



[www.kitaabdost.com](http://www.kitaabdost.com)



## آوارہ۔۔۔۔۔ شاہینہ چند امہتاب

کھڑکی کے دونوں پٹ کھولے کھڑی وہ اپنے آپ سے بھی بے خبریوں باہر دیکھے جارہی تھی جیسے موسم بہت سی دلکش اور بے حد سہلنا ہو۔ جبکہ باہر طوفان باد و باران اپنی پوری شدتوں پر تھا۔ اگرچہ موسم صبح ہی سے برا لہو تھا مگر شام ہوتے ہوتے وہ طوفان کی شکل میں وحل چکا تھا بارش شروع ہوئی تو پھر رکنے کا نام ہی نہ لیا۔ اندھیرا کبیرا ہونے کے ساتھ ساتھ طوفانی بارش شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ مردہ کرنجلی کے کوندے لہجے بھر کے لیے بھرتی کو روشن کرتے پھر پہلے سے زیادہ تاریکی چھا جاتی اور اس کبری تاریکی میں بالوں کی گھن گرج اور بھی بھیا نک لگ رہی تھی۔ اس پر منہ زور ہوا کی تیزی کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہر چیز آج اڑا کر لے جائے گی۔ فضا میں عجیب سا خوفناک شور تھا۔

رات تو یوں بھی ایک سکوت پرور، اس اور ڈراؤنی چیز کا نام ہے۔ خاص کر تنہا انسان کے لیے۔ اور انسان بھی وہ جو اپنے روم میں ہی نہیں پورے گھر میں تنہا ہو۔ اس پر یہ خوفناک طوفان، پھرے ہوئے بالوں کی بھیا نک آوازیں اور زوروں سے برستی شدید بارش لگتا تھا صبح ہوتے ہوتے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ایسے خوفناک موسم میں انسان تو انسان چہرہ پر بند بھی گھونسلوں میں دیکے بیٹھے تھے۔ مگر اس کو تو جیسے کسی بات کا احساس ہی نہیں تھا۔ وہ خوف، ہر طوفان اور ہر چیز سے بے نیاز آنکھیں پھاڑے نجانے تاریکی میں کیا دیکھنے، کیا محسوس کرنے یا سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ دفعتاً ہوا کی شاخیں شاخیں کسی کی سرکوشیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تم واقعی آوارہ ہو۔ سناتم نے ذیل لڑکی! تم آوارہ ہو۔ لوگ تمہارے بارے میں جو بھی کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اتنی سی عمر میں تم کتنے پراگندہ ذہن کی لڑکی ہو۔ کتنے دن سے میں تمہاری حرکتوں کو دیکھ رہا تھا بالآخر آج اس موسم کا سہارا لے کر تم مجھے گمراہ کرنے بھی آگئیں۔“ وہ نکال ایک نفرت بھری نگاہ سامنے کھڑی روٹی پر ڈالی پھر زیر خند سے بولا۔

”میں مردہ ہو کر تمہارے پاس نہیں آیا، اور نہ اس موسم کے تقاضے میں بھی سمجھتا تھا۔ یہ بھیگا موسم مجھ پر بھی اثر انداز ہو سکتا تھا۔“ اس آواز میں ذہر بھرا ہوا تھا۔ ”مگر تم، تم عورت ہو کر مجھ سے رفاقت کی بھیک مانگ رہی ہو۔ مگر افسوس تم اپنی خواہش پوری کرنے بہت غلط جگہ آئی ہو، کیونکہ میں ایسا مرد نہیں ہوں کہ تم جیسی عورت کی حوصلہ افزائی کروں۔ تمہیں یہاں کچھ نہ ملے گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔“ حقارت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے بلال نے بڑی بے رحمی سے خود سے لپٹی روٹی کو نوچنے والے انداز میں الگ کرتے ہوئے پوری قوت سے دروازے کی جانب دھکیل دیا۔

وہ دروازے کی بجائے پورے زور سے سیدھی دیوار سے جا ٹکرائی۔ سر میں شدید درد کا احساس ہوا، مگر بال بال اور بجلی کی کڑکتی آوازوں کا خوف ہر شے پر حاوی تھا۔ وہ چوٹ بھول کر پھر بلال کی سمت ہی آئی تھی، کہ اس وقت بلال کے علاوہ کوئی ذی روح گھر میں موجود نہیں تھا۔ کڑکتی بجلی سے ڈر کر بلال سے لپٹنا ایک غیر ارادی فعل تھا۔ اور وہ کیا سمجھا تھا اور کیا کچھ نہ کہہ ڈالا تھا۔ تم عورت ہو کر مجھ سے رفاقت کی بھیک مانگ رہی ہو کیا وہ عورت تھی، وہ تو 17 برس کی ایک بہت بیدار اور بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ بلکہ وہ تو ابھی پورے سترہ برس کی بھی نہیں تھی۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالے سامنے کھڑے بلال کو دیکھا۔ پھر اس کے سامنے آتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں بولی۔

”باہر طوفان ہے بال بال ہے بجلی ہے۔ مجھ سے بے حد ڈر لگتا ہے۔ بہت ڈر لگتا ہے۔“ مگر اس سنگ دل پر کچھ اثر نہ ہوا۔

”نیکو اس بند کرو اور فو رائیہاں سے چلی جاؤ۔ میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ پوری قوت سے دھاڑا۔

روٹی مارے خوف کے ایک بار پھر دیوار سے جا لگی۔ مگر کمرے سے باہر نہیں گئی کہ اندر وہ قہر کا دیوتا بن کر کھڑا تھا تو باہر طوفان باد و باران عروج پر تھا۔ مگر وہ اس کی مجبوری نہیں سمجھ رہا تھا۔ کوکہ روٹی کو اب بلال سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ مگر باہر والے طوفان سے زیادہ نہیں۔ وہ اس کی پتاہ چاہتی تھی۔ اس لیے سب کچھ سن کر بھی وہیں کھڑی تھی۔ حالانکہ اس کی باتوں کے جواب میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ایک زنا لے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر کے خود ہی کمرے سے نکل جاتی۔ مگر بات پھر وہی خوف کی تھی۔

”بی بی جی!۔۔۔۔۔ بی بی جی!“ اچانک وہ اپنی بوڑھی ملازمہ کی آواز سن کر چونک پڑی۔ یکدم پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”کیا بات ہے ماں؟“ روٹی نے وہیں کھڑے کھڑے سخت لہجے میں پوچھا۔ جیسا اس کا اس وقت محل ہونا کو گرازا ہو۔

”بی بی جی! باہر بہت زور کا طوفان ہے، کھڑکی بند کر کے اپنے بستر پر آ جاؤ۔“ ملازمہ نے وہی ایک گھسا پٹا جملہ کہا، جو وہ کئی سالوں سے کہہ رہی تھی۔ مگر وہ اب بوڑھی ملازمہ کی آواز کب سن رہی تھی۔ اس کا ذہن، دل و دماغ اس کی سماعتیں پھر وہی بازگشت سن رہے تھے۔



”تم جیسی خوبصورت عورتیں رات کا حسن تو ہو سکتی ہیں، رات کی دلکشی میں اپنی خوبصورتی اداؤں سے اضافہ تو کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔  
مرد کے جسم و جان کو آسودہ تو کر سکتی ہیں مگر۔۔۔۔۔

دن کے اجالے میں کوئی شریف آدمی تمہیں اپنی شناخت نہیں بنا سکتا۔ تمہارے وجود کو اپنانا نہیں دے سکتا۔ حتیٰ کہ دوسروں کے سامنے تم سے بات کرنی کا ارادہ نہیں کر سکتا۔ تم جو سوچ کر آئی ہو تم جو چاہتی ہو، اگر میں یہ سب کر ڈالوں تو تمہارے پاس سوائے ذلت کے کیا رہ جائے گا۔ پلیز جاؤ یہاں سے، جلی جاؤ، کیوں اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی تباہ اور سوا کرنے پر تل گئی ہو۔ میں کہتا ہوں جاؤ۔“ وہ ایک بار پھر پوری شدت سے دھاڑا۔

”بی بی جی!“ بوڑھی ملازمہ بھی اس دم پورے زور سے چیختی تو روپی چونک پڑی۔ آنکھیں پھاڑ کر ملازمہ کو دیکھتے ہوئے روپی بولی تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز بہت دور سے آرہی ہو، بہت ہی دور سے۔

”کیلیات۔ ہاں! کیوں پریشان ہوتی ہو۔“

”بی بی جی! اب بہت زوروں کا طوفان جاوے گا۔ آپ۔۔۔۔۔ اماں کی آواز ناگوار رہی۔

”اندھی نہیں ہوں، دکھائی دے رہا ہے مجھے بھی۔“ روپی نے تیز لہجے میں اماں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”آپ سمجھتی کیوں نہیں بی بی جی! موسم بہت خراب ہے۔“ بوڑھی ملازمہ نے ہمدردی سے روپی کا احساسات سے عاری سپاٹ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پھر دہائی دی۔

روپی نے ایک لمحے کے لیے سر جھٹک کر آنکھیں پھاڑ کر اپنی بوڑھی ملازمہ کو دیکھا۔ جو بے حد پریشانی اور ہمدردی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اماں یہی موسم تو میرے ساند ٹھہر چکا ہے۔ میں تو کئی برس سے دن رات اس موسم کی زد میں رہتی ہوں تو مجھے اس موسم سے کیا ڈرائے گی۔ روپی نے صرف دل میں سوچا۔

بوڑھی ملازمہ کو اس کی خاموشی اور نرم رویے سے تھوڑا حوصلہ ہوا تو ہمت کر کے بولی۔

”بی بی جی! آپ کو ڈر کیوں نہیں آتا، اس موسم سے۔ دیکھئے تو گوڑے باطل کتنے زور سے کڑکتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے لپک رہے ہیں۔ اور اس پر یہ بجلی جب کڑکتی، چمکتی ہے تو یوں لگتا ہے اچھی سڑوں پر آگرے لگی۔ مجھے بوڑھی عورت ہونے کے باوجود ڈر لگ رہا ہے۔ آپ تو پھر جوان ہو اور جوان جہاں لڑکیاں تو ایسے موسم میں ماں کی کوڈ میں منہ چھپا کر اپنے بستر پر دبی رہتی ہیں اور ایک آپ ہیں۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر روپی کو دیکھا جو سپاٹ چہرہ لیے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اماں کے خاموش ہوتے ہی پھٹ پڑی۔

”ڈر؟ خوف؟ یہ کس کو کہتے ہیں؟ بھیا نک موسم کس کو کہتے ہیں؟“ ہونہارہ وحشت بھری ہنسی کے ساتھ بولی۔

”یہ الفاظ بہت چھوٹی عمر میں میری زندگی کی کتاب سے مٹ چکے ہیں۔“ ملازمہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے روپی کو دیکھا۔ تبھی بھیا نک آواز کے ساتھ بجلی نہ صرف کڑکی تھی بلکہ چمکی بھی

یوں تھی جیسے قریب ہی کہیں گری ہو۔ مارے خوف کے کانپتے ہوئے اماں نے روپی کے غصے کی پردہ کیے بغیر آگے بڑھ کر خود ہی کھڑکی کے دروازے بند کر دیئے پھر سمجھانے والے انداز میں بولی۔

”بی بی جی! یہاں لوگ کہتے ہیں جب آدمی اور طوفان آتے ہیں تو ان میں بہت سارے جن بھوت اور دوسری بہت ساری چھوٹی بڑی بلائیں شامل ہوتی ہیں۔ اس موسم سے

ڈرنا چاہیے، بچنا چاہیے، دروازے بند کر کے خاص کر کنواری لڑکیوں کو اپنے کمرے میں رہنا چاہیے، ورنہ کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا ہے۔“

اماں کی بات ادھوری رہی کیونکہ اب وحشت اس کی آنکھوں ہی میں نہیں پورے جسم میں سرایت کر چکی تھی۔ اماں نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اس کو بستر کے قریب لانا چاہا۔

مگر اب روپی پر دیوانگی طاری ہو رہی تھی۔ اماں کا ہاتھ جھٹک کر وہ پھر کھڑکی کے قریب آئی اور اس کو پوری کی پوری کھولتے ہوئے جنوبی انداز میں چلائی تھی۔

”اماں تم کتنی بے ضرر چیزوں کو خوفناک کہہ رہی ہو۔ بھلا انسان سے بڑھ کر بھی کوئی چیز بھیا نک یا خوفناک ہو سکتی ہے۔ انسان کو آج تک جتنا دکھ جتنی تکلیفیں، خود انسان نے پہنچائی

ہیں، شاید ہی کسی دوسری چیز نے پہنچائی ہوں۔ ہاں کبھی میں بھی اس موسم سے خوف کھاتی تھی۔ بہت ڈرتی تھی، کبھی میں بھی اس موسم سے، اس چمکتی بجلی، کڑکتی بجلی اور گر جتے بادلوں

سے خوفزدہ ہو کر خود کو ہنپی سمجھ کر ڈر جاتی تھی۔ ہاں 17 برس کی لڑکی ہی تو ہوتی ہے۔ مگر وہ بچہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی لڑکا تھا۔ وہ 26 برس کا ایک سمجھدار نوجوان تھا، مرد تھا اور میرا جرم یہ تھا کہ

میں اس سنگدل سے محبت کرتی تھی اور ویسے بھی اس وقت گھر میں اس کے سوا کوئی تھا بھی تو نہیں۔ اس لیے میں اس کے پاس جلی گئی، پناہ کے لیے، اپنے خوف سے نجات حاصل



کرنے کیلئے۔ کیونکہ یہ موسم مجھے ڈراتا تھا۔ میں بچپن سے ہی اس موسم سے ضرورت سے زیادہ خوف کھاتی تھی۔ میں تو اس کو اپنا سمجھ کر اس کے پاس اپنے خوف سے نجات حاصل کرنے کو گئی تھی کہ وہ میری محبت تھا، میرا محبوب تھا۔ یوں بھی اس وقت میں انسان کو انسان کا بہت بڑا ہمدرد اور سہارا سمجھتی تھی۔ مگر اس نے اس وقت جو میرے ساتھ رویہ اختیار کیا، جو کہا، کیا وہ اسے کہنا چاہیے تھا، کرنا چاہیے تھا۔“

بات کرتے کرتے وہ رکی اور اذیت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی سماعتوں میں پھر وہی بازگشت تھی۔ کیا خوب صلہ دیا تھا بلال نے اس کی معصوم محبت کا، چاہت کا اس کے اعتبار کا۔

”تم آوارہ ہو، سنا تم نے ذیل لڑکی! تم آوارہ ہو۔“

”ہاں ہاں میں آوارہ ہوں۔“ روبی نے زور سے چیختے، چلاتے ہوئے کھڑکی کے دونوں پٹ پوری قوت سے ایک دوسرے پر دے مارے۔ شیشہ ٹوٹ کر کرچوں کی صورت میں ہر طرف بکھر گیا۔ مگر اب اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے بیڈروم میں موجود ہر چیز اٹھا اٹھا کر پھینکنی شروع کر دی تھی۔ باہر والا طوفان اب گویا کمرے کا اندر بھی آ گیا تھا۔ اس نے چیختے، چلاتے، دیوانگی کے عالم میں سب کچھ ہی توڑ ڈالا تھا۔ وہ چیختے، چلاتے ایک ہی جملہ کہا کرتی تھی۔

”مجھے تم سے نفرت ہے بلال! مجھے تم سے نفرت ہے بلال! شدید نفرت۔“ کہ اس کے آج کہ اس مقام کا ذمہ دار جہاں وہ بھی بلال ہی تو تھا۔ مگر آج وہ بلال کا نام لینے کی بجائے صرف یہ کہہ رہی تھی۔

”مجھے سب سے نفرت ہے۔ مجھے سب سے نفرت ہے۔“

اور یہ سب کون تھے۔ اماں سمجھ نہ سکی۔ وہ چیختے چلانے کے ساتھ ساتھ اب ہاتھ پاؤں بھی چلا رہی تھی۔ اماں اس کو سنبھالتے سنبھالتے مڑھل ہو رہی تھی اور روبی جب تھک کر چور چور ہو گئی تو نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنے بیڈ پر گر کر وہ اپنے ماحول کو کیا خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو چکی تھی۔

بوڑھی ملازمہ کتنی دیر گم صم ہی کھڑی بے سدھ پڑی روبی کو دیکھتی رہی۔ پھر دروازہ بند کر کے خود اپنے کمرے میں چلی آئی کہ اس کو اچھی طرح معلوم تھا اب صبح تک روبی یونہی بے سدھ پڑی رہے گی۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ یوں بھی روبی کو سنبھالتے سنبھالتے وہ خود بھی تھک کر مڑھل ہو چکی تھی۔ اس لیے مزید وہاں کھڑی رہنے کی بجائے وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

دوسرے دن کی صبح کھری کھری روز سے کچھ زیادہ ہی خوشگوار تھی۔ گزری رات طوفان کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ننگلوں آسمان ہمیشہ سے کچھ زیادہ ہی اجلا اجلا لگ رہا تھا۔ جبکہ روبی ابھی تک آڑی تریچھی بیڈ پر پڑی سو رہی تھی۔ اماں دبے پاؤں روبی کے کمرے میں آئی اور بغور روبی کو دیکھنے لگی۔ چونکہ روتے روتے سوئی تھی اس لیے آنسوؤں کے نشان ابھی بھی چہرے پر موجود تھے۔ اس کے خوبصورت سیاہ شولڈر کٹ بال ٹکے پر ادھر ادھر بے ترتیب بکھرے پڑے تھے۔ اور اس کا خوبصورت، بے داغ، شفاف چہرہ کسی دیوی کی طرح مقدس لگ رہا تھا۔ اماں کا جی چلا آگے بڑھ کر محبت سے اس کے معصوم چہرے پر ہاتھ پھیرے یا پھر محبت اور شفقت سے اس کی پیشانی چوم لے۔ مگر چاہنے کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکی کہ ایسا کرنے سے نہ صرف وہ اٹھ سکتی تھی بلکہ خفا بھی ہو سکتی تھی۔ اس لیے اماں بیڈ سے ذرا پرے کھڑی محبت سے اس کو دیکھنے لگی۔ کتنی خوبصورت ہے، جوان بھی، دولت مند بھی اور ایک معروف مشہور سستی بھی، بہت پیاری مگر بالکل تنہا۔ نجانے کیا غم یا دکھ اپنے اندر چھپائے جی رہی ہے کہ جب بھی طوفانی موسم ہوتا ہے یہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ خدا جانے وہ کوئی یاد دیا بات ہے جو اس طوفانی موسم سے وابستہ ہے۔ جو اچھی بھلی لڑکی ایسے موسم میں مارے وحشت کے پاگل ہو جاتی ہے اور یہ بلال کون ہے؟ جس کا نام لے کر وہ اپنی نفرت کا اظہار کرتی تھی۔ مگر حیرت ہے آج روبی نے بلال کا نام نہیں لیا تھا۔ یہ بلال کون تھا؟ محبوب تھا یا کچھ اور۔ اماں بھی نہ سمجھ سکی کہ اس ایک جملے کے علاوہ وہ کبھی کچھ اور نہ کہتی تھی۔

”بلال مجھے تم سے نفرت ہے، شدید نفرت۔“

اماں کو تقریباً اوس برس ہو چکے تھے، اس کے ساتھ رہتے ہوئے۔ مگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کے بارے میں کچھ جان نہ سکی تھی۔ بل میں تو وہ، بل میں ماشہ وہاں کے بارے میں جانتی بھی تو کیسے، اس کا کوئی بھی ملنے والا بھی اس گھر میں نہیں آیا تھا۔ اس بے حد خوبصورت اور بڑے گھر میں وہ اماں کے ساتھ بالکل تنہا رہتی تھی۔ اماں اکثر سوچتی یہ بے چاری شاید اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہے، مگر نہیں۔ کوئی نہ کوئی تو ہوگا اس کا اپنا بھی۔ نجانے وہ کیا حالات ہوں گے جو اس نے سب کو چھوڑ کر یہ تنہائی کی زندگی اختیار کی تھی۔ وہ اس



ملک کی ایک مشہور و معروف اداکارہ تھی، جس کی ہر فلم باکس آفس پر کامیابی سے ہمکنار ہوتی تھی۔ وہ جس کی ایک جھلک دیکھنے کو دنیا ترستی تھی۔ بات سننے کو تڑپتی تھی۔ مگر وہ اپنی ذات میں کتنی دھمی اور تنہا تھی۔ یہ صرف ماں جانتی تھی اور اس بات کا ماں کو پورا یقین تھا کہ اس کا تعلق بازار گناہ یعنی ہیرا منڈی سے پر گز نہیں تھا۔ جیسا کہ اکثر اداکاراؤں کا تھا۔ وہ یقیناً کسی معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی کہ اس کا اٹھنا بیٹھنا اداکاراؤں جیسا نہیں تھا۔ وہ گھر کے باہر اداکارہ بھی تو گھر کے اندر ایک بے حد سادہ لڑکی، بے حد کم کلام اور کم صم سی، جو باتیں کم کرتی تھی اور سوچتی زیادہ تھی۔ ماں کے مزید کچھ سوچنے سے پہلے ہی معاہدہ کرنے کو روٹی بدلی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ روٹی نے سامنے کھڑی ماں کو حیرت سے دیکھا، پھر خلاف امید نرم لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے ماں! آپ صبح میرے روم میں کوئی کام ہے کیا۔“

”نہیں بی بی جی! کام کیا، میں تو یونہی آپ کو دیکھنے آئی تھی۔“ ماں نے جلدی سے وضاحت کی۔

”مجھے کیوں بھلا مجھے کیا ہوا؟“ روٹی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ چونک پڑی۔ پہلے حیران ہو کر خود کو دیکھا، پھر سارے روم پر اک نگاہ ڈالی، سب کچھ ہی ٹوٹ چکا تھا۔ درجے کا شیشہ، ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ، پرفیوم کی شیشیاں، قیمتی میک اپ کا سامان، سب کچھ ہی تو ٹوٹ چکا تھا اور اب سارے روم میں کھرا پڑا تھا۔ روٹی کچھ دیر کھوٹی کھوٹی سی نگاہوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے یہ سب دیکھتی رہی۔ اچانک سامنے دیوار پر لگے دل کلاک پر نگاہ پڑی تو نام دیکھ کر چونک پڑی، پھر اچھل کر بیڈ سے نیچے تری تو ماں یکدم چپٹی۔

”بی بی جی! وہ بیان سے کہیں پاؤں میں کانچ نہ لگ جائے۔ کہیں میں آپ کو چپل پکڑا تھی۔“

رات کی کوئی چیز بھی تو اپنے ٹھکانے پر نہیں رہی تھی۔ مگر روٹی ماں کی وارننگ کی پروا کیے بغیر بیڈ سے اتر چکی تھی اور فرش پر بکھری کر چیاں بھی اپنا کام دکھا چکی تھیں۔ ماں کی مزید سرزنش سے بچنے کے لیے وہ سیدھی واش روم میں گئی اور پاؤں سے بہنے والے خون نے بیڈ اور واش روم کے درمیان خون کی ایک لائن بنا دی تھی۔ اس نے لباس اتارے بغیر ہی شاور کے نیچے کھڑے ہو کر شاور کھول دیا اور نیم گرم پانی اسے ہلکا ہلکا سکون دینے لگا۔ کتنی ہی دیر وہ اس حلقے میں شاور کے نیچے کھڑی رہی۔ جبکہ ماں روٹی کے واش روم میں گھستے ہی جلدی جلدی روم کی صفائی کرنے لگی۔ جب تک روٹی واش روم سے فارغ ہو کر باہر آئی، ماں کافی حد تک روم کی صفائی کر چکی تھی۔ روٹی روم میں ٹہلتے ہوئے بالوں میں برش کرنے لگی تو ماں نے باہر جا کر کھانا میز پر چن دیا۔ روٹی بالوں میں برش کرنے کے بعد بیگ کندھے پر ڈالے فٹ تیار کی کے ساتھ باہر آئی۔ برائے نام کھانا کھایا اور پھر بغیر بات کیے گھر سے باہر نکل گئی کہ آج کل بلال کی وجہ سے اس کو بھوک کم ہی لگتی تھی۔

روٹی کے میز سے اٹھتے ہی ماں برتن سمیٹنے لگی۔ اچھی طرح جانتی تھی اب رات سے پہلے روٹی کی واپسی نہیں ہوگی کہ آج ٹی وی کے لیے اس کی آخری ریکارڈنگ تھی۔ اور روٹی نے ماں کو بتایا تھا۔ بے شک رات کا ایک بج جائے وہ آج اپنا کام مکمل کروانے کے بعد ہی آئے گی۔ حالانکہ رات نو بجے کے بعد اس نے کبھی شوٹنگ نہیں کی تھی۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ٹی وی ریکارڈنگ کی بجائے صرف اور صرف اپنے اس سفر کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کی زندگی کا اہم سفر تھا اور شاید آخری بھی۔ مگر سچی بات تو یہ تھی کہ ابھی خود روٹی کو بھی اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ یہ سفر کب شروع ہوگا۔ تاہم یہ طے تھا کہ وہ سفر اسی ہفتہ کے اندر اندر شروع ہوگا کہ ابھی ٹکٹس اونگھیں ہوئی تھیں۔ بس روٹی کا ایک فون سیکرٹری کو کرنے کی دیر تھی۔ یہ کام بھی ہو جاتا اور اس کے بعد کیا ہوگا، روٹی ہونٹ دبا کر سوچنے لگی۔

شاید میں بھی سب کچھ بھول جاؤں گی۔ یہ ملک یہاں بسنے والے لوگ، اپنے گھر والوں کو تو وہ بہت پہلے کا ہی بھول چکی تھی۔ کیا بلال کو بھی بھول جاؤں گی یا بھول سکوں گی؟ دل نے سر کوئی کی تو روٹی نے مارے کرب کے آنکھیں بند کر لیں۔

کیا جرم تھا اس کا؟ یہی نہ کہ وہ بلال سے محبت کرتی تھی۔ اور بلال اس قدر بے رحم اور سنگدل ہو گیا کہ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ یہ بے رحمی ہی تو تھی جو روٹی کو اس مقام پر لے آئی تھی۔ وہ جو ایک شریف اور معزز خاندان کی مٹی تھی، بہت نیک اور شریف ماں باپ کی اولاد اور وہ خود بھی تو ایک سیدھی سادھی معصوم لڑکی تھی۔ مگر اب وہ کیا تھی۔ بظاہر ایک مشہور و معروف اداکارہ اور اندر سے کیا تھی، غلاظت کا ڈھیر۔ مزید کچھ سوچنے سے پہلے ہی وہ ٹی وی سٹیشن پہنچ گئی۔

ٹی وی کے لیے یہ روٹی کی آخری ریکارڈنگ تھی اور وہ بے حد لیٹ ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے گاڑی روکتے ہی وہ سیدھی سٹوڈیو چلی آئی۔ جہاں ڈرامے کا پروڈیوسر اپنے سٹاف کے



ساتھ بے چینی سے روپی کا منظر تھا۔ روپی کو دیکھتے ہی لیٹ ہونے کا شکوہ کیے بغیر مسکرا کر بولا۔

”آئیے آئیے میں آپ ہی کا ویٹ کر رہا تھا۔“ بہت مشکل سے اس نے روپی کو اپنے ڈرامے میں کام کرنے کو ایگری کیا تھا کہ روپی کی فلمی مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ ڈرامے میں روپی کا رول کافی پاورفل تھا اس لیے اپنا کردار سننے کے بعد وہ مان گئی تھی۔

”آئی ایم سوری میں تھوڑی لیٹ ہو گئی۔“ روپی نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ حالانکہ بلال کی وجہ سے آج کل اس کا رسمی طور پر بھی مسکرانے کو مل نہیں جاتا تھا۔ کبھی وہ اس کی محبت میں پاگل ہوئی تھی۔ شاید اس لیے آج اس مقام پر بھی۔ ہاں یہ بلال کی محبت ہی تو تھی جو جب نفرت میں بدلی تھی تو روپی کو رسوائی کے اس مقام پر لے آئی تھی۔ اور بلال جس نے روپی سے کھل کر اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا۔ اب روپی کی محبت میں پاگل ہو رہا تھا۔ عجب اتفاق تھا۔ روپی کی محبت نفرت میں بدل گئی تھی، تو بلال کی نفرت شدید ترین محبت میں بدل گئی تھی۔ اتنی شدید محبت کہ اس کو ناپنے خاندان کی عزت کا خیال رہا تھا نہ اپنی عزت کا۔ روپی کو حاصل کرنے کیلئے وہ سب کچھ کرنے، چھوڑنے کو تیار تھا۔ روپی کے انکار کے باوجود وہ روپی کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا، بلکہ وہ سارا وقت روپی کے تعاقب میں رہتا تھا۔ روپی جہاں بھی جاتی وہ بھی وہاں پہنچ جاتا۔

اور روپی؟ وہ خوب اچھی طرح جانتی اور سمجھتی تھی کہ وہ اب بلال اور اس کے خاندان کے لائق نہیں رہی۔ یہ عزت یہ دولت اور شہرت یونہی ہاتھ نہیں آتی تھی۔ شوبز بظاہر روشنیوں کی دنیا ہے مگر اندر سے گندگی کا ڈھیر۔ اگر روپی پہلے یہ جانتی تو کبھی گھر سے بھاگنے کی غلطی نہ کرتی۔ مگر اب تو ایک لہلہ تھی جس میں وہ پھنس چکی تھی۔ بلال اس کو اس لہلہ سے نکالنے کے لیے سب کچھ چھوڑ چکا تھا۔ مگر اب وہ سب ناممکن تھا، جو بلال چاہتا تھا۔

روپی نے سر جھٹک کر ان سوچوں سے پیچھا چھڑایا اور پروڈیوسر سے مزید چند باتیں کرنے کے بعد میک اپ روم کی جانب چلی آئی۔ روپی کو معلوم تھا کہ اگر وہ مزید کچھ دیر یہاں رکی تو دوسرے لوگ بھی آجائیں گے اور آدھا دن باتوں میں ہی ضائع ہو جائے گا۔ جبکہ اس کے پاس ضائع کرنے کو ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ بہت کم نام تھا اس کے پاس۔ جبکہ کرنے کو کام زیادہ تھا اور وہ جلد از جلد ہر کام مکمل کروانا چاہتی تھی۔

میک اپ سے فارغ ہو کر وہ سٹوڈیو میں آئی تو پروڈیوسر کے مطابق ریکارڈنگ شروع ہو گئی۔ اور پھر باقی کا سارا دن تو کیا آدھی رات بھی ریکارڈنگ کی نظر ہو گئی۔ پروڈیوسر نے اگرچہ کہا بھی تھا کہ باقی کا کام کل مکمل کر لیں گے کیونکہ اس کو بھی معلوم تھا کہ روپی رات 8 بجے کے بعد شوٹنگ میں حصہ نہیں لیتی۔ مگر آج تو روپی خود ہی کہہ رہی تھی کہ بے شک آدھی رات بھی لگ جائے وہ آج اپنا سارا کام مکمل کروانے کے بعد ہی جائے گی۔ یوں کام جاری رہا اور جب ریکارڈنگ مکمل ہوئی تو روپی تھکن سے چورھی تا ہم خوش تھی کہ یہ آخری کام بھی مکمل ہو گیا ہے۔

وہ تھکے تھکے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے سٹوڈیو سے باہر آئی تو چائے تیار تھی۔ اگرچہ ڈرامے کے پروڈیوسر نے کھانے کی آفر کی تھی مگر روپی نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ مگر چائے کی طلب شدید تھی اور سچی بات تو یہ تھی کہ گرم چائے کے دو گ پی کر اس کے دل و دماغ کو کھرا سکون ملا تھا۔

چائے سے فارغ ہوتے ہی بیگ کندھے پر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پروڈیوسر سے الوداعی کلمات کہے اور پھر اپنی گاڑی کی جانب چلی آئی۔ گاڑی کا دروازہ کھل کر ابھی وہ سیٹ پر بیٹھ ہی رہی تھی کہ نظر سامنے سے آتے ہوئے ڈیٹان پر پڑی وہ قریباً بھاگنے والے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے سیدھا روپی کی جانب آ رہا تھا۔ روپی گاڑی سٹارٹ کرنے کی بجائے کوڈ میں دونوں ہاتھ رکھے چپ چاپ اس کو دیکھنے لگی۔ پھر جیسے ہی ڈیٹان قریب آیا اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی روپی نے پوچھا۔

”خیریت؟ تم اور اس وقت یہاں؟ کیا پھر کسی ٹی وی ڈرامے میں کام کر رہے ہو۔“ ڈیٹان نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ڈیئر! کیلئے سچ ہے کہ تم مستقل سکونت کے لیے بہت جلد امریکہ جا رہی ہو۔ پلیز جلدی بناؤ۔“

”تمہاں کراتے ہوئے ہر بار میرا نام کیوں بھول جاتے ہو۔“ روپی نے اس کو گھورتے ہوئے سچی بھرے لہجے میں کہا۔

”فضول باتیں مت کرو۔ روپی ڈیئر! میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ پلیز!“ ڈیٹان نے بتائی سے پوچھا۔

روپی نے ایک نگاہ اس کو دیکھا۔ جانتی تھی وہ جب اس کے جانے کا سنے گا تو پریشان ہوگا کہ اس سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ یہاں لگس بات ہے کہ روپی کا اعتبار محبت تو کیلبر چیز سے اٹھ گیا تھا۔



”ہاں میں جارہی ہوں۔“ روبی نے آہستگی سے قرار کیا۔

”مگر کیوں۔“ ذیشان نے بے چینی سے پوچھا۔

روبی کا جی چلا کہہ دے کہ وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔ مگر اس کی محبت کا خیال کر کے چپ رہی اور ذیشان نے کہا۔

”یہ تمہیں اچانک بیٹھے بیٹھائے ملک چھوڑنے کی کیا سوچھی۔ یہاں تمہیں کسی چیز کی کمی ہے جو باہر جارہی ہو۔ عزت، دولت، شہرت ہر چیز تو ہے تمہارے پاس۔ پھر تم کیوں جارہی ہو، مگر۔۔۔۔۔“

”سنو ذیشان! یہ عزت احترام والے الفاظ کتنی بار تمہیں منع کیا کم از کم میرے لیے استعمال نہ کیا کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو ایک اداکارہ کتنی عزت دار ہوتی ہے۔“ اس نے ذیشان کی بات کاٹ کر نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”پلیز روبی ڈیر اتم آخر میری بات اور میرے جذبات کو سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ جب تم نے نئی فلمیں سائن کرنی چھوڑ دیں اور باقی فلموں کا کام جلد از جلد مکمل کروانے لگی تو میں سمجھا شاید اب تم شادی کے لیے رضامند ہو چکی ہو۔ مگر اب جب کسی اور کے منہ سے تمہارے جانے کا سنا ہے تو بہت دکھ ہوا ہے۔ لیکن نہیں آتا کہ میں جو تمہارا سب سے بہترین دوست ہوں تم نے مجھ سے یہ بات چھپائی۔ کتنے افسوس کی بات ہے بلکہ صدمے کی۔“

روبی اس کی بات سن کر پھر چپ رہی کہ جانتی تھی وہ سچ کہہ رہا ہے۔

روبی کو خاموش دیکھ کر ذیشان نے پھر کہا۔ ”بہر حال چاہے کچھ بھی ہو، میں تمہیں امریکہ برگز نہیں جانے دوں گا۔ تم جانتی ہو نہ میں تم سے کتنی شدید محبت کرتا ہوں۔ تمہارے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتا ہوں۔ نہیں ڈیر اتم مجھے تنہا چھوڑ کر امریکہ نہیں جاسکتیں۔ کیونکہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور تمہیں مجھ سے لازمی شادی کرنا ہوگی۔“ اس کو واقعی روبی سے سچی محبت تھی۔

”شادی اور وہ بھی ایک بدنام اداکارہ کے ساتھ۔“ روبی نے کہا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ حالانکہ اب اس کو رونے سے شدید نفرت تھی کہ ایک عمر روتے ہوئے ہی گزری تھی۔

”تم خود کو کچھ بھی کہو میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔“ ذیشان نے محبت سے اس کا خوبصورت مخروٹ انگلیوں والا ہاتھ تھام لیا۔ چند لمحوں کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر جذبات سے بو جھل لہجے میں بولا۔

”چلو یار! کسی ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں تاکہ آرام سے باتیں کر سکیں۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“ اور چاہنے کے باوجود روبی انکار نہ کر سکی۔ خاموشی سے فسٹ ڈور اوپن کر دیا اور ذیشان جلدی سے اس کے قریب فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ وہ اپنی گاڑی میں آیا تھا مگر اس کو روبی کے سوا کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ بہر حال روبی کو روکنا چاہتا تھا۔

”کیا بات ہے آج تمہارے بھاؤ کی گاڑی دکھائی نہیں دے رہی؟“ ذیشان نے سیٹ سے ٹپک لگا کر تھوڑا سا ترچھا ہو کر محبت سے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے سب کی چھٹی کر دی۔ اب جب سب ختم ہو رہا ہے تو ان کی ضرورت بھی ختم ہو گئی تھی۔“ روبی نے ونڈ اسکرین کے باہر دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بتایا۔ ”گویا بہت جلد جانے کا پروگرام ہے۔ ذیشان نے عجیب سی حیرت زدہ نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ خبر نہیں۔“ وہ لاپرواہی سے شانے اچکا کر بولی اور گاڑی ایک اچھے مگر نئے بننے والے ہوٹل کے باہر روک دی۔ پھر گاڑی بند کر کے وہ دونوں خاموشی سے اندر چلے آئے اور اپنے لیے ایک لگ سے کونے کی میز کا انتخاب کر کے وہ دونوں بیٹھ گئے۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر ذیشان نے پوچھا۔

”چائے پیو گی یا کافی؟ ویسے کھانے کا نام ہے، کہو تو کھانا منگوادوں۔“

”کھانا نہیں صرف کافی چائے پی کر آئی ہوں۔“ روبی نے کہا پھر آس پاس کا جائزہ لینے لگی۔

”سگریٹ۔“ ذیشان نے سگریٹ کیس کھول کر اس کے سامنے کیا تو روبی چونک کر سگریٹ دیکھنے لگی۔

”کیا سگریٹ بھی چھوڑ دیئے۔“ ذیشان نے اس کو ہنسی سے دیکھ کر پوچھا۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی لہجے میں ہلکا سا طنز شامل ہو گیا۔

”نہیں، خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ روبی نے ایک سگریٹ پکڑ کر ہونٹوں میں دبائی تو ذیشان نے جلدی سے ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبائی۔ پھر اپنے لائٹر سے روبی کی



سگریٹ سلگانے کے بعد اپنی سلگاتے ہوئے بولا۔

”کل کی طوفانی بارش کے بعد موسم کافی خوبصورت ہو گیا ہے۔ مگر بے حد سرد بھی۔ اگر تمہارے جانے کی خبر نہ ملتی تو میں اس وقت بستر سے نکلنے والا نہیں تھا۔ آج میری کوئی شوٹنگ بھی نہیں تھی۔ مگر تمہارے جانے کی خبر نے مجھے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

”کیا ضرورت تھی اس وقت بستر چھوڑنے کی؟ صبح ہونے کا انتظار کر سکتے تھے۔“ روبی نے ایک لمبا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو ذیشان نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے جانے کی خبر سن کر میں بستر میں رہ سکتا تھا؟“ اتنے میں ویٹر کافی لے کر آ گیا۔ روبی نے جلدی جلدی دو تین کش لیے اور سگریٹ اش ٹرے میں مسل دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ بھاپ اڑتی گرم گرم کافی کے کیلے گھونٹ حلق سے نیچا تا رہی تھی جبکہ ذیشان اپنا مگ سامنے رکھا ایک بار پھر اس کو سمجھانے میں مصروف تھا۔

”دیکھو ڈیز! جہاں تک میں سمجھتا ہوں تمہارا ملک چھوڑ کر امریکہ جانا محض حماقت ہوگی۔ تمہارے ساتھ اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے کہو میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں اور اگر تم ہدایتے ہوئے فلمی ماحول سے خنجر دھو تو مجھ سے شادی کر لو۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ فلمی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں تو تمہارے یقین اور اس سکون کے لیے میں وہ سب کرنے کو تیار ہوں جو تم چاہتی ہو تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ مہر تم جتنا چاہو میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں اور کیا چاہیے تمہیں۔ تم آخر کھل کر کچھ کیوں نہیں کہتی ہو۔ پلیز! میری محبت اور میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر تمہارے ساتھ کسی اور نے غلط کیا ہے تو اس کا بدلہ مجھ سے کیوں لیتی ہو۔ یا میری محبت پر یقین نہیں۔“

”محبت بتا نہیں کس کو کہتے ہیں یا کیا ہوتی ہے؟“ روبی نے دکھ سے کہا۔

”میں بتا سکتا ہوں۔ دکھا سکتا ہوں۔ تم یقین کر کے تو دیکھو۔ ایک موقع مجھ سے ملے کر تو دیکھو۔“ ذیشان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”سنو ذیشان! تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ تمہارے کہنے سے میں رک نہیں سکتی۔ اپنی ضروریات بندہ خود ہی بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں۔ یہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں کہ میرا ملک چھوڑ کر جانا کتنا ضروری ہے۔ اس لیے میں جاری ہوں۔ مجھے فیسوں ہے کہ میں تمہارے سامنے کسی قسم کی وضاحت نہیں کر سکتی۔ یوں بھی یہ سفر میری زندگی کا آخری سفر ہے اور میں اس سفر کو تمہارے کہنے سے ملتوی نہیں کر سکتی۔“ روبی نے پہلی بار ذرا خشک لہجہ اختیار کیا۔

”آخری سفر؟ کیا مطلب؟“ ذیشان نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں آخری سفر کیونکہ اس کے بعد میں کبھی لوٹ کر واپس یہاں نہیں آؤں گی۔ نہ زندہ، نہ ہی مردہ۔ وہیں دفن ہونے کا ارادہ ہے جہاں جاری ہوں۔ تمہارا خلوص تمہاری محبت اپنی جگہ مگر میں نے کہا نہیں رک نہیں سکتی۔“

اور بل میں سوچا میں تو اس کے لیے بھی نہیں رک سکتی جس کی محبت پر اب شک کی گنجائش ہی نہیں اور جس کو پانا کبھی میری زندگی کی اولین خواہش تھی۔ تمہاری محبت پر تو یقین ہی نہیں مجھے۔

”تمہاری ان باتوں کے باوجود آخری بار تمہیں سمجھانا اپنا غرض سمجھتا ہوں۔ اچھا نہیں روکتا میں تمہیں امریکہ جانے سے۔ صرف ایک بار کھل کر یہ بتا دو تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ وہ کیا حالات ہیں جن کی وجہ سے تم نے اچانک ملک چھوڑنے کا یہ فیصلہ کر لیا۔ میری محبت پر یقین نہیں، نہ سہی۔ دوستی پر تو شک کی گنجائش نہیں۔ پلیز! بتاؤ اصل بات کیا ہے؟“

ذیشان میز پر کہنیاں ٹکائے آگے کو جھک آیا اور روبی کچھ دیر اپنے سامنے جھکے ذیشان کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ پھر طویل سانس لے کر روبی

”وہ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی

دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں“

پھر وہ رکی نہیں۔ کرسی دھکیل کر اٹھی اور ذیشان کی سمت دیکھے بغیر صدر دروازے کی جانب بڑھتی ہی چلی گئی اور ذیشان انگلیوں میں سگریٹ دبائے اس کے پاس روپے پر غور ہی کرتا رہ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ذیشان روبی سے محبت کرتا تھا۔ مگر اندر کی بات یہ بھی تھی، روبی سے زیادہ محبت اس کو روبی کی شہرت، دولت اور جائیداد سے تھی۔ اس کو معلوم تھا۔ روبی کے پاس



بہت بینک بزنس ہے۔ تین کروڑ کی تو صرف یہ لکھی ہی تھی، جس میں وہ رہتی تھی۔ یہ بات بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ روپی کا تعلق بازار گناہ سے نہیں تھا۔ یوں بھی وہ بالکل تنہا تھی۔ روپی سے شادی کی صورت میں یہ سب ذیشان کا ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ہر قیمت پر روپی کا ہیکری کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر افسوس بات بن نہ سکی تھی۔

ویسے تو ذیشان خود بھی شو بیز کا ایک معروف نام تھا۔ مگر پچھلے تین، چار برس سے ہو یہ رہا تھا کہ اس کی صرف وہی فلمیں باکس آفس پر کامیابی حاصل کرتی تھیں جن میں اس کی ہیروئن روپی ہوتی تھی۔ نجانے کیلیات تھی۔ باقی کی سب فلمیں بری طرح نام کامی سے دو چار ہو رہی تھیں۔

ذیشان نے سوچا تھا شادی کے بعد اس کا پوری طرح روپی پر قبضہ ہو جائے گا کہ عورت تو عورت ہی ہوتی ہے۔ مرد شادی کے بعد اپنی ہر بات منوانے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ بھی شادی کے بعد روپی کو دوسرے ہیرو کے ساتھ کام کرنے سے منع کر دے گا۔ صرف اپنے ساتھ کام کرنے کی اجازت دے گا۔ یوں اس کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا مل جائے گا۔ مگر افسوس اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ روپی کو قائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ یوں اس کا سارا پلان فلاپ ہو گیا تھا۔ اور اب جس طرح روپی اس کو خدا حافظ کہے بغیر گئی تھی اس کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔ اس نے زیر لب ایک گندی سے گالی روپی کو دیتے ہوئے کہا۔

”ہونہہ نو سو چو ہے کھا کر چلی ہے بلی جج کرنے۔ تو میل عورت بتا نہیں خود کو کچھتی کیا ہے؟ جہنم میں جاؤ۔“ اور خود بھی مارے غصے کے کرسی اٹھو کر مار کر کھڑا ہو گیا۔ روپی ہونٹ سے نکل کر پارکنگ ایریا میں آئی۔ اپنی کار نکالی اور سیدھی گھر چلی آئی۔ اس کو دیکھتے ہی اماں نے کھانا میز پر چین دیا۔ جانتی تھی بے شک آدھی رات ہو جائے کھانا اس نے گھر سے باہر کبھی نہیں کھایا تھا۔ اور روپی بھی چھینچ کر کے کھانے والی ٹیبل پر آ بیٹھی تھی۔

”بی بی جی! آج آپ نے کسی مستری کو نہیں بھیجا کام کرنے کیلئے۔“ اماں نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

”کھانا کھاتے ہوئے روپی نے اماں کو دیکھا مگر جواب دینے کی زحمت کو ارا نہیں کی تھی۔“ اور اماں سمجھ گئی، ابھی اس کا بولنے کا موڈ نہیں۔ وہ کھاتی رہی اور اماں پاس کھڑی دیکھتی رہی۔

جب روپی کھانے سے فارغ ہو گئی تو اماں نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ ”بی بی جی! میں نے آپ سے کچھ پوچھا تھا؟“

”کیا پوچھا تھا؟“ روپی نے ٹینکین سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اماں کو دیکھا تو اماں نے کہا۔

”رات آپ نے سب کچھ ہی توڑ ڈالا تھا۔ مگر آج کام کرنے کو مستری نہیں بھیجا۔ روم کی حالت کباڑ خانے جیسی ہو رہی ہے۔ آپ کیسے رہیں گی اس کباڑ خانے میں۔“

”کباڑ خانے جیسی ہو رہی ہے تو ہوتی رہے، تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہی میری اس کباڑ خانے میں رہنے کی بات تو تم دس برس سے میرے قریب رہ کر مجھے نہیں سمجھ سکی ہو۔ یہ شہرت، یہ دولت، یہ اسٹیٹس اور اعلیٰ معیار زندگی..... میں ان کی تمنائی تو بھی بھی نہ تھی۔ جو چیز جس نام بھی مل جائے میں اسی کے ساتھ ایڈ جسٹ ہو جاتی۔ مگر.....“ وہ نجانے کیا کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ کافی دیر سوچ میں گم رہی، پھر گہری سانس لے کر بولی۔

”اماں تم میری فکر مت کرو۔ اس ٹوٹے بھوٹے روم میں تو کیا میں کسی ویران کھنڈر میں بھی بڑے آرام اور سکون کے ساتھ رہ سکتی ہوں۔“

اماں نے حیران ہو کر روپی کو دیکھا پھر کہا۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے، بی بی جی! مگر پھر بھی برا لگتا ہے۔ آخر پہلے بھی تو مستری آ کر سب بنا دیتا تھا۔ کل یاد سے مستری بھیجے گا۔“

روپی اماں کو اپنی رواجی کا بتانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اب مجبوری ہو گئی تھی۔ اس لیے روپی کو بتانا پڑا۔

”اماں! آج میں نے مستری اس لیے نہیں بھیجا کہ میں یہ گھر، یہ شہر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس ملک سے جا رہی ہوں۔ یہ گھر اب سدا یونی رہے گا۔ اب آپ اس گھر کی فکر کرنی چھوڑ دیں۔“ کہہ کر وہ اٹھی اور سیدھی اپنے روم میں آئی۔ چند لمبے روم کے وسط میں کھڑی روم کی حالت دیکھتی رہی، پھر بستر پر چلی آئی۔ سارا دن بڑی گزرا تھا۔ اب شدید ٹھکن ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد سونا چاہتی تھی۔ مگر آنکھیں بند کرنے کے باوجود نیند آنکھوں سے بہت دور تھی۔

روپی کے اپنے روم میں جاتے ہی اماں نے برتن سمیٹ کر رکھے، پھر روپی کے بارے میں سوچنے لگی۔ کافی دنوں سے وہ روپی کے رویے میں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ مگر اماں کو معلوم نہ تھا کہ یہ تبدیلی اتنی بڑی ہو گئی۔ وہ اس ملک کے ساتھ ساتھ اس کو بھی اکیلی چھوڑ جائے گی۔ دس برس اس کے ساتھ رہنے سے اماں اب اس کی عادی ہو چکی تھی۔ اب اس کے بغیر رہنے



کاسوچ کراماں اداں ہونے لگی تھی۔ اگرچہ ماں نے اس کو جہنم نہیں دیا تھا۔ لیکن اگر ماں کی اپنی کوئی اولاد ہوتی تو وہ بالکل اسی طرح اس کا خیال رکھتی جس طرح روہی کا رکھ رہی تھی۔

اماں ایک بے اولاد عورت تھی۔ شادی کے 20 سال بعد شوہر فوت ہو گیا تھا۔ وہ زندہ ہی تھا جب سے ماں لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اس کا اور اپنا خرچہ اٹھاتی تھی کہ شوہر ایک بے کماؤ شخص تھا۔ یونہی لوگوں کے گھروں میں کام کرتے اس کا ایک نئی اداکارہ کے گھر کام کرنے کا موقع ملا۔ میسے بھی زیادہ ملے اور رہائش بھی مل گئی تھی۔ مگر چند ماہ بعد ہی اس کی کوئی چیز گم گئی۔ ماں سے پوچھا۔ ماں نے اٹھائی ہی نہ تھی قرار کیسے کرتی۔ چیز قیمتی تھی۔ اداکارہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس پاگل پن میں ماں کے منہ پر تھپڑ مار کر بولی۔

”مائی دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔“ یوں ماں نے اس کا گھر چھوڑ کر ایک گلوکارہ کے ہاں ملازمت کر لی۔ یونہی خوار ہوتے ہوتے وہاں آخر روہی کے گھر پہنچ گئی تھی اور دس برس سے روہی کے ساتھ تھی۔ روہی ماں پر اعتبار کرتی تھی۔ مگر ضرورت سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ تاہم وہ بزرگ سمجھ کر ماں کی بے حد عزت کرتی تھی۔ اس لیے ماں بھی اس کو بے حد عزیز رکھتی تھی۔ اور اب وہاں کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔

اماں کافی دیر سوچتی رہی۔ پھر برتن دھونے کے بعد ہاتھ پونچھتے ہوئے روہی کے دم میں چلی آئی۔ روہی آنکھوں پر بازو رکھے بیڈ پر چٹ لیٹی تھی۔ ماں سوچ میں پڑ گئی۔ مخاطب کرے یا نہ کرے کہیں آنکھ نہ لگ گئی ہو اور نیند خراب ہونے پر خفا نہ ہو جائے۔

اماں ابھی اسی سوچ میں تھی کہ روہی نے خود ہی ماں کی مشکل آسان کر دی۔

”کیلیات ہاں؟ کیوں آئی ہو اس وقت میرے روم میں؟ اس نے قدموں کی آہٹ فل کرتے ہی آنکھوں سے بازو ہٹائے بغیر کچھنا کواری سے پوچھا۔ تو ماں نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بی بی! میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کیا آپ سچ سچ جا رہی ہیں؟“

”مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“ اب کے روہی نے آنکھوں سے بازو اٹھا کر ماں کو گھورتے ہوئے تنخی بھرے لہجے میں کہا۔

”وہ جی میرا مطلب ہے کیا واقعی آپ جا رہی ہیں۔“ سب کچھ سننے کے باوجود ماں نے ایک بار پھر حماقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

روہی کو غصہ تو بے حد آیا مگر ضبط کرتے ہوئے نرمی سے بولی۔

”ہاں ماں! میں مستقل یہ ملک چھوڑ کر اسی ہفتے امریکہ جا رہی ہوں۔ تم کیوں بار بار پوچھ رہی ہوں۔ میرے جانے یا نہ جانے سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔“

”بی بی جی! اماں نے بمشکل آنسو ضبط کرتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔

”اماں میرے ساتھ یہ ڈرامہ مت کرو کیا فرق پڑے گا تمہیں۔“ روہی کے لہجے میں تنخی کھل گئی۔ ”کسی کے آنے سے، کسی کے جانے، کسی کے زندہ رہنے یا مر جانے سے۔ میرا

مطلب ہے یہاں کچھ بھی ہو جائے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ ہر بندہ اپنی ذات اور مفاد کا غلام ہے۔ سب اپنے حال اور کھال میں مست رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ

ہوتا تو کیا میں یہاں یوں تنہا زندگی بسر کر رہی ہوتی۔“ وہ چند لمحے رکی کو یا آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر بولی۔

”یقین کرو تمہیں بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں البتہ دس برس کا ساتھ ہے اس لیے تم چند روز اداسی ضرور فل کرو گی اور پھر سب بھول جاؤ گی۔ اور فرض کرو اگر فرق پڑتا بھی ہے تو

مجھے کیا پروا۔ مجھے تو ہر حال میں اس شہر اور ملک کو چھوڑ کر جانا ہے۔“ روہی کا لہجہ خشک ہو گیا۔ ماں بیشک دس برس سے اس کے ساتھ تھی مگر اس کا ماں کے ساتھ صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ

وہ گھر کی صفائی ستھرائی کر کے کھانا وغیرہ دینے بغیر ضرورت کے روہی نے کبھی ماں سے بات بھی نہ کی تھی۔

وہ چونک پڑی ماں کہہ رہی تھی۔

”یہ تو اپنی اپنی سوچ ہے بی بی جی! جو جیسا چاہے فل کرے۔ آپ کے لیے میری جدائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مگر مجھے تو آپ کے جانے سے بہت فرق پڑے گا۔ آپ جلی گئیں

تو میں کیا کروں گی۔ کہاں پر رہوں گی؟“ اماں دل کی بات زبان پر لے آئی۔

”اوہ تو اصل بات یہ ہے۔ اس میں پریشانی کیسی اماں؟“ روہی بالآخر اٹھ بیٹھی۔ تم جس طرح میرے یہاں کام کرتی ہو یونہی کسی دوسرے گھر میں شروع کر دینا۔ بلکہ اگر تم کہو تو

میں تمہارے لیے کسی گھر کا بندوبست کرتی جاؤں گی۔



اماں اس کی باتیں سن کر کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر ٹھوس لہجے میں کہا۔

”کام تو میں خود بھی بہت سارے گھروں میں تلاش کر سکتی ہوں مگر۔“ اماں سانس لینے کو روکی تو روبی نے تیز لہجے میں کہا۔

”اگر یہی بات ہے تو پھر کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ کیوں مجھے شرب کر رہی ہو۔ معلوم نہیں میں سارے دن کی ٹھکی ہوئی آئی ہوں اور اب سو ناچا ہتی ہوں۔“

”مسئلہ تو کوئی نہیں حقیقت ہے۔ اور یہ حقیقت یہ ہے بیٹی کہ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

اماں نے دس برس میں پہلی بار اس کو بیٹی کہا تھا۔ ورنہ ہمیشہ بی بی جی ہی کہتی تھی کیونکہ اس کی مالکین خود کو بیٹی کہلانا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کلافٹ بیٹی سے شدید نفرت تھی۔ انوکھی لڑکی تھی وہ اس کو محبت سے نفرت تھی۔ اپنائیت سے نفرت تھی۔

”تم نے مجھے بیٹی کہا؟“ روبی نے خود کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے۔ بیٹی میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی کیونکہ تم اکیلی ہو۔“ اماں نے محبت سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے بیٹی مت کہو اور میرے اکیلے ہونے کی فکر مت کرو۔“ روبی اماں کی بات کاٹ کر نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

”میں اکیلی پوری دنیا سے پیٹ سکتی ہوں۔ میں خود اکیلی رہنا چاہتی ہوں، کیونکہ میں کسی سہارے کسی دوست کسی رشتے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ میں یہ سب کا مارا کر رہی نہیں سکتی۔ میں اکیلی رہنے کی عادی ہوں۔ میں تو پیدا ہی اکیلی رہنے کے لیے ہوئی تھیں۔ میں تو۔۔۔۔۔ میں تو۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئی کتا آواز بھر گئی تھی۔

اماں نے ہمدردی سے روبی کو دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔

”تم کچھ بھی کہو اصل بات تو یہ ہے کہ میں خود تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے جیسے تو میری ہی بیٹی ہے اور ایک ماں جو ان بیٹی کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں بھی اپنی بیٹی کو تنہا نہیں جانے دوں گی۔ تمہیں ہر حال میں مجھے ساتھ لے کر جانا ہوگا۔“

”پلیز اماں! خاموش ہو جاؤ۔“ روبی مارے کرب کے چیخ پڑی۔ ”مت کہو مجھے بیٹی! ایسی باتیں مت کرو، مت کرو ایسی باتیں۔ اتنا پیارا اتنی محبت تو میرے سگوں نے بھی مجھ سے نہیں کی تھی۔ وہ جن کا میں خون تھی۔ جن کے وجود کا میں حصہ تھی۔ اتنا پیارا تو انہوں نے بھی مجھ سے نہ کیا بلکہ اتنا سا بھی نہ کیا کہ میں بھی ان کو یاد ہی کر لیتی۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔

”میں نہیں جانتی انہوں نے ایسا کیوں کیا مگر میں تو اپنی بیٹی سے بے حد پیار کرتی ہوں۔ اب تم کچھ بھی کہو مگر میرا فیصلہ یہی ہے۔ اگر تم ملک چھوڑ کر جاؤ گی تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔“ اماں نے گویا یکطرفہ فیصلہ سنا دیا۔ تو روبی پھر آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہاں کو کیسے سمجھائے۔ اماں جو چاہتی تھی وہاں ممکن تھا۔ بہت سارا نام یونہی گزر گیا۔ اماں اس کے جواب کی منتظر وہیں گھڑی اس کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ آخر میں اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ بیٹی! ایک اکیلے سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنا دکھ سکھ کہہ سن لیا کریں گے۔ تو میری بات سمجھ رہی ہے نا۔“

اماں کی بات سن کر روبی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں تو تمہاری بات سمجھ رہی ہوں مگر افسوس تم میری بات نہیں سمجھ رہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ مجھے اپنا دکھ سکھ کسی سے کہنے کی عادت نہیں۔ تم دس برس سے میرے ساتھ ہو تمہیں میری اس عادت کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہوگا۔ دوسرا اماں تم اگر سمجھتی ہو میں جہاں بھی رہوں گی وہاں ایسی ہی عیش و عشرت کی زندگی ہوگی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ہو سکتا ہے اپنے وطن سے دور مجھے بھوکا پیاسا رہنا پڑے۔ نرم فوم کے بیڈ کی بجائے فٹ پاتھوں پر سونا پڑے۔ تم کہاں میرے ساتھ خواہ ہوئی ہوگی۔ یہاں کسی گھر میں ملازمت کرو اور اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن امن و سکون سے بسر کرو۔“

”بیٹی! روزی دینے والی تو خود خدا کی ذات ہے۔ تم میری فکر مت کرو۔ وہ مجھے تمہارے ساتھ جس حل میں بھی رکھے گا میں خوشی خوشی رہاؤں گی۔ کوئی شکوہ نہ کروں گی۔ بس تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ اماں نے امید بھری نگاہوں سے روبی کو دیکھا۔

روبی چند لمحاں کو دیکھتی رہی پھر نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولی۔



”اماں یہ بات اتنی آسان نہیں۔ ایک ہفتہ کا اندراب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ آئی ایم سوری تاہم میں آپ کے لیے کسی گھر کا بندوبست لازمی کرتی جاؤں گی۔“

”بات گھر کی نہیں، محبت کی ہے۔ تمہاری ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ اماں رونے لگی مگر روپی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے اماں کو گھورتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”اماں! فضول باتیں کر کے میرا دماغ خراب مت کرو۔ مجھ سے پہلے بھی تو تم رتی آئی ہو۔ پھر اب کیا تکلیف ہے تمہیں۔ میرے بعد بھی تم اسی طرح زندہ ہو گی۔ جاؤ میرے دردم سے۔“ اور اماں روتے روتے ہی باہر چلی گئی تھی۔ اماں کے باہر جاتے ہی روپی نے اسی نام اپنے سیکرٹری کفون کر کے اپنی روانگی کا پوچھا تو پتا چلا کہ ٹکٹ اوکے ہو گیا ہے اور پرسوں صبح کی فلائٹ سے اس کا اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔

یہ سب سن کر روپی نے اطمینان کی کبری سانس لیتے ہوئے فون بند کر دیا اور آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ مگر نیند آنکھوں سے اب بھی بہت دور تھی۔ حالانکہ سارا دن کام کرنے کی وجہ سے وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔

چند ماہ پہلے تک شو بزا اور ملک چھوڑنے کے بارے میں روپی نے سوچا تک نہیں تھا۔ وہ بڑے سکون سے اپنی زندگی جی رہی تھی۔ مگر ایسے میں بلال نے ایک بار پھر اس کے سامنے آ کر اس کو شرب کر دیا تھا۔

روپی نے بچنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر بلال اپنے پہلے رویے کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا اور یہ کفارہ ادا کرنے کے لیے وہ اپنی خاندانی حیثیت، عزت اور وقار بھول گیا تھا۔ روپی کو حاصل کرنے کے جنون میں وہ اپنی سچ اور مقام سے بہت نیچے آ گیا تھا۔ وہ ہر بات سے لاپرواہا سارا نام اس کی تلاش میں لاہور کے ہر سٹوڈیو کی خاک چھان رہا تھا۔ اس کو دیکھنا اور حاصل کرنے کے لیے خوار ہو رہا تھا۔ حالانکہ روپی نے صاف صاف انکار کرتے ہوئے کھل کر بلال کو بتایا تھا۔

”ذلت اور رسوائی کے جس مقام پر میں ہوں اس پر تمہیں اب اپنے ساتھ کھڑا نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اب میں تمہارے اور تمہارے بے حد معزز خاندان کے لائق نہیں رہی۔“ مگر وہ اس کی بات مان نہیں رہا تھا۔ کو کہ گھر چھوڑنے اور شہرت حاصل کرنے کے بعد وہ ہر لمحہ اس انتظار میں رہی تھی کہ اس کی کاش زندگی میں ایک بار بلال سے ملاقات ہو جائے اور یہ ملاقات تو ہو گئی تھی۔ مگر ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی اور اب روپی سوچتی تھی۔

اے کاش! اس نے بلال سے ملنے کی دعائیں نہ مانگی ہوتیں کہ وہ بلال جو روپی سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اب وہ اس کی محبت میں مارے دیوانگی کے سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ روپی کا بس اس پر ترس آنے لگا تھا۔ کبھی اس نے لڑکی ہونے کے باوجود اس کو حاصل کرنے کے لیے ساری شرم و حیا کے باوجود خود کہا تھا۔

”بلال! مجھے آپ سے محبت ہے، بے حد شدید قسم کی۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پلیز! مجھے غلط نہ سمجھیں۔“ روپی کی بات سن کر وہ ہنسنا تھا۔ پھر روپی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے کٹ دار اور توہین آمیز لہجے میں پوچھا تھا۔

”مجھے سے پہلے کتنوں کو اپنی اس شدید محبت سے نواز چکی ہو، بتانا پسند کرو گی۔“

روپی نے اس وقت بھی بلال کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ وہ اس کی پہلی اور شاید آخری محبت بھی ہے۔ ”آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مگر وہ مزید کچھ سننے کی بجائے بڑی بے رحمی سے اس کو ٹھکرا کر ایسٹ آبا دوا پس چلا گیا تھا اور اب جب بہت سالوں بعد ہونے والی اس ملاقات میں بلال نے اس کو بتایا تھا۔ وہ اب اس سے نفرت نہیں محبت کرتا ہے۔ اس کی غلط فہمی دور ہو چکی ہے۔“

تو روپی نے ایک بار پھر اس کو سمجھانے اور بتانے کی کوشش کی تھی کہ اس کی محبت اپنی جگہ مگر۔ ”میں اب تمہارے لائق نہیں رہی۔“

مگر وہ ایک بار پھر اس کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح ایک بار پھر اپنی ضد پر قائم تھا۔ اس کو پانے کی ضد پر۔ وہ کسی طور بھی روپی کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا اور اب ایک بار پھر روپی کو ہی فیصلہ کرنا تھا۔ اور اس نے پوری ایمانداری سے فیصلہ کیا تھا۔

بلال کو خود سے بچانے کیلئے اور خود بلال سے بچنے کیلئے روپی کے پاس بس یہی ایک راستہ بچا تھا کہ وہ شو بزا تو کیا اس ملک کو بھی ہمیشہ کیلئے چھوڑ دے کہ اس کے بغیر بلال اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اور یہ فیصلہ کرتے ہی روپی نے جسکے جسکے ملک چھوڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں تھیں۔

اس نے نئی فلمیں سائن کرنی چھوڑ دی تھیں اور زیر تکمیل فلموں کا بچا کچھا کام تیزی سے مکمل کروانے لگی۔ تاہم بتایا ابھی کسی کو بھی نہیں تھا کہ وہ یہ ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی



ہے۔ اس خوف سے کہ میڈیا والوں کے ہاتھ میں یہ خبر لگی تو بلال کو بھی بتا لگ جائے گا اور اس کو روکنے کیلئے وہ بچانے کا کچھ کر گزرے۔

وہ بلال جو بھی اس کا محبوب تھا۔ محبت تھا۔ پھر جب یہ محبت نفرت میں بدلی تو بلال کی اس نفرت میں روپی نے اپنا گھر اور سارا خاندان ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ بلال کی محبت میں یہ ملک اور اس ملک میں بسنے والے اپنے لاکھوں چاہنے والے پرستاروں کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ پہلا گر گھر چھوڑنا اس کی مجبوری بن گیا تھا تو اب ملک چھوڑنا مجبوری تھی۔ وہ سترہ برس کی ایک بے حد خوبصورت دھنیزہ تھی۔ جب وہ پہلی بار اس کی زندگی میں آیا اور بلال کو دیکھتے ہی روپی سو جان سے اس پر فدا ہو گئی تھی بلکہ مر گئی تھی۔ پہلی بار وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی اور بلال کے غلط رویے کی وجہ سے پھر یہ محبت نفرت میں بدل گئی اور محبت نفرت کے اس کھیل میں بلال کے اپنی زندگی میں پہلی بار آنے کی قیمت روپی کو ہمیشہ کیلئے اپنا گھر اور پورا خاندان چھوڑ کر ادا کرنی پڑی تھی اور تب بھی سچی بات یہی ہے کہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اور اب بارہ برس بعد وہ پھر اس کی زندگی میں آیا تھا اور بلال کے اس دوبارہ آنے اور ملنے کی قیمت اب اس کو یہ ادا کرنی پڑی کہ پہلی بار اگر اپنا گھر اور خاندان چھوڑا تھا تو اب ہمیشہ کے لیے اپنا ملک چھوڑ کر جا رہی تھی۔ روپی نے سوچا۔

”کاش! بلال تم میری زندگی میں کبھی نہ آتے۔ تمہارے آنے کی قیمت ہر بار مجھے ہی ادا کرنی پڑتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ تم تیسری بار میری زندگی میں آؤ۔۔۔ اور تمہارے اس تیسری بار آنے کی قیمت مجھے اپنی جان اور یہ دنیا چھوڑ کر دینی پڑے۔ پھر اس نے دکھ سے سوچا۔

پرسوں جب میں یہ ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گی تو میرا کوئی بھی اپنا مجھے الوداع کہنے کے لیے سڑ پورٹ پر موجود نہیں ہوگا۔ وہ منظر دیکھ کر کتنا اذیت ناک ہوگا۔ مانی فٹ۔ جب خود ہی سب کو چھوڑ دیا تو پھر یہ سوچنا اور یاد کرنا کیسا اس نے نفرت سے سر جھٹک کر ان سوچوں اور یادوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر یہ کیا آج تو بلال کے ساتھ ساتھ سب گھر والے بھی یاد آنے لگے تھے۔ حالانکہ کتنے ہی برس بیت گئے تھے گھر اور گھر والوں کو چھوڑے ہوئے۔ روپی نے بھی ان کو یاد کرنے کی زحمت نہ کی تھی کہ وہ ان میں سے کسی کو بات کرنے کے قابل سمجھتی ہی نہ تھی۔ مگر آج ان یادوں سے بچنے کی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش شروع کر دی اور جب ناکام رہی تو اٹھ کر درم میں ٹھیلنے لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی جب بلال دوبارہ ملے گا تو روپی کے دل میں موجود اس کی نفرت محبت میں بدل جائے گی۔ ٹھیلے ٹھیلے روپی نے ریڈیو آن کیا اور خود ٹوٹی ہوئی کھلی کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی اور چہرہ دھٹکا کر اوپر آسمان کو دیکھنے لگی۔ کل طوفانی رات تھی تو آج بہت دلکش خوبصورت چمکتی تاروں بھری رات تھی۔ بلکہ ساتھ چودھویں کا چاند بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

روپی نے ٹھکی ٹھکی سانس لے کر سوچا۔ یہ چاندنی راتیں تو میرا مقدر بھی تھیں نہ بن سکتی تھیں۔ اس کی ہر رات طوفانی رات تھی۔ اچانک وہ چونک کر ریڈیو کی سمت متوجہ ہو گئی۔ پتا نہیں کونسا چینل تھا۔ اس نے تو اپنی سوچوں سے پیچھا چھوڑنے کے لیے ریڈیو آن کیا تھا اور اب شوکت علی کی آواز سن کر چونک پڑی تھی۔ وہ ایوب رومانی کا خوبصورت کلام گارہا تھا۔ روپی کو شوکت علی کی آواز سخت ناپسند تھی۔ کرخت اور بے حد خشک خشک سی مگر اس غزل کو وہ بڑی محنت سے گارہا تھا۔ آواز میں نرمی اور ملائمت تھی۔ شاعری بھی اچھی تھی اور سب سے اچھی کمپوزیشن تھی۔ جس نے ایوب رومانی کی شاعری کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہ پوری توجہ سے سننے لگی

صبح گل چھوڑ چلا مل میرا پاگل نکلا  
جب بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا

وہ جن یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اٹھی تھی۔ شوکت علی اس کو پھر اسی ماحول میں لے جا رہا تھا۔ اس نے جلدی ریڈیو بند کیا اور پھر بستر پر آ لیٹی اور فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ مگر یہ سب بیکار ثابت ہوا تو روپی نے بے بسی سے سوچا۔

اب جب پرسوں یہ شہر اور ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہوں تو پھر آخری بار ان سب کو یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ پھر اچانک اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”ماں! اور آنسو ٹپ آنکھوں سے گرنے لگے۔ کیا وہ سب زندہ ہوں گے۔ ماں، باپ، بھائی، آپا۔۔۔ اور۔۔۔ اور سب سے چھوٹی بیلادی سی مٹی سی زوپی۔ خدا کرے وہ سب زندہ ہی ہوں۔ اپنے آپ دل سے یہ دعا نکلی تھی۔“



وہ کل چار بہن بھائی تھے۔ ایک بھائی اور تین بہنیں اور ان کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ باپ نصیر ملک کا اپنا ذاتی برنس تھا اور بڑی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ نصیر ملک کی شادی ان کی سگی خالہ زاد شمشاد سے ہوئی تھی۔ دونوں نے شادی سے پہلے نہ صرف ایک دوسرے کو دیکھا ہوا تھا بلکہ ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے بھی تھے۔ یہی وجہ ہے شادی کے بعد زندگی بے حد خوشگوار رہی۔ خاندان بھر میں ان کی جوڑی اور محبت کی مثال دی جاتی تھی۔ دونوں میاں بیوی تھے بھی بے حد خوبصورت۔ نصیر ملک کم کو تھے جبکہ شمشاد بیگم باتیں کرنے کی بے حد شوقین اور خاندان بھر میں اپنے بچوں اور خوکونما یاں رکھنے کا شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا۔ اپنے بچوں اور خاص کر اپنے لباس کا بہت زیادہ خیال رکھنے والی اور کافی حد تک فضول خرچ تھی۔

نصیر ملک کو پہلی اولاد خدا نے بیٹی کی صورت میں دی تھی۔ اور وہ بیٹی پا کر از حد خوش تھے کہ بیٹی خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ بہت محبت سے انہوں نے بیٹی کا نام روجی رکھا اور روجی پہلی اولاد ہونے کے نام طے ماں باپ کو کچھ زیادہ ہی عزیز بھی۔ دوسری اولاد سلیمان تھا۔ تیسری روہی اور آخری اولاد چھوٹی روہی تھی۔ اس کے بعد مزید کوئی بچہ نہ ہوا۔ اب روجی اگر پہلی اولاد ہونے کے نام طے ماں باپ کو بے حد عزیز تھی تو سلیمان اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے بہت لاڈلا تھا۔ اور روہی سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے سبھی کو پیاری تھی۔ باقی رہی روہی تو تیسرے نمبر پر ہونے کی وجہ سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ سوائے باپ کے روہی کسی کو عزیز نہ تھی۔ باپ کو وہ سب سے زیادہ پیاری تھی۔ بقول ان کے روہی بھائی کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے یہ خاص کر بھائی کی بہن ہے۔ کیونکہ اس کو بھائی اپنے ساتھ لایا تھا۔ روہی یہ سن کر بہت خوش خوش پھرتی تھی۔ تاہم یہ اور بات تھی کہ گھر میں اس کی پروا کوئی نہیں کرتا تھا۔ مگر روہی نے بھی اس بات کو فیل کیا یہ نہ تھا۔ نصیر ملک پرانے مزنگ میں موجود اپنے چھوٹے سے آبائی گھر میں رہتے تھے۔ بلکہ ان کا سارا خاندان شروع ہی سے مزنگ میں رہ رہا تھا۔ تائے، چاچے، چھوچھو اور بھی بہن بھائی، کہ ان سب بہن بھائیوں کی شادیاں خاندان کے اندر ہی طے ہوئی تھیں۔ شروع میں تو ان کو گھر چھوٹا ہونے کا احساس نہ ہوا۔ لیکن اب بچے بڑے ہو رہے تھے اور نصیر ملک محسوس کرنے لگے تھے کہ گھر چھوٹا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ انہوں نے وقت ضائع کیے بغیر ایک نئی بننے والی سکیم میں دس مرلے کا ایک پلاٹ لیا۔ اور جلد ہی تین بیڈرومز اور ایک ڈرائنگ روم کا گھر بنا کر اس میں شفٹ ہو گئے۔ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے پر وہ سب بہت خوش تھے۔ خاص کر بچے کھلے گھر میں آ کر زیادہ خوش تھے۔

وہ کل چار بہن، بھائی تھے۔ مگر گھر، خاندان اور محلے میں جو عزت، وقار اور مقام روجی کو ملا وہ کسی اور کا مقدر نہ بن سکا۔ وہ بھی بہت نیک، صاف ستھری، نگہ اور محنتی۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے سارے گھر کا کام سنبھل لیا تھا۔ وہ دم گھر کو شیشے کی مانند چمکا کر رکھتی تھی۔ بچل ہے جو گھر میں کوئی چیز بے ترتیب نظر آئے۔ اور کھانا ایسے مزے کا بناتی کہ لوگ انگلیاں چامتے رہ جاتے۔ سلائی کڑھائی ایسی کرتی، کیا ٹیلر ماسٹر کرتا ہوگا۔ گھر میں ہر آنے والا دل کھول کر روجی کی تعریف کرتا۔ کتنی نیک اور نگہ پرانی ہے۔ شمشاد بیگم یہ سب سن کر بہت خوش ہوتی۔ ان کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا۔ اور روجی نے سارا گھر سنبھل کر ان کو گھر کی فکر سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ روجی پر اندھا اعتبار کرتی تھیں۔

یہ تو تھیں روجی کے ظاہر نگہ پران کی باتیں۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اکیلی ہر گز سارا گھر نہیں سنبھالتی تھی۔ روہی چھوٹی ہونے کے باوجود ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی یا بتانے پر مجبور تھی کہ روجی بہت سخت مزاج تھی۔ بچوں سے انکار سننا اس کی عادت نہیں تھی۔ انکار کی صورت میں وہ مار مار کر چھوٹی سی روہی کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی تھی۔ اور پھر گھر میں کسی کو بتانے یا شکایت کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ گو کہ گھر کا سارا کام بظاہر روجی کرتی تھی۔ مگر کچھ اس طرح کے فرس دھور روجی رہی ہے تو خشک روہی کر رہی ہے، برتن بھی اس طرح دونوں مل کر صاف کرتی تھیں۔ کپڑے دھلائی کے بعد چھت پر ڈالنے کا کام روجی کا تھا۔ اور خشک ہونے پر اتارنے کا کام روہی کا تھا۔ سارے گھر کی ڈسٹنگ چھٹی والے دن روہی کی ذمہ داری تھی۔ غرض سارا دن روہی اپنے چھوٹے، چھوٹے ہاتھوں سے روجی کے ساتھ مل کر بڑے بڑے کام کرتی تھی۔ اور سکول کی ذمہ داری اس کے علاوہ تھی۔

تاہم یہ الگ بات تھی کہ چھوٹی ہونے کی وجہ سے روہی کسی کو کم ہی دکھائی دیتی تھی۔ یا پھر یہ رچی کی چالاکی تھی کہ کسی آئے گئے کے سامنے وہ روہی سے کم ہی کام لیتی تھی۔ تا کہ بتا چلے کہ سارے گھر کا کام وہ اکیلی ہی کرتی ہے۔ یہ تو تھیں روجی کے نگہ پران کی باتیں۔ اب آتے ہیں اس کے کردار اور مزاج کی جانب تو اندر کی بات یہ تھی۔

روہی اندر سے ایک از حد رو میٹنگ لڑکی تھی۔ سارے مالے مالے پڑھنا، ڈرامے اور برائی آنے والی فلم دیکھنا اور میوزک سننا اس کی ہابی تھی۔ سارا گھر سنبھالنے کے باوجود گھر کا کام کرنے کے باوجود ٹھکن کا احساس اسے چھوٹا بھی نہیں تھا۔ وہ بہت فریش موڈ کے ساتھ ہر وقت گڑیا کی طرح سچی، مہنی، مسکراتی، گنگنااتی رہتی۔ روجی نے 13 برس کی عمر میں ایک لڑکے سے محبت کی تھی۔ تب وہ آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ اور مزنگ میں رہتی تھی۔ تین برس تک یہ محبت چلتی رہی۔ وہ اکثر سکول سے چھٹی کر کے بیگ ساتھ لیے اس لڑکے کے ساتھ گھومنے چلی جاتی



تھی۔ پھر اچانک وہ لڑکا کچھ بتائے بغیر روجی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اور اس کے بعد روجی نے محبت کرنے والی غلطی دوبارہ نہیں کی تھی۔ لیکن جب مزنگ چھوڑ کر وہ لوگ اس نئے گھر میں شفٹ ہوئے۔ نئے گھر میں شفٹ ہونے کے دوسرے ہی دن روجی کی ملاقات غزالہ سے ہوئی۔ جس نے فوری طور پر روجی کی زندگی پر بے حد گہرا اثر ڈالا تھا۔ یہاں نے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ خبر روزے کو دیکھ کر خبر روزہ رنگ پکڑتا ہے۔ یہی معاملہ روجی اور غزالہ کا ہو گیا تھا۔

غزالہ بہت بے باک اور کافی حد تک آزاد خیال لڑکی تھی اور بے باک قسم کی ہی وہ باتیں کرتی تھی۔ ذرا سی بھی شرموہیا غزالہ میں نہیں تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں سامنے والی شخصیت کو اپنے زیر اثر کر لیا، یا اپنے رنگ میں رنگ لیا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اور روجی تو خود بھی اندر سے از حد رویخک لڑکی تھی۔ اس لیے روجی کو اپنے رنگ میں رنگنا غزالہ کے لیے زیادہ مشکل بات نہ تھی۔

روجی کو غزالہ کی لچر قسم کی گفتگو از حد پسند تھی۔ وہ دونوں رومانی قسم کے ناول پڑھ کر ان پر خوب دل کھل کر ڈسکس کیا کرتی تھیں۔ اور کبھی کبھی خود بھی ان کرداروں میں ڈھل جانے کی خواہش کیا کرتی تھیں۔ کچھ ان کتابوں کا اثر تھا۔ کچھ تنہائی کا کہ ماں گھر میں ذرا کم ہی ہوتی تھی۔ باقی غزالہ کی صحبت کا، جس نے روجی کو بھی آزاد خیال بنا دیا تھا۔ اور وہ محبت جیسی غلطی دوبارہ سے کرنے کا سوچنے لگی تھی۔

غزالہ سے روجی کی پہلی ملاقات نئے گھر میں شفٹ ہونے کے دوسرے ہی دن یوں ہوئی کہ غزالہ کا گھر ان کے گھر سے دو چار پلاٹ ہٹ کر تھا۔ چونکہ یہ ایک نئی رہائشی اسکیم تھی۔ اس لیے ابھی اکا کا گھر ہی بنے تھے۔ بہت سارے پلاٹ ان کے گھر کے ارد گرد خالی پڑے تھے۔ اور کچھ پر دور نزدیک گھر بن بھی رہے تھے۔

روجی کو اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے ابھی دوسرا دن تھا۔ جب غزالہ اور اس کی چالاک والدہ ان سب سے ملنے خدان کے گھر آئیں۔ شمشاد بیگم تو پہلے ہی باتیں کرنے کی بے حد شوقین تھیں۔ ان کی آمد پر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ اور چائے پر حسب عادت نمایاں ہونے کے چکر میں بہت سارے لوازمات کا اہتمام کیا تھا۔ اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد شمشاد بیگم تو غزالہ کی والدہ خلدہ سے باتوں میں محو ہو گئیں۔ اور غزالہ کو روجی اپنے ساتھ اپنے روم میں لے گئی۔ اب شمشاد بیگم باہر برآمدے میں بیٹھی خلدہ سے باتوں میں مصروف تھیں۔ اندر روم میں غزالہ اور روجی، جبکہ دہلی اور زوہبی لان میں کھیل کود میں مصروف تھیں۔

”آپ کا نام کیا ہے؟ اور آپ کیا کرتی ہیں؟“ روجی نے غزالہ کے ساتھ اپنے صوفہ کم بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بڑے ادب آداب سے بات شروع کی۔

”نام غزالہ، میٹرک میں تین بار فیل ہونے کے بعد سکول چھوڑ چکی ہوں۔“

”آپ کا نام تو سن لیا تھا۔ روجی کہہ کر آپ کی امی نے آپ کو بلایا تھا۔ کرتی کیا ہیں یہ بتائیں۔“ غزالہ نے بھی کچھ ادب سے جواب دینے کے بعد پوچھا؟

”میں نے اسی سل میٹرک پاس کیا ہے۔“ روجی نے ایک بار پھر ادب سے بتایا۔

”آگے پڑھنے کا ارادہ ہے۔“ غزالہ نے پوچھا۔

”نہ تو ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا رواج ہے اور نہ ہی میرا پتا مل آگے پڑھنے کو چاہتا ہے۔ مجھے گھر کا کام کرنا، ہلائی کڑھائی کرنا چھالگتا ہے۔“ روجی نے پوری وضاحت سے بتایا۔

”اس کے علاوہ کیا مشاغل ہیں آپ کے؟“ غزالہ نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

”خواتین کے رسالے پڑھتی ہوں اور رضیہ ہٹ، سلمیٰ کنول، بشریٰ رحمان کے رومانی ناولز پڑھتی ہوں اور میوزک بہت شوق سے سنتی ہوں اور یہ کیا آپ مجھ سے ہی پوچھتی جا رہی ہیں۔ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ روجی نے اجنبی بات ختم کرتے ہوئے پوچھا۔

”بتایا تو ہے تین بار فیل ہونے کے بعد سکول چھوڑ چکی ہوں اور اب سارا وقت گھر پر ہی ہوتی ہوں۔ مگر گھر کے کام کام کرنے کی بجائے لائف بجائے کرتی ہوں۔“ وہ بڑے

لغز انداز میں روجی کو آنکھ مار کر نہی۔ پھر کہا۔ ”کیونکہ گھر کے کام کام کرنے کو گھر میں ایک عدد بھالی موجود ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ تمہاری مٹگنی ہو چکی؟“

”نہیں۔“ روجی جواب دیتے ہوئے کچھ شرمائی اور غزالہ نے پھر پوچھا۔

”اچھا یہ بتاؤ کوئی عشق وغیرہ کیا ہے ابھی تک یا نہیں۔“



”آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں۔“ روجی نے کچھ حیرانی سے غزالہ کو دیکھا۔

”ارے لعنت بھیجواس آپ جناب پر جہزہ تو اور تم میں ہے وہ آپ جناب میں کہاں۔ تم مجھے تم کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔“ غزالہ جو باادب گفتگو کرتے ہوئے اکتا گئی تھی، تنک کر بولی۔ پھر غور سے روجی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”یار کتنی خشک لڑکی ہو تم۔ نہ تمہاری منگنی ہوئی ہے۔ نہ ہی تم نے کوئی عشق کیا ہے۔ کتنی بورا لائف ہے تمہاری۔“

”آپ کی منگنی مطلب تمہاری منگنی ہو چکی۔“ روجی نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

”یار اجنبی ایسی قسمت کہاں۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں تھیں۔ ابھی ایک ماہ پہلے تیسری بہن کی شادی ہوئی ہے۔ میری شادی بتائیں کب ہوگی۔ پہلے تو ابو جی کہتے تھے۔ اب وہ زیادہ بیمار ہی رہتے ہیں۔ بڑے بھائی کی شادی ہو چکی ہے۔ کوکہ وہ ہمارے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ مگر اب ان کی بیوی اور چھوٹا سا ایک بچہ بھی ہے۔ مطلب ان کا اپنا خیر جا بھی ہے۔ دوسرا بھائی جاب کرتا ہے۔ تیسرا ابھی بی کام کر رہا ہے۔ اور چوتھا مجھ سے چھوٹا ہے۔ ابھی سکول میں پڑھتا ہے۔ ہم کل آٹھ بہن، بھائی ہیں۔ بڑے سے چھوٹے بھائی کی منگنی خالہ کی بیٹی سے ہو چکی ہے۔ ابھی ایک دو برس تک ان کی شادی کا پروگرام ہے۔ ان کے بعد میری باری آئے گی۔ اس لیے میری ابھی منگنی نہیں ہوئی۔ مگر میری زندگی تمہاری طرح خشک اور بور نہیں۔ بوریت سے مجھے ویسے ہی شدید نفرت ہے۔ اب تک تین، چار عشق کر چکی ہوں۔ بات کرتے کرتے غزالہ نے آواز دھیمی کر لی۔

”تین، چار عشق۔ کیا عشق بھی تین چار ہوتے ہیں؟“ روجی نے حیرانی سے غزالہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پانچ سات بھی ہو سکتے ہیں۔ بس بندے میں بہت ہوتی چاہیے۔“ غزالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”غزالہ میں سیریس ہوں۔ کیا واقعی تم نے تین، چار عشق کیے ہیں۔“ روجی نے ایک بار بھر حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں یار سچی بات ہے آج کل چوتھا کر رہی ہوں۔“ غزالہ نے اب کے سنجیدگی سے کہا تو روجی بولی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ محبت تو ایک ہی بار ہوتی ہے۔“

”ہاں محبت ایک بار ہوتی ہے مگر۔۔۔ مگر بی بی یہاں محبت کرنا کون ہے اور کبھی تو تو نبھانا کون ہے۔ لڑکے لائف انجوائے کرتے ہیں۔ محبت کالا لگا کر لڑکیوں سے اپنا دل بہلاتے ہیں اور جب دل بھر جائے تو بغیر بتائے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ہاں تو پھر لڑکیوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ بھی لائف انجوائے کریں۔ اب تم سے کیا چھپانا۔ جب پہلی بار ایاز نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ تو میں نے حدیث سمجھ کر اس کی بات پر یقین کر لیا۔ وہ کہتا تھا میں اس دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہوں۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں خوبصورت نہیں۔ نجائے کیوں میں اس کی بات پر یقین کرتی گئی۔ ایک برس میری اور اس کی محبت قائم ہوئی، پھر وہ سعودیہ چلا گیا۔

سعودیہ جانے سے ایک ہفتہ پہلے ایاز کا نکاح اس کی چچا زاد سے ہو گیا۔ میں بہت روئی مڑ پئی۔ جب کہ ایاز نے بتایا کہ وہ مجبور تھا اور یہ کہ اب تم بھی اپنے گھر والوں کی پسند پر شادی کر لینا۔ پھر وہ کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے مجھ سے جدا ہو گیا۔ کچھ عرصہ لگا مجھے خود کو سنبھالتے ہوئے پھر ایک اور لڑکا میری زندگی میں چلا آیا۔ وہ بھی مجھ سے وہی کچھ کہتا رہا جو کچھ ایاز کہتا تھا۔ اس کے نزدیک بھی میں دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ اور میں ایک بار پھر سب کچھ بھول کر اس کی باتوں پر یقین کرتی رہی۔ مگر کچھ عرصہ بعد وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور جاتے ہوئے اس نے مجھے بتانے کی رحمت کوارا نہیں کی۔

ایاز نے میرا دل رکھنے کو ہی سہی کم از کم یہ تو کہا تھا نہ کہ وہ مجبور تھا۔ مگر یہ دوسرا کمینہ! سچی بات تو یہ ہے بی بی مردوں کی دنیا میں محبت وفا نہیں۔ صرف بھوک ہوتی ہے۔ خوبصورتی کی لڑکوں کے نزدیک اہمیت ہی نہیں ہر طرف لڑکی ہونا شرط ہے تا کہ وہ اپنی بھوک مٹا سکیں، ہوس پوری کر سکیں۔ پھر کیوں یہ بیوقوف لڑکیاں اپنی زندگی تباہ کرتی ہیں، انتظار کرتی ہیں ان کا جو کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔“ وہ خاموش ہو کر کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر ہنس کر کہا۔

”میرا خیال ہے اب یہ بتانا ضروری نہیں کہ تیسرا عشق کس سے کیا۔ صرف یہ بتاؤں گی۔ تیسرے نے مجھے نہیں میں نے از خود اس کو چھوڑا تھا۔ کیونکہ تب ہم لوگ ابھاری میں رہتے تھے۔ چھ ماہ پہلے ہم لوگ ادھر اس نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ تو وہ لڑکا وہیں رہ گیا۔ اور بات ختم ہو گئی۔ یہاں شفٹ ہونے کے تین ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک دن میں اوپر چھت پر کھڑی یونہی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ ہمارے گھر کی پیچھلی جانب کچھ دور ایک لڑکا اپنے زیر تکمیل گھر کی چھت پر کھڑا مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہ لڑکا اچھا لگا۔



چند روز دیکھنے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایک دن اس نے مجھے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سلام دے مارا۔ اور میں نے جوابی سلام کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ بس پھر کیا تھا۔ پھر رقعہ بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو ابھی تک جاری ہے۔ ان کا گھر ابھی بن رہا ہے۔ اس کے گھر والے کویت میں رہتے ہیں۔ پہلے وہ بھی وہیں تھا۔ پھر پاکستان چلا آیا۔ جب گھر مکمل ہو جائے گا تو اس کے گھر والے بھی یہاں شفٹ ہو جائیں گے۔ لڑکے کا نام پرویز ہے۔ اور وہ بہت اچھا اور سنجیدہ لڑکا ہے۔ کہتا تھا بلکہ کہتا ہے مجھ سے سچی محبت کرنا ہے اور اگر میں اس کو نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔

حالانکہ یہ ایک کھلی بکواس ہے۔ یہاں کوئی کسی کے بغیر نہیں مرنے والا تھا۔ ہم اس نے قسم کھا کر وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھ سے ہی شادی کرے گا۔ اگر شادی کرے تو بھی ٹھیک ہے۔ نہ کرے تو بھی پروا نہیں کہ میری شادی میری ماں کی ذمہ داری ہے کہ وہ رشتہ تلاش کر کے میرا بیاہ کرے۔ بہر حال آج کل وہی لڑکا میری ذات کا خورنا ہوا ہے۔ ویسے میرا خیال بھی بہت رکھتا ہے۔ وہ مسکا کر چپ ہو گئی۔ کوپا اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔

اور روجی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ غزالہ کی باتیں اس کے لیے بالکل نئی باتیں تھیں۔ وہ 13، 14 برس کی تھی۔ اور آٹھویں میں پڑھتی تھیں۔ جب طارق نامی لڑکا اس کی زندگی میں آیا۔ میٹرک تک یہ محبت قائم رہی۔ اس لڑکے کا گھر ان کے گھر سے تین، چار گھنٹوں کے سفر کے سکول کے واسطے میں تھا۔ وہ چھوٹی ہونے کے باوجود سکول سے چھٹی مار کر اس لڑکے سے ملتی رہی۔ تین برس یہ تعلق قائم رہا۔ مگر گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ پھر وہ بغیر کچھ بتائے اس کو چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بہت انتظار کرنے کے بعد ان کے گھر گئی تو معلوم ہوا وہ لوگ کرائے دار تھے اور دو ماہ پہلے یہ گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

یہ سب سن کر روجی کے دل پر گویا ایک قیامت سی گزرنی۔ کتنے دن چپکے چپکے روتی رہی۔ بمشکل میٹرک کا امتحان دے سکی۔ اور پھر آہستہ آہستہ سب بھول گئی۔ آئندہ محبت کرنے سے بھی توبہ کر لی کہ اس نے تو محبت ہی کی تھی۔ اور اب غزالہ کہہ رہی تھی۔ محبت ایک کھلی بکواس ہے۔ یہاں کوئی کسی کے لیے نہیں مرنے والا تھا۔ نچوائے کرتے ہیں تو لڑکیوں کو بھی۔ لائف انجوائے کرنی چاہئے۔ مگر وہ طارق کے بعد لائف انجوائے نہ کر سکی تھی۔ آج طارق کا سوچ کر پھر اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی کہ اس کی یاد آج بھی دل کے کسی حصے میں موجود تھی۔

غزالہ جو بغور اس کو سوچ میں گھرا دیکھ رہی تھی۔ بہت تیز لڑکی تھی فوراً سمجھ گئی کوئی بات ہے ضرور جو روجی اس سے چھپا رہی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر روجی کا چہرہ ہا پر کرتے ہوئے روجی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”چھپاؤ نہیں مجھ سے۔ سچی سچی بتاؤ کسی سے محبت کرتی ہونہ۔“ اور اب چھپانا بیکار تھا۔ روجی نے چند لمحے سوچا۔ پھر غزالہ پر اعتبار کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بھرائی ہوئی دردناک آواز میں یہ شعر پڑھا۔

وہ تو کیسی ہے اور مگر دل کے آس پاس  
پھرتی ہے کوئی شے نگاہ یار کی طرح

اور ضبط کے باوجود آنسو آنکھوں سے نکل کر گر پڑے۔ یہ دیکھ کر غزالہ نے کہا۔

”چلو شاہاش باب پوری سٹوری بھی سنا دو۔“ اور روجی نے جلدی جلدی ساری سٹوری سننے کے بعد غزالہ نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”ارے یہ ذلیل لڑکے سمجھتے ہیں لڑکیاں ان کے بغیر رہ نہیں سکتیں۔ وہ ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے تو ہم مرجائیں گی نہیں ہمیں مرنا نہیں بندھ رہنا ہے۔ بھول جاؤ اس کمینے طارق کو۔ اکذرا نگاہ اٹھا کر تو دیکھو تمہیں کئی طارق آس پاس بڑپتے ہوئے نظر آئیں گے۔ لاؤ ہاتھ، مجھ سے دوستی کر لو۔ زندہ رہنے اور لائف انجوائے کرنے کے طریقے سکھا دوں گی۔“ اور روجی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ یوں دونوں میں پکی پکی دوستی کا آغاز ہو گیا۔ ادھر اندر روم میں دو لڑکیاں اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ تو باہر شمشاد بیگم غزالہ کی والدہ خالدہ سے کہہ رہی تھی۔

”میرا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔“ چھوٹی دونوں بیٹیاں تو ابھی سکول میں پڑھتی ہیں اور اتنی ذہین ہیں کہ ہر جماعت میں فرسٹ آتی ہیں۔ بڑی اتنی سنگڑ ہے کہ میں کہیں بھی چلی جاؤں مجھے گھر کی فکر نہیں ہوتی۔ اتنے اچھے طریقے سے وہ سارے گھر کو سنبھالتی ہے۔ بیٹا میرا ابھی کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ میری بیٹیوں سے بھی زیادہ شریف ہے۔ پڑھائی میں بھی



بہت تیز ہے۔ میرے شوہر ناصر بہت خوبصورت ہیں بلکہ محنتی بھی ہیں۔ ہماری محبت کی شادی تھی۔ میری بڑی خالہ کا بیٹا ہے۔ شمشاد بیگم جب شروع ہوتی تھیں تو باتیں کرنے کے شوق میں اس کو بتاتی نہیں چلتا تھا وہ کیا کیا کہہ جاتی ہیں۔ وہ خاموش ہوئیں تو اب باری خالہ بیگم کی تھی۔ اور وہ کہنے لگی۔

”بہن میرے چار بیٹے اور چار بی بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹے اور تین بیٹیوں کی شادی کر چکی ہوں۔ تیسری کی تو ابھی ایک ماہ پہلے کی ہے۔ میری چاروں بیٹیاں بہت نیک، پاک، معصوم اور بے حد سیدھی سادی ہیں۔ مجال ہے جو شادی سے پہلے کبھی نگاہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا ہو۔ پانچ وقت کی نمازی ہیں اور میں نے تو کبھی تہجد بھی قضا نہیں کی۔“ حالانکہ کبھی فجر کی نماز پڑھتی تھیں نہ صیغہ نہیں ہوتی تھی۔ اور بہن بیٹے میرے، میری بیٹیوں سے بھی زیادہ شریف ہیں۔ بڑے کی اگرچہ شادی کر چکی ہوں۔ پر مجال ہے جو میرے پاؤں دبائے بغیر اپنے کمرے میں جائے۔“ جبکہ اندر کی حالت یہ تھی جیسی بیٹیاں تھیں۔ ویسے ہی بیٹے تھے۔ اور میری بہو بہت اچھی ہے۔ میں خود ہی اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر سارے گھر کا کام کرتی ہوں۔ بہو کو پریشان نہیں کرتی۔ شوہر نے ساری زندگی جو کمایا میرے ہاتھ پر لا کر رکھا۔ پر اب ذرا بیمار رہتا ہے۔“

قصہ مختصر ان کو باتیں کرتے شام ہو گئی۔ سلیمان گھر آیا تو وہ اجازت لے کر اپنے گھر گئیں۔ اندر روجی غزالہ سے دوستی پکی کر چکی تھی۔ تو اب خالہ شمشاد سے دوپٹہ بدل کر دونوں بہنیں بن گئی تھیں اور جاتے ہوئے خالہ شمشاد کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر گئی تھیں۔



خالہ کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ وہ صرف تین بہنیں ہی تھیں۔ باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ ماں نے محنت کر کے، مشین چلا چلا کر ان کو پالا تھا۔ نہ پر باپ تھا نہ کوئی بھائی۔ اس لیے تینوں بہنوں نے اپنی اپنی زندگی اپنی اپنی مرضی اور آزادی سے بسر کی تھی۔ بڑی بہن اختر ابھی 4 برس کی تھی۔ جب گھر سے بھاگ کر اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی۔ پھر کچھ عرصہ بعد شوہر کے ہاتھوں قتل ہو گئی۔ کیونکہ شوہر کی موجودگی میں کسی اور شخص سے اس کا تعلق ہو گیا تھا۔ دوسری خالہ تھی۔ اپنی جوانی میں شادی سے پہلے خالہ نے خوب نارے توڑے تھے۔ بہت سارے لڑکوں سے دوستیاں کی تھیں۔ صرف کھانے پینے اور پہننے اور ہنسنے کو۔ جس سے شادی کی تھی۔ اس کو بھی پہلے اپنی محبت کے مجال میں پھنسا تھا۔

تیسری بہن کوثر تھی۔ وہ ان دونوں کا سہرا تھی۔ بہت زیادہ چلاک اور بد کردار۔ خالہ سے بھی زیادہ لڑکوں سے اس نے دوستی کی تھی۔ اور اہم بات یہ تھی کہ شادی کے بعد بھی کوثر نے اپنی یہ عادت ترک نہیں کی تھی۔ خالہ جانتی تھی جوانی نامہ ہی عشق کرنے کا ہے۔ چار دن ہی کو یہ کبخت جوانی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد دو چار بچے ہو جائیں تو لوگ سب بھول جاتے ہیں کس نے اپنی جوانی میں کیا کیا تھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

کئی کئی معاشقے چلانے والی خاندان اور محلے کی لڑکیاں شادی کے بعد دو چار بچے پیدا کر کے معتبر ماں کا روپ دھار چکی تھیں۔ ان کی ماں کو بتا تھا وہ تینوں بہنیں کیا کیا نارے توڑتی ہیں۔ مگر انہوں نے سب کچھ جاننے کے باوجود ان پر کوئی روک ٹوک نہ لگائی تھی۔ اور اب یہی عادت خالہ کی تھی۔ اس کی تینوں بڑی بیٹیاں کو کہہ کر قہر پہنچتی تھیں۔ مگر اپنے اپنے دور میں تینوں نے محلے کے لڑکوں کا اپنی نگاہوں پر خوب نچایا تھا۔ اور اب غزالہ تھی۔ خالہ کبھی طرح جانتی تھی۔ وہ کس وقت کیا کرتی ہے۔ مگر اپنی ماں کی طرح اس نے بھی غزالہ کو کبھی روکا ٹوکا نہیں تھا۔ ایک بار جب وہ وہاں ہی رہتے تھے تو خالہ کی بہو نے غزالہ کو محلے کا ایک لڑکے پوی کے ساتھ آٹھ لڑاتے دیکھ لیا اور خاندان کی عزت کا خیال کر کے جب بڑی رازداری سے اس کو یہ بات بتائی تو مارے غصے کہ وہ بہو پر برس پڑی۔

”ارے بہو اگر الگ ہونا چاہتی ہو تو بے شک ہو جاؤ مگر میری معصوم سیدھی سادی بیٹی پر یہ گندالزام نہ رکھو۔“ اس کی بات سن کر بہو بیچاری نے ہونٹ سی لیے۔ پھر بعد میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود کبھی کسی سے کچھ نہ کہا کہ شوہر اس سے بھی زیادہ سخت مزاج تھا۔ اب ادھر غزالہ تو روجی کا ایک نئی راہ دکھا کر چلی گئی۔

غزالہ کے جانے کے بعد روجی نے بہت دن سوچنے کے بعد اپنے آس پاس کا جائزہ لیا شروع کیا۔ مگر فوری طور پر دو روز دیکھ کوئی لڑکا دکھائی نہ دیا جس سے وہ محبت کرنے کی غلطی دوبارہ کرتی۔ مگر روجی نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے محبت کرنے کے لیے لڑکے کی تلاش جاری رکھی۔ کہ محبت کرنے کے لیے لڑکے کا ہونا پہلی شرط ہے۔

اور ہوا یہ کہ چند ہفتے بعد ہی چچا کا بڑا بیٹا غنیم آ گیا۔ وہ اپنے کسی کام سے ادھر آئے تھے۔ جاتے جاتے گھر دیکھنے چلے آئے کہ وہاں محفل میلاد میں بھی نہ شامل ہو سکے تھے۔ جو نئے گھر میں شفٹ ہونے کے ایک ہفتہ بعد گھر کی خیر و برکت کے لیے بطور شکرانہ منعقد کی گئی تھی۔ غنیم بھائی نے ڈاکٹری پڑھی تھی۔ اور آج کل وہ امریکہ جانے کی تیاری میں تھے۔ سلام دعا کے بعد ہاتھ میں پکڑی بک بیکل پر رکھ کر وہ تائی اماں سے باتوں میں مصروف ہو گئے اور روجی ان کے لیے چائے بنانے لگی۔ جبکہ ابو کام پر، سلمان کالج اور روجی، زوبی سکول



گئی ہوئی تھیں۔ چائے بنا کر جب روجی نے کیک کے ساتھ چائے عظیم بھائی کو پیش کیا تو پھر خود بھی ان کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سننے لگی اور باتیں سننے سننے اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اور روجی نے اچانک عظیم بھائی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

”محبت کرنے کے لیے عظیم بھائی بھی کچھ برے تو نہیں۔ یوں بھی سکے چچا کے بیٹے ہیں۔ محبت ہونے کے بعد شادی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر عظیم بھائی مجھ سے دس برس بڑے ہیں۔ اونہ تو پھر کیا ہوا۔ کتنے خوبصورت ہیں اور پھر امریکہ جا رہے ہیں۔ اگر میری شادی ان سے ہو جائے تو کتنی اچھی بات ہوگی۔ روجی ایک اچھی لڑکی تھی۔ مگر بری محبت اپنا اثر لازمی دکھاتی ہے۔ غزالہ نے اس اچھی لڑکی کو بہکا دیا تھا اور اس نے غزالہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایسے ہی وقت کے لیے ماؤں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ بچیوں کے بدلتے مشاغل پر بدستی پر نگاہ رکھیں۔ مگر شمشاد کو گھومنے پھرنے سے ہی فرصت نہ تھی۔

عظیم بھائی چائے سے فارغ ہوئے تو وہ خالی برتن اٹھا کر کچن میں چلی آئی۔ وہ ابھی کچن میں برتن دھو رہی تھی۔ جب عظیم بھائی چلے بھی گئے۔ حالانکہ تائی اماں نے ان کو کھانے پر روکنے کی پوری کوشش کی تھی۔ عظیم بھائی تو چلے گئے مگر روجی مسلسل انہی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی کہ ان سے توبہ کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اٹھارہ محبت کیسے کروں گی۔ کیونکہ عظیم بھائی کی عادت تھی۔ وہ چھوٹوں سے زیادہ فری نہ ہوتے تھے۔ اب کیا کروں؟ روجی پریشانی سے سوچنے لگی۔ یوں بھی وہ کسنا روز روز آئیں گے۔ وہ اپنے روم میں سنجیدگی سے عظیم بھائی سے محبت کرنے کا سوچ رہی تھی کہ ماں نے آواز دی۔ وہ فوراً باہر آئی۔

”روجی! دیکھو تو عظیم جلدی میں اپنی بک یہاں بھول گیا ہے۔ اٹھا کر اپنے روم میں رکھ دو۔ ادھر مزنگ سے کوئی آیا تو یاد سے دے دینا۔“ شمشاد نے روجی کو دیکھتے ہی کہا۔ روجی نے خاموشی سے جھک کر ٹیبل سے بک اٹھائی اور اپنے روم میں لے آئی۔

وہ رات روجی کی طرف یہی سوچتے ہوئے گزری تھی کہ عظیم بھائی سے اٹھارہ محبت کے لیے کسنا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اسے فقط اس کے ذہن میں ایک خیال بچکی کی تیزی سے لپکا۔ کیوں نہ خط لکھ کر عظیم بھائی کی بک میں رکھ دیا جائے۔ اونہ بھائی نہیں صرف عظیم، ان کی بک ان کے بغیر کوئی نہیں کھول سکتا۔ ہاں یہی درست ہوگا۔ روجی نے سوچا اور مطمئن ہو گئی۔ ایک بوجھ تھا جو دماغ سے اتر گیا تھا۔ مگر اب ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ لٹر لکھا کیسے جائے؟ اٹھارہ محبت کن الفاظ میں کیا جائے؟ طارق اس کے برابر کا تھا جبکہ عظیم بھائی دس برس بڑے تھے۔ مگر اب جب محبت کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تو پھر لٹر کا مضمون تو لازمی سوچنا تھا۔ سو بہت سوچنے کے بعد روجی نے لکھا۔

”بہت اچھے عظیم!“

بہت ڈرتے ڈرتے سلام محبت اور دعا لیں۔

ہو سکتا ہے آپ میرا یہ لٹر پڑھ کر بہت خفا ہوں مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھ رہی ہوں۔ جب میں وہاں مزنگ میں آپ کے قریب رہتی تھی تو کبھی احساس تک نہ ہوا۔ مگر یہاں نئے گھر میں آپ سے دور ہونے پر محسوس ہوا کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اب مزید ضبط کی تاب نہیں۔ اس لیے دل کا حال لکھ کر آپ کی بک میں رکھی رہی ہوں۔ یقین کیجئے گا مجھے آپ سے بہت شدید محبت ہے۔ اگر آپ مجھے نہ ملے تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ آپ کے دل میں میرے لیے کیا جذبات ہیں ضرور لکھیں گے۔ نیچے اس نے ایک قلمی گیت کے بول لکھے۔

ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے

مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے

آپ کے جواب کی منتظر۔۔۔۔۔

آپ کی اجنبی روجی

خط لکھ کر روجی ہلکی پھلکی ہو گئی اور لٹر تہہ کر کے فوراً بک کے اندر رکھ دیا اور لگی ویٹ کرنے کہ کب کوئی مزنگ سے آئے اور وہ یہ بک اس کے ہاتھ عظیم بھائی کو بھجوائے۔ اس کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک ہفتہ بعد چچی شام کے ٹائم چچا کے ساتھ ان کو ملنے آ گئی۔ رات گئے تک وہ لوگ بیٹھے رہے۔ خوب باتیں ہوتی رہیں۔ رات کا کھانا کھا کر جب وہ لوگ جانے لگے تو روجی بھاگی بھاگی اپنے روم میں گئی اور بک لاکر چچی کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔



”عظیم بھائی بھول گئے تھے، ان کو دیکھئے گا۔“ اور وہ لوگ بک لے کر چلے گئے۔ اب دھڑکتے دل کے ساتھ روجی جواب کی منتظر تھی۔ مگر اس کو یہ بھی معلوم تھا عظیم بھائی بغیر کسی کام کے فضول میں ادھر ادھر آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ مگر ہوا یہ کہ۔۔۔۔۔

اگلے ہی روز جب دوپہر کے بعد امی زوبی کو ساتھ لے کر بڑی خانہ کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں اس وقت وہ اور روجی اکیلی تھیں۔ روجی اوپر چھت پر تھی جبکہ وہ خود برآمدے میں صوفے پر بیٹی رضیہ بٹ کا ناول پڑھ رہی تھی۔ اچانک باہر کا دروازہ کھلا، وہ کبھی سلمان ہے۔ اس لیے آرام سے بیٹھی پڑھتی رہی۔ چونکی تو اس وقت بلکہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ جب عظیم بھائی نے اس کے سر پر پہنچ کر اس کو اپنی رعب دار آواز میں پکارا۔ روجی کو ان کے اتنی جلدی آنے کی امید ہرگز نہ تھی۔ یہی وجہ تھی ان کا اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ ڈر گئی۔

”آپ اور اس وقت۔“ اس کے منہ سے صرف یہی نکلا۔

”کیوں آنے کے لیے غم کس کرنا ضروری ہے۔“ انہوں نے ناکاری سے کہا۔

پھر روجی کے ہاتھ میں پکڑی بک دیکھ کر پوچھا۔

”کیا پڑھ رہی ہو؟“

”رضیہ بٹ کی ”لامہ“۔۔۔۔۔“ روجی نے بک ان کے سامنے کی۔ انہوں نے پکڑ کر چند سطریں پڑھیں پھر بک واپس کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا یہی خرافات پڑھنے کا اثر ہے جو تم نے اتنی بڑی حرکت کی۔“

”کوئی حرکت۔۔۔۔۔؟“ روجی نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی معصوم بن کر پوچھا؟

”لیٹر کیوں لکھا تھا؟“ انہوں نے وہیں کھڑے سخت ناکاری سے پوچھا۔

”اگر آپ نے لیٹر پڑھ لیا ہے تو بتا چل گیا ہوگا کیوں لکھا ہے۔“ اب کے روجی نے خود کو سنبھال کر جواب دیا۔

”بک میری بجائے کوئی اور کھول لیتا تو۔“ انہوں نے روجی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی اجازت کے بغیر کوئی آپ کی چیز چھونے کی جرأت کر سکتا ہے؟“ روجی نے مسکرا کر کہا۔

”تم نے اگر لولیر لکھنے کی جرأت کر لی ہے تو باقی چھونے کی جرأت تو کر ہی سکتے ہیں۔“ انہوں نے ذرا کرخت لہجے میں کہا۔ اب کے روجی خاموش رہی اور عظیم بھائی نے پا کٹ

سے روجی کا لولیر نکال کر اس کے سامنے پرزے پرزے کر کے اس کے حوالے کرتے ہوئے سخت غصے سے روجی کو تنبیہ کی۔

”دوبارہ یہ غلطی کبھی نہ کرنا ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ نفرت ہے مجھ ان چھپوری حرکتوں سے۔ حد ہوتی ہے بے شرمی کی۔“ بات ختم کر کے وہ جانے کھڑے۔

”آپ میری بات تو سنیں۔“ روجی نے رو ہا سی ہو کر کہا۔

”یکواں ہند کرو۔“ انہوں نے کہا اور فو رائی چلے گئے اور روجی پرزے پرزے لولیر ہاتھ میں لیے گم سم سی کھڑی رہ گئی۔ محبت کرنے کی پہلی کوشش تو بین آمیز انداز میں ناکامی سے

دوچار ہوئی تھی۔

ادھر روجی جو بیڑھی میں بیٹھی اپنی ڈول سے کھیل رہی تھی۔ اس نے عظیم بھائی کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اٹھ کر روجی کے پاس آئی اور پوچھا۔

”بھائی جان چلے گئے۔“ روجی چونکی پھر تخی سے کہا۔

”ہاں دفع ہو گئے ہیں۔“ اور اپنے پہلے لولیر کے پرزے جلانے کیلئے چلی گئی تھی۔ لیکن اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ اور وہ غصے سے کھولتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ کیا تکلیف

ہوتی عظیم بھائی کو اگر میری محبت کا جواب محبت سے دے دیتے۔ اذنبہ بڑھالاز کا ہوتا تو بتا چلتا محبت کس کو کہتے ہیں۔ اس نے روجی سے کہہ دیا تھا گھر میں کسی کو یہ بتانے کی ضرورت

نہیں کہ عظیم بھائی آئے تھے اور روجی نے ان کی بات سن کر جی اچھا کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اور روجی غصے میں بھری اپنے روم میں چلی گئی تھی۔ جبکہ روجی ایک بار پھر اپنی

ڈول سے کھیلنے لگی تھی۔

سارا دن روجی کا موڈ آف رہا۔ اسی آف موڈ کے ساتھ وہ رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ جب امی کی واپسی ہوئی اور ان کے ساتھ روجی کی خانہ کی بیٹی نرگس بھی تھی۔ نرگس کو دیکھ کر روجی کی



دن بھر کی کوفت جاتی رہی کہ وہ دونوں کزن ہونے کے علاوہ فرینڈز بھی تھیں۔ نرگس سیدھی روحی کے پاس کچن میں آئی اور گلے ملنے کے بعد ایک بوتل روحی کے حوالے کرتی ہوئی بولی۔

”سبزیوں کا اچار ڈالا تھا تمہارے لیے بھی لے کر آئی ہوں۔“ اور روجی خوش ہو گئی۔ پھر ان دونوں نے مل کر یہی کچن کا کام ختم کیا۔ اور رات کا کھانا کھانے اور کھانے کے بعد روجی اس کو اپنے روم میں لے گئی۔ روپی سے روجی نے کہہ دیا تھا کیا آج وہ بھی امی اور زوبی کے ساتھ ان کے روم میں سو جائے۔ کیونکہ ان دونوں فرینڈز نے رات گئے تک گپ شپ کرنی تھی۔ وہ دونوں جب بھی اکٹھی ہوتی تھیں تو خوب باتیں کرتی تھیں۔

پورا ایک ہفتہ نرس ان کے یہاں رہی اور گھر میں خوب رفق رہی۔ اچھے اچھے پکوان پکتے رہے۔

سلمان بھائی بھی گھر جلدی آ جاتے تھے۔ ایک دو بار غزالہ بھی نرس سے ملنے آئی تھی۔ تینوں الگ الگ ٹیمیں پتا نہیں کیا کیا تھیں کرتی تھیں۔ اور روجی نے بڑی رازداری سے غزالہ کو بتایا تھا کہ اس کے پہلے لولہ شکر کا عظیم نے کیا شکر کیا تھا۔ وہ تو شکر ہے ان کی کسی سے فضول بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ ورنہ وہاں گرا بیٹی امی کو بتا دیتے تو کتنی رسوائی ہوتی۔ ”پورے خاندان میں میری خاک عزت رہ جاتی۔ تم نے میری بے عزتی کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“ وہ بسوری۔

”ارے تمہارے عقیم بھائی پہلی ہی کسی کو چاہتے ہوں گے۔ ورنہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ لڑکی کسی لڑکے کے کلو لیسٹر لکھے اور وہ جواب نہ دے۔“ خیر فکرنہ کرو اپنی تلاش جاری رکھو، کوئی نہ کوئی بیوقوف..... سوری مطلب لڑکا ہی جائے گا۔“ جو ابا راجی کچھ نہ بولی تھی اور غزالہ ترگس سے ملنے اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اپنے گھر چلی گئی تھی۔

جس دن زرگس نے اپنے گھر جلتا تھا اس کی امی صبح ہی صبح اس کو لینے چلی آئی تھیں۔ وہ تو شمشاد نے مارے محبت کے بہن کو دوپہر کے کھانے تک روک لیا۔ سردی کے چھوٹے چھوٹے دن تھے۔ خالہ ارامی نے مل کر پالک بنائی، پھر زرگس اور روجی نے روز کی طرح مل کر کھانا بنایا۔ پالک کوشت روجی نے اور پالاؤ زرگس نے، سلا بھی زرگس نے بنائی تھی بلکہ بنائی کم کھائی زیادہ تھی۔ کھانے سے قاصرغ ہونے کے بعد شمشاد بہن کو لے کر اپنی نئی پہلی خلدہ کے گھر چلی گئی۔ تو روجی زرگس کو لے کر اوپر چھت پر آگئی جہاں روپی اور زوبی اپنے سکول کا ہوم ورک کر رہی تھیں۔ وہ دونوں منڈھیر کے ساتھ کھڑی ہو کر باتیں کرنے لگیں۔ باتیں کرتے کرتے زرگس نے چو نکتے ہوئے کہا۔

”کون...؟“ کہتے ہوئے روجی نے سامنے دیکھا۔ چھ سات گھر چھوڑ کر ایک چھت پر دوڑ کے کھڑے ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ روجی کو دیکھنے پر ایک مسکرایا تھا۔ یہ دیکھ کر نرگس نے پوچھا۔

”یہ کیا چکر ہے، بھئی؟“  
”مجھے کیا پتہ، میں تو آج پہلی بار ان دونوں کو دیکھ رہی ہوں۔“ روجی نے جوبنا کہا، نرگس بولی۔

”اگر یہ بات ہے تو وہ تمہیں دیکھ کر مسکرایا کیوں ہے۔“

”جا کر اسی سے پوچھ لو۔ اگر میری بات پر یقین نہیں۔“ روجی نے جل کر کہا۔ تبھی نیچے سے زنگ کی امی نے آواز دی تو وہ دونوں جلدی سے نیچے آئیں اور فوراً ہی خالہ زنگس کو لے کر چلی گئیں۔ روجی دوپہر کے گندے برتن دھونے کچن میں آگئی اور امی اوپر چھت پر رزوبلی اور روپلی کے پاس دھوپ تاپنے چلی گئی تھیں۔ روجی برتن صاف کر رہی تھی مگر دھیان سارے کا سارا اس لڑکے میں تھا جس نے مسکرا کر روجی کو دیکھا تھا۔

روحی نے سوچا۔ اچھا خاصا خوبصورت لڑکا تھا اور شکل سے ہی بہت زیادہ پڑھا لکھا لگتا تھا۔ مگر وہ مجھ دیکھ کر مسکرایا کیوں تھا؟ کیڑے ڈالنے کے علاوہ تو میں کبھی چھت پر نہیں گئی کہ مجھ کو پ میں بیٹھنا پسند نہیں جبکہ وہ لڑکائیوں مسکرایا تھا جیسے پہلے سے ہی مجھے جانتا ہو۔ شاید میں اس کو اچھی لگی ہوں۔ شاید یہی بات ہے۔ کل پھر چھت پر جا کر دیکھ لوں گی۔ اگر میرا اندازہ درست ہے۔ یعنی میں اسے اچھی لگی ہوں تو لڑکا بھی برا نہیں۔ وہ برتن صاف کر کے اپنے روم میں آ گئی۔ اب اس کو بچپنی سے کل کا انتظار تھا۔

اگلی صبح جب ابو، سلمان، زوی، وروی ناستے سے فارغ ہو کر گھر سے چلے گئے تو روجی نے امی کا ناشتہ بنایا اور ناستے سے فارغ ہوتے ہی وہ جلدی جلدی سارے گھر کا کام نپٹانے لگی۔ جبکہ شمشاد بیگم بھری لینے چلی گئی تھی۔ وہ بھری لے کر آئیں تو روجی نے کہا۔



”امی ہیزی اوپر چھت پر لے جائیں میں بھی وہیں آتی ہوں۔“

روجی کی بات سن کر شمشاد نے حیران ہو کر اس کو دیکھا۔ جانتی تھی محض اپنی رنگت میلی ہونے سے بچانے کے لیے وہ کبھی دھوپ میں نہیں بیٹھی کہ کہیں میرا کورا رنگ کالا نہ ہو جائے۔ مگر آج وہ خود ہی کہہ رہی تھی کہ ہیزی اوپر لے جائیں۔ وہ کچھ بولے بغیر یونہی ہیزی والا سا پراٹھا لے چھت پر آ گئی۔ چند منٹ بعد ہی روجی چھری اور برتن لے کر چھت پر آ گئی۔ شمشاد نے آج پکانے کو آلو متھی لائی تھی نرگس کی وجہ سے روزانہ گوشت پکاتا تھا۔ شمشاد نہیں چاہتی تھی کہ نرگس گھر جا کر کہے خالہ کے یہاں خالی ہیزی پکتی ہے۔ وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ محض شومارنے کے چکر میں کہ خاندان کو پتہ چلے ہم بہت امیر ہیں۔

آج انہوں نے پہلے تو روجی سے پوچھا تھا کیا پکایا جائے۔ اور جب روجی نے کہا اپنی مرضی سے کچھ بھی لے آئیں تو وہ بہت سوچنے کے بعد آلو متھی لے آئیں۔ آلو متھی بھی بچے شوق سے کھاتے تھے۔ اب روجی اوپر آئی۔ ماں کے قریب بیٹھ گئی۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے سامنے دیکھا مگر اس وقت چھت خالی تھی۔ وہ چھری اور باسکٹ لے کر ماں کے قریب بیٹھ گئی۔ شمشاد متھی بنا بنا کر اس کو پکڑائی گئی اور روجی کا کٹی رہی۔ مگر دھیان سارے کا سارا سامنے والی چھت کی جانب تھا۔ یہی وجہ تھی وہاں کی باتیں بھی دھیان سے نہیں سن رہی تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی نرگس کو اپنا سوٹ پسند آیا تھا۔ اس نے صرف سوٹ ہی سنا تھا۔ چونکہ کر پوچھا۔

”گوئنا سوٹ؟“

”جو نرگس کو دینے کے لیے بازار سے لائی تھی۔“ تمہارا دھیان کہاں پر ہے۔

”اچھا وہ سوٹ۔ ہاں نرگس نے بہت پسند کیا تھا اور کہا تھا میں بے شک ایک دن بھی رہ کر جانے لگوں خالہ سوٹ دینا نہیں بھولتیں۔“ روجی نے سنبھال کر جواب دیا۔ اور شمشاد دل میں یہ سوچ کر بہت خوش ہوئیں۔ کہ اگر نرگس نے روجی کو یہ بات کہی ہے تو باقی سارے خاندان میں بھی تو۔۔۔۔۔ اور روجی نے متھی کاٹنے کے بعد آلو بھی چھیل لیے حتیٰ کہ ادھک یہاں بھی کاٹ لی مگر سامنے والی چھت خالی ہی رہی۔ ہیزی دنانے کے بعد بھی وہ کتنی دیر ماں سے باتیں کرتی رہی اور شاید مزید کرتی رہتی وہ تو شمشاد نے کہا۔

”بچے آنے والے ہیں، جاؤ اب کھانا تیار کرو۔“ اور روجی سامنے والی چھت کو دیکھتے ہوئے مایوسی سے نیچے آ گئی۔ پھر کھانا بناتے ہوئے روجی نے سوچا۔

”بے وقوفی کی بھی حد ہوتی ہے۔ وہاں پر مہتا ہے تو اس وقت کسی درگاہ میں ہوگا اور اگر جاب کرنا ہے تو آفس میں بڑی ہوگا۔ پھر وہ اپنی بے تابی اور بے وقوفی پر ہنستے ہوئے کھانا بنانے لگی۔ آلو متھی پکتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ سامن جلدی تیار ہو گیا۔ سامن پکنے کے ساتھ ساتھ اس نے آٹا بھی گوند کر رکھ دیا تھا۔ روٹیاں اس لیے نہیں بنائی تھیں کہ کو کو نکال کر آلو متھی کے ساتھ بھی گھر والے پراٹھے کھاتے تھے اور پراٹھا گرم گرم ہی اچھا لگتا ہے۔

وہ چولہا ہلکا کر کے بھی بچکن سے باہر نکلی ہی تھی کہ روٹی، زروبی سکول سے آ گئیں۔ روجی کو سلام کرنے کے بعد وہ دونوں یونیفارم بدلنے اندر چلی گئیں۔ روجی نے واپس بچکن میں آ کر تواچو۔ بے پر رکھ کر آٹے کی تیز کی اور بیڑا بنانے لگی۔ جب تک وہ یونیفارم بدل کر باہر آئیں ان کے پراٹھے بنا چکی تھی۔ ان دونوں کو سامن ڈال کر دیا تو سلمان بھی کالج سے آ گیا اور امی بھی کھانے کے لیے چھت سے نیچے آ گئی۔ بہر حال جب سب کھانے سے فارغ ہو گئے تو روجی نے سکون کی سانس لی اور ہاتھ دھو کر بچکن سے باہر آئی اور چھت پر جانے کا سوچنے لگی۔ امی کھانا کھانے کے بعد چھت پر جانے کی بجائے محلے کا ایک چکر لگانے چلی گئی تھیں کیونکہ اس کے بغیر ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی ان کو گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ ان کے جانے کے بعد سلمان بھی اپنے روم میں چلا گیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس کو اکیڈمی جانا تھا۔ جبکہ روٹی، زروبی اپنی اپنی ڈول سے کھیلے لگیں۔ کھیلنے کے بعد ان کو بھی روجی سے سنا صرف پر مہتا تھا بلکہ سکول سے ملا ہوا ہوم ورک بھی مکمل کرنا تھا۔ روجی لاؤنچ کے صوفے پر بیٹھی بے چینی سے سلمان کا اکیڈمی جانے کی منتظر تھی اور جیسے ہی سلمان اکیڈمی گیا روجی نے روٹی زروبی سے تحکمانہ انداز میں کہا چلو اب تم دونوں بھی اپنا ہوم ورک مکمل کرو اور پھر پر مہتا بھی ہے۔ روٹی زروبی خاموشی سے انھیں ادا اپنے بستے لے کر اوپر چلی گئیں تو تھوڑی دیر بعد روجی بھی ان کے پیچھے چلی آئی۔

مگر افسوس! سامنے والی چھت ابھی تک خالی تھی۔ وہ یونہی بے زاری سے چھت پر بیٹھنے لگی اور جب کافی دیر بعد تھک کر نیچے آنے لگی تھی وہ نظر آ گیا۔ روجی سب کچھ بھول کر وہیں سیز جی پر رک کر اس کو دیکھنے لگی۔ وہ بھی کو یا اسی کے لیے چھت پر آیا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور نگاہیں روجی پر جمی تھیں۔ روجی نے بھی غزالہ کی باتوں کی روشنی میں کہ پرویز نے سلام کیا تو میں نے بھی جوابی سلام کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرانے میں دیر نہیں لگائی۔ پھر لڑکا تو کھڑا اس کو دیکھتا رہا جبکہ روجی نے جلدی سے کاپی قلم



لے کر وہیں منڈھیر پر کاپی رکھ کر ایک مختصر سالوئر لکھا اور مکمل کرنے کے بعد تہہ کر کے وہیں کھڑے کھڑے لے کر کو دکھایا۔ پھر جھک کر روٹی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔  
 ”روٹی! ذرا ادھر آؤ۔“

”آپی مجھے پڑھنے دیں۔ کل میرا ٹیسٹ ہے۔“ روٹی نے یہ کہتے ہوئے روجی سے اپنا ہاتھ چھڑایا تو روجی نے سخت لہجے میں کہا۔

”فورا اٹھو نہیں تو ابھی مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں گی۔“ روٹی مارے خوف کے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی کہ آپی کافی ہاتھ چھٹ بھی۔ روجی سامنے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ اس ڈر سے کہ کہیں روٹی نہ سن لے اور ای کو نہ بتا دے کہ وہ ابھی زیادہ چھوٹی بھی۔ اگر روجی بھی اس کو مار نہ پھینکتی تو وہ فوراً ہی سے شکایت کر دیتی تھی اور روجی کو ای سے خوب ڈانٹ پڑتی تھی کہ اتنی چھوٹی بہن کو مارتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی جبکہ روٹی اس کے ساتھ اس کے روم میں سوتی تھی۔ شروع ہی سے جب وہ طارق کو ملتی تھی تو روٹی اس کے ساتھ ہوتی تھی کہ وہ دونوں ایک ہی سکول میں پڑھتی تھیں۔

”دیکھو روجی وہ سامنے کی چھت پر جگڑ کا کھڑا ہے، بھاگ کر جاؤ اور یہ خط اس کو دے آؤ۔ مگر یاد رکھنا کسی کو بتانا نہیں۔“

”مگر آپی! روٹی نے پھر کہا چلا۔“

”اگر مگر کچھ نہیں۔“ روجی اس کی بات کاٹ کر آنکھیں نکالتی ہوئی بولی۔ ”جیسا کہہ رہی ہوں ویسا ہی کرو۔“ روٹی خط لے کر نیچے چلی گئی۔ لڑکا دور کھڑا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ پھر روٹی کے آنے سے پہلے ہی وہ اپنے گھر کے دروازے کے باہر آن کھڑا ہوا تھا۔ روٹی اس کو قہقہے کے کمرٹی تو اس نے نرمی سے کہا۔  
 ”بیٹا شام کا اس خط کا جواب لے جانا۔“ روٹی کوئی جواب دینے کی بجائے گھر واپس بھاگ آئی تھی۔ روجی اس کی خستہ تھی۔ دیکھتے ہی پوچھا۔  
 ”خط لیتے ہوئے انہوں نے کچھ کہا بھی تھا؟“

”جی آپی! انہوں نے کہا تھا کہ شام کو آ کر اس خط کا جواب لے جانا۔“ روجی یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور لگی شام کا انتظار کرنے۔ ایک نئی لگن غزالہ نے اس کے اندر پیدا کی تھی۔ ورنہ وہ تو طارق کے جانے کے بعد ان باتوں سے توبہ کر چکی تھی۔ مگر اب غزالہ سے ملنے کے بعد اور اس کی بے باک باتیں سننے کے بعد وہ بے چین ان لمحوں کی منتظر تھی۔ جب پھر کوئی طارق اس کے ساتھ پیار بھری باتیں کرے اور کہوہ بہت خوبصورت ہے۔ وہ بھی بھی خوبصورت۔ مگر غزالہ تو کہہ رہی تھی لڑکوں کے نزدیک خوبصورتی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ صرف لڑکی ہونا شرط ہے۔ ہونٹ کا لے ہوں یا گلابی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اچانک ای گھر میں داخل ہوئی تو روجی جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

شا کر خان لیٹر کھول کر ابھی پڑھنے ہی لگا تھا کہ نوید روم میں داخل ہوا اور شا کر خان کے ہاتھ میں لیٹر دیکھ کر پوچھا۔  
 ”کیا پڑھ رہے ہو؟“

”لولیٹر۔“ شا کر خان نے خط پڑھتے پڑھتے جواب دیا۔

”کس نے بھیجا ہے یہ لولیٹر؟“ نوید نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس لڑکی نے جوکل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھ کو کچھ ہی تھی، آج آفس سے آتے ہی میں اس کو چیک کرنے اوپر گیا وہ گویا پہلے ہی سے میرے انتظار میں ٹپل رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میں مسکرایا۔ جو اب وہ بھی مسکرائی، پھر وہیں دیوار پر کاپی رکھ کر اس نے جلدی جلدی خط لکھا اور صرف لکھا بلکہ فوراً ہی اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھ بھیج بھی دیا۔ ابھی ابھی دے کر گئی ہے اس کی بہن۔“ شا کر خان نے بتایا۔

”واہ! کیا پھرتیاں ہیں۔“ نوید نے ہنس کر کہا۔ پھر کوٹا تارتے ہوئے پوچھا۔ ”بائی دیو لکھا کیا ہے اس پیلڈی لڑکی نے۔“

”کچھ زیادہ نہیں، صرف یہ پوچھا ہے کل آپ مجھ کو کچھ کمرے کرائے کیوں تھے جبکہ اس سے پہلے میں نے آپ کو دیکھا تک نہیں، کیا میں آپ کو اچھی لگی ہوں؟ اگر یہی بات ہے تو جواب ضرور دیجئے گا۔“ شا کر خان خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد نوید سے پوچھا۔



”کوئی ضرورت نہیں، ابھی غلط فہمی دور کرنے کی۔“ نوید نے تیزی سے کہا۔ تو شا کر خاں سوچتے ہوئے بولا۔

”یار میرے لیے یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ بڑے شہروں میں لڑکیاں خولڑکوں کو لفٹ کراتی ہیں۔“ یہ سن کر نوید نے ہنس کر کہا۔

”شا کر خاں تم لفٹ کی بات کرتے ہوئے، بڑے شہروں کی لڑکیاں لڑکوں کو بڑے عشق کرواتی ہیں۔ میرا ایک دوست تھا عمران اس کی ایک لڑکی فرخ سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بتاتا تھا میں جب بھی فرخ سے ملتا ہوں مجھ سے زیادہ وہ بے تاب ہوتی ہے۔ اس کا انداز ہمیشہ خود پیردگی لئے ہوتا ہے۔ یعنی تم کچھ بھی کر لو وہ تو میں ہی شریف بندہ ہوں۔ آخری حد تک نہیں جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے آنے کا وعدہ کیا اور وہ نہ آئی اور میں غما ہو گیا۔ اگلی بار وہ آئی تو آتے ہی میرے سینے سے لگ گئی۔ میں خفگی کی وجہ سے ذرا اکڑ میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ فرخ نے یہ دیکھا تو ایک ہاتھ میرے سر کے پیچھے رکھ کر میرا چہرہ خود اپنے چہرے پر جھکالیا اور ایک طویل بوسے کی رشوت دے کر مجھے منالیا۔ ہاں تو بھائی شا کر خاں! لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جولوڑکوں سے زیادہ لڑکوں کی قربت کے لیے بے قرار ہوتی ہیں۔ لکھو اس خط کا جواب اور بلا واسطہ لڑکی کو یہاں دونوں مل کر عیش کریں گے۔ آخر تو تمہیں پشاور اور مجھے اسلام آباد واپس جانا ہے اور جانے سے پہلے اس کی غلط فہمی بھی دور کرتے جائیں گے۔ لیکن یہ جو چھ ماہا دھر رہنا ہے ذرا مزے کرتے ہوئے گزاریں۔ کیا خیال ہے؟“ نوید نے بات ختم کر کے شا کر خان کی رائے جاننے کے لیے اس کی جانب دیکھا، جو ابھی تک خط ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

”میں یہ دھوکا نہیں کر سکتا۔ یوں بھی یہ گناہ ہے۔“ شا کر خان نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

”اُس اوکے! نہ بلاؤ۔ مگر لٹر کو کا جواب تو لکھو گے۔“ نوید نے پوچھا۔

”ہاں اتنا سا نجانے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“

شا کر خان نے جواب دیا تو نوید نے پوچھا۔

”اچھا چھوڑو یہ بتاؤ پکایا کیا ہے، بھوک لگ رہی ہے۔ آج میں لیٹ آیا ہوں آفس سے۔ آتے ہوئے قیمہ مٹر لایا ہوں مگر پکا نہیں سکا کہ آتے ہی اوپر چلا گیا اور دس منٹ ہی ہوئے ہیں مجھے آئے ہوئے۔ اب تم چیخ کر کہ مٹر چھیل دو، میں تب تک قیمہ بھون لیتا ہوں۔“ شا کر خاں نے لٹر رکھتے ہوئے قیمہ والا شا پر اٹھایا۔

”یار بس جلدی سے قیمہ ہی بھون لو، بہت بھوک لگی ہے۔“ نوید نے کہا تو شا کر خاں بولا۔

”نوید میں قیمہ مٹر بہت زبردست بناتا ہوں۔ تم مٹر چھیلو میں قیمہ بھون لیتا ہوں۔“ پھر وہ باہر چلا گیا۔ وہ دونوں بہت کبر سے دوست تھے۔

شا کر خان کا تعلق پشاور سے تھا اور نوید اسلام آباد کا رہنے والا تھا۔ دونوں دوست ابھی تک غیر شادی شدہ تھے۔ تاہم شا کر خان کی منگنی ہو چکی تھی اور نوید کے گھر والے بھی اس کے لیے لڑکی تلاش کر رہے تھے کہ چنانچہ دونوں کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا۔ لاہور ہی میں رہنے والے شا کر خان کے ایک دوست وقار نے ان کے لیے اس گھر کا بندوبست کیا تھا جو ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوا تھا اور وقار نے کہا تھا۔

”تم چار چھ ماہ شوق سے اس گھر میں رہو، فی الحال سرمائے کی کمی کے باعث اس گھر کی تعمیر کی ہوئی ہے۔ یہ گھر میرا ایک بے حد عزیز دوست کا ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ لندن میں رہتا ہے۔ اور اس کی دیکھ بھال اس نے مجھے سونپ رکھی ہے۔“ یہ سن کر شا کر خان فوراً رضامند ہو گیا کہ کرائے کی بچت ہو رہی تھی۔ ان دونوں کو اس گھر میں آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ وہ دوست جس کی وجہ سے اس گھر میں قیام کرنے میں کامیاب ہوئے تھے پاکستان آ گیا۔ اس کا پتا گھر روجی کے گھر کی پچھلی لائن میں تھا۔ پرسوں جب روجی یہ بھی کہ وہ اس کو دیکھ کر مسکرایا ہے۔ وہ روجی کے پیچھے اپنے گھر کی چھت پر کھڑے اپنے دوست وقار کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ جو دور ہونے کی وجہ سے ان کا حال احوال پوچھ رہا تھا اور روجی غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔

شا کر خاں سے زیادہ اس بات کو نوید نے محسوس کیا اور کہا۔

”یار شا کر! دونوں لڑکیاں شاید یہ سمجھی ہیں کہ تم ان کو دیکھ کر مسکرا رہے ہو۔ ذرا ادھر دیکھو ان میں سے ایک لڑکی مسلسل تمہیں دیکھتی جا رہی ہے۔“

یہ سن کر شا کر خاں نے بغور روجی کو دیکھا پھر کہا۔

”اگر یہ بات ہے تو کل پھر چیک کر لیں گے۔“ اور آج آتے ہی لباس بدل کر اوپر چھت پر چیک کرنے گیا تو نوید کی بات سچ نکلی تھی۔ بلکہ وہیں اس کے سامنے کھڑے کھڑے



اس نے لیٹر لکھ کر اس کفو راج بھیج دیا تھا۔ روجی کے لیٹر کا جواب سوچتے ہوئے اس نے قیمہ مٹر پکایا تو وہ بجائے زبردست بننے کے بہت خراب بن گیا تھا۔ نوید ہمیشہ شا کر خاں کے بعد آفس سے آتا تھا اور آتے ہوئے روٹیاں لانا اس کی ذمہ داری تھی۔

نوید کے آنے تک شا کر خاں سالن تیار کر چکا ہوتا تھا۔ جبکہ صبح کا ناشتہ نوید بنا لیتا تھا۔ یعنی دونوں دوست مل جل کر گھر کا کام کر لیتے تھے۔ ہاں تو اب جب قیمہ مٹر پکنے کے بعد دونوں دوست کھانے کیلئے بیٹھے تو پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہی نوید چلایا بلکہ غریا۔

”ایسا ہی قیمہ مٹر زبردست ہمیشہ پکاتے ہو، کمینے! کتنی تیز مرچ ہے اور نمک شاید ڈالا ہی نہیں۔“ شا کر خاں جو پانی کا جگ اور گلاس رکھ رہا تھا جلدی سے ایک نوالہ لیا پھر کچھ کہے بغیر یکن میں گیا اور نمک دانی اٹھا لایا۔ نمک ڈالنا وہ واقعی بھول گیا تھا۔ بہر حال اب نمک ڈالنے کے باوجود سالن میں وہ ذائقہ پیدا نہیں ہو سکا تھا جو پکتے ہوئے سالن میں نمک ڈالنے پر ہوتا ہے۔ نوید نے سی سی کرتے اور برہنہ کرتے ہوئے جیسے تیسے کھانا ختم کیا اور پھر کتاب کھول کر اپنے بستر میں لیٹ گیا۔ شا کر خاں کفارے کے طور پر اس کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لے آیا حالانکہ کھانے کے بعد چائے بنانا نوید کی ذمہ داری تھی۔ اب چائے پی کر نوید کا موڈ پورا تو نہیں مگر کافی حد تک بہتر ہو گیا تھا۔ جبکہ شا کر خاں چائے پینے کے بعد روجی کے لیٹر کا جواب لکھنے بیٹھ گیا تھا۔

غروب آفتاب سے چند منٹ پہلے روجی نے روپی کو اپنے لیٹر کا جواب لینے بھیجا تھا اور روپی کا جانا بے کار نہیں گیا تھا۔ شا کر خاں اس کی آمد سے پہلے ہی گھر کے دروازے پر اس کا منتظر تھا۔ روپی نے لیٹر لیا اور فوراً گھر بھاگ آئی۔ آپنی یکن میں روٹیاں بنا رہی تھی۔ ای زوپی اندر اپنے بستر میں تھیں۔ روپی نے یکن میں داخل ہوتے ہی ہانپتے ہوئے کہا۔

”یہ لیں آپنی اوہیرے کا انتظار میں پہلے ہی گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ مجھے خط دے کر اندر چلے گئے۔“

”اچھا۔“ روجی مسکرائی اور لیٹر پکڑ کر چھپا کر رکھ لیا۔ ”پھر روپی کو یہ یاد کرتے ہوئے کہا اب تم اپنے ٹیسٹ کی اندر جا کر تیاری کرو۔ اور روپی سر ہلاتے ہوئے روجی کے دم میں چلی گئی۔ روجی نے جلدی جلدی باقی کی روٹیاں بنا لیں۔ ابو کے آنے پر سب نے کھانا کھلایا۔ پھر وہ ہر کام سے فارغ ہو کر اپنے روم میں چلی آئی۔ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے دروازہ بند کیا۔ پھر بڑے آرام سے بستر پر بیٹھ کر لیٹر پڑھنے لگی۔ شا کر خاں نے لکھا تھا۔

مائی ڈیر روجی!

اسلام علیکم!

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

آپ کا بھیجا ہوا محبت نامہ ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آپ نے پوچھا ہے کیا میں آپ کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ ہاں تو ڈیڑہ کسی خوبصورت چہرے کو دیکھ کر مسکرنا کیا گناہ ہے اور اگر گناہ بھی ہے تو مجھ سے یہ سرزد ہو چکا۔ مگر میں ایک سکویو نہیں کروں گا۔ پھر آپ نے پوچھا ہے کیا میں آپ کو اچھی لگی ہوں۔ تو آپ ایسی لڑکی کسی کو بری لگ سکتی ہے؟ جی ہاں مجھے اعتراف ہے کہ آپ مجھے اچھی لگی ہیں۔ اس لیے کہ آپ ہیں ہی بہت اچھی۔ کو کہ میرے بارے میں آپ نے کچھ نہیں پوچھا مگر میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ میرا نام شا کر خاں ہے۔ پشاور کا رہنے والا ہوں۔ مگر جاب اسلام آباد میں کرتا تھا۔ ایک ہفتہ قبل ہی اپنے ایک دوست نوید کے ساتھ ٹرانسفر ہو کر لاہور آیا ہوں۔ کو کہ یہ لیٹر پہلے آپ نے لکھا ہے مگر ادھورا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے دوستی کرنا پسند کریں گی۔ اگر مجھ سے دوستی کرنا پسند ہو تو لیٹر کا جواب ضرور دیجئے گا اور اگر نہ بھی کرنی چاہیں تو کوئی زبردستی نہیں۔ تاہم اگر آپ مجھ سے دوستی کر لیں گی تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ آپ کے جواب کا منتظر شا کر خاں۔“

روپی نے ایک بار نہیں کئی بار خط کو پڑھا مگر پوری طرح سمجھ نہ آ سکی۔ طارق چھوٹا تھا مگر کہتا تھا وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ ہر لڑکا لڑکی کے قریب جب ہوتا یا ہونا چاہتا ہے تو پہلی بار یہی کہتا ہے کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ مگر اس خط میں محبت والی کوئی بات نہ کی گئی تھی۔ روجی نے پاس سوئی ہوئی روپی کو دیکھا۔ پھر خط ٹکے کے نیچے رکھتے ہوئے خود بھی لیٹ گئی۔ یہ سوچ کر کہ کل غزالہ کے گھر جاؤں گی اور اس کو خط پڑھا کر جواب پوچھوں گی کہ مجھے تو ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی۔ دوستی کا مطلب کیا ہے؟ کیا ہمارے معاشرے میں لڑکے لڑکی کی دوستی پسند کی جاتی ہے۔ محبت تو اور چیز ہے۔ یہ چوری کی جاتی ہے اور خود بخود دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ سو گئی صبح وہ پروگرام کے مطابق غزالہ کے گھر نہ جا سکی کہ امی صبح ہی مزنگ چلی گئی تھی۔ سائی اماں کا ابو پیغام لائے تھے کہ کل انہوں نے گیارہویں کی نیاز دینی ہے قرآن خوانی بھی ہوگی۔ سب آئیں گے مگر نئے گھر کو یوں تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا۔



اس لیے وہاں کی گئی تھیں۔ اپنا پروگرام خراب ہوتے دیکھ کر روجی کا موڈ آف ہو گیا۔ مگر جب جاتے جاتے شمشاد نے کہا۔

”سارا دن گھر میں گھبرانہ جاؤ۔ روپی زوپی تو ایک بجے کے بعد سکول سے آئیں گی۔ میں جاتے جاتے خالدہ سے کہے جاتی ہوں وہ غزالہ کو تمہارے پاس بھیج دے۔ یہ بات شمشاد نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہی تھی۔ ان کی عادت تھی۔ اگر گھر سے ان کے بجائے کوئی اور بھی جانے لگتا تو خواہ وہ مہمان ہو یا ابویا سلمان وہ تب تک باتیں کرتی جاتی تھیں جب تک جانے والا باہر نکل نہیں جاتا تھا۔ اور خود بھی اگر کہیں جانا ہوتا تھا تو وہ جب تک خود بھی دروازے سے نکل نہیں جاتی تھیں تب تک بولتی رہتی تھیں۔

سلمان ان کی اس طرح پیچھے سے بولنے والی عادت سے بہت گھبراتا تھا۔ امی بولتی تو وہ اچھا امی جی، اچھا اچھا امی کہتے ہوئے جلدی سے دروازہ کراس کر جاتا۔ کوفت تو روجی کو بہت ہوتی تھی۔ جب وہ کسی خالا، پھوپھو، چچا کے گھر جانے لگتی تو امی کہتی جاتی۔ دیکھو وہاں زیادہ بڑبڑ کر کے باتیں نہ کرتی رہنا۔ کم کم بولنا اور امی اور کزنز کے پاس ہی نہ بیٹھی رہنا، تھوڑا نام نانی کو بھی دینا اور پاں زیادہ دن نہیں رہنا جلدی آ جانا اور سب تو میں کر لوں گی مگر صفائی ذرا مشکل ہوتی ہے۔ سارے گھر والے ان کی اس عادت سے پریشان ہوتے تھے۔ مگر امی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ انہیں بولنے کی عادت تھی۔ اس لیے وہ بولتی رہتی تھیں۔ مگر آج ان کی آخری بات نے روجی کو خوش کر دیا تھا۔ یعنی اگر وہ نہیں جاسکتی تھیں تو کیا ہوا۔ غزالہ آ رہی تھی اور وہ بھی تھی۔ خوب کھل کر باتیں کریں گی۔ وہ جلدی جلدی صفائی ستھرائی میں لگ گئی اور جلد ہی سارے گھر کی صفائی کر کے فارغ بھی ہو گئی اور لگی غزالہ کا انتظار کرنے۔ ٹھیک نو بجے غزالہ چلی آئی۔ وہ بڑی ساری چادر اوڑھتی تھی۔

”شکر ہے تم آ گئیں۔ جانتی ہو اگر امی نہ جاتی تو میں خود تمہارے پاس آنے والی تھی۔“ روجی نے اس کو دیکھتے ہی کہا۔

”اُسی کیا مصیبت نازل ہو گئی۔“ غزالہ نے چادر اتار کر صوفے پر پھیلتے ہوئے روجی کو دیکھا۔ جب تک وہ دروازہ بند کر کے آئی غزالہ اس کے بستر پر بیٹھ چکی تھی۔ روجی بھی اس کے قریب بستر پر بیٹھ گئی اور شا کر خان کے بارے میں مزے لے لے کر ہاتھ دھو رہی تھی۔

”اس نے پہلے دن مجھے مسکرا کر دیکھا، دوسرے دن میں نے مسکرا کر دیکھا۔ وہ میرے مسکرانے کے جواب میں مسکرایا، پھر ہاتھ کا اشارے سے میرا حال پوچھا۔ تو میں نے وہیں کھڑے کھڑے روپی سے کاپی بین لے کر خط لکھا اور اسی وقت روپی کے ہاتھ سے بھجوا دیا۔“ تمہیں یاد ہے نا کہ تم نے کہا تھا جب پرویز نے تمہیں پہلی بار سلام کیا تو تم نے جوابی سلام کرنے میں دیر نہ لگائی تھی۔ میں نے بھی تمہارے کہنے پر عمل کیا۔ اچھا کیلاں۔“

اس نے اپنی پھرتی کی غزالہ سے داد چاہی۔

”ویری گڈ۔“ پھر کیا ہوا۔

”پھر یہ کد سی شام اس نے بھی مجھے لٹر لکھ دیا۔ مگر اس کے خط کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ اس لیے تمہارے پاس جانا چاہتی تھی۔ چلو خیر تم آ گئی۔ بات تو ایک ہی ہے۔ اب ذرا خط پڑھ کر میرا مسئلہ تو حل کرو۔“

”وہ خط کہاں ہے؟ دکھاؤ مجھے۔“ غزالہ نے کہا تو روجی نیکی کے نیچے ہاتھ ڈال کر لٹر نکال کر غزالہ کو دیتے ہوئے بولی۔

”اب ذرا تم اس کو غور سے پڑھو تو مجھے بتاؤ میں جواب کیا لکھوں۔“

غزالہ نے اس سے لٹر لیا۔ دو تین بار پڑھا۔ پھر کہا۔ ”اچھا! تو پتھان ہے۔ دیکھنے میں کیسا ہے۔“

”جیسے پتھان ہوتے ہیں، بہت کورا، اونچا، لمبا، خوبصورت۔“ روجی نے کچھ فخر سے کہا۔

غزالہ بولی۔ ”اچھا اچھا پتھان ہے، اس لیے اس میں سمجھ کی تھوڑی کمی ہے۔ محبت کو دوستی لکھا ہے۔“

”خیر آؤ تم بھی کیا یاد کرو گی۔ کاغذ قلم سنبھالو، میں تمہیں اس رقعہ کا جواب ایسا شاعرانہ لکھواتی ہوں کہ پڑھتے ہوئے وہ عیش عیش کراٹھے گا۔“

روپی جلدی سے اٹھی اور کاپی بین لے آئی۔ غزالہ نے شا کر خان کا لٹر ہاتھ میں لیا اور لگی روجی کو لٹر کا جواب لکھوانے۔

”کیسا جواب لکھوایا ہے؟“

”بہت زبردست۔“ روجی نے تعریف کی۔



غزالہ نے خود بھی لیٹر لے کر پڑھا۔ پھر بولی۔ ”چائے وغیرہ مہمانوں کو پوچھنے کا رواج نہیں تمہارے یہاں۔ سو کھے منہ بھیج دو گی مجھے۔“

”ارے! روجی چو نکلتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تو ابھی کھانا بھی تیار کرنا ہے اور تم روٹی زوٹی کے آنے سے پہلے نہیں جا سکتیں۔ اتنا بڑا گھر اور میں اکیلی۔ آؤ تم میرے ساتھ کچن میں ہی آ جاؤ۔ تم چائے بنانا، پیٹا اور باتیں کرنا اور میں کھانا بھی بنا لوں گی۔“ غزالہ اس کے ساتھ کچن میں آ گئی۔ پھر وہ ایک سٹول پر بیٹھی، نمکوکھاتے، چائے پیتے باتیں کرتے ہوئے روجی کو دیکھتی رہی اور روجی اس کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ کھانا بنانے لگی۔

وہ دونوں ابھی کچن ہی میں تھیں جب روٹی زوٹی سکول سے آ گئیں۔

روجی اور غزالہ کو سلام کر کے وہ اندر جانے لگیں تو روجی نے روٹی کو آواز دی۔

”روٹی پہلا دھر آؤ۔“ وہ چاہتی تھی اتنی محنت سے لکھا ہوا محبت نامہ جلد از جلد شا کر خاں تک پہنچ جائے۔

اس جلدی میں وہ یہ بھی بھول چکی تھی کہ شا کر خاں اس وقت تک آفس سے نہیں آیا ہوگا۔

روجی جیسے ہی روجی کے قریب آئی تو روجی نے گلے میں ہاتھ ڈال کر شا کر خاں کے لیے لکھا ہوا محبت نامہ نکالا۔ پھر روٹی کے ہاتھ سے بستہ پکڑ کر لیٹر دیتے ہوئے نرمی سے بولی۔

”میں تمہارا کھانا نکالتی ہوں تب تک تم بھاگ کر یہ خط اپنے بھائی جان کو دے آؤ۔“

”کون سے بھائی جان؟“ روٹی بھول چکی تھی۔

”وہی جس سے کل خط لائی تھی۔“ روجی نے مسکرا کر بتایا۔

”دے آؤں گی۔“ روٹی نے کہنا چاہا اور انکار سن کر روجی ساری نرمی بھول گئی۔

”یکو اس بند کرو! جیسا کہوں ویسا کیا کرو۔“ روجی غرائی۔ ”چلو جاؤ۔“ روٹی نے خط لیا اور چلی گئی۔

ابھی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی تھی کہ سلمان باہر کا دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوا۔ روٹی اس کو دیکھ کر رک گئی۔ سلمان نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

”تم یہاں کیوں کھڑی ہوں؟“ وہ کالج سے آیا تھا۔

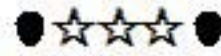
وہ بھائی جان یہ خط روٹی نے منٹھی اس کے سامنے کی۔

”روجی تو سلمان کی آواز سن کر ہی ڈر گئی تھی۔ وہ ابھی کچن کے باہر ہی تھی۔ قریب ہی غزالہ کھڑی تھی۔“

روٹی نے منٹھی سلمان کے سامنے کی تو روجی کا مارے خوف کے رنگ فق ہو گیا۔

اگر سلمان نے لیٹر کھول کر پڑھ لیا تو کیا ہوگا؟

”کیسا خط۔“ کہتے ہوئے سلمان نے لیٹر اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔



”اب کیا ہوگا غزالہ! اگر سلمان نے لیٹر پڑھ لیا تو میں ساری زندگی گھر والوں کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔ ساری زندگی کی بنی بنائی عزت یوں پل میں خاک میں مل جائے گی۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔“ روجی نے مارے گھبراہٹ کے غزالہ کو دیکھا۔ غزالہ اس میدان کی پرانی کھلاڑی تھی۔ اور کبھی بھی روجی سے دو تین برس بڑی۔ اس لیے بغیر کسی خوف کے مسکرا کر بولی۔

”ارے! کچھ نہیں ہوتا۔ لیٹر پڑھنے سے پہلے واپس لینا میرا کام ہے اور بعد کے حالات کنٹرول کرنا تمہارا کام ہے۔“ اس نے جلدی سے سامنے صوفے پر رکھی چادر اٹھا کر اوڑھی

اور کہا اب میں چلتی ہوں۔ پھر وہ بڑی پھرتی سے روٹی کی جانب لپکی کہ سلمان لیٹر کھول رہا تھا۔



”ارے مارے یہ کیا کر رہے ہو۔ میرا خط ہے۔ کہتے ہوئے غزالہ نے سلمان کے ہاتھ سے لیٹر لیا اور اس کے بغیر تیز تیز چلتی ہوئی دروازہ کراس کر گئی۔“

روحی کی جان میں جان آئی۔ مانتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک کیا، جو سردی کا موسم ہونے کے باوجود اپنی ذلت کا سوچ کر آیا تھا۔ پھر خود کو سنبھال کر روٹی کو آواز دی۔

”روٹی! تم وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ چلو اندر جا کر یونیفارم پہنچ کر اور آ کر کھانا کھاؤ۔“ پھر سلمان کو دیکھا اور کچھ بھی سوچنے کا موقع دیے بغیر مسکرا کر کہا۔ ”تم آج جلدی کیسے آگئے۔ آؤ آؤ میں نے تمہاری پسندیدہ ڈش دال کوشت اور بواکل چاول پکائے ہیں۔“ سلمان نے بہن کو دیکھا اور کہا۔

”آپا! مجھے فسوس ہے کھانا میں کھانہ سکوں گا۔ مجھے چچا کے گھر جانا ہے۔ آصف نے کہا تھا پتھر کے بعد ختم ہے لازمی آنا۔ اس لیے جلدی آیا ہوں۔“ وضاحت کر کے وہ اپنے روم میں گیا اور جلد ہی چھینچ کر کے باہر آیا اور چچا کے گھر چلا گیا۔

روحی کی جان میں جان آئی۔ اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر روٹی زوٹی کو کھانا دیا اور خود بھی اپنی پلیٹ دال چاول سے بھر کر صوفے پر آ بیٹھی اور پھر چاول کھاتے ہوئے اس نے سوچا۔

”مارے جوش کے میں یہ بھول گئی کہ شا کر بھی آفس میں ہوگا۔ اس جوش اور جلد بازی میں آج عزت ہاتھ سے چلی جانی تھی۔ خیر اب جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ اس نے اطمینان سے کھانا کھایا اور جب روٹی زوٹی بھی کھا چکیں تو اس نے روٹی سے کہا۔

”روٹی میری اچھی بہن، اب تم جاؤ اور غزالہ باجی سے وہ خط لے کر آؤ جو وہ سلمان سے لے گئی ہے۔“ اور روٹی انکار کیے بغیر اٹھ گئی جبکہ روحی اب برتن سمیٹنے لگی تھی۔

☆☆☆☆

”کھانے کے بعد نوید اور شا کر خاں چائے پی رہے تھے۔ جب دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہو سکتا ہے۔“ چائے کی سپ لیتے ہوئے شا کر خاں نے کہا تو نوید بولا۔

”وقار تو اس وقت آ نہیں سکتا کہ وہ شام چھ بجے آفس سے آتا ہے۔ یہ تمہاری محبوبہ نے لیٹر کا جواب بھیجا ہوگا۔“

”ارے!“ کہتے ہوئے شا کر خاں کپ پرچ میں رکھتے ہوئے اٹھ کر باہر گیا اور جلد ہی لیٹر لے کر واپس آ گیا۔

”میں نے ٹھیک کہا تھا۔“ نوید نے اس کے ہاتھ میں لیٹر دیکھ کر کہا۔ پوچھا۔

شا کر نے جواب دینے کی بجائے لیٹر کھولا اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

”میرے پیدے شا کر خاں صدا خوش رہو۔

سلام محبت!

یقین ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

آپ کا ارسال کردہ محبت نامہ ملایا کرازد خوشی ہوئی۔ مگر کئی بار پڑھنے کے باوجود مجھے سمجھ نہ آ سکی۔ وہ تو شکر ہے میری سہیلی غزالہ چلی آئی اور اس نے آپ کا خط سمجھنے میں میری مدد

کی۔ میں آپ کو اچھی لگی، اس کے لیے شکر یہ آپ نے پوچھا کیا آپ مجھ سے دوستی کرنا پسند کریں گی۔ آپ دوستی کی بات کرتے ہیں۔ مجھے تو آپ کو دیکھتے ہی آپ سے شدید محبت

ہو گئی ہے۔ آپ پٹھان ہیں۔ شاید اس لیے محبت کو دوستی لکھا ہے۔ خیر جو بھی ہے میرے دل میں جو تھا وہی لکھا تھا۔ یقین کریں آپ میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہیں۔ اٹھتے

بیٹھتے ہوتے جاتے آپ کو ہی اپنے سامنے پاتی ہوں۔ آپ کے بغیر اب میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آپ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ضرور لکھئے گا اور ہاں میری

سہیلی غزالہ آپ کو سلام کہتی ہے۔ اب اجازت۔

ہمیشہ کیلئے آپ کی،

روحی!“

لیٹر ختم کر کے نوید نے شا کر کو دیکھا۔ پھر مسکرا کر خط نوید کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لو تم بھی پڑھ لو۔“ نوید نے خاموشی سے خط لیا۔ پھر پڑھنے کے بعد شا کر خاں کو واپس



دیتے ہوئے ہوا۔

”چار چھ ماہ دھر رہتا ہے اور ان چار چھ ماہ میں محبت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“

”لکھنا اس کو تمہیں بھی اس سے محبت ہے۔ تم بھی سوتے جاگتے اس کو یاد کرتے ہو۔“

”یکو اس بند اور یہ کھیل بھی بند۔ محبت مجھ اپنی مگیت سے ہے۔ اب لیٹر کا جواب نہیں جائے گا۔“ شا کر خاں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ بڑی مشکل سے نوید نے اس کو لیٹر کا جواب لکھنے کے لیے ایسا گیری کیا۔ تب بھی ایک ہفتہ بعد ہی لیٹر کا جواب جاسکا تھا۔

بہر حال اب ہوتا یہ تھا، لیٹر آتا شا کر خاں کے نام تھا۔ جواب نوید لکھنا تھا۔ یوں ہی چار ماہ بیت گئے۔ لیٹر آتے رہے۔ جواب جاتے رہے۔ اب نوید کہتا تھا یا رجانے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ ایک بار اس کو یہاں بلاؤ تو کسی ذرا دیکھیں تو کسی کیلجیز ہے۔

شا کر چونکہ نوید کا مطلب سمجھتا تھا اس لیے انکار کر دیتا۔ تنگ آ کر نوید نے ٹھوڑی سی محنت کر کے شا کر کی لکھائی کی نقل کی اور جب شا کر نے لیٹر لکھ کر رکھ دیا تو نوید نے بڑی چالاکی سے کھل کر نیچے یہ ان لکھ دی۔

”کل صبح مجھے دس بجے ملے ضرور آئیں۔ اگر مجھ سے سچی محبت ہے۔“ اور پھر لیٹر بند کر کے رکھ دیا۔ شام کو روپی آ کر لیٹر لے گئی تو نوید نے کبری سانس لی۔ اس کو ڈر تھا اگر شا کر نے لیٹر کھل کر پڑھ لیا تو سارا بھید کھل جائے گا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ رات سونے سے پہلے وہ باقی کا پروگرام بنا چکا تھا۔ یہی وجہ تھی صبح اٹھتے ہی اس نے اپنی طبیعت کی ناسازی کا کہتے ہوئے چھٹی کا اعلان کر دیا تھا۔

شا کر خاں نے ناشتے کا پوچھا۔ نوید نے کہا۔ ”صرف چائے کا ایک کپ۔“

شا کر نے اس کو چائے دی اور خود پورنا ناشتہ کر کے جانے لگا تو پوچھا۔

”طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں رک جاؤں۔“

”ارے نہیں! نوید بوکھلا کر ہوا۔“ ”بس پیٹ میں ذرا سی گڑ بڑ ہے تم جاؤ۔“

اور شا کر خاں چلا گیا۔ نوید کتنی دیر بستر میں لیٹا اپنے پروگرام کے بارے میں سوچتا رہا اور غور کرتا رہا۔ وہ جو کرنے جا رہا تھا وہ صحیح تھا یا غلط۔ بات یہ نہیں تھی۔ بات یہ تھی کہ کہیں بعد میں شا کر کو پتہ نہ لگ جائے۔ ان کے جانے میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا اور آنے جانے کا سلسلہ تو شاید آخری دن تک جاری رہتا تھا کہ جواب لکھنے میں شا کر خان ٹھوڑی تاخیر جان بوجھ کر کرتا تھا۔

روجی تو لیٹر ملتے ہی دوسرے دن جواب بھیج دیتی تھی۔

نوید نے سوچا یا ایک ہفتہ وہ احتیاط کرے گا اور روجی کی بہن جب بھی لیٹر دینے آئے گی وہ یہ لیٹر خود وصول کیا کرے گا۔ یہ سوچتے ہی چھلانگ مار کر وہ بستر سے باہر آیا۔ سب سے پہلے تو ایک قریبی بیکری سے جا کر چائے کے ساتھ پیش کرنے کو کافی سارے لوازمات لے کر آیا۔ پھر روم کی صفائی کی۔ بیڈ پر نئی بیڈ شیٹ نکل کر بچھائی۔ پھر بڑے ہتمام سے خود تیاں ہوا اور لگا بے چینی سے روجی کا انتظار کرنے۔

اس نے دس بجے روجی کو آنے کا لکھا تھا جبکہ شا کر نے تین بجے آفس سے آنا تھا۔ تب تک وہ اپنا سوچا ہوا کام مکمل کر کے روجی کو واپس گھر بھجوا چکا ہوگا۔ شا کر خاں کفر شتوں کو بھی خبر نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ جو چاہتا تھا وہ کر چکا ہے۔

ٹھیک دس بجے نرم سی دروازے پر دستک ہوئی تو نوید لپک کر باہر آیا۔ دروازہ کھولا تو باہر چادر اوڑھے روجی اکیلی ہی کھڑی تھی۔

شا کر کی جگہ نوید کو سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ یہ دیکھ کر نوید نے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”ارے! آپ روجی ہیں ناں۔ میں شا کر خاں کا دوست نوید ہوں۔ آپ بھی مجھے جانتی ہوں گی۔ خط میں میرا سلام آپ کو ملتا ہوگا۔ پلیز اندر تشریف لے آئیں۔“

”وہ شا کر صاحب کہاں ہیں؟“ روجی نے اندر آنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو نوید نے مکاری سے کہا۔



”وہ اپنے روم میں بیٹھے آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔ میں آپ کو رسیو کرنے آیا ہوں۔“ یہ سن کر روجی اندر گھر میں داخل ہو گئی۔

نوید نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ پھر پہلے دروازہ بند کیا پھر روجی کی سمت مڑتے ہوئے بولا: ”اب آئیں شا کر کہ دم میں۔ روجی شرمائی، گھبرائی اس کے ساتھ روم میں آئی تو کمرہ خالی تھا نوید نے سکون سے کہا۔“

”اگر میں آپ کو باہر ہی بتا دیتا تو شاید اندر نہ آتیں۔ اصل میں شا کو ایک ضروری کام سے کہیں اچانک جانا پڑ گیا ہے۔ وہ کہتا تھا اس کے آنے تک میں چائے وغیرہ آپ کو پلاؤں۔ وہ جلد ہی آ جائے گا۔“

”آپ بیٹھیں۔“ نوید نے چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

”میں چلتی ہوں پھر کسی دن آ جاؤں گی۔“ روجی جلدی سے دروازے کی طرف مڑی۔ اس کو نوید سے کچھ خطرہ محسوس ہوا۔

”ارے! وہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو جانے دوں۔“ نوید نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

”شا کرواپس آ کر مجھ پر خفا ہو گا۔ میں تھوڑی دیر بھی آپ کا دل نہ بہلا سکا۔ چلیں شا کر کے آنے تک ہم چائے پیتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے یہ آپ کے لیے چائے کی چھوٹی میز سجا کر گیا ہے۔“ پیلیز بیٹھیں ناں! اور نوید کے صرار پر نہ چاہتے ہوئے بھی روجی کو بیٹھنا پڑا۔

نوید نے خود فلاسک پکڑ کر روجی کے لیے کپ میں چائے انڈلی۔ پھر کپ خود اٹھا کر روجی کو دیتے ہوئے کہا۔

”لیجئے، پی کر دیکھیں کیسی بنی ہے۔ ہمارے سفارغ ہونے تک یقیناً شا کر آ جائے گا۔“

اور روجی نے دوپٹہ دست کرتے ہوئے کپ تھا ملایا۔ چائے پیتے ہوئے نوید روجی کا خوف دور کرنے کیلئے بھابی بھابی کہہ کر ہلکی پھلکی بات چیت کرتا رہا اور چائے پیتے ہی وہ بے تکلفی پر اتر آیا۔

اپنا کپ واپس پرچ میں رکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر روجی کو دیکھا اور بولا۔

”آپ اٹھتی ہیں یا میں آپ کو اٹھا کر لے جاؤں بستر میں۔“

”جی کیا مطلب۔“ روجی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ پہلی بار خطرے کا احساس ہوا۔ وہ تو اس لیے ملنے آ گئی تھی کہ شا کرنے کے بھی خط میں کوئی غلط بات نہ لکھی تھی۔ پہلے ہی وہ بڑی مشکل سے بہانہ بنا کر آئی تھی اور یہاں اب معاملہ ہی کچھ اور سنگین تھا۔

”اب آ بھی جاؤ۔“ نوید آپ سے تم پر اتر آیا۔ اس کی آنکھوں میں نجانے کیا تھا۔

روجی ڈر گئی اور منت کرنے والے انداز میں کہا۔

”پیلیز! مجھے جانے دیں۔ مجھے جانا ہے۔“

”میری خواہش پوری کرو پھر چلی جانا۔“ نوید کی آنکھوں میں غماز آ گیا۔

روجی گھبرا کر دروازے کی جانب بھاگی تو نوید نے لپک کر اس کا دوپٹہ گلے سے کھینچ کر اتار لیا۔ روجی نے دوپٹے کی پروا کیے بغیر دروازے کے قریب آ کر جیسے ہی پردہ ہٹایا باہر چہرے پر گہری سنجیدگی لیے شا کر خاں کھڑا تھا۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے مجھے بلا کر؟“ یہ کہتے ہوئے روجی رو پڑی۔

شا کر خاں خاموشی سے اندر آیا۔ نوید اس کو دیکھ کر شرمندہ ہوا۔ پھر روجی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”یار میں ذرا بھابی سے ڈرامہ کر رہا تھا اور بھابی سچ بچ ڈر گئی۔“

اس نے دوپٹہ شا کر کی طرف بڑھایا، جس کو پکڑ کر شا کرنے روجی کے سر پر ڈال دیا۔ پھر کرسی پر رکھی اس کی چادر اٹھا کر اس کو دیتے ہوئے بولا۔

”ابھی آپ جاؤ، مجھے ایک ضروری کام سے پھر جانا ہے۔“ نوید نے ابھی تک آپ کے ساتھ جو کچھ بھی کیا یا کہا وہ صرف ایک مذاق تھا۔ ”پھر وہ روجی کو ساتھ لیے کمرے سے باہر آیا



تولاؤنج میں ایک اور نوجوان لڑکا کھڑا تھا۔

مگر شا کر خاں رکے بغیر اس کو دروازے کے باہر چھوڑ کر دروازہ بند کرکے اندر نوید کے پاس آیا۔ اب وقار بھی نوید کے پاس کھڑا تھا۔

اب نوید نے بجائے شرمندہ ہونے کے بلکے غصے سے کہا۔

”او کمینے! تو کہاں سے آگیا۔ میرا بنایا ہوا پروگرام خراب کرنے کو۔ سارا مزہ خراب کر کے رکھ دیا۔“

”یکو اس بند کرو۔“ اب کے شا کر خاں غرایا۔ ”اسلام آباد میں کم از کم کیوں سے نہیں کھیلے جو یہاں بھی وہ گند کرنے لگے تھے۔“

”ہاں کرنے لگا تھا تمہیں کیا تکلیف ہے۔“ نوید کو بھی غصہ آ گیا۔

”اس لیے کہ وہ لڑکی یہاں میرے نام پر بلائی گئی تھی۔ اتنا بڑا دھوکا۔ وہ تو وقار آیا تو میں نے اس کو بتایا میں آج ذرا جلدی جاؤں گا۔ نوید کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ تب وقار نے بتایا طبیعت تو تمہاری ٹھیک ہے اور یہ کہ تم کیسا غلاظت بھرا پروگرام بنا کر بیٹھے ہو۔ یہ سنتے ہی میں وقار کو ساتھ لیے فوراً آفس سے اٹھ آیا۔ تمہیں اپنی نہیں تو کم از کم دوسروں کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہم یہاں پردہ کی ہیں۔ ایک ہفتہ بعد یہاں سے چلے جائیں گے اور وہ لڑکی آج اگر تم کچھ غلط کر دیتے تو اس کی ساری زندگی تباہ ہو جاتی۔“

یہ سن کر نوید نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

”مولانا صاحب! خط آپ کے نام ضرور آئے تھے۔ جواب بر لیٹر کا میں لکھنا تھا اور اگر اتنا ہی اس کو اپنی عزت کا خیال ہوتا تو نہ آتی۔ یہاں لڑکیاں لڑکوں کے پاس کیا لینے آتی ہیں اس کو پورا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا میں۔“

”شٹ اپ! نوید ایک لفظ بھی مزید نہیں کہنا اب ورنہ پٹ جاؤ گے میرے ہاتھوں سے۔“ شا کر دھار اور وقار نے کہا۔

”چلو یا رجو ہونا تھا ہو گیا۔ اب لڑکی خیریت سے گھر واپس جا چکی ہے تم بھی سب بھول جاؤ۔“

”بھول جاؤ اگر تم مجھے بتاتے اور اگر یہاں کچھ غلط ہو جاتا تو اس کا ذمہ دار کون تھا۔“

”ہوا تو نہیں۔“ نوید نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا تو وقار نے پیچھے سے آواز لگائی۔

”یہ تم خود کو چائے پی چکے ہو ہمیں بھی پلاؤ۔“

”وہی رونا باہر آیا ہوں۔“ اب کہ نوید نے ہنس کر کہا۔ وقار مسکرا دیا۔ مگر شا کر خاں کے چہرے پر ہنوز سنجیدگی تھی۔ روجی سکون سے شا کر خان کے کہنے پر گھر چلی آئی تھی۔ اس نے یہ سوچنے کی زحمت ہی نہ کی تھی کہ جو نوید نے کیا وہ سچ تھا یا جو شا کر نے کہا تھا اس نے اگر کچھ سوچا تھا تو صرف یہ کہ چند لمحے مکاش وہ شا کر کے پہلو میں بیٹھ کر اس کا چہرہ دیکھ سکتی یا پھر نوید کا بھابی کہنا یہ مارا لگا تھا۔ پھر اس کی شرارت کا سوچ کر وہ مسکرانے لگی۔ شادی سے پہلے اتنا تنگ کیا ہے۔ شادی کے بعد اب تو بہ کتنا تنگ کرے گا۔ پھر اس نے سنجیدگی سے سوچا تو یہ کہ خدا جانے کیسا کام آن پڑا تھا جو وہ میرے جانے سے پہلے ہی چلا گیا اور آ یا بھی تو پھر واپس جانے کو اور میری عقل دیکھو۔ میں نے پوچھا ہی نہیں خیریت تو ہنا۔ خیر اب ان کا خط آیا تو پھر پوچھ لوں گی اور مطمئن ہو گئی۔

غزالہ کلاس نے نہیں بتایا تھا کہ وہ شا کر خاں کو ملنے گئی تھی۔

☆☆☆

روبی سکول سے واپس آ رہی تھی جب شا کر خاں نے لیٹر اس کو دیا اور روبی نے لیٹر لے کر وہیں بستہ کھول کر اس میں رکھ لیا۔ پھر زپ بند کر کے گھر آئی۔ اتفاق تھا کہ ذوبی دو تین دن بخار ہونے کی وجہ سے سکول نہیں جا رہی تھی۔ وہ گھر آئی تو نانی آئی ہوئی تھی۔ روبی سے نانی بے حد پیار کرتی تھی۔ روبی بستہ رکھ کر یونیفارم بدلے بغیر نانی سے گلے ملی اور پھر نانی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ شا کر کا خط روجی کو دینا اسے یاد نہ رہا تھا۔ یوں بھی روجی اس وقت بچن میں مصروف تھی اور پھر وہ ہمیشہ کی طرح شام کو جب نانی جانے لگی تو وہ ان کے ساتھ چلی گئی کہ اگلے روز چھٹی تھی۔ امی نے روکنا چاہا کہ پھر جا کر تم وہاں بیٹھ جاتی ہو۔ سکول کی پڑھائی کا حرج ہوتا ہے۔

”ایک دن میں کیا حرج ہوگا۔“ نانی نے کہا اور روبی خوش ہو گئی اور پھر ہمیشہ کی طرح وہاں رک گئی۔



ثانی ناصر ف اس کو اپنے ساتھ سلائی تھی بلکہ ہر رات ایک نئے بادشاہ کی کہانی بھی سناتی تھی۔

ادھر روپی تو نانی اماں کے گھر سکون سے تھی۔ نہ سکول جانا پڑتا تھا۔ نہ ہومورک کرتی۔ نہ امی کی ڈانٹ، نہ مارا اور گھر کے کام سے بھی جان بچی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کاش زندگی یونہی گزر جائے۔ اس کو کبھی واپس نہ جانا پڑے مگر جانا تو لازمی تھا۔

روپی وہاں جتنے سکون سے تھی روتی اتنی ہی یہاں بے سکون تھی۔

شا کر کے گھر سے آئے ہوئے اسے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ پہلا ہفتہ تو شا کر خان کے لیٹر کا انتظار کرتے گزرا تھا کہ اس نے کہا تھا میں لیٹر لکھوں گا۔ پھر روپی چلی گئی۔ وہ دن رات میں کئی چکر چھت کے لگاتی مگر ایک بار بھی شا کر خان یا نوید کی شکل دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسو باب اس گھر میں موجود ہی نہیں۔

روچی شا کر کی خیریت کے لیے پریشان تھی۔ تنگ آ کر اتوار والے دن اس نے یہ سوچ کر امی سے کہا کہ وہ خود جا کر روپی کو لے آئیں کہ اگر روپی آج بھی نہ آئی تو مزید ایک ہفتہ اور سکول کی پڑھائی کا حرج ہو گا اور امی فوراً روپی کو ساتھ لے کر چلی گئی تھی۔ رات ہونے تک امی اس کو لے کر واپس بھی آ چکی تھی۔ رات جب روپی کو ساتھ لیے روچی اپنے کمرے میں آئی تو جو پہلی بات روپی سے کی وہ یہ تھی۔

”آئندہ سے ذرا تم نانی اماں کے ساتھ جانے کا کہنا پھر دیکھنا میں تمہارا کیا حشر کرتی ہوں۔“

روپی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جواب دینے کا مطلب روچی سے تھپڑ کھانا تھا۔

وہ خاموشی سے بستر میں لیٹ گئی تو روچی نے کہا۔

”صبح اپنے بھائی جان کو خط دے کر سکول جانا۔ پندرہ دن ہو چکے ہیں، ان کی خیر خبر کا کوئی پتا نہیں۔“ یہ سن کر روپی کو یاد آیا جس دن وہ نانی کے ساتھ گئی تھی اس دن بھائی جان نے سکول سے واپس آتی ہوئی روپی کو خط دیا تھا۔ ان کا گھر روپی کے سکول کے راستے میں تھا اور وہ پہلے ہی سے روپی کے انتظار میں اپنے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ روپی خاموشی سے اٹھی اور خط روچی کو دیتے ہوئے کہا۔

”آپ! یہ خط بھائی جان نے اس دن مجھے دیا تھا جس دن میں نانی کے ساتھ گئی تھی۔ نانی کو دیکھ کر مجھے یہ خط آپ کو دینا یاد ہی نہ رہا۔“ روپی نے ڈرتے ڈرتے خط روچی کی طرف بڑھایا۔

روچی نے جھٹ لیٹر روپی کے ہاتھ سے لیا اور بڑی بے تابی سے کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا:

محترمہ روچی صاحبہ!

آداب!

امید کرتا ہوں خیریت سے ہوں گی۔

آپ نے اپنے پہلے والے لیٹر میں پوچھا تھا کہ آپ مجھے دیکھ کر مسکرا دیے تھے اور یہ کہ میں آپ کا اچھی لگی ہوں۔ پہلی بات کا جواب آج دے رہا ہوں کہ آپ کے پیچھے میرے ایک دوست کا گھر تھا۔ اس وقت وہ اپنی چھت پر کھڑا مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا تو میں بھی مسکرا دیا۔ درمیان میں چونکہ آپ نہیں اس لیے آپ غلط فہمی کا شکار ہو گئیں۔ دوسرا آپ مجھے اچھی لگیں جب آپ نے خود ہی یہ بات پوچھ لی۔ تو میں نے آپ کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے بھی لڑکیاں مردوں کو ہر حال میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ بہر حال پھر بھی میں نے آپ سے دوستی چاہی تھی کہ چھابہ چلوادھر رہتا ہے مذاق ہی یہی۔ آپ نے لفظ دوستی کو محبت میں بدل ڈالا۔ یہ آپ کی مرضی تھی۔ آپ نے لکھا میں پٹھان ہوں اس لیے محبت کو دوستی لکھ دیا۔ میں پٹھان تھا مگر ان پڑھ نہیں۔ دوستی کا مطلب میرے نزدیک دوستی ہی تھا اور محبت سے زیادہ مقدس میں دوستی کے دشتے کو سمجھتا ہوں۔ اگر دوست تخلص ہو تو مگر وہی پھر وہی روچی صاحبہ کہ آپ خود ہی مجھ سے تعلق چاہتی تھیں۔ اس لیے میں نے زیادہ وضاحت نہ کی اور دل تو چاہتا تھا کہ کھل کر آپ کو لکھ دوں کہ میں مگنی شدہ ہوں۔ محبت میں صرف اپنی ہونے والی بیوی سے کرتا ہوں۔ آپ اپنے لیٹر میں جو باتیں لکھتی تھیں ان کا جواب میں محض آپ کا دل رکھنے کو دیتا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ شروعات آپ کی طرف سے ہوئی تھی۔ اب ہم لوگ واپس جانے والے تھے۔ سو چاہا جانے سے پہلے آپ سے مل کر ایک سکویو ز بھی کر لیا جائے اور آپ کو ایک دعوت بھی کھلائی جائے مگر اچانک ایک مسئلہ ہونے پر مجھے جانا پڑ گیا اور نوید محض آپ



کو تنگ کرنے کو وہ سب کرنے لگا جو اس کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حالانکہ یہ صرف شرارت تھی اس کی۔ مگر مجھے پسند نہیں آئی۔ آپ کے جانے کے بعد میں نے اس کو بھی ڈانٹا اور آپ سے بھی معافی چاہتا ہوں۔ چھ ماہ کا وقت آپ کی وجہ سے اچھا گزر گیا۔ اس کے لیے شکریہ۔ آج شام ہم آپ کا یہ خوبصورت شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یقیناً دوبارہ زندگی میں بھی ملاقات کا امکان نہیں۔ ہو سکے تو معاف کر دیجئے گا۔

والسلام ہٹا کر خان۔

لیٹر ختم کرتے ہی رومی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ایک بار پھر اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ اور یہ دھوکا پھر محبت کے نام پر کھایا تھا۔ وہ تو طارق کو ہی بڑی مشکل سے بھولی تھی۔ یہ کھیل تو اس نے غزالہ کے کہنے پر شروع کیا تھا اور ہارا ایک بار پھر اس کا مقدر بنی تھی۔ جس پھرتی اور جوش سے یہ کھیل شروع ہوا تھا۔ اس سے زیادہ خاموشی سے ختم ہو گیا۔ کتنے دن وہ گم صم غم غم رہی۔ غزالہ آئی، پتا چلا، خوب برا بھلا کہا۔ رومی نے یہ بات پھر بھی نہیں بتائی کہ وہ شا کر کو ملنے گئی تھی۔ آخر میں غزالہ نے کہا۔

”ارے تھو کو اس پٹھان پر۔ آئندہ محبت کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھنا۔ بجا بی بی ہے۔“ رومی نے کوئی جواب نہ دیا۔

چپ چاپ سوچتی رہی اور غزالہ مزید تسلی دے کر رخصت ہو گئی۔

وقت یونہی دبے پاؤں گزرنے لگا۔ پھر وہی سونے سونے دن اور ادا سی بھری راتیں تھیں۔

سکول سے واپس آتے ہی رومی نے روپی کو دیکھ کر کہا۔

”روپی پہلے کھانا کھا لو پھر سارے برتن صاف کر کے رکھ لیا۔ آج ذرا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ اور ایک رومانی ناول اٹھا کر پڑھنے لگی۔ رومی کی طبیعت اب اسی طرح اکثر خراب ہو جایا کرتی تھی اور چھوٹی سی روپی کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آتی تھی کہ اگر ان کی طبیعت خراب ہے تو وہ لپٹ کر آرام کیوں نہیں کرتی۔ کتابیں کیوں پڑھتی رہتی ہیں۔ سوچنے کے باوجود اس نے یہ بات آپلی سے صرف اس لیے بھی نہ پوچھی تھی۔ ایک تو اس لیے کہ اس کو آپلی بے حد عزیز تھی۔ دوسرا مار کے خوف سے کہ آپلی امی سے زیادہ ہاتھ چھٹ تھی۔ اس نے بستہ برآمدے کے ستون کے پاس رکھا اور پھر آپلی کے غم کے مطابق برتن صاف کر کے کچن سے باہر آئی سی تھی کہ آپلی نے آواز دی۔

”روپی! قارغ ہو گئی تو ذرا ادھر تو آنا۔“ اور روپی ان کے قریب چلی آئی کہ وہ سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ امی اپنی عادت کے مطابق کسی بہن کے گھر گئی ہوئی تھی۔

”جی آپلی!“ روپی نے ان کے قریب کھڑی ہوتے ہوئے پوچھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بیان گڑیا سے کھیلتی ہوئی روپی کی طرف تھا۔ رومی نے ادھر ادھر دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔

”روپی یہ خط لکھ لو اور اپنے بھائی جان کو دے آؤ۔“

”کوئی بھائی جان کو وہ تو یہاں سے چلے گئے تھے۔“ روپی نے اپنے ہاتھ پر رکھے خط کی طرف دیکھتے ہوئے گویا رومی کو جتایا یا بتایا۔

”معلوم ہے مجھ کو کہ مینے لوگ یہاں سے جا چکے ہیں۔“ رومی کے لہجے میں سختی کھل گئی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر بولی۔

”ادھر آؤ میں تمہیں بتاؤں۔ وہاں کو لیے گیٹ پر آئی۔ پھر بیک سائیڈ پر بنے ایک گھر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔ وہ دیکھو سامنے جو پیلے پینٹ والا گھر ہے وہاں جو

لڑکا کھڑا ہے۔ بھاگ کر جاؤ اور یہ رقطہ سے دو آؤ۔“

”مگر کیوں آپلی؟“ روپی کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ خدا خدا کر کے تو ابھی پہلا سلسلہ ختم ہوا تھا اور اب یہ نیا لڑکا۔ روپی کو اچھی طرح یاد تھا جب ان لوگوں کی رہائش مزنگ میں تھی تب

وہ آپلی کے ساتھ سکول جایا کرتی تھی۔ تب راستے میں ایک لڑکا ان کے ساتھ ہو جاتا اور آپلی اس کے ساتھ باتیں کرتے سکول پہنچ جایا کرتی تھی۔ اور اکثر سکول سے چھٹی مار کر روپی کو

ساتھ لیے اس لڑکے کے ساتھ رکشا میں بیٹھ کر کسی پارک میں چلی جاتی۔

پھر مزنگ کی رہائش چھوڑ کر وہ لوگ یہاں نئے گھر میں شفٹ ہو گئے تو یہاں بھی آپلی نے کافی دور مگر بالکل سامنے والے گھر میں آنے والے لڑکے سے دوستی کر لی۔ پھر وہ چلے

گئے تو اب وہ روپی کو مزید نئے بھائی جان کو رقعہ دینے کا کہہ رہی تھی۔ روپی کی سمجھ میں نہ آیا یہ سب کیا ہے۔ حالانکہ روپی خود بھی کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی ان کی بیک سائیڈ کے پیلے



پینٹ والے گھر میں جو نئے لٹک آئے تھے ان کو آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ روپی باقی لوگوں کے بارے میں تو نہیں جانتی تھی جو اس گھر میں رہتے تھے۔

تاہم گیٹ اور گھر کی بالکونی میں اکثر ایک لڑکے کو کھڑا دیکھا کرتی تھی اور روپی نے اکثر یہ بھی دیکھا تھا آپلی اپنے چھوٹے سے لان میں کھڑے ہو کر ان کے گھر کی جانب دیکھتی رہتی تھی۔ ادھر وہ لڑکا بھی بالکونی میں سارا وقت کھڑا سوکھتا رہتا تھا۔ چونکہ روپی کی اپنی عمر ابھی چھوٹی تھی اس لیے وہ کوشش کے باوجود سمجھ نہیں پاتی تھی کہ آپلی ایسا کیوں کرتی ہے اور وہ لڑکا بھی سارا دن بالکونی میں کیوں کھڑا رہتا ہے۔ اس کو کرنے کیلئے شاید کوئی کام نہیں تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ آپلی سے پوچھے مگر وہ کبھی نہ پوچھ سکتی کہ سارے گھر میں اس کو آپلی سے سب سے زیادہ پیار تھا۔ وہ ان کے بارے میں کوئی غلط بات سوچ ہی نہ سکتی تھی اور پھر اس کے پاس سوچنے کو نام ہی کب تھا۔ سکول سے آتے ہی وہ کھانا کھاتے ہی روپی کے ساتھ گڈے گڈی کا کھیل کھیلتی۔ کھیل سے فارغ ہوتی تو آپلی ان کو پڑھانے بیٹھ جاتی اور اب پھر اس کو نئے لڑکے کو ورقہ دینے کا کہہ رہی تھی۔ روپی نے روپیوں ہچکچاہٹ کا اظہار کرتے دیکھا تو بجائے سختی کے نرمی سے بولی۔

”دیکھو روپی! میری اچھی بہن! یہ خط اس لڑکے کو دینا بہت ضروری ہے۔ تم تو میری پیاری لڑیا ہو۔ چلو شاہاش بھاگ کر جاؤ اور یہ خط اس کو دے آؤ۔ دیکھو یہ سامنے ہی تو گھر ہے۔ تمہارا سآ نے تک میں تمہارے لیے چسپ تلتی ہوں۔“ رشوت کے طور پر کہا اور یہ سنتے ہی روپی نے خوش ہو کر کہا۔

”اچھا آپلی! ابھی دے آتی ہوں اور تمھی بند کر لی۔“

”اور سنو۔“ روپی کو جاتے دیکھ کر روچی آہستگی سے بولی۔ ”اس بات کا ذکر کسی اور سے نہیں کرنا۔“

”کبھی نہیں کروں گی۔“ روپی نے کہا اور خط منھی میں دبا کر بھاگ گئی۔ گھر سے باہر آتے ہی روپی پوری تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی اس لڑکے کے پاس گئی جو اپنے گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ لڑکے کے قریب پہنچ کر وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

”یہ لیجئے بھائی جان! آپلی نے دیا ہے۔“

”اچھا۔“ لڑکا مسکرایا۔ وہ شاید خود بھی روپی کا منتظر تھا فوراً خط لے کر جیب میں ڈال لیا۔ پھر بالکھیرتا ہوئے بولا۔

”ارے! آپ تو بہت پیاری بچی ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا۔ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں۔“ یہ سنتے ہی روپی نے شرما کر کہا۔ ”روپی!“

روپی واپس گھر بھاگ گئی اور گھر میں آپلی اس کی منتظر تھی۔

”دیکھتے ہی پوچھا۔“

”دے آئی ہو ان کو لیٹر۔“

”جی آپلی! دے آئی ہوں۔“ روپی نے اپنی لڑیا اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کسی نے دیکھا تو نہیں؟“ روچی نے پھر پوچھا۔

”نہیں آپلی اس کے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔“ روپی نے اپنی لڑیا کو کیڑے پہاتے ہوئے کہا۔

”خط لے کر نہوں نے کچھ کہا بھی تھا۔“ روچی نے پھر پوچھا تو روپی جھنجھلا گئی۔ تاہم جواب تو دینا ہی تھا۔

”لڑیا کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بے زاری سے بولی۔ ”آپلی وہ کہہ رہے تھے تم بہت اچھی ہو۔“

”وہ تو تم ہو ہی اچھی۔“ آپلی نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔ پتا نہیں یہ پیار روپی پر آیا تھا یا کسی اور پر۔ روپی نے اکتا کر اپنی لڑیا اور کھلونے اٹھائے اور روپی کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے جانے کی سوچی۔ صرف اس وجہ سے کہ آپلی کوئی اور سوال نہ پوچھ لے۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے پوچھا۔

”آپلی میری چسپ کہاں ہیں؟ جس کا آپ نے وعدہ کیا تھا؟“

”آلو کاٹ کر رکھے ہیں، ابھی تل کر دیتی ہوں۔“ روچی نے کہا اور کچن میں چلی گئی اور روپی زوپی کے لئے چسپ تلنے لگی اور اس لڑکے کے بارے میں بھی سوچنے لگی جو اس کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔



تجی بات تو یہ ہے طارق کے بعد جب شا کر خاں نے بھی دھوکا محبت کے نام پر دیا۔ محض اپنا نام اچھا گزرنے کے لیے وہ اس کے ساتھ رقعہ بازی کرتا رہا تو روجی کا دل ایک بار پھر محبت سے متغیر ہو گیا تھا اور روجی نے دل میں سوچ لیا تھا خواہ کوئی کچھ بھی کہے (مطلب غزالہ) کو اب کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ وہ اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم تھی۔ گرمی رخصت ہونے کو تھی۔ اکتوبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ ایک دن لان میں ٹہل رہی تھی۔ جب پیلے بینٹ والے گھر کی جانب، محض اتفاق سے نگا اٹھ گئی۔ وہاں ایک لڑکا بالکونی میں کھڑا اس کو دیکھ رہا تھا۔ روجی اسی وقت اندر اپنے روم میں چلی گئی مگر یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔

روجی کی عادت تھی پڑھتے پڑھتے جب تھک جاتی تو ناول ہاتھ میں لیے لان میں آ جاتی۔ واک بھی ہوتی رہتی۔ پڑھتی بھی رہتی۔ روجی محسوس کرتی اس لڑکے کو روجی کو دیکھنے کے علاوہ جیسے دنیا میں کوئی اور کام نہیں تھا۔ روجی پڑھتے پڑھتے ٹہلتے ٹہلتے دانستہ دانستہ کئی بار بالکونی کی جانب دیکھتی اور اس کو ہمیشہ وہاں کھڑا پاتی۔ اب تو وہ روجی کو دیکھنے پر مسکراتے لگا تھا۔

مگر روجی مسکراتا تو دور کی بات فوراً رخ پھیر کر اپنے روم میں چلی جاتی۔ وہ سوچتی اب میں کسی کے چکر میں ہرگز نہیں آؤں گی۔ مگر ہوا یہ کہ۔ پرسوں جب وہ گھر کی صفائی کرنے کے بعد گیٹ کے باہر والا حصہ دھو رہی تھی تب بالکونی والے لڑکے نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے منہ سے کچھ کہے بغیر خط اس کے ہاتھوں پر پھینکا اور خود آگے بڑھتا چلا گیا۔

روجی نے ادھر ادھر دیکھ کر لے فوراً چھپا لیا۔ پھر جلدی جلدی اپنا باقی کا کام ختم کر کے اندر آئی اور لیٹر کھول کر پڑھنے لگی لڑکے نے روجی کی بے رخی کا شکوہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”مائی ڈیر گرل!

سلام محبت!

آپ کو دیکھنے کے لیے سارا وقت بالکونی میں سوکھتا رہتا ہوں۔ مگر آپ کو پروا ہی نہیں۔ مجھ سے زیادہ اہمیت تو آپ کے نزدیک اپنی کتاب کی ہے جس پر سارا وقت نگاہ جمائے رکھتی ہیں۔ مگر میں بھی ہمت ہارنے والا نہیں۔ اگر محبت کرنا جرم ہے تو میں یہ جرم کر چکا ہوں۔ اب آپ جو بھی سزا دیں اور اگر میری محبت پر یقین کر کے مجھ پر رحم کھا کر اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیں تو مہربانی ہوگی۔ یقین کریں مجھے آپ سے تجی محبت ہو چکی ہے۔ محبت میں یقین پہلی شرط ہے۔ آج بہت مجبور ہو کر اس لیٹر کے ذریعے اپنے دل کی حالت بتا رہا ہوں۔ پلیز جواب سے ضرور نوازیئے گا مہربانی ہوگی۔

والسلام، جمشید۔

روجی نے لیٹر پڑھا تو دل میں یکدم عجیب سا احساس جاگ اٹھا۔ کوکہ وہ اب کبھی نہ محبت کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی مگر بہت سوچ کر اس نے جمشید کے خط کا جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اب کہ سنجیدہ نہیں تھی۔ یعنی اس نے غزالہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ویسے وہ دیکھنا بھی چاہتی تھی کہ لڑکے نے جو کچھ لکھا ہے وہ کتنا سچ ہے۔ ویسے بھی اس نے سوچا اگر شا کر خاں اچھا نام پاس کرنے کے لیے اس کا استعمال کر سکتا ہے تو وہ بھی ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔ انہی خیالات میں گم اس نے چپس ٹل کر روٹی زروٹی کو دیئے اور اپنی پلیٹ اٹھائے اپنے روم میں آ گئی۔

شام کے وقت روٹی ہوم ورک سے فارغ ہو کر باہر سہیلیوں کیساتھ گراؤنڈ میں کھیل رہی تھی کہ اچانک جمشید نے آواز دے کر اس کو بلایا کیونکہ گراؤنڈ ان لوگوں کے گھر کے سامنے ہی تھی۔ روٹی کو اگرچہ جمشید کا بلانا بہت ناگوار گزرا۔ مگر کے اندر آپی نہیں کھیلنے دیتی اور باہر گراؤنڈ میں آئی تھی تو یہ منحوس آگیا۔ تاہم آپی کا خیال کر کے جلتا تو تھا ہی۔ وہ برا سامنے بناتے ہوئے ان کے قریب چلی آئی اور بڑی بے زاری سے جمشید کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے بھائی جان!؟“

”چیونکہ کھاؤ گی؟“ جمشید نے پوچھا۔

”آپ کے پاس ہے۔“ روٹی نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں تمہارے لیے لے کر آیا ہوں۔“ اس نے جیب سے ایک نکال کر روٹی کو تھمایا تو روٹی نے حیران ہو کر پوچھا۔



”کیا سب کی سب میں لے لوں۔“ یعنی آج تو موجیں ہو گئی تھیں۔ گھر کے اندر آپی نے چپس بنا کر کھلائی تو باہر سے چیونگم کا پورا ایکٹ مل رہا تھا۔ روبی کی بات سن کر جمشید بولا  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں ساری چیونگم تم لے لو۔“

وہ رک پھر ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے بولا۔ ”لیکن یہ خط اپنی آپا کو پہنچا دو۔“

”جاؤ، شاباش۔ پہلے بھاگ کر خط ان کو دے آؤ پھر چیونگم کھانا اور خوب کھیلنا۔“ یہ سنتے ہی روبی نے رقحان کے ہاتھ سے چھٹ لیا اور پوری تیزی سے بھاگتی ہوئی جب گھر میں داخل ہوئی تو روجی امی کے پاس بیٹھی چاول جن رہی تھی جبکہ امی پالک کاٹ رہی تھی۔ روبی نے آؤ دکھانا تو اس رفتار سے آپا کے قریب آ کر کی اور خط روجی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”آپی! یہ خط انہوں نے دیا ہے۔“

روبی نے گھبرا کر امی کو دیکھا۔ وہ روبی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

روجی نے جلدی سے روبی کے ہاتھ سے لیٹر لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا چھا غزالہ نے دیا ہوگا۔ خود آتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے جو لیٹر لکھ دیا۔“ قبل اس کے روبی وضاحت کرتی کہ خط غزالہ کا نہیں ہے بھائی جان کا ہے۔ روجی نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”روبی جاؤ میرے دم سے ذرا کھڑ کریم تو اٹھا کر لانا۔“ روبی فوراً اندر چلی گئی تو شمشاد نے پوچھا۔

”کس کا خط ہے؟“ حالانکہ روبی سے خط پکڑتے ہوئے کہا بھی تھا کہ غزالہ نے لکھا ہے۔ مگر انہوں نے شاید سنا نہیں تھا۔ روجی نے کہا۔

”امی غزالہ کا ہے اور کس کا ہوگا۔ میں چند روز پہلے ایک ناول لائی تھی ان کے گھر سے اس کی واپسی کا لکھا ہے۔“ روجی نے خط ان کے سامنے کھول کر پڑھا۔ صرف انہیں یہ یقین دلانے کو کہ یہ خط غزالہ ہی کا ہے۔ حالانکہ وہ ایسا نہ بھی کرتی تو ماں اس پر شک کرنے والی نہیں تھی کیونکہ وہ روجی پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ خود وہ گھر میں کم ہی رہتی تھی۔ انہیں گھومنے پھرنے کی عادت تھی۔ کوئی کام ہو یا نہ ہو۔ وہ آج ایک بہن کے گھر جا رہی ہے تو کل دوسری کے، پرسوں بھائی کے گھر جا رہی ہے تو ترسوں دیور کے ہاں۔ ان کی اس عادت سے بھی روجی نے قائلہ ہوا تھا تھا تاہم غزالہ کے ملنے کے بعد بہت آزاد خیال ہو گئی تھی۔ ایک تو ماں روجی پر اندھا اعتماد کرتی تھی اور پھر وہ گھر میں بھی کم ہی رہتی تھی۔ ان کی زیادہ غیر موجودگی میں غزالہ زیادہ سے زیادہ ان ہی کے گھر میں رہتی تھی۔ اچانک روجی چاؤل والی پرات ایک سائیڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔

”امی! میں ذرا روبی کو غزالہ کا ناول دے آؤں۔“

اور جلدی سے اپنے روم میں آئی جہاں روبی ابھی تک کریم تلاش کر رہی تھی۔ ”روبی یہ کیا حماقت تھی۔“ روجی نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا کیا ہے میں نے؟“ روبی نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ جانتی تھی روجی آپا کو بات بے بات مارنے کی عادت تھی مگر وہ روبی کو مار کر محرم نہیں بننا چاہتی تھی۔ حالانکہ جی تو یہی چاہ رہا تھا۔ روبی کو اس حرکت پر اس کا گلا دبا کر وہ جلاک کر دے۔ روجی نے بھی روبی کے چہرے پر خوف دیکھا تو نرمی سے بولی۔

”روبی اب تم اتنی بھی چھوٹی نہیں ہو کہ بات کو سمجھ نہ سکو۔ تمہیں یہ خط مجھے امی کے سامنے نہیں دینا چاہیے تھا۔“

”مگر کیوں آپا؟“ روبی ان کی بات کا مطلب ٹھیک سے نہ سمجھ سکی تھی۔

”کیوں کو چھوڑ کر اب میری بات غور سے سنو۔ آئندہ امی تو کیا کسی کے سامنے بھی مجھے خط نہ دینا۔ جب بھی تمہارے بھائی جان تم کو خط دیں چھپالیا اور سیدھی میرے روم میں آنا اور میرا تکیہ اٹھا کر اس کے نیچے رکھ دیا کرنا۔“ پھر پرس سے چوٹی نکال کر روبی کو دیتے ہوئے بولی۔ ”اب یہ ناول لو بھاگ کر جاؤ اور غزالہ باجی کو دے آؤ اور سنو باہر امی کے پاس رکنا نہیں۔ چلو جاؤ۔“

روبی ان کے فریاد اور غم سے پر حیران ہوتے ہوئے گھر سے باہر آ گئی۔ سب سے پہلے وہ غزالہ کے گھر گئی۔ اس کی امی اور بھابی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ جب غزالہ کہیں نظر نہ آئی تو روبی نے غزالہ کے بارے میں اس کی امی سے پوچھا۔ غزالہ کی امی نے ٹھنکے ہوئے کونانے کے لیے کہا، اپنے کمرے میں ہو گئی اور کہاں جانا ہے اس معصوم نے۔ ایسی شریف بچی ہے۔ سارا دن اپنے کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ مجال ہے جو ادھر ادھر آئے جائے۔“ روبی مزید باتیں سننے کی بجائے غزالہ کے روم میں آئی تو وہ بھی بستر پر لیٹی کوئی



کتاب پڑھ رہی تھی۔ روبی نے سلام کرنے کے بعد ناول اس کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ آپ نے دیا ہے ناول۔“ غزالہ کو تھا کروہا پس جانے لگی تو غزالہ نے پوچھا سنو روبی! روجی کیا کر رہی تھی۔  
 ”وہ بھی کتاب پڑھ رہی تھیں۔“ روبی نے بہت سوچ کر جواب دیا۔

پھر باہر آ گئی۔ گراؤنڈ میں اب تک بچے کھیل رہے تھے۔ وہ تب تک ان سب کے ساتھ شور کرتے کھیلتی رہی جب تک سلمان بھائی نے آواز دے کر گھر آنے کو نہیں کہا۔ وہ گھر آئی تو سب کھانا کھا رہے تھے۔ وہ بھی ہاتھ دھو کر ان کے ساتھ کھانے لگی۔

روجی نے رات سونے سے پہلے اپنے خط کا جواب پڑھا اور مسکرا دی۔ لڑکا اس کے لیے ضرورت سے زیادہ بے تاب تھا۔ اس نے روجی کے لیے بے حد خوبصورت الفاظ میں بہت زیادہ تعریف کی تھی۔ روجی نے سوچا لڑکا سنجیدہ ہے یا نہیں مگر میں نے جو پہلے غلطی کی تھی اب نہیں کروں گی کہ ادھر خط آیا ادھر فوراً جواب لکھ دیا۔ اب تو خوب تڑپا تڑپا کر جواب لکھوں گی۔ جب وہ انتظار کرتے کرتے مڈھل ہو جائے گا۔۔۔۔۔ جبکہ روبی روجی کو لیٹر پڑھتے دیکھ کر سوچ رہی تھی اب پھر وہی مصیبت، روز نے بھائی جان کے پاس جانا ہوگا۔ کبھی خط دینے، کبھی جواب لینے۔ مگر وہ حیران رہ گئی۔ جب اگلے روز تو کیا بہت دنوں تک بھی روبی کو خط دینے کا نہیں کہا تھا۔

تاہم روبی اکثر دیکھتی آپا اب پہلے سے بھی زیادہ ٹائم لان میں گزارتی اور اس لڑکے کے گھر کی جانب دیکھتی رہتی اور وہ لڑکا بھی کبھی گیٹ پر، کبھی بالکونی میں اور کبھی گھر کی چھت پر کھڑا مسکرا کر آپا کو دیکھتا رہتا۔ پھر وہ سنجیدہ رہنے لگا اور ایک دن اتفاق سے روبی نے دیکھا وہ اپنی بالکونی میں کھڑا آپا کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ آپا اس کو ہاتھ جوڑتے دیکھ کر مسکرائی۔ پھر اپنے روم میں چلی گئی جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ یہ ایک رہائشی سکیم تھی اس لیے اس کا دکائی مکان ابھی تعمیر ہوئے تھے۔ کچھ گھر تعمیر ہو رہے تھے، تاہم کچھ پلاٹ ابھی تک یوں ہی پڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دنوں محبت کا کھیل بڑی آزادی سے کھیل رہے تھے۔

جس دن اس لڑکے نے آپا کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے اسی دن جب روبی شام کو کھیلنے کے لیے گراؤنڈ میں جانے لگی تو آپا اس کے پیچھے دروازے تک آئی۔ پھر رقعہ اس کو دیتے ہوئے بولی۔

”تمہارے بھائی جان! وہاں گیٹ پر کھڑے ہوں گے۔ پہلے یہ خط ان کو دے دینا پھر کھیلنا۔“ روبی نے خاموشی سے رقعہ پکڑ لیا کہ انکار قبول تھا۔ اس کے بعد خط دینے اور لینے کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ پہلے ہیل تو روبی کو اپنے کھیل کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ مگر جب یہ آپا اور جمشید کا کھیل طویل ہو گیا تو وہ ان کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے کیوں رہتے ہیں اور ان لیٹر میں باتیں کیسی لکھتے ہوں گے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔

تاہم ان الجھنوں کے باوجود وہ خوش تھی۔ کیونکہ اب آپا اس کو مارتی نہیں تھی بلکہ انار روبی کو اپنے پاس سے پیسے بھی دے دیتی تھی۔ ادھر جمشید بھائی مافی اور چیونگم مفت میں دے دیتے تھے۔

سکول میں سب سہیلیاں اس کی بہت عزت کرنے لگی تھیں۔ کیونکہ وہ یہ سب چیزیں ان میں بانٹ کر کھاتی تھی۔  
 کسی اور کا تو روبی کو پتہ نہیں خود روبی کا وقت اچھا گزرنے لگا تھا۔

عیش ہی عیش تھی اور وہ بھی اسی دوران اس نے پانچویں کا امتحان بڑی محنت سے فل تیاری کر کے دیا تھا۔ زلٹ والے دن جب روبی تیار ہو کر جانے لگی تو روجی نے پکارا۔  
 ”روبی ابھی ٹھہر دو سہیلی، میں اپنا پرس پکڑ لوں، مجھے تمہارے ساتھ جانا ہے۔“

”آپ بھی آپا میرے ساتھ جائیں گی۔“ روبی نے حیرت اور خوشی سے پوچھا۔  
 ”ہاں! چننا آج میں تمہارا زلٹ سننے خود جاؤں گی۔“

”اماں سے میں نے اجازت لے لی ہے۔“ روجی نے پرس پکڑتے ہوئے بتایا۔

” واقعی!“ روبی نے کہا۔ پھر خوشی خوشی آپا کے ساتھ گھر سے باہر آئی۔ ابھی وہ پیلے پینٹ والے مکان سے تھوڑی دور رہی تھی کہ روبی نے دیکھا جمشید بھائی اپنے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولے کھڑے تھے۔ یہ دیکھ کر روبی نے آپا کو بتانا ضروری سمجھا۔



”آپ وہ سامنے جمشید بھائی کھڑے ہیں۔“

روحی نے حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا اگر یہ بات ہے تو تم اکیلی سکول چلی جاؤ میں ذرا تمہارے بھائی جان سے تھوڑی باتیں کر لوں۔“

”مگر آپ! آپ نے امی سے میرے ساتھ جانے کے لیے اجازت لی تھی اب آپ میرے ساتھ چلیں۔“ روبی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ مگر روحی اس کا احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے پرس سے ایک دو پیسہ نکال کر اس کو دیتے ہوئے بولی۔

”روبی مجھے تمہارے بھائی جان سے بہت ضروری بات کرنی ہے اب تم تنہا سکول جاؤ اور واپسی پر مجھے ساتھ لے جانا۔ یاد رکھنا روبی واپس گھر جاتے ہوئے تم نے یاد سے مجھے ساتھ لینا ہے اور خبردار جو اس بارے میں اگر کسی کو کچھ بتایا۔“

روحی نے آخری بار روبی کو کپکپاتی اور گیٹ چھوڑ کر دوسری سائیڈ پر بنے ہوئے ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

مگر روبی کتنی دیر آنکھوں میں نمی لیے وہیں فسر رہی کھڑی رہی۔ اس نے جب سے سکول جو ان کیا تھا تب سے کبھی بھی اس کے ساتھ گھر سے کوئی اس کا زلٹ سننے نہیں گیا تھا۔ اس کی سب سہیلیوں کے ساتھ ان کے گھر سے کوئی نہ کوئی لازمی آتا تھا۔ کوئی اپنے ابو کے ساتھ آتی تھی تو کوئی امی کے ساتھ کوئی اپنی باجی کے ساتھ تو کوئی بڑے بھائی کے ساتھ۔ مگر وہ ہمیشہ اکیلی ہی ہوتی تھی۔ اس نے کئی بار امی سے کہا بھی تھا۔ امی کا جواب تھا۔

”میں تمہارے ساتھ جا کر کیا کروں گی۔ زلٹ ہی سننا ہے جا کر سن آؤ۔“ اور آج اگر آپ اتفاق سے آئی بھی تھی تو راستے میں ہی رہ گئی تھی۔ روبی دل ہی دل میں جمشید کو برا بھلا کہتے ہوئے سکول چلی گئی۔ اس نے پورے سکول میں تیسری پوزیشن لی تھی۔ زلٹ سننے کے بعد سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔ ایسے میں روحی کا خیال اس کے ذہن سے بالکل نہیں گیا۔ کھیلتے کھیلتے بہت دیر بعد اس کو آپ کا خیال آیا تو کیڑے جھاڑتی ہوئی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تقریباً بھاگتی ہوئی جمشید کے گھر روانہ ہو گئی۔

☆☆☆☆

روحی ادھر ادھر دیکھ کر جلدی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی تو جمشید نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر روحی کی جانب مڑا اور محویت سے اسے دیکھنے لگا جبکہ روحی ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی تھی۔ خاصا کشادہ ڈرائنگ روم تھا جس میں بہت قیمتی اور خوبصورت صوفے لگے تھے فرش پر قالین اور درپچے کے پردے بہت خوبصورت تھے اور ریشم کے تھے۔ چھت میں لگا فائٹس بہت زیادہ قیمتی تو شاید نہیں تھا مگر تھا بہت خوبصورت جدید انداز کے ڈیکوریشن پیس ڈرائنگ روم کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

روحی بظاہر تو ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی لیکن درحقیقت دھیان سارا پیچھے کھڑے جمشید پر تھا۔ وہ اس کی نگاہوں کی پیش اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ اس کو یقین تھا جمشید کی نگاہیں اسی پر جمی ہوں گی۔ وہ تو بالکل کوئی میں کھڑا سا اور وقت اس کو دیکھتا رہتا تھا۔ اب تو وہ اس کے بے حد قریب کھڑی تھی۔

”اب بیٹھو روحی! کب تک یونہی کھڑی رہو گی۔“ وہ جمشید کی آواز سن کر چونکی۔ پھر مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ کھڑے بین کا گرے لکر کا شلوار سوٹ پہنے ہوئے تھا اور آنکھوں میں محبت لیے روحی کو دیکھ رہا تھا۔ روحی کے دیکھنے پر شکوہ کیا۔

”روحی ڈیر! کتنا ترپا ترپا کر تم میرے لیٹر کے جواب دیتی ہو اور کب سے ملنے پر زور دے رہا تھا مگر تم آج آئی ہو۔“

روحی اس کی بات سن کر مسکرائی پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ جاب کی تلاش میں فارغ ہوتے ہیں۔ اس لیے لیٹر لکھنے اور ملنے کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں جبکہ مجھے گھر کے اندر بہت سارے کام ہوتے ہیں۔ آج بھی روبی کا زلٹ سننے کے لیے اجازت ملی ہے۔ روبی بے چاری تھا ہو کر اکیلی سکول چلی گئی اور میں آپ کی خواہش پر یہاں رک گئی۔“

”تمہاری آمد کا شکریہ روحی! مگر شاید تم میری محبت پر یقین نہیں کرتی ہو۔ تمہیں میری بے قراریوں کا اندازہ نہیں۔ میری زندگی میں تم سے پہلے کوئی لڑکی نہیں آئی اور نہ ہی اب تمہارے بعد آئے گی۔ میں نے تم سے محبت کی ہے تو شادی بھی تم سے کروں گا۔“

روحی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سکون سے اس کو دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سنتی رہی۔ دل میں طارق اور شا کر خان کا خیال تھا۔ اس نے سوچا لڑکے کے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اپنا دل



بہلاتے ہیں اور پھر لڑکیوں کو روٹی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

اس کو خاموش دیکھ کر جمشید نے پھر محبت بھری نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
”کیا میری محبت اور باتوں پر یقین نہیں آیا جواب بھی خاموش ہو۔“

یہ سن کر روجی سنبھلی پھر کہا۔

”آپ کی محبت پر یقین نہ ہوتا تو یہاں کیسے آتی۔“ یہ سن کر جمشید نے اس کے بہت قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔  
”اس بار جب کے سلسلے میں جو انٹرویو دیا تھا اس میں کامیاب رہا ہوں۔ اب پرسوں سے میں ڈیوٹی جو آئن کر رہا ہوں۔“  
”مبارک ہو! یہ تو بہت خوشی کی بات سنائی آپ نے۔“ روجی نے مسکرا کر کہا۔

”اس برس کے آخر میں بڑی باجی کی شادی طے ہے۔ ان کی شادی کے بعد امی اور باجی کو تمہارے گھر بھجوا دوں گا۔“ جمشید نے اپنا پروگرام بتایا تو روجی نے معصوم بن کر پوچھا۔  
”وہ کس لیے۔“ حالانکہ امی باجی کے آنے کا مطلب صاف تھا۔

”تمہیں اپنی بنانے کے لیے۔“ جمشید نے سامنے ٹیبل پر رکھی فروٹ والی باسکٹ میں سے کیلا نکال کر اسے تھمایا اور خود چھری پکڑ کر سیب چھیلنے لگا تو روجی نے چھری اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

”لائیں چھری مجھ دیں، میں چھیلتی ہوں اور جمشید چھری اس کو تھما کر باتیں کرنے لگا۔“ اب وہ روجی کو اپنی فیملی کے متعلق بتا رہا تھا۔ روجی جس پتے فروٹ کھاتے اس کی باتیں سنتی رہی۔ خود وہ کم ہی بولی تھی۔

تاہم جب جمشید نے اس کو رنگ پہنانی چاہی جو وہ بہت محبت سے اس پہلی ملاقات کا گفٹ سمجھ کر لایا تھا تو روجی نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔  
”میں اس کو نہیں لے سکتی۔ کلڈ کی ہے۔ گھر والوں سے کیا کہوں گی۔“

”گھر والوں کو کلڈ کی بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کہہ دینا آرٹی فیشل ہے۔“ جمشید نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”آئی ایم سوری، میں اس کو ابھی نہیں پہن سکتی۔ میری مجبوری سمجھیں۔“ ہاں یہ وعدہ رہا جب اس کو پہننے کا موقع آیا تو ضرور پہنوں گی اور جمشید مان گیا اور وہ سب کچھ بھول کر اپنی باتوں میں کھو گئے۔ چونکہ تو اس وقت جب روہی نے زور زور سے ڈرائنگ روم کا دروازہ پینٹا شروع کیا۔

روہی جو بے خودی جمشید کے ہاتھوں میں اپنا تھوڑے بٹھی تھی چونک پڑی۔ پھر جلدی سے جمشید کے ہاتھوں سے اپنا تھوڑا لٹے ہوئے بولی۔  
”یقیناً روہی آئی ہے۔“ جلدی سے جا کر دروازہ کھولیں۔

”پہلے یہ بتاؤ پھر کب ملو گی۔“ جمشید نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جب بھی موقع ملا لکھ کر بتا دوں گی۔ ابھی دروازہ تو کھولیں۔“ اور جمشید نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ روہی فوراً اندر آئی اور روجی کو پکارا۔

”آپی جی! آپی جی! اب چلیں۔“ اور روجی تو پہلے ہی جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ روہی کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگی تو جمشید نے اس کا ہاتھ زری سے دباتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ ادھر روہی کو خوف تھا۔ آپی لیٹ ہونے پر اس کو ڈانٹنے کی مروت دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آپی کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔

”تمہارا رزلٹ کیا رہا؟“ راستے میں روجی نے پوچھا۔

”آپی! میں سکس کلاس میں ہو گئی ہوں اور میں نے پورے سکول میں تیسری پوزیشن لی ہے۔ یہ دیکھیں مجھے انعام بھی ملا ہے۔“ روجی نے اس کے ہاتھ میں پکڑا پیکٹ دیکھا۔ پھر شاباش دینے کے بعد یہاں سے اس کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

”دیکھو روہی! تم میری پیاری سی بہن ہو امی کو یہ مت بتانا بلکہ کسی کو بھی نہ بتانا کہ میں تمہارے ساتھ سکول نہیں گئی تھی۔“

”کبھی نہیں بتاؤں گی آپی۔“ روہی نے انہیں دلایا اور دونوں گھر میں داخل ہو گئیں۔ گھر میں امی زوہی کے علاوہ سلمان بھائی اور ابو بھی موجود تھے۔ روہی روجی کو دیکھتے ہی سب



نے روپی کدز لٹ کیا رے میں استفسار کیا۔

”ارے بھی لپاس ہو گئی ہے ہماری روپی بلکہ تیسری پوزیشن بھی لی ہے۔“ روجی نے کہا اور فو رائے نے روم کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ روپی بھاگ کر باپ کی کوڑ میں چڑھ گئی تھی۔

”ابو میرے پاس اور تیسری پوزیشن لینے پر آپ مجھے کیا انعام دیں گے؟ ویسے مجھے سکول سے بھی انعام ملا ہے۔“ روپی نے لاڈ سا اٹھلا کر پوچھا۔

”بھئی جو بھی ہماری بیٹی کہے گی وہی لا دیں گے۔“ ابو نے شفقت سے کہا۔

”ابو جی! میرے پاس بڑے بالوں والی گڑیا نہیں جبکہ روپی کے پاس ہے۔ بس آپ مجھے ویسی گڑیا لا دیں۔“ روپی نے جلدی سے بتایا۔

”ٹھیک ہے بیٹا کل ہی آپ کو گڑیا مل جائے گی۔“ ابو نے اس کی پیشانی چوم کر کہا تو روپی سلمان بھائی کے پاس آ گئی۔

”بھائی جان! آپ مجھے کیا تحفہ دیں گے؟“ روپی نے پوچھا۔

”صرف ایک چیونٹ۔“ سلمان نے ہنس کر کہا۔ تو پاس بیٹھی روپی بولی چیونٹ میں بھی لوں گی۔ روپی کی بات پر سب ہنسنے لگے تو روپی نے ماں سے پوچھا۔ ”امی آپ کو معلوم ہے میں نے پورے سکول میں تیسری پوزیشن لی ہے۔ آپ مجھے کیا انعام دیں گی؟“ شمشاد بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔

”جلدی سے بتائیے امی جان!“ روپی نے جھل کر کہا۔

”ارے میں تمہیں کورس کی نئی کتابیں لے دوں گی۔ بھلا اور کیا دوں گی۔ دیکھو فریڈا جیڈن بدن بڑھ رہا ہے جبکہ تمہارا باپ۔“

”خدا کے لیے اب تم اپنی غریبی کا رونا مت دینا۔“ نصیر نے کہا۔

اتنے میں روجی بھی اندر سے آ کر ان سب کی باتوں میں شامل ہو گئی۔ گھر میں داخل ہوتے وقت جو لگا سا خوف اس کے چہرے پر موجھتا تھا وہ اب زائل ہو چکا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے ان سب سے باتیں کرنے لگی۔ روپی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی روجی نے کہا۔

”میں تو اپنی ننھی مٹی سی بہن کو سوٹاپنے ہاتھوں سے ہی کر دوں گی۔“

پھر وہ روپی کو سکول سے ملنے والا پیکٹ کھول کر دیکھنے لگی۔ بچوں کی کہانیوں والی بک تھی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر روجی نے چادر اوڑھتے ہوئے پوچھا۔

”امی جان! اگر آپ اجازت دیں تو میں غزالہ کے گھر چلی جاؤں۔“ اصل میں وہ اپنی آج والی جمشید کی ملاقات کا حوالہ غزالہ کو سننا چاہتی تھی۔

”ہاں..... ہاں چلی جاؤ۔“ شمشاد کو اپنی بیٹی پر فخر تھا۔ وہ سارے گھر کو کتنی محنت سے سنبھالتی تھی۔ وہ روجی کی ہر بات بغیر اعتراض کے مان جاتی تھی اور غزالہ کا گھر دور ہی کتنا تھا۔

روپی روپی کو لے کر غزالہ کے گھر آئی۔ اس وقت بھی رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ مگر غزالہ ان سب میں نہیں تھی۔ روجی نے بڑے ادب سے سلام کیا پھر پوچھا۔

”خالہ جی! غزالہ کہاں ہے؟“

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اپنے کمرے میں ہے۔ تم بھی وہیں چلی جاؤ۔“ انہوں نے کہا تو روجی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کیا وہ غزالہ کو خالہ جان؟ مجھے تو کچھ خبر نہیں۔“

”اب آئی ہو تو خود ہی جا کر دیکھ لو۔“ خلدہ بیگم نے کہا۔ پھر چونکتے ہوئے کہا۔

”ارے! آؤ پہلے کھانا کھاؤ۔“ یہ سن کر روجی نے کہا۔

”خالہ جی! کھانا میں ابھی ابھی گھر سے کھا کر آئی ہوں۔“ روجی روپی کو لیے غزالہ کے کمرے میں آئی۔ تو وہ اپنے پیٹ پر لیٹی ناول پڑھ رہی تھی۔ یقیناً کوئی دلچسپ سین تھا جو وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ مسکرا رہی تھی۔

”ارے دادا! تمہارے تو بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ خالہ جان کہہ رہی تھیں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں اور تم یہاں ہٹی کٹی لیٹی پڑھ رہی ہو۔“ روجی نے چادر اتارتے ہوئے کہا۔

”ہائے روجی تم آئی ہو۔“ غزالہ ناول رکھ کر اٹھی اور اچھل کر روجی سے لپٹ گئی۔ سچی مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم آئی ہو۔ باقی رہی طبیعت کی خرابی کی بات وہ تو گھر کا کام نہ کرنے کا بہانہ



ہے۔“ روہی اس دوران کمرے میں ایک کونے میں بچھی دروی پر بیٹھ چکی تھی۔

دن ہوتا تو روہی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے چلی جاتی مگر اس وقت تو رات تھی۔ مجبوری کی حالت میں بیٹھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی باتیں سننے لگی کہ اب اپنے کان تو نہیں بند کر سکتی۔ حالانکہ جس قسم کی وہ بات چیت کرتی تھیں وہ بچوں کے تو کیا بڑوں کے سننے کے لائق بھی نہیں تھی۔

”اتنے یقین کی بات چھوڑو۔“ روجی اس کو چٹکی بھرتے ہوئے بولی۔ اب یقین آ گیا ہے تو یہ بتاؤ طبیعت ٹھیک ہے تو یہاں کیوں پڑی ہے جبکہ باہر سب لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔

”یار بتایا تو ہے طبیعت کی خرابی کام سے بچنے کے لیے ہے۔“ ویسے میری طبیعت تھوڑی خراب بھی ہے۔ اب کے غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری طبیعت کتوں میں اچھی طرح سمجھتی ہوں غزالہ کی بچی۔“ روجی نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے چل چل میری طبیعت کو چھوڑ۔ یہ بتاؤ آج کئی کہاں تھی؟“ غزالہ نے آہستہ سے پوچھا۔

”اچھا تو تم اب میری ٹو میں رہتی ہو۔“ روجی نے ہنس کر کہا۔

”جناب! میں تمہاری ہی نہیں سبھی کی ٹو میں رہتی ہوں۔ دیکھو یہ میرے روم کی ونڈویہ سارا دن کھلی رہتی ہے۔ باہر جو کچھ ہوتا ہے اس میں سے سب نظر آتا ہے۔ مجھ سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی۔ میں نے آج تمہیں دیکھا تھا اور ساتھ کسی اور کو بھی۔“ غزالہ بات ختم کر کے ہنسنے لگی۔

”تم بہت بے ہودہ ہو غزالہ۔“ روجی جھینپ کر بولی۔

”میں بے ہودہ ہوں تو تم خود کیا ہو۔ کیا تو لیٹر کے جواب، کئی کئی دن تر ستر سا کر اس کو دیتی ہو اور اب ملاقات کر لی۔ وہ بھی مجھے بتائے بغیر۔“ غزالہ نے روجی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”خدا کے لیے آہستہ آہستہ بولو۔ غزالہ! کیا بے ہودگی ہے۔“ روجی نے غصے سے کہا۔

”ارے بھائیہ بے ہودگی ہے جو میں نے کہا اور جہاں مہتر مہ خود شریف لے گئیں وہ کیا تھا۔“

”تمہارا سر!“ روجی نے کہا اور مسکرا دی۔

”اچھا جی میرا سر اور ان کا غزالہ اونچی آواز میں ہنسی۔

”خدا کے لیے غزالہ۔۔۔ خدا کے لیے آہستہ بولو کوئی تمہارے گھر سے سن نہ لے۔“ روجی خفزدہ ہو کر بولی۔

”اچھا بھئی! آہستہ بولتی ہوں۔ مگر یار زرا یہ تو بتاؤ ملاقات کا معاملہ طے کیسے ہوا۔ تمہیں تو روز روز لیٹر کا جواب لکھتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی تھی اور اب مل بھی آئی ہو۔“ غزالہ نے پوچھا تو روجی دھیمی آواز میں بولی۔

”اب میں تمہیں کیا بتاؤں وہ کسی طور میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ہر خط میں ملنے کا مطالبہ۔ آخر مجبور ہو کر مجھلنا پڑا۔“ روجی خاموش ہوئی تو غزالہ نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

”یار بتایا تو ہے وہ ہر خط میں ملو ملو لکھتا تھا۔ پھر میں کیا کرتی۔ پہلے تو مجھے کوئی بہانہ نہیں سوچتا تھا اور رات کو گھر سے نکلتے ہوئے مجھ سے ہی خوف آتا تھا۔ آج اتفاق سے روہی کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ بس اسی بہانے گھر سے نکلی تھی۔ اتفاق سے اس وقت وہ بھی گھر میں آیا تھا۔ اس لیے ملاقات آسان ہو گئی اور میں تمہیں کیا بتاؤں غزالہ! وہ کتنی باتیں کرتا ہے اور اپنی محبت کے بارے میں کتنے بڑے بڑے دعوے۔ میرا ہاتھ جو اس نے اپنے ہاتھوں میں لیا تو تب چھوڑا جب روہی مجھے لینے آئی۔“

”ہاتھ چھوڑ کر اب یہ بتاؤ باتیں کیا کیا ہوئیں؟“ غزالہ نے پوچھا تو روجی اس کے کانڈھے پر سر رکھ کر وہ سب رپیت کر کے ہنسنے لگی اور روجی بولی۔

”واقعی؟“ روہی نے غزالہ کی آواز سن کر پھر وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں اور روجی بولی۔

”جانتی ہو جب میں آ رہی تھی تو کہتا تھا جانے سے پہلے یہ بتاؤ پھر کب ملوں گی؟ میں نے کہا جب موقع ملے لکھ کر بتا دوں گی۔ تب کہیں اس نے آنے کی اجازت دی اور جب میں آ رہی تھی اس کی بے چینی دیکھنے والی تھی۔ روہی مزید کچھ دیر بیٹھی بے زاری سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ بہت سوچنے کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ کیسی باتیں تھیں۔ آخر سر جھٹک کر اٹھتے ہوئے بولی۔



”آپنی مجھے نیند آ رہی ہے اب گھر چلیں۔“

روچی نے چونک کر روٹی کو دیکھا۔ جیسے اس کی موجودگی کو بھول چکی تھی۔ پھر چادر اٹھاتے ہوئے بولی۔

”اچھا غزالہ اب میں چلتی ہوں تم آنا کسی دن۔“

”ضرور ضرور کیوں نہیں۔“ غزالہ نے ہنس کر کہا اور روچی زوٹی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے گھر سے باہر آئی۔

روچی اور جمشید کا سلسلہ یونہی بغیر کسی رکاوٹ کے چل رہا تھا۔ گھر کے حالات بھی وہی تھے۔ یعنی ماں کا گھومنا پھرنا اور روچی کا گھر سنبھالنا۔ اس روٹن میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اگر فرق آیا تو صرف اتنا کہ شمشاد بیگم نے روچی کی شادی کا فیصلہ کرتے ہوئے رشتہ کروانے والیوں کو روچی کے لیے اچھا سا رشتہ تلاش کرنے کو کہہ دیا تھا۔ روچی اُمی کا یہ فیصلہ سن کر بے حد خوش ہوئی تھی اور تصویر ہی تصویر میں اس شخص کو دیکھنے لگی تھی جس کے ساتھ اس کی شادی ہونا تھی۔

موسم سرما کی آمد آمد تھی اور روچی پوری طرح شادی کی تیاری میں لگ گئی تھی۔ اس دن مشین رکھے دو نئے لحاف کے غلاف سی رہی تھی۔ شمشاد بیگم ہمیشہ کی طرح زوٹی کو ساتھ لیے اپنے بڑے بھائی سے لڑائی ہونے کے بعد دل کی بھڑاس نکالنے آج چھوٹے بھائی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ جبکہ روٹی کورس کی کتابیں سامنے رکھے پڑھنے میں محو تھی ایسے میں غزالہ چلی آئی۔ اس بار وہ کافی دنوں بعد آئی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے بھئی؟“ اس نے روچی کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”دیکھ تو رہی ہو لحاف کا غلاف سی رہی ہوں۔“ روچی نے سلائی کرتے ہوئے اس کو دیکھے بغیر جواب دیا۔

”یعنی سردیوں کی تیاری شروع۔“ غزالہ نے کہا۔

”ظاہر ہے بندے کو ٹائم سے پہلے ہی اپنا کام مکمل کر کے رکھنا چاہیے۔ تم دیکھنا ایک دو بارش ہونے کی دیر ہے۔ سردی کا آغاز ہو جائے گا۔ باطل تو روز آ جا رہے ہیں۔“ روچی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”یہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اچھا یہ بتاؤ خالہ جان اور زوٹی کدھر ہیں؟“ غزالہ نے تنہا بیٹھی روٹی کو پڑھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”میری امی کا تو تمہیں پتہ ہے کہیں نا کہیں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ تاہم آج بطور خاص گئی ہیں چھوٹے بھائی کے گھر۔ محض دل کی بھڑاس نکالنے۔ بڑے ماموں سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہی سب چھوٹے کو بتانے گئی ہیں۔“ روچی نے مشین سے کپڑا نکل کر سیزر سے دھاگہ کاٹتے ہوئے تفصیل سے بتایا۔ یہ سن کر غزالہ تھوڑی دیر چپ رہی پھر پوچھا۔

”تم سناؤ تمہارا اور جمشید کا سلسلہ کیسا چل رہا ہے؟“

”ویسے ہی جیسا پہلے چل رہا تھا۔“ روچی نے سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”میری طرح تم بھی جمشید کو ہی پکڑ کر بیٹھ گئی ہو۔“ غزالہ نے کہا۔

”غلط نہ کہو یا۔ میں نے اس کو نہیں پکڑا وہ بے وقوف خود ہی مجھے نہیں چھوڑ رہا۔ کہتا ہے مجھ سے پہلے اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی اور نہ ہی اب کوئی آئے گی۔ جبکہ اصرامی نے رشتے کروانے والی خالہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ میرے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کرے۔“ روچی نے بتایا تو غزالہ نے چھیڑا۔

”روچی تم نے شادی کر لی تو بے چارے جمشید کا کیا ہوگا؟“

”مائی فٹ۔“ روچی نے نفرت سے ناک سکیڑ کر کہا۔ ”طارق شاکر نے میرا سوچا تھا۔ جو میں جمشید کا سوچوں گی۔ یہاں سب اپنا سوچتے ہیں۔ میں بھی جہاں میرے والدین میری شادی طے کریں گے وہاں خوشی خوشی شادی کر لوں گی۔ جانتی ہو جب میں طارق سے محبت کرتی تھی تو مجھے اس کے سوا کوئی دنیا میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پھر جب وہ مجھے بتائے بغیر چھوڑ کر چلا گیا تو میں نے حالات سے سمجھنا کر لیا۔ مگر بہت مجبوری کی حالت میں کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ بمشکل میں نے خود کو سنبھالا کہ وہ مجھے بھولتا ہی نہیں تھا۔ نہ اس کی باتیں نہ اس کا چہرہ۔“

پھر جب طارق کے بعد شاکر خاں میری زندگی میں آیا تو میں نے کبھی بھول کر بھی طارق کو یاد نہیں کیا تھا۔ مگر افسوس صد افسوس کے شاکر نے بھی دھوکا دیا اور اب یہ جمشید وہ سنجیدہ



ہوسکتا ہے میرے لیے۔ جیسی کہو جانتیں کرتا ہے۔ وہ رکی، مسکرائی پھر زہر خند سے کہا مگر میں شروع ہی سے جمشید سے سنجیدہ نہیں تھی، نہ ہوں۔ یہ سوچ کر کہ کل کو وہ بھی مجھے طارق اور شا کی طرح چھوڑ کر جاسکتا ہے۔ حالانکہ کہتا تو وہ ہر ملاقات میں یہی ہے کہ میں تم سے شادی کر لوں گا اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں اس کی زندگی کی پہلی اور آخری تمنا ہوں۔ بہر حال دیکھو وقت کیا گل کھلاتا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر جاتا ہے یا میں ہی شادی کر کے اس کو چھوڑ جاؤں گی۔ طارق اور شا کی طرح کہ کبھی کہ دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ خیر تم اپنے پرویز کی سناؤ۔“ روجی نے بات ختم کر کے شرارت سے غزالہ کو دیکھا۔

تو وہ بولی۔ ”روجی سچی بات تو یہ ہے کہ میں کسی ایک جگہ تک نہیں سکتی۔ نہ ہی کسی ایک بندے کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ سکتی ہوں۔ شادی کے بعد یہ سب نہیں چلے گا۔ ویسے بھی یار زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ مرد دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔ باقی رہی گناہ اور ثواب کی بات تو اس بارے میں میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔“

”بہت بدتمیزی ہو۔ غزالہ توبہ کرو۔“ روجی نے اسے گھور کر دیکھا۔

”بدتمیزی نہیں۔ حقیقت پسند ہوں۔ اب دیکھو میں سڑک پر جا رہی ہوں۔ ایسے میں اگر مجھے کوئی مسکرا کر دیکھتا ہے۔ اپنا دل خوش کرتا ہے تو اس میں میرا کیا جاتا ہے۔ دل خوش کرنا تو ویسے بھی نیکی کا کام ہے اور پھر اس میں میرا بکڑتا ہی کیا ہے؟ قسم سے مجھے تو ان لڑکیوں پر بہت غصہ آتا ہے جو راہ چلتے لڑکوں کے چند جملے سن کر خواہ مخواہ ہی شکل بگاڑ لیتی ہیں۔ ارے بھئی یہی زندگی ہے۔ وہ بھی چار دن کی چاندنی پھر اندھیری راتیں۔ غصہ اور ہنسناؤ۔ خوش رہو اور دوسروں کو بھی خوش رکھو۔ میں تو اسی فلسفے پر عمل کرتی ہوں اور میرے نزدیک اسی کا نام زندگی ہے۔ یہ بھی سوچو اگر ہمیں لڑکے نہ دیکھیں تو ہمارا دنیا سنو نا سب بے کار ہے، بلکہ ساری لائف ہی بے کار ہے۔ باقی رہی یہ بات کوئی کیا کہے گا؟ کیسا کہے گا؟ تو میں ان باتوں کی پروا نہیں کرتی۔ اللہ نے لوگوں کو زبان دی ہے۔ تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کہیں گے۔ پھر لوگوں سے کیوں ڈروں۔“

”اب آتی ہوں پرویز کی طرف۔ وہ نا صرف بہت اچھا ہے بلکہ امیر بھی بہت ہے۔ ساری فیملی کویت سیٹل ہے۔ ویسے بھی وہ مجھ سے کہتا ہے مجھ سے شادی کرے گا۔ پتہ نہیں سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر شادی کرے تو بھی ٹھیک ہے نا کرے تو بھی پروا نہیں۔ ویسے بھی میری شادی میری ماں کی ذمہ داری ہے۔“ غزالہ نے شان بے نیازی سے اپنے بالوں کو جھٹکتے ہوئے کہا اور مسکرا کر روجی کو دیکھا۔

”توبہ غزالہ کی بچی تو کتنی مڈر ہے۔ دوسروں کو خوش کرتے رہو۔ گھر سے چاہے جوتے پڑ جائیں۔“

”ارے! ہاں جوتے پر یاد آیا۔“ غزالہ ایک دم چونک کر بولی۔ ”کل رات تو واقعی مجھے جوتے پڑتے پڑتے رہ گئے۔“

”وہ کسے؟“ روجی نے متعین روک کر اس کو دیکھا۔

”روجی تمہیں تو پتہ ہے پرویز رات کو رقعہ لینے آتا ہے۔ میں چھت سے نیچے پھینک دیتی ہوں۔ رات جونہی میں نے رقعہ نیچے پھینکا اسی وقت بھائی جان دروازہ کھل کر باہر نکل آئے۔ وہ تو خیر ہوئی پرویز نے ہوشیاری سے ہاتھ میں پکڑا رومل نیچے پھینکا اور پھر رومال اٹھاتے ہوئے رقعہ بھی اٹھا لیا۔ اس کے باوجود بھائی جان کو شک ہو گیا۔ وہ فوراً پلٹ کر اندر آئے۔ تب تک میں بھاگ کر نیچے آ گئی تھی بلکہ امی کے ساتھ لیٹ کر آنکھیں بھی بند کر لیں۔ بھائی جان نے مجھے سوتے دیکھا تو واپس چلے گئے۔ اگر مجھے ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو نجلانے کیا ہو جاتا۔ شاید قیامت ہی آ جاتی۔ بھابی تو پہلے ہی میرے خلاف بھائی کے کان بھرتی رہتی ہیں۔ بہت بد معاش ہیں۔ وہ تو بھائی جان امی کی وجہ سے مجھے کچھ نہیں کہتے۔“ یہ سب سن کر روجی نے کہا۔

”تم خود یہ خطرہ کیوں مول لیتی ہو؟“ روپی کا سہارا لے لو۔ اب مجھے ہی دیکھو کتنے لمبے عرصے سے جمشید کا سلسلہ چل رہا ہے بلکہ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے اور گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔“

”اچھا کمال ہے۔ یہ مشورہ تم نے پہلے کیوں نہیں دیا۔“ غزالہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔ تو روجی مسکرا کر بولی۔ ”اب جو دے دیا ہے۔“ غزالہ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولی۔

”یار! اصل میں تمہارے والد اتنا سامنے ہی رہتا ہے جبکہ پرویز کو کچھلی دو گھیاں چھوڑ کر آنا ہوتا ہے۔ جس دن مجھ سے رقعہ لینا ہوتا ہے اور چھت پر چڑھ کر اسے دکھا دیتی ہوں اور رات کو وہ خود لینے آ جاتا ہے۔ ملنے پر آج کل وہ بھی بہت زور دے رہا ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ ذرا سردیاں شروع ہو جائیں۔ پھر رات کو ملنے جاسکتی ہوں۔ دن میں تو بہت مشکل ہے کہ میرے گھر میں میری ایک عدد بد معاش قسم کی بھابی بھی رہتی ہے۔ اچھا سنو کل یاد سے روپی کو بھیج دینا میں اس کو چھت پر لے جا کر پرویز کا گھر دکھا دوں گی۔ پھر روپی رقعہ لے بھی آیا



کرے گی اور دے بھی آیا کرے گی۔ بس تم یاد سے بھیج دینا۔“ غزالہ نے تائید کی۔

”فکر مت کر۔ کل روپی آجائے گی۔“ روجی نے ہنس کر کہا اور غزالہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ روجی بھی لحاف کے غلاف سی چکی تھی۔ مشین اٹھا کر اندر سٹور میں رکھی اور خود رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔

روپی وہیں برآمدے کے ستون کے پاس بیٹھی تھی۔

کتاب اس کے سامنے کھلی تھی مگر وہ پڑھنے کی بجائے روجی اور غزالہ کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ اب کچھ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔

روجی کے ساتھ ساتھ غزالہ کی ذمہ داری بھی روپی پر آن پڑی۔ جس کو وہ بحالت مجبوری انجام دینے لگی تھی کیونکہ روجی کا حکم تھا۔ اور وہ آپنی کی بات سے انکار کر کے پٹنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر غزالہ کا شاید ستارہ ہی ان دنوں گردش میں تھا۔ اصل میں پرویز کا گھر کافی دور تھا۔ اس لیے روپی نے انکار کر دیا تھا۔ ہاں پرویز شام کے وقت آتا اور رقم دے بھی جاتا اور لے بھی جاتا کہ اس وقت روپی باہر گراؤنڈ یا گلی میں کھیل رہی ہوتی تھی۔

ایک دن جونہی پرویز نے گلی سے گزرتے ہوئے روپی کو خط دیا تو غزالہ کی ماں نے دیکھ لیا۔ وہ بالکل اچانک اپنے گھر سے باہر آئی تھی۔ ابھی روپی نے رقم پکڑ لی تھی کہ غزالہ کی امی نے آکر اس کی کلائی پکڑ لی اور پھر یونہی کلائی پکڑے اس کو شمشاد بیگم کے پاس لے آئی اور پھر جو کچھ خالہ بیگم نے آنکھوں سے دیکھا تھا وہ سب شمشاد بیگم کو بتا دیا۔



”کیوں ری روپی! یہ تیری خالہ کیا کہہ رہی ہے۔ کس کا رقم تھا اور کس نے دیا تمہیں۔“ ماں جو بیٹھی ساگ کاٹ رہی تھی اسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

قریب ہی روجی بیٹھی ساگ کوڑ کا لگانے کے لیے پیاز کاٹنے کے بعد اور کچھیل رہی تھی۔ روپی کے جواب دینے سے قبل روجی نے منت بھری نظروں سے اس کو دیکھا گویا آنکھوں ہی آنکھوں سے کہہ رہی ہو میری اچھی بہن بتانا مت۔ یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔ اگرچہ روجی روپی کو بہت مارتی تھی ڈانٹتی تھی۔ چھوٹی ہونے کے باوجود گھر سے بہت سارے کام روپی سے لیتی تھی۔ اس کے باوجود روپی کو آپنی سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ پھر وہ کیوں نا آپنی کی عزت رکھتی۔ چھوٹی تھی اس لیے نہیں جانتی تھی۔ آپنی کی عزت بچاتے ہوئے وہ خود اپنی عزت شاید ہمیشہ کے لیے کھودے گی۔ وہ چپ چاپ کھڑی سوچ رہی تھی۔ اب کہہ تو کیا۔ بچ بول دے یا آپنی کی عزت رکھ لے۔

”ارے بولتی کیوں نہیں اور وہ رقم کہاں ہے؟“ ماں نے کڑھکی سے پوچھا تو روپی نے خاموشی سے خط والا ہاتھ ان کی جانب بڑھا دیا۔ شمشاد نے رقم پکڑ کر روجی کو دیا اور کہا۔

”ڈرا پڑھ تو سہی کیا لکھا ہے اس میں۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔“ انہوں نے روپی کو گھورتے ہوئے کہا۔

روجی نے جلدی سے ان سے رقم لیا۔ مرنی کیانہ کرتی۔ مصیبت سر پہ کھڑی تھی۔ جس کو وہ صرف اپنی ہوشیاری سے ٹال سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہی کوشش کی۔ جتنا سنسر کر سکتی تھی کر کے ماں کو سنایا اور شمشاد کے کچھ بولنے سے پہلے ہی غزالہ کی ماں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”توبہ توبہ! ارے ماں پانچ وقت کی نمازی۔ بڑی بہن اس قدر نیک پاک مگر تو کس پر گئی۔ انہوں نے گھور کر روپی کو دیکھا تو روپی کا جی چلایا ابھی اس کی بیٹی کا نام لے کر سارا پول کھول دے۔ گر آپنی کے ڈر سے وہاں نہ کر سکی اور خالہ نے کہا۔“

”بہن اب ذرا اپنی بچی کا خاص خیال رکھنا کہیں اور کچھ غلط سلط نہ کر بیٹھے۔ ابھی عمر ہی کیا ہے جو ابھی سے ان کاموں پر لگ گئی تو آگے چل کر کیا کیانا کرے گی۔“ پھر بچے کے بلانے پر وہ اٹھ کر چلی گئی۔ دل ہی دل میں وہ شمشاد بیگم کو ارچہ کر کے بے حد خوش تھی۔ ابھی کل ہی تو منوری نے اس کو بتایا تھا۔

شمشاد کہہ رہی تھی تمہاری بہو بے چاری کیلی سارا گھر سنبھالتی ہے۔ غزالہ سارا وقت فارغ بیٹھی کھاتی پیتی ہے یا پھر کہانی والی کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔ خالہ کو یہ سب سن کر بے حد غصہ آیا تھا۔ اس نے تو منوری کو بتا رکھا تھا اس کو ایک نمبر کی بد معاش بہو ملی ہے۔ جو خود دل کر پانی بھی نہیں پیتی۔ سارا گھر میری غزالہ سنبھالتی ہے۔ پھر بھی شوہر کو میری بیٹی کی خلاف سکھاتی پڑھاتی رہتی ہے۔ انہوں نے منوری سے بھی کہہ دیا۔ ارے شمشاد تو ایک نمبر کی جھوٹی عورت ہے۔ سارا وقت خود پھرتی رہتی ہے اور بیٹی سامنے والے لوڈے سے آنکھ لڑاتی رہتی ہے۔ پر میں نے بھی تم سے روجی کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا اور اب وہ مسکراتی اپنے گھر کو جارہی تھی۔ غزالہ کی ماں چلی گئی شمشاد نے روپی سے پوچھا۔



”کون ہے ولہڑ کا جس نے تمہیں یہ دیکھ دیا؟“ روجی نے جلدی سے روٹی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ماں کی مار کے خوف سے۔

”ارے اب بولتی کیوں نہیں۔ بتاتی کیوں نہیں۔ کون ہے ولہڑ کا۔ نام بتاؤ تا کہ ابھی تمہارا باپ اور بھائی جا کر اس کو سیدھا کر کے آئیں۔“ روٹی پھر بھی چپ رہی تو شمشاد بیگم نے ساگ اور داتر ایک طرف رکھا اور روٹی کو بالوں سے پکڑ لیا۔ پھر پورے زور سے ایک تھپڑ روٹی کے منہ پر مارتے ہوئے پوچھا۔

”بتاتی کیوں نہیں؟ کس نے دیا تھا یہ دیکھ نہیں۔ نام کیا ہے اس حرام زادے کا۔ کیا وہ مجھے اور تمہارا بے باپ کو نہیں جانتا تھا۔“

”امی گلی میں گرا پڑا تھا، میں نے اٹھالیا۔ غزالہ کی ماں نے جھوٹ بولا کہ کسی لڑکے نے دیا۔“ روٹی نے ماں کی مار سے بچنے کے لیے جلدی سے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”ہاں امی!“ روجی بات سنبھالنے کو جلدی سے خود بھی بول پڑی۔ ”لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے بات بڑھا چڑھا کر کرنے کی۔ ہو سکتا ہے روٹی نے گلی سے ہی اٹھالیا ہو۔ آپ خود ہی سوچیں اتنی چھوٹی سی بچی کو۔ کوئی خط لکھ سکتا ہے اور پھر غزالہ کی ماں کی عادت کا بھی آپ کو پتہ ہے۔ ان کو الفب کا پتہ چلتے تو چھوٹی ی تک خود ہی چلی جاتی ہیں۔ ایسی عورت سے خدا بچائے۔ اللہ بھی کہتا ہے کسی کا عیب دیکھو تو پردہ ڈال دو اور یہ اتنی چھوٹی سی بچی کو بدنام کرنے۔“

”تم چپ رہو روجی! اگر یہ سچی تھی تو غزالہ کی ماں کے سامنے یہ سب کیوں نہ کہہ دیا جواب کہا ہے۔ آج میں اس کو نہیں چھوڑوں گی۔“ شمشاد نے روجی کو تھڑک کر روٹی کو پکڑ لیا۔

”مگر امی میری بات تو سنیں۔“ روجی نے پھر کہا کہ جانتی تھی بات کھلی تو وہ خود ملوث ہو جائے گی۔“

”تم تو اب جی بکواس بند کرو۔“ روجی کی ماں نے پھر اس کو ڈانٹ دیا۔ پھر روٹی کو نفرت سے گھورتے ہوئے بولی۔

”بول ری آوارہ کب سے چل رہا یہ سلسلہ۔ اس اتنی سی عمر میں یہ شوق تمہیں کہاں سے چڑھ گیا۔ ارے کم بخت! بد کردار! بے غیرت! ابھی تو تمہاری عمر بارہ سال ہے اور ابھی سے تیری یہ حرکتیں کہ پیدا ہوتے ہی تجھے عاشقی معشوقی کی سوجھی۔“ ماں نے پہلی بار اس کے لیے گندی زبان استعمال کی تھی اور مارتے ہوئے تو وہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتی تھیں کہ کہاں کہاں چوٹ لگ رہی ہے۔

روٹی مار کھاتے ہوئے زور زور سے رونے لگی۔ روجی خاموشی سے اس کو بچھے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ ماں کا موڈ بے حد خراب تھا۔ اسی وقت نصیر صاحب گھر میں داخل ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی روجی نے ہاتھ میں پکڑا خنوار اٹھا دیا کہ ان کے ساتھ ہی سلمان بھی ہوتا تھا اور اگر خط پڑھا جاتا تو ساری بات کھل جاتی اور وہ خود بھی رسوا ہوتی۔

”ارے مارے کیا ہوا۔ کیوں مار رہی ہو بچی کو۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر روٹی کو چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بچی ہے؟“ شمشاد نے دانت پیس کر روٹی کو دیکھا اور روجی موقع سے فائدہ اٹھا کر روٹی کو جلدی سے اپنے روم میں لے گئی۔“

”کیا ہوا۔ امی بہت غصے میں ہو۔“ باپ کے پیچھے ہی سلمان بھی اندر آ گیا تھا۔

شمشاد کو کسی بڑے چھوٹے کی عزت رکھنے کی عادت نہیں تھی مگر آج تھوڑی دیر کے لیے سوچا بتائے یا نہ بتائے اور پھر سب کچھ ان کو بتا دیا۔ بات بہت بڑی تھی۔ دونوں باپ بیٹا سن کر اپنی جگہ سر جھکا کر رہ گئے۔ کافی دیر سکوت چھایا رہا بالآخر سلمان نے باپ کو دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔

”امی جان اگر ابھی سے یہ حالت ہے تو پھر مزید روٹی کو سکول بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ آگے جا کر وہ کوئی بڑی غلطی بھی کر سکتی ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ شمشاد نے فوراً کہا۔ نصیر صاحب تو بس چپ چاپ کچھ سوچتے جا رہے تھے۔ اور اندر روجی کے قدم میں بیٹھی روٹی بھی یہ سب باتیں سن رہی تھی اور سکول نہ جانے والا یہ فیصلہ روٹی کو منظور نہیں تھا کیونکہ پڑھائی سے اس کو بے حد دلچسپی تھی اس نے ایک نظر آپنی کو دیکھا پھر قہقیلے لہجے میں کہا۔

”آئی اگر میرا سکول جانا بند ہوا تو میں امی جان کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گی کہ قصور دار میں نہیں غزالہ یا آپ خود ہیں۔“

”کیا کہا۔“ روجی کو اس کی دھمکی سن کر غصہ تو بے حد آیا مگر ضبط کے سوا اس وقت کوئی چارہ نہ تھا۔ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی روٹی کو گھورتی رہی پھر باہر چلی آئی اور کہا۔

”امی جان تعلیم تو آج کے دور میں بے حد ضروری ہے۔ آخر شادی بھی تو کل کو کرنی ہے اور ان پڑھ لڑکیوں کو۔ کوئی بھی پسند نہیں کرنا۔ کالج بے شک نہ بھیجے گا مگر کم از کم میٹرک تو کر لینے دیجئے۔ ویسے میں خود بھی اس کو سمجھا دوں گی اور اس کا خیل بھی رکھوں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے! جان!“ اس نے باپ سے ان کی رائے پوچھی۔

”میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اچھے شے کے لیے میٹرک تو ہونا چاہیے۔ کل کو شادی تو لازمی کرنی ہے۔ بہر حال اب یہ تمہارا فرض ہے تم بڑی بہن ہو اچھی طرح سمجھا دینا۔ پھر ایسی



غلطی نہ کرے۔“ ابا جان نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

روحی کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وفوراً اندر چلی گئی۔

حمیدہ اپنی جگہ شور مچاتی رہ گئیں مگر فیصلہ روپی کے حق میں ہو گیا تھا۔

سلمان کو باپ کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا مگر بظاہر خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تاہم غصہ اس کو روپی پر حد سے زیادہ آ رہا تھا۔ پھر اس نے سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

”آج کھانا ملے گا یا نہیں؟“

”ارے روحی تم بھی اندرجا کر بیٹھ گئی ہو۔ کھانا کون لگائے گا۔“ یہ سنتے ہی روحی باہر آئی۔ روپی کو اس وقت اس نے خود ہی باہر آنے کو نہیں کہا تھا کہ ماں اور سلمان کے موڈ کو سمجھ رہی تھی اور یہ بھی جانتی تھی سلمان نے زیادہ مارا تو وہ سب کچھ صاف صاف بتا دے گی۔ تاہم جب سب کھانا کھا کر اپنے اپنے روم میں چلے گئے تو وہ روپی کو لے کر باہر آئی۔ پھر کھانا اس کو دیتے ہوئے بولی۔

”کھانا کھا کر ساگ اور پا لکدھو کر باڈی میں ڈالنا میں پھر چو۔ لہے پر رکھ دوں گی اور ہاں برتن بھی سارے اٹھا کر رکھ دینا۔“ پھر وہ اپنے روم میں چلی گئی۔

روپی کا جواب سننے کی اس نے رحمت کو ارا نہیں کی تھی۔ جانتی تھی روپی ویسا ہی کرے گی جیسا اس نے کہا ہے اور روپی نے پہلے کھانا کھلایا۔ پھر برتن اٹھا کر رکھے، اس کے بعد دل کے سامنے بیٹھ کر ساگ دھونے لگی۔ ایک گھنٹے بعد وہ روحی کے روم میں آئی تو روحی بڑے آرام سے جمشید کالیسٹر پڑھ رہی تھی۔ وہ ایک ایک خط کو کئی کئی بار پڑھنے کے بعد رکھتی تھی۔ روپی نے یہ دیکھ کر کہا۔

”آپنی میں نے برتن اٹھا کر رکھ دیئے ہیں اور ساگ پا لک بھی دھو کر رکھ دی ہے۔“ پھر بستر میں لیٹ گئی۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ مگر پھر بھی یہ سوچ کر خوش تھی کہ سکول جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ یہی سوچتے وہ سو بھی گئی۔

سکول جانے کی اجازت ابا جان کی وجہ سے مل گئی تھی۔ مگر اس کے بعد گھر سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ شمشاد بیگم نے سختی سے روحی کو کہا تھا وہ اس کو سارا وقت اپنی نگرانی میں رکھے۔ کھیلنے کے لیے بھی اب باہر جانے کی اجازت نہ دے۔ شمشاد اپنی عادت تو چھوڑ نہیں سکتی تھی کھونے پھرنے کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی۔ ان کا روز کہیں نہ کہیں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کیونکہ انہیں روحی پر بے پناہ اعتماد تھا۔ اس لیے انہوں نے روپی کی تمام تر ذمہ داری روحی کو دے کر سمجھ لیا کہ ان کا اپنا غرض پورا ہو گیا کہ روحی ان کی نگاہوں میں بہت شریف، نیک لڑکی تھی۔

ادھر جب سے غزالہ کالیسٹر پکڑا گیا تھا تب سے روپی ان کی طرف نہیں گئی تھی کہ گھر سے باہر جانے پر تو ویسے بھی پابندی لگ چکی تھی۔ غزالہ کی ماں نے اپنے گھر جاتے ہی غزالہ کو اور بہو کو سب کچھ بتا دیا تھا اور کہا تھا۔

”تو بہ تو بہ، قیامت قریب ہے۔ عمر دیکھو بارہ برس اور کروت دیکھو۔“ یہ سب سن کر غزالہ نے کہا۔

”امی آپ کو کیا ضرورت تھی چھوٹی سی بچی کی شکایت کرنے کی؟“ کیونکہ وہ خود تو اندر کی ساری بات جانتی تھی کہ لیسٹر پرویز نے دیا ہوگا۔

”اے! چھوٹی سی بچی جب لڑکوں سے آنکھ لڑاتی پھر رہی ہے تو پھر میں کیوں نہ بتاتی۔“ خلدہ نے کہا تو غزالہ چپ ہو گئی۔ وفوراً روحی کے پاس جا کر باقی کی بات جانا چاہتی تھی مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ تاہم چند روز بعد غزالہ اس وقت روحی کے پاس آئی جب شمشاد بیگم خود غزالہ کے گھر بیٹھی اس کی ماں سے باتیں کر رہی تھی۔

”کیوں بھئی یہ سب کیسے ہوا؟“ اس نے آتے ہی روپی سے پوچھا۔

”باجی! بھائی جان جب مجھے خط پکڑا رہے تھے آپ کی امی گھر سے نکلی اور انہوں نے مجھے خط لیتے دیکھ لیا۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر امی کے پاس لے آئیں اور ساری بات بتادی۔ پھر امی نے مجھے بہت مارا۔“ روپی بات ختم کر کے رونے لگی۔ غزالہ نے اس کو پکڑ کر اس کو سینے سے لگالیا۔

”ارے ارے رو نہیں۔“ پھر پانچ کا نوٹ روپی کو دیتے ہوئے بولی۔



”اس کا کچھ کھالینا۔“ پھر طویل سانس لے کر روجی کو دیکھا اور کہا۔

”اف! کتنا بڑا حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا اور روجی نے ہستے ہوئے کہا۔“

”شکر کرو میری وجہ سے تم بچ گئی کہ رقعہ پڑھ کر میں نے ہی سنایا تھا۔ صاف صاف تمہارا تو کیا پرویز نے اپنا نام بھی لکھا تھا۔ مگر میں چھپا گئی اور امی کو بھی شک نہ ہوا۔“

”اچھا اب لاؤ دو مجھے میرا لٹریٹ میں بھی پڑھوں۔“ غزالہ نے کہا۔

”مگر لاؤں کہاں سے۔ میں نے پھاڑ دیا۔“ روجی کے بتانے پر غزالہ نے گھور کر اس کو دیکھا تو روجی نے کہا۔ ”غزالہ میں رکھ تو لیتی تمہارے لیے مگر اسی وقت اچانک ابا جان اور سلمان آگئے اور میں نے سوچا کہ میں سلمان پکڑ کر پڑھنے لے اور ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے۔ اس لیے جلدی سے پھاڑ دیا۔“

”اچھا کیا۔“ یہ سب سن کر غزالہ نے سکون کا سانس لیا پھر پوچھا۔ ”مگر لکھا کیا تھا۔“

روبی برآمدے کے ستون سے ٹیکہ لگائے کھڑی ماصرف ان دونوں کو دیکھ رہی تھی بلکہ ان کی باتیں بھی سن رہی تھی۔ نجانے کیوں اب روبی کو ان باتوں میں ایک کشش ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ یکدم نجانے یہ کیا ہوا تھا کہ وہ باتیں جو پہلے روبی کو بے حد بری بلکہ زبردستی تھیں اب اچھی لگنے لگی تھیں۔ بات صرف اچھی لگنے تک ہی رہتی تو بھی ٹھیک تھی مگر وہ خود بھی آپنی اور غزالہ کے کردار میں ڈھلنا چاہتی تھی۔ مگر ابھی یہ ناممکن تھا تاہم اب وہ سارا وقت وہاں تیں سوچتی رہتی جو آپنی اور غزالہ اس کی موجودگی میں کیا کرتی تھیں۔ ماں کا رویہ تو پھر نارمل ہوئی گیا مگر روبی کا رویہ بد لسنے لگا تھا۔

بچپن قبل از وقت رخصت مانگنے لگا تھا۔ جسم جوانی کی ہلکی پھلکی دستک قبل از وقت محسوس کرنے لگا تھا۔ دل میں کئی قسم کے جذبات و احساسات بھی قبل از وقت پیدا ہوئے تھے۔ جس قسم کا ماحول اس کو بچپن میں ملا تھا۔ جس قسم کے ماحول میں اس کی تربیت ہوئی۔ وہ بلی برہمی۔ جو کچھ اس کو آپنی اور غزالہ کی وجہ سے قبل از وقت جاننے کو ملا۔ سننے کو ملا۔ یہ اس ماحول اور باتوں کا اثر تھا کہ وہ ذہنی طور پر بھی قبل از وقت جوان ہوئی تھی عمر تیرہ برس تھی اور روبی ان دنوں زبردست جسمانی تبدیلیوں کی زد میں تھی۔ مگر گھر کے اندر باہر کوئی اس کو اس سلسلے میں گائیڈ کرنے والا نہیں تھا۔ ماں کو اپنی عادت کے مطابق گھومنے پھرنے سے ہی فرصت نہ تھی اور بڑی بہن کی اپنی ایکٹو ٹینز تھیں۔ ماں کوئی روبی کو بتانے والا تھا نہ سمجھانے والا تھا۔

ایک طرف تو خود اس کی یہ حالت۔ دوسری جانب گھر میں اس کی حیثیت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ باپ کبھی کبھار ہی اس کو مخاطب کرتا تھا اور سلمان کو وہ جب تک خود مخاطب نہ کرتی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ رہی ماں تو اکثر نارمل ہی رہتی۔ مگر کبھی بھی بلا وجہ بات بے بات نفرت کا اظہار کرنے لگتیں۔ ایک آپنی تھی جو اپنے مطلب کے لیے اب بھی روبی سے محبت کرتی تھی یا پھر چھوٹی زو بی تھی جس کے ساتھ کھیل کر وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔ جب سے گھر سے باہر جانے پر پابندی عائد ہوئی تھی تب سے روبی نے یہ اصول بنالیا تھا یا روجی نے بنادیا تھا صبح سکول جاتے ہوئے روجی کا پیغام لے جاتی اور واپس آتے ہوئے جواب لے آتی۔ روجی کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری تھا اور روجی مطمئن بھی تھی کہ جمشید کے حوالے سے ماصرف وہ رسوائی سے بچتی ہوئی تھی بلکہ لٹریٹ کے آنے جانے میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی تھی۔

اس دن ماں گھر پر نہیں تھی۔ روجی حسب معمول اپنے روم میں بند ناول پڑھنے میں مصروف تھی جبکہ زو بی کو اکثر ماں اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ روبی یوں ہی ٹہلتے ٹہلتے باہر کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی اور سامنے گراؤنڈ میں کھیلتے بچوں کو دیکھنے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ بھی ان سب کے ساتھ مل کر پہلے کی طرح پھر سے کھیلے مگر ماں کے خوف نے اس کو دروازے میں ہی باندھ رکھا تھا کہ شام ہونے والی تھی اور وہ کسی بھی لمحے آسکتی تھی۔ ویسے عام طور پر وہ ہمیشہ عشاء سے پہلے آ جایا کرتی تھی اور یہ بھی محض اتفاق تھا۔ جمشید اس دن ان کے گھر کے سامنے سے گزرا اور ویسے تو وہ بے حد محتاط نوجوان تھا۔ اب جو روبی کو تھا دروازے کے باہر کھڑے ہو دیکھا تو رک گیا۔

”کیوں بھی گڑیا یہاں کھڑی کیا کر رہی ہوں اس نے مسکرا کر پوچھا؟“

”بھائی جان! سب کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔“ روبی نے یہ کہتے ہوئے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔

”اچھا مگر خود کیوں نہیں کھیلتی ہوں۔“ جمشید نے کھلے دروازے کا اندر جھانکتے ہوئے پوچھا کہ شاید روجی کی ایک جھلک دکھائی دے جائے۔

”بھائی جان! امی نے گھر سے باہر کھیلنے سے منع کر رکھا ہے۔“ روبی نے بتایا۔

”مگر کیوں؟“ جمشید نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔



”بھائی جان! امی کہتی ہیں۔ جمشید کی ہمدردی یا کر روپی کی آواز بھرا گئی۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی سامنے سے آتی زوپی اور ماں پر نگاہ گئی۔ روپی سوچ میں پڑ گئی اپنی بات مکمل کرے یا اندر بھاگ جائے۔ جمشید چند لمحے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اکتا کر آگے بڑھ گیا اور روپی بھاگ کر اندر چلی آئی۔ مگر شمشاد بیگم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔

اجنبی کا آگے بڑھ جانا اور روپی کا بھاگ کر گھر کے اندر جانا۔ وہ غصے سے بھری گھر میں داخل ہوئیں اور برقع اتار کر تخت پوش پر رکھتے ہوئے روپی کے قریب آ گئیں۔ انہوں نے اس کو بالوں سے پکڑ کر پوچھا۔

”بتا کون تھا وہ اور کیا کہہ رہا تھا تجھ سے۔ مجھ کو دیکھتے ہی جس کو تم نے جانے کا اشارہ کیا تھا۔“

”امی میں نہیں جانتی وہ کون تھا؟ اور کیا کہہ رہا تھا؟“ نامی میں نے اس کو جانے کا اشارہ کیا تھا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ روپی نے مارے تکلیف کے بمشکل آنسو ضبط کرتے ہوئے وضاحت کی۔

”اچھا تو تو کچھ نہیں جانتی کہتے ہوئے ماں نے اس کا سر برآمدے کے ستون پر دے مارا اور روپی کے منہ سے درد میں ڈوبی ایک چیخ بلند ہوئی۔ روجی جو اندر بستر میں لیٹی رویانی ناول پڑھنے میں مگھی بھاگ کر باہر آئی تو روپی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ماں اب بھی روپی کو بے رحمی سے مسلسل مارتی جا رہی تھی۔ زوپی پرے کھڑی اس منظر کو دیکھ کر روئے جا رہی تھی۔“

”امی یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ روجی نے آگے بڑھ کر ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ غصہ بھی سمجھ گئی کہیں پھر اس کا اپنا معاملہ ہی نہ نکل آئے۔

”میرے ہاتھ چھوڑ دو روجی! آج میں اس آوارہ کوزہ نہیں چھوڑوں گی۔“ شمشاد بیگم نے غصے سے کہا۔

”امی! خدا کے لیے ہوش سے کام لیں۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ اب روپی چھوٹی نہیں رہی بڑی ہو رہی ہے۔“ اور ماں کے ہاتھ چھوڑ کر روپی کا ہاتھ تھام کر اس کو اپنے روم میں لے گئی جو کہ روپی کا بھی تھا کہ وہ بھی اسی روم میں اس کے ساتھ سوتی تھی جبکہ باہر شمشاد زوپی کو باہر نہیں لے کر چپ کرانے لگی جو بہن کو پٹا دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر مسلسل روتی جا رہی تھی۔

اندر روم میں روجی نے روپی کے سر پر بٹی پاندھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہوا تھا روپی، امی کیوں تمہیں مار رہی تھیں؟“

”روپی نے روتے ہوئے آہوں اور سسکیوں کے درمیان اپنے اور جمشید کے درمیان ہونے والی بات سے آگاہ کر دیا۔“ یہ سب سن کر روجی نے روپی کو سینے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

”چپ کرو میری بیاری بہن تمہیں امی کی بے رحمی کا تو پتہ ہے۔ تم بستر پر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔ یہ کہہ وہ باہر چلی آئی تو برآمدے میں بیٹھی شمشاد بیگم نے اس کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور ازاداری سے روپی اور جمشید کے بارے میں بتاتے ہوئے بولی۔

”وہ لڑکا جو گراؤنڈ کے دوسری جانب سامنے والے گھر میں رہتا ہے روپی آج اس کے ساتھ اپنے ہی گھر کے دروازے میں کھڑی بات کر رہی تھی۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ اب روپی کا خیال رکھنا مگر تمہیں پڑھنے سے فرصت ملے تو کسی کا خیال رکھو گی۔ میرے خیال میں تو اب روپی کا سکول جانا درست نہیں لڑکا سامنے ہی تو رہتا ہے۔“

”امی! آپ کو غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔“ روپی چھوٹی سی اور وہ 28 برس کا نوجوان لڑکا اور بات بات پر سکول سے اٹھانے کی بات نہ کیا کریں۔ کیلایا نہیں کرنا اس کا۔ کون قبول کرتا ہے آج کل ان پڑھنے کیوں کو۔ میٹرک تو کرنے دیں اس کو اور پھر خاندان میں کیا کہیں گی۔ کیوں اٹھایا ہے روپی کو سکول سے۔“ روجی نے پہلی بار تھوڑی سا کھاری سے کہا۔

”بات تو تمہاری درست ہے مگر روپی کا اب پیدل سکول جانا بھی ٹھیک نا ہوگا۔ لڑکا سامنے ہی تو رہتا ہے۔ تمہارے باپ سے کہتی ہوں اپنی لاڈلی کو نا تگہ لگوا دیں جو گھر کے دروازے سے روپی کو بٹھا کر سکول لے جائے اور سکول سے گھر چھوڑ جائے۔ محلے کے اندر ایسے کارنامے انجام دے رہی ہے تو محلے کے باہر کیا کیا نہ کرتی ہوگی اور ابھی تک نہیں کیا تو آگے چل کر کچھ نہ غلط کرے۔ اب تم ہی بتاؤں کیا کروں۔“

”امی جان نا تگہ ہی مناسب رہے گا۔ سکول سے اٹھانا ابھی ٹھیک نہیں۔“ روجی نے کہا اور روپی کے لیے یکن میں دودھ گرم کرنے چلی گئی۔ یوں یہ بات ختم ہو گئی اور روپی کے لیے



تا نگہ لگوا لیا گیا جو گھر سے روپی کو سکول لے جاتا اور سکول سے گھر لے آتا۔

گھر والوں کا تو مسئلہ حل ہو گیا تھا مگر روپی کا نہیں۔ اس کے ذہن میں آنے والے سوالات دل میں بیدار ہونے والے جذبات زیادہ ہی شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ وہ جاگتے میں بھی بیٹھے بیٹھے پیندے پینے لگی تھی اور یہ شاید ان سینوں کا ہی اثر تھا کہ وہ چھوٹی عمر میں ہی گمراہ ہو گئی یا پھر رچی کی صحبت کا اثر تھا کہ وہ کچی عمر میں ہی بہک گئی۔ اس کا دل ابھی سے سب کچھ چاہہ نہ لگا تھا۔ اس کے دن رات اس لڑکے کی تلاش میں پیتا رہتا تھا جس کو روپی کا محبوب ہونے کا شرف حاصل ہونا تھا۔ جلد ہی وہ روپی کو مل گیا۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ روپی کو تو فقط انسان کی تلاش تھی اور پھر کسی خاص یا بڑے خاندان کے نہیں ایک عام لڑکے کی تلاش تھی جو پرویز اور جمشید کی طرح اس کو پیدا کر سکا اور ایسے لڑکے کو قدم قدم پر ملتے ہیں۔ سو روپی کو بھی مل گیا۔

وہ بک شاپ روپی کے سکول کے سامنے ہی تھی۔ گھر سے ملنے والی پا کٹ منی سے ہمیشہ وہ اسی بک شاپ سے چیزیں خریدتی تھی۔ بک شاپ پر ادھر عمر کا آدمی جو بک شاپ کا مالک تھا اور ساتھ میں برس کا ایک ملازم لڑکا بھی ہوتا تھا۔ روپی چونکہ اکثر وہاں سے شاپنگ کرتی تھی اس لیے وہ روپی کو دیکھتے ہی کہتا۔

”ارے سسٹر، میری پیاری سسٹر آج کیا لینا ہے۔ اکثر وہ سکول سے واپسی پر بھی وہیں سے چیزیں لیتی تھی۔“

ایک دن جب وہ حسب معمول خریداری کے لیے بک شاپ میں داخل ہوئی تو وہ لڑکا کیلانی تھا اور اکثر ایسا ہو جاتا تھا۔ روپی اپنی ضرورت کی چیزیں لے کر شاپ سے باہر نکلنے لگی تو وہ لڑکائیوں ہی موڈ میں کچھ گنگنا نہ لگا۔

چلتے چلتے روپی کے قدم رک گئے اور وہ ہیں رک کر بلکہ مڑ کر عجیب سی نظروں سے جاوید کو دیکھنے لگی۔ مگر جاوید اس کی جانب متوجہ نہیں تھا وہ بکس درست کر کے رکھ رہا تھا۔ مگر روپی محویت سے اس کو دیکھتی رہی۔ روپی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہی لڑکا ہے جس کی اس کو تلاش تھی۔ اس کے اندر سے جیسے کوئی کہہ رہا تھا۔ یہ تمہارا جمشید ہے۔ یہ تمہارا جاوید ہے۔ وہ شاید مزید وہیں کھڑی رہتی مگر تا نگہ والے نے آواز دے کر بلا لیا۔

روپی نے برا سامنہ بنا کر تا نگہ والے بابے کو دیکھا۔ مجبوراً تا نگہ میں بیٹھ گئی۔ مگر دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ ایک عجیب اور نامعلوم سی کیفیت اور احساس پورے وجود میں سرایت کرنے لگا تھا۔ ایک عجیب سی خوشی اور سکون وہ اپنے اندر اور ارد گرد محسوس کرنے لگی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی تلاش ختم ہو گئی ہو۔

چند روز یوں بیتے کہ وہ صبح جاتے ہوئے بھی اس کی بک شاپ پر رک کر کچھ نہ کچھ ضرور لیتی اور آتے ہوئے بھی۔ دل تو چاہتا تھا سکول کی بجائے وہاں کی بک شاپ پر بیٹھی رہے مگر مجبوری یہ تھی کہ جاوید چپ تھا۔ اس کا دل چاہتا وہ بھی اس کو لو لے کر لکھے۔ جمشید اور پرویز کی طرح۔ مگر چند یوم انتظار کے باوجود جب جاوید نے منہ سے کچھ نہ کہا تو روپی نے خود ہی اس کو لے کر لکھنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ کر کے وہ بے حد خوش تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ لیسٹر میں لکھے کیا۔ بہت سارے دن مضمون کے بارے میں سوچتے ہوئے ضائع ہو گئے مگر کچھ سمجھ نہ آتا۔ لکھے تو کیا کہنا بھی عمر ہی کیا بھی 13 برس۔ یہی وجہ ہے وہ اب سکول میں بھی زیادہ تر چپ رہنے لگی تھی۔ بریک کے نام بھی وہ سب فرینڈز سے الگ تھلگ سکول کے قدیم درخت کے موٹے تنے سے ٹپک لگائے اس کا حل سوچتی رہتی جس نے اس کا دن رات کا سکون غارت کر کے رکھ دیا تھا۔

اس وقت بھی حسب معمول بن ہاتھ میں پکڑے سوچوں میں گم سم بیٹھی تھی کہ کرن اس کے پاس چلی آئی۔ یوں تو اس کی بہت ساری فرینڈز تھیں مگر بیسٹ فرینڈ کرن تھی۔ وہ روپی سے بھی چاہتا تھا آگے تھی۔ مگر اپنی سب باتیں اپنے تک رکھتی تھی۔ کرن کی بڑی بہن ماڈلنگ کرتی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا پورا گھرانہ بے حد آنا دخیل تھا۔

”کیلیات ہے روپی!! بہت چپ چپ رہنے لگی ہو۔ کیا طبیعت ٹھیک نہیں یا گھر سے ڈانٹ زیادہ پڑنے لگی ہے؟“ کرن کو معلوم تھا کہ گھر والوں کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں۔ یہ بات اس کو روپی ہی نے بتائی تھی۔ مگر وہ خراب ہونے کی وجہ نہیں بتاتی تھی۔

”دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں۔“ روپی نے بہت آہستگی سے کہا۔

”پھر کیلیات ہے جو خاموش رہنے لگی ہو۔ روپی کیا سوچ رہی ہو۔ بتاتی کیوں نہیں؟“ کرن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بلایا تو روپی نے کرن پر اعتبار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر کرن کو دیکھتی رہی پھر خود کو آپی اور کرن کو خزانہ کی جگہ سمجھ کر بولی۔

”کرن تم جاوید کو جانتی ہو؟“



”ہاں ہاں! کیوں نہیں میرا فسٹ کزن ہے۔ تم بھی مل چکی ہو جاوید سے۔“ کرن نے جلدی سے بتایا تو روبی نفرت سے ناک سیکڑ کر بولی۔  
”میں تمہاری خلعہ کے بھینگے اور لفظ جاوید کی بات نہیں کر رہی۔“

”تو پھر کس کی بات کر رہی ہو؟“ کرن نے برامان کر پوچھا۔ کزن بھینکا ضرور تھا مگر تھا دل والا۔ بے حد امیر۔ دل کھول کر ان پر پیسے خرچ کرتا تھا۔ ایک دفعہ روبی کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا اس نے اور روبی نے اس کو بہت سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔

”میں سکول کے سامنے والی بک شاپ والے جاوید کی بات کر رہی ہوں۔“ روبی نے وضاحت کی۔  
”ارے! اچھا ہاں وہ جاوید۔“ کرن نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنس کر کہا تھا۔ پھر سنجیدہ ہو کر پوچھا؟  
”کیا اس کو کچھ ہوا ہے؟“ روبی نے کرن کی بات سن کر سوچا اس کا تو پکا پتہ نہیں مگر مجھے ضرور کچھ ہوا ہے۔  
”ارے اب چپ کیوں ہو؟ کیا ہوا اس کو صبح تک تو بالکل ٹھیک تھا۔ میں نے صبح سکول آتے ہوئے خود جاوید کی بک شاپ سے کاپی لی تھی۔“  
”کرن! وہ..... وہ مجھے۔“ روبی نے انک انک کر بھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ کرن نے جو روبی سے دو برس بڑی بھی تھی تیزی سے کہا۔  
”کیا وہ لگا رکھی ہے سیدھی طرح بتاتی کیوں نہیں اصل بات کیا ہے؟“

”کرن! وہ مجھے..... وہ مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔“ اب کے روبی نے جلدی سے کہا اور یہ سب کہتے ہوئے روبی کے لہجے میں ہی نہیں آنکھوں میں بھی بے حد یرغمان آ یا تھا۔ چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو گیا تھا۔

”اچھا مگر کیوں؟“ کرن نے ساری بات سمجھ کر بھی حیرت کا اظہار کرنا ضروری سمجھا اور اس کی بات سن کر روبی نے نگاہیں جھکا کر کہا۔  
”کیوں کا تو مجھے بھی پتہ نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں وہ مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں۔“ روبی نے مشورہ مانگا۔  
”مگر روبی وہ تو تمہیں سسٹر کہتا ہے۔ پھر مشورہ کیا دوں۔“ کرن نے ہستے ہوئے روبی کو جتایا۔  
”وہ سسٹر کہتا ہے تو کہتا رہے میں تو بھائی ہرگز نہ کہوں گی۔“ روبی نے غصے سے کہا تو کرن نے ہستے ہوئے پوچھا۔  
”کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں جاوید سے محبت ہو رہی ہے۔“

”ہو رہی نہیں اسٹوڈنٹ ہو چکی ہے۔“ روبی نے جلدی سے وضاحت کی تو کرن نے سنجیدگی سے کہا۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر سوچنا پڑے گا تمہارے لیے۔ لیکن ابھی تو میں کلاس میں جا رہی ہوں کیونکہ بریک ٹائم ختم ہو چکا ہے اور میں اس بارفل ہونا نہیں چاہتی کہ یہ میرا اسٹ چانس ہے۔ تاہم کل لازمی سوچوں گی۔“ کہتے ہوئے وہ جلی گئی مگر روبی وہیں بیٹھی کبری سوچ میں ڈوب گئی۔ کلاس میں جانے کی اس نے ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ چھٹی ہونے پر کرن نے اس کو وہیں بیٹھ دیکھا تو قریب چلی آئی اور تسلی دینے والا انداز میں بولی۔

”یار! اب اتنا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ لو! لٹر لکھتے ہیں۔ خط کے مضمون کو تم بھی سوچو میں بھی سوچتی ہوں۔ پھر جواب آنے پر پتہ چلے گا وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ اب آؤ! اب تمہارے تانگے والا آچکا ہوگا۔“ روبی اس کی بات مان کر چپ چاپ اٹھ گئی۔

مضمون سوچتے سوچتے کافی دن لگ گئے اور جب وہ اپنا پہلا لولیر خود لے کر اس کی بک شاپ پر گئی تو اس کا پہلا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ جاوید بک شاپ پر نہیں تھا۔ روبی نے سوچا کہیں کام سے گیا ہو گا اور وہیں ایک جانب کھڑی ہو کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس کو یوں ہی بیکار کھڑی دیکھ کر بے نے پوچھا؟  
”کیا لینا ہے روبی! بتاؤ وہاں کیوں کھڑی ہو۔ یہاں آؤ۔“ روبی اس کے قریب آئی پھر پوچھا۔

”باباجی! جاوید کہاں ہے؟“

”ارے! جاوید وہ کمینہ انسان کل اچانک نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ ارے! اگر جانا ہی تھا تو پہلے بتا دیتا۔ میں کسی اور کے کورکھ لینا مگر یہ احسان فراموش بھوکا مر رہا تھا جب میری بک شاپ پر نوکری مانگنے آیا پانچ برس پہلے اور میں نے ترس کھا کر فوراً رکھ لیا۔ اب کسی نے زیادہ خواہ دی ہو گی جو یوں اچانک نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر بتا کر بھی نہیں گیا کہ کہاں جا رہا



ہے؟ ایسے بھی احسان فراموش ہوتے ہیں لوگ اس دنیا میں۔“

روبی بابے کی مزید باتیں سننے کے لیے وہاں نہیں رکی۔ ٹانگے والا زور زور سے آوازیں دے رہا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹانگے میں بیٹھ گئی مگر ذہن جاوید میں ہی لگا ہوا تھا۔ اس کے بیٹھنے ہی ٹانگہ چل پڑا۔ مگر وہ کچھ محسوس نہ کر رہی تھی۔ گم صم بیگ پر ہاتھ رکھے سوچتی جا رہی تھی۔

وہ چلا گیا۔ مجھ سے ملے بغیر۔ مجھے بتائے بغیر۔ اس نے مجھے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ کاش! وہ جانے سے پہلے کچھ تو بتا کر جاتا۔ جدا ہونے سے پہلے وہ کچھ وعدے کرتا۔ کچھ قسمیں میں کھاتی مگر وہ بتائے بغیر چلا گیا ہے۔ اس کا جی چلا وہ چیخ چیخ کر روئے۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ بکس جلا ڈالے۔ مگر وہ ان میں سے کچھ بھی نہ کر سکی اور ٹانگہ اس کے گھر کے باہر رک گیا۔ وہ اپنے حواس میں کب بھی جواترتی۔ ٹانگے والے بابے نے مڑ کر حیرت سے اس کو دیکھا اور کہا۔

”کیلیات ہے آج پریشان ہو۔ کچھ کھو گیا ہے کیا تمہارا۔“

روبی نے چونک کر بابا کو دیکھا اور دل میں سوچا کچھ کیا میرا تو سب کچھ ہی کھو گیا ہے۔ مگر وہ چپ رہی۔ بابا کو بھی جانے کی جلدی تھی کچھ اور پوچھنے کی بجائے صرف اتنا کہا۔

”چلو اترو بیٹی کیا ٹانگے میں ہی بیٹھے رہنے کا پروگرام ہے۔“

تب پہلی بار روبی نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اپنے ہی گھر کے سامنے تھی۔ سوری بابا جی کہتے ہوئے اس نے بیگ اٹھایا اور پھر ٹانگے سے اترتے ہوئے اس کی نگاہیں اتفاق سے آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ بالوں کے اکاؤ کا ٹکڑا کٹھنے ہو رہے تھے۔ شاید برسنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ایک نامعلوم خوف نے اس کو اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ اس اس کی جلدی سے گھر میں داخل ہوئی۔ بغیر کسی کو سلام کیے اور بغیر کھانا کھائے بیگ سٹور میں رکھ کر سیدھی روم میں آ کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ روجی روم میں داخل ہوئی۔ بستر پر لیٹی ہوئی روبی کو حیرت سے دیکھا۔ بجائے یہ پوچھنے کے کہ خیریت ہے لیٹی کیوں ہو؟ کیا طبیعت ٹھیک نہیں؟ کھانا کیوں نہیں کھایا؟ پوچھا تو صرف یہ۔

”کیوں روبی آج انہوں نے خط نہیں دیا کیا اور روبی نے بڑی کوشش کر کے آنکھیں کھول کر آپ کو دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔

”آپی! آج وہ وہاں تھے ہی نہیں جہاں روز ہوتے ہیں اور دل میں سوچا آج تو مجھے اپنے آپ کا ہوش نہیں تھا۔ آپ کا کام کیسے کرتی۔ جاوید یہ تم نے کیا کیا۔ وہ پھر جاوید کے بارے میں سوچنے لگی۔ دوسری طرف روجی بھی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر چونکتے ہوئے کہا۔

”تم بغیر یونیفارم چھینج کئے لیٹ گئی ہو۔ چلو لباس بدل کر کھانا کھاؤ۔“ یہ بات اس نے محبت کی وجہ سے نہیں کہی بلکہ اس لیے کہا تھا کہ یونیفارم خراب ہوئی تو دھونی تو پھر روجی کو ہی تھی اور کھانے کا اس لئے کہا تھا کہ کھانے کے بعد برتن روبی صاف کرتی تھی۔

”نہیں آپی! آج میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔“ روبی نے کروٹ بدل کر چہرہ دوسری جانب کرتے ہوئے کہا۔ آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی اور روبی آپی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ آپی رونے کی وجہ پوچھتی تو وہ کیا بتاتی۔ آپی غزالہ کی محبت میں رہ کر وہ اتنی سمجھدار تو ہو چکی تھی اور بہت اچھی طرح جانتی تھی یہ بات کسی کو بتانے والی نہیں۔ دل میں چھپا کر رکھنے والی ہے۔

”کھانا کیوں نہیں کھاؤ گی؟“ آپی نے حیرت سے پوچھا۔

”دل نہیں چاہتا آپی! روبی نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔“ روبی کو اب آپی پر غصہ آنے لگا تھا۔ خواہ مخواہ پوچھے جا رہی تھی۔ بھلا میری مرضی میں کھانا کھاؤں یا بھوک رہوں۔ اب ایسی بھی محبت نہیں کرتیں مجھ سے کہ میرے نہ کھانے پر پریشان ہوں۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔“ روجی نے کہا اور باہر چلی گئی۔

روبی جواب تک صبر کیے بیٹھی تھی ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی۔ بابے جاوید یہ تم نے کیا کیا اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ اچانک ہی باہر باطل زور سے گرجنے کی آواز ابھری اور روبی یہ آواز سنتے ہی خنجر دھو گئی۔ جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے باہر دیکھا شام سے پہلے بالوں کی آمد نے شام کر دی تھی۔ وہ یقیناً سورج کو اپنے بھاری وجود کے پیچھے چھپا چکے تھے۔ ایسے موسم میں وہ تنہا نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھی اور امی کے کمرے میں بھاگ گئی جہاں سب لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ روبی نے امی کے بستر پر چڑھ کر جلدی سے لیٹ کر لطف اڑھ لی۔ چھوٹی خالہ آئی ہوئی تھیں۔ ہنستے ہوئے پوچھا۔



”ارے بھی آپا اس کو کیا ہوا؟“

”تم تو اچھی طرح جانتی ہوں اس کو بالوں کی گرج، بجلی کی چمک اور طوفان سے سخت ڈر لگتا ہے۔ ایسے موسم میں یہ تنہا نہیں رہ سکتی۔“ انہوں نے ہستے ہوئے بتایا۔ پھر روجی سے کہا جاؤ روجی تم بھی روپی کے ساتھ اپنے روم میں چلی جاؤ اور روجی روپی کو ساتھ لیے اپنے روم میں آ گئی۔ روپی ان سے لیٹ کر لیٹ گئی۔

نجانے کیلیات بھی ایسے موسم میں روپی بہت خنجر وہ ہو جایا کرتی تھی۔ وہ بچپن ہی سے اس موسم سے خوف کھاتی تھی۔ وجہ کیا تھی وہ خود بھی آج تک سمجھ نہ پائی تھی۔ آسمان پر بالوں کا ایک ٹکڑا دیکھ کر بھی وہ ڈر جایا کرتی تھی اور آج تو ڈر کے ساتھ ساتھ پہلے پید کا پہلا غم بھی ملا تھا۔ بل میں مردھی تھا اور خوف بھی۔ باہر طوفانی رات کا آغاز ہو گیا تھا اور اندر خنجر وہی روپی جاوید کی یاد میں گم۔ ساری رات وہارے خوف کے جاگتی رہی۔ ایک پل کے لیے بھی آنکھ نہ لگی تھی اور بالآخر صبح ہو گئی۔

موسم اگر چاہ بھی ابرا آلو تھا مگر زیادہ نہیں۔ کہیں کہیں بدلیوں کے پیچھے سے آسمان بھی جھانک رہا تھا۔ تاہم سورج ہنوز غائب تھا۔

”آج سکول جانے کا پروگرام نہیں؟“ آپنی نے اس کے اوپر سے لحاف پھینچتے ہوئے پوچھا۔ تو روپی جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ پھر ناشتہ کر کے وہ بکس چیک کر کے بیگ میں رکھ رہی تھی کتا نگے والے نے باہر سے ٹن ٹن شروع کر دی۔ وہ جلدی جلدی باقی کی بکس بیگ میں ٹھونستے ہوئے باہر چلی آئی۔ سکول کے سامنے تانگے سوار تے ہوئے روپی نے بک بٹاپ کی جانب دیکھا اور دل میں سوچا جاوید میں تمہیں بھی بھلا نہ پاؤں گی اور سنوا کر سن سکتے ہو میں زندگی کی آخری سانس تک تمہاری واپسی کا انتظار کروں گی اور آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔

مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ چند روزہ اس رہی پھر سب کچھ بھول گئی کہ وقت ہر زخم کا ہر جرم ہے اور پھر اس کی عمر ہی ابھی کتنی تھی کہ وہ جاوید کی یاد کو روگ بنا لیتی۔ یہی وجہ تھی وہ سب کچھ بھول گئی۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ سکول سے گھر آتی، کھانا کھاتی پھر چھپت پر چڑھ جاتی اور خود کو ادا دھرا دھرا تاک نک جھانک کرتی رہتی۔ جب تھک جاتی یا دل بھر جاتا تو نیچے آ جاتی۔ وہ پندرہویں برس میں تھی اور ابھی ابھی میٹرک میں آئی تھی۔ اب تو اس کو جوشید سے لیٹر لیتے ہوئے بھی شرم آنے لگی تھی کہ قد بھی ایک دم ہی سرو کے درخت جیسا ہو گیا تھا۔ مگر کیا کرتی مجبوری تھی۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ سکول سے واپس آئی تو روجی لان میں گلاب کے پودوں کے پاس بیٹھی پھولوں کی کیاریاں صاف کر رہی تھی۔ روپی نے اس پاس دیکھا اور جب کوئی بھی نظر نہ آیا تو وہ تیزی سے سیدھی آپنی کے پاس آئی اور لیٹر روجی کو تھا دیا۔ اور یہ محض اتفاق تھا یا روجی کی بد قسمتی۔ اھر روجی نے روپی سے لیٹر لے کر کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ اھر شمشاد بیگم چانک اپنے روم سے باہر نکل آئیں۔ انہوں نے حیرت سے یہ سارا منظر دیکھا۔ پھر قریب آ کر روجی سے پوچھا۔

”یہ سب کیا ہے قریب ہی روپی بھی کھڑی تھی۔“

ماں کو اچانک سامنے دیکھ کر روجی چکر کر رہ گئی۔ مرنی کیانہ کرتی۔ کچھ نہ کچھ تو اب لازمی کہنا تھا کہ چوری رنگے ہاتھوں پکڑی جا چکی تھی مگر کیا کہنا تھا وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”روجی میں نے تم سے کیا پوچھا ہے؟“ شمشاد بیگم دھاڑی اور اتنے سے وقفے میں روجی کے چالاک ذہن نے سوچ لیا تھا کہ اس کو امی سے کیا کہنا ہے۔ اس بات کا تو روجی کو 100 فیصد یقین تھا کہ وہ امی سے جو بھی کہے گی امی اس پر یقین کر لیں گی اور اس نے سوچا کیا تھا اس نے سوچا تھا وہ امی سے کہے گی امی روپی کی کلاس ٹیچر نے اس کی شکایت لکھ کر بھیجی۔ یہ سوچتے ہی اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

”امی جان! یہ روپی کی کلاس ٹیچر نے اس کی شکایت لکھ کر۔۔۔۔۔“ بات ابھی نامکمل تھی کہ معا سلمان گھر میں داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر روجی گھبرا گئی اور شمشاد بیگم نے اس کے ہاتھوں سے لپک کر لیٹر چھپٹ کر سلمان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”سلمان ذرا دیکھو تو سہی۔ اس لیٹر میں کیا لکھا ہے۔ سلمان نے لیٹر پر ایک نظر ڈالی۔ پورا لیٹر پڑھنے کے بعد ایک خونی نگاہ روجی پر ڈالی۔ پھر اونچی آواز میں سارا لیٹر ماں کو پڑھ کر سنا دیا اور پھر تو گویا گھر میں قیامت سی آئی۔ خط پڑھنے کے بعد سلمان غصے سے آگ کا گولہ بنے کھڑا تھا۔ شمشاد بیگم چند لمحے روجی کو گھورتی رہی پھر سر دلبجے میں کہا۔

”گویا تم بھی اب اس نیک کام میں شامل ہو چکی ہو۔ کب سے شروع کیا تم نے یہ سلسلہ؟ کب سے یہ تمہارے محبت نامے آ رہے ہیں۔ ذرا مجھے بھی تو پتہ چلے۔“

جب سلمان نے خود لیٹر پڑھ لیا تھا تب روجی بری طرح گھبرا گئی تھی۔ ساری زندگی کی بنی بنائی عزت خاک میں ملتی نظر آتی تھی اور یہ بات روجی کو کوارہ نہ تھی۔ اس کو بات بنانی اور اپنا



مقام بنانا خوب آتا تھا۔ اس کو اگر اپنی عزت بنانی آتی تھی تو بچانی بھی اچھی طرح آتی تھی۔ جب سلمان امی کو لیٹر سنا رہا تھا تو روجی نے انہی چند لمحوں میں ایک بے رحم فیصلہ کیا اور ہاتھوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے روپی کو دیکھا جس کا رنگ مارے خوف کے پیلا ہو چکا تھا۔ روجی جانتی تھی اس وقت ماں کو شک ہے۔ یقین نہیں۔ وہ بڑی آسانی سے یہ اپنا الزام روپی کے سر رکھ کر خود کو بے گناہ ثابت کر دے گی اور امی بھی اس کی بات کا یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ کیونکہ روپی کا کردار تو پہلے ہی مشکوک ہو چکا تھا اور یہی بات آج روجی کو فائدہ دے سکتی تھی اور روجی کو اپنے مطلب کے ہر ہر معاملے میں فائدہ اٹھانا خوب آتا تھا۔ اس نے دل میں سوچتے ہوئے مضمون کو بولنے سے پہلے ایک نظر سلمان کے پھولے ہوئے چہرے پر ڈالی پھر ماں کی جانب دیکھتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ بولی۔

”مجھے معاف کیجئے گا امی جان کہ میں نے آپ سے یہ بات چھپائی مگر میں کیا کرتی میرے منع کرنے کے باوجود یہ روپی چند روز سے میرے لیے ایسی ہی رفتے لاری ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے نہ بتایا کہ آپ پریشان ہوں گی اور روپی کو ماریں گی مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ روپی کو مار سے بچاتے بچاتے میں خود بے قصور ہوتے ہوئے بھی مجرم بن جاؤں گی۔ مجھے آپ کی قسم امی جان میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی روجی مگر مجھ کے آنسو بہاتے ہوئے مزید اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔ جو صرف اس لیے قبول کر لی گئی کیونکہ لیٹر میں جھشید نے لکھا تھا۔ ”کیا بات ہے روجی کتنے لیٹر لکھ چکا ہوں تمہیں کہ ایک بار صرف مجھے سے ملنے آ جاؤ اور تم کتنی ستم دل ہو کتنا ملنے آتی ہو اور نہ ہی لیٹر کا جواب دیتی ہو۔ پلیز کسی نہ کسی طرح ایک بار مجھ سے مل لو۔ میں تمہارا ویٹ کروں گا۔ پلیز دیکھو انکار نہیں کرنا۔“

خط کا مضمون بڑی خوبصورتی سے روجی کو بچا گیا اور روپی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنادی گئی۔ اس نے حیرت سے آپی کو دیکھا اور روجی نظریں چرا گئی جبکہ حمیدہ بیگم نے غصے سے روپی کے بال پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو پیدا ہوتے ہی اتنی بے غیرت کیسے ہو گئی اور ارے خود تو آوارہ بن ہی گئی تھی اب بڑی بہن کو بھی اپنی راہ پر لگانا چاہتی ہو۔ آج میں تمہیں ہرگز زندہ نہ چھوڑوں گی۔“ ماں روپی کو مارنے لگی تو وہاں کی مار سے بچنے کیلئے چیخ پڑی۔

”امی جان یہ سب جھوٹ ہے۔ جو آپ نے آپ سے کیا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ تو خود آپ۔۔۔۔۔۔ وہ آج ماں کو سب کچھ کھل کر بتانا چاہتی تھی کہ پہلے بھی محض خاموش رہنے کی وجہ سے وہ مجرم بنی تھی۔ بدنامی کی زد میں آئی تھی مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اس کی بات سن کر چہرہ دیکھ کر روجی نے سوچا۔

امی کی مار کے خوف سے وہ شاید آج سب کچھ بتانے پر آمادہ ہے۔ یہ خطرہ فیل کرتے ہی وہ اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھی۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر روپی کو گھورتے ہوئے بولی۔

”امی جان! ابھی تو میں نے آپ کو اس کی یہ ذلالت نہیں بتائی یہ آوارہ لڑکی غزالہ کو بھی اسی طرح کدے قلعے لا کر دیتی رہی ہے۔ روجی خود پر لگا داغ اچھی طرح دھونا چاہتی تھی۔ پھر روپی کی زبان بند رکھنے کے لیے وہ خود بھی ماں کے ساتھ مل کر ماں سے بھی زیادہ بے رحمی سے اس کو مارنے لگی۔ محض اس کا منہ بند رکھنے کو اور روپی مار کھاتے ہوئے بھی روجی کو دیکھتی۔ بھی ماں کو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی صفائی کیسے پیش کرے۔

روجی نے اس وقت روپی کو چھوڑا تھا جب اس کے اپنے خیال میں وہ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ پھر وہ اس کو گھسیٹتے ہوئے اپنے روم میں لے گئی اور فرش پر چھوڑ کر ہی دروازہ بند کر دیا کہ اندر ہی اندر وہ ہر حل روپی سے خائف بھی تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ وہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی محض اس کی چالاکی کی وجہ سے مجرم بن گئی تھی۔ پہلے بھی اور اب بھی۔

”بس امی جان بہت ہو چکی۔“ سلمان تیز تیز بولتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اب روپی سکول نہیں جائے گی۔ وہ جوں جوں باہر جائے گی اس سے زیادہ آوارگی اپنائے گی اور ہم خاندان اور محلے میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ اچھی طرح سے سن لیں۔ آج سے روپی کا سکول جلنا بند اور اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو پھر میں خود یہ گھر چھوڑ دوں گا۔“ وہ دھمکی دے کر خاموش ہو گیا تو روجی نے اس کی بات کی تائید کرنا ضروری سمجھا۔

”ابو! میرے اپنے خیال میں سلمان درست کہہ رہا ہے۔ روپی کا اب سکول جلنا واقعی ہی درست نہیں۔ ابھی تو بات صرف رقعوں تک محدود ہے۔ آگے چل کر کچھ اور غلط ملط کر بیٹھے۔ میں صرف گھر کے اندر اس کی نگرانی کر سکتی ہوں۔ گھر کے باہر وہ اکیلی ہوتی ہے اور کیا کیا کھیل کھیتی ہے۔ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔“ روجی بات ختم کر کے باپ کی جانب دیکھنے لگی جو کسی کبریٰ سوچ میں غرق تھے۔ روجی کی بات سن کر چونک پڑے۔ پھر بیوی کو دیکھتے ہوئے پوری سنجیدگی سے کہا۔



”مجھ میں نہیں آتا روپی ایسی کیوں ہوگئی۔ وہ تو بہت پیاری بچی تھی۔ روجی تو ایسی نہیں تھی۔ روپی جاتی تو اپنی بڑی بہن پر مروتان راہوں پر کیسے چلی گئی۔ انوشم شاد بیگم تم سے ضرور کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ جو روپی غلط راہ پر چلی گئی۔“

”کوئی غلطی نہیں کی میں نے۔ روجی بھی تو اسی گھر میں ہے۔ ارے یہ تو تھی ہی آوارہ اس لیے میں نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کو سکول سے اٹھا لو۔ مگر تم لوگ نہیں مانے۔ اب میری بات نہ ماننے کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور اب میری سختی بھی دیکھنا۔“ دیکھتی ہوں اب یہ کیسے کوئی غلط حرکت کرتی ہے۔“ شمشاد بیگم نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بھی جو مناسب سمجھو کرو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا زیادہ سختی بچے کی اصلاح کرنے کی بجائے بچے کو مزید بگاڑنے کا باعث بنتی ہے۔ ایسا نہ ہو تمہاری سختی سے تنگ آ کر روپی کوئی بڑا قدم اٹھا لے۔“ ان کے لہجے میں دنیا بھر کی اذیت سمٹ آئی اور وہ چپ ہو گئے۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ سلمان مارے غصے سے غرایا۔

”اور اگر ایسا ویسا کوئی غلط کام اب روپی نے کیا تو میں اس کو جان سے مار دوں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا میں پھر اس بے غیرت کو۔“

”گھر سے باہر جائے گی تو کچھ ایسا ویسا کرے گی۔ آج سے سکول جانا بند۔ اب گھر میں ہی رہے گی۔“ شمشاد بیگم نے بھی اپنا غصہ سنا دیا اور بات کو ختم ہوگئی۔ روجی خوش تھی کہ وہ ایک بار پھر اپنی چالاکی سے رسوا ہوتے ہوئے بچ گئی تھی۔

روپی باہر بیٹھی ساری بات چیت سن رہی تھی۔ مگر آج چاہنے کے باوجود وہنا تو اپنے لیے کچھ کر سکتی تھی نا کوئی وضاحت اپنے بارے میں کر سکتی تھی۔ کرتی بھی تو یقین کس نے کرنا تھا۔ آپ نے چل ہی کچھ ایسی زوردار چلی تھی کہ بات روپی کا اور جیت روجی کا مقدر ہمیشہ کیلئے بن گئی تھی۔ کیسی بے رحم بہن تھی وہ۔ پہلے اس نے غزالہ کی آوارگی کا الزام روپی کے سر رکھ کر دوستی نبھائی تھی اور اب گناہگار ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو بے گناہ بن گئی تھی اور روپی کی بچی کچی عزت بھی اب گھر میں ختم ہوگئی تھی اور یہ عزت ختم ہونے کے بعد روپی نے قتل کیا تھا اس کے دل میں موجود آپ کی عزت بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ محبت جو وہ آپ سے کرتی تھی وہ بھی ایک لخت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی اگلی صبح جب روجی گھر میں کیلی تھی۔ ماں کے دور کا کوئی رشتہ دار مر گیا تھا اس لئے وہاں شہ کئے بغیر ہی گھر سے چلی گئی کہ لاہور سے باہر جانا تھا۔ اب کیلئے میں روپی بے خوف ہو کر روجی کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔

اگر چاندی سے تھوڑی خنجر وہ بھی تھی مگر کوشش کے باوجود وہ ضبط نہ کر پا رہی تھی۔ اس کے دل میں یہ شدید ترین نفرت اچانک آپ کے لیے دڑائی تھی وہ اب آنکھوں سے صاف عیاں ہو رہی تھی۔ روپی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ روجی کو جان سے مار ڈالے۔ کیسی معصوم بن رہی تھی۔ لگتی آسانی سے اپنا الزام روپی کے سر رکھ کر وہ آج بھی گھر والوں کے لیے نیک پروین تھی۔ اور میں اس نے سو چا میرا تو کوئی قصور ہی نہیں۔ میں نے تو کبھی کوئی بری حرکت کی ہی نہیں۔ میں نے صرف جاوید سے محبت کی تھی مگر وہ اظہار کا موقع دیے بغیر مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

اور یہ آپ اس نے سوچتے سوچتے پھر گھور کر آپ کی کو دیکھا اور پک دم ہی محسوس کیا جیسے اس کا اندر سے وہ ڈر خوف بھی ختم ہو گیا تھا جو روجی کے حوالے سے اسے ہمیشہ اس کو اپنے حصار میں رکھتا تھا۔ اچانک ہی وہ خود کو بے خوف اور نڈر مل کرنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی وہ زید نفرت سے گھورنے لگی تھی روجی کو۔

روجی کافی دیر سے محسوس کر رہی تھی کہ روپی اس ک نفرت سے گھور گھور کر دیکھ رہی ہے۔ چونکہ خود محرم تھی اس لیے جان بوجھ کر انہوں نے اپنے کام میں مچ رہی تاہم جب روپی مسلسل اسی طرح گھورنے میں لگی رہی تو روجی کا صبر و ضبط جواب دے گیا اور اس نے جواباً روپی کو ہمیشہ والے غصے اور نفرت سے گھورتے ہوئے کڑھکی سے پوچھا۔

”یہ آج تو مجھ کو کس طرح رہی ہو؟“ روجی نے سوچا تھا یہ سن کر روپی ڈر جائے گی مگر جواباً روپی نے نہایت بدتمیزی سے کہا۔

”ویسے دیکھ ہی ہوں جیسے بہت پہلے تمہیں دیکھنا چاہیے تھا۔“

”بکواس بند کرو اور اب اٹھ کر برتن صاف کرو۔“ اب کہ روجی نے تھوڑی نرمی سے کہا وہ آگے منہ لگانا نہ چاہتی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ روپی کا منہ کھل گیا تو وہ بدنام ہو جائے گی۔ ماں اور گھر والے یقین نا بھی کریں مگر شک تو ہو ہی سکتا تھا تاہم اس کے ساتھ ساتھ روجی نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ اب سارے گھر کا کام روپی سے لیا کرے گی۔ حالانکہ پہلے بھی روپی کو سنا کم کام کرتی تھی۔ مگر اب جب وہ روجی کے کام کی نہ رہی تھی تو روجی نے اس کو گھر کے کام کی بنانے کا سوچ لیا تھا۔ ایک طویل عرصہ تھا وہ محض اپنی غلط ایکٹوئیز کی وجہ سے روپی سے نرم لہجے میں بات کرنے پر مجبور رہی تھی مگر اب ایسی کوئی مجبوری باقی نہ رہی تھی۔ اس لیے روجی نے مزید سختی اور رعب سے کہا۔



”تم نے سنا نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں۔ اٹھ کر برتن صاف کرو۔“

”محترمہ نیک پروین! میرا برتن صاف کرنے کا بالکل موڈ نہیں اور نہ ہی اب میں برتن صاف کروں گی بلکہ اب میں وہ کروں گی جو میرا دل چاہے گا اور سنو اب تم یہ رعب کسی اور پر ڈالنا۔ میں اب تم سے ڈرتی نہیں ہوں۔“ روبی نے شکل بگاڑ بگاڑ کر اپنی بات مکمل کی۔

”روبی کی سمجھ میں نا آیا وہ اب کیا کہے یا کیا کرے۔“ روبی نے چند لمحے روبی کے بولنے کا انتظار کیا پھر طنزیہ ہنسی ہستے ہوئے روبی پر چوٹ کرتے ہوئے بولی۔

”محترمہ نیک پروین! آپ کو تو میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ میں نے تمہارے برعکس پر پردہ پڑا رہنے دیا اور تم ہو کہ الٹا آنکھیں دکھا رہی ہو۔ حالانکہ یہ آنکھیں دکھانے کا اصل حق تو میرا ہے۔ اس سارے فساد کی اصل جڑ تو تم ہی تھی اور ہو۔ اب امی کو یہ بات کون سمجھاتا کہ آوارہ میں نہیں تو تھی اور خود ان میں اتنی عقل ہے ہی نہیں کہ وہ اپنے طور پر کچھ سوچ سکیں۔“ روبی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

آج وہ آپ کی بجائے تم اور تو پر اترا آئی تھی۔ کو یا ہر خوف ہر رعب سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ یہ سب دیکھ کر روبی نے پہلے تو ضبط کرنے کا سوچا۔ مگر وہ ایک سفاک اور بے رحم لڑکی تھی۔ ضبط اس کے لیے ناممکن تھا۔ اچانک ہی اس کے اندر آگ سی بھر گئی۔ روبی نے سوچا آج اگر میں نے خاموشی اختیار کی یا روبی کے ساتھ نرمی اختیار کی تو اس کا حوصلہ مزید بڑھے گا اور آگے چل کر ہو سکتا ہے وہ مزید کھل کر بکواس کرے۔ یہ سوچتے ہی روبی نے کہا جانے والی نگاہوں سے روبی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کہتا ہوں میرے بارے میں ذرا پھر سے کہنا۔“

”وہی جو تم نے سنا۔ میں ریپٹ کرنا پسند نہیں کرتی۔“ روبی نے شان بے نیازی سے جواب دیا اور یہ سب سن کر روبی مارے غصے کے پاگل ہو گئی۔ پھر بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور تیزی سے لپک کر ایک ہاتھ میں روبی کے کمال جکڑ کر دوسرا ہاتھ پوری قوت سے اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے بولی۔

”اب بتاؤ پھر یہ بکواس کرو گی؟ پھر بھی ایسا کہو گی؟ ارے بد کردار ذلیل لڑکی خاندان اور محلے والے مجھے بھی جانتے ہیں اور تمہیں بھی۔ کیا تمہارے آوارہ کہنے سے لوگ مجھے آوارہ مان لیں گے۔ وہ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ آوارہ صرف تم ہو۔ سارے محلے میں غزالہ کی ماں نے تیری آوارگی کے قصے پھیلا رکھے ہیں۔ اب بولو پھر بھی یہ بکواس کروں گی۔“ روبی نے ایک ہی منٹ میں کئی تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ہاں!“

”ایک بار نہیں ہزار بار کہوں گی اور اب تو غزالہ کے یار بھی گن کر سب کو بتاؤں گی۔ آج کل اپنے سامنے بننے والے نئے گھر کے نئے یار سے آنکھ لڑ رہی ہے۔“ روبی نے طق پھاڑ کر کہا۔

روبی نے آس پاس دیکھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اس کلباز و مضبوطی سے پکڑے گھسٹتی ہوئی باہر لے آئی۔ آج پھر وہ پرانی بے رحم روبی بن چکی تھی۔ روبی روتی رہی۔ چیختی رہی۔ چلاتی رہی۔ ساتھ ساتھ روبی کو برا بھلا بھی کہتی گئی اور خوب جی بھر کر مارنے کے بعد روبی نے اس کو وہیں چھوڑ کر اپنے روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

روبی وہیں بیٹھی اونچی اونچی آواز میں روتی رہی اور روبی کو کوستی بھی رہی جس کی وجہ سے اس کی پر مٹائی ختم کرادی گئی تھی اور سب سے زیادہ غصہ روبی کو تھا بھی سکول چھوڑنے کا۔ وہ میٹرک مکمل کرنا چاہتی تھی مگر اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ روبی بجائے روبی کے ساتھ تعاون کرنے کے اپنا ہر اہم روبی کے سر رکھ کر خود بھی ان کے ساتھ گئی تھی۔ یہی وجہ تھی روبی بھی ساری محبت، ساری مروت بھول گئی تھی۔ جب ہزار بار احتجاج کے باوجود روبی کو سکول جانے کی اجازت نہ ملی تو وہ سب کچھ بھول گئی۔ وہ عزت و احترام جو وہ ساری زندگی آپا کا کرتی آئی تھی۔

ظاہر ہے گھر میں جب اس کی اپنی عزت خاک میں مل گئی تھی تو اس کو بھی کسی کی عزت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ باپ بھائی تو قریب سے گزرتے ہوئے ایک نگاہ بھی اس پر ڈالنی کو ارا نہیں کرتے تھے۔ کو یا نگاہ ڈال کر وہ خود بھی اس کے ساتھ گناہ گار ہو جائیں گے۔ مخاطب کرنا تو دور کی بات تھی اور یہ سب روبی کی وجہ سے ہوا تھا۔

اور تو اور ماں نے تو اس کا نام ہی آوارہ رکھ دیا تھا۔ جب بھی کچھ کہنا ہوتا یا روبی کو بلانا ہوتا تو کہتی۔

”ارے آوارہ! کہاں ہے؟ سنو روبی اس آوارہ کو بلانا۔“ اور اگر بھی روبی کو روبی کے پاس بیٹھے یا کھیلتے دیکھ لیتی تو فوراً کہتی۔



ماں انسان اگر کسی کی صحبت میں ہی خراب ہوتا ہے تو پھر آپ یہ کیوں نہیں سمجھتی ہیں کہ مجھے آپ کی صحبت ملی تھی۔ آپ جی جی بھی خاندان، محلے اور خاص کر آپ لوگوں کی نگاہوں میں نیک پروین ہے مگر درحقیقت وہ کتنے آوارہ ذہن کی مالک ہے۔ کاش! آپ سب جان سکتے۔ سمجھ سکتے مگر افسوس! اس نے چونک کر ماں کی سمت دیکھا جو زوہبی سے کہہ رہی تھیں۔

اور یہ انہی باتوں کا اثر تھا جو روپیہ بروقت غصے میں بھری رہتی۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ہی گھر میں اس کو اچھوت بنا دیا گیا تھا۔  
مارے غصے اور نفرت کو وہ خود بخود ادا ہوا اور دہناتی پھرتی اور ایسے میں اگر روجی کوئی کام روپیہ سے کہتی تو وہ بدتمیزی سے صاف جواب دیتی۔ ”خود سے کرو تمہارے کیا ہاتھ پاؤں نہیں ہیں۔ میں بہت کام کر چکی ہوں۔ اب ہرگز نہیں کروں گی۔“

”ہاں ہاں! اچھی طرح جانتی ہوں۔“ روجی قریب بیٹھی ماں کو دیکھ کر کہتی۔ ”توبہ کردار تھی۔ آوارہ تھی۔ تمہاری ماں بھی کرتوتوں کی وجہ سے امی ابونے تم کو سکول سے اٹھا لیا۔ اگر تمہارے پاس شرم نام کی کوئی چیز ہے تو ڈوب مرو مگر تمہارے پاس شرم کہاں۔ ارے کمینی! تمہارے پاس عمر میں تم اتنی بے غیرت ہو گزنا ہوتی۔“

”کو..... رکونیک پروین! ذرا سوچ کر بتاؤ میں یا تم۔“ کہتے ہوئے وہ اذیت بھرے انداز میں خوابو واہ منس پڑتی اور ایسے میں ماں روجی کا ساتھ دینا ضرور سمجھتی جیسے روپی ان کی میٹی نہیں لاوارث لڑکی ہو۔

ورنہ جو کچھ گھر والوں نے اس کے ساتھ کیا تھا اور کر رہے تھے وہ کب کا گھر چھوڑ چکی ہوتی۔ کرن کی بہن کی پیشکش کی صورت میں اس کے پاس ایک اچھا آپشن بھی موجود تھا۔ اصل میں سکول چھوڑنے کا بھی چند روز ہی ہوئے تھے جب ایک روز اچانک سکول سے چھٹی کے بعد کرن روپی کی خیریت معلوم کرنے ان کے گھر آئی کہ وہ اتنے روز سے سکول کیوں نہیں آ رہی۔ صد شکر کہ ماں حسب عادت گھر نہیں تھی اور روجی اپنے روم میں بیٹھی ”حد“ پڑھ رہی تھی۔ روپی کرن کو ساتھ لیے جلدی سے اوپر چھت پر چلی آئی اور اوپر آ کر جب کرن نے روپی سے اتنے روز سے سکول نہ آنے کی وجہ پوچھی پہلے تو روپی نے چھپلا چھپلا مگر پھر یہ سوچ کر کہ کرن ایک ہی تو میری فریڈ ہے اور پھر وہ کتنی محبت سے معلوم کرنے آئی ہے۔ یہ سوچتے ہی روپی نے کرن کو سکول چھوڑنے کی صاف صاف وجہ بتادی۔ مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ یہ باتیں کسی کو نہ بتائے۔ وہ کرن کے ساتھ نیچے آئی ہی تھی کہ اچانک روجی اپنے روم سے باہر آئی۔ کرن کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی کہ یہ روپی کے سکول کی واحد فریڈ تھی جو بھی کبھار ان کے یہاں آ جاتی تھی۔ اور روجی کے ساتھ بڑی محبت اور ادب سے پیش آتی تھی۔ اب بھی روجی کو دیکھتے ہی کرن نے بڑے ادب سے سلام کیا اور روجی نے کرن کے سلام کا جواب دیتے ہوئے حیران ہو کر پوچھا؟



”کرن تم کب آئی ہو؟“

”آپنی جی بس ابھی ابھی آئی ہوں۔ روپی کتنے دنوں سے سکول نہیں آرہی تھی۔ سوچا معلوم کرتی جاؤں طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ کرن نے مکاری سے روپی کو آنکھ مار کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ روجی نے اس کی بات کا تھین کر لیا اور کہا۔

”امی نے کہا روپی کو سکول سے اٹھالیں۔ تم سناؤ تمہاری آئی، امی اور باقی سب گھر والے کیسے ہیں؟“ روجی کو معلوم تھا کہ کرن کی بہن ماڈلنگ کرتی ہے۔ اس وجہ سے بھی وہ کرن کے ساتھ محبت سے پیش آتی ہے۔ کدو ایک مشہور ہستی کی بہن بھی بلکہ کرن جب بھی ان کے یہاں آتی ہے باہر کہتی کرن کبھی اپنی آئی کو بھی ساتھ لے کر آؤں۔ کرن ہر بار وعدہ کرتی کہ اگلی بار آپنی کو ضرور لے کر آؤں گی۔ مگر وہ کبھی اپنی بہن کو ساتھ لانا سکی کیونکہ اس کی آپنی ایسے لوگوں کے گھروں میں آنا جانا پسند ہی نہ کرتی تھی۔ اس لیے کرن کبھی آپنی کو ساتھ لانے کا وعدہ پورا نہ کر سکی۔

”وہ سب لوگ ٹھیک ہیں۔“ روجی کی بات سن کر کرن نے جواب دیا۔ پھر کہا۔

”آپنی! آپ مائنڈ نہ کریں تو میں یہ کہوں گی یہ روپی کا سکول میں لاسٹ لیٹر ہے۔ کم از کم میٹرک تو کرنے دیں۔“ روپی نے کرن کی بات سن کر کچھ دیر سوچا پھر کہا۔

”ہاں ہاں میٹرک تو لازمی کرے گی۔ ارے میٹرک تو کیا جتنا پڑھنا چاہیے گی پڑھنے کی اجازت ہے مگر پرائیویٹ پڑھیں۔ یہی ہم سب کی مرضی ہے۔ تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔“ روجی، کرن کو روپی کے پاس چھوڑ کر کچن میں چلی گئی تو روپی نے کہا۔

”میں نے تمہیں بتایا تو ہے سارا چکراسی کا چلایا ہوا ہے۔“ پھر روجی چائے لے کر آگئی اور چائے پی کر کرن بھی چائے کے لیے تھینکس کہتے ہوئے چلی گئی۔ روجی بھی اپنے روم میں چلی گئی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ روپی کرن کو اپنے سکول چھوڑنے کی اصل وجہ بتا چکی تھی۔

چند روز بعد ہی کرن پھر ان کے گھر چلی آئی۔ اتفاق سے شمشاد گھر پر ہی تھی۔ مگر بھی روجی کدوم میں۔ روپی نے کرن کو دیکھتے ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آج کیا لینے آئی ہو جبکہ میں نے تمہیں سکول چھوڑنے کی ساری وجہ بتادی تھی۔ جانتی ہو آج میری امی بھی گھر پر ہی ہیں اور وہ کسی کی عزت کا خیال کم ہی کرتی ہیں۔ پلیز! تم فوراً چلی جاؤ۔ قبل اس کے کہ وہاں آ جائیں۔“

”میری فکر چھوڑ کر یہ لیٹر پکڑو۔ میری آپنی نے دیا ہے اور سنو تمہاری امی اگر کسی کی عزت کا خیال کم ہی کرتی ہیں تو میں بھی ایسے لوگوں کا احترام ذرا کم ہی کرتی ہوں۔“ کہتے ہوئے کرن نے لیٹر روپی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تو روپی نے گھبرا کر پوچھا۔

”کرن اس کا کیا کروں۔“ قبل اس کے کہ کرن جواب دیتی روجی کدوم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی امی اور آپنی کی آواز وہ شاید دونوں روم سے باہر آرہی تھیں۔

مارے خوف کدوم کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا کہ لیٹر میں نجانے کرن کی آپنی نے کیا لکھا ہے۔ امی آپنی نے پکڑ لیا تو اس نے مٹھی زور سے بند کرتے ہوئے کرن کو دیکھا کہ روجی کدوم کی جانب روپی کی پشت تھی۔



”کمینی! یوں پاگلوں کی طرح مجھے کیا دیکھ رہی ہو؟ وہ ابھی دروازے میں ہیں۔ تم لیٹر کو جلدی سے اپنے گلے کا اندر رکھلو۔“ کرن دبے دبے لہجے میں غرائی۔

روپی نے کو کدوم سے پہلے بھی سینے کے زیر جامہ کو کسی بھی چیز کے حوالے سے استعمال نہیں کیا تھا مگر آج امی کی مار کے خوف سے روپی نے بڑی پھرتی سے لیٹر گلے میں رکھا ہی تھا۔ کدوم اور روجی ایک ساتھ روم سے باہر آ گئیں۔ کرن کو اتنی جلدی پھر اپنے گھر میں دیکھ کر روجی حیران ہوئی جبکہ شمشاد بیگم غصے میں آ گئی تھیں۔ کو کدوم اچھی طرح جانتی تھیں کہ کرن روپی کی فرینڈ ہے۔ مگر آج کرن کا اپنے گھر آنا ان کو سخت ناگوار گزارا تھا۔ اصل میں شمشاد نے سوچا۔

”کہیں کرن روپی کے کسی فرینڈ کا پیغام ہاں اس کے لیے لائی ہو۔“ کرن نے ان کو دیکھتے ہی بڑے ادب سے سلام کیا۔ جس کا جواب حمیدہ بیگم نے از حد خشک لہجے میں دیا۔ پھر بے حد رکھائی سے پوچھا۔

”کیسے آنا ہوا ہمارے گھر؟“ نانی مٹی کہا نانی نام لیا۔



”خالہ جی میں روپی کی خیریت معلوم۔۔۔۔۔“

شمشاد بیگم نے کرن کو بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر بے رخی سے کہا۔

”بی بی! روپی اپنے گھر میں ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ تمہیں اس کی خیریت کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم زندہ ہیں۔ اس کی خیریت کا خیال رکھئے کو۔“

”جی بہتر آئی جی!“ کرن نے بڑے ضبط سے کہا۔ پھر روپی سے مخاطب ہوئی۔

”او کے روپی! اب میں جاتی ہوں۔“ روپی نے جواباً صرف سر ہلایا۔

کو کہ روپی کو بھی ماں کا رویہ مناسب لگا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ کرن ایک مشہور ماڈل اور اداکارہ کی بہن تھی۔ مگر اس وقت اسے خاموش رہنا ہی بہتر جانا کہ کہیں ماں کرن کے سامنے اس کو بھی کوئی نامعقول بات نہ کہہ دیں جبکہ شمشاد بیگم نے جاتی ہوئی کرن کو دیکھ کرنا کھاری سے کہا۔

”سنو کی! دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ کرنا۔ ہمارے خاندان میں بیٹھوں کو گھر سے باہر فرینڈ بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جب تک روپی سکول جاتی تھی تب تک وہ تمہاری فرینڈ تھی۔ سکول جانا بند تو یہ دوستی بھی ختم۔ سکول کی دوستی سکول کے اندر ہی اچھی لگتی ہے۔“ حمیدہ خاموش ہوئی تو کرن بھی سلام دعا کیے بغیر خاموشی سے دروازے کی جانب چل دی۔ وہ تیز تیز چل رہی تھی۔ مگر دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر رکی پھر وہیں کھڑے کھڑے مڑ کر شمشاد کو دیکھا اور زبردست خند سے بولی۔

”خالہ جی! آپ بوڑھی ہو چکی ہیں مگر آپ کو گھر آئے ہوئے مہمان سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ کہتے ہیں گھر دشمن بھی چل کر آ جائے تو اس کی بھی عزت کرو۔ میں تو پھر آپ کی بیٹی کی فرینڈ ہوں۔ آپ نے کہا میں دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ کروں تو سن لیں میں لعنت بھیجتی ہوں آپ پر اور آپ کے اس گھر پر اونیہ۔“

اونیہ بات ختم کرتے ہی وہ دروازہ پار کر گئی اور شمشاد بیگم مارے غصے کے پاگل ہوئی۔ انہوں نے روپی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری فرینڈ تھی۔ چنڈال، بد معاش، بد کردار اور بد زبان۔“ وہ کرن کو مزید گالیاں دینے لگی۔ روپی ان کے غصے اور مارے سے بچنے کیلئے فوراً واش روم میں گھس گئی کہ اس وقت واش روم سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں تھی۔ ماں کی مار سے بچنے کیلئے اور کرن کا لایا ہوا لیٹر پڑھنے کے لیے بھی مناسب ترین جگہ یہی تھی۔

روپی کواش روم میں گھستے ہی روپی نے کہا۔

”امی جان! آپ نے کرن کے ساتھ بہت نامناسب رویہ اختیار کیا۔ آپ کو معلوم ہے نا وہ کتنی بڑی اور مشہور ماڈل کی بہن ہے بلکہ اب تو اس کی بہن ایک ڈرامہ میں بھی کام کر رہی ہے۔ وہ اپنے گھر جا کر بتائے گی تو اس کے گھر والے ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔“

”ارے ہوگی مشہور ماڈل کی بہن۔ اونیہ ماڈل ارے سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتی ہو کہ کرن کنجری کی بہن ہے۔ دیکھا ہے میں نے اس کو بھی ٹی وی پر ایک فشن شو میں۔ کیسے نا گلیں آڑھی تر چھی کر کے چل رہی تھی۔ اونچی ہیل کا جوتا پہن کر چلا ہے گر جاتی۔ چلتا ہے کوئی ایسے؟ جیسے وہ فشن شو میں چل رہی تھی۔ اور ڈراموں میں کام کرتی ہے۔ ارے میں پوچھتی ہوں کیا شریف لڑکیاں ڈراموں میں کام کرتی ہیں۔ کیا میں نہیں جانتی سب کی سب آوارہ ہوتی ہیں ناچ گانا کرنے والی۔“ شمشاد بیگم کرن کے رویے سے تپتی ہوئی تھیں۔ اس لیے اس طریقے سے دل کی بھڑاس نکالی۔

”امی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اب تو شریف خاندان کی لڑکیاں بھی شو بزم میں آ رہی ہیں۔“ روپی نے ان کو سمجھانا چلایا۔

”بس بس رہنے دو۔ میں نہیں مانتی۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روپی کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اگر یہ بات ہے تو پھر تم کیوں نہیں فلم یا ڈراموں میں کام کرتی ہو۔ کر سکتی ہو تم روپی یا روپی ڈرامے میں کام؟“ انہوں نے پوچھا۔

روپی نے خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی اور شمشاد بیگم نے کہا۔ ”ارے تم ذرا ایسا ویسا کام کر کے تو دیکھو گا ادا کرو نا خود ہلاک کرو۔ کرن کی ماں بھی بیٹی کے ساتھ خود بھی بن سنور کر لڑکی بن کر پھرتی ہے۔ بے غیرت عورت۔“ شمشاد بیگم کو کرن تپا گئی تھی۔ اس لیے ان کا غصہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

جبکہ واش روم کے اندر روپی نے لیٹر نکالا اور وہیں بیٹھے بیٹھے کھول کر پڑھنے لگی۔ کرن کی آپنی نے لکھا تھا۔

”ڈیسر روپی! چند ہمارا!



ڈھیروں پیارا اور دعائیں!

یہ کہنا یا پوچھنا فضول ہے کہ کیا تم خیریت سے ہو گی؟ کرن نے تمہارے گھر سے آنے کے بعد تمہارے بارے میں ساری باتیں مجھے بتادی تھیں۔ تمہارے گھر والے اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں۔ خاص کر تمہاری امی اور آپنی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جب سے کرن نے تمہارے حالات مجھے بتائے ہیں تب سے یقین کر ویری چندا میں بہت بے سکون ہوں۔ دیکھو چندہ! تم ہمارے گھر آ کر مستقل رہ سکتی ہو۔ مجھے جس طرح کرن عزیز ہے ویسے ہی تم بھی عزیز ہو۔ ہمارے گھر کا ایک دھوم آج سے تمہارے نام ہے۔ میں اپنا فون نمبر لکھ رہی ہوں۔ تم جب بھی آنا چاہو موسٹ وٹلم۔ اپنے گھر والوں سے اب تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم ہمارے یہاں آ جاؤ تو ان سب کو میں خود سنبھال لوں گی۔ تمہیں جب بھی آنا ہو مجھے اپنے گھر والوں سے چھپ کر فون کر دینا میں اپنی گاڑی لے کر خود تمہارے سکول کے پارک والی روڈ پر جو کلائڈ کارز ہے وہاں آ جاؤں گی۔ ارے ایسا خاندان! اور ماں بہن کس کام کی جو بجائے سکون کے تکلیف دے۔ یقین کرو ہمارے گھر میں تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ تم اچھی طرح سوچ کر جب فیصلہ کر لو تو مجھے فون کر دینا بلکہ میں تو کہتی ہوں۔ جو کچھ تمہارے ساتھ کر چکے ہیں اس کے بعد سوچنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ جو کچھ ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے اس کا بدلہ لے لی ہے کہ تو بھی ان کو چھوڑ کر ان کی اوقات ان کو یاد دلا دو۔ اچھا اب باقی باتیں تمہارے یہاں یعنی ہمارے گھر آنے پر ہوں گی۔ اب اجازت۔

تمہارے فون کی منتظر۔ ام

ارے ہاں لیٹر پڑھ کر فون نمبر اپنی کسی کاپی پر لکھ کر لیٹر پھاڑ دینا یا بہتر ہو گا جلا دینا۔ اوکے؟ کہیں تمہاری امی، آپنی یا پڑھ لیں اور پھر تم پر تشدد کریں۔“  
روبی نے لیٹر پڑھ کر واپس گلے میں رکھا ہی تھا کہ روجی نے چیخ کر اس کو پکا مایس اب باہر آ جاؤ کہ مات بھرو ہیں سونے کا پروگرام ہے۔ ماں منوری کے گھر چلی گئی ہیں۔ دوپہر کے برتن ابھی تک یوں ہی پڑے ہیں۔ باہر نکل کر ان کو صاف کرو۔ اور روبی دروازہ کھول کر چپکے سے باہر چلی آئی۔ بیسن پر ہاتھ دھو کر بیسن میں آئی اور برتن صاف کرتے ہوئے کرن کی آپنی کے بارے میں سوچنے لگی۔

ایک بار سکول کفن فیز میں وہ نیچر کی دعوت پر کرن کے ساتھ آئی تھی۔ روبی چونکہ کرن کی خاص دوست تھی اس لیے اس نے اپنی آپنی سے اس کا تعارف بھی بطور خاص کروایا تھا اور ام نے فو ر روبی کو گلے لگا کر اس کے خد کو بوسہ دیا تو روبی نے شرمنا کر کہا۔

”آپنی! مجھے آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ میں جب بھی آپ کے گھر گئی آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کتر تو آپ گھر پر ہوتی ہی نہیں تھیں اور اگر ہوتی بھی تھیں تو سو رہی ہوتی تھیں۔ میرے لاکھ بار کہنے کے باوجود کرن نے آپ کو بھی نہ جگایا کہ آپ اس کو ڈانٹ دیں گی۔“

”اچھا؟“ ام نے ہنس کر کہا۔ پھر روبی کا ہاتھ تھام کر نرمی اور محبت سے سہلاتے ہوئے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولی۔

”یقین کرو مجھے خود بھی تم سے ملنے کا زہد شوق تھا۔ بلکہ جنون کہا جاسکتا ہے۔ کرن نے مجھے تمہارے بارے میں سب بتا رکھا ہے۔ یعنی تمہارے گھر والے تم سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔“ یہ سن کر روبی کی آنکھوں میں ہلکی سی آنسو آئی اور ام نے یہ دیکھ کر کہ لوہا گرم ہے چوٹ لگانے کی سوچی۔

”میں تو ہوں۔ اگر وہ تمہاری پرواہ نہیں کرتے تو پھر تم بھی ان کی عزت کا خیال مت کرو۔ دیکھو روبی! تمہاری سکرین بیوٹی بہت زبردست ہے۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ اداکارہ بن کر ماڈل بن کر تم پرورے ملک میں دھوم مچا سکتی ہوں۔“ وہ رکی پھر کہا۔

”اور یہ گھر والے جو آج تم سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے کل کو نوکروں کی طرح تمہارے پیچھے پیچھے پھریں گے۔ روبی شہرت کا نشا اور مزہ ہی کچھ اوروں کا ہے اور پھر اس کام میں بیسہ بھی تو بہت ہے۔ تم بھی ماڈل یا اداکارہ بننے کا سوچو تو ادھر ادھر خواہ ہونے کی بجائے سیدھی میرے پاس چلی آنا۔ ہمارا گھر تو تم نے دیکھا ہوا ہے۔

ارے اگر تم اداکارہ بن گئی تو پوری دنیا تمہاری ایک جھلک دیکھنے کو تڑپا کرے گی اور ہاں ابھی ابھی تم نے آج پر گلیا بھی تھا۔ تمہاری آواز بھی بے حد اچھی ہے بلکہ بہت خوبصورت سہی ہے۔ اداکارہ نہیں تو گلوکارہ ہی سہی۔ مطلب اگر کبھی تمہارا دل شوبز میں آنے کو چاہے تو میں نے کہا نا میرے پاس چلی آنا جو والدین اولاد سے محبت نہیں کرتے اولاد کو بھی ان کی عزت کا خیال کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا۔“

اور روبی نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تاہم دل میں سوچا میں شوبز میں گئی تو مسلمان بھائی تو مجھے قتل ہی کر دیں گے۔ میں کبھی بھی آپ کے پاس نہیں آؤں



گئی۔ اف! کتنی بری عورت ہے مجھے گھر سے بھاگنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ اس نے ایک بار پھر بغور کرن کی آپی کو دیکھا۔ وہ روپی کا ہاتھ چھوڑ کر لڑکیوں کو اب آٹو گراف دے رہی تھی۔ اس نے پرنٹ ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ ساتھ جو بلاؤز پہنا ہوا تھا وہ سیلو لیس ٹوئیں تھا مگر سیلوں برائے نام ہی تھیں اور اور بلاؤز کا گاتو جو تھا سو تھا مگر چھوٹا تھا کہ کافی زیادہ پیٹ عریاں ہو رہا تھا۔

ارم نے خوب گہرا میک اپ کر کے شوٹڈ رکٹ بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ سن گلاسز صرف بطور فیشن لگا کر آتی تھیں کیونکہ آنکھوں کی بجائے سر پر لگا رکھے تھے۔ کانوں میں لمبے لمبے آویزے تھے۔ گلے میں تین چار چھوٹی بڑی چیزیں۔ کورے کورے پیروں میں ہائی ہیل کا بلیک جوتا پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں کی بھی انگلیوں کے علاوہ پیروں کے انگوٹھوں اور ایک ایک انگلی میں بھی پھلے اور انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ جاتے ہوئے بھی وہ روپی کو پیار کر کے اور اللہ حافظ کہہ کر گئی تھی۔

اس کے بعد نہ روپی ان کے گھر گئی نہ ملاقات ہوئی اور آج اس نے خود لٹر لکھ کر بھیجا تھا جو ابھی تک روپی کے پاس موجود تھا۔ جس میں ایک بار پھر اس کو گھر سے بھاگنے کا مشورہ دینے کے ساتھ رہائش کی پیش کش بھی کی گئی تھی۔ کوکہ گھر والوں کا رویہ پہلے سے بھی از حد خراب ہو چکا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ گھر سے بھاگنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ماں گھر نہیں تھیں۔ روٹی اپنے روم میں۔ اس نے نمبر زبانی یاد کر کے لٹر چو لے پر رکھ کر جلادیا اور پھر نمبر بھی اسٹور کی الماری میں بچھے اخبار کے کاغذ پر لکھ دیا تھا کہ کبھی کرن سے بات کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ان کے اپنے گھر میں فون ابھی تک نہیں لگا تھا۔

انہیں دنوں گھر میں ایک نئی تبدیلی آئی اور یہ تبدیلی تھی روٹی کے رشتے کی تلاش کی۔ ایسے میں روٹی کو سختی سے ہدایت کی جاتی کہ جب تک مہمان روٹی کو دیکھ کر چلے نہ جائیں تب تک وہ اپنے روم سے باہر نہ آئے۔ روٹی بہر حال روٹی سے زیادہ خوبصورت تھی اور کم عمر بھی۔

روٹی کو ذاتی طور پر آنے جانے والے مہمانوں سے کوئی خاص انٹرسٹ نہیں تھا۔ اس لیے وہ ہر ماں نے بغیر روم میں بند ہو جاتی اور ایسے میں مہمانوں کی آمد پر آپی کو خوشی خوشی بڑے اہتمام سے تیار ہوتے دیکھ کر روٹی کے اپنے دماغ میں درد سا ہونے لگتا۔ وہ مارے دکھ اور شدید صدمے کے سوچتی۔ مجھے خود جاوید چھوڑ کر چلا گیا ہے اور یہ آپی کس قدر بے رحم ہے۔ ان کو جشید بھائی کا ذرا سا بھی احساس اور خیال نہیں اور جشید بھائی بے چارے کتنی محبت کرتے ہیں آپی سے۔ اے کاش! اس سے تھوڑی کم محبت ہی جاوید مجھ سے کرتا۔ تو میں ساری زندگی اس کا انتظار میں گزار دیتی مگر وہ کیونکہ کہتا بھی مجھے سسر تھا۔ معاوضہ خزانہ کی آواز سن کر چونک پڑی جو بالکل اس کے سر پر کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”روٹی! خالہ جی کہاں ہیں؟ روٹی تو یقیناً اپنے روم میں بند ہو کر محویت سے پڑھ رہی ہوگی۔“ روٹی نے چہرہ اٹھا کر اس کو دیکھتے ہوئے پہلے سلام کیا پھر بتایا۔

”باجی! امی تو چچا کے ہاں گئی ہیں۔ باقی رہی آپ کی فریڈ وہ ظاہر ہے اپنے روم میں ہوگی اور بھلا کہاں جانا ہے اس کو۔“ آپی کہنا روٹی نے گوارہ نہیں کیا تھا۔

غزالہ نے مسکراتے ہوئے اس کے گال پر ایک ہلکی سی چپت رسید کی۔ پھر روٹی کے روم میں چلی گئی۔ روٹی نے محسوس کیا تھا وہ بہت ہی تھی۔ ایک گہرا سکون تھا آج اس کے چہرے پر۔ غزالہ نے روم میں انٹر ہو کر جیسے ہی دروازہ بند کیا تو روٹی بڑی پھرتی سے لپک کر کھڑکی کے قریب آ کر بلکہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ غزالہ جب بھی ان کے گھر آتی تھی ایسے میں گرامی گھر پرنا ہوتی تو روٹی یونہی کھڑکی کے ساتھ لگ کر ان دونوں کی باتیں سنا کرتی تھی۔ اب اس کو ایسی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔ امی اکثر گھر پر نہیں ہوتی تھیں۔ یا پھر غزالہ بھی ہی اتنی چالاک کہ ان کے یہاں آتی ہی اس وقت تھی جب امی گھر پر نہیں ہوتی تھیں تا کہ جی بھر کر وہ روٹی ایک دوسرے کو دل کا حال سناسکیں۔

اچانک وہ آپی کی مصنوعی گھبراہٹ والی آواز سن کر چونکی اور چہرہ فوراً کھڑکی کے شیشے پر جھکا کر اندر دیکھنے لگی۔ اندر جھانکنے کے لیے وہ کونے سے تھوڑا سا پردہ خود ہی کھسکا کر رکھتی تھی کیونکہ غزالہ اچانک ہی آ جاتی تھی۔

”ارے ارے! یہ کیا کر رہی ہو۔ پرے ہو۔ مارنے کا ارادہ ہے کیا مجھے موٹی۔“ کیونکہ ان دنوں غزالہ کلائیٹ بڑھ رہا تھا۔ وہ مٹر پلاؤ شوق سے کھاتی تھی اور آج کل سردی کا سیزن تھا اور غزالہ مٹر پلاؤ کھائے بغیر سوتی ہی نہ تھی۔ یا پھر سو ہی نہ سکتی تھی۔

”میں تو خود رہی ہوں۔ تجھے کیسے مار سکتی ہوں۔“ غزالہ کی آواز میں مے نوشی کرنے والوں جیسا خمار تھا اور پھر وہ دھب سے بستر پر روٹی کے قریب گرنے والے انداز میں لیٹ گئی بلکہ روٹی سے لپٹ کر ایک سردا ہ بھری تب روٹی نے دیکھا۔ روٹی نے غزالہ کے بازو پر چنگلی بھرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا شرا بیوں کی طرح باتیں کر رہی ہو۔ سچی آج تو کوئی اور ہی چیز لگ رہی ہو۔ کیا ہوا ہے تمہیں، مجھے بھی تو پتہ چلے۔“



”جب چیز ہی اور بن گئی ہوں تو دکھائی بھی دوں گی۔“ غزالہ نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے کہا تو روجی نے چونکتے ہوئے غرست ماتم بغور غزالہ کو دیکھا وہ بہت پیسی اور پرسکون تھی۔ ”نید دیکھ کر روجی نے پوچھا۔“

”پہیلیاں کیوں بھجوا رہی ہوں۔ سیدھی طرح بکواس کیوں نہیں کرتی۔ کیا چیز بن گئی ہو۔ کہیں چڑیل تو نہیں بن گئی ہو؟“ یہ سن کر غزالہ اچھل کر اٹھ بیٹھی۔ پھر روجی کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے آہستگی سے انکشاف کیا۔

”روجی! رات کو میں پرویز کو ملنے گئی تو وہ سب ہو گیا جو شادی کی رات ہونا چاہیے تھا۔ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔“

”ہاں اللہ! غزالہ یہ تم نے کیا کیا۔“ روجی نے گھبرا کر بے ساختہ دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے غزالہ کو رشتہ والے انداز میں دیکھا۔

”روجی میں نے تو کچھ نہیں کیا سب اس نے ہی کیا۔“

☆☆☆☆

سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ مگر میں اس کو ملنے نہ جاسکتی تھی۔ بھابی کو شک تو مجھ پر پہلے ہی تھا۔ اب میری اس کے ساتھ زبردست جھڑپ ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ مکار عورت جس نے شادی سے پہلے خود سکے ماموں کے شادی شدہ بیٹے سے یا رانہ لگا رکھا تھا بلکہ اب بھی ہے۔ خاندان والے تو یہی کہتے ہیں۔ ہاں تو بھابی اس جھگڑے کے بعد اب میری ٹوہ میں رہنے لگی تھی کہ اب مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ کر باپ اور بھائیوں کی نظروں میں رسوا کر سکے۔ ہاں تو اس بار جو لڑ آ یا اس میں پرویز نے دھمکی دی تھی کہ اب شرافت سے مجھے ملنے آ جاؤ۔ اور سنو اگر کل تم مجھ سے ملنے نہ آئی تو پھر میں بھی تنہا یہاں نہیں رہوں گا بلکہ فوراً اپنے خاندان کے پاس کویت چلا جاؤں گا۔ صرف تمہاری وجہ سے یہاں رہتا ہوں اور تم ہو کہ تمہیں اب میرا کوئی خیال ہی نہیں۔ احساس ہی نہیں۔

دیکھو آج کل موسم کتنا خوبصورت ہے۔ سارا دن باطل چھائے رہتے ہیں۔ تیز ہوائیں چلتی ہیں اور رات کے وقت جب سردی کی ہلکی ہلکی بے آواز بارش برسی ہے تو اس سرد موسم میں..... میں تمہاری قربت کو کتنا ترچہا ہوں۔ ترستا ہوں۔ یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ اگر کل رات تم مجھ سے ملنے نہ آئی تو پھر مجھے لڑ لکھنے کی بھی ضرورت نہیں اور تم لکھو بھی تو میں کبھی بھی لینے نہیں آؤں گا۔ اب فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔

اب تم ہی کہو اس کے بعد میں کیا کرتی۔ مجھے تو ہر حال میں ملنے جانا تھا اور اتفاق یہ ہوا کہ بھابی بھی اپنے میکے چلی گئی اور میں بھی اطمینان اور سکون سے چلی گئی۔ غزالہ خاموش ہوئی تو روجی نے خفا ہو کر کہا۔

”ملنے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ تم بھی گنوا آئی۔“

”یار! میں جب بھی پرویز سے ملنے جاتی تھی اپنے روم میں داخل ہوتے ہی مجھے بانہوں میں بھر کر وہ گویا خود کو بھی بھول جاتا تھا۔ مگر اس بار وہ خفا تھا۔ میں نے دروازہ ٹوک کیا تو اس نے تھوڑے توقف سے کھولا گویا آج بھی اس کو میرے آنے کی امید نہیں تھی۔ اس شدید سردی میں بھی اس کے جسم پر صرف بلیک جینز تھی۔ چونکہ مجھ سے بہت خفا تھا اس لیے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے ایک طرف ہٹ کر اس نے مجھے اندر کا اشارہ کیا۔ میں گھر میں داخل ہوئی تو وہ دروازہ بند کر کے منہ پھلائے خفا تھا سا مجھ سے بات کیے بغیر اپنے روم کی جانب چل دیا اور روم میں داخل ہو کر چپ چاپ روم کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کیا پھر اس کے خفا چہرے کو دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

”اب جب میں آ چکی ہوں تو پھر یہ ناراضگی کیسی؟“ گڈ بوائے اب یہ خفگی ختم کرو ورنہ اگر میں یہاں تک آ سکتی ہوں تو واپس بھی جاسکتی ہوں۔ تم آخر میری مجبوری کیوں نہیں سمجھتے؟ میں نے تمہیں لکھا بھی تھا کہ بھابی کو شاید مجھے پر شک ہو گیا ہے۔ اس لیے اب بھی میں نہیں آ سکتی۔ اب موڈ درست کر لو ورنہ میں ابھی چلی جاؤں گی۔“

”میری مجبوری سمجھ کر یا میری دھمکی سے ڈر کر اس نے بے ساختہ اپنے بازو میرے جسم کے گرد گھمائل کر دیے۔“ غزالہ خاموش ہوئی تو روجی نے کہا۔

”تم نے اس کو منع کیوں نہ کیا۔ یہ چھوٹی بات نہیں تھی۔ عزت بہت نایاب ہوتی ہے۔“ روجی نے پھر خفا ہو کر کہا۔

”جانتی ہوں عزت بہت نایاب شے ہے مگر امانت تو اسی کی تھی اور پھر روجی! میں نے تمہیں بتایا تو ہے وہ خفا تھا۔ میں ٹوک ٹوک کر اس کو مزید خفا نہیں کرنا چاہتی تھی۔“ وہ رکی، کچھ دیر سوچتی رہی پھر کہا۔ ”جی بات پوچھتی ہوں اس کے سینے میں منہ چھپا کر میں خود کو بھی بھول گئی تھی۔ میں نے خود ہی مزاحمت نہیں کی۔ اس کو لازم دینا زیادتی ہوگی۔“



”بعد میں..... بعد میں مجھے بھی یہ سب اچھا لگا۔“ غزالہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی تو روجی نے تشویش بھری نگاہوں سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب اگر کچھ غلط ہو گیا تو تم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہو گی۔“ یہ سنتے ہی غزالہ نے مارے جوش کھو رہا تھا۔

”ارے! ایسا ویسا کچھ نہیں ہو گا۔ جانتی ہو جب میں آنے لگی تب اس نے پیور کولڈ کا اچھا خاصا بھاری سیٹ گفٹ کیا ہے۔“ یہ سنتے ہی روجی نے غصے سے کہا۔

ارے! یہ مرد بڑے چالاک اور تیز ہوتے ہیں بلکہ کپکپے بد معاش ہوتے ہیں اپنے مطلب کے یار!

”یار! جب مجھے غصہ نہیں تو تمہیں کیوں آ رہا ہے۔ اب اس بات کو چھوڑ دو جو بھی ہونا تھا۔ بس ہو گیا..... اور..... اور مجھے برا بھی نہیں لگا اور جانتی ہوں اس نے قرآن اٹھا کر وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھ سے ہی شادی کرے گا اور اسی برس کرے گا۔ اس برس کتا خر میں اس کے گھر والے آ رہے ہیں۔“

”اور اگر نہ کی۔“ روجی نے گھورا۔

”کہا تو ہے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے ساتھ نہیں تو کسی اور کے ساتھ ہو جائے گی۔ مگر وہ لمحے خوبصورت لمحے شاید میری زندگی میں دوبارہ نہیں آئیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے میرا اس کو چھوڑ کر آنے کو بل ہی نہیں چاہتا تھا۔ آج پھر اس کو مجھے ملنے جانا ہے۔ اس نے ناکید کی تھی بلکہ منت کرنے والا انداز میں کہا تھا۔ کل بھی ضرور آنا۔“

اب کہ روجی چپ رہی تھی اور روبی نے محسوس کیا تھا بلکہ دیکھا تھا غزالہ جب روجی کو اپنی عزت لٹنے کی داستان سن رہی تھی تو ذرا سی بھی اندامت اس کے چہرے پر نہیں تھی بلکہ آج تو اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا اور اب وہ مسکرا رہی تھی۔

اچانک وہ غزالہ کی آواز سن کر چونک پڑی جو کہہ رہی تھی۔

”روجی تم ہمارے گھر آنا۔ پھر میں تمہیں وہ سیٹ دکھاؤں گی جو پرویز نے مجھے گفٹ کیا ہے۔“ غزالہ بات ختم کر کے بستر سے اتری تو روجی نے کہا۔

”میں ضرور آؤں گی سیٹ دیکھنے لیکن تم جانے سے پہلے میری ایک بات کا جواب دیتی جاؤ ایک دن روبی کا مجھ سے جھگڑا ہو گیا۔ مجھے تو برا کہتی ہی ہے تمہارے بارے میں بھی کہنے لگی تمہاری فریڈ غزالہ آج کل اپنے گھر کے سامنے بننے والے نئے گھر میں آنے والے کے سے آنکھ اڑ رہی ہے جبکہ لڑکا ہے بھی غزالہ سے چھوٹا۔“

”ارے! وہاں غزالہ روجی کی بات سن کر ہنس پڑی۔ ہاں وہ ہے تو مجھ سے چھوٹا مگر خود ہی میری جانب متوجہ ہوا ہے۔ اس نے لو لٹر بڑی محبت اور محنت سے لکھا تھا۔ میں نے بھی اس کا دل توڑنا مناسب سمجھا اور جواب لکھ دیا۔ صرف انجائے کرنے کیلئے۔ یوں یہ سلسلہ شروع ہو گیا جو ابھی تک اس لیے جاری ہے کہ وہ اچھے خاصے گفٹ دیتا رہتا ہے اور روبی چونکا کثر چھت پر ہوتی ہے اس نے دیکھا ہو گا۔“

”غزالہ تم بھی حد کرتی ہو۔ ایک جانب پرویز اور اب یہ لڑکا جو ہے بھی تم سے چھوٹا۔ کچھ خیال کرو۔“ روجی نے گھورا تو غزالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یار صرف انجائے منٹ اور بس!“

”اور اگر اس انجائے منٹ کا پرویز کو پتہ چل گیا تو۔“ روجی نے پھر کہا تو غزالہ اطمینان سے بولی۔

”پرویز کو پتہ چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پرویز شام کو ڈیوٹی سے واپس آتا ہے۔ تب یہ لڑکا کیڈی پڑھنے گیا ہوتا ہے۔ کالج میں یہ اس کا آخری سلی ہے۔ بی کام کے فائل میں ہے۔“ غزالہ نے کہا پھر دروازہ کھل کر باہر نکلی۔ کھڑکی کے قریب کھڑی روبی کو دیکھا تو شیر کہیں کی کہہ کر مسکرا دی جبکہ روجی نے یہ بات اس لیے بتائی تھی کہ غزالہ روبی کی خوب بے عزتی کرے گی مگر وہ مسکراتے ہوئے چلی گئی تھی۔

اور روبی ایک بار پھر ایک نئے موز پر آ کھڑ ہوئی تھی۔ اچانک اس کو اپنے اندر ایک گہری تشنگی کا احساس ہوا تھا۔ کسی کی محبت کی طلب شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ ورنہ جاوید کے چلے جانے کے بعد اس نے اب تک کسی کی سمت آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اب غزالہ کا چہرہ غزالہ کی باتیں ان سب باتوں کی کچھ سمجھ آئی تھی کچھ نہیں آئی تھی۔ مگر برابہ ہوا روبی کے اندر یہ ادھوری باتیں نے جذبے جگا گئی تھیں۔ اس وقت اس کی سماعتوں میں ایک ہی جملے کی بازگشت تھی۔ ”بے خود ہو گئی۔“ کتنی دیر روبی یہ بازگشت سنتی رہی۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر سوچا۔

”نجانے میری لائف میں یہ محبت بھرے لمحے کب آئیں گے۔ جب کوئی مجھ سے محبت کرے گا۔ جب کوئی مجھ سے خفا ہو گا۔ تو میں اس کو مناؤں گی۔“ نجانے کتنی دیر وہ انہی

سوچا۔



سوچوں میں گم رہتی کہ روجی کی آواز سن کر چونک پڑی جو کہہ رہی تھی۔

”رات کی روٹیاں بنا کر رکھ دو۔ ابوسلمان آنے والے ہوں گے۔“ روٹی اٹھ کر یکن میں آگئی۔ رات کی روٹیاں پکانے کی ذمہ داری امی نے اس کے ذمہ لگائی تھی۔ باقی سب کام تو وہ گھر کے کرتی ہی مگر کھانے پکانے کا سارا کام روجی کرتی تھی۔“

☆☆☆

چند ہفتوں کی تلاش کے بعد نتیجہ نکل آیا تھا۔ یعنی بالآخر روجی کا رشتہ طے ہو گیا تھا بلکہ باقاعدہ منگنی کی رسم بھی ادا کر دی گئی تھی۔ روجی بے حد خوش تھی کہ عامر تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور بینک میں جاب کرنا تھا۔ سبھی گھر والے خوش تھے۔ بلکہ سبھی خاندان والے۔ کوکہ منگنی سلاگی سے ہوئی تھی مگر نصیر چونکہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور یہ ان کی اولاد کی پہلی خوشی تھی اس لیے سبھی خوش تھے اور مبارکباد دینے باری باری سب ہی آئے تھے۔ منگنی کے بعد آئی تو غزالہ بھی تھی۔ مگر بے حد ناراض ناراض سی۔ روجی اس کو ساتھ لے کر اپنے روم میں چلی گئی تو روٹی ہمیشہ کی طرح کھڑکی کے ساتھ لگ کر ان کی باتیں سننے لگی۔ پہلی آواز غزالہ کی تھی جو خفگی سے کہہ رہی تھی۔

”منگنی مبارک ہو۔ تم لوگوں نے چپکے سے سارا کام اندر ہی اندر کر ڈالا اور باہر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ گھر والوں کی تو چھوڑ تم خود بھی بہت تیز اور چالاک ہو روجی! منگنی میں بلا نا تو دور کی بات مجھ سے ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ میں تو اکثر آتی جاتی رہتی ہوں۔ وہ تو تب پتہ چلا جب لڈو ہمارے گھر پہنچے۔ ارے تمہارا کیا خیال تھا میں تمہاری منگنی کا سن کر جل جاؤں گی یا پھر جمشید کو بتا دوں گی۔ مجھے بہت دکھ ہوا تمہارے اس غیروں والے رویے سے۔ انسان اپنے دوستوں سے لازمی ذکر کر رہی دیتا ہے اور میں تمہاری دوست ہوں۔ میں نے تو اپنی کوئی بات بھی تم سے نہیں چھپائی تھی اور تم۔“ غزالہ نے خفگی بھری نظروں سے روجی کو دیکھا تو روجی نے جلدی سے وضاحت کرنے والے انداز میں کہا۔

”اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ بس جھٹ پٹ ہی یہ سب کچھ ہو گیا اور پھر کونسا دھوم دھام سے منگنی ہوئی ہے جو تمہیں شکوہ ہے۔ عامر کی امی نے کہا تھا وہ صرف گھر کے لوگ آئیں گے اور رنگ پہنا کر منگنی کی رسم سلاگی سے ادا کر دیں گے اور وہ ابھی یہی اور امی نے کہا اگر وہ صرف گھر کے لوگ ہی آئیں گے تو پھر ہم بھی کسی کو نہ بلائیں گے۔ ایک وجہ تو یہ تھی۔ دوسری جلدی میں رشتہ طے ہو گیا۔ منگنی پر جو سوٹ ان کو دینے تھے وہ بازار سے لانے بھی تھے اور نا نکلنے بھی تھے، انہی کاموں میں بھٹس کر گھر سے نہ نکل سکی۔ ورنہ میں اور تمہیں بھول جاتی۔ جناب یہ تو ہو ہی نہیں سکتا اور چھپاتے کیوں آخر شادی بھی تو سب کے سامنے ہی ہونی ہے۔“

”بس بس زیادہ پیار دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔“ غزالہ ابھی تک خفا تھی۔ یہ دیکھ کر روجی نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”اگر میری وضاحت کے باوجود تم ابھی تک ناراض ہو تو تمہاری قسم میں یہ منگنی ہی ختم کر دوں گی۔ ورنہ میری بات کا یقین کر لو میں کم از کم تم سے تو کوئی بات چھپا ہی نہیں سکتی۔“ غزالہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا پھر سچ کا اندازہ کر کے بولی۔

”اچھا یا تم بھی کیا یاد کروں گی جاؤ میں نے معاف کیا۔“

”زرہ نوازی ہے آپ کی۔ شکریہ بہر بانی۔“ روجی پہلی بار مسکرائی۔

”اچھا اب یہ بتاؤ عامر کیا کرتا ہے؟ کتنے بہن بھائی ہیں؟ منگنی پر کیا کیا لائے ہیں اور کیا تم نے عامر کو دیکھا ہے؟“ غزالہ نے ایک ہی سانس میں مسکراتے ہوئے سارے سوال کیے تو روجی نے کہا۔

”اے! میں کسے دیکھ سکتی تھی۔ وہ خود تھوڑی آئے تھے منگنی میں ہاں مگر وہ رکی۔“ تھوڑا مسکرائی پھر کہا۔

”تصویر ضرور دیکھی ہے میں نے ان کی اور اب تمہیں بھی دکھائی ہوں۔ باقی منگنی میں وہ لوگ صرف ایک رنگ ہی لائے تھے۔ میری ساس کہتی تھی ان کے یہاں منگنی پر سوٹ لانے کا رواج نہیں۔ عامر تین بہنوں کے اکلوتے بھائی ہیں۔ بینک میں جاب کرتے ہیں اور مٹھائی لائے تھے۔ یعنی موتی چور لڈو جو تم کھا چکی ہو۔ یہ تو تصویر اور بتاؤ کیسا ہے؟“ روجی باتیں کرتے کرتے الماری سے تصویر نکال لائی اور غزالہ کو تھما دی۔

غزالہ نے بہت غور سے تصویر دیکھی بلکہ کتنی دیر دیکھتی رہی پھر مسکرا کر کہا۔



جلدی سے پوچھا۔

”مگر کیا۔۔۔“

”وہی بتانے لگی ہوں۔ تمہاری تو منگنی ہو گئی مگر جمشید بے چارے کا کیا ہو گا۔ وہ تو تم سے سچی محبت کرنے لگا ہے بلکہ تمہاری محبت میں مجنوں بن چکا ہے۔ اگر تم نے اس کو چھوڑ دیا تو کیا حال ہو گا تمہارے اس بے چارے عاشق کا۔ کہیں دیوانہ۔۔۔ نہ بن جائے تمہاری منگنی کا سن کر۔ کچھ جمشید کا بھی سوچا ہے تم نے۔“

”سوچا کیا بس ٹھیک ہے۔ جو دن اس کی سنگت میں گزرے اچھے تھے۔ اب وہ اپنی راہ اور ہم اپنے راستے پر۔“ روجی نے ہنس کر کہا۔ وہ اپنی منگنی سے بے حد خوش تھی۔ اس کی بات سن کر غزالہ بھی ہنسنے لگی۔ پھر ہمیشہ کی طرح سرکشیوں میں باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر یوں ہی سرکشیوں میں باتیں کرنے کے بعد غزالہ نے سیدھی ہوتے ہوئے کہا۔

”تم بڑی ظالم ہو روجی! اسے اپنی منگنی کی بھی اطلاع دی ہے یا یونہی دھوکے میں رکھنے کا پروگرام ہے بے چارے کو۔“

”ہاں ہاں! اطلاع تو دے دی ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ میں بہت مجبور ہوں اور یہ کہ میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک آپ کو نہیں بھولوں گی۔ البتہ ہو سکے تو آپ ضرور مجھے بھول جائیں بلکہ ہو سکتے تو جلدی سے شادی کر لیجئے گا ورنہ اگر آپ تمہارے تو میں سکون سے بھی نہ رہ سکوں گی۔“ روجی نے مسکراتے ہوئے بھنویں اچکا کر ہنستے ہوئے بتایا۔

”مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ تم نے تو جمشید سے مل لگی کی تھی اس لیے اس کو یاد رکھنے کا سول ہی پیدا نہیں ہوتا مگر وہ شاید شادی کر کے بھی تمہیں نا بھول سکے۔“ غزالہ نے ہنس کر کہا۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہوں؟“ روجی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جناب لفاؤ دیکھ کر مضمون بھانپ لیتے اور چہرہ دیکھ کر بندہ پہچان لیتے ہیں۔“ غزالہ نے عقل مند بننے کی کوشش کی۔

”یار! چھوڑو اب جمشید کے ٹا پک کو تم کیا اور ٹا پک لے کر بیٹھ گئی ہو۔“ روجی نے اکتا کر بیزاری سے کہا۔ پھر مسکرا کر بولی۔

”غزالہ! تمہیں معلوم ہے میری نند کہہ رہی تھی عامر بھائی کہتے ہیں شادی کے بعد ہنی مون کے لیے سوات جانے کا پروگرام ہے۔“ روجی پھر عامر کے بارے میں بات کرنے لگی کیونکہ منگنی ہونے کے بعد جمشید سے اس کی انٹرسٹ ختم ہو چکی تھی۔ روجی کو غزالہ کا بار بار جمشید کا ذکر کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ روجی کی بات سن کر غزالہ نے چونک کر اس کو دیکھا۔ پھر ہنس کر کہا۔

”اچھا اچھا! ہنی مون منانے کے لیے سوات جانے کا پروگرام ہے۔ میں سمجھی پیرس جانے کا پروگرام ہے۔“ غزالہ کی بات سن کر روجی بھی ہنس دی اور پھر غزالہ چلی گئی تو روجی نے عامر کی تصویر دوبارہ الماری میں رکھ دی اور رنگ نکل کر دیکھنے لگی۔ پھر انگلی میں ڈال لی۔

کسی اور کے بارے میں تو روٹی نہیں جانتی تھی کہ کس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے مگر خود اس کی اپنی لائف بہت بور ہو گئی تھی۔ سارا چارم ہی جیسے لائف سے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر روم میں بیٹھی پڑھتی رہتی کہ پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دینے کی اجازت ملی گئی تھی اور روٹی کے لیے بہت بڑی بات تھی کہ پرائیویٹ ہی سہی میٹرک مکمل تو ہو گا۔ جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتی تو بکس بند کر کے اوپر چھت پر چلی جاتی فریش ہونے کے لیے کیونکہ روٹی کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ چھت پر وہ اکثر دیکھتی چند گھر چھوڑ کر ایک لڑکا جو عمر میں روٹی کے برابر ہی تھا اپنے گھر کی چھت پر پتنگ بازی میں مشغول ہوتا اور روٹی منڈیر پر سر رکھنے بھی لڑکے کو دیکھتی اور کبھی اوپر آسمان کی جانب جاتی ہوئی پتنگ کو۔ اس میں کوئی غلط بات نہ تھی بس اس کو یہ مشغلا چھا لگتا تھا۔ وہ باقاعدگی سے اوپر جانے لگی تو روجی نے قیل کر لیا کیوں کہ وہ تو خود ایسی تھی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی روٹی محض اس کی وجہ سے بکڑ گئی تھی مگر جو رویہ روٹی نے سکول چھوٹ جانے کے بعد روجی کے ساتھ اپنا رکھا تھا اس کی وجہ سے روجی اس کو مارنے، ماں سے مروانے اور بے عزت کروانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ سب سے پہلے تو روجی نے ماں کے کان بھرے۔

”امی جان! اب روٹی روز اوپر چھت پر جانے لگی ہے۔ ضرور کوئی نیا چاند چڑھانے کے چکر میں ہوگی۔ آپ خود اس کو منع کر دیں۔ میں نے کچھ کہا تو زبان چلائے گی۔ وہ دیکھ لیں وہ اوپر جارہی ہے۔“ اس نے سیزھیوں کی جانب بڑھتی ہوئی روٹی کی جانب اشارہ کیا۔



”اچھا۔ شمشاد نے اوپر جاتی ہوئی روٹی کو دیکھا۔ قبل اس کے کہ وہ اس کو آواز دیتی یا کوئی تلخ بات کہتی چھوٹی خالہ رضیہ آگئی اور بات آئی گئی ہوگئی۔

اور دوسرے دن روجی کے اپنے سرالی آگئے اور یوں روجی کا روٹی کو ماں سے مروانے اور بے عزت کروانے کا پروگرام اٹھارہ گیا۔ مگر چند روز بعد روٹی اپنے روم سے باہر آئی اور جیسے ہی سیرھیوں کی جانب قدم بڑھایا روجی جو پہلے ہی اس کے انتظار میں بیٹھی تھی طنزیہ لہجے میں چوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کسی یار کو دیکھنے روز چھت پر جاتی ہوا دارلڑکی؟“

روٹی وہیں رک گئی۔ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی روجی کے قریب آئی اور روجی کے چہرے کو غور دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔

”سارا محلہ تمہارے یاروں سے بھرا پڑا ہے۔ تم نے کسی کو چھوڑا تو میں بھی بڑائی۔“

روٹی کی بات اچھوری رہ گئی۔ روجی تڑپ کر اٹھ کر اپنی جگہ سے اٹھی۔ روٹی کی بات نے کو یا اس کے اندر بارود بھردیا تھا۔ وہ یکدم سامنے کھڑی روٹی پر حملہ آور ہوئی اور بالوں سے پکڑ کر ایک ہی منٹ میں کئی تھپڑ روٹی کے منہ پر جھڑ دیئے۔ جو با روٹی زبان چلانے لگی بلکہ ایک آدھا ہاتھ بھی روجی کو جھڑا دیا۔ یہ دیکھ کر روجی نے مارے نفرت اور غصے کے پاؤں سے چپل اتار لی اور لگی بے رحمی سے روٹی کو مارنے۔ روٹی زبان چلانے کے ساتھ ساتھ رونے بھی لگی۔ خوب مارنے کے بعد وہ غصے میں بھری اپنے روم میں آگئی۔ روٹی کو اتنا مارنے کے بعد بھی اس کی اندر لگی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تھی اس نے روٹی کے کپڑے اور بیگ اٹھایا اور باہر برآمدے میں پھینکتے ہوئے بولی۔

”آج سے تم میرے روم میں نہیں بلکہ سٹور میں رہو گی آوارلڑکی۔“

روٹی نے دیکھا بیگ زمین پر گرتے ہی بیگ کے باہر والے حصے میں سے جاوید کو لکھا گیا پہلا لیٹر جو روٹی نے پہلی محبت کی نشانی کے طور پر سنبھل کر رکھا ہوا تھا بیگ سے نکل کر باہر فرش پر گر گیا تھا۔ یہ دیکھ کر روٹی رونے لگا بھول کر بھاگ کر آئی مگر دیر ہو چکی تھی۔ تب تک روجی کی نگاہ بھی اس لیٹر پر پڑ چکی تھی۔ روٹی کے قریب آنے سے قبل ہی روجی نے لپک کر ماحول سے لیٹر اٹھالیا بلکہ فوراً کھول کر پڑھنے لگی اور روٹی مارے بے بسی کے ہونٹ کھلتی ہوئی روجی سے واپس لیٹر لینے کا طریقہ سوچنے لگی۔ روجی لیٹر پڑھ کر فارغ ہوئی پھر روٹی کو گھورتے ہوئے بولی۔

”اچھا تو اس کے لیے تم روز اور چھت پر جاتی ہو؟“ جو با روٹی چپ رہی۔ ہر قسم کی وضاحت فضول تھی۔ وہ تو اس سوچ میں گم تھی کہ روجی سے یہ لیٹر واپس کیسے لے۔ ابھی وہ اس مسئلے کا کوئی حل سوچ بھی ناپائی تھی کہ ماں سلمان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ ان کو دیکھ کر روٹی کے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ شمشاد نے روٹی کو دیکھا۔ روجی سے روٹی کے رونے کا سبب پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ روجی نے خط سلمان کے حوالے کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

”امی! میں نے آپ سے کہا تھا کہ روٹی اب روزانہ اوپر چھت پر جانے لگی ہے۔ ضرور کوئی نیا چاند چڑھائے گی اور اس نے چڑھا دیا۔ یہ لیٹر روٹی کے بیگ سے نکلا ہے۔“ اس نے سلمان کے ہاتھ میں پکڑے لیٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پورے جوش سے کہا۔

شمشاد چپ چاپ سلمان کو دیکھنے لگی جو غصے سے بھر لیٹر پڑھ رہا تھا۔ لیٹر پڑھنے کے بعد وہ ماں اور روجی سے کچھ کہنے کی بجائے جانور بن کر روٹی پر جھپٹ پڑا اور مار مار کر وہ حالت کر دی کہ لٹنی دیر اس جگہ سے اٹھنا تو دور کی بات روٹی مل بھی نہ سکی تھی۔ روٹی کو مارنے کے بعد سلمان لیٹر ماں کے آگے پھینکتے ہوئے خود غصے سے بھر باہر چلا گیا تو روجی نے ماں کو خود سارا لیٹر پڑھ کر سنایا۔ لیٹر سن کر حمیدہ نے روٹی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں ری آوارہ کون ہے وہ جس کو تم نے یہ لیٹر لکھا ہے؟“

روٹی بولنے کے قابل بھی ہی نہیں۔ ہوتی بھی تو جو بچ تھا وہ بھلی نہ سکتی تھی۔ اس کو خاموش دیکھ کر روجی نے کہا۔

”امی جان! روٹی نے زبان چلانے کے ساتھ ساتھ آج مجھے پر ہاتھ بھی اٹھایا ہے۔ اب میں اس کو اپنے روم میں نہیں رہنے دوں گی۔ آج سے یہ سٹور میں رہے گی۔ اچھی خاصی جگہ ہاس میں چارپائی بچھانے کی۔“

”تم ہوش میں تو ہو روجی۔ روٹی سٹور میں رہے گی تا کہ جب ہم سب سو جائیں تو وہ کسی یار کو ملنے چلی جائے یا گھر میں بلا لے۔ روٹی تمہارے روم میں ہی رہے گی۔“ دعا کرو خدا اس کو موت دیدے۔ آوارہ بچانے لگی کس پر ہے۔ اس کی تو پچھو پچھی بھی بے حد شریف تھی۔“



ماں کی بات سن کر روہی نے نفرت بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھا مگر چپ رہی۔ وہاں گرجاں بہن سب کے سامنے زبان چلانے لگی تھی مگر دل میں آج بھی ان سب کے لیے بے حد محبت اور احترام تھا۔ وہ مجرم بس روجی کو سمجھتی تھی اور اکثر دل میں دعا کرتی کہ اے کاش وہ سب ایک بار پھر پہلے کی طرح مہربان ہوں۔ اس کو محبت کرنے لگیں اور شاید ایسا ہو بھی جاتا مگر روجی اس کے خلاف سب کے کان بھرتی رہتی۔ محض اپنی آوارگیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ گھر کا مخالف ہمیشہ روہی کی خلاف گرم رکھتی تھی۔

روہی روجی کے روم میں ہی سونے لگی مگر پہلے روجی کے ساتھ اس کے بستر پر سوتی تھی مگر اب روجی نے اس کے لیے الگ چارپائی لگا دی تھی۔ دن میں وہ روہی کو اپنے روم میں گھسنے بھی نہ دیتی تھی مگر رات کو سونے کی روہی کو اس کے روم میں اجازت تھی۔

چند ہفتوں بعد روہی کے میٹرک کے ایگزیم شروع ہو گئے۔ ماں خود اس کو لے کر جاتی۔ خود ہی ساتھ لے کر آتی۔ ایگزیم ختم ہوئے ہی تھے کہ ماموں کے یہاں سے نیاز کا بلاوا آ گیا۔ شمشاد بیگم روجی اور زوہی کو ساتھ لے کر جانے لگی تو روہی بولی۔  
”امی جان! مجھے بھی ساتھ لے جائیں مجھے کیلے گھر میں ڈر لگے گا۔“

”ہاں تمہیں لے جاؤں گا کہ وہاں بھی اپنی آوارگی دکھاؤ۔ اب تم گھر میں ہی رہا کرو گی۔“ ماں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا اور زوہی روجی کو ساتھ لے کر چلی گئیں۔  
ماں کی بات سن کر روہی کے دل پر چوٹ پڑی۔ جو مجرم تھی، آوارہ تھی وہ عزت دار بنی ہوئی تھی اور اس کو بے گناہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنادیا گیا تھا۔

ان سب کے جانے کے بعد روہی نے ڈور بند کیا اور خود روتی ہوئی اپنے روم میں چلی آئی۔ سارا دن وہ گھر میں اکیلی ہی رہی اور بھوک کی بھی۔ سارے غصے اور دکھ کے نہ کھانا بنایا اور نہ ہی کھایا۔ یونہی شام ہو گئی۔ اندھیرے میں روہی کو ڈر آنے لگا تو اس نے سارے گھر کی لائٹیں آن کر دیں اور خود پر آمدے میں بیٹھ کر رونے لگی۔ وہ اپنے آپ کو اس وقت بے حد مظلوم سمجھ رہی تھی اور شاید بھی تھی۔ اس کی اپنی سمجھ میں اپنے جرم اور وہ گناہ نہ آ رہے تھے جن کی اس کو یہ بڑا دی جا رہی تھی۔ جرم تو آپنی نے کیے تھے مگر بڑی اور چلاک ہونے کی وجہ سے وہ اپنا دفاع کر گئی تھی اور میں..... میں اب اگر امی کو بتا بھی دوں تو وہ یقین نہیں کریں گی۔ پھر بتانے کا کیا فائدہ وہ یونہی روتی رہی اور سوچتی رہی خود کو بے گناہ ثابت کرنے کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

انہی دنوں روہی کی خالد اور ماموں کی بیٹیاں رخسانہ اور گلدان کے گھر رہنے چلی آئیں اور ان دونوں کے آنے سے گھر کا ماحول اب روہی کے لیے بھی خوشگوار ہو گیا۔ مارتو کیا ان کی موجودگی میں روہی کو ڈانٹ بھی نہ پڑتی تھی۔ ماں بھی گھر پر رہنے لگی تھی۔ دن میں جب وہ چاروں یعنی ماں، روجی، رخسانہ اور گلدان باتوں میں مشغول ہوتیں تو روہی کو اشارہ کرتی آؤ زوہی ہم کھیلیں مگر زوہی ماں کی باتوں پر اب شاید پوری طرح عمل پیرا تھی۔ ماں بے شک یاس ہوتی یا نہ ہوتی وہ روہی سے کھیلتا تو دور کی بات اس کی بات کا جواب دینا بھی کلام نہ کرتی۔ یہ دیکھ کر روہی کو بے حد غصہ آتا اور وہ کس کر زوہی کے منہ پر دوچار تھپڑ مار کر سٹور میں بند ہو جاتی۔ روم میں جانے کی اجازت تو صرف رات کو تھی۔

زوہی بڑے حوصلے اور صبر سے اس کے تھپڑ برداشت کر جاتی حالانکہ اگر وہ ایسے میں ماں سے شکایت کرتی تو روہی کی اچھی خاصی ہٹائی ہو جاتی مگر زوہی نے ایسا کبھی نہ کیا تھا۔ ماں سے شکایت کرنا تو دور کی بات کبھی خود بھی منہ سے کچھ نہ کہا تھا۔ مار کھانے کے بعد وہ بڑی معصومیت سے روہی کو دیکھا کرتی تھی اور روہی کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آتی کہ زوہی مار کھا کر خاموش کیوں رہتی ہے۔ وہ یہ بات کبھی نہ سمجھ سکی تھی۔

حساس زوہی پہلے ہی گھر میں روہی کی حیثیت کو مل کر چکی تھی۔ اس کو روہی پر بہت ترس آتا تھا مگر وہ چھوٹی تھی۔ روہی کے لیے کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ویسے بھی وہاں کی فرمانبردار بیٹی تھی۔ ماں کا کہنا کبھی نہ ٹال سکتی تھی۔ مگر بہن ہونے کے نا طے اس کو روہی سے بھی بے حد محبت تھی۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ روہی اپنی بری حرکتیں چھوڑ دے۔ یعنی زبان بازی مگر وہ خود روہی کو ایسی باتوں سے نہ تو روک سکتی تھی اور نہ ہی چھوٹی ہونے کی وجہ سے سمجھا سکتی تھی۔ وہ بے حد سمجھدار بہن تھی۔ اس کو کھیلنے سے کم اور پڑھنے لکھنے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بھی گھر والے زوہی سے بے حد خوش رہتے تھے۔ حالانکہ اس کی عمر ابھی دس برس تھی مگر اس کی سوچ اور ذہن اپنی موجودہ عمر سے کہیں زیادہ تھا۔ روہی کے ساتھ نہ کھیلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ماں نے اب کی بار اس کو سختی سے تناید کی تھی کہ اب اگر میں نے تمہیں روہی کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو تمہیں تو میں کچھنا کہوں گی مگر روہی کا مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں گی اور زوہی روہی کو ماں کی مار سے بچانے کیلئے خود روہی سے مار کھالیا کرتی تھی۔

رخسانہ اور گلدان کے آنے سے گھر میں ایک ہنگامہ سا رہنے لگا تھا۔ خاص کر رات کے وقت سلمان بھائی بھی آپنی کے روم میں آ جاتے۔ دیر تک باتیں اور ہنسی مذاق ہوتا۔ خشک میوہ



کھایا جاتا پھر سلمان چلا جاتا مگر ان کی باتیں پھر بھی ختم نہ ہوتیں۔ روپی چونکہ آپنی کے روم میں سوتی تھی اس لیے آدھی رات تک ان کی باتیں سنتی رہتی اور کبھی باتیں سنتے سنتے سو جاتی۔ رخسانہ روپی کے ساتھ سوتی تھی اور گڈو روجی کے ساتھ۔ مگر رخسانہ باتوں سے فارغ ہو کر ہی روپی کی چارپائی پر سونے آتی تھی۔ جب تک سلمان روم میں رہتا تب تک باتیں سننے کرنے کو وہ بھی گڈو کے ساتھ روجی کی چارپائی بلکہ پٹنگ پر موجود رہتی۔

ایک رات وہ سب حسب معمول بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک روپی کا چچا زاد بھائی آصف آگیا اور ان سب کے ساتھ باتوں میں شامل ہو گیا۔ روپی کو ماں نے بڑوں کی باتوں میں بولنے سے منع کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی روپی چپ چاپ بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہتی۔ بولتی کبھی نہ تھی۔ تاہم آصف کی آمد کے بعد روپی نے ٹل کیا تھا رخسانہ کچھ زیادہ ہی اٹھلا اٹھلا کر باتیں کرنے لگی تھی۔ ورنہ آصف کی آمد سے پہلے سب سے زیادہ باتیں صرف گڈو کرتی تھی۔ صرف باتیں خوب کرتی تھی بلکہ بات بے بات ہنستی بھی خوب تھی اور اہم بات یہ کہ روز سلمان سے ایک نئی چیز کھانے کی فرمائش بھی وہی کرتی تھی اور سلمان لازمی اگلے روز وہ چیز لے آتا جو میل کر کھاتے۔

روپی کلاس کا حصہ اس کی چارپائی پر ہی مل جاتا۔ مگر آصف کی آمد کے بعد رخسانہ بھی خوب ہنسنے بولنے لگی تھی۔ روپی نے اکثر دیکھا باتیں کرتے کرتے جب کبھی آصف کی نگاہ رخسانہ پر پڑتی تو وہ خامخو اہالوں کو درست کرتے ہوئے مسکراتے لگتی۔ کبھی نگاہیں جھکاتی کبھی نگاہیں اٹھاتی جیسے شرماری ہو۔ جب آصف روز آنے لگا تو نجانے کیسے روپی کے دل میں یہ خیال آیا کہ آصف میرے چچا کا بیٹا ہے۔ اس پر پہا حق میرا ہے۔ یہ رخسانہ کون ہوتی ہے۔ آصف کو ایسی محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے والی۔ ذلیل کمینہ! بے شرم۔ افوہ آخر یہ خیل پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ وہ دل ہی دل میں یہ سب سوچتے ہوئے آصف کو دیکھنے لگی۔

آصف پچیس برس کا کورے چٹے رنگ کا بہت وجیہ نوجوان تھا۔ روپی اس کو باتیں کرتے دیکھتی رہی مگر وہ صرف رخسانہ کی جانب متوجہ تھا۔ حالانکہ سلمان بھائی بھی محفل میں موجود تھے۔ آصف کے چلے جانے کے بعد روپی اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ نیند تو جیسے کہیں پاڑ کر چلی گئی تھی۔ معاً گڈو کی سرکوشی سن کر چونک پڑی۔

”اچھا بھی میں تو اب چلتی ہوں۔ میرا سلمان کے روم میں جانے کا نام ہو گیا، بے چارہ انتظار میں ٹل رہا ہوگا۔“ گڈو نے دھیمی دھیمی ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں! کیوں نہیں جاؤ، جاؤ۔“ روپی نے جواباً روجی اور رخسانہ کی سرکوشی سنی۔ گڈو چلی گئی تو تھوڑی دیر بعد ہی رخسانہ روپی کی چارپائی پر آ کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ مگر روپی کو گڈو کی واپسی تک نیند نہیں آتی تھی۔ وہ سوچتی رہی اچھا تو یہ بات ہے جو روز ہنس ہنس کر سلمان بھائی سے نئی نئی فرمائشیں کرتی ہے اور سلمان بھائی بھی انکار نہیں کرتے۔ اب وہ سلمان بھائی کے خوش رہنے کی وجہ بھی سمجھ گئی تھی۔ روپی نے سوچا۔

اب یہ رخسانہ لگتا ہے آصف کو پھانس کر ہی رہے گی کیونکہ آصف بھی سارا دن اسی کو دیکھتے رہتے ہیں اور روز وہ بھی کوئی نہ کوئی کھانے والی چیز ضرور لے کر آتے ہیں۔ آج بھی تو گاجر کا حلوہ لائے تھے۔ کل دس ملائی پرسوں گلاب جامن اور یہ سب چیزیں وہ صرف رخسانہ کی وجہ سے لاتے ہیں۔ جیسے سلمان بھائی گڈو کے کہنے پر لاتے ہیں اور یہ رخسانہ کتنی بے غیرت ہے۔ آج کیسے کہہ رہی تھی کہ اچھرہ موڑ کی ٹلی ہوئی چھلی کھانے کو دل چاہتا ہے۔ اب لازمی کل آصف فٹ لے کر آئیں گے۔ کمینہ چیزیں جتنی مرضی کھالے مگر خیر میں دیکھتی ہوں میری موجودگی میں رخسانہ آصف کو کیسے پھانسی ہے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ گڈو چپکے سے روم میں داخل ہوئی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے روجی کے ساتھ لیٹ گئی۔ روپی کو بھی نیند نے آن گھیرا۔

پھر تو روز ہی آپنی کے روم میں محفل جنمے لگی۔ جس میں سلمان، آصف، روجی، گڈو، رخسانہ اور روپی شامل ہوتے تھے۔ روپی کی شمولیت محض ایک مجبوری تھی کہ وہ آپنی کے روم میں سوتی تھی ورنہ بات چیت میں چاہنے کے باوجود اس کو حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ تاہم وہ چاروں سارا وقت خوش گپیوں میں مصروف رہتے اور روپی اپنی چارپائی پر لیٹی سارے منظر دیکھتی اور باتیں سنتی رہتی۔ ایک رات آصف اٹھ کر گیا تو رخسانہ نے ہنستے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”بھئی! روجی تمہارا چچا زاد بھائی تو بہت شریہ ہے بلکہ بے حد تیز دیکھو تو آج جاتے ہوئے کتنی صفائی سے وہ مجھے یہ لیٹر دے گیا ہے اور تم میں سے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔“

”ہائیں!“ روجی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے لیٹر کو دیکھا۔ ”یہ آصف تو واقعی بڑا تیز نکلا۔ ویسے میں کئی دنوں سے تم دونوں کلنٹ کر رہی تھی۔“ روجی نے ہنس کر کہا تو گڈو بولی۔



”وہی تیز نہیں یہ خود بھی بڑی تیز ہے۔ میں بھی کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ خود بھی سارا نام اس کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھی رہتی تھی۔ وہ لڑکا تھا آخر پہل تو اس نے ہی کرنی تھی۔ سو وہ کر گیا۔“ اور پھر تینوں ہنسنے لگی تھیں۔

روبی اپنی چارپائی پر بیٹھی چپ چاپ ان کی باتیں سن رہی تھی۔  
خط کا سن کر اس کو بے حد غصہ آیا۔ اس نے سوچا۔

یہ لیٹر تو آصف کو مجھے لکھنا چاہیے تھا۔ میں اس کے بتایا کی بیٹی ہوں اور اس کمینی رخسانہ سے زیادہ خوبصورت ہوں۔ خیر کل سے میں اچھی طرح ان دونوں کا دھیان رکھوں گی اگر پھر آصف نے اس کمینی لڑکی کو لیٹر دینے کی کوشش کی تو تو۔۔۔ وہ سوچنے لگی تو پھر کیا کروں گی۔ میں ایسا کوئی موقع آنے ہی نہ دوں گی۔ اس نے وہیں لیٹے لیٹے دل میں پلاننگ کر لی کہ اگر آصف نے پھر خط دینے کی کوشش کی تو وہ مسلمان بھائی کے سامنے ہی ان کا بھانڈا بھوڑ دے گی اور صاف صاف کہہ دے گی کہ آصف بھائی یا سپد خسانہ باجی کو کس کا لیٹر دے رہے ہیں۔ اس طرح ان دونوں کے درمیان شروع ہونے والا یہ نیا تیار و ناس ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا۔ ہاں یہی ٹھیک رہے گا۔ روبی نے سوچا اور اپنی چالاکی پر خود ہی مسکرا دی مگر روبی کی یہ پلاننگ اچھوری رہ گئی کیونکہ اگلی صبح رخسانہ کی امی اس کو لینے آگئی اور وہ اپنی امی کے ساتھ چلی گئی جبکہ گڈو کو اس کے گھر چھوڑنے خود مسلمان بھائی نے جانا تھا۔

روبی نے دیکھا تھا جاتے ہوئے رخسانہ آصف کے لیے روٹی کو ایک لیٹر دے گئی تھی۔ روبی نے اس لیٹر کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر اپنی پوری کوشش کے باوجود جب اس کو لیٹر نہ ملا تو غصے سے دانت پیس کر رہ گئی۔ اس پر روٹی کی باتیں سن کر روبی کو اور بھی غصہ آیا جس نے جاتی ہوئی رخسانہ کے گلے ملتے ہوئے پیس کر کہا تھا۔

”لگتا ہے اللہ نے تم دونوں کو یہاں رشتے کی تلاش میں بھیجا تھا۔ آج سے تم اپنا رشتہ آصف سے نکالو۔ گڈو مسلمان کے لیے تو میں خود امی سے آج ہی بات کروں گی کہ میری شادی کفر و کدای کا خیال مسلمان کی شادی کا ہے۔ ان کو گھر بیٹھنے کی عادت نہیں اور انہی کام کی بہو کم از کم گھر تو سنبھال لے گی۔“

گڈو مسلمان کے دشتے پر روبی کو اعتراض نہیں تھا۔ مسلمان اس کا بھائی تھا اور گڈو ویسے بھی رخسانہ سے زیادہ روبی کے ساتھ پیدا محبت سے پیش آتی تھی۔

مگر آصف اور رخسانہ کے دشتے کا سوچ کر ہی روبی کا دماغ خراب ہونے لگا۔ روبی نے سوچ لیا تھا خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ ہرگز یہ رشتہ نہ ہونا دے گی۔ وہ اور کچھ نہ کر سکی تو چچی سے کہہ دے گی۔ رخسانہ اچھی لڑکی نہیں ہے اور اگر چچی نے امی کو بتا دیا تو رخسانہ ان کو پھانسی ہے وہ تو مجھے بہت مار سکیں گی آخر پھر میں کیا کروں اس نے بے بسی سے سوچا۔

آصف پچیس برس کا تھا جبکہ وہ خود بھی سولہ برس کی تھی اس کے باوجود وہاں بیٹھے بیٹھے آصف کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ آصف کے ساتھ اظہار محبت کیسے کرے۔ وہ کس طریقے سے آصف کو بتائے کہ وہ اس کے ساتھ محبت کرنے لگی ہے۔ کیا اپنے منہ سے کہہ دے۔ ہائے اللہ نہیں یہ تو میں قیامت تک نہیں کر سکتی تو پھر کیا کروں۔ مجھے جو بھی کرنا ہے جلدی جلدی کرنا ہے۔ آصف اور رخسانہ کا رشتہ طے ہونے سے پہلے پہلے بہت سوچ بچار کے بعد روبی نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ آصف کو لیٹر لکھ کر اپنے خیالات سے دل کی حالت سے آگاہ کر دے۔ آخر آپ ہی بھی تو خود ہی لڑکوں کو خط لکھنے میں پہل کیا کرتی تھی۔ وہ سب باہر کے لڑکے تھے اور آصف تو میرے سکے چچا کا بیٹا ہے۔ یہ سوچتے ہی روبی نے اپنی اس سوچ کفر و کدای طور پر عملی جامہ پہنانے کا سوچا اور بڑی محنت اور محبت سے آصف کے نام محبت نامہ لکھ کر رکھ لیا اور لگی انتظار کرنے کہ کب آصف ان کے گھر آئے اور وہ یہ اپنا محنت سے لکھا ہوا محبت نامہ اس کے حوالے کرے۔

روبی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند روز بعد ہی اتفاق سے آصف ان کے گھر آیا تو روبی مارے خوشی کے جھوم اٹھی۔ ماں گھر پر نہیں تھی۔ وہ سیدھا روٹی کے دم میں گیا اور چند باتیں کرنے کے بعد جیسے ہی واپس جانے لگا تو روبی جلدی سے ان کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

”آصف یہ لیٹر لیجئے اور گھر جا کر پڑھ لیجئے گا۔“ روبی کے صرف آصف کہنے پر آصف نے قدرے حیران ہو کر اس کو دیکھا۔ پھر لیٹر پکڑتے ہوئے پوچھا۔  
”کس کا ہے یہ لیٹر اور کس کے لیے ہے؟“

”میرا ہے اور آپ کے لیے ہے۔“ روبی نے جلدی سے کہا اور شرما کر اندر بھاگ گئی۔ آصف چند سیکنڈ وہاں کھڑا رہا پھر چلا گیا۔

اپنی چارپائی پر لیٹتے ہی روبی بیٹھے سینوں کی خوبصورت رنگین دنیا میں کھو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ جب آصف دوبارہ آئے گا اور محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ کر مسکرائے گا تو وہ بھی شرما کر رہ جائے گی اور جب وہ روبی سے اظہار محبت کرے گا تو وہ بھی شرما کر کبھی نگاہیں اٹھائے گی، کبھی جھکائے گی رخسانہ کی طرح۔



اگلے دن وہ عجیب سی کیفیت سے دو چار رہی۔ سارا وقت آصف کے خیال آتے رہے۔ دن دھیرے دھیرے ڈھلنے لگا اور بالآخر شام تو کیا رات بھی ہو گئی مگر آصف کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ وہ فسر دگی کے عالم میں رات گئے تک اس کو یاد کر کے جاگتی رہی اور پھر آصف کے خیالوں میں ہی گم یہ سوچ کر سو گئی کہ کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے۔ آج نہیں تو کل آ جائے گا۔ اتنی جلدی بھی اچھی نہیں ہوتی۔

سو تے میں روٹی نے خواب دیکھا۔ آصف نے اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے کی بجائے اس کی امی کو ساری بات بتادی تھی۔ اس کی بات سنتے ہی امی غصے سے بھری اس کی جانب آئی تو روٹی کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو روٹی بہت پریشان ہوئی کہ یہ کیا ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے۔ پھر اس نے سوچا خواب صرف خواب ہوتے ہیں حقیقت نہیں اور مطمئن ہو کر پھر سو گئی۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت آصف اپنی تمام تر مردانہ وجاہت کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ صحن میں وہاں کیلی تھی۔ امی روجی کے روم میں تھی۔ روٹی نے نظر بھر کر آصف کو دیکھا پھر بڑی محبت اور احترام سے سلام کیا اور فوٹو ماشرما کر چہرہ جھکا لیا اور آصف اس کے سلام کا جواب دینے کی بجائے بڑی سنجیدگی سے روٹی کو دیکھتے ہوئے روجی کے روم میں چلا گیا۔ روٹی آصف کے اس سرد رویے پر حیران تھی اور دل میں فوٹو ماشرما کر چہرہ جھکا لیا اور آصف اس کے سلام کا جواب دینے کی بجائے بڑی سنجیدگی سے روٹی کو دیکھتے ہوئے روجی کے روم میں چلا گیا۔ روٹی آصف کے اس سرد رویے پر حیران تھی اور دل میں فوٹو ماشرما کر چہرہ جھکا لیا اور آصف اس کے سلام کا جواب دینے کی بجائے بڑی سنجیدگی سے روٹی کو دیکھتے ہوئے روجی کے روم میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھلا اور آصف باہر آیا۔ روٹی کو دیکھے بنا بڑی تیزی سے باہر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی ماں غصے سے بھری خون خوار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی جانب آئی تو روٹی سمجھ گئی معاملہ الٹا ہو گیا ہے۔ آصف نے اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے کی بجائے روجی اور اس کی امی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس دن پھر حمیدہ بیگم نے اس کو بڑی بے رحمی سے مارا تھا۔ مگر اتنی مار کھانے کے باوجود آصف کی محبت پھر بھی اس کے دل سے کم نہ ہوئی تھی۔ رات سلمان اور ابو کے گھر آنے پر حمیدہ بیگم نے یہ سارا قصہ ان کو بھی سنا دیا اور سب نے مل کر ایک ہی فیصلہ کیا کہ اچھا برا جیسا بھی رشتہ ملتا ہے تلاش کریں اور جلدی سے روٹی کی شادی کر دی جائے کیونکہ اس کی حرکات سے کبھی گھر والے پریشان رہنے لگے تھے۔ شمشاد بیگم نے کہا۔۔۔۔۔

”ارے روجی ہی کو دیکھو پچیس کی ہو رہی ہے مجال ہے جو محلے میں کسی نے کبھی اس کا اونچی آواز میں بولتے ہوئے بھی سنا ہو اور یہ بے غیرت پیدا ہوتے ہی آوارہ ہو گئی۔ پتہ نہیں یہ گئی کس پر ہے۔“

روٹی کا دل چلا چنچ چنچ کر کہہ دے روجی پر اور کس پر مگر وہ چپ رہی۔ زبان چلا کر انہیں کھانا چاہتی تھی۔ ”امی ان باتوں کو چھوڑیے قبل اس کے خاندان یا محلے میں ہماری مزید بدنامی ہو۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں۔ اس کی شادی کر کے اس کو یہاں سے دفع کیجئے۔ اب میں اس کو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔“ سلمان نے غصے سے کہا۔

روٹی جو اندر بیٹھی ساری باتیں سن رہی تھی جی چاہا کہہ دے میں تو صرف لیٹر لکھتی ہوں اور پکڑی جاتی ہوں اور تم خود تو آدھی رات تک ساموں کی بیٹی کو اپنے روم میں بند رکھتے ہو اور پتہ نہیں کیا کیا اس کے ساتھ کرتے ہو گے۔“ مگر وہ یہ سب باتیں سوچ سکتی تھی کہہ نہیں سکتی تھی۔ پھر وہاں کی آواز سن کر چونکی۔

”تم نہیں سمجھتے بیٹا بڑی بہن کے ہوتے ہوئے چھوٹی کی شادی نہیں ہو سکتی۔ لوگ تو پھر باتیں بنائیں گے کہ ابھی بڑی کی تو شادی نہیں ہوئی اور چھوٹی کی کر دی۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے اور لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ اب ہم خود تو لوگوں کو یہ بتانے سے رہے کہ چھوٹی سی عمر میں کتنے بڑے بڑے گل کھلا رہی ہے آوارہ لڑکی۔“

”لوگوں کی باتیں چھوڑو۔“ نصیر جو کب کے چپ چاپ سب کی باتیں سن رہے تھے بول پڑے۔ ”میرے خیال میں اب مزید دیر کرنا فضول ہوگا۔ روجی کی منگنی تو ہو چکی اب جلدی سے اس کے لیے بھی رشتے والی سے کہو۔ اس کے لیے بھی کوئی مناسب رشتہ جلدی سے ڈھونڈ کر لائے تاکہ روجی کی شادی کے ساتھ روٹی کی شادی بھی ہو جائے۔ دو بیٹیوں کی شادی تو بہت سارے لوگ اکٹھی کر دیتے ہیں۔ بس جو کچھ بھی کرنا ہے اب جلدی سے کر ڈالو۔ اگر اس نے مزید کوئی غلط قدم اٹھالیا تو ہم جیتے جی مرجائیں گے۔“ وہ خاموش ہو کر سوچنے لگان کی جتنی محبت روٹی سے تھی اب اس سے زیادہ نفرت ہو چکی تھی۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں صبح ہی رشتہ کرانے والی سے بات کرتی ہوں بلکہ کہتی ہوں وہ جلدی سے کوئی اچھا سا رشتہ روٹی کے لیے لے کر آئے۔ یہ بات آپ کی درست ہے دو بیٹیوں کی اکٹھی شادی کرنا معیوب بات نہیں اور اس طرح خرچے کی بھی بچت ہوگی۔ اب اللہ کرے رشتہ مل جائے۔“ شمشاد بیگم کی بات پر کوئی کچھ نہ بولا تھا جیسے بولنے کو کسی کے پاس اب کچھ رہا ہی نہ تھا۔



ان سب کی احتیاط کے باوجود سارے خاندان کو پتہ چل گیا کہ روبی نے آصف کو لولہ لکھا تھا۔ آصف نے تو کو اس بات کا ذکر صرف اپنی امی سے کیا تھا مگر انہوں نے سٹوری بنا کر ہر کسی کو بتا ڈالا۔ شمشاد بیگم کو پتہ چلا تو غصہ تو بے حد آیا مگر غلطی اپنی اولاد کی تھی۔ اس لیے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ تاہم روبی پر گھر کے اندر باہر جانے پر مزید پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

ادھر روبی کے رشتے کی تلاش جاری تھی اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ابھی تک کوئی اچھا رشتہ تو کیا کوئی عام سارشتہ بھی نہ آیا تھا۔ ادھر رشتے کی تلاش جاری تھی۔ ادھر آصف کی شادی رخسانہ سے ہو گئی۔ انہوں نے منگنی وغیرہ کے چکر میں پڑنے کی بجائے سیدھی طرح بات طے کر کے شادی کر دی تھی۔ آصف کی شادی کا سن کر روبی دانت پیستے ہوئے سوچنے لگی کہ بخت ادھر ادھر میرا رشتہ تلاش کرتے رہے اگر یہ چاہتے تو کیا آصف سے رخسانہ کی بجائے میری بھی تو شادی ہو سکتی تھی۔ مارے غصے کے روبی شادی میں بھی نہ گئی اور یوں اس کا یہ دوسرا عشق بھی اپنے آپ ختم ہو گیا اور وہ باوجود خوشی کے کچھ نہ کر سکی۔ بہت دن وہ اداس رہی۔ پھر پہلی محبت کی طرح اس دوسری محبت کو بھی نا صرف بھول گئی بلکہ دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ اب وہ کسی کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی مگر اس کے باوجود ایک بار پھر غلطی ہو گئی، یعنی تیسری غلطی۔

وہ لڑکا سلمان بھائی کا فریڈ تھا۔ جو کالج سے واپسی پر ہمیشہ سلمان کو ڈراپ کرنے آتا تھا۔ ایک دن بس اچانک ہی روبی نے اس کو دیکھا لیا۔ وہ چھت پر کپڑے ڈالنے لگی تھی۔ موٹر بائیک کی آواز سن کر نیچے جھانکا سلمان بھائی موٹر بائیک سے اترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”یار! آج موسم بہت گرم ہے، آؤ میرے ساتھ اندر آ جاؤ اور شربت پی کر چلے جانا۔“  
 ”شربت نہیں صرف ٹھنڈا پانی یہاں پر ہی لے آؤ آج مجھے بھی گھر جلدی جانا ہے۔ آ پا آنے والی تھیں۔“ سلمان کا فریڈ نے کہا۔  
 ”ویل اوکے! تم یہاں ٹھہرو میں ابھی لے کر آتا ہوں۔“ کہہ کر سلمان اندر چلا گیا۔

آج تو گرمی نے حد کر دی تو صیف نے رومال سے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے اوپر آسمان کی جانب دیکھا اور روبی پر نگاہ پڑتے ہی چہرہ فوراً نیچے کر لیا کہ وہ بے حد شریف لڑکا تھا۔ مگر روبی اس کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی تھی۔ دھوپ کے بلیک گلاسز لگائے بلیک پینٹ اور سفید شرٹ میں وہ بہت خوبصورت لگتا تھا۔ روبی گرمی کے احساس سے بے نیاز ہو کر اس کو دیکھتی رہی۔ سلمان پانی کی بوتل لے کر باہر آیا اور پانی پی کر وہ سلمان کو اللہ حافظ کہہ کر فوراً ہی رخصت ہو گیا۔ روبی وہیں رینگت کتھریب کھڑی اس کے بارے میں سوچنے لگی۔

وہ روبی کو بے حد پسند آیا تھا۔ کیا میں اس کو دوبارہ دیکھ سکوں گی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا۔ اب وہ دھوپ کی تمازت سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ کافی دیر سوچنے کے بعد ایک آئینہ روبی کے ذہن میں آیا اور وہ مارے خوشی کا چھل پڑی۔ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ اس نے خود کا امی کی۔

پھر روز اس خیل پر عمل ہونے لگا۔ روبی کو اچھی طرح معلوم تھا جس نام سلمان کالج سے گھر واپس آتا تھا۔ روبی اس نام کسی نا کسی طرح اس کی ایک جھلک دیکھنے جلدی سے چھت پر چلی جاتی۔ اس کی موٹر بائیک اسٹ نام پر ان کے دروازہ پر رکتی اور سلمان کے اترتے ہی فوراً آگے بڑھ جاتی اور روبی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ روز اس کی ایک جھلک ہی سہی دیکھ تو لیتی تھی۔ سلمان کے اندر صحن میں آنے تک وہ بڑی پھرتی سے نیچے بھی آچکی ہوتی۔

اسی دوران گرمیوں کی تعطیلات ہو گئیں اور اس کے روز آنے جانے والا سلسلہ ختم ہو گیا۔ تاہم کبھی کبھار وہ سلمان کا پوچھنے گھر آ جاتا تو روبی مارے خوشی کے جھوم اٹھتی۔ کسی اور کے اٹھنے سے پہلے ہی جلدی سے وہ دروازہ پر جاتی۔ وہ سلمان کا پوچھتا تو روبی کچھ دیر اس کو دیکھتی رہتی پھر ایک اداسے مسکرا کر کہتی۔

”بھائی جان تو گھر پر نہیں ہیں۔“

”کہاں گیا ہے اور کب آئے گا؟“ تو صیف موٹر سائیکل کا شیشہ خامو اور دست کرتے ہوئے پوچھتا۔

”بتا کر نہیں گئے۔“ روبی پھر ایک اداسے مسکرا کر کہتی اور تو صیف فوراً چلا جاتا۔ روبی اس کے جانے کے بعد بھی اسی کے بارے میں سوچتی رہتی اور دعا کرتی۔ اللہ کرے وہ جلدی سے پھر آئے۔

ایک دن تو صیف گھر آیا تو سلمان گھر پر ہی تھا۔ سلمان اس کو اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں ہی لے گیا۔ شاید پڑھنے کا پروگرام بن گیا تھا۔ وہ دونوں پڑھتے رہے اور روبی باہر صحن



میں تخت پوش پر بیٹھی اس کے بارے میں سوچتی رہی جبکہ رومی کیجی میں دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ کھانا بناتے بناتے اس نے آواز دے کر رومی کو سلا دینے کا کہا۔ بغیر سلا دے کہ کم از کم دوپہر کا کھانا ان کے گھر کھلایا ہی نہیں جاتا تھا۔ رومی اٹھ کر گئی اور فریج سے سلا دینے والی چیزیں نکال لائی۔ سلا دے کے پتے، لال چھوٹی مولیاں، کھیرا، ٹماٹر اور پیاز وہیں تخت پوش پر بیٹھ کر بنانے لگی تو رومی بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ رومی سے بات کیے بغیر کبھی مولی، کبھی کھیر کی ایک ایک قاش اٹھا کر کھانے لگی۔ رومی نے اس کو منع نہیں کیا تھا کیونکہ اس کا سارا دھیان توصیف میں لگا ہوا تھا۔ کھانا تیار ہو گیا۔ سلا دھکی بن گئی تو سلمان اور توصیف کا کھانا ٹرے میں لگاتے ہوئے رومی سے کہا۔

”جاؤ رومی! سلمان بھائی سے جا کر کہہ دو کھانا تیار ہو گیا ہے آ کر لے جائیں۔“ رومی کی بات سنتے ہی رومی فوراً ڈرائنگ روم کی جانب گئی تو رومی بھی چپکے سے رومی کے ساتھ ہوئی۔ ڈرائنگ روم کے قریب جا کر خواتین اور اہل اہل کی فضول باتیں کر کے ہنسنے لگی۔ کوئی توصیف کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتی ہو۔ رومی کے ڈرائنگ روم میں جانے سے پہلے سلمان دروازہ کھول کر غصے سے بھر لیا بریکٹ اور رومی کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے دے دے دے لفظوں میں دھاڑا۔

”دفع ہو جاؤ رومی تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ رومی ہم کر اپنے روم کی جانب بھاگ گئی اور رومی نے کہا۔

”بھائی جان آپ کی کہتی ہیں کھانا پک گیا ہے آ کر لے جائیں۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ میں آتا ہوں۔“ سلمان نے کہا۔ اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

☆☆☆☆

رومی کی پڑھائی کا سلسلہ تو میٹرک کے بعد مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا۔ رشتے کی تلاش جاری تھی جو باوجود کوشش کا بھی تکمیل نہ سکا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی آج کل رومی سارے گھر کا کام کرتی۔ شام کا کھانا بھی وہی بناتی اور فریج میں رومی کی الماری سے رومانی ٹائمر اور رسالے نکال نکال کر پڑھتی ریتی اور سنووری پڑھتے پڑھتے وہ خود بھی اس تصویراتی دنیا میں کھو جاتی۔ صبح ہوتے ہی وہ منہ ہاتھ دھو کر ریڈی ہو کر توصیف کے انتظار میں بیٹھ جاتی کہ ہو سکتا ہے آج پھر وہ آجائے۔ کبھی کبھار اگر وہ سچ سچ آجائے تو رومی کی عید ہو جاتی۔ وہ توصیف کو دیکھتے ہی کھل اٹھتی۔ مگر وہ تو رومی کو لفت ہی نہ دے رہا تھا۔ اس کے خشک اور سرد رویے کو قبول کر کے رومی نے بہت دکھ سے سوچا۔

وہ کتنی بد نصیب ہے، جس کسی سے بھی وہ محبت کرتی ہے وہ اس کی محبت کا جواب نفرت سے ہی دیتا ہے جبکہ وہ آپنی سے زیادہ خوبصورت ہے، نقش بھی اچھے ہیں اور رنگ بھی وارث ہے۔ ہارٹ بھی آپنی سے زیادہ ہے۔ پھر بھی کوئی اس سے محبت نہیں کرتا اور گھر والے لالگ اس کو آوارہ کہتے ہیں۔ نہ ماں پیار کرتی ہے نہ باپ محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ بھائی کی نظروں میں بھی عزت نہیں رہی۔ سارے ہی گھر والے برنامہ میری بے عزتی پر کمر بستہ رہتے ہیں اور یہ رومی آپنی جس کی وجہ سے یہ ساری بدنامیاں مجھے ملتی ہیں مجھے ذلیل کرنے اور مارنے میں پیش پیش ہوتی ہیں۔

بہر حال کچھ ہی ہو جائے میں توصیف کو اب اپنی محبت کے جل میں پھانس کر رہوں گی۔ آخر محبت کرنا میرا بھی حق ہے مگر میں توصیف کو اپنی محبت کے بارے میں کیسے بتاؤں۔ لیٹر لکھنے کو تو لکھ دوں مگر اگر اس نے بھی ذلیل کمینہ آصف کی طرح میرا لیٹر سلمان بھائی کے حوالے کر دیا تو بہت مار پڑے گی۔ کچھ ایسا ہو کہ لیٹر بھی نہ لکھتا پڑے اور توصیف کو یہ پتہ بھی چل جائے کہ میں اس کو محبت کرنے لگی ہوں۔ وہ سوچتی رہی اور بہت سوچ کر رومی نے فیصلہ کیا اب اگر کبھی اتفاق سے توصیف مجھے کیلا ل گیا تو میں زبانی اظہار محبت کر دوں گی۔ وہ بھی کوئی رومانی گانا گا کر۔ عقل مند ہو گا تو سمجھ جائے گا۔ یہ اظہار محبت ہے۔ لیکن اگر وہ پھر بھی نا سمجھا بل میں خوف بھی تھا۔ خیر یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔ آخر اسے معلوم تو ہونا چاہیے کہ کوئی اس سے محبت کرنے لگا ہے اور اس میں پکڑے جانے کا کوئی رسک بھی نہیں۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنی اس چالاکی پر خود ہی مسکرا دی۔ اس نے اس سانگ کا بھی انتخاب کر لیا جس کو توصیف کے سامنے گا کر اظہار محبت کرنا تھا۔ اتفاق سے جلد ہی یہ موقع رومی کو مل گیا۔ چھٹی کے روز توصیف سلمان سے ملنے آیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ سب گھر والے خاندان میں ہونے والے ایک فنکشن میں گئے ہوئے تھے۔ دستک سنتے ہی وہ جلدی سے دوڑ کر آئی اور حسب آرزو توصیف کو سامنے دیکھ کر کھل اٹھی۔ وہ تو دل ہی دل میں صبح سے دعا کر رہی تھی۔ آج گھر کوئی نہیں، چانس اچھا ہے۔ اے کاش! توصیف آجائے اور وہ آ گیا تھا۔

”سلمان کہاں ہے؟“ توصیف نے رومی کو دیکھتے ہی پوچھا۔



میری قدر نہیں کرتے۔ مجھ سے پیدا نہیں کرتے بلکہ شدید نفرت کرتے ہیں۔ جب جی چاہے کبھی ماں، کبھی آبی، کبھی سلمان بھائی مجھے پکڑ کر جانوروں کی طرح پیٹتے گتے ہیں مگر میرا شوہر ہاں وہ نہ صرف میری قدر کرے گا بلکہ ڈھیروں پیدا بھی کرے گا۔ وہ سب کچھ بھول کر اپنے گھر کے سینے دیکھنے لگی جہاں وہ ہوگی اور اس کا بے حد محبت کرنے والا شوہر ہوگا اور ننھے منے پیارے پیارے بچے ہوں گے۔ بچوں کا سوچتے ہوئے وہ خود ہی بے طرح شرما کر رہ گئی۔ ایک پیدلی سے مسکان لبوں پر اپنے آپ در آتی تھی۔

لیکن اب اس کو کیا کہیں روپی کی ڈھیروں دعاؤں اور گھر والوں کی ہزار کوششوں کے باوجود کوئی اچھا تو کیا کوئی عام سارشتہ بھی ناسل سکا۔ بھی گھر والے لے لے طور خاص اس کا دھیان رکھتے لگے تھے کہ وہ کہیں پھر کوئی عظمیٰ نہ کر دے۔ سارا گھر پریشان تھا اور ایسٹ آباد سے آنے والے ایک لیٹر نے ان سب کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا۔

”یہ لیٹر تھا شمشاد بیگم کی منہ بولی بہن بیگم خلاق کا۔ انہوں نے لکھا تھا بلکہ اطلاع دی تھی کہ ان کا چھوٹا بیٹا بلال اپنا کوئی تعلیمی کورس کرنے لگا ہوا رہا ہے۔ یہ کورس تین ماہ کا تھا اور یہ تین ماہ بلال آپ کے یہاں قیام کرے گا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔“

لیٹر ملتے ہی سارے گھر میں فرائضی مچ گئی۔ روجی نے لیٹر پڑھ کر سنایا تو شمشاد بیگم ہنسنے لگی۔

”ارے! وہاں چاہتا تو ہوٹل میں رہ لیتا مگر میری بہن جانتی تھی کہ اس طرح میں ناراض ہو جاؤں گی۔ یہی وجہ ہے اس نے بلال کو میرے گھر بھیجا ہے۔ پر یہ اجازت والی بات اس نے کیوں لکھی۔ آج ہی ان کے لیٹر کا جواب لکھ دو کہ انہوں نے یہ غیروں والی بات کیوں کی۔ ایک بار نہیں سو بار آئے۔ یہ اس کی خالہ کا گھر ہے۔“

”جی امی! ابھی لکھ دیتی ہوں۔“ روجی نے کہا تو شمشاد بولیں۔

”اب بلال کی رہائش کے لیے کوئی روم بھی صاف کر دو۔“

”کونسا روم صاف کروں امی۔“ روجی برا سامنے بنا کر بولی۔ گھر میں صرف تین ہی تو بیڈ رومز ہیں اور ایک ڈرائنگ روم۔ ایک روم سلمان کے پاس ہے تو دوسرا ابواور آپ کے پاس۔ باقی رہا تیسرا تو وہ میرے اور روپی کے پاس ہے۔ میرے خیل میں تو بلال کا بیڈ روم میں لگا دیتے ہیں۔ صرف ایک صوفہ سیٹ ہی تو ہے ڈرائنگ روم میں۔“ روجی نے اپنا خیل ظاہر کیا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ سلمان کے روم میں ہی بلال کا بیڈر بھی بچھا دیا جائے۔“ شمشاد بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے مشورہ طلب نظروں سے روجی کو دیکھا تو وہ فوراً بول اٹھی۔

”کمال کرتی ہیں امی جان آپ بھی۔ وہ اتنے امیر لوگ ہیں۔ سب الگ الگ رومز میں رہنے سونے کے عادی ہوں گے۔ میرا خیال ہے بلال کے لیے ڈرائنگ روم ہی ٹھیک رہے گا۔ ایک سائیڈ پر پلنگ بچھا کر اس کا بیڈر لگائیں گے۔“ روجی نے گویا قائل کر دیا۔

”اگر ڈرائنگ روم بلال کو دے دیا تو تین ماہ تک مہمانوں کو کہاں بٹھایا کریں گے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو خاندان سے ہر دوسرے روز کوئی نہ کوئی آیا گیا رہتا ہے۔ کتنی بار تمہارا بھائی سے کہا ہے اوپر چھت پر ایک روم ہی بنا دو مگر مجال ہے جو وہ میری بات سنتے ہوں۔ اب مسئلہ ہو گیا۔“ شمشاد بیگم پریشانی سے روجی کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”امی! آپ مہمانوں کی چھوڑیں سب خاندان کے لوگ ہیں اور ان کو بٹھانے کے لیے یہ اتنا بڑا برآمدہ جو ہے بلال کے لیے ڈرائنگ روم ہی ٹھیک رہے گا۔ سب سا لگ تھلگ اور اس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا ہے۔ بلال کا اپنی مرضی سے آنے جانے میں بھی آسانی رہے گی۔“ روجی نے بات ختم کی تو شمشاد بیگم نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے تم جو مناسب سمجھو کرو۔ مگر سنو پردے بہت خراب ہو رہے ہیں۔ گھر بھر کے کیوں نا آج دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر مارکیٹ چلیں اور کسی اچھے کپڑے کی بیڈ شیٹ اور پردے لے آئیں۔ تم پرانے پردے کا تار کر خوب اچھی طرح گھر کی صفائی کر کے نئے پردے ڈال دینا اور نئی بیڈ شیٹ بچھا دیا اور نہ بلال کیا سوچے گا ہمارے بارے میں۔“

”جی ہاں تو آ رہا ہے وہ ہمارے گھر۔ سب اچھا چھا ہونا چاہیے۔“

”امی! اگر بیڈ شیٹ اور پردے نئے لارہی ہیں تو پھر سارے گھر میں پینٹ بھی کروالیں اس طرح گھر زیادہ خوبصورت نظر آئے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔“ روجی نے ماں سے پوچھا۔ روپی چپ چاپ سامنے بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”بالکل ٹھیک۔“ شمشاد نے فوراً کہا تھا۔ تمہاری شادی پر بھی تو گھر میں پینٹ کروانا تھا۔ تب نہیں تو اب سہی کہ شادی کوئی زیادہ دور ہے۔“ روجی چپ رہی یہ گویا شرمانے کی ایک ادا تھی۔ حالانکہ جس قسم کی باتیں وہ اور غزالہ کرتی تھیں ان کو سن کر محسوس ہوتا تھا شرم ان دونوں کو چھو کر بھی نہیں گزری یا پھر ان دونوں نے گھول کر پی لی تھی اپنے جیسے کی شرم۔“ روجی کو



خاموش دیکھ کر شمشاد بیگم نے پھر کہا تم جلدی جلدی سارا کام بنانا آج ہی دوپہر کے کھانے کے بعد مارکیٹ چلیں گے۔ لیکن سب سے پہلے تم اس لیٹر کا جواب لکھ دو اپنی خلد کو۔ مارکیٹ جاتے ہوئے پوسٹ کر دیں گے اور روجی فوراً کاپی پن لے کر بیٹھ گئی۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی وہ دونوں ماں بیٹی مارکیٹ چلی گئیں تو روپی برا سامنہ بناتے ہوئے نا کواری سے آنے والے گیسٹ کے بارے میں سوچنے لگی جس کی آمد سے اس کی مصروفیات میں اضافہ ہونے والا تھا۔ کیونکہ آج کل گھر کے کام کی تمام تر ذمہ داری روپی کے سر تھی۔ روجی تو سارا سارا دن اپنے جینز کی کسی نہ کسی چیز کو سنوارنے میں لگی رہتی تھی۔ کیونکہ اس کے سسرال والے جلدی شادی پر زور دے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے گھر والوں نے تین ماہ کی مہلت مانگی تھی جو بمشکل ملی تھی۔ باقی رہی زوپی ایک تو وہ چھوٹی تھی دوسرا وہ تو کتابوں کا کیزا بن کر رہ گئی تھی۔ اس کو بکس کے علاوہ کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی تھی۔ سارا دن کام کر کر کے روپی اس قدر تھک جاتی کہ چارپائی پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلی جاتی اور پھر اگلی صبح آپ کی گھنچوڑنے پر ہی اس کی آنکھ کھلتی تھی۔ اب نیا مہمان اور اس کے مزید کام کا سوچ کر وہ پریشان ہو رہی تھی۔ صبح ناشتے میں ایک دوپرا ٹھے زیادہ پکانے ہوں گے۔ دوپہر اور رات کے کھانے پر دو دو زید روٹیل کا اضافہ۔ سارن تو خیر چار بندوں کا ہویا دن کا نام ایک ہی لگتا ہے اور ہاں ہفتے میں چار نہیں تو دوسو تو لازمی دھلائی کے لیے دے گا۔ اس نے دعا کی اللہ کرے وہاں ہی آئے تو اچھا ہے۔

روپی نے ماں سے جو کہا تھا شمشاد بیگم نے بغیر کسی اعتراض کے وہ سب کر دیا تھا۔ وہ روجی کی کس بات سے کم ہی انکار کرتی تھیں۔ وہ روجی کو اپنی عقلمند اور ذہین ترین بیٹی سمجھتی تھیں۔ رات ہو اور سلمان کے آتے ہی شمشاد بیگم نے ان کو کھانے سے پہلے ہی سب بتا دیا کہ ایسٹ آباد سے بلال آ رہا ہے۔ تین ماہ ہمارے یہاں قیام کرے گا۔ وہ اپنا کوئی کورس کرنے لاہور آ رہا ہے۔ پھر رات گئے تک بلال اس کا خاندان اور ان کی دولت ہی رہی۔

بلال کی آمد سے چند یوم پہلے ہی سارے کام مکمل ہو گئے تھے۔ پینٹ ہونے سے گھر یکدم نیا نیا لگنے لگا تھا۔ اگرچہ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا مگر پھر بھی خوبصورت لگ رہا تھا۔ پردے بھی سلائی ہو کر آ گئے تھے اور روجی نے روپی کی مدد سے ڈال بھی دیئے تھے۔ سارا گھر ہی شیشے کی طرح چمکنے لگا تھا۔ کام تو مکمل ہو گیا تھا تاہم۔

اب یہ طے کرنا تھا کہ بلال کوناشتے میں کیا دینا تھا۔ دوپہر کے کھانے پر کیا پکنا تھا اور رات کو کیا کھانا تھا۔ بلال چونکہ بے حد امیر خاندان کا لڑکا تھا اس لیے وہ سب بوکھلائے بوکھلائے اس کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

بہر حال پھر کھانے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ شمشاد بیگم کے یہاں دن میں صرف ایک بار سارن پکنا تھا۔ وہ بھی دوپہر میں۔ مگر اب بلال کی وجہ سے رات کو بھی تازہ سارن بنانے کا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ ساتھ ہی روجی نے یہ مشورہ بھی دے دیا تھا کہ آپ کو گوشت لادیں میں بلال کے لیے شامی کباب بنا کر فرج میں رکھ دوں گی۔ ناشتے میں آلیٹ کے ساتھ شامی بھی دے دیا کریں گے اور شمشاد بیگم تو خود شمارنے کی عادی تھیں۔ اس لیے وہ یہ بات بھی نہ صرف فوراً مان گئیں بلکہ اسی دن ایک کے بجائے دو کلو بیف اور کلو چنے کی دال لا کر روجی کو دے دی تھی۔

بلال کے آنے میں صرف ایک روز باقی تھا اور کھانے پینے سے لے کر گھر کا ہر کام ہی خوش اسلوبی سے مکمل ہو گیا تھا۔ کام تو سارا سب نے مل جل کر جوش سے مکمل کر لیا تھا مگر اب اچانک ایک پریشانی نے حمیدہ بیگم کو آن گھیرا تھا اور یہ پریشانی روپی کے حوالے سے تھی۔ وہ پریشان تھیں کہیں روپی بلال کے سامنے کوئی بے ہودہ غلط حرکت نہ کر دے۔ بات اگرچہ یوم کی ہوتی تو روپی کو ماموں کے گھر بھجوا یا جاسکتا کہ گڈو ماموں کی بیٹی روپی سے ویسے بھی بہت محبت کرتی تھی مگر بلال نے تو پورے تین ماہ ان کے یہاں رہنا تھا اور ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اب تین ماہ تو روپی کو گھر سے باہر رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور نہ ہی سارا نام روپی کی گمرانی ہو سکتی تھی۔ مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ سو اپنے دل کی تسلی کے لیے انہوں نے بلال کے آنے سے پہلے ہی روپی کو اپنے روم میں بلایا اور پاس بٹھا کر بلال کے بارے میں بتاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”روپی! کان بھول کر اچھی طرح میری بات سن بھی لو اور سمجھ بھی لو اور اس پر عمل بھی کرنا ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ سنو بلال کے سامنے زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں مت کرنا۔ اس کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی مت کرنا بلکہ بہتر ہوگا تم اس کے سامنے خاموش ہی رہا کرنا۔“

”جی بہتر امی جان!“ روپی نے سعادت مندی سے وعدہ کر لیا اور اسی سہ پہر روجی نے ماں سے کہا۔

”امی جان! اور سب تو ٹھیک ٹھاک ہو گیا مگر آپ نے روپی کا بھی سوچا ہے۔ اگر اس نے بلال کے سامنے بھی فری ہونے کی کوشش کی تو ہماری ساری عزت خاک میں مل جائے



گی۔

”روپی کی تم فکرت کرو میں نے اس کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ وہ بلال کے سامنے خاموش ہی رہا کرے گی۔“ حمیدہ بیگم نے اطمینان سے بتایا۔ ماں کی بات سن کر روجی کچھ دیر سوچتی رہی پھر ماں کو مزید متفرک کرنے کو بولی۔

”امی جان! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ روپی نے پہلے کبھی ہماری بات سنی ہے جواب مانے گی۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوں اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کر دی تو ہماری ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔“

اگر یہ بات ہے تو پھر تم ہی بتاؤ اس مصیبت کا کیا کروں۔ شمشاد بیگم واقعی پریشان ہو گئیں کہ بات تو روجی کی سچ تھی۔ روجی کچھ دیر سوچتی رہی پھر سکون سے بولی۔  
”اس پریشانی سے بچنے کا حل بہتر تو یہی ہے کہ آپ روپی کو بلال کے سامنے آنے سے ہی منع کر دیں۔ نہ روپی بلال کے سامنے آئے گی اور نہ ہی کوئی مسئلہ پیدا ہوگا۔“ کیا خیال ہے آپ کا۔

”ہاں تمہاری یہ بات تو درست ہے جب وہ بلال کے سامنے ہی نہ آئے گی تو کوئی بے ہودہ حرکت کیسے کرے گی۔“ حمیدہ بیگم خوش ہو گئیں اور اسی وقت انہوں نے روپی کو بلا کر کہہ دیا۔

”سنو روپی! تم بلال کے سامنے نہیں آؤ گی یہ نہ ہو کہ تو بلال کے سامنے بھی اپنی گندی حرکتیں شروع کر دے اور ہم اس کی ماں کو منہ دکھانے کے لائق نہ ہیں۔ بلال تو ویسے بھی اس کی ماں بتاتی تھی بہت نیکہ پرہیزگار اور پانچ وقت کا نمازی لڑکا ہے بلکہ ان کا پورا گھرانہ ہی پرہیزگاروں کا گھرانہ ہے۔“  
روپی نے ماں کے ساتھ پکا وعدہ کر لیا کہ وہ بلال کے سامنے ہرگز نہیں آئے گی اور نہ ہی اونچی آواز میں بات کرے گی۔ حمیدہ بیگم مطمئن ہو گئیں۔

بلال حمیدہ بیگم کی منہ بولی بہن کا بیٹا تھا۔ وہ لوگ ایبٹ آباد میں رہتے تھے۔ بلال کا تعلق باصرف صوم صلوٰۃ کے پابند ایک مذہبی گھرانے سے تھا بلکہ بلال خود بھی مذہب سے بے حد لگاؤ رکھنے والا پانچ وقت کا نمازی نوجوان تھا۔ علاوہ اس کے ایک جماعت سے بھی اس کا تعلق تھا۔  
رائونڈ کا اجتماع تو بلال نے کبھی مس نہیں کیا تھا۔ یوں بھی تبلیغ کرنے کا کوئی موقع وہ اپنے ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دیتا تھا۔ سال میں ایک بار وہ ایک ہفتہ اپنے شہر سے دور تبلیغ کرتے ہوئے گزارتا تھا۔ وہ بے حد نیک، خدا ترس اور غریب غریبا کا خیال رکھنے والا لڑکا تھا۔

وہ لوگ پٹھان تھے اور ایبٹ آباد کے بڑے خان کہلاتے تھے۔ ان کا گھرانہ ایبٹ آباد کے محرز اور امیر ترین گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ بے شمار زمینیں، لاتعداد باغات اور پہاڑان کی ملکیت تھے۔ ایبٹ آباد کی مشہور الیاسی مسجد کے قریب ان کا شاندار گھر تھا۔ پہاڑ کے نشیب فراز میں بنایا گیا یہ گھر بہت خوبصورت تھا۔ بلال کے والد خان اخلاق خان ایبٹ آباد کی مشہور اور محرز شخصیت ہونے کے علاوہ جرگہ کے ممبر بھی تھے۔ والدہ بے حد محبت کرنے والی سیدھی سادی خاتون تھیں جو سارا وقت لوگوں کی مدد کرنے میں مصروف رہتی۔

خان اخلاق خان کے صرف دو بیٹے تھے۔ بڑا کمال اور چھوٹا بلال۔ دونوں بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر انہوں نے خاص توجہ دی تھی۔ دونوں بھائیوں نے سکول کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد باقی کی ساری تعلیم پشاور ہاسٹل میں رہ کر مکمل کی تھی۔ کمال بڑے تھے اور خان اخلاق خان نے ان کو ڈاکٹر بنایا تھا جبکہ بلال نے انجینئرنگ پڑھی تھی۔ ابھی ایگزیم دے کر فارغ ہوا تھا اور اس فارغ وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کہ زلزلہ آؤٹ ہونے کے بعد اس نے جاب اور مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جانا تھا۔ جہاں کی ایک یونیورسٹی میں وہ ایڈمیشن کے لیے پلائی کر چکا تھا۔ درمیان میں جو چند فراغت کے تھے ان میں بھی اس نے ایک کورس کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو کہ لاہور میں رہ کر اس کو مکمل کرنا تھا۔

بلال پچیس برس کا ایک وجیہ نوجوان تھا۔ صاف رنگ، ہلکش نقوش، دراز قد، چہرے پر سیاہ مٹی مویچھوں کے علاوہ ہلکی ہلکی شیونما ڈھمی جو اس کی مردانہ وجاہت میں مزید اضافہ کرتی تھی۔ بے حد مدہم اور نرم لہجے میں بات کرنے والا بلال ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ گھر والوں کے خاص کرامی جان کے مسلسلصرار کے باوجود وہ شادی سے گریزاں تھا۔ اس گریز کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ اس کی زندگی میں دور دور تک کسی لڑکی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ بے فزنی نام میں وہ اسلامی بکس کے مطالعے میں مجبور تھا۔

اگر جان کے خاندان میں لڑکی لڑکوں کی شادی جلدی کر دینے کا ارادہ تھا۔ روپے پیسے کا تو کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ کمال اچھی ڈاکٹری پڑھ رہا تھا جب اس کی شادی چچا کی بیٹی سعدیہ سے ہو گئی تھی جس کو گھر اور پورے خاندان میں گل کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ان کے یہاں یہ رسم بھی کہ بڑی بیٹی کا نام آپ جو بھی رکھیں مگر مخاطب گل کے نام سے کی جائے گی۔ جب کمال کی



شادی ہوئی تب اس کی عمر 22 برس تھی اور اب تو اس کے دو بیدے بیدے بیٹے بھی تھے جو سب گھر والوں کی جان تھے۔ گل کو بیٹی اور دادی کو پوتی کی شدید خواہش تھی۔ مگر وہ بیٹوں کے بعد ابھی تک اللہ نے مزید اپنی رحمت نہ کی تھی۔

جبکہ بلال 25 برس کا ہونے کے باوجود ابھی تک شادی کے لیے اگیری نہ تھا۔ بیگم خلاق اس کے لیے بہت پریشان تھیں کہ آخر یہ لڑکا چاہتا کیا ہے۔ مگر زبردستی نہیں کر سکتی تھیں۔ تاہم انہوں نے دبے دبے لفظوں میں بلال کو جتادیا تھا کہ۔

”اگر یکے جانے سے پہلے تمہیں لازمی شادی کرنی ہوگی۔“ ان کی بات سن کر بلال خاموش ہی رہا تھا اور اس خاموشی کو نیم رضا مندی سمجھ کر انہوں نے بلال کے لیے ایک لڑکی پسند بھی کر لی تھی اور گل کو بھی بتا دیا تھا۔ تاہم لڑکی والوں سے ابھی بات نہ کی تھی۔ خیال تھا بلال کا رزلٹ آؤٹ ہونے کے بعد وہ بڑے خان اور کمال سے کہہ کر بلال سے شادی کی بات کریں گی اور وہ یقیناً مان جائے گا۔ اس کو تعلیم اور جاب کے سلسلے میں چند برس امریکہ میں ہی قیام کرنا تھا۔ اس وقت 25 برس کا تھا۔ تب تیس کا ہو جاتا تب تک بڑے بھائی کی اولاد جوان بھی ہو جاتی اور یوں بھی جب شادی کرنی ہی ہے تو پھر کیوں نہ نام پر کی جائے اور آج ان کو گل نے بتایا تھا وہ کوئی تعلیمی کورس کرنے تین ماہ کے لیے لاہور جا رہا ہے تو ان کو اس کے تنہا رہنے کا سوچ کر پریشانی ہوئی۔ پہلے تو انہوں نے سوچا وہ بلال کو یہ کورس کرنے سے منع کر دیں گی۔ یہ کہہ کر کہ اب اتنے برسوں بعد فارغ ہونے تو چند ماہ مارے ساتھ رہو اور آرام بھی کر لو۔ رزلٹ آؤٹ ہونے کے بعد تمہیں مزید تعلیم حاصل کرنے امریکہ بھی جانا ہے۔ پھر یہ قائلو کورس کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

مگر نہیں ان کا اچھی طرح معلوم تھا بلال پر بھائی کے معاملے میں کسی کی بھی نہیں مانتا۔ تاہم کہنے میں حرج ہی کیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہاں کا دل رکھ لے مگر جب انہوں نے بلال سے بات کی تو اس نے محبت اور نرمی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”امی جان یہ کورس میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے جا رہا ہوں۔ آپ میری تنہائی کا سوچ کر پریشان نہ ہوں۔ میں وہاں اتنا بڑی رہوں گا کہ تنہائی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر تم لاہور میں ہاسٹل میں رہنے کی بجائے اپنی خالہ شمشاد بیگم کے گھر رہو گے۔“ ماں کی بات سن کر بلال نے پہلے تو انکار کرنا چاہا مگر پھر یہ سوچ کر مان گیا کہ وہ پہلے ہی شادی کے لیے انکار کر کے ماں کو کھڑی کر چکا ہے۔ بلال کی ماں سنتے ہی بیگم خلاق نے فوراً شمشاد بیگم کے نام لیٹر لکھ دیا جو ان کی منہ بولی بہن بنی ہوئی تھی۔ یہ بہن والا رشتہ اور دوستی چندی کی ایک شادی میں استوار ہوا تھا جس کی بارات لاہور سے آئی تھی۔

شمشاد برأت کے ساتھ لاہور سے آئی تھی جبکہ وہ خود بہن والوں کی طرف سے انوائٹ تھیں۔ یہ چند برس پہلے کی بات تھی۔ نصرت کی کوئی بہن نہیں تھی۔ وہ شمشاد بیگم کو سبکی بہن ہی سمجھتی تھی۔ اس دوستی کے بعد شمشاد تو اپنے شوہر کے ساتھ کئی بار ان کے یہاں آئیں تھیں مگر وہ خود صرف ایک بار ہی لاہور گئی تھیں۔ وہ بھی بڑے بیٹے کمال کے ساتھ۔ تاہم لیٹر آنے جانے سے رابطہ رہا تھا۔ اب انہوں نے شمشاد کو لکھ دیا تھا کہ تمہارا بھانجا بلال تین ماہ کا کوئی کورس کرنے لاہور آ رہا ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو وہ یہ تین ماہ آپ کے گھر قیام کرے گا۔ یہ صرف ایک رسمی بات تھی جو انہوں نے رسمی طور پر ہی لکھی تھی۔ ورنہ ان کو معلوم تھا اعتراض کیسا۔ وہ تو بہت خوش ہوں گی اور یوں بلال کے شمشاد بیگم کے گھر رہنے سے وہ خود بھی مطمئن رہیں گی۔

بلال کے روانہ ہونے سے پہلے ایک روز انہوں نے خشک میوہ جات، مکئی کا آٹا، ثابت مکئی اور چند اور چیزوں کی پیکنگ خادمہ کے پاس بیٹھ کر خود کروائی تھی۔ حمیدہ بیگم کے لیے۔ اور پھر دوسرے روز بلال چلا گیا۔

گھر والوں کو چونکہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ آج بلال نے آنا ہے اس لیے سب تیاری مکمل تھی۔ مطلب گھر کی صفائی ہو چکی تھی۔ سب نے آج ہی نہادھو کر کپڑے پہنے تھے۔ روٹی کو روٹی کے دم میں بند کر دیا گیا تھا۔ کھانے پر بھی پہلا دن ہونے کی وجہ سے اچھا خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ ان، چکن کڑا ہی کے ساتھ یا لک کوشت اور پلاؤ بنایا گیا تھا، ملاو، میٹھے میں روٹی نے فرنی صبحی بنا کر فرنیج میں رکھ دی تھی۔ کیونکہ شمشاد بیگم کے لیٹر کا جواب جوا یا تھا۔ اس میں بیگم خلاق نے لکھا تھا تین تاریخ کی دوپہر ایک بجے تک بلال آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔ یہی وجہ ہے روٹی نے ایک بجے سے کچھ پہلے ہی کھانا تیار کر لیا تھا۔

چھٹی کا روز تھا۔ اس لیے سب لوگ ہی گھر پر موجود تھے۔ حالانکہ ابو نے چچا اور سلمان نے ماموں کے گھر جانا تھا۔ وہر چھٹی والے روز محض گڈو کی وجہ سے ماموں کے گھر ایک چکر



لازمی لگانا تھا۔ لیکن آج بلال کی وجہ سے وہ سب گھر پر موجود تھا اور بلال کاویٹ کر رہے تھے۔

مگر ہوا یہ کہ ایک کے بعد دوسرے پھر تین بھی بج گئے مگر بلال کو نہ آنا تھا اور نہ آیا۔ مارے بھوک کے سب گھر والوں کا برا حال تھا۔ مگر شمشاد بیگم نے سختی سے کہا تھا کہ کھانا سب لوگ بلال کے ساتھ کھائیں گے۔ یہ نہ ہو، ہم کھانا شروع کر دیں اور وہ آجائے۔

”وہ اگر رات تک نہ آیا تو کیا ہم رات تک یونہی بھوکے بیٹھے رہیں گے؟“ سلمان نے تھوڑے غصے سے کہا۔ ایک تو کھانے کا نام لیٹ ہو چکا تھا اس پر بچن سے آنے والی خوشبو عین مزید بے چین کر رہی تھیں۔

”جہاں اتنا صبر کیا ہے بیٹا وہاں تھوڑا اور کر لو، آخر رمضان میں روزہ رکھ کر بھی تو صبر کرتے ہو۔“

”ارے ہو سکتا ہے بچے کی گاڑی خراب ہوگئی ہو جو وہ لیٹ ہوا ہے۔ ورنہ اب تک تو آ جانا چاہیے تھا اس کو۔“ ماں کی بات سن کر سلمان خاموش ہو گیا۔ ایک بجے سے ہوتا یہ تھا کہ جب بھی دروازہ پر دستک ہوتی سلمان جلدی سے باہر جاتا پھر مایوس سا واپس آ جاتا کہ دروازہ پر بجائے بلال کے یا تو اس کا کوئی فریڈ ہوتا یا مٹلے دار۔

اس نے کہہ دیا تھا۔ اب اگر دستک ہوئی تو باہر دیکھنے زوبلی جائے گی۔ دروازہ تو کھلا ہی تھا ابھی سلمان نے بات ختم کی ہی تھی کہ پھر دستک ہوئی تو حمیدہ بیگم نے محبت اور نرمی سے کہا۔

”جاؤ بیٹا! اب ضرور بلال ہی آیا ہوگا۔“ سلمان منہ بنا کر باہر گیا۔ مگر بلال کی بجائے وہاں غزالہ تھی۔ سلمان تپ کر واپس آیا۔ پیچھے غزالہ بھی تھی۔ وہ تو کچھ تھی چھٹی کی وجہ سے شمشاد بیگم شوہر کے ساتھ کہیں گئی ہوں گی اور سلمان کا تو روجی نے اس کو بتا دیا تھا گڈو کی وجہ سے ہر ویک اینڈ پر ماموں کے ہاں لازمی جاتا ہے اس لیے وہ آئی تھی۔ اب جو گھر میں سب کو موجود دیکھا تو سب کو سلام کرتے ہوئے اس نے تھوڑی حیرانی سے روجی سے پوچھا۔

”کیا کسی کاویٹ ہے جو سب لوگ ہی تیاری کی حالت میں بیٹھے تھے۔“ کھانا نہ ملنے کی وجہ سے آنے والے لکا انتظار ان کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔

”ہاں! ایسٹ آباد سے ہمارے یہاں گیسٹ آ رہے ہیں آج۔“ روجی نے بتایا تو غزالہ وہیں سب کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔

یونہی بلال کاویٹ کرتے دن بھی رخصت ہونے کے قریب آیا تو سلمان نے کہا۔

”امی! ہو سکتا ہے بلال بھائی نے آنے کا پروگرام تبدیل کر لیا ہو اور اگر گاڑی کی خرابی کی وجہ سے بھی لیٹ ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ہم سب کو بھوکا مار دیں۔ اب شام ہو رہی ہے اور کتناویٹ کروائیں گی آپ ہمیں۔ امی! آپ ایسا کریں ان کا کھانا نکال کر الگ رکھ لیں اور ہمیں کھانا دیں ورنہ میں ابھی ماموں کے گھر چلا جاؤں گا اور رات بھی ادھر ہی رہوں گا۔“ سلمان کی دھمکی سن کر شمشاد نے روجی سے کہا۔

”سلمان کی بات ٹھیک ہے تم پہلے بلال کا کھانا نکال کر الگ سے رکھ دو اور دسترخوان لگا دو۔“ روجی ماں کی بات سنتے ہی اٹھ کر بچن میں جانے لگی۔ اسی وقت پھر دستک ہوئی۔ سلمان نے روجی کو رکتے دیکھا تو بولا۔

”آپ! آپ کھانا لگائیں میں دیکھتا ہوں۔ پھر وہاں گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی ایک بڑی بوری گھسیٹتے ہوئے اندر کچن میں چھوڑ کر وہیں سے واپس جاتے ہوئے بولا۔

”آئی! کھانا لگانے کی ضرورت نہیں بلال بھائی آگئے ہیں۔ اب سب مل کر ہی کھائیں گے اور باہر چلا گیا۔ دوبارہ اندر آیا تو پھر ایک بوری گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لا رہا تھا۔ ہم اب وہاں گیا نہیں تھا ساتھ بلال بھی تھا۔ ہلکے گرین کلر کے شلوار سوٹ میں سیاہ جیکٹ پہنے، پاؤں میں بلیک بوٹ، ایک ہاتھ میں سفری بیگ، دوسرے میں بریف کیس۔ شمشاد بیگم اس کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بلال نے اپنے ہاتھ میں پکڑا سلمان ایک سائڈ پرفرش پر رکھتے ہوئے ان سب کو مشترکہ سلام کیا اور حمیدہ بیگم نے دونوں ہاتھوں سے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے ڈھیروں دعاؤں سے اس کو نوازا۔ اما جی نے خود آگے بڑھ کر بلال سے مصافحہ کیا تو شمشاد بیگم نے بتانا ضروری سمجھا حالانکہ بتانے کی ضرورت نہ تھی۔

”یہ تمہارے خالو نصیر صاحب ہیں۔“ پھر باقی لوگوں کا تعارف کرتے ہوئے بولیں اور یہ تمہارا بھائی سلمان ہے۔ بلال نے سر کو خفیف سا خم دے کر گویا اچھا کہا کہ ہاتھ وہاں ہر سلمان سے ملا چکا تھا۔ پھر شمشاد نے پاس کھڑی زوبلی اور روجی کا تعارف کچھ ایسے کروایا یہ میری بیٹی روجی ہے۔ بلال نے دیکھا روجی اس کی اتنی فیملی تھی۔ شمشاد کی بات ختم ہوتے ہی دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو سلام کیا تو شمشاد نے زوبلی کا ہاتھ تھام کر بلال کے سامنے کرتے ہوئے بتایا یہ میری چھوٹی بیٹی زوبلی۔ پھر زوبلی سے کہا چلو زوبلی بھائی کو سلام کرو۔



زوبی نے فوراً سلام کیا۔ بلال نے جواب دیتے ہوئے جھک کر شفقت سے اس کے گال تھپھپھائے۔ پھر سلمان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا تو حمیدہ بیگم خود بھی بلال کے قریب بیٹھ گئیں۔ پھر محبت سے پوچھا۔

”بلال بیٹا تم نے تو دوپہر کو آنا تھا لیٹ کیسے ہو گئے؟“

”خالہ جی کوچ راستے میں خراب ہو گئی تھی۔ بس اسی وجہ سے لیٹ ہو گیا۔“ بلال نے وضاحت کی۔

پھر حمیدہ بیگم نے باری باری سب گھر والوں کی خیریت دریافت کی۔ بلال ہر بات کا جواب مدہم لہجے میں دیتا رہا۔ چند منٹ بات چیت کی بند ہوئے، پھر بلال نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”میری رہائش کہاں ہوگی؟“ آئی من مجھے جہاں سیٹ کرنا ہے وہ روم بتادیں بہت ٹھکن ہو رہی ہے۔“ یہ سن کر شمشاد بیگم نے سلمان سے کہا۔

”جاؤ سلمان! بھائی کو ڈرائنگ روم میں لے جاؤ۔“ پھر بلال سے پوچھا۔

”بیٹا کھانا لگا دیں تمہارے انتظار میں آج دوپہر میں بھی کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ بلال کا موڈ کھانے کی بجائے چائے پینے کا تھا۔ ٹھکن کی وجہ سے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ مگر شمشاد خالہ کی بات سن کر بلال نے کہا۔

”جی ضرور میں ابھی سلمان کھ کر آتا ہوں۔“

”بلال کی بات سنتے ہی روجی بچن میں چلی گئی۔ سب سے پہلے روجی کا کھانا ٹرے میں لگایا جو بلال کی آمد کا سنتے ہی روجی کے روم میں بند ہو گئی تھی۔ روجی خود اس کو جا کر کھانا دے کر آئی۔ ایک تو اس لیے کہ وہ بھی صبح کی بھوک تھی۔ دوسرا اس لیے بھی کہ کھانا نہ ملنے پر وہ باہر تانک جھانک نہ کرے۔ روجی کو کھانا دے کر وہ پھر بچن میں آ گئی جبکہ شمشاد بیگم سلمان کے ساتھ کمر جٹائی بچھار ہی تھیں۔ اندر بچن میں روجی برتنوں میں کھانا نکال رہی تھی جبکہ ادھر روجی کھانا دے کر جیسے ہی باہر گئی روجی نے نا صرف فوراً کھانا شروع کر دیا بلکہ خوش ہو کر یہ بھی سوچا چلو اس گیسٹ کے یہاں نے ہی سہی تین ماہ خوب آرام کروں گی۔

تھوڑی دیر بعد ہی باہر بھی کھانا شروع ہو گیا۔ روجی کھانا کھاتے ہوئے باہر ہونے والی گفتگو سنتی رہی۔ مگر اٹھ کر بلال کو ایک نگاہ دیکھنے کی زحمت کرا رہی تھی۔ یوں بھی مہمان کم ہی بول رہا تھا۔ سارا شور شمشاد بیگم کی اپنی باتوں کا تھا۔ جن کو کھانا بھی خاموش سے کھانے کی عادت نہیں تھی۔ کھانے سے فری ہو کر روجی نے برتن وہیں اپنی چارپائی کے نیچے کھے اور سکون سے لیٹ گئی اور ان کی باتیں سنتے سنتے نجانے کب سو گئی۔ اس کو پتہ ہی نہ چلا آپنی سونے کے لیے کب روم میں آئی تھی۔ کھانے کے بعد بلال نے ان سب کے ساتھ مل کر چائے پی۔ پھر لمبے سفر کی شدید ٹھکن کی وجہ سے جلد ہی اجازت لے کر اٹھ گیا اور جاتے جاتے شمشاد بیگم سے یہ بھی کہہ گیا۔

”خالہ جی! ان دونوں بوریوں میں امی جان نے آپ کے لیے چند چیزیں بھجوائی ہیں۔“ وہ نہ بھی یہ کہتا تب بھی سب گھر والوں کو معلوم تھا۔ یہ سب ان کے لیے ہی آیا ہے۔ سب کو ہی اندر سے بے چینی ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں ان میں کیا کیا سوچا تھا ان کے لیے آئی ہیں۔ اب بلال کے جاتے ہی حمیدہ بیگم نے کہا۔

”چلو سلمان! دونوں بوریاں میرے روم میں لے آؤ۔“

سلمان ان کی بات سنتے ہی اٹھ گیا۔ روجی جواب بھی چائے پی رہی تھی جلدی سے باقی کی چائے حلق میں اندلی اور خود بھی امی کے روم میں چلی گئی۔ تب تک سلمان دونوں بوریاں بھی لے آیا۔ بڑی بے تابی سے پہلی بوری کھولی تو وہ ریڈ بلڈ کے مالنوں سے بھری پڑی تھی جبکہ دوسری میں اخروٹ، پستہ، بادام، خشک خوبانی اور نجانے کیا کچھ تھا۔ کوکھان سب نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ پھر بھی کئی دن کے بھوکوں کی طرح خشک میوہ جات پر ٹوٹ پڑے تھے۔ جبکہ ابوجی نے صرف دو مالٹے ہی کھائے تھے۔

رات گئے تک آنے والے سامان کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سب ان کی حیثیت سے بے حد مرعوب تھے۔ پھر سب سونے اپنے روم میں چلے گئے۔ یعنی سلمان اپنے روم اور روجی اپنے بیڈ روم میں۔ روجی کو کہ رات گئے سونے اپنے روم میں آئی تھی اس کے باوجود فجر کی اذان سے تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً اٹھ کر روجی کو جگانے اس کی چارپائی پر آئی اور جھک کر اس کو جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”روبی اب اٹھ جاؤ۔“

”کیوں آپ! روبی جو گہری نیند میں تھی روجی کے جھنجھوڑنے پر آدمی آنکھیں کھول کر خود پر جھکی روجی کو دیکھتے ہوئے پوچھا؟“



”بہت سولیا۔ اب تم جلدی سے اٹھ کر سارے گھر کی صفائی کر دو ورنہ صفائی دیر سے ہونے کی صورت میں کھیاں آ جائیں گی اور ہاں صفائی کے بعد رات کے گندے برتنوں سے کچن بھرا پڑا ہے وہ بھی صاف کر دینا۔“ روجی نے جلدی سے بات مکمل کی۔

”مگر آپی! امی نے مجھان کے سامنے آنے سے منع کیا تھا؟“ روبی نے آنکھوں میں موجود ہنسی کچھ نیند کو بھگاتے ہوئے بتایا۔

”معلوم ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے تو تمہیں اس وقت جگایا ہے۔ اس وقت بلال سو رہا ہے۔ تم بلال کے اٹھنے سے پہلے صفائی بھی کر لو اور برتن بھی دھو لو۔ مگر سنو شور مت کرنا۔“ روجی نے تحکمانہ انداز میں کہا اور واپس اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئی۔

روبی جو رات کو یہ سوچ کر خوش ہوئی تھی کہ چلو اس گیسٹ کی وجہ سے کم از کم یہ تین ماہ تو ریسٹ کرنے کا موقع ملے گا کیونکہ امی نے کہا تھا۔ ”کھانا ابھی روبی زیادہ اچھی نہیں بناتی بلال کے آنے پر کھانا وغیرہ روجی! تم پکانا۔“

بعد میں انہوں نے روبی کو بلال کے سامنے آنے سے منع کیا تھا تو روبی نے خود ہی سوچ لیا جب کھانا روجی نے خود پکانا ہے تو صفائی وغیرہ بھی وہ خود ہی کر لیا کرے گی۔ برتن بھی خود ہی دھولیا کرے گی۔ مگر روجی اتنی اچھی کب تھی کہ روبی کو آرام سے رہنے دیتی۔ کھانا پکانا مجبوری تھی باقی اس نے سوچ لیا تھا کہ گھر کی صفائی، برتن اور کپڑے روبی ہی دھویا کرے گی۔ یہی وجہ ہے رات دیر سے سونے کے باوجود فجر کی اذان سے تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھ گئی تھی کیونکہ صبح ناشتے کے لیے کچن میں ایک بھی صاف برتن موجود نہیں تھا۔

روبی کا اس شدید سردی میں اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ جانتی تھی اگر انکار کیا تو آپنی ٹائم کا احساس کیے بغیر اس کو مارنا شروع کر دے گی اور روبی اس ٹائم مار کھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے خاموشی سے اٹھ کر باہر آئی تو دیکھا باہر تو اچھی خاصی تاریکی تھی۔ روبی نے چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھا آسمان ابھی جوں کا توں ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور ستاروں کی روشنی اچھی ذرا سی بھی مدہم نہا ہوئی تھی۔

”اتنی شدید سردی میں خود کام کرنا پڑتا تو پتا چلتا۔“ روبی آہستہ سے بڑبڑائی۔ پھر چادر اتار کر تخت پوش پر رکھی اور اسی ٹائم فجر کی اذانیں ہونے لگیں اور روبی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے کام میں مصروف ہو گئی۔

آپی نے کہا تھا۔۔۔۔۔ پہلے گھر کی صفائی کرنا۔ بعد میں برتن دھونا۔ مگر روبی نے پہلے برتن صاف کیے پھر سارے کچن کی صفائی کی۔ بعد میں چائے کا ایک تازہ مگ بنا کر پی کر باقی گھر کا کام کرنے لگی۔ کچن میں کام کرنے اور گرما گرم چائے کا ایک مگ پینے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی سستی جاتی رہی۔ جسم میں چستی پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے جلدی ہی وہ سارے گھر کی صفائی سے فارغ ہو گئی۔ اسی اثنا میں صبح کا ستارہ بھی قریب آ کر چمکنے لگا تھا اور دوسرے ستاروں کی روشنی مدہم پڑنے لگی تھی۔ کام سے فری ہو کر آخر میں وہ صحن میں لگے بیسن پر کھڑی منہ ہاتھ دھو رہی تھی کہ جانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور روبی مارے خوف کے اچھل پڑی۔

”ہائے اللہ! اب کیا ہوگا۔“ اس نے گھبرا کر سوچا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی آنے والے گیسٹ کو دیکھنے کوڑی اور سب کچھ بھول کر مبہوت سی دیکھتی رہ گئی۔ سفید بے داغ شلوار سوٹ میں ملبوس وہ شخصیت پہلی نظر میں ہی دل میں اتر جانے والی تھی۔ دراز قد، تیکھے نعوش، صاف بے داغ رنگت اور چہرے پر ایک عجیب سا نور تھا۔ وہ بھول گئی امی نے اس کے سامنے بطور خاص آنے سے منع کیا تھا۔ بس محویت سے اس نورانی چہرے والے فرشتے کو دیکھتی چلی گئی۔ ہاں وہ انسان نہیں روبی کو۔ کوئی فرشتہ ہی لگ رہا تھا۔ آسمان کی بلندیوں سے اتر ہوا معصوم فرشتہ۔ وہ محویت سے تب تک اس کو دیکھتی رہی جب تک بلال کی نگاہ اس پر نہیں پڑ گئی۔

اب بلال کی نگاہ بھی اس پر پڑ گئی تھی۔ وہ جہاں تھا وہیں رک کر حیرت سے روبی کو دیکھنے لگا۔ بلال کے دیکھنے پر روبی نے بے ساختہ نگاہیں جھکا لیں جبکہ بلال اب بھی حیران سا کھڑا اس کو دیکھ رہا تھا۔ رات کے کھانے پر گھر کے تقریباً سبھی لوگوں سے تعارف ہوا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ روبی ان سب میں موجود نہیں تھی۔ کون ہے یہ؟ وہ روبی کو دیکھتے ہی سوچ میں گم تھا۔ امی جان نے کہا تھا تمہاری خالہ شمشاد کا ایک ہی بیٹا ہے اور بیٹیاں شاید دو یا تین کبھی تھیں۔ بلال نے ٹھیک سے سنا نہیں تھا۔ بلال کو کد ایک بے حد شریف نوجوان تھا مگر روبی کے فیس میں نجانے کیسی کشش تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسلسل اس کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اتنا مکمل حسن بلال نے فرسٹ ٹائم ہی دیکھا تھا۔ سروقہ، ضرورت سے زیادہ کھری رنگت، گلابی ہونٹ، چھوٹی سی پیلر ناک، بڑی بڑی خوبصورت سیاہ شفاف آنکھیں، کشادہ پیشانی، لمبی صراحی دار گردن۔ اتنا مکمل اور معصوم حسن بلال نے فرسٹ ٹائم دیکھا تھا۔ وہ دوپٹے کے بغیر تھی اور نگاہیں جھکا ئے واش بیسن کے سامنے کھڑی تھی۔ بلال بے خبری یا بے خودی میں آہستگی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر جانے کی بجائے اس کے قریب چلا آیا۔ یہ سب کچھ اپنے



آپ ہوا تھا۔ خوفِ اموشی کے عالم میں اس میں بلال کی اپنی رضا یا مرضی شامل نہیں تھی۔ بس یوں قفل ہوا تھا جیسے کوئی اس کا ہاتھ تھام کر خود اس کو روپی کے قریب لایا ہو۔

بلال کو اپنے قریب آتے دیکھ کر روپی بے طرح گھبرا گئی۔ یکدم سماعتوں میں ماں کی غرائی ہوئی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

”اچھی طرح کان کھول کر سن لو روپی تم بلال کے سامنے نہیں آؤ گی۔ اگر میرے سمجھانے کے باوجود تو بلال کے سامنے آئی اور کوئی غلط حرکت کی تو یاد رکھنا میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ آواز کی بازگشت ختم ہوتے ہی روپی نے دو قدم کے فاصلے پر کھڑے بلال کو نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔

ارے یہ کیا ہوا۔ روپی کے دیکھنے پر بلال بھی چونک پڑے۔ وہ تو نماز پڑھنے مسجد جا رہے تھے اور جماعت کا نام بھی ہو چکا تھا۔ پھر کیا ہوا تھا۔ بلال سب کچھ بھول کر تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر مسجد چلے گئے مگر نگاہوں میں وہ معصوم چہرہ اب بھی موجود تھا۔

اس کے جاتے ہی کو یاد ہوئی بھی ہوش کی دنیا میں واپس آگئی۔ اس نے جلدی سے گردن گھما کر روز کی جانب دیکھا کہ کہیں کسی نے اس کو بلال کے پاس کھڑی دیکھ تو نہیں لیا لیکن ابھی تمام روز کے دروازے بند تھے۔ پھر بھی وہ دھڑکتے دل کے ساتھ غفر زہی مڑی اور بھاگتی ہوئی برآمدے میں چلی آئی۔ پھر ٹاول سے چہرہ خشک کرتے ہوئے آپنی کے روم میں چلی آئی۔ تاہم وہ اب بھی بلال کی پرکشش اور دلکش شخصیت کے بحر میں گم اسی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ کیا کوئی مرد اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے۔ یہی سوچتے وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی کہ اپنے حصے کا کاموہ کراتی تھی۔ یوں بھی بلال کے گھر سے جانے تک اس کو روم میں ہی نہ رہنا تھا۔ پھر نیند پوری کرنے میں کیا حرج تھا۔

بلال مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد گھر آنے کی بجائے سیدھا واک کرنے چلا گیا تھا۔ کوکہ وہ یہاں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا کہ فرسٹ ٹائم آیا تھا مگر پھر بھی چلا گیا تھا۔ وہ بہت بحر خیز تھا اور صبح کی واک اس کی پختہ عادت بن چکی تھی۔ وہ ایٹ آباد میں بھی صبح کی نماز سے فارغ ہو کر سیدھا واک کرنے چلا جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر بھی کرتا جاتا۔ یہی وجہ تھی یہاں بھی وہ مسجد سے نکل کر گھر آنے کی بجائے واک کرنے چلا گیا تھا۔ بلال واک کر کے گھر واپس آیا تو سارا گھراٹھ چکا تھا۔

نصیر صاحب نہا کر واش روم سے باہر آ رہے تھے کہ ان کے شو لڈر پر ٹاول پڑا تھا۔ سلمان واش بیسن کے سامنے کھڑا دانتوں میں برش کر رہا تھا۔ روجی یقیناً کچن میں بڑی تھی۔ آلیٹ تلنے کی سمیل باہر تک آ رہی تھی۔ چھوٹی زوپی یونیفارم پہنے سامنے برآمد میں بیٹھی اپنے بیگ میں بکس، کاپیز چیک کر کے رکھ رہی تھی اور قریب ہی صوفے پر بیٹھی شمشاد بیگم سوں سوں کر کے خوابوں اور ہر دی کا احساس ڈال رہی تھی۔

مگر وہ ان میں نہیں تھی جس کو بلال نے مسجد جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بلال سوچنے لگا وہ کون تھی؟ کیا اسی گھر کا فیملی ممبر تھی۔ اگر اسی گھر میں رہتی ہے تو دن میں بھی لازمی دکھائی دے گی۔ یہی سب سوچتے ہوئے بلال نے نصیر صاحب اور حمیدہ بیگم کو سلام کیا تو شمشاد بیگم نے پوچھا۔

”بیٹا نماز پڑھ کر تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں تمہارے لیے پریشان تھی۔“

”نماز پڑھنے کے بعد میں ہمیشہ واک کے لیے جاتا ہوں۔ یہاں بھی نماز ادا کرنے کے بعد واک کے لیے چلا گیا تھا۔“ بلال یہ کہہ کر سیدھا ڈرائنگ روم میں چلا گیا تو شمشاد بیگم نے کہا۔

”روجی ناشتہ تیار ہونے میں ابھی کتنی دیر ہے؟“

”امی! بس ختم ہی سمجھیں۔ انڈے فرائی کرنے کے بعد اب ٹائی فرائی کر رہی ہوں۔ سلمان نہالے تو چٹائی بچھا دیں۔“ روجی نے جواب دیا۔

تب شمشاد بیگم نے دیکھا سلمان ابھی باپ کے باہر آنے پر واش روم میں گیا تھا۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگی جبکہ زوپی اللہ حافظ کہہ کر چلی گئی۔ ٹانگے والا آ گیا تھا اور بریک فاسٹ وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔

بلال نے سب کے ساتھ مل کر بریک فاسٹ کیا اور جب گھر سے باہر جانے لگے تو روجی نے آواز دے کر پوچھا۔

”بلال! دوپہر کے کھانے پر کتنے بجے گھر آؤ گے؟“

بلال کل آتے ہی ان کی مالی حیثیت کا اندازہ کر چکا تھا اور رات کے کھانے پر بھی دیکھ لیا تھا کہ ان لوگوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر اس کے کھانے کا اہتمام کیا تھا اور ابھی ناشتے پر بھی پرائیوٹ کے ساتھ سالن کے علاوہ آلیٹ اور کباب فرائی کر کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ روجی اس کی ہم عمر تھی۔ اس لیے اس نے بے تکلفی سے بلال کہہ کر مخاطب کر لیا تھا۔ مگر



بلال اس کلام نہ لے سکا۔

”مسٹر! میری واپسی شام کو ہی گھر ہوا کرے گی۔ اس لیے دوپہر کے کھانے پر میرا ویٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر آپ سائنڈ نہ کریں تو میں یہ بھی کہوں گات کے کھانے پر بھی زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت سادہ سادہ ہوں۔ ہاں صبح ناشتے پر بھی تین تین چیزیں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ پراٹھا میں شوق سے کھاتا ہوں۔ ساتھ اگر سالن ہو تو ٹھیک ورنہ یا تو آلیٹ ہو یا کباب۔ دونوں چیزیں نہیں۔“ پھر وہ روٹی کا جواب سنے بغیر سلمان کے ساتھ چلا گیا تو شمشاد بیگم نے فخر سے کہا۔

”دیکھا روٹی! اتنے امیر خاندان کا ہو کر کتنا سادہ اور شریف ہے۔ پر میں یہ سوچ کر حیران ہوں یہ کوچ میں کیوں آیا ہے۔ ان کے گھر تو ایک چھوڑی کئی گاڑیاں موجود ہیں۔“ امی! آپ نے سنا نہیں وہ کہہ رہا تھا میں بہت سادہ سادہ ہوں۔ چلیں آپ کی بچت ہو گئی۔ ورنہ اگر وہ دوپہر میں کھانا گھر کھاتا تو خرچہ لازمی بڑھ جاتا تھا۔“ پھر اس نے روٹی کو آواز دی۔

”چلو روٹی آ کرنا شتہ کر لو اور ناشتے سے فارغ ہو کر برتن بھی صاف کر دینا۔ چلو جلدی آؤ بلال چلا گیا ہے۔“ روٹی دل ہی دل میں مسکراتی ہوئی باہر آئی اور دل میں سوچا بیوقوف احمق سمجھتے ہیں۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا اگر میں ان کو بتا دوں کہ وہ مجھے دیکھ چکا ہے اور خوب اچھی طرح دیکھ چکا ہے تو کتنا مزہ آئے۔ اس کے ساتھ ہی جو پھینٹی پڑے گی اس کا بھی کچھ سوچا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ سیریس سی شکل بنا لے باہر آئی۔ پھر روٹی اور ماں کو دیکھے بغیر سیدھی کچن میں گھس گئی تھی۔

”اگلی صبح پھر وہی حادثہ ہوا تھا۔ وہ صفائی سے فارغ ہو کر واش بیسن پر کھڑی منہ دھو رہی تھی اور دل ہی دل میں بلال کی فحش بھی تھی۔ اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ روٹی نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو بلال دروازہ بند کر کے مڑ رہے تھے۔ دل میں کل والی لڑکی کو دیکھنے کی خواہش بلال کو بھی تھی اور خواہش پوری ہو گئی۔ بیسن کے سامنے کھڑی روٹی کو بلال چند لمحوں کی گھڑی دیکھتے رہا اور سوچتے رہے بات کی جائے یا نہ کی جائے۔ اچانک اس نے بلال کو دیکھا پھر خنجر دہی بھاگتی ہوئی برآمدے میں چلی گئی۔ اور بلال نماز کا خیال کر کے مسجد چلے گئے۔

روٹی کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے اندر سے کوئی اٹھ گیا ہے۔ اس لیے وہ وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ تاہم اس نے محسوس کر لیا تھا جیسے بلال اس سے کچھ کہنا یا پوچھنا چاہتے ہیں۔ اور اب وہ برآمدے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ گھر والوں نے خود ہی بلال کے سامنے آنے سے منع کیا اور خود ہی اسے بلال کے سامنے آنے کا موقع دے دیا تھا۔ ”کیا وہ نہیں جانتے کہ بلال نماز کے لیے مسجد جاتا ہے۔ بیوقوف۔“ روٹی نے زیر لب کہا۔ پھر اپنے روم میں آ کر سونے کے لیے لیٹ گئی تاکہ نیند کی کمی پوری کی جاسکے۔ کل اس کو آپنی کے جگانے پر شدید غصہ آیا تھا۔ لیکن آج وہ محض بلال کی وجہ سے خوشی خوشی اٹھ گئی تھی۔ وہ ایک بار اس کو دیکھنا چاہتی تھی۔ کوئی دل میں ابھی کوئی ایسا ویسا خیال نہیں تھا۔ ماں کی دھمکی بھی یاد تھی۔

اسی طرح چند روز گزر گئے۔ دن میں وہ بلال کو دکھائی نہ دیتی اور نہ ہی گھر کا کوئی فرد اس کا ذکر کرتا۔ پھر وہ کون تھی؟ بلال سوچتے۔ چونکہ وہ شروع سے ہی بچکانہ نماز ادا کرنے کے عادی تھے اس لیے روز اس کو دیکھتے اور حرمت سے سوچتے آخر کون ہے یہ؟ وہاں بات کو بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ گھر والوں سے اس کے بارے میں پوچھتے۔ جب گھر والوں نے خود ہی نہیں بتایا تو وہ کیوں پوچھتے۔ جس بارے میں گھر کا کوئی فرد بھی بات نہیں کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود ہر روز اسی مخصوص وقت پر اس گھر میں نظر آتی تھی۔ ایک ہفتہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ بلال کوشش کے باوجود نہ تو گھر والوں سے اس کے بارے میں پوچھ سکے اور نہ ہی خود اس سے کوئی بات کر سکے۔ کیونکہ اس سے بات کرنا اب وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ یوں بھی وہ ان کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑی ہوتی تھی۔ جیسوہ کوئی خوفناک چیز ہوں۔

بہر حال یہ بھی سچ تھا کہ بلال اس کی وجہ سے ڈسٹرب ہو گئے تھے۔ ایسا شاید لائف میں فرسٹ ٹائم ہوا تھا۔ آج جمعہ کی چھٹی تھی۔ اور بلال سوچ رہے تھے پہلے تو چلو وہ سارا دن گھر سے باہر رہتے تھے۔ صبح کے گئے شام کو گھر واپس آتے تھے۔ اس لیے دن میں اس کو نہ دیکھ سکے۔ لیکن آج چھٹی کا دن ہے۔ سبھی گھر پر ہیں۔ اگر وہ اسی گھر کا ممبر ہے یا گیسٹ بھی ہے تب بھی ان کو لازمی نظر آئے گی۔ مگر سارا دن گزر گیا۔ وہ منتظر رہے مگر اس کو نہ نظر آتا تھا نہ آئی۔ بلال نے فرسٹ ٹائم سوچا۔

وہ انسان نہیں آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور یا پری ہے۔ جو ایک مخصوص ٹائم پر ہی ان کو دکھائی دیتی تھی۔ اور ٹائم بھی وہ جب سب لوگ سو رہے ہوتے تھے۔ یوں بھی جب روٹی



سامنے آتی تھی تو پھر کسی اور کو چھپایا پردہ کیسے کروا سکتے تھے۔ انہی سوچوں میں دن بیت گیا۔

انگلی صبح وہ حیرت انگیز شکل پھر اپنی جگہ موجود تھی۔ بلیک سوٹ میں اس کا وارنٹ رنگ اور بھی نمایاں لگ رہا تھا۔ بلال سید صفا کے قریب آ کر رک گئے۔ دل میں آیا آج براہ راست ہی پوچھ لیں کہ تم کون ہو؟ اور ہر روز اسی جگہ کیوں کھڑی ہوتی ہو۔ مگر ہوا یہ کہ ہمیشہ کی طرح ان کا اپنی جانب آتے دیکھ کر وہ بھاگتی ہوئی برآمدے میں چلی گئی۔ بلال چند لمحوں میں ساکت سے کھڑے برآمدے کی جانب دیکھتے رہے۔ پردے کے پیچھے وہ روز کی طرح چھپ چکی تھی۔ پھر نماز کا خیال کر کے مسجد چلے گئے۔

روبی نے بلال کے مسجد جانے کے بعد آج فرسٹ ٹائم دل میں سوچا وہ خواہ مخواہ پیار کی تلاش میں بھٹکتی رہی۔ بے عزت ہوئی رہی۔ پیدا اس کو کہتے ہیں کہ وہ میرے کچھ کہے بنا ہی میرے دیوانے ہو چکے ہیں۔ وہ مجھے روز دیکھتے ہیں۔ یقیناً ایک دن اپنی محبت کا اظہار بھی خود ہی کریں گے۔ وہ سرور سرور سی اپنے روم میں آ کر گر گئی۔ ماں نے کیا وارنٹ دی تھی۔ وہ سب بھول چکی تھی۔ گو کہ اس نے خود بھی اب کبھی نہ محبت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر یہ سوچ کر وہ اس عہد کو بھی بھول گئی کہ میں نے تو اس کو اپنی جانب متوجہ نہیں کیا۔ وہ خود ہی میری جانب متوجہ ہوا ہے۔ مطلب وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔

یاد رہا تھا تو صرف بلال۔ روبی کو یوں لگ رہا تھا وہ منزل جس کے لیے وہ مدتوں ادھر ادھر بھٹکتی رہی تھی وہ خود چل کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔ آخر خدا کو میری بے بسی پر ترس آ ہی گیا۔ آپ اپنی اور غزالہ کی طرح مجھے بھی میرا محبوب چاہئے خواہ اس ہی گیا۔ لیکن وہ مجھے مخاطب کیوں نہیں کرتے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ پھر بے ساختہ ہنس کر سوچا آج وہ مخاطب ہی تو کرنے لگے تھے کہ میں خود ہی ماں کے خوف سے بھاگ کر برآمدے میں چلی آئی۔ وہ کتنی دیر وہیں گم صدم سے کھڑے برآمدے کی جانب دیکھتے رہے۔ محبت اسی کو تو کہتے ہیں۔ وہ یہی سب سوچتے سونے کے لیے لیٹ گئی۔

بلال کو اس گھر میں آئے ہوئے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی تک فجر کے وقت دکھائی دینے والی دن میں نظر نہ آتی تھی۔ مگر واش بین کے سامنے اپنے مخصوص ٹائم پر اب بھی وہ موجود ہوتی تھی۔ بلال کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دن بلال جلدی میں جوتیاں ہو کر گھر سے نکلے تو اپنے اہم چند کاغذات گھر پر ہی بھول گئے۔ جلد ہی راستے میں انہیں خیال آ گیا تو وہ واپس گھر کاغذات لینے آئے تو وہاں ایک شاک بھی ان کا منتظر تھا۔ فجر کے وقت دکھائی دینے والی وہ پری صحن میں کچن کے سامنے کھڑی کھلے بالوں کو لپیٹ کر جوڑے کی شکل دے رہی تھی۔ بلال نے آج فرسٹ ٹائم اس کو دن کی روشنی میں دیکھا تھا۔ لیکن ابھی پوری طرح دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ محاس کی نگاہ بلال پر پڑ گئی اور اگلے ہی لمحے وہ بھاگتی ہوئی روجی کے روم میں گھس کر غائب ہو گئی۔

روبی نے روبی کو بھاگتے دیکھا تو جلدی سے کچن سے نکل کر باہر آئی اور صحن میں بلال کو کھڑے دیکھا تو روبی کے بھاگنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

”بلال! تم چلے گئے تھے۔ واپس کیوں آئے۔ خیریت تو ہے نا۔ روجی نے پوچھا؟“

”روبی سسٹر! ابھی میں نے یہاں ایک لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ وہ کون ہے۔“ بلال نے روجی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا کہ اب جب دن میں دیکھ ہی لیا تھا تو پوچھنے میں حرج ہی کیا تھا۔ مگر روجی کے جواب نے بلال کو چکرا کر رکھ دیا۔

”لڑکی اور یہاں۔ روجی نے حیران ہونے کی ادکاری کی۔ یہاں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ تمہیں دھوکا ہوا ہے۔“ حالانکہ وہ جانتی تھی وہ روبی کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ جو روجی کے بلانے پر ناشتہ کرنے باہر آئی تھی۔

”اچھا؟“ بلال نے کہا اور دل میں حیرت سے سوچا کیا واقعی یہ سب میری نظروں کا دھوکا تھا۔ ہاں دھوکا ہی ہوگا۔ سارا ٹائم اس کے خیالوں میں گم جو رہتا ہوں۔ تاہم وہ روجی سے مزید کچھ کہے بغیر ڈرائنگ روم میں چلا گیا اور کاغذات لے کر فوراً ہی چلا گیا۔ مگر ہلکی پریشانی کا شکار ضرور ہو گیا تھا روجی کا جواب سن کر۔

دل میں یہ بھی سوچ لیا کہ صبح وہ اس لڑکی سے پوچھ کر رہیں گے کہ وہ کون ہے؟ اور اس ٹائم ہی کیوں یہاں کھڑی ہوتی ہے۔ مگر اس کا موقع ہی نا آیا۔

اسی شام وہ ڈرائنگ روم میں گھر آ گئے۔ وہ گھر میں ہمیشہ دستک دے کر داخل ہوتے تھے۔ دستک تو انہوں نے آج بھی دی تھی مگر افسوس روجی کی سماعتوں نے آج ان کی دستک نہ سنی۔ چونکہ غزالہ آئی ہوئی تھی اس لیے روجی پوری طرح غزالہ کے ساتھ باتوں میں مگن تھی۔ بلال اس کی سمت جانے کی بجائے سیدھے ڈرائنگ روم میں چلے آئے اور پھر حیران اور ششدر سے دروازے میں ہی رک کر اس کو دیکھنے لگے۔



ہاں وہ حورِ شام کی چاند بھی وہی تھا۔ وہ بستر کی چادر چھیڑ کر کے نیکی پر غلاف چڑھا رہی تھی۔ قریب ہی قالین پر میلی چادر اور غلاف پڑا تھا۔ بلال دروازہ میں کھڑے اس کو کام کرتے دیکھتے رہے۔ عمر سولہ سترہ برس کے درمیان تھی۔ رنگت بے حد کوری، سیاہ کھلے بال اگرچہ زیادہ لمبے نہیں تھے مگر خوبصورت لگ رہے تھے اور سوٹ نجانے کس لکڑ کا تھا۔ میلا ہونے کی وجہ سے اس کے کمر اور پرنٹ کا پتہ ہی نہ چل رہا تھا۔ وہ بلال کی آمد سے بے خبر بڑے سا نہاک سے مسکراتے ہوئے اپنا کام کر رہی تھی اور بلال وہیں کھڑے نہ صرف فرسٹ ٹائم اس کو جی بھر کر دیکھ رہے تھے بلکہ ساتھ ساتھ اس کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر اور جھک کر قالین پر پڑی ہوئی چادر اور نیکی کا غلاف اٹھا کر جیسے ہی مڑی دروازہ میں کھڑے بلال کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔ روٹی نے باہر جانے کے لیے قدم اٹھانا چاہا پھر دروازہ میں کھڑے بلال کو دیکھ کر رک گئی۔ اب وہ بھی بلال کو دیکھتی۔ جو بریف کیس ہانگوں کے قریب کھڑا کر کے خود دونوں ہاتھ سینے پر باندھے نجانے کب سے کھڑے روٹی کو دیکھ رہے تھے۔ اور بھی دروازے کو۔ کبھی بات کرنے کو منہ کھولتی مگر بات ہو توں سے باہر نہ آتی۔ وہ خفزدہ سی کھڑی پریشانی سے سوچ رہی تھی۔ اگر ایسے میں امی آ گئیں تو وہ بلال کے سامنے ہی بے عزت کرنا شروع کر دیں گی۔ ان کو تو کسی آئے گئے کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ اب اگر انہوں نے بلال کے میرے محبوب کے سامنے ہی مارنا شروع کر دیا تو کیا عزت رہ جائے گی بلال کی نظروں میں میری؟ یہ سوچتے ہی سردی کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینا آ گیا۔ بلال بغور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ جب وہ کوشش کے باوجود بول نہ پائی تو اس نے خود ہی بڑے احترام سے پوچھا۔

”آپ کون ہیں اور آپ کا نام کیا ہے؟“

اور روٹی بس بلال کو دیکھ کر رہ گئی۔ بتاتی بھی تو کیا۔ منہ پر تو ماں نے چپ کے تالے لگا دیئے تھے۔ وہ چپ چاپ کھڑی ہونٹ کھلتی رہی۔ حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہہ دے میں وہ ہوں جس کی خاطر خدا نے تمہیں بھیجا ہے۔ میں تمہاری محبت ہوں مگر افسوس کہ میں بول نہیں سکتی۔

”آپ یہاں۔ میرا مطلب ہے کیا آپ اسی گھر میں رہتی ہیں؟“ بلال نے پوچھا۔

اور روٹی پھر صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

”میرے دم کی روزانہ صفائی آپ کرتی ہیں۔“ بلال نے روٹی کو بلانے کی خاطر پوچھا۔

اور روٹی نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیا آپ کو بولنا منع ہے یا آپ کو لگی ہیں۔“ اب کے بلال نے مسکرا کر پوچھا۔

روٹی نے دل میں سوچا یہ ستم ظریفی کی بات ہے۔ جن لوگوں سے میں نے محبت کرنے کی کوشش کی۔ جن لوگوں کی قربت کی میں تمنائی تھی۔ انہوں نے میری قدر نہ کی۔ مجھے دھتکار دیا اور اب اتنے برسوں بعد تم میری محبت بن کر آئے ہو۔ مجھ سے پیدا کرنا چاہتے ہو۔ میرے قریب ہونا چاہتے ہو۔ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو۔ مگر افسوس میں بول نہیں سکتی اور تمہیں کچھ بتا بھی نہیں سکتی۔ ہائے یہ کیسی مجبوری ہے۔ شاید محبت۔۔۔۔۔۔ ہاں سچی محبت کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر نہیں ہمیشہ ایسا نہیں ہوگا۔ تم میرا ویٹ کرنا۔ میرے محبوب! میں پہلے کی طرح جلد بازی سے کام لے کر تمہیں کھانا نہیں چاہتی۔ کیونکہ۔۔۔۔۔۔ کیونکہ تم میری آخری محبت ہو۔ مگر میرے پیداے محبوب بھی ویٹ کرو۔ وہ کھڑی سوچتی جا رہی تھی۔ وہ یہ بھول چکی تھی کہ دروازہ میں کھڑا بلال بغور اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا اور باہر سے روٹی کی نام بھی اندر آ سکتی تھی۔

مگر باہر بیٹھی روٹی تو غزالہ کے ساتھ باتوں میں کچھ ایسی مگن تھی کہ بلال کی آمد کا احساس تک نہ ہوا تھا کہ جب غزالہ آتی تھی تو ان کی اپنی باتیں ایسی شروع ہوتی تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نا آتی تھیں۔ اس وقت بھی غزالہ اس کو اپنے کسی نئے افیئر کے بارے میں بتا رہی تھی اور روٹی پوری دلچسپی سے سن رہی تھی۔ ”یار آج کل ایک اور لڑکا میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔“

”کونسا لڑکا؟“ روٹی نے دلچسپی سے پوچھا۔

”یار! منوری خلع کے گھر کے اوپر والے پورشن میں نئے کرائے دار آئے ہیں۔ تمہیں معلوم تو ہے منوری خلع کا گھر ہمارے گھر کے ساتھ ہی ہے۔ وہ لڑکا گہرے سانولے رنگ اور چھوٹے قد کا ہے۔ جب سے آیا ہے تب سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں تو اس کو منہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے ایک دن اس وقت مجھے پکڑ لیا۔ جب رات کے نام میں



چھت پر اکیلی تھی۔ وہ خالہ منوری کی چھت سے کود کر ہماری چھت پر آیا اور کہنے لگا میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ مگر آپ مجھ سے بات کرنا تو دور کی بات دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے نا کہ میں خوبصورت نہیں۔ بد صورت ہوں۔ اس کی بات سن کر مجھے ترس آ گیا۔ اب کہ میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا کہا مجھے بھی تم اچھے لگتے ہو۔ انسان کا دل خوبصورت ہونا چاہیے۔ باقی سب بیکار ہے۔“

غزالہ نے بات ختم کی تو روجی نے پوچھا۔

”اور وہ جو گھر کے سامنے رہتا ہے اس کو پتہ چل گیا تو۔۔۔۔۔“

”ارے او؟“ غزالہ نے ہنس کر کہا۔ موصوف عشق میں پڑ کر پڑھائی بھول گئے تھے۔ مطلب پڑھائی میں کمزور ہو گئے تھے۔ والد صاحب کو غصہ آیا تو پچھلے ہفتے گھر سے ہوٹل بھیج دیا اور یہ محض اتفاق ہے۔ اس کے جاتے ہی یہ آ گیا ہے۔ میں نے سوچا چلو اپنے جہیز کی چند چیزیں ہی اس کے دیئے ہوئے پیسوں میں سے خرید لوں گی کیونکہ وہ ہر ملاقات میں تھوڑا بہت کیش مجھے لازمی دے کر جاتا ہے۔“

غزالہ وضاحت کرنے کے بعد خاموشی ہو گئی تو روجی جس کے پاس اپنے کسی نئے تو کیا پرانے آئینہ کا بھی کوئی قصہ نہیں تھا کیونکہ منگنی ہوتے ہی وہ جمشید سے قطع تعلق کر چکی تھی۔ اندر سے لاکر غزالہ کو چند جہیز کی آٹمیں دکھائی ہوئے بولی۔

”کیسی ہیں؟“

”بہت پیاری۔“ غزالہ نے دل سے تعریف کی۔ پھر پوچھا۔

”شادی کا کب تک ارادہ ہے؟“

”ہم لوگوں کا تو شادی کرنے کا بھی کوئی پروگرام نہیں تھا۔ مگر میرے سسرال والے جلدی شادی پر زور دے رہے ہیں۔ میرے امی ابو کا خیل تو ابھی سال چھ ماہ بعد شادی کرنے کا تھا۔ مگر عامر ہی نہیں مانے۔ مجبوراً ہمیں یہ ساری تیاری کرنی پڑی۔“ روجی نے بتایا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ عامر نہیں مانے۔“ غزالہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”جناب عالی! وہ میرا فیانی ہے۔ مجھے پتہ نہیں چلے گا تو کیا کسی اور کو پتہ چلے گا۔“ روجی نے تڑا کر کہا۔

”ارے ہاں! کہیں اس کو بھی تو لیسٹر وٹر لکھنے نہیں شروع کر دیئے۔“ یار دیکھنا لیسٹر محبوب کو لکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ فیانی کو لکھنے کے لیے نہیں کیونکہ یہ فیانی صاحب جو اب ٹیکمٹ کے بعد فیانی کی ایک جھلک دیکھنے کوڑے پتے ہیں۔ فون پر کسی آواز سننے کوڑے پتے ہیں۔ شادی ہو جانے کے بعد یہی فیانی صاحب جب پیسہ بند بنتے ہیں تو ایسی ویسی بات ہونے کی صورت میں طنز فیہر مانتے ہیں۔“

”دیکھا ہے تمہیں بھی شادی سے پہلے ہی۔ مجھے لیسٹر لکھا کرتی تھی۔“ غزالہ نے روجی کو سمجھانے کیلئے لمبی چوڑی تفصیل بیان کی تو روجی نے ہنس کر غزالہ سے کہا۔

”تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ اب اتنی بھی سیدھی اور بھولی نہیں ہوں کہ ان ہی کو لیسٹر لکھنے بیٹھ جاؤں۔ اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ عامر شادی پر زور دے رہے ہیں۔“ غزالہ نے مشکوک نظروں سے روجی کو دیکھا۔

”یار اتم تو سی آئی اے والوں سے بھی زیادہ انکوائری کر رہی ہو۔ بدوقوف بدھویہ بات تو ان کی بہنوں نے مطلب میری نندوں نے بتائی تھی۔ اس کامی ابو تو ایک برس بعد شادی کے لیے مان گئے تھے مگر عامر بھائی نہیں مانے۔ اب سمجھ آئی۔“ روجی بات ختم کر کے مسکرائی تو غزالہ نے کہا۔

”ہو سکتا ہے میری شادی بھی اسی برس ہو جائے۔ پرویز بتا رہا تھا کہ اس کے گھر والے بھی چند ماہ تک مستقل پاکستان آرہے ہیں اور ان کے آتے ہی میں امی سے تمہارے بارے میں بات کروں گا۔ ویسے بڑی آپا جوائنڈن میں ہوتی ہیں ان کو میں تمہارے بارے میں بتا چکا ہوں اور انہوں نے تمہارے ساتھ شادی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ کہا تھا۔ اگر امی نے انکار کیا تو میں ان کو خود ہی منالوں گی۔“

”اچھا واقعی یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ تم سے کیا ہوا اپنا شادی والا وعدہ پورا کر رہا ہے۔ کیا تم اب بھی پرویز کو ملنے جاتی ہو اور باقی سلسلہ بھی چل رہا ہے۔“ روجی نے راز داری سے



پوچھا۔

”یار اتم سے کیا چھپلا۔ بلاناغہ ملنے جاتی ہوں۔ باقی سلسلہ بھی جوں کا توں چل رہا ہے۔ سچی بات بتاؤں میں خود ہی پرویز کی عادی ہو چکی ہوں۔ گھر میں مہمان آنے کی وجہ سے میں چند روز نہ جا سکی کہ بڑی باجی فیصل آباد سے اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ لیکن کروڑوں رات کروٹیں بدلتے گزرتی تھیں۔ غزالہ نے بے باکی سے کہا۔  
روحی جو بلا کچھ کہہ بھی نہ پائی تھی کہ غزالہ کا چھوٹا بھائی اس کو بلانے آ گیا۔

”باجی! گھر میں گیسٹ آئے ہیں۔ امی آپ کو بلا رہی ہیں۔“ بھائی کی بات سنتے ہی اٹھتے ہوئے بولی۔  
”اچھا روحی میں اب جاتی ہوں اور سنو تمہیں بھی اب کبھی ہمارے گھر آنا نصیب ہو گیا نہیں۔ جب سے بچھٹ ہوئی ہے تب سے اپنے گھر یا سسرال کی ہو کر رہ گئی ہو۔“ یہ سن کر روحی نے وضاحت کی۔

”سچی غزالہ! نے کوئل تو بہت چاہتا ہے مگر کام زیادہ کرنے والا ہے جبکہ اتم بہت کم ہے۔ یار اتم آجایا کر فنامیر ہا تھا بٹانے۔“

”ہاں یہ خوب رہی تم خود تو ملنے کے لیے بھی نا آؤ اور میں تمہارا ہا تھا بٹانے آجایا کروں۔“ غزالہ نے گھور کر روحی کو دیکھا۔

”مختصر! جب تمہاری شادی ہوگی تو میں بھی آ جاؤں گی تمہارا ہا تھا بٹانے۔“ روحی نے ہنس کر کہا۔ غزالہ مسکرا کر اسے چھیڑا۔

”تم آؤ گی میری شادی پر میرا ہا تھا بٹانے۔ تب تو ریں ریں کرنے والے تمہارے ارد گرد چکر کاٹ رہے ہوں گے۔“

”چل ہسٹ بدتمیز۔“ روحی شرمائی۔ حالانکہ شرماس کے وجود کا حصہ نہ تھی۔

شرمانے کی تو اس کو عادت ہی نہیں تھی۔ غزالہ تو بھائی کے ساتھ چلی گئی۔ روحی اس کی باتیں یاد کر کے مسکرانے لگی۔ اچانک وہ چونک پڑی۔ روبی کا خیال آیا جو بلال کے بستر کی چادر اور نیکے کاغذات بدلنے لگی تھی اور ابھی تک وہیں تھی۔

روحی نے جلدی سے دیوار پر لگے وال کلاک کی جانب چہرہ پھیر کر دیکھا۔ بلال کے آنے کا نام ہو رہا تھا۔ یہی دیکھ کر روبی کو آواز دی۔

☆☆☆☆

”کیا سوچتی جا رہی ہیں آپ؟“ روبی کو مسلسل سوچ میں گم دیکھ کر بلال نے پوچھا۔ اور روبی چونک پڑی سامنے کھڑے بلال کو دیکھا تو گھبرا گئی۔ وہ جیسے وہاں بلال کی موجودگی سے بے خبر ہو چکی تھی۔ اب دل ہی دل میں خود کو کھرنش کرتے ہوئے سوچا میں ابھی تک یہاں کیوں کھڑی ہوں۔ مجھے تو بلال کو دیکھتے ہی یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔ اگر ایسے میں امی یا آپلی آ گئیں تو کو کیا قیامت ہی آ جائیں گی۔

روبی ابھی اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ روحی کی آواز آئی اور روبی مارے خوف کے کچھل پڑی۔

”روبی کام مکمل ہو گیا ہے تو جلدی سے باہر آ جاؤ۔ بلال کے آنے کا نام ہو رہا ہے۔“ پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود ہی ڈرائنگ روم کی جانب آرہی ہو۔

اب کیا ہوگا۔ روبی نے غصہ وہو کر سوچا۔

☆☆☆☆

”روبی تم نے سنائیں جلدی سے باہر آؤ۔ بلال کے آنے کا نام ہو چکا ہے۔“ روحی کی آواز پھر سنائی دی۔

”اچھا تو آپ کا نام روبی ہے۔ بہت پیدل نام ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی بلال کے منہ سے نکل گیا اور پھر روبی کو زید تنگ کرنے کا پروگرام مؤخر کرتے وہ دُور سے ہسٹ گیا اور روبی ان کے قریب سے گزر کر تیزی سے باہر چلی گئی۔ اس کو یوں جانا دیکھ کر بلال کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھڑ گئی۔

یہ بات تو طے ہو گئی تھی کہ وہاں گھر میں رہتی تھی۔ نام کی مناسبت سے دیکھا جائے تو روحی، روبی، زوبی یعنی وہ روحی کی سسٹری بھی جاسکتی تھی۔ مگر مجھ سے پردہ آخر کیوں؟ یا تو روحی کو بھی پردہ کرواتے اور اگر روحی کو نہیں کروایا تو روحی کو کیوں پردے میں چھپایا۔ وہ روبی کو جانا دیکھا کر سوچ رہے تھے۔



روبی دل ہی دل میں مسکرائی تھی کہ باہر کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی اور وہ مجھ سے اتنی ڈھیر ساری باتیں کر چکا ہے۔ بے وقوف، احمق لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ سچی محبت کرنے والے ہر حال میں مل جاتے ہیں۔ وہ روجی کی الماری سے نکل نکل کر جو رومانٹک ناول اور رسالے پڑھتی تھی ان کا بھی اس پر خوب اثر ہو رہا تھا۔ وہ باہر آ کر روجی کے قریب کھڑی ہو گئی تو روجی نے اس کو گھورتے ہوئے کہا

”تم نے سنا نہیں۔ میں نے کہا تھا بلال کے آنے کا نام ہو گیا ہے۔ چلو اب جلدی سے اندر چلی جاؤ۔ یہ چادر اور غلاف مجھے پکڑاؤ میں رکھتی ہوں اس کو سٹور میں۔“

”اب جاؤ میری شکل کیو دیکھ رہی ہو۔“ وہ غرائی۔

”جی اچھا آئی!“ روبی نے کہا اور چادر غلاف روجی کو تھمایا۔

روبی باہر چلی گئی تو بلال سوچنے لگے روجی کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟ مجھ سے بطور خاص پردہ کیوں کر دایا جا رہا ہے۔ یہی سوچتے وہ فوراً خود ہی باہر چلے آئے۔ ظاہر ہے اگر پردہ تھا بھی تو اب اٹھ چکا۔ وہ باہر آئے تو روبی روجی کو چادر اور غلاف تھما رہی تھی۔ بلال کو دیکھ کر نا صرف روبی کی رنگت زرد ہو گئی بلکہ مارے غصے کے ماتھے پر ٹل بھی پڑ گئے تھے اور اس نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔

”اگر یہ اس وقت اپنے روم سے باہر نہ آتے تو کوئی قیامت آ جاتی۔ کیا میری قسمت میں خدا نے بے رحم اور بے وقوف محبوب ہی لکھے ہیں۔ اب ان کے جانے کے بعد آپنی مجھے ڈاٹیں گی کہ میں نے ان کو بتایا کیوں نہیں کہ اندر بلال آچکا تھا۔ وہ اندر جانے کی بجائے وہیں کھڑی رہی کہ اب کہیں میرے بارے میں کچھ اور نہ کہہ دیں جبکہ بلال روبی کی ہر سوچ اور رویے سے بے خبر روجی سے پوچھ رہے تھے۔“

”روجی سسٹر! یہ کون ہے۔“ حالانکہ نام سن کر اندازہ کر چکے تھے کہ وہ اس کی سسٹر ہے۔

”روجی کی رنگت تو اچانک بلال کو سامنے دیکھ کر ہی پھل پھول گئی تھی اور وہ روبی کی مکاری پر دل ہی دل میں کھل کر رہ گئی تھی کہ اس نے بتایا کیوں نہیں کہ بلال آچکا ہے مگر یہ نام روبی کو کچھ کہنے کی بجائے بلال کو جواب دینے کا تھا۔ بے جان سی پھلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔“

”یہ..... میری چھوٹی سسٹر روبی ہے۔“

”واقعی!“ بلال نے اندر جاتی ہوئی روبی کو دیکھ کر کہا۔ یا ایک ریکی جملہ تھا۔

”تمہیں یقین نہیں آیا نا۔“ روجی نے نجانے کیوں یہ جملہ کہا۔

”نہیں خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ وہ اصل میں..... میں نے فرسٹ نام دیکھا ہے نا اس لیے پوچھا تھا۔“ انہوں نے چالاکی سے کہا۔ وہ یہ بات چھپا گئے تھے کہ وہ پہلے دن سے ہی اس کو دیکھتے آ رہے ہیں اور یہ جاننے کے لیے بھی بے قرار کہ وہ کون ہے مگر انہوں نے یہ سب کہنے کی بجائے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا یہ بولنا نہیں جانتی۔ بلال دل کی بات زبان پر لے آئے؟“

”جانتی ہے مگر بہت کم بولتی ہے۔“ روجی نے پھر جلدی سے کہا۔

”اچھا؟“ بلال کے لہجے میں حیرت تھی۔ پھر کہا۔ ”اچھا جی میں نے اندر مخاطب کیا تو جواب نہیں دیا، خاموشی سے باہر چلی آئیں۔“ بلال نے بتایا۔

”دراصل وہ کسی سے ملنا بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ تنہائی پسند ہے۔“ روجی نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے لمبی چوڑی تفصیل بیان کی اور بلال مزید کچھ کہنے کی بجائے اٹھا کر اپنے روم میں چلے گئے۔

رات کو شمشاد بیگم بہن کے گھر سے واپس گھر آئی تو ان کو کھانا دیتے ہوئے روجی نے بتایا۔

”امی! آج بلال نے روبی کو دیکھا لیا ہے۔“

”ہائے! کیسے دیکھا لیا بلال نے۔“ شمشاد بیگم نے غصے سے پوچھا؟

”امی! روبی ان کے روم کی صفائی کرنے کے بعد بیڈ شیٹ اور ٹکیے کا کور بد لئے گئی تھی کہ وہاں چانک آ گئے۔“ دراصل آج غزالہ آئی ہوئی تھی اس کے ساتھ باتوں میں لگی تھی۔ یوں



بلال کے آنے کا پتہ نہ چلا اور ایسے بھی بلال آج جلدی آ گیا تھا۔“ روجی نے پوری بات بتادی۔

”تم اسی طرح باتوں میں لگی رہنا اور وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی۔“ حمیدہ بیگم کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔

ڈرائنگ روم کے درجے میں کھڑے بلال نے یہ بات بے حد حیرت سے سنی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان سب باتوں کا مقصد اور مطلب کیا ہے۔ وہ جتنا سوچتے گئے اتنا ہی الجھتے گئے۔ مگر بات ایسی تھی کہ وہ روجی سے پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔

تاہم اس واقعہ کے بعد یہ ضرور ہوا کہ روبی کا جوان سے پردہ کر دیا جا رہا تھا وہ ختم کر دیا گیا کیونکہ اب روبی ان کو دن میں بھی نظر آنے لگی تھی۔ کبھی گھر کا کام کرتے ہوئے۔ کبھی برآمدے میں بیٹھی بک پڑھتے ہوئے اور کبھی یوں ہی چپ چاپ لان کی سبز گھاس پر ہاتھ کود میں رکھے بیٹھی وہ سوچوں میں گمنظر آتی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ بلال نے ابھی تک اس کی آواز مطلب اس کو بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ اس کے چہرہ پر ہمیشہ اسی چھائی رتی تھی اور آنکھوں میں نامعلوم خوف۔ بلال کو اس کا یہ روپ ڈسٹرب کرنا تھا۔ بلال کی سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ سب کیا ہے۔ وہ اس کیوں رتی ہے۔ جبکہ باقی لوگ ہنسی خوشی باتوں میں لگے رہتے تھے۔ بلال کو چپ چپ پھر نے والی اس لڑکی سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

”ہمدردی نہیں۔ محبت کہو محبت۔“ ان کا اندر سے کوئی بولا تھا۔

”نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بلال نے بے ساختہ کہا۔“

”یہ ہو چکا ہے۔ تم مل ہا رہ چکے۔ مان لو کہ تمہیں روبی سے محبت ہو چکی ہے۔“ ان کا اندر ہی سے پھر کہا گیا۔

اب کہ بلال خاموش ہی رہے تھے کہ یکدم ہی بلال نے فیصلہ کیا تھا کہ ہنوا لے نے غلط نہیں کہا تھا۔

”ہاں! یہ بات سچ تھی ان کو روبی سے ہمدردی نہیں واقعی ہی محبت ہو چکی تھی۔ مگر یہ انہونی کب اور کیسے ہوئی خود ان کو پتہ نہ چل سکا۔“ انہوں نے حیرت سے سوچا۔

”وہ تو شروع ہی سے دین کے قریب ہونے کی وجہ سے لڑکیوں سے دور ہو گئے تھے۔ مطلب دور دور ہی رہے تھے۔ ان کی والدہ کب سے شادی کیلئے ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں مگر وہ کسی نہ کسی طرح ان کو بہلاتے آ رہے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب اس کی والدہ کو معلوم ہوا وہ مزید تعلیم کے لیے امریکہ جانا چاہتا ہے تو انہوں نے بلال کو اپنے پاس بیٹھا کہ بات کی بلکہ زور دے کر کہا تھا۔“

”بلال اچھی طرح سن لو امریکہ جانے سے پہلے تمہیں لازمی شادی کرنا ہوگی۔“

وہ امی جان کی بات سن کر خاموش رہے نہ ہاں کی نہ ہی ناں۔ جب مرضی اپنی کرنی ہے تو پھر ابھی سے انکار کر کے ماں کا دل توڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ امریکہ سے واپسی پر شادی کرنے کا پروگرام رکھتے تھے۔ پھر وہ اپنا کورس کرنے لگا اور چلے آئے اور یہاں آتے ہی پہلی صبح ہی روبی کو دیکھ کر وہ حیران ششدر سوچتے رہے۔ وہ لڑکی ہے، پری ہے یا حور۔

ایسے خیالات پہلی بار ان کے دل میں کسی لڑکی کے لیے آئے تھے اور انہوں نے اپنے خیالات پر خود کو رنڈش بھی کی تھی۔ تاہم اس کے باوجود ہر صبح جب وہ نماز کے لیے اپنے روم سے باہر آتے تو ان کی خواہش ہوتی وہ پری اپنی جگہ موجود ہو تو اللہ ان کی دعا سن لیتا۔ وہ پری ہر صبح اپنی مخصوص جگہ یعنی واش بیسن پر موجود ہوتی۔ ہاں اب پردہ ختم ہونے کے بعد صبح کے وقت کبھی دکھائی نہ دی تھی۔

اور آج ان پر یہ بھید کھلا تھا کہ وہ اس پری چہرہ لڑکی کی محبت کا سیر ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔

اچھا تو زندگی میں یہ بھی ہونا تھا بلال خاں! اور ایک خوب صورت پرسکون چمکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ انہوں نے فوراً ہی روبی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھی امریکہ جانے سے پہلے۔ اس بات کا ان کو مکمل یقین تھا کہ امی جان روبی کے ساتھ اس کی شادی پر اعتراض نہیں کریں گی بلکہ وہ تو خوش ہوں گی کہ شکر ہے بلال شادی کے لیے مان گیا۔ البتہ ماں کے ساتھ بات کرنے سے پہلے انہوں نے روبی کے ساتھ بات کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ روبی سے پوچھ سکیں کہ اس کا ان کے ساتھ شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں۔

رائے جانے کے بعد ہی وہ ماں کے ساتھ بات کر سکیں گے۔ مگر بات کیسے کی جائے۔ سبھی لوگ تو گھر پر ہوتے ہیں۔ اچانک انہوں نے فیصلہ کر لیا وہ ابھی شادی کی بات کر کے روبی کو ڈسٹرب نہیں کریں گے بلکہ واپس جانے سے چند یوم پہلے بات کریں گے اور وہ مطمئن ہو گئے۔



”چھٹی کے روز حسب معمول بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ روجی بچن میں دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ زوبی اپنا سکول سے ملا ہوا ہوم ورک مکمل کر رہی تھی۔ قریب ہی شمشاد بیگم بیٹھی مٹر چھلتی رہی تھیں۔ سلمان ناشتے سے فارغ ہو کر دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا گیا تھا اور نصیر صاحب کسی دوست کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے صبح ہی صبح تیار ہو کر گھر سے چلے گئے تھے۔ ان کو لاہور سے باہر کسی دھڑے شہر جانا تھا۔ روبی البتہ بلال کو کہیں دکھائی نہ دی تھی۔ جب سے بلال نے محسوس کیا تھا کہ ان کو روبی سے محبت ہو چکی ہے تب سے ان کی خواہش ہوتی تھی زیادہ نہیں تو کم از کم صبح گھر سے نکلنے سے پہلے اس کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ شام کو گھر میں داخل ہوتے ہی ان کو سب سے پہلے روبی دکھائی دے مگر ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ ناشتہ وہ اپنے روم میں کرتے تھے کیونکہ ناشتہ کرنے کے بھی کپڑے اپنے نام تھے۔ سب سے پہلے زوبی ناشتہ کرتی تھی کیونکہ نانگے والے نے آنا ہوتا تھا۔ پھر بلال کہ سب سے آخر میں گھر سے وہی نکلتا تھا اور اس کو ناشتے کی ٹرے دینے حمیدہ بیگم خود آتی تھیں۔

ہاں البتہ رات کا کھانا بلال سب گھر والوں کے ساتھ کھاتے تھے۔ رات کے کھانے پر بھی کسی کو کہیں آنے جانے کی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ سبھی گھر میں موجود ہوتے تھے۔ سب مل کر سکون سے کھانا کھاتے۔ کھانے کے بعد مزید اقسام کی چائے پیتے باتیں کرتے، پھر سونے کے لیے اپنے اپنے روم میں چلے جاتے۔ مگر روبی رات کے کھانے میں کبھی شامل نہ ہوتی۔ یوں وہ اس کے دیدار سے محروم رہ جاتے۔

اس وقت وہ اپنا بیٹہ رومال دھونے واش بین پر آئے تھے۔ ابھی رومال کو بھگوایا ہی تھا کہ سامنے بیٹھی مٹر چھلتی شمشاد بیگم کی نگاہ ان پر پڑ گئی اور انہوں نے خفا ہو کر بلال سے کہا۔

”آئے ہائے بیٹا! یہ کیا تم خود کپڑے دھو رہے ہو؟“

”کپڑے نہیں خالہ جی صرف رومال۔“ بلال نے مسکرا کر ان کی بات کی تصحیح کی۔

”آئے ہائے بیٹا! رومال بھی تو کاہے کو دھوئے۔“ پھر بلال کو جواب دینے کی مہلت دینے بغیر روبی کو پکارا اور بلال کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ ان کے بل کی مراد برآئی تھی۔ روبی کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع رب نے پیدا کر دیا تھا۔

”ارے روبی! تو کہاں مرنے لگی ہے۔ جلد سے باہر آؤ۔ جب دیکھو سارا دن پڑھنے میں لگی رہتی ہو۔“ ان کی آواز سننے ہی روبی جلدی سے روم سے باہر نکلی تو انہوں نے ہاتھ سے بلال کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

”جاؤ اور بھائی کا رومال دھو کر دے آؤ۔“

”خالہ جی! میں نے کہنا میں خود ہی دھولوں گا۔“ اب کہ انہوں نے صرف یہی طور پر ہی کہا تھا۔ پھر قریب آتی ہوئی روبی کو دیکھا۔ ریڈ کلر کے پرنٹڈ سوٹ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی مگر بے حد اس بھی۔ وہ چپ چاپ ان کے قریب آئی اور منہ سے کچھ بھی کہے بغیر رومال ان کے ہاتھ سے پکڑ لیا تو بلال واپس ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ اپنے سوٹ وغیرہ دھلائی کے لیے لانڈری پردے آتے تھے۔ روجی اور حمیدہ بیگم اس بات پر بھی خفا ہوئی تھیں مگر بلال مناسب خیال نہیں کرتے تھے کہ گھر والوں سے اپنے کپڑے دھلائیں۔

بلال بستر پر گاؤٹکیے کے سہارے نیم دراز کتاب کے مطالعہ میں محو تھے کہ روبی چپکے سے روم میں داخل ہوئی۔ انہوں نے فوراً اس کی آمد کو محسوس کر لیا کہ ان کی سماعتیں تو کب سے ان خوبصورت قدموں کی آہٹ کی منتظر تھیں۔ تاہم ظاہر یوں کیا جیسے اس کی آمد سے بے خبر ہوں۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے روبی ان کو مخاطب کرے کہ وہ اس کی خوبصورت آواز سن سکیں۔

روبی چند لمحے دروازے کے قریب اس انتظار میں کھڑی رہی کہ کب بلال کی نگاہ اس پر پڑے اور وہ ان کا رومال ان کے حوالے کر کے واپس جاسکے۔ مگر بلال مطالعہ کرنے میں یوں محو تھے جیسے اس پاس کی کچھ خبر نہیں۔ یہ اندازہ روبی نے لٹاڑی ہونے کی وجہ سے اپنے طور پر لگایا تھا۔ اگر وہ فراموشی بھی غفلت نہ ہوتی تو وہ فوراً سمجھ جاتی کہ بلال جان بوجھ کر اس کو انور کر رہے تھے۔

باہر بیٹھی ماں اور روجی کا خیال نہ ہوتا تو وہ یونہی کھڑی بلال کو دیکھتی رہتی۔ وہ مطالعہ کرتے ہوئے بہت اچھے لگدے تھے۔ ماں کا خیال آتے ہی وہ خوف سے کانپ گئی۔ پھر تیزی سے بلال کے قریب آئی۔ جن کی اب بھی نظریں کتاب پر تھیں مگر سماعتیں روبی کی آواز سننے کی منتظر۔ وہ منہ سے کچھ بھی کہے بغیر رومال کے ان کے قریب رکھ کر واپس جانے کیلئے تیزی سے مڑی اور قبل اس کے دروازہ کراں کر جاتی بلال نے اس کے ارادے سمجھ کر جلدی سے کتاب بند کرتے ہوئے اس کو پکارا۔



”سنو روپی!“

روپی کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ سینے کا اندر دل پوری شدت سے دھڑکا تھا مگر وہڑی نہیں تھی۔ ماں باہر موجود تھی۔ یہ دیکھ کر بلال نے کہا۔  
”روپی یہاں آؤ میرے قریب۔“ اور روپی ان کے قریب چلی آئی۔ مگر نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ بلال نے بغور اس کے خوبصورت سراپے کو دیکھا پھر مسکرا کر پوچھا۔  
”آپ کو کئی ہیں یا کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔“

روپی کا جی چلنا کہہ دے کوئی نہیں ہوں۔ بولنا بھی جانتی ہوں اور خوب باتیں کرنا بھی اور تم سے بہت پیاری باتیں کرنا تمہارے پاس بیٹھنا صرف میرے دل کی خواہش ہے بلکہ خوشی بھی۔ مگر باہر بیٹھی بے رحم ماں کا خیل کر کے وہ جواب دیئے بغیر تیزی سے مڑی اور باہر چلی گئی اور بلال کو پہلے سے بھی زیادہ بے تاب و بے قرار کر گئی۔ بلال کتاب پڑھنے کی بجائے کتنی دیر روپی کے بارے میں ہی سوچتے رہے۔

بلال کی بات سن کر اس کے چہرے پر پچھلی اداس پہلے سے بھی زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ اس نے بات کرنے کے لیے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔ پھر نجانے کیا سوچ کر جلدی سے باہر چل گئی۔

”کیا مسئلہ ہے ڈیئر! تمہارے ساتھ۔ مجھے بتا دو۔ میں ساری اداسی، سارے دکھ سمیٹ لوں گا۔ پھر اتنی محبت دوں گا کہ تم سارا وقت مسکراتی رہو گی۔ مگر تم بولو تو سہی کچھ۔ کچھ کہو تو سہی۔“ بلال اب پڑھنے کی بجائے کتاب بند کر کے مسلسل ایک بار پھر روپی کے بارے میں سوچتے جا رہے تھے۔

دوپہر کے کھانے پر چھٹی ہونے کی وجہ سے کافی دنوں بعد روتی نے اچھا خاصا ہتمام کیا تھا۔ شمشاد بیگم نے کہا تھا آگے پیچھے نہیں مگر چھٹی والے دن ایک آدھ ڈش زیادہ بنایا کرو۔ بلال نے اگر ہماری بچت کے خیال سے ون ڈش کا کہہ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سارا مہینہ ون ڈش پارتی ہی چلتی رہے۔ یہی وجہ تھی آج روتی نے آلو کوشت کے ساتھ پتلی پتلی چپاتیاں بنائی تھیں۔ اس کے علاوہ مٹر پلاؤ بنایا تھا۔ سادہ ملاد کے ساتھ آلو مٹر ڈال کر دی کا رائتہ بھی بنایا تھا۔ سب سے سہاگم گاجر کا حلوہ بطور خاص دودھ کے علاوہ دام پستہ اور کھویا ڈال کر بنایا تھا۔ پھر بوائل انڈے کاٹ کر گارش کی تھی۔

کھانے پر نصیر صاحب کے علاوہ بھی گھر والے موجود تھے۔ سلمان کرکٹ کھیل کر واپس آچکا تھا اور آج اتفاق سے پہلی مرتبہ روپی بھی کھانے پر موجود تھی۔ بلال نے ایک نظر اس کو دیکھا، پھر کھانے کی جانب متوجہ ہو گئے۔ وہ ایک ایک چیز چک رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر گاجر کا حلوہ کھاتے ہوئے روتی کی تعریف ان الفاظ میں کی۔

”واقعی روتی بہن! آپ کو کنگ بہت اچھی کرتی ہیں۔ ہر چیز میں جان ڈال کر رکھ دیتی ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔“

روتی اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوئی۔ اپنی تعریف سننا اس کو بہت اچھا لگتا تھا جبکہ روپی کھانے سے فارغ ہو کر خاموشی سے اٹھ کر اپنے روم میں چلی گئی تھی۔ اس نے کھانا بھی خاموشی سے منہ بنا کر ہی کھایا تھا۔ جیسے کسی مرگ پر بیٹھی کھا رہی ہو۔

اس کے جاتے ہی سلمان بھی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔

”وہ سونے جا رہا ہے کیونکہ کرکٹ کھیلنے کی وجہ سے بہت تھک چکا ہے۔ اس کی بات سن کر بلال نے دوبارہ اس کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سب کے چہروں پر ایک نظر ڈالی، پھر آہستگی سے کہا۔

”خالہ جان! اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو ایک بات کہوں۔ آپ سب سے۔“ بلال چونکہ اب سب گھر والوں سے کافی بے تکلف ہو چکے تھے اس لیے تبلیغ کرنے کا سوچا کہ تبلیغ کرنے کا کوئی بھی موقع وہ بھی مس نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر جھگڑے ہوئے انسان کو نیکی کی راہ دکھانا ضروری سمجھتے تھے۔ یہی تعلیم ان کو دی گئی تھی۔

”ارے بیٹا! برا کیوں منانا۔ تمہارا جوتی چاہے کہو۔“ شمشاد بیگم اس سے ضرورت سے زیادہ ہی مہربان تھیں۔ ان کی بات سن کر بلال نے تھوڑا توقف کیا، پھر کہنے لگے۔

”خالہ جان! خیر سے آپ سب لوگ ہی مسلمان ہیں۔ ایک ماہ سے زیادہ دن ہو چکے مجھے آپ کے یہاں آئے ہوئے۔ مگر میں نے اس عرصہ میں آپ گھر والوں میں سے کسی کو

بھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ حالانکہ نماز دین کا ستون ہے۔ یہ ایک ایسا دینی فرض ہے جس کے بارے میں سب سے پہلے حشر میں آپ سے سؤل کیا جائے گا۔ کسی ایک نماز کی بھی

معاف نہیں کی جائے گی جبکہ آپ کے گھر والوں میں سے کوئی ایک نماز بھی نہیں پڑھتا۔ کچھ اس کا بھی سوچا ہے۔“ بلال کی بات سن کر سب گھر والے شرمندہ ہو گئے۔ پھر حیدر بیگم نے



کہا۔

”بس بیٹا! اب کیا کہوں رات ٹی وی دیکھتے ہوئے باتیں کرتے ہوئے غم گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ دیر سے سونے کی وجہ سے صبح جلدی آنکھ ہی نہیں کھلتی اور بعد میں یہ سوچ کر کہ جب پہلی نہیں پڑھی یعنی فجر کی تو پھر باقی نمازیں بھی چھوڑ دیتے ہیں یا چھوٹ جاتی ہیں۔“

”مگر خالہ جی! ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ آپ رات کو جلدی سونے کی عادت ڈالیں اور آج کل تو ویسے بھی جائزوں کی لمبی راتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔“ بلال نے پھر سمجھایا۔ سب گھر والے اس کی باتوں سے متاثر نظر آرہے تھے۔

”سلمان نے فوراً کہا۔ بلال بھائی صبح کی نماز میں آپ کے ساتھ ہی باجماعت ادا کروں گا اور پوری کوشش کروں گا باقی کی بھی کوئی نماز نہ ہو۔ ابھی جمعہ پڑھنے بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ پھر وہ روضہ کو گھر لے گیا تو حمیدہ بیگم نے کہا۔

”بلال بیٹا! آج سے انشاء اللہ میں بھی ساری نمازیں شروع کروں گی۔ اب تمہیں مجھ سے اس سلسلے میں شکایت نہیں ہوگی۔“ انہوں نے اپنی بات ختم کی تو بلال نے ایک نظر روجی اور زوبی کو دیکھا۔ پھر سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں بھئی! تم لوگوں کے نمازیں پڑھنے کے بارے میں کیا ارادے ہیں؟“

”بھائی جان! میں بھی آج ہی سے ساری نمازیں شروع کر دوں گی۔“ زوبی نے ایک عزم سے کہا تو انہوں نے روجی کو دیکھا اور روجی نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ارے بھئی! میں تو اب کل سے ہی ساری نمازیں پڑھنا شروع کروں گی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے صبح کی پڑھی نہیں اور اب باقی کی پڑھنے بیٹھ جاؤں۔“

”کل کے انتظار میں تم آج کی چار قیمتی نمازیں کر دوں گی۔ بہت بری بات روجی بہن! چار نمازیں کرنے سے بہتر ہے کہ تم آج والی فجر کی پڑھ لو۔“ بلال کہاں چھوڑنے والا تھا۔ ”اچھا بھئی! سوچوں گی۔“ اب کہ روجی نے کچھ بیزاری سے کہا اور دسترخون سے اٹھ گئی۔ بلال بھی نماز جمعہ کے لیے مسجد چلے گئے۔ سلمان بھی ان کے ساتھ ہی گیا تھا جبکہ نصیر صاحب اپنے دوست کے بیٹے کی شادی سے ابھی تک واپس ہی نہیں آئے تھے۔ سلمان اور بلال کے جاتے ہی حمیدہ بیگم اور زوبی بھی وضو کرنے لگیں اور روجی نماز پڑھنے کی بجائے آرام سے جا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی کہ صبح سب کو ناشتہ کروانے کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی تھی اور اب شدید تھکن ہو رہی تھی۔ خود وہ آرام کرنے لیٹ گئی تھی مگر زوبی کو بے آرام کر کے اس نے آنکھیں بند کرنے سے پہلے کہا۔

”اتھو زوبی! صبح کا بہت آرام کر چکی، اب باہر جا کرنا صرف دسترخوان سمیٹو بلکہ برتن دھو کر کچن بھی صاف کر دینا۔“ زوبی خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ وہ سو نہیں رہی تھی بلکہ اور سب گھر والوں کی باتیں سن رہی تھی۔

بلال کی باتوں کا گھر والوں پر خوب کبر اثر ہوا تھا۔ سب گھر والوں نے پانچ وقت کی نمازیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ خاص کر شمشاد اور زوبی تو ایک نماز بھی نہیں کرتی تھیں اور سلمان صبح کی نماز باجماعت بلال کے ساتھ ادا کرتا۔ کالج سے واپس آنے پر جتنی بھی نمازیں مل جاتیں پڑھ لیتا اور نصیر صاحب تو صبح کے گئے آتے ہی رات کو تھے۔ تاہم جب حمیدہ بیگم نے بلال کی باتیں انہیں بتائیں تو اس کے بعد وہ فجر کی نماز ضرور پڑھنے لگے تھے۔ مگر جماعت کے ساتھ نہیں گھر پر کہ جماعت کے ساتھ شامل ہونے کے لیے جلدی اٹھنا ضروری تھا۔

اب باقی رہی روجی تو اس نے نمازیں پڑھنی کم اور دکھانی زیادہ شروع کر دی تھیں۔ خاص کر جب اس کے سرال سے کوئی آ جانا تو جمل ہے روجی کوئی ایک نماز بھی کر دے۔ اس کو نمازیں پڑھتے دیکھ کر روجی کی ساس مارے خوشی کے پھولے نہ سائی۔ روجی کی بلائیں لیتی اور فخر سے کہتیں۔

”ارے اتنی سی چھوٹی عمر میں میری بہو کتنی پرہیزگار ہے۔ میرے گھر تو رحمت کی بارش ہوا کرے گی۔“ شمشاد بیگم بیٹی کی تعریف سن کر بے حد خوش ہوتی اور ایسے میں یہ کہنا ضروری سمجھتی ہیں۔

”بہن میں نے تو خود ساری عمر کوئی نماز نہیں کی اور یہی علت اپنے سارے بچوں کو سکھائی ہے۔“ اور روجی مکاری سے مسکرا کر ماں کی ہاں میں ہاں ملانے لگ جاتی۔ اور خود زوبی نمازیں تو کیا ساتھ ساتھ قرآن بھی پڑھنے لگی تھی بلکہ نمازوں سے زیادہ نماز قرآن کی تلاوت میں صرف کرنے لگی تھی۔ جس کی روجی کو سخت تکلیف تھی۔ اس نے تو اپنی



منگنی کے بعد روپی سے کہہ دیا تھا کہ جب میرے سسرال والے آئیں تو ان سے زیادہ فیری ہونے کی ضرورت نہیں۔ سلام کر کے اپنے کمرے میں چلی جایا کرو۔ اور تو اور منگنی پر بھی جب سب لوگ اھر رزم کرنے گئے تھے تو روجی کے کہنے پر ساتھ لے کر نہیں گئے تھے۔

اب روجی بے شک روپی کو نمازوں کے ساتھ قرآن پڑھتے دیکھ کر جلتی تھی مگر شمشاد بیگم روپی کو نمازیں اور قرآن پڑھتے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی کہ وہ پھر سے نیک اور معصوم بچی بن گئی تھی جبکہ بلال کے آنے پر وہ روپی کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان رہتی تھی کہ کہیں وہ بلال کے ساتھ بھی کوئی غلط حرکت نہ کر دے لیکن اب یہ پریشانی ختم ہو چکی تھی۔ اب ان کو کیا خبر آنے والا خود ہی روپی پر مرنا تھا اور یہ کہ اللہ سے زیادہ روپی اپنے محبوب کو خوش کرنے کیلئے یہ سب کچھ کرتی تھی۔ وہ ہر حال میں بلال کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی۔ متوجہ تو وہ اس کی طرف ہوا ہی تھا۔ آج جس طرح بلال نے اس کے ساتھ باتیں کی تھیں اور جس طرح محبت سے روپی کو دیکھتے رہے تھے وہ یہ بتانے کو کافی تھا کہ بلال بھی اس سے متاثر ہو چکے تھے۔ وہ ان کو اپنی محبت میں دیا نہ کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

دبیر کی سب سے رات دھیرے دھیرے صبح کی جانب محو سفر تھی۔ مگر اتنی رات ہونے کے باوجود نیند روپی کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اندر کمرے میں اور باہر فضا میں ہر طرف گہری تاریکی اور ایک سکوت طاری تھا۔ البتہ کبھی کبھار کسی کتے کے بھونکنے سے فضا میں چند پل کے لیے ایک شور سا پیدا ہوتا۔ پھر گہری خاموشی چھا جاتی یا پھر پھرے پر موجود چوکیدار کی سیٹی کی آواز سنائی دیتی۔ اس کے بعد پھر وہی لامتناہی خاموشی ہوتی۔

روپی کب کی سوچ چکی تھی مگر روپی چھت لکھوتے ہوئے مسلسل سوچے جارہے تھی۔ پہلے اس نے جتنے لوگوں سے محبت کی تھی وہ سب کے سب بے قدرے نکلے تھے۔ ان سب نے اس کی محبت کے جواب میں نفرت کا اظہار ہی کیا تھا بلکہ الٹا گھروالوں سے شکایت بھی کی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی اچھی خاصی پٹائی بھی ہوئی تھی۔ اس کا گھر سے باہر جانا بند کر دیا گیا تھا۔ مگر بلال ان سے مختلف تھا۔ ابھی میں نے محبت کا اظہار بھی نہیں کیا اور وہ میری اتنی عزت کرتے ہیں۔ اتنے احترام سے مجھ کو دیکھتے ہیں۔ اگر ان کو پتہ چل جائے کہ میں ان سے شدید محبت کرتی ہوں تو ہمارے خوشی کے ان کا کیا حال ہوگا شاید وہ میرا اور بھی زیادہ احترام کرنے لگیں۔

یا

بلال کو دوسرے لوگوں پر اس لیے بھی فوقیت حاصل تھی کہ پہلے والوں کے پیچھے وہ خود تھی۔ پہلے والوں کو اس نے سانگ گا کر یا خط لکھ کر خود اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی جبکہ بلال خود ہی اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ یوں بھی دوسرے لوگ گھر سے باہر تھے۔ جبکہ بلال ان کے اپنے گھر میں مقیم تھے اور اس کے بہت قریب رہتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ سامان گھر کے کام کاج کرتے ہوئے بھی ان کے بارے میں سوچتی رہتی اور کوشش کر کے صبح اور شام میں ان کی ایک جھلک ضرور دیکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی سماعتیں شام ہوتے ہی اس کے قدموں کی خنجر زبیں اور جب اس کو دیکھتی تو چہرہ ہمارے خوشی کے کھل اٹھتا جیسے دو جہانوں کی دولت مل گئی ہو۔ لب آپ ہی آپ مسکرانے لگتے۔ آنکھیں آنے والے دلوں کے سینے دیکھنے لگتیں۔ ساری رات اس کا خیال ہونے نہ دیتا اور اگر سو جاتی تو خواب میں بھی بلال ہی دکھائی دیتا۔ نہ صرف دکھائی دیتا بلکہ محبت سے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے کھل کر اپنی محبت کا روپی کو یقین دلاتے ہوئے اس کا نرم ہاتھ اپنی بھاری ہاتھ میں لے کر اپنے پیار کی شدتیں اس کے اندر منتقل کرتا۔

یہاں لگ بھگ ہے کہ جب آنکھ کھلتی تو وہ اپنی چارپائی پر تنہا ہوتی اور سامنے آپی سو رہی ہوتی۔ اسے میں کبھی تو وہ روئے لگتی اور کبھی سوچتی۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں درحقیقت ہماری دنیا کام خواہشات ہی خواہوں کا روپ دھار کر ہمیں نظر آتی ہیں۔ نا کام خواہشیں خواب میں پوری ہو کر آتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی بلال کھل کر اس کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کریں اور وہ ہر رات یہی خواب دیکھتی کہ بلال اس کے سامنے کھل کر اپنی محبت کا اظہار کر رہے ہیں اور یہ ایسی خواہش بھی جو حقیقت میں ابھی تک پوری نہ ہو سکی تھی۔ حالانکہ بلال کو اپنی جانب متوجہ کرنے کیلئے کیا کیا جتن نہیں کر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر بلال کے سامنے اس اور چپ چپ رہنے لگی تھی۔ اگرچہ گھر میں بھی امی، ابو، بہن بھائی اس سے کم ہی بات کرتے تھے، تاہم اب وہ خود بھی کسی کے ساتھ زیادہ بات چیت پسند نہیں کرتی تھی۔ پہلے وہ چاہتی تھی روپی اس کے ساتھ کھیلے۔ بولے مگر جب سے بلال آیا تھا تب سے اس کی سوچ کا محور بلال ہی بن گیا تھا۔

روپی نے سوچ لیا تھا۔ وہ ہر حال میں بلال کو حاصل کر کے رہے گی۔ خواہ اس کے لیے اس کی اپنی جان کیوں نہ چلی جائے۔ وہ اکثر سوچتی۔ اپنی بزدلی کی وجہ سے اس نے جاوید، آصف، توصیف کو تو کھو دیا ہے مگر بلال کو ہرگز نہ کھونے دوں گی۔ اگر وہ چپ ہی رہے تو میں خود ہی ان کو صاف صاف بتا دوں گی کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور شادی کرنا چاہتی



ہوں۔ آپ میرے ہیں صرف اور صرف میرے۔ میں تو کئی صدیوں سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ اگر آپ آئے ہیں تو مجھے چھوڑ کر مت جائیں ورنہ میں مرجاؤں گی۔ اور اب کدھر امی نے مجھے مارنے کی کوشش کی تو میں ان کے ہاتھ پکڑ کر صاف صاف کہہ دوں گی۔ مجھے مارنے کی بجائے سیدھی طرح میری شادی بلال کے ساتھ کر دیں۔ ورنہ میں یہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں گی۔ مگر پہلے بلال سے بات کرنا ضروری تھا۔ مگر اپنی ہزار کوشش کے باوجود وہ بھی تک بلال سے بات نہ کر سکی تھی اس دن دوپہر کے کھانے پر جب بلال نماز کی باتیں کر رہے تھے۔ روبی نے بلال کی تمام باتیں توجہ سے سنی تھیں اور دل میں پکارا وہ کر لیا تھا کہ اب وہ بھی باقاعدگی سے نماز ادا کرے گی۔

روبی نے سوچا جب وہ خود نماز پڑھتے ہیں تو مجھے بھی ابھی سے نماز کی عادت ڈالنی چاہیے تاکہ شادی کے بعد انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو اور ویسے بھی میں نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کیا کروں گی کہ وہ میری شادی بلال سے کروادیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس نے دل میں پختہ عزم کیا اور آنکھیں بند کر لیں سونے کے لیے۔ کیونکہ یہ سب سوچتے ہی اس کو کبرا سکون ملا تھا اور جلد ہی وہ سو بھی گئی۔

روبی پانچ وقت کی نمازیں شروع کر چکی تھی۔ اب یہ اور بات تھی کہ بلال ابھی تک اس کو نمازیں پڑھتے ہوئے نہ دیکھ پائے تھے۔ حالانکہ روبی ان کو کھانے کے لیے ساری نمازیں برآمدے میں پڑھتی تھی۔ خاص کر چھٹی والے روز۔ مگر یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ چھٹی والے روز بلال گھر میں موجود ہونے کے باوجود اپنے روم میں بیٹھے کسی کتاب کے مطالعے میں غرق ہوتے اور باہر آتے بھی تو کھانا کھاتے اور کھانے کے وقت روبی نماز نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اب تو اس کو خود پر بھی غصہ آئے لگا تھا کہ نہ وہ نماز پڑھتے اسے دیکھ سکتے تھے۔ نہ روبی ابھی تک ان سے بات کر سکی تھی۔ جبکہ وقت تھا کہ تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مگر ای آپلی اس کی نگرانی چھوڑتیں تو وہ کچھ کرتی۔

اس دن روجی کے سرالی آئے ہوئے تھے۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ سب باہر لاؤنج میں ہی بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ روجی اور ماں ان کے قریب بیٹھی تھیں جبکہ روبی کچن میں سنک کے سامنے کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ روبی کھانے کے بعد ٹیوشن پر جا چکی تھی۔ ایسے میں اچانک بلال چلے آئے۔ حالانکہ یہ ان کے آنے کا نام نہیں تھا۔ اب جوانہوں نے سامنے لاؤنج میں روجی کے سرال فیملی کو دیکھا تو سلام کرنے سیدھے لاؤنج میں چلے آئے۔ اس سے پہلے جب وہ لوگ آئے تھے تو شمشاد بیگم نے مارے محبت اور مروت کے طور خاص ان کے روم سے بلا کر ان کا تعارف روجی کے سرال سے کروایا تھا۔ بلال نے قریب آ کر کھڑے کھڑے سب کو سلام کرنے کے بعد ان کا حال حال دریافت کیا۔ پھر روجی سے ایک مگ چائے کا کہہ کر جانے لگے تو حمیدہ بیگم نے محبت سے پوچھا۔

”بلال آج تم جلدی کیسے آگئے اور اب آئے ہو تو بیٹھو یہاں ہمارے پاس؟“

”آئی ایم سوری خالہ جی! بیٹھ نہیں سکوں گا۔ طبیعت ٹھیک نہیں، سر میں شدید درد ہے۔ ابھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ چائے ذرا جلدی بنا دیں۔“ بلال نے کہا اور چلے گئے۔ روجی نے خود ٹھننے کی بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے روبی کو آواز دے کر کہا۔

”روبی بلال کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ایک مگ اچھی سی چائے بنا کر ان کو دے آؤ۔“ اور خود پھر سے باتوں میں مچھو گئی۔ جب اس کے سرالی آتے تھے تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی ان کو تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ تو کھانا بھی ان کے آنے سے پہلے ہی بنا کر رکھ لیتی تھی۔ وہ سب آنے سے پہلے ہی فون کر کے بتا دیتے تھے کہ کل آئیں گے۔

روبی کے لیے یہ بہت خوشی کی بات تھی کہ روجی نے خود ٹھننے کی بجائے بلال کا یہ کام اس کے سپرد کیا تھا۔ اس نے برتن وہیں چھوڑ کر ہاتھ دھو کر بڑی محبت سے خوشی خوشی بلال کے لیے چائے بنائی پھر مگ میں ڈالنے کے بعد بڑے قریب سے مگ چھوٹی ٹرے میں رکھ کر جلدی سے ٹرے اٹھا کر بلال کے روم میں چلی آئی۔ کہیں اب امی یا روجی نا اٹھ جائیں۔ چائے دینے کے لیے وہ روم میں آئی تو بلال گاؤٹکے کے سہارے اپنے بستر میں نیم ہارے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔

روبی نہیں جانتی تھی کہ یہ آنکھیں تو بلال نے روبی کے قدموں کی آہٹ سن کر بند کی تھیں۔ انہوں نے سن لیا تھا جب روجی نے روبی کو کہا تھا کہ بلال کو ایک مگ چائے بنا کر دے آؤ۔ وہ تب سے اس کی آمد کے منتظر تھے۔ آج وہ ہر حال میں روبی کی آواز سننا چاہتے تھے بلکہ آج تو وہ اس سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ روبی کم صدم ان کے سر ہانے کھڑی سوچ رہی تھی اب کرے تو کیا کرے۔ آج اس کے ہاتھ میں رومال نہیں تھا جس کو بستر پر پھینک کر وہ چلی جاتی۔ کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی بلال اس کے ساتھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ خود پہل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے بلال کو مخاطب کرنے کی بجائے ذرا سا کھانسی اور اس کا رادے سمجھتے ہوئے بلال نے فوراً آنکھیں کھول کر پھر بے تاب دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔



”آپ کو بولنا نہیں آتا یا میرے ضبط کا امتحان لے رہی ہو۔ ترس گیا ہوں میں آپ کی خوبصورت آواز سننے کو۔ آپ سے باتیں کرنے کو۔ پلیز! مجھ پر رحم کریں۔“ بلال کی بات سن کر روہی کا دل مارے خوشی کے جھوم اٹھا۔ وہ یہی تو چاہتی تھی۔ بلال اس کے ساتھ بہت ساری باتیں کریں مگر اس وقت گھر کے اندر نہ صرف ماں موجود تھی بلکہ مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔ یہی سوچ کر اس نے چائے کا گلدستہ بلال کو تھماتے ہوئے فقط اتنا کہا۔

”بولنا بھی آتا ہے مجھے اور خوب باتیں کرنا بھی۔ مگر۔۔۔۔۔“

بات ادھوری چھوڑ کر روہی تو باہر چلی گئی اور بلال کو مزید بے قرار کر گئی۔

چائے کے ہلکے ہلکے سپ لیتے وہ اس کی بات پر غور کرتے رہے کہ اس کا مطلب کیا تھا؟ کیا روہی کو بطور خاص ان سے بات چیت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو کیوں؟ آخر روجی اور روہی بھی ان سے بات چیت کرتی ہیں مگر بہت سوچنے کے بعد کچھ سمجھ میں نہ آیا تو چائے پی کر وہ آرام کرنے لیٹ گئے۔

کئی دنوں سے بلال دیکھ رہے تھے جب بھی اتفاق سے ان کی نگاہ روہی پر پڑتی تو وہ بڑی ادا سے مسکرا دیتی۔

بلال نے سوچا لگتا ہے میرے کہے بغیر ہی روہی میری بات سمجھ چکی ہے۔ یہ سوچتے ہی ان کو کبرا سکون ملا تھا۔ مگر پھر نجانے کیا ہوا وہ روہی کے اس رویے سے گھبرائے کہ اگر کسی نے روہی کو سکرا کر ان کی جانب دیکھتے پالیا تو روہی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی رسوائی کی زد میں آ جائیں گے۔ وہ اس بے وقوف لڑکی کو سمجھنا چاہتے تھے کہ وہ ایسا نہ کرے مگر وہ کیسی ان کو ہی نہیں رہی تھی۔

صبح جب وہ گھر سے نکلتے تب روجی اور شمشاد داخلہ گھر میں موجود ہوتی اور جب شام کو گھر آتے تو سبھی لوگ گھر میں موجود ہوتے۔ پھر روہی سے بات کیسے کرتے اور روہی بھی کہہ کر وہ روجی سے بات کر رہے ہوتے اور پیچھے روہی ہوتی تو وہ ان کو دیکھتے ہی مسکراتے ملکتی۔

بلال کو اس گھر میں آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا اور وہ اس گھر میں گھر کا ایک فرد بن کر رہ رہے تھے۔ روہی اکثر پر مچائی میں ان سے مدد لیتی تھی۔ سلمان بھی ان کے ساتھ خوب گپ شپ لگاتا تھا۔ باقی سب لوگ بھی ان کے ساتھ ٹھیک ٹھاک تھے مگر سب سے زیادہ بے تکلفی ان کی روجی کے ساتھ تھی۔ اس کی شادی نزدیک تھی اور پھر گھر میں آنے جانے والے بھی لوگوں کو وہی ڈیل کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہ نہ صرف بلال کے ساتھ بات چیت لازمی کرتی بلکہ اس نے بتایا تھا کہ محض اس کی وجہ سے وہ کھانا خود بناتی تھی۔ روہی تو پہلے دن سے ہی ان کو ڈسٹرب کرتی چلی آ رہی تھی۔ پھر انہوں نے محسوس کیا تھا کہ وہ روہی سے محبت کرنے لگے ہیں۔ یہ محسوس کرنے کے باوجود انہوں نے روہی کے ساتھ اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ انہوں نے سوچا تھا جانے سے پہلے روہی سے بات کر کہ اس کی رائے جاننے کی کوشش کریں گے۔ مگر وہ ان کے کہنے سے پہلے ہی سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ یہ اچھی بات تھی مگر ان کو دیکھتے ہی مسکراتا اچھی بات نہ تھی۔ وہ اس کو سمجھنا چاہتے تھے مگر وہ ملتی تو تباہ۔

☆☆☆☆

روہی تقریباً صبح ہی سے مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی کیونکہ اس کی پھوپھو، تایا، چچا آئے ہوئے تھے۔ ساتھ ان کے بچے بھی تھے، جن کے لیے روجی کھانے پر ان کے لیے خاص اہتمام کر رہی تھی۔ ناشتہ بھی ان لوگوں نے یہاں آ کر کیا تھا۔ نان بونگ کے ساتھ۔ بونگ روجی نے رات سونے سے پہلے دھیمی آنچ پر پکھنے کیلئے رکھی تھی اور اب وہ دوپہر کا کھانا بنا رہی تھی۔ اس کے ساتھ روہی بھی مصروف تھی۔ روہی نے پہلے حائل بھگو کر رکھے پھر گوشت وغیرہ ڈھو کر روجی کو دیا تھا۔ اب وہ کبابوں کے لیے قیمہ پیس رہی تھی جبکہ روہی روجی کو چیزیں پکڑانے کیلئے اس کے قریب کھڑی تھی۔ قیمہ پینے کے بعد روہی کسی کام سے کچن سے باہر آئی تو بلال پر نگاہ پڑ گئی۔ وہ آج پھر بیسن پر کھڑے اپنا رومال خود دھو رہے تھے۔ روہی سیدھی ان کی طرف آئی اور تیزی سے پوچھا۔

”ارے! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”تم دیکھ تو رہی ہو اپنا رومال دھو رہا ہوں۔“ بلال نے بظاہر سنجیدگی سے کہا یا اور بات ہے کہ اس وقت اچانک اس کے اپنے اتنے قریب دیکھ کر دل ہی دل میں بے حد مسرور ہوئے تھے۔

”آپ کو کیا نہیں امی نے آپ کو ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔“ روہی نے خفا ہو کر ان کو دیکھا۔ ادھر لائیں میں دھو دیتی ہوں، کہتے ہوئے اس نے بلال کے جواب کا انتظار کیے بغیر



ناصر ف رومال ان کے ہاتھ سے لایا بلکہ پوچھا۔

”کیا آپ کے پاس صرف یہی ایک رومال ہے؟“

”یہاں یہی ایک رومال ہے۔ جب ایک چیز سے کام چل رہا ہو تو پھر خواہ فضول میں دوسری پر پیسے ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔“ بلال نے دانستہ جواب مختصر دیا۔

”پھر تو بہت کنجوس ہیں آپ۔“ روبی نے جھٹ سے کہہ دیا۔

”خیر کنجوس تو نہیں ہوں مگر فضول خرچی کو مناسب نہیں سمجھتا۔“ بلال نے لہجے میں سنجیدگی برقرار رکھی۔ حالانکہ بھی مہمان شمشاد خانہ کے روم میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ جیسی تو روبی شوخ ہو رہی تھی۔

”آپ کچھ بھی کہیں مگر میں تو اس کو کنجوسی ہی سمجھتی ہوں۔“ روبی بات ختم کر کے مسکرا کر ان کو دیکھنے لگی تو بلال نے سر کوئی میں کہا۔

”روبی! اتنا زیادہ مسکراتا اچھی بات نہیں۔“

”تو کیا رونا اچھی بات ہے۔“ اب کہ روبی نے مسکرانے کی بجائے ہنس کر کہا تو بلال گھبرا کر ڈرائنگ روم میں چلے آئے کہ مبادا کوئی دیکھ نہ لے۔ تھوڑی دیر بعد ہی روبی ان کے روم میں داخل ہوئی اور بلال کے قریب آ کر روبی۔

”لیجئے جناب! اپنا رومال۔“ بلال کتاب پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ روبی کی بات پر اس کو نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر رومال لینا چاہا تو روبی نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور ان کو دیکھتے ہوئے شرارت سے ہنسنے لگی۔ اس کی اس معصوم حرکت پر بلال بے ساختہ مسکرائے۔ روبی مزید چھیڑ خانی کے موڈ میں تھی مگر تبھی کچن میں سے روٹی نے پکارا۔

”روبی کہاں چلی گئی ہو تم۔ یہ سفید زیرہ پیس کر دینا۔“ یہ سنتے ہی روبی نے رومل بلال کے حوالے کیا تو بلال نے آہستگی سے کہا۔

”شکریہ!“

”ارے اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ یہ تو میرا ہی فرض تھا۔“ وہ ذومعنی جملہ کہتی ہوئی مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ اس بات کا مطلب سمجھ کر بلال بھی مسکرا دیئے۔ مگر اس کے بعد کوشش کیا جو روبی ان کا کیلی بھی نہ ملی تھی۔

بلال کو آئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ اب ٹھیک ایک ماہ بعد وہاپس چلا جائے گا۔ دو ماہیوں گزرے ہیں جیسے دو لمحے ہوں۔

یہ سنتے ہی کہ بلال ایک ماہ بعد چلا جائے گا روبی اس کی جدائی کا سوچ کر ہی اداس ہو گئی کوشش کیا جو وہ بھی تک بلال کو کچھ بھی نہ کہہ پائی تھی۔ وہ بلال کا اظہار محبت کی منتظر تھی۔ مگر اب ماں کی بات سننے کے بعد کہ بلال ایک ماہ تک چلا جائے گا اس نے سوچا اب دیر کرنا خطرناک ہوگا۔ مگر مسئلہ یہ تھا اظہار کیسے کرے۔ زبانی یا لکھ کر۔ خط لکھنا ہی مناسب ہوگا۔ جب بہت سوچنے کے باوجود خط کا مضمون سمجھ میں نہ آیا تو روبی نے فیصلہ کر لیا وہ زبانی بلال سے سب کچھ کہہ دے گی۔ مگر کہوں گی کس وقت۔ جب وہ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جاتے ہیں۔ تب کہوں گی کہ اس وقت بھی گھر والے کبریٰ نیند سو رہے ہوتے ہیں۔

کو کہ چند روز سلمان نے فجر کی نماز ان کے ساتھ باجماعت ادا کی تھی پھر یہ کہہ کر پرہیزی چھوڑ دی تھی کہ بلال بھائی یہی تو ایک وقت ہوتا ہے کبریٰ پر سکون نیند لینے کا۔ لیکن میرا وعدہ نماز پڑھ لیا کروں گا۔ اب روبی نے سوچا یہی مناسب وقت ہوگا ان سے بات کرنے کا۔ ورنہ دن بھر تو روٹی اور حمیدہ بیگم اس پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔

اس رات اس کو نیند بھی ٹھیک سے نہ آئی تھی۔ آنکھ لگتی اور کھلتی رہی اور وہ بار بار اپنے سر ہانے رکھنا تم نہیں دیکھتی رہی۔ فجر سے کافی دیر پہلے ہی اٹھ بیٹھی تھی۔ بلال سے بات کرنے کے شوق میں اور جیسے ہی فجر کی اذان ہوئی وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ اگرچہ شمشاد بیگم صبح کی نماز باقاعدگی سے پڑھتی تھی مگر سورج طلوع ہونے سے پندرہ منٹ پہلے۔ اذان کے ساتھ وہ بھی بھی نا اگھی تھی اور روبی نے اسی موقع کو غنیمت جانتا تھا۔ وہ باہر آئی اور بلال کے انتظار میں کھڑی ہو گئی اور جب بلال مسجد جانے کے لیے روم سے باہر آئے تو روبی نے ان کے قریب آتے ہوئے پکارا۔

”بات سنیں۔“ بلال جاتے جاتے رک گئے۔ مڑ کر روبی کو دیکھا پھر پوچھا۔

”خیریت، کیلیات ہے؟“ روبی نے ان کو دیکھا پھر کہا۔



”دیکھئے میں آپ سے..... دیکھئے میں آپ سے۔“ وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئی اور کوشش کے باوجود کہہ نہ سکی کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر بلال نے نرمی سے پوچھا۔

”کیا میں آپ..... میں آپ سے کر رہی ہو۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں جو کہنا ہے کہہ دو۔“ ان کی بات پر روبی نے نگاہیں اٹھا کر ان کو دیکھا۔ اہل کی بات زبان پر لانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ یہ دیکھ کر بلال نے محبت سے پوچھا۔

”کیا بات ہے روبی کیوں پریشان ہو؟“

روبی نے بے بسی سے ان کو دیکھا مگر افسوس کوشش کے باوجود کچھ بھی کہہ نہ سکی اور جماعت چھوٹ جانے کے ڈر سے بلال مزید ر کے بغیر مسجد چلے گئے۔ روبی بھی واپس اپنے روم میں آ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ زبانی بلال سے کچھ بھی نہ کہہ سکے گی۔ بہت سوچنے کے بعد اب اس نے یہی مناسب سمجھا آپ ساری کیفیت لکھ کر ان کو دیدے..... اور پرسکون ہو گئی۔ اسی رات جب آپ اپنی سو گئی تو وہ کاغذ قلم لے کر بستر پر آ بیٹھی۔

اور اپنے سارے خیالات پیپر پر لکھ کر لیٹر کو رہانے رکھا اور پرسکون نیند سو گئی۔

صبح جب بلال جانے لگے تو روجی کی نظروں سے بچ کر ان کے پیچھے لپکی کدائی تو صبح بو کے ساتھ چلی گئی تھیں کہ وہاں سے مزنگ چھوڑ کر آفس جائیں۔

”پلیز ایئر لیتے جائیں۔“ روبی نے لیٹران کی جانب بڑھایا۔

”کیا ایئر؟“ بلال نے کہا۔ مگر لیٹر بھی تھا ملایا۔

”کیا ایئر ہے؟“ یہ تو آپ کو پڑھنے کے بعد پتہ چلے گا۔ واپس آنے سے پہلے سے پڑھ ضرور لیجئے گا۔“ روبی نے کہا اور جلدی سے واپس مڑ گئی۔

بلال نے واپس جاتی ہوئی روبی کو حیرت سے دیکھا۔ سوچ میں گم گھر سے باہر آ گئے۔ تاہم لیٹر انہوں نے پا کرٹ میں رکھ لیا تھا۔

سارا دن بڑی رہنے کی وجہ سے لیٹران کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ مگر شام کو جب وہ گھر آئے لگے تو ان کو یاد آیا صبح روبی نے ان کو ایک لیٹر دیا تھا اور کہا تھا گھر آنے سے پہلے ضرور پڑھ لیجئے گا۔ یہ یاد آتے ہی انہوں نے پا کرٹ سے لیٹر نکل کر کھولا اور پہلی لائن پر ہی نظر پڑتے ہی چونک پڑے۔ روبی نے لکھا تھا۔

میرے اپنے پیارے بلال صدا خوش رہو آباد رہو

سلام محبت!

میری سمجھ میں نہیں آتا لیٹر کیسے شروع کروں۔ جب سے آپ اس گھر میں آئے ہیں کو یا صحرا میں بہا ر آئی ہے۔ یقین کریں تب سے میرا دل میرے اختیار میں نہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں جنم جنم سے آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ پہلے تو جب امی نے آپ کے سامنے آنے سے منع کیا تو میں چھپ چھپ کر آپ کو دکھاتی تھی۔ ایک دن آپ نے جب صبح کی بجائے دن میں مجھے دیکھ لیا اور روجی آپ سے میرے بارے میں پوچھ لیا تو یوں مجھے آپ کے سامنے آنے کی اجازت مل گئی اور پھر کوشش کر کے صبح شام میں آپ کی ایک جھلک ہی کسی دیکھتی ضرور تھی کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ یقین کریں سارا دن آپ ہی کے خیالوں میں گم رہتی ہوں اور رات خواب میں بھی آپ ہی آپ نظر آتے ہیں۔ میرا یقین کریں میں آپ سے سچی محبت کرنے لگی ہوں۔ ویسے تو مجھے معلوم ہے کہ آپ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں مگر میں آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔ آپ بھی میری طرح خط لکھ کر مجھے بتادیں۔ اس لیٹر کا جواب ضرور دیجئے گا۔

اب اجازت آپ کی اور صرف آپ کی روبی۔

لیٹر پڑھ کر بلال طویل سانس لیتے ہوئے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے کئی بار روبی کا دیا ہوا لیٹر پڑھا اور انہیں روبی کے عامیانہ خیال جان کو بے حد افسوس ہوا تھا۔ انہوں نے سوچا کیا انہوں نے روبی سے شادی کرنے کا فیصلہ جلد بازی میں کیا تھا۔ یہ لڑکی جو خود مجھے لیٹر لکھ کر مجھے اپنی محبت کے بارے میں بتا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے مجھ سے پہلے بھی کسی کو لیٹر لکھا ہو۔ فوہ! میں کیا بکواس سوچ رہا ہوں۔ ایسا سوچنا گناہ ہے کسی کے بارے میں۔ مگر کسی لڑکے کو خود لیٹر لکھنا کوئی اچھی بات تو نہیں۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھے روبی کی اس حرکت پر غور کرتے رہے۔ ان کا دل ایک حد تک روبی سے متنفر ہو گیا تھا۔ مگر انہوں نے سوچا وہ پہلے روبی سے پوچھ تو لیں کہ اس نے یہ لیٹر کیوں لکھا اور فوراً ہی گھر جانے کے لیے اٹھ گئے۔



وہ گھر آئے تو روہی کو یا پہلے ہی سے ان کی منتظر تھی۔ روہی کو پورا یقین تھا کہ اس کو کسی نہ کسی طرح جواب ضرور دیں گے۔ اس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ بلال اس کو پسند کرتے ہیں اور جیسا کہ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر بلال کو پتہ چل جائے کہ میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں تو وہ کتنے خوش ہوں گا اور چونکہ وہ انہیں لیسٹر لکھ کر بتا چکی تھی کہ وہ ان سے محبت کرتی ہے اس لیے ان کے چہرے کی خوشی دیکھنے کا ان کا رویہ جاننے کے لیے بڑی بے تابی سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی بلال نے کبریٰ نظروں سے دور کھڑی روہی کو پہلی بار کچھ زیادہ ہی غور سے دیکھا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ یعنی اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اس کو۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کا دل بجھ کر رہ گیا جب بلال بے رخی سے منہ موڑ کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

روہی ان کو آواز دے کر روکنا چاہتی تھی۔ ان کے اس سرد رویے پر احتجاج کرنا چاہتی تھی مگر گلے میں آواز ناک کر رہ گئی۔ روہی منہ بسورتے ہوئے برآمدے میں آ بیٹھی۔ چند لمحوں بعد ہی اس نے بلال کی آواز سنی وہ اس کا اپنے پاس بلا رہے تھے۔ وہ خوشی سے دمکتا چہرہ لیے ان کے پاس آئی۔ بلال نے ایک بار پھر اس کو غور سے دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتے ہی رہے پھر روہی کا دیا ہوا لیسٹر اس کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“ روجی نے حیران ہو کر ان کو دیکھا۔ ان کی اس کم عقلی پر رونما بھی آیا۔ بھلا اتنی سی بات بھی وہ نہیں جانتے کہ یہ لولیسٹر ہے۔ تاہم جواب تو دینا ہی تھا سو آہستگی سے کہا۔

”یہ لولیسٹر ہے۔“

”وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“ ناپا جتے ہوئے بھی بلال کے لہجے میں ہلکی سا کواری درآئی۔

”پھر کیا مسئلہ ہے۔ اگر سب جانتے ہیں۔“ روہی نے بے تکلفی سے پوچھا۔

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کیا یہ سب باتیں تم نے لکھی ہیں؟“

”سب کی سب میں نے خود ہی لکھی ہیں۔“

روہی نے کچھ فخر سے کہتے ہوئے پورے زور شور سے اثبات میں سر ہلایا۔ بلال کے لیے اس کا یہ رویہ اور الفاظ شاک تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر پوچھا۔

”روہی تم نے یہ سب کیوں لکھا۔؟“

”کیا مطلب۔؟“ روہی نے قدرے حیران ہو کر ان کو دیکھا اور دل میں سوچا ہائے اللہ کس عقل سے کورے عاشق سے واسطہ پڑا۔ خود کچھ نہیں سمجھتے مجھ سے ہی ہر بات پوچھ

جار ہے ہیں۔ حالانکہ مجھ سے بڑے ہیں۔

”روہی میں نے پوچھا تم نے یہ سب کیوں لکھا۔ چپنا ہو بتاؤ مجھے۔“ بلال کے لہجے میں کبریٰ سنجیدگی تھی۔

”آپ نہیں جانتے میں نے یہ سب کیوں لکھا؟“ روہی نے الٹا ان سے پوچھا۔

”وہ مجھے۔۔۔۔۔ آپ سے۔۔۔۔۔ وہ دراصل میں آپ سے۔۔۔۔۔“

تو بلال نے کہا۔ ”میں جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔“ بلال کو اس کا رویہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔

”وہ مجھے آپ سے۔۔۔۔۔ وہ دراصل میں آپ سے۔۔۔۔۔“ روہی اتنا کہہ کر شرمائی۔ مگر جاوید اور آصف کی طرح بلال کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے انکا ٹک کر بولی۔

”مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ یقین کریں بالکل سچی محبت۔ یہی بتانے کو میں نے آپ کو خط لکھا اور میں نے ہر بات صاف صاف اور کھل کر لکھی تھی۔ پھر بھی نجانے آپ کو سمجھ

کیوں نہیں آتی۔“

بلال نے طویل سانس لے کر اس کو دیکھا۔ چند لمحوں دیکھتے رہے پھر بڑے ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔ ”روہی کیا تم جانتی ہو محبت کس کو کہتے ہیں، محبت کیا ہوتی ہے۔“

”بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ روہی نے جلدی سے کہا۔ ”محبت بس محبت ہوتی ہے جیسے کہ مجھے آپ سے ہو گئی اور یقیناً آپ کو بھی مجھ سے ہو چکی ہے۔“

”بس یا کچھ اور بھی جانتی ہو۔“ بلال نے پھر پوچھا۔

روہی نے حیرت سے ان کو دیکھا اور سوچا وہ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ باتیں جو آپنی غزالہ سے کرتی ہے۔ کیا میں اس کو بتا دوں کہ مجھے سب معلوم ہے۔ لڑکائی کو کیسے پیار کرتا ہے



اور وہ بھی اسی سوچ میں گم تھی کہ بلال نے اس کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”کان کھول کر سن اور وہی میں تمہیں آئندہ ایسی حرکت کرتے نادیکھوں۔ اگر تم نے پھر کبھی ایسا لٹکھا تو بری طرح پیش آؤں گا۔ سمجھی اور اب جاؤ۔“

”مگر کیوں؟“ روجی نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ بلال تو خود ہی اس کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔ اگر خط لکھنے میں نیا حال مل بتانے میں روہی نے پہل کر لی تو کوئی قیامت آگئی۔ آخر روجی آپہ بھی تو ہر لڑکے کو خود ہی خط لکھا کرتی تھی۔

”کیوں کیا مطلب؟“ بلال نے گھور کر اس کو دیکھا اور سرد لہجے میں کہا۔ ”فورا جلی جاؤ یہاں سے ورنہ۔“

”مگر آپ سنیں تو سہی۔ آپ تھا کس بات پر ہیں۔“ روہی انہیں کھل کر سمجھانا چاہتی تھی مگر بلال کا دل یکدم ہی خراب ہو گیا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں یہ خیالات۔

”میں کہتا ہوں فوراً جلی جاؤ یہاں سے ورنہ بھی خالہ جی سے جا کر شکایت کروں گا۔“ اور ان کی یہ دھمکی فوری طور پر اثر دکھا گئی۔ روہی جلدی سے باہر چلی گئی اور پھر سٹور میں جا کر رونے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ خوش ہونے کی بجائے وہ خفا کیوں ہو گیا۔ آخر کیا ہو گیا ہے ان کو؟ پہلے تو میری آواز سننے کو رستے تھے۔ اب اگر میں نے اظہار محبت کر ڈالا تو کیا برا کیا جو وہ یوں مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ مگر بہت سوچنے پر بھی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

ادھر بلال بھی ڈرائنگ روم میں اس کے بارے میں سوچے جا رہے تھے۔ روہی کی یہ بے باکی انہیں ناگوار گزری تھی۔ کیا روہی سے شادی کرنا مناسب ہوگا۔ پتہ نہیں مجھ سے پہلے کتنوں سے اظہار محبت کیا ہوگا جو اس بے باکی سے مجھ سے بات کر رہی تھی۔ خیر مجھے کسی کے بارے میں ایسا سوچنے کا کوئی حق نہیں مگر روہی کے ساتھ شادی والے فیصلہ پر ایک بار پھر غور کرنا پڑے گا۔ بہت پیاری اور خوبصورت بھی ہے اور مجھے اچھی بھی لگتی ہے مگر اس کا یہ رویہ یہ باتیں ان کو متفر کر گئیں۔ انہوں نے روہی کے ساتھ شادی نا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے جانے میں ابھی ایک ماہ باقی تھا اور انہیں یہ عرصہ اس گھر میں جیسے نیسے گزارنا تھا مگر ذرا روہی سے بچ کر اور سنبھل سنبھل کر مگر ان کی بہت ساری احتیاطوں کے باوجود چانک وہ حادثہ ہو گیا۔ جس کا انہوں نے کبھی سوچا نہ تھا۔

ان کے جانے میں ابھی پندرہ روز باقی تھے کہ چانک روجی کے چچا کی بیٹی کی شادی آگئی۔ اتنا ترسی رشتہ تھا۔ ظاہر ہے سبھی گھر والوں نے جانا تھا مگر سلمان نے سختی سے منع کیا تھا کہ روہی اس شادی میں نہیں جائے گی۔ ایسا نہ ہو اس کی کسی غلط حرکت سے شرمندگی اٹھانی پڑے اور سلمان کی یہ بات سب گھر والوں کی سمجھ میں آگئی تھی۔ یوں بھی شمشاد بیگم کا خیال تھا وہ گھر پر ہی رہے تا کہ بلال کو کھانے پینے کے معاملے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔

روہی بلال کے کھانا وغیرہ بنا دے گی۔ مہندی کے بعد ان کا پروگرام اگلے روز دہن کو رخصت کر کے آنے کا تھا۔ بارات دوپہر کی تھی ولیمہ بعد میں دیکھا جاتا۔ باقی رہی بلال کی بات تو بلال کی جانب سے انہیں کوئی خدشہ نہیں تھا۔ وہ بے حد شریف و جوان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ روہی کو گھر چھوڑ کر چلے گئے۔

زندگی میں شاید روہی پہلی بار ان کے فیصلے سے خوش ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی اگر قدرت نے اس کو یہ موقع دیا ہے تو وہ خود تفصیل سے بلال کے ساتھ بات کرے گی اور ان سے ان کے خفا ہونے کی وجہ پوچھے گی۔ پھر اپنے محبت بھرے دے سے ان کی خفا کی دور کرنے کی کوشش کرے گی۔ جب وہ اپنی باتیں ان کے گلے میں ڈال کر سران کے سینے پر رکھے گی تو کیا وہ خفا نہ سکیں گے ہرگز نہیں۔ اپنی کامیابی کا اس کو پورا یقین تھا اور اس کے لیے خصوصی تیاری ضروری تھی۔ یہی وجہ تھی گھر والوں کے جاتے ہی اس نے نہا کر اپنا ایک خوبصورت سوٹ پہنا اور بال سکھاتے ہوئے گنگنا نے لگی۔

اس نے بے حد محبت سے اپنے اور بلال کے لیے قیمہ مٹر پکائے روٹی کے ساتھ ساتھ چکن پلاؤ بھی بنایا۔ کھانا تیار کرنے کے بعد اس نے بچن کا دروازہ بند کیا اور آپہ کے کمرے میں آ کر دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو مختلف زاویوں سے دیکھنے لگی۔ روجی اپنے میک اپ کا سامان یونہی کھلا چھوڑ گئی تھی۔ روہی نے تھوڑی دیر سوچا پھر بیٹھ کر میک اپ کرنے لگی۔ خوب اچھا سا میک اپ کرنے کے بعد اس نے بالوں میں برش کر کے انہیں یونہی کھلا چھوڑ دیا۔ ابھی وہ پرفیوم لگا رہی تھی۔ جب دروازے پر دستک ہوئی۔ روہی کا دل مارے خوشی کے دھڑک اٹھا۔ آج وہ اس گھر میں اکیلی تھی۔ پندرہ روز ہو گئے تھے۔ بلال کو اس سے خفا ہوئے۔ تب سے انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کو نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ چھٹی والے روز وہ کھانا ان کے سب کے ساتھ ہی کھاتے تھے۔ روہی نے دوپٹا اٹھا کر ایک اداسے کاندھے پر ڈالا اور دروازہ کھولنے چلی گئی اور پھر جا کر دروازہ کھول دیا۔



”تم لگ ابھی گئے نہیں؟ اندر داخل ہوتے بلال نے سرسری نظر اس پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔“

”سب لوگ چلے گئے ہیں۔“ روہی نے دروازہ بند کرتے ہوئے بتایا۔

”اچھا مگر تم کیوں نہیں گئیں؟“ بلال نے قدم اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

روہی نے مسکرا کر ان کو دیکھا اور بولی۔

”میں بس آپ کی وجہ سے نہیں گئی۔“ یہ سن کر بلال کا موڈ آف ہو گیا اور انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔

”میری وجہ سے تمہیں رکنے کی ضرورت نہیں۔“ اور ڈرائنگ روم کی جانب چل دیئے۔ مگر روہی آج کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھی۔ ان کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

”رکنے کی ضرورت کیوں نہ تھی۔ آپ کے لیے کھانا بھی تو بننا تھا۔“

”تم لوگ کھانا بنا کر رکھ جاتے میں خود ہی گرم کر کے کھا لیتا۔“ بلال نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ پھر سوکس اتار کر واش روم میں چلے گئے اور روہی غصے سے برآمداتی ہوئی باہر چلی

آئی تھی۔ ”پتہ نہیں خود کو سمجھتے کیا ہیں۔“

پندرہ روز ہو گئے تھے مگر روہی ابھی تک بلال کی ناراضگی کی وجہ نہ سمجھ سکی تھی۔ وہ کھانا لگاتے ہوئے بھی بلال کی خفگی کا ہی سوچتی رہی۔ بلال کے سر دروپیے سے ساری خوشی کا نور ہو گئی

تھی۔ اس نے بڑی بے دلی سے برآمدے میں کھانا لگایا اور جب انہیں بتانے لگی تو انہوں نے بے رخی سے کہا۔

”میرا کھانا پیس دے جاؤ۔“ انہوں نے روہی کو دیکھ کر بغیر کہا۔

”مگر میں کھانا لگا چکی ہوں۔“ روہی نے پھر کہا۔

”پھر بھی مجھے باہر نہیں جانا۔ میرا کھانا الگ کر کے یہاں دے جاؤ۔“ اب کے انہوں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے رکھائی سے کہا تو روہی مارے غصے کے دانت بیستی ہوئی باہر آئی۔

اپنے لیے کھانا الگ کیا اور باقی ٹرے میں لگا کر انہیں دے آئی۔ پھر خود اکیلی بیچ کر کھانے لگی۔ بلال کو منانے کے طریقے بھی سوچنے لگی۔ وہ ابھی کھانا کھا رہی تھی کہ کھانے سے فارغ

ہو کر بلال برتن دینے خود باہر چلے آئے۔ کھانا کھاتی روہی کو دیکھا تو برتن اس کے قریب رکھ کر سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔

”اگر ہو سکے تو ایک کپ چائے بنا دینا۔“ اور واپس چلے گئے۔

”ہونہ! چائے بنا دینا۔“ روہی نے کھاتے ہوئے منہ بنا کر سوچا مگر خاموش رہی۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے برتن سمیٹے پھر بلال کے لیے چائے بنانے لگی۔ اچانک تیز

ہوا میں چلنا شروع ہوئیں۔ روہی کو موسم خراب ہونے کا احساس بالکل اچانک ہوا تھا۔ سارا دن تو وہ بلال کے خیالوں میں گم رہی تھی۔ اب اچانک موسم کے خراب ہونے کا احساس

کر کے وہ خفزدہ ہو گئی تھی۔ اس نے جلدی سے جا کر ساری کھڑکیاں دروازے بند کیے۔ پھر چائے بنا کر بلال کو دینے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ بلال گاؤٹکیے سے ٹیک لگا کر کوئی کام

کر رہے تھے۔ اندر داخل ہوتی روہی کو دیکھا تو سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ روہی نے چائے کا کپ ان کو تھمایا اور خود ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ بلال نے چائے کا پہلا سپ لیتے ہوئے اس

کو دیکھا اور سوچا یہ ساری تیاری میرے لیے کی گئی ہے۔ اچھی لگ رہی ہے۔ بلکہ بہت پیاری لگ رہی ہے۔ مگر اب ناممکن ہے۔ انہوں نے چائے کا دوسرا سپ لیتے ہوئے اس کو

جانے کا اشارہ کیا۔ مگر روہی چونکہ آج کھل کر ان سے تھیلیا بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس لیے اس کے چائے ختم ہونے کا انتظار میں کھڑی رہی۔

”تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے۔ اپنے روم میں جاؤ۔“ بلال نے تھوڑے سخت لہجے میں کہا۔

اوہ! جہنم میں تم بھی جاؤ۔ روہی نے دانت پیس کر سوچا اور اپنے روم میں آ گئی۔

باہر آئی تو رات کی تاریکی تھی۔ دوسرا بلالوں نے ستاروں کی مدد ہم روشنی کو بھی اپنے بھاری وجود کے پیچھے چھپا کر اس تاریکی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس پر ہوا کی تیز سائیں سائیں

یہ سب مل کر روہی کے خوف میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

روہی نے بمشکل دروازہ بند کیا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ مگر ایسی خوف کی حالت میں نیند کیوں کر آتی۔ خوف کے ساتھ ساتھ اکیلی بھی تھی۔ اس لیے ڈر کچھ

زیادہ لگ رہا تھا اور اس پر بلال کی بے رخی جس کو وہ کوشش کرنے کے باوجود سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بلال کی بے رخی کا ہی سوچتے ہوئے نجانے کیسے اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گئی۔ مگر یہ



کبری نیند ہرگز نہ تھی۔ اس کو سوائے کچھ زیادہ دیر نہ ہوتی تھی کہ اچانک باطل اس زور سے گرجے کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ لائٹ اس نے سونے سے پہلے خود ہی اپنے خوف کی وجہ سے آف نہیں کی تھی۔ اب اس نے پہلے سارے دم میں نگاہیں دوڑائیں پھر کمبل اچھی طرح لپیٹ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

بابر بکلی کے کوندے یا بار بار درپچوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ باطل الگ خوفناک آواز میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ ہوائی تیز تھی کہ دروازے کے ساتھ زور آزمائی کر رہی تھی۔ روپی نے اس شور سے بچنے کیلئے کانوں میں انگلیاں ٹھوس لی تھیں۔ اس کا مسئلہ یہ تھا وہ بچپن ہی سے ایسے خوفناک موسم سے خوف کھاتی آ رہی تھی۔ ایسے موسم میں وہ کبھی امی سے لپٹ کر سوتی تھی کبھی آپلی سے۔ بلکہ اکثر تو اس کو ساری رات نیند ہی نہ آتی تھی۔

وہ ساری ساری رات جاگ کر صبح ہونے کا انتظار کرتی اور صبح ہونے تک رنگ پیلا پڑ چکا ہوتا۔ آج پہلا اتفاق تھا کہ اس خوفناک موسم میں اس کے پاس کوئی بھی نہ تھا۔ امی اور نا ہی آپلی۔ وہ امی آپلی کی کبھی نہ محسوس کرتی اگر بلال اس کے ساتھ ایسا سخت اور ناقابل برداشت رویہ نہ اختیار کرتے۔ اب یہ موسم ہمیشہ کی طرح اسے ڈرا رہا تھا اور وہ مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جب اس کا دل مارے خوف و وحشت اور گھبراہٹ کے بے طرح دھڑکنے لگا تو وہ اپنی ماما اور بلال کی ساری بے رخی بھول کر دروازہ کھول کر روم سے باہر نکل آئی۔ باہر بارش بھی خوب زور پر تھی۔ وہ بھاگ کر ڈرائنگ روم کی جانب آئی اور زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔ اس وقت سوائے ڈر، خوف کے اس کو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ پیار محبت وہ سب بھول چکی تھی۔

بلال اطمینان سے سو رہے تھے۔ دستک کی آواز سن کر آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر سوچا پھر اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر کھڑی روپی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ دوپٹے سے بے نیازان کے سامنے کھڑی تھی اور شاید کچھ خنزیر بھی تھی۔

”کیا بات ہے روپی! اس وقت کیوں آئی ہو؟“ روپی انہیں جواب دینے کی بجائے روم میں داخل ہو گئی۔

”ارے بھئی! کیا ہوا۔“ بلال نے پلٹ کر پوچھا۔

روپی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپکے سے ان کے بستر پر ایک سمت بیٹھ گئی۔

بلال کچھ دیر کھڑا اس کو گھورتا رہا۔ پھر ذرا کرخت لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ کیوں آئی ہو تم یہاں۔ بتاتی کیوں نہیں؟“

روپی نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا مگر جواب پھر بھی نہ دے سکی۔

”کیا میں بکواس کر رہا ہوں۔“ بلال نے غصے سے پوچھا۔

”بابر بہت زور کی بارش ہو رہی ہے۔“ روپی نے خنزیر دہ لہجے میں بتایا۔

”ہو رہی ہے تو پھر۔۔۔۔۔“ بلال نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”آپ آخر کس بات پر اتنے خفا ہیں۔ جو یوں گھور رہے ہیں۔ ذرا باہر جا کر خود دیکھیں بارش کے ساتھ ساتھ طوفان بھی ہے اور بجلی بھی بار بار چمک رہی ہے۔“ روپی نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

بلال اس کی بات سن کر چند لمحے بے ساختگی سے روپی کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہ اس کی خفگی کی وجہ پوچھ رہی تھی اور بلال اس کے اس روپ کو دیکھ کر ویسے ہی ڈسٹرب ہو رہے تھے۔ یہی وجہ ہے روپی کی بات کا جواب دینے کی بجائے بولے۔

”فورا اٹھو میرے بستر سے۔“ ان کے لہجے میں نجانے کیا بات تھی کہ روپی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”شاباش! اپنے روم میں جاؤ۔“ بلال نے بدستور اسی لہجے میں کہا۔

”گھر میں کوئی نہیں اور مجھے وہاں اکیلے کمرے میں ڈر لگتا ہے۔ آپ کو کیا ہو گیا۔ پہلے تو آپ ایسے نا تھے۔ آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ میں لڑکی ہوں اور یہ موسم تو مجھے ہمیشہ خنزیر دہ



کر دیتا ہے۔ پلیز! مجھے یہاں رہنے دیں۔“ کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔ ”آپ کو کیا ہو گیا؟“ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اسی وقت خوفناک آواز کے ساتھ بجلی یوں چمکی کہ گویا بھر صحن میں ہی گری ہو۔ روٹی بدحواس ہو کر مارے خوف اور گھبراہٹ کے بے ساختہ سامنے کھڑے بلال سے لپٹ گئی۔

یہ حرکت ہانسیٹھیں نادانستگی میں روٹی سے سرزد ہوئی تھی۔ کچھ دیر تو باہر ہونے والے دھماکہ نے بلال کو بھی حواس باختہ کر دیا۔ ان کی بھی سمجھ میں نہ آیا یہ سب کیا ہوا ہے۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ جب ہوش آیا تو انہوں نے دیکھا روٹی ان کے بازوؤں میں تھی۔ وہ کسی سبھی ہوئی بچی کی طرح ان سے لپٹی ہوئی تھی۔ اب پتہ نہیں یہ بھگیکے موسم کا اثر تھا یا رات کی اس سکونت پر ورثائی کا۔ بس اچانک ہی ان کا منہ روٹی کے لئے ڈھیروں محبت اور ہمدردی مند آئی۔ ابھی چند لمحوں قبل ہی تو وہ ان سے روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ پہلے تو ایسے نہ تھے؟“ اور اب وہ خود بھی یہی سوچ رہے تھے۔ بیان کو روٹی سے محبت کرتے کرتے یکدم نفرت کیسے ہو گئی۔ اگر روٹی نے کوئی غلطی کی ہے یا کی تھی تو وہ محبت فری سے اس کو سمجھا سکتے تھے۔ اس کی اصلاح کر سکتے تھے مگر انہوں نے جو رویہ اختیار کیا کیا وہ مناسب تھا۔ وہ محض ان کی وجہ سے یقیناً شادی میں نہیں گئی۔ یہ روپ اس نے ان کو دکھانے کے لیے اپنایا تھا اور انہوں نے بجائے سراہنے کے نفرت کا اظہار کیا۔ معاذ انہوں نے جھک کر خود سے لپٹی روٹی کو دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اوپر اٹھایا۔ روٹی نے ان کی آنکھوں میں دیکھا پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”تب بلال بے ساختہ اس کے چہرے پر جھکے تھے۔“



ایک بجلی باہر گری تھی اور دوسری اس وقت بلال کے دل و دماغ پر۔ قبل اس کے کہ ان کی عمر بھر کی نیک نامی ضائع ہوتی کوئی ان کے اپنے ہی اندر سے پوری قوت کے ساتھ چلایا تھا۔

”نہیں بلال نہیں! یہ مت کرنا۔ یہ گناہ ہے۔“ اور بلال کا چہرہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ انہوں نے ایک نظر اپنے ہاتھوں کے پیلے لے میں موجود روٹی کے چہرے پر ڈالی۔ روٹی کے لبوں اور ان کے ہونٹوں کے درمیان صرف دو تین انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

”اُف! یہ میں کیا کرنے لگا تھا۔“ انہوں نے مذمت سے سوچا اور فوراً ہی روٹی کو چھوڑ کر رخ بدل لیا۔ دل میں سوچا گھر والے ان پر اعتبار کر کے اپنی جوان مٹی کو گھر پر اکیلا چھوڑ گئے تھے اور وہ بہک گئے۔ مگر صد شکر اللہ نے بچا لیا۔

”یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا بلال! تم ایسے تو نہ تھے۔“ روٹی نے حیرت سے بلال کے بدلے ہوئے روئے کو دیکھا۔ کچھ سوچا پھر دو قدم آگے بڑھ کر ان سے دوبارہ لپٹ گئی۔ بلکاب کے اپنے بازو بلال کی گرد لپیٹ کر اپنا چہرہ ایک بار پھر ان کے سینے میں چھپاتے ہوئے بولی۔

”آئی لو یو بلال! میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سے سچی محبت کرتی ہوں۔ میرا یقین کریں۔ لیکن یہ اچانک آپ کو کیا ہو جاتا ہے؟“ مگر بلال اب سمجھل چکے تھے۔ ایک نظر جھک کر خود سے لپٹی روٹی کو دیکھا پھر آہستگی سے اس کا بازو تھام کر خود سے الگ کرتے ہوئے بولے۔

”پلیز روٹی! اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ اکیلے روم میں مجھ ڈر لگتا ہے۔ آج میں یہاں آپ کے پاس رہوں گی۔“ روٹی نے ان کے ساتھ لگتے ہوئے کہا۔ تو بلال کو غصہ آ گیا۔ اب انہیں پتہ چلا گھر والوں نے روٹی کو ان کے سامنے آنے سے منع کیوں کیا تھا۔ سارے گھر والے اس کے کردار پر شک کرتے تھے۔ اس گھر میں رہتے ہوئے اس بات کا اندازہ تو ان کو ہو چکا تھا اور آج تجربہ ہو چکا تھا۔

انہوں نے جھک کر اپنے ساتھ لگی روٹی کو دیکھا پھر سختی سے اس کا بازو تھام کر پوری قوت سے دروازے کی جانب دھکیل کر شاید زندگی میں پہلی بار اونچی آواز میں نازیبا الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بولے۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تم واقعی آوارہ ہو۔ سنا تم نے ذیل لڑکی! تم آوارہ ہو۔ تمہارے گھر والے تمہارے بارے میں جو بھی کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اتنی ہی عمر میں تم کتنی پراگندہ ذہن کی لڑکی ہو۔ کتنے دنوں سے میں تمہاری حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ بال آخر آج اس بھگیکے موسم کا سہارا لے کر تم مجھے گمراہ کرنے چلی آئیں اور شاید میں بہک جانا مگر میرے خدا



نے مجھے بچالیا۔“ وہ رک کا ایک نفرت بھری نگاہ سامنے کھڑی روٹی پر ڈالی پھر زبردستی سے کہا۔

”میں مرد ہو کر تمہارے پاس نہیں آیا۔ ورنہ اس موسم کے تقاضے میں بھی سمجھتا تھا۔ یہ بھیگا موسم مجھ پر بھی اثر انداز ہو سکتا تھا۔“

ان کی آواز میں زبردستی بھرا ہوا تھا۔ مگر تم۔۔۔ تم عورت ہو کر مجھ سے رفاقت کی بھیک مانگ رہی ہو۔ مگر افسوس! تم اپنی یہ خواہش پوری کرنے بہت غلط جگہ آئی ہو۔ کیونکہ میں ایسا مرد نہیں ہوں کہ تم جیسی عورت کی حوصلہ افزائی کروں۔ تمہیں یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ جاؤ خدا کے لیے میرے روم سے چلی جاؤ۔“

روٹی دروازے کی بجائے پورے دروازے سے سیدھی سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی۔ سر میں شدید درد کا احساس ہوا مگر بجلی کی کڑکتی آوازوں کا شور ہر شے پر حاوی تھا۔ وہ چوٹ بھول کر پھر بلال کی جانب ہی آئی تھی کہ اس وقت بلال کے سوا کوئی اور ذی روح اس گھر میں موجود نہیں تھا جس کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتی جبکہ بلال تو اس کا محبوب بھی تھا۔ اگر رات وہ اس کے روم میں رہ بھی جاتی تو کیا فرق پڑتا۔ مگر وہ بکڑ گیا تھا کیوں۔۔۔؟

کڑکتی بجلی سے ڈر کر بلال سے لپٹنا ایک غیر ارادی فعل تھا اور اس کے بعد سب کچھ بلال کی جانب سے ہوا تھا۔ اب اگر وہ ان کی حوصلہ افزائی کے بعد دوبارہ ان سے لپٹ گئی تھی تو اس کا یہ مطلب ہو کر نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے گرے ہوئے الفاظ ادا کرتے۔ کیا کچھ نہ کہہ ڈالا تھا۔

”تم عورت ہو کر رفاقت کی بھیک مانگ رہی ہو۔“ کیا وہ عورت تھی۔ وہ ستر کا ٹھارہ سل کی ایک بہت پیاری اور بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے بے حد دکھ سے ماتھے پر ہزاروں ٹل ڈالے۔ سامنے کھڑے بلال کو دیکھا پھر منت کرنے والے انداز میں کہا۔

”بابر طوفان ہے، بجلی ہے، باطل ہے اور میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا مجھے ان سے بے حد ڈر لگتا ہے۔“ مگر اس سنگدل پر کچھ اثر نہ ہوا۔

”مجھے کوئی بہانہ نہیں سننا پس فوراً دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ پوری قوت سے دھاڑا۔

روٹی مارے خوف کا ایک بار پھر دروازے سے جا لگی۔ مگر روم سے باہر نہیں گئی تھی۔ اندر وہ قہر کا دیوتا بن کر بیٹھا تھا تو بابر طوفان با دوبارہ اس عروج پر تھا۔ مگر وہ اس کی مجبوری نہیں سمجھتا رہا تھا۔ کو کد باس کو بلال سے بھی خوف آنے لگا تھا مگر بابر طوفان زیادہ خوفناک تھا۔ وہ اس کی وجہ سے سکون محسوس کر رہی تھی۔

بلال نے اس کو یونہی ڈھٹائی سے کھڑے دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے زبردستی باہر لے آئے اور پھر اس کو صحن میں چھوڑ کر خود جلدی سے روم میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ بابر وہی طوفانی موسم تھا۔ جیسے بہت سے بھوت اور چڑیلیں اس کمرچرخے میں گھومتی رہیں۔ اپنی اس قدر بے عزتی اور توہین کا روبرو کچھ زیادہ احساس نہ تھا۔ وہ ساری بے عزتی بھول کر ایک بار پھر بلال کے روم کا دروازہ پیٹنے لگی۔

”پیلیز بلال! دروازہ کھول دیجئے۔ امی آپ آئیں تو ان سے پوچھ لیجئے گا۔ مجھے اس موسم سے بچپن سے ڈر لگتا ہے۔“ بات ختم کر کے وہ ہلکے ہلکے کر رونے لگی۔ مگر بلال پر کچھ اثر نہ ہوا اور روٹی غصے میں آ کر پتا سر زور زور سے دروازے پر مارنے لگی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور پھر بلال نے دوزخا لے کر پھٹ کر روٹی کے منہ پر رسید کیے اور دانت پیس کر بولے۔

”تم ایک بد کردار اور آوارہ لڑکی ہو۔ تم نہیں جانتی عورت کے پاس فقط ایک عزت ہوتی ہے۔ وہ بھی نہ ہے تو اس میں اور بازاری میں بیٹھی ہوئی عورت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔“ وہ بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ کیا کچھ نہ کہہ ڈالا تھا اس نے۔ اس قدر توہین اس قدر بے عزتی وہ جوابی تک باطل بجلی سے بھی کھڑی تھی۔ بلال کی اس قدر گری ہوئی باتیں سن کر گویا اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ آنکھوں سے بہتے آنسو رگ گئے۔ وہ حیرت سے منہ پھاڑے بلال کو دیکھ رہی تھی۔

”یہاں کھڑی میری شکل کیا دیکھ رہی ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ کیوں اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی گناہگار کرتی ہو۔ میں تمہاری خواہش پوری نہیں کر سکتا۔“ یہ کہہ کر بلال نے دروازہ پھر بند کر لیا۔ مارے غصے کے ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ لڑکی آج ضرور مجھ سے کچھ کروا کر رہے گی۔

”اف! اس قدر بے عزتی۔ اس قدر غلیظ باتیں۔“ وہ چند لمحوں کے دروازے کو دیکھتی رہی پھر بھاگتی ہوئی آ کر صحن کے وسط میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ بلال کی باتیں نہیں آگ کے شعلے تھے۔ جس نے اس کے اندر بابر ایک آگ سی لگا دی تھی۔ کیا الفاظ تھے؟

”تم جیسی عورتیں رات کا حسن تو ہو سکتی ہیں، رات کی دلکشی میں اپنی خوبصورت اداؤں سے اضافہ تو کر سکتی ہیں مگر۔۔۔ مگر دن کے آجائے میں کوئی شریف مرد تمہیں اپنی شناخت نہیں بنا سکتا۔ تمہارے وجود کو اپنانا نہیں دے سکتا۔ حتیٰ کہ دوسروں کی موجودگی میں ایسی عورتوں سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ تم جو سوچ کر آئی ہو۔ تم جو چاہتی ہو۔ اگر میں وہ سب کر



ڈالوں تو تمہارے پاس سوائے ذلت کے کیا رہ جائے گا۔“

نہیں نہیں! وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر زور سے چلائی۔ پھر اس نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بال نوچ ڈالے۔ دوپٹہ بھاڑ دیا۔ پاس پڑی دوسری چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھیلتی رہی۔ اپنے چہرے پر خود ہی تھپڑ مارتی رہی۔ بلال کی بات نے اس کے اندر ایک آگ سی لگا دی تھی۔ اس کو لگ رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود شعلوں کی زد میں آ گیا ہو۔ محبت، ڈر، نفرت، خوف اس کے اندر سے ہر احساس مٹ گیا تھا۔ وہ صحن میں چکراتی ہوئی بارش میں بھیگتی رہی۔ مگر اس کے اندر جلنے والی آگ سنا بھی اور نا ہی سماعتوں میں سنائی دینے والا بلال کی باتوں کا شور کم ہوا۔ وہ یوانگی کے عالم میں صحن کے چکر کاٹی رہی۔ کبھی اٹھتی، کبھی بیٹھتی مگر ہر اطراف میں ایک ہی شور تھا۔ ایک ہی جملہ تھا۔

”تم آوارہ ہو۔ سناتم نے؟ تم آوارہ ہو۔“ امی جب اس کو آوارہ کہتی تھیں تو روٹی کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر اتنا برا بھی کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ مگر آج بلال کے منہ سے سن کر وہ پاگل ہو گئی تھی۔ ایک ناقابل برداشت اذیت تھی جو اس کوڑپا رہی تھی۔ اسی حالت میں اپنے روم میں آئی اور بستر پر اوندھے منہ لیٹ کر رونے لگی اور پھر یونہی روتے روتے خود سے بے خبر ہو گئی۔

صبح ہوئی تو طوقان تھم چکا تھا۔ مگر موسم اب بھی ابرا آلود ہی تھا۔ بلال اپنے روم سے باہر آئے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر نماز کے لیے مسجد چلے گئے اور جب واک سے فارغ ہو کر گھر آئے تو گھر میں پہلی سی ویرانی تھی۔ لیکن کاہنہ آواز نہ تھا۔ صحن میں دو لگ ٹوٹے پڑے تھے اور کچھ دوسرا سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔

بلال نے رک کر روجی کے کمرے کی جانب دیکھا تو اس کا ہوا زہ بھی بند تھا۔ بلال نے سوچا وہ تو ابھی تک سو رہی ہے یا پھر اپنی رات والی حرکت پر شرمندہ ہو گئی۔ اس لیے سامنے نہیں آ رہی۔ وہ اپنے روم میں آئے اور لباس بدل کر ناشتے کا انتہار کیے بغیر نام سے پہلے ہی گھر سے نکل آئے۔ وہ خود بھی اب روٹی کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ رات جو کچھ ہوا تھا وہاں کو روٹی سے دور کرنے کا باعث بن گیا تھا۔

رات کو وہ محض روٹی کی وجہ سے لیٹ گھر آئے تھے تا کہ ان کے گھر پہنچنے سے پہلے گھر والے شادی سے واپس آ چکے ہوں گے تاہم جب وہ گھر آ رہے تھے تو بھی ان کو گھر کے باہر ہی مل گئے۔ وہاں سب سے باتیں کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو گھر وں کی ہی حالت میں تھا جیسی حالت میں وہ صبح چھوڑ کر گئے تھے۔ ٹوٹے ہوئے برتن اور سامان یونہی ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا اور صفائی بھی ہونے والی تھی۔

گھر کی یہ حالت دیکھ کر اور ٹوٹے لگے دیکھ کر شمشاد بیگم کو غصہ آ گیا اور وفرت سے بولیں۔

”ارے! یہ روٹی کی بخت گھر پر ہی تھی..... پھر صفائی کیوں نہیں کی اس نے۔“

”بلال بھلا کیا جواب دیتے۔ وہ تو خود صبح بغیر ناشتے کے چلے گئے تھے اور ابھی ابھی ان سب کے ساتھ ہی ان کی واپسی ہوئی تھی۔“ روجی نے نجانے کیا سوچ کر بلال سے پوچھا۔

”بلال صبح ناشتہ بھی ملا تھا یا نہیں؟“

”اپنی ایسی قسمت کہاں۔“ بلال نے مسکرا کر کہا۔ پھر وضاحت کی۔ ”ویسے میں صبح کچھ جلدی ہی چلا گیا تھا۔ تب شاید روٹی سو رہی تھی۔ تاہم کل رات کا کھانا ضرور کھایا تھا۔“

”ارے روٹی کی پٹی، کی بخت کہاں مر گئی ہو جو..... جواب نہیں دیتی۔“

شمشاد بیگم نے بے حد غصے سے روٹی کو پکا مگر جواب میں کہری خاموشی تھی۔ یوں کو یا روٹی گھر میں موجود ہی نہیں تھی۔ جب بہت بار پکارنے پر بھی روٹی باہر نہ آئی تو شمشاد بیگم نے روجی سے کہا۔

”جاؤ روجی دیکھو تو سہی کیا کر رہی ہے۔ کہیں سو تو نہیں رہی۔“ ماں کی بات سن کر روجی اندر جانے لگی تو بلال نے سوچا۔

ہو سکتا ہے وہ میری وجہ سے باہر نہ آ رہی ہو۔ میرا سامنا نہ کرنا چاہتی ہو۔ مجھے فوراً اپنے روم میں چلے جانا چاہیے۔ مگر شمشاد بیگم ان کو شادی کا قصہ سنانے بیٹھ گئی۔ دوپہر کی بات تھی۔ بارہ بجے کا نام رکھا گیا تھا جبکہ بارہ آئی چار بجے۔ ابھی ابھی رخصتی ہوئی اور رخصتی ہوتے ہی ہم گھر چلے آئے۔

روجی اپنے روم میں آئی تو دیکھا روٹی اپنے بستر میں بے ہوش پڑی تھی۔ وہ بھی اس حالت میں کہ اس کے جسم پر گیلیا لباس تھا۔ روٹی کی یہ حالت کیسے ہوئی؟ روجی نے سوچا اور پھر اچانک ہی اس کے بل میں روٹی کے لیمو پھروں، ہمدردی کے بے پناہ جذبات پیدا ہو گئے۔ کچھ بھی ہوا خرمی تو بہن ہی اور پھر جس طرح اس نے ان کے دازوں پر..... پردہ ڈال



کبر بار اس کی عزت بچائی تھی۔ اور ماں کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھوں سے بھی مار کھائی تھی۔ وہ معمولی بات نہ تھی۔ اس نے جھک کر روٹی کے چہرے پر ہاتھ بھیرا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے چیخ کر آواز دی۔

”امی جان! یہاں آئیں، روٹی تو اپنے بستر میں بے ہوش پڑی ہے۔“

روح کی بات سنتے ہی سب گھر والے پریشانی کے عالم میں بھاگتے ہوئے روح کے روم میں آئے۔ مجبور بلال کو بھی ان کے ساتھ آنا پڑا اور اندر آ کر بلال نے دیکھا روٹی کچھ بھی اوڑھے بغیر بستر پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے سیاہ سلکی چمکیلے بال نیچے پر کھڑے پڑے تھے۔ شاید یہ رات ہی سے ایسی حالت میں یہاں پڑی ہے۔ مگر لباس گیارا کیسے ہوا۔ پہلی بار بلال نے سوچا۔ پھر شمشاد بیگم کی آواز سن کر چونک پڑے۔

”بلال جب تو صبح گھر سے گیا یہ کیسی تھی؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میں نے آپ کو پہلے بتایا تو تھا کہ میں آج ذرا جلدی چلا گیا تھا۔ تب کچن اور روحی کدوم کے دروازے بند تھے۔“

”اچھا شمشاد بیگم نے کہا۔ وہ پھر وہیں روٹی کے قریب بستر پر بیٹھ گئیں۔ تو نصیر صاحب نے روٹی کو دیکھتے ہوئے سلمان سے کہا۔

”جاؤ سلمان تم جلدی سے ڈاکٹر کو لے کر آؤ۔ نجائے کب سے بچی بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔“

سلمان کی بات سنتے ہی ڈاکٹر کو لینے چلا گیا تو وہ خود بھی روٹی کو دیکھتے ہوئے اپنے روم میں چلے گئے تو شمشاد بیگم کہنے لگی۔

”موسم توکل دوپہر کو اچانک ہی خراب ہوا تھا۔ جب ہم گھر سے گئے تب تو ٹھیک ہی تھا۔ اور پھر رات میں بارش کے ساتھ طوفان بھی آ گیا۔ سچی بات ہے میں تو وہاں روٹی کا سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ وہ تو اکیلے میں بہت ڈر رہی ہوگی۔ وہ تو بچپن ہی سے ایسے موسم سے خوف کھاتی چلی آ رہی ہے۔ پر مجبوری تھی۔ آ نہیں سکتی تھی۔“ حمیدہ بیگم کی بات سن کر بلال چونک پڑے۔ پھر پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”وہ دراصل روٹی بچپن ہی سے بڑی ڈر پوک واقع ہوئی ہے۔ ذرا سا بھی موسم خراب ہو تو روٹی کی جان پر بن جاتی ہے۔ کبھی امی کے پاس جائے گی۔ کبھی میرے پاس آئے گی۔ ایسے موسم میں وہ اکیلی ہر گز نہیں سوتی۔ اور کل رات تو خاصا بڑا طوفان تھا اور ساتھ طوفانی بارش بھی اور گھر میں روٹی بھی اکیلی، ڈر گئی ہوگی مگر۔۔۔۔۔“ روحی نے رک کر غور سے پھر روٹی کو دیکھا اور کہا۔ مگر سمجھ نہیں آتی یہ بھیگ کیسے گئی۔ اب بلال بھلا ان کو کیا جواب دیتے۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہے تھے۔

”اوہ! تو وہ واقعی موسم سے خنجر دھگی۔“ اتنے میں سلمان قریبی شاپ والے ڈاکٹر کو لے کر آ گیا۔

ڈاکٹر نے آتے ہی روٹی کو چیک کیا پھر انجکشن بھرتے ہوئے بتایا زیادہ فکر کی بات نہیں بارش میں بھیگنے سے سردی لگ چکی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ حالت ہوئی۔

انجکشن لگنے کے تھوڑی دیر بعد ہی روٹی کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اس کو چیک کیا۔ پھر ضروری ہدایت دیتا ہوا سلمان کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ میڈیسن دینے کے لیے اور جانے سے پہلے یہ بھی کہہ گیا۔ سب سے پہلے گیارا لباس بدل دیں۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد روٹی نے پوری آنکھیں کھول کر روم میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ امی، آبی، زوٹی کے ساتھ دماز قد بلال نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی روٹی کو ناقابل برداشت اذیت کا احساس ہوا اور اس اذیت سے بچنے کیلئے روٹی نے مارے کرب کفر آ آنکھیں بند کر لیں اور سوچا۔

’رات جو گھاؤ بلال نے میری روح پر لگائے ہیں یہ گھاؤ تو تمام عمر ہی ہرے رہیں گے۔ گزرتا وقت بھی ان کو کبھی نہ بھرسکے گا۔ میرے اندر جو آگ آپ نے لگائی ہے یہ تو میرے مرنے کے بعد بھی نا بجھ سکے گی۔ میری جو بے عزتی اور توہین ہوئی ہے وہ مجھے زندگی کی آخری سانس تک یاد رہے گی۔ کاش بلال آپ بھی آصف اور تو صیف کی طرح میری امی سے میری شکایت کر دیتے اور وہ مجھے ہمیشہ کی طرح برا بھلا کہہ کر میری پٹائی کر کے مجھے جھوڑتی اور بات ختم ہو جاتی مگر۔

مگر آپ نے تو سنگدلی اور بے رحمی کی حد کر دی۔ لفظوں کے جو گھاؤ اور نثر آپ نے میرے دل اور روح میں اتار دیئے ہیں ان کی اذیت مجھے ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ رات کو جو کچھ ہوا۔ یقین کرو میں اس کو کبھی نا بھول سکوں گی۔ تم نے تو میرے اندر سے ہر جذبہ جلاؤ والا، مٹاؤ والا۔ دوستی محبت کچھ بھی تو نہیں بچا۔ مجھے بتاؤ کیا بلال! اتنی ذلت اٹھانے کے بعد میں



جی پاؤں گی۔ وہ آنکھیں بند کیے مسلسل سوچے جا رہی تھی جبکہ ڈاکٹر کے جانے کے بعد حمیدہ بیگم نے محبت سے روٹی کے سر پر ہاتھ بھرتے ہوئے پوچھا۔  
 ”روٹی یہ تجھے کیا ہوا اور تم بھیک کیسے گئیں؟“

روٹی نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ دیکھ کر بلال جانے لگے تو روجی نے جو روٹی کے قریب کھڑی اور اس کو غور سے دیکھ رہی تھی بلال کو جاتے دیکھ کر پکارا۔

”بلال! ذرا دیکھنا تو یہ روٹی کے چہرے پر نشان اور سوجن کیسی ہے۔ یوں نہیں لگتا جیسے کسی نے روٹی کے چہرے پر پتھر مارے ہوں۔ سارا چہرہ سرخ ہو رہا ہے؟“

”کون پتھر مار سکتا ہے روٹی کو؟ گھر میں بلال کے سوا تو کوئی تھا ہی نہیں۔ تمہارا داغ درست ہے؟“ حمیدہ بیگم نے غصے سے کہا۔ چہرہ بخار کی وجہ سے سرخ ہو گیا ہے۔ مگر روجی یہ سوچ کر ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ ان کی نظر کمزور ہے ہو سکتا ہے ان کو یہ نشان نظر نہ آ رہے ہوں۔ بولی۔

”بلال! تم ذرا دیکھو تو سہی بادل خواستہ بلال مڑ کے روٹی کی جانب آئے۔ پھر جھک کر روٹی کے چہرے کو غور دیکھا جہاں ان کی ہتھیلیوں کے نشان تھے اور یہ نشان تو دور سے بھی نظر آ رہے تھے۔“ خالہ جان کو نجانے کیوں دکھائی نہیں دیئے۔ انہوں نے سوچا۔ مگر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

معا روٹی نے آنکھیں کھول کر خود پر جھکے ہوئے بلال کی آنکھوں میں چند پل دیکھا۔ پھر مارے کرب کے آنکھیں بند کر لیں اور پھر یہ روٹی کا کرب روٹی کے سارے چہرے پر پھیل گیا اور آنکھوں میں کی اتر آئی۔

یہ دیکھ کر بلال جلدی سے سیدھے ہوئے اور روجی کی بات کا جواب دیئے بغیر فوراً اپنے روم میں چلے آئے۔ اور روم میں آ کر انہوں نے خود کلامی کا لانداز میں کہا۔  
 ”معاف کرنا روٹی! یہ نشان، یہ داغ چند روز بعد ختم ہو جائیں گے مگر جس بڑے داغ سے میں نے تمہیں بچایا ہے اگر وہ لگ جاتا تو تم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتی کہ میں اول آخر ایک مر رہتا۔“

اس پر یہ بھیگاموسم اور رات کی تنہائی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی اس موقع کو بس نہ کرتا۔ وہ تھوڑے سے شرب ہوئے تھے روٹی کے اس طرح دیکھنے پر۔ وہ اپنے انداز میں بے چینی محسوس کر رہے تھے۔

بلال کے جانے کے بعد حمیدہ بیگم نے روجی سے کہا۔  
 ”روٹی جاؤ اور بہن کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ۔ صبح سے بھوکی ہے۔ پلاؤ لے کر آؤ روٹی کے لیے یا پھر پوچھ لو اس سے وہ کیا کھائے گی۔ میرا خیال ہے تمہاری چچی نے نان اور فورمہ بھی ساتھ دیئے تھے۔“ روجی کے جی جہاں کہنے پر انہوں نے روٹی سے پوچھا۔

”روٹی نان اور فورمہ کھاؤ گی یا پلاؤ؟“ روٹی پھر بھی چپ رہی۔ وہ اپنے اندر بے حد کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر حمیدہ بیگم نے کہا۔  
 ”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تم ایسا کرو گرم دودھ کے ساتھ بریڈ لے آؤ اور ہاں روٹی کو ساتھ لے جاؤ اور بلال کو بھی کھانا بھیج دو۔“  
 ”جی امی! روجی نے کہا اور روٹی کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ تو سلمان میڈیسن لے کر آ گیا۔ خود وہاں بیٹھنے یا روٹی کو دیکھنے کی بجائے میڈیسن ماں کے حوالے کر کے ان کو سمجھا کر وہ اپنے روم میں چلا گیا۔“ ہر خوراک چار گھنٹے بعد دینی ہے، وہ بھی دودھ کے ساتھ۔“

روٹی جب تک دودھ اور سلاؤس گرم کر کے لائی تب تک حمیدہ بیگم روٹی کو گیلے لباس کی جگہ دوسرا لباس پہنا چکی تھی۔ ان کو اس وقت روٹی پر ترس اور پیار ایک وقت آ رہا تھا۔ وہ اب بہت اچھی اور نیک بچی بن چکی تھی۔ پانچ وقت نماز پڑھتی تھی اور صبح کو قرآن پاک بھی لازمی کھوتی تھی اور پھر چپ چاپ سارا وقت گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ روجی گرم دودھ اور سلاؤس لائی تو انہوں نے اپنے سامنے بٹھا کر روٹی کو کھلایا۔ میڈیسن کی پہلی خوراک بھی خودی۔ روجی کو روٹی کا خیال رکھنے کا کہہ کر اپنے روم میں چلی گئیں۔

☆☆☆☆

بلال جب ایسٹ آباد سے روجی کے گھر آئے تو غزالہ ایک روز قبل ہی اپنی والدہ کے ساتھ کراچی اپنے خالہ کے گھر جانے کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ ایک ماہ کراچی میں رہنے کے بعد وہ جب لاہور واپس آئی تو دوسرے ہی دن روجی کو ملنے اور گفت دینے ان کے گھر آئی۔ کافی دیر بیٹھنے اور کراچی میں بیتے پل پل کے قصے سنانے کے بعد جب وہ واپس اپنے گھر جا رہی تھی۔ تب اچانک بلال گھر میں انٹر ہوئے۔ غزالہ نے چونک کر بلال کو دیکھا اور تب تک حیران و ششدر رہتی رہی جب تک وہ ڈرائنگ روم میں چلے نہیں گئے۔ پھر پاس کھڑی



روحی سے پوچھا۔

”روحی یہ ہیر کون تھا؟ کیا زبردست پر سنائی ہے جناب کی۔“

”پرویز ہیر نہیں۔“ روحی نے ہنس کر پوچھا؟

”وہ بس سو سو ہے مگر یہ تو دیکھتے ہی دل میں اتر گیا۔“ غزالہ نے بے باکی سے کہا۔

”منہ دھو کر رکھو۔ وہ تمہارے کام کی چیز نہیں۔ بہت نیک اور شریف بندہ ہے۔ ویسے بھی پنجابی نہیں پنچان ہے۔ امی کی منہ بولی بہن کا بیٹا ہے اور ایسٹ آباد سے اپنا کوئی تقسیمی کورس مکمل کرنے لاہور آیا ہے۔ جس دن تم اپنی امی کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہوئی تھی اس کے دوسرے ہی روز توبال آیا تھا۔ بہت اچھا، سادہ منہ ہے اور پانچ وقت کا نمازی بھی۔“

روحی نے وضاحت سے بتایا۔

”ارے! بہت دیکھے ہم نے نیک اور شریف بندے۔ تم ذرا اس کو باہر بلا کر میرا تعارف کروادو پھر میں تمہیں دکھاؤں گی وہ کتنا نیک اور شریف بندہ ہے۔“ غزالہ نے اپنے سابقہ تجربہ کی بنا پر کہا۔

”یکو اس مت کرو۔ وہ واقعی بہت نیک اور شریف ہے۔“ روحی نے پھر کہا تو غزالہ بولی۔

”اگر یہ بات ہے تو مجھے بھی ضد ہے میں تمہیں دکھا کر رہوں گی مگر صرف مرد ہوتا ہے۔ نیک شریف یہ لفظ صرف لڑکیوں کے لیے سوٹ کرتے ہیں۔ مجھے جلدی سے بتاؤ یہ گھر میں کب موجود ہوتا ہے تاکہ میں تمہیں اس کی شرافت کھل کر دکھا سکوں۔“ غزالہ نے کچھ غرور سے کہا۔

”بہت کمینی ہو۔ باز نہیں آؤ گی۔ وہ صرف چھٹی والے روز گھر ہوتا ہے۔“

”چھٹی والے روز میں لازمی آؤں گی۔ بس تم اپنے امی ابو کو کہیں بھجوانے کا انتظام کرو اور وہ موجود ہوئے تو بات نہ بن سکے گی۔ میں دوپہر کے کھانے پر آؤں گی۔“ غزالہ نے اپنا پروگرام بتایا۔

”اوکے! امی ابو کا بندوبست میں کر لوں گی۔ تاہم بلال کی جانب سے میں ابھی تم سے شرط لگاتی ہوں کہ تم ہار جاؤ گی۔ تم نے اس کو صرف آج بلکہ ابھی دیکھا ہے جبکہ میں اس کو پورے ایک ماہ سے دیکھ رہی ہوں۔“ روحی نے پورے یقین سے کہا۔

”اگر میں جیت گئی تو؟“ غزالہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”تو پھر میں تمہیں کوک کی ایک بوتل پلا دوں گی۔“ روحی نے نفوراً ہنس کر کہا۔

”یہ لڈو کی گیم نہیں جو تم کوک کی ایک بوتل شرط لگا رہی ہو۔ شرط ذرا وزن دان ہونی چاہیے۔“ غزالہ بہت اور ہورہی تھی۔

”پیور کلفٹ کا وہیٹ نلگا لیں جو پرویز نے تمہیں گفت کیا تھا۔“ روحی نے ذومعنی انداز میں پوچھا۔

”ہاں کے بعد جوابی سیٹ کہاں سے لا کر دو گی۔“ غزالہ کو اپنی جیت کا مکمل یقین تھا۔ وہ تو کراچی بھی ایک عدد محبت کرکاتی تھی۔

”میں ہاری تو تب نا۔“ روحی نے پھر ہنس کر کہا تو غزالہ بولی۔

”یکو اس مت کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ سیٹ کے بدلے سیٹ دیتی ہو اور میری ہار کا خیال دل سے نکال دو۔“ مگر روحی کو اپنی مکمل جیت کا یقین تھا۔

”اچھا بھئی! یہ بات ہے تو تم میرا منگنی والا سیٹ لے لیا اور پھر میری شادی پر مجھے گفت کر دینا۔ ٹھیک ہے نا۔“

”بالکل ٹھیک۔ منگنی والا سیٹ تو میرے ذہن سے نکل چکا تھا۔“ غزالہ نے خاصے جوش سے کہا۔

”ویسے مجھے مکمل یقین ہے کہ اس کی نویت نہیں آئے گی۔ کیا خیال ہے؟“ روحی نے مسکرا کر پوچھا اور غزالہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بات بکی کر دی اور اپنے گھر چلی گئی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ چھٹی والے روز امی ابو بلال کے ساتھ کھانے پر لازمی موجود ہوتے تھے۔ ان کو گھر سے باہر بھیجنے کے لیے روحی نے گلد ولفون کر کے ساری بات بتائی۔ پھر کہا۔



”اب تم کسی بہانے سے ان کو اپنے یہاں بلاؤ۔“ اور جواباً گڈو نے کہا۔

”ارے! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ مجھ تو تمہارا کام ہو گیا اور فون بند کر دیا۔“ روجی کے گھر میں فون ابھی تک نہیں لگا تھا۔ فون اس نے منوری خالہ کے گھر سے کیا تھا اور اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

چھٹی والے روز حسب وعدہ غزالہ عین اس وقت روجی کے گھر آئی جب دسترخوان لگ چکا تھا اور سبھی لوگ کھانے میں محو تھے۔ ان میں بلال کے ساتھ ساتھ سلمان بھی تھا جبکہ امی ابو ماموں کے ہاں جا چکے تھے۔ گڈو نے منوری خالہ کے گھر فون کر کے پیغام دیا تھا۔ ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ پھوپھو کو یاد کرتے ہیں۔ ان سے کہیے کل چھٹی ہے پھوپھو پھلانی کو ساتھ لے کر ضرور آئیں اور حمیدہ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی شوہر کو ساتھ لے کر جلی گئی تھیں۔ اور غزالہ خوب اچھا سا سوٹ پہن کر پورا میک اپ کر کے آئی تھی۔ غزالہ کو دیکھتے ہی روجی نے کہا۔

”غزالہ یہ بلال ہے۔ امی کی منہ بولی بہن کا بیٹا ہے اور ایسٹ آباد سے آیا ہے۔“

”بلال یہ غزالہ ہے۔ میری کلونی دوست۔“

روجی کی بات سن کر سر جھکا کر محویت سے کھانا کھاتے بلال نے چہرہ اٹھا کر غزالہ کی جانب دیکھا غزالہ نے فوراً ایک داد سے پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بلال کو سلام کیا۔

”علیکم سلام! غزالہ بہن کیسی ہیں۔“ بلال نے بڑی عزت اور احترام سے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں بھائی جان۔“ غزالہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس کے بعد کو یہ ساری بات ہی ختم ہو گئی تھی۔

بلال پھر سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے اور روجی نے بمشکل اپنا قبضہ حلق کا بند روکا تھا۔ اس کے بعد غزالہ بھی ان کے ساتھ خاموش سے کھانے میں شامل ہو گئی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی بلال ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ سلمان بھی ان کیساتھ ہی چلا گیا تھا اور ان کے جاتے ہی روجی، روہی کو برتن سمیٹنے کا کہتے ہوئے غزالہ کو ساتھ لیتے ہوئے اپنے روم میں چلی گئی۔ روم میں آتے ہی اس نے جو غزالہ کی شکل دیکھتے ہوئے ہنسنا شروع کیا تو ہنسی ہی چلی گئی۔ مگر غزالہ نے برا نہیں منایا تھا بلکہ اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

”یار! زندگی میں پہلی بار کسی شریف مرد کو دیکھا ہے۔ واقعی بہت شریفہ بندہ ہے۔“ غزالہ نے تعریف کی۔ پرویز کا دیا ہوا پورک لٹڈ کا سیٹ اب سمجھو تمہارا ہوا۔

”ارے! نہیں نہیں۔ مجھے معلوم تھا تم ہار جاؤ گی۔ وہ تو یونہی ایک بات کی تھی میں نے۔“ روجی نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”خیر اب نہیں تو تین ماہ بعد تمہاری شادی پر تمہیں گفت کروں گی۔“ غزالہ نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ چلی گئی تھی۔ اس کے بعد جب بھی غزالہ آتی اور اگر اتفاق سے بلال کے ساتھ سامنا ہو جاتا تو وہ خود ہی سلام کرنے میں پہلی کرتے ہوئے کہتی۔

”السلام علیکم! بھائی جان کیسے ہیں آپ اور سلام کا جواب دیتے ہوئے جواب بلال بڑے احترام سے پوچھتے۔

”آپ کیسی ہیں؟ غزالہ بہن۔“

اور آج روجی کی امی ان کے گھر کسی کام سے آئی تو بتایا روہی بہت سخت بیمار ہے اور گھر تنہا چھوڑ کر شادی میں گئے تھے۔ ہمارے گھر آنے سے پہلے ہی بیمار پڑ گئی۔ یہ سننے کے بعد غزالہ اسی سپر روہی کو دیکھنے ان کے گھر آئی تھی تو ڈیوڑھی میں باہر آتے ہوئے بلال سے ملاقات ہو گئی۔ غزالہ نے سلام کیا تو بلال نے جواب دیتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

”اب کے ہماری بہن بہت دنوں بعد آئی، خیریت تو تھی؟“

”بالکل خیریت تھی بھائی جان! وہ میری باجیاں اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی ہیں۔ ان کی وجہ سے گھر سے نکل نہ سکی۔ آج بھی روہی کو دیکھنے آئی ہوں۔ خالہ بتا رہی تھیں روہی بہت سخت بیمار ہے۔“

بلال نے ہوں کہا اور باہر نکل گئے۔ دل میں سوچا وہ ابھی تک بیمار ہے۔ لگتا ہے میری باتوں کا کچھ زیادہ ہی اثر لیا۔ انہیں ابھی تک اپنی غلطی کا احساس تک نہ تھا کہ ایک لڑکی کو سمجھانے کیلئے انہوں نے غلط طریقہ اختیار کیا تھا۔

”آج کیسے بھول پڑی بے مروت لڑکی۔“ روجی نے غزالہ کو دیکھتے ہی شکوہ کیا تو غزالہ بولی۔



”یار! بیاں اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی ہیں۔ ان کی وجہ سے ادھر ادھر سرکنے کا ذرا سا بھی نام نہیں ملا۔ آج بھی روپی کو دیکھنے آئی ہوں۔ خالہ بتا رہی تھیں کہ وہ سخت بیمار ہے۔“ غزالہ نے بتایا۔

”ہاں! وہ بیمار ہے۔“ روجی نے کہا اور غزالہ کو ساتھ لے کر اپنے روم میں آئی۔ روپی بستر میں لیٹی تھی۔ غزالہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے حال پوچھا۔

”اب ٹھیک ہوں۔“ روپی نے آہستہ سے کہا۔

”ہوا کیا تھا؟“ غزالہ نے بہت محبت سے پوچھا۔ اچھی طرح جانتی تھی۔ ایک بار اس کا الزام اپنے سر لے کر اس کی عزت بچانی تھی۔ حالانکہ اس کی شکایت کرنے والی بھی اس کی ماں تھی۔ وہ کہہ سکتی تھی یہ رقعہ میرے نہیں تمہاری بیٹی کے پیار نے دیا ہے مگر اس نے خاموشی ہی اختیار کی تھی۔

”کچھ خاص نہیں، یونہی ہمیشہ کی طرح باطل، بچکی، بارش سے ڈرتی تھی۔“ روپی نے ایک بار پھر آہستہ سے کہا۔

”روپی تم اتنی بڑی ہو کر باطل، بچکی سے ڈرتی ہوں۔“ غزالہ نے حیرت سے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تو روپی نے کہا۔

”یہ ڈرنا بس آخری بار کا تھا۔ اب کے بعد کبھی نہیں ڈروں گی۔ کلاب ہر ڈر، خوف میرے اندر سے اچانک ختم ہو گیا ہے۔“

غزالہ کچھ دیر یونہی باتیں کرتی رہی پھر روجی کے کہنے پر اٹھ کر باہر چلی آئی۔ مگر زیادہ دیر وہ باہر بھی نہیں بیٹھی تھی۔ جلد ہی وہ اپنے گھر واپس چلی گئی تھی۔

تقریباً ایک ہفتہ وہ سخت بیمار رہی۔ پھر اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اس روز چھٹی تھی اور روپی اپنی طبیعت پہلے سے زیادہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر وہ باہر جانے کا سوچ رہی تھی، معاہدہ سے آتی بلال کی آواز سن کر رک گئی اور پھر غور سے ان کی بات سننے لگی۔

”روجی کیا روپی تمہاری سگی بہن ہے؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”تمہیں کوئی شک ہے۔“ اس پر روجی نے ہنس کر پوچھا۔

”شک کیا۔“ بلال خفیف سا مسکرائے پھر کہا۔

”وہ اصل میں اس کی عادات تم لوگوں سے ذرا مختلف ہیں۔ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو بلال۔ کیا تم نے روپی کی کوئی غلط حرکت دیکھی ہے۔ بولو۔“ روجی نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں! بلال کے منہ سے بے ساختگی میں نکل گیا۔ مگر فوراً ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ یہی وجہ تھی فوراً سنبھل کر بولے۔“ نہیں خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ میں نے محسوس کیا ہے وہ تم لوگوں سے ذرا الگ لگ سی لگتی ہے۔ بلال نے روجی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر روجی بھی ایک نمبر کی تیز اور ہوشیار لڑکی تھی بلکہ بے حد مکار۔ اس پر روپی کا استعمال کرنے کے باوجود اس کی دشمنی میں پیش پیش تھی۔

وہ سمجھ گئی۔ کوئی بات ہوئی ضروری ہے جو بلال نے یہ بات کی ہے۔

معا روجی کو یاد آیا جب وہ لوگ شادی سے واپس آئے تو گھر کے صحن میں دو لگ ٹوٹے پڑے تھے اور کچھ سلمان بھی ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ جیسے کسی نے غصے میں آ کر خود برتن توڑے ہوں۔ سامان بکھیرا ہوا تھا اور جب وہ اندر آئی تو روپی بے ہوش تھی۔ اس کے چہرے پر نا صرف سوچن تھی بلکہ ہاتھوں کی تھیلیوں کے نشان بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اس کے چہرے پر کسی نے تھپڑ مارے تھے۔ اور اس وقت اس بات پر زیادہ غور اس لیے بھی نہ کیا گیا کہ گھر میں تو صرف بلال تھے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو ان نشانوں کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔ اور اب یہ بات چونکہ ناممکن تھی کہ بلال کے بارے میں تو ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس لیے بات آئی گئی ہو گئی اور اب وہ سوچ رہی تھی ضرور کوئی بات ہوئی جو پہلے بلال نے ہاں کہا پھر مکر گئے۔ مگر یہ مجھے نہیں جانتا۔ میرا نام بھی روجی ہے۔ میں بلال سے سچا اگلا کر رہی ہوں گی۔“ یہ سوچتے ہی بڑی چالاکی سے کہنے لگی۔

”بلال! تم نے مجھ سے کہا تھا تم ہمیشہ سچ بولتے ہو۔ اگر یہ بات ہے تو سچی سچی بتاؤ تمہارا اور روپی کے درمیان کوئی بات ہوئی ہے نا۔“ تو بلال خاموش ہی رہے۔ تو روجی کھل کر کہنے لگی۔

”جب ہم شادی سے فارغ ہو کر گھر واپس آئے تو صحن میں دو لگ ٹوٹے پڑے تھے جن میں یقیناً تم نے اور روپی نے کھانے کے بعد چائے پی ہوگی اور کچھ سلمان بھی بکھرا پڑا تھا



اور اندر کمرے میں روپی بے ہوش تھی اور اس کے چہرے پر تھپڑوں کے نشان واضح نظر آ رہے تھے۔ اس وقت تو بات امی کی مداخلت کی وجہ سے آئی گئی ہو گئی تھی اور تم بھی روپی کا چہرہ دیکھنے کے بعد کوئی تبصرہ کیے بغیر روم سے باہر نکل گئے تھے۔ حالانکہ میں نے تم سے جو کہا تھا وہ سچ تھا۔ روپی کے چہرے پر ہتھیلیوں کے نشان صاف صاف نظر آ رہے تھے اور یہ تھپڑ تمہارے سواروپی کو کون مار سکتا تھا کہ گھر میں تمہارے سوا کوئی تھا ہی نہیں۔ یقیناً تمہارے سواروپی کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ مگر یہ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا یہ صرف تم بتا سکتے ہو۔

روپی نے ایسا کیا کیا جو تم ایسا چھ انسان نے اس کو تھپڑ مارے۔ میرا تم سے سچا وعدہ ہے تمہاری بتائی ہوئی بات ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔“ روپی نے بات کچھ اس انداز سے کی تھی کہ بلال نے اب کے کچھ بھی چھپانا مناسب نہ سمجھا اور سب کچھ صاف صاف روپی کو بتا دیا اور بلال کہنے سے ساری کہانی سننے کے بعد روپی کہنے لگی۔

”بس بلال یہی وجہ تھی جو ہم گھر والوں نے روپی کو تمہارے سامنے آنے سے روکا۔ وہ ہر لڑکے کو دیکھتے ہی لولہ لکھ لگتی ہے۔ تمہیں اس نے لولہ لٹا لے لیا نہیں لکھا کہ تم گھر کے اندر موجود تھے۔ یہی وجہ ہے اس نے لٹیر لکھنے کی بجائے زبانی اپنا مدعا بیان کر دیا۔“ روپی کی بات سن کر بلال خاموش ہی رہے۔ یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ انہیں بھی لٹیر لکھ چکی ہے۔ وہ روپی کی سن رہے تھے جو کہہ رہی تھی۔

”ہم لوگ روپی کی وجہ سے سارا وقت پریشان رہتے ہیں۔ اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے ہم اس کو اپنے ساتھ شادی میں لے کر نہیں گئے تھے اور اس کمینے نے گھر کے اندر ہی ایسی حرکت کر دی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ذرا سنجیدگی سے سوچو عزت باقی رہتی۔ ہم لوگ سمجھ نہیں پائے وہ کئی کس پر ہے۔ اب مجھے دیکھو، زوپی کو دیکھو تم نے بھی کوئی غلط بات ہم میں دیکھی اور یہ روپی۔۔۔۔۔“ روپی بولنے پر آئی تو خود کو پارسا بنا کر اپنی ہر لوسٹوری روپی سے وابستہ کر کے بلال کو شادی بلکہ غزالہ والی بات بھی روپی سے ہی منسلک کر دی اور روپی کے بارے میں یہ ساری کہانیاں سن کر بلال فسوس سے سر ہلا کر رہ گئے اور دل میں سوچا وہ شادی کے لیے کتنی غلط لڑکی کا انتخاب کرنے لگے تھے۔ صد شکر کہ وہ سچ گئے۔

کمرے کے اندر چلتی ہوئی باتیں سنتی روپی کا خون کھول کر رہ گیا۔

روپی کی یہ ساری بکواس سن کر مگر قصور خود اس کا اپنا تھا۔ مسلسل خاموشی اختیار کرنے کی وجہ سے آج حالات اس کو ایسے مقام پر لے آئے تھے جہاں وہ کسی بھی بات کی وضاحت کرنے کے مقابلہ میں ہی وہ بے گناہ ہو کر بھی سب کی نگاہوں میں گناہگار اور محرم بن چکی تھی۔ اپنی بے بسی کا حساس اب روپی کو شدت سے ہونے لگا تھا۔

اس طوفانی رات کے بعد روپی بلال کے سامنے نہیں آئی تھی۔ جو کچھ بلال نے کیا تھا اور کہا تھا اس کے بعد وہ بلال کا سامنا کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے سارا وقت بیماری کا بہانہ کر کے خود کو روم میں مقید رکھتی۔ ماں آج کل اس پر بہت مہربان ہو چکی تھی۔ دن میں کئی بار اس کو کمرے میں دیکھنے آتی۔ خود کھانا بعد میں کھاتی پہلے اس کو اندر بھیجتی۔ لیکن اب جب بلال کے واپس جانے میں صرف دو روز باقی تھے جب روپی غصے میں بھری روم میں آئی اور تنہا ہی ہوئی ہوئی۔

”روپی بہت دیسٹ کر لیا اب تم ٹھیک ہو چکی ہو۔ چلو اٹھو اور گھر کا کام۔۔۔۔۔“ اور روپی جواب دیئے بغیر اٹھ کر باہر آ گئی۔ گھر بھر کی صفائی کرنے لگی۔ آخر میں جب وہ ڈیوڑھی صاف کر رہی تھی تو خلاف توقع بلال گھر آ گئے۔ اتفاق سے ان کا کام آج ہی مکمل ہو گیا تھا۔ انہوں نے کام کرتی روپی کو دیکھا تو قدم خود بخود ہی رک گئے۔ ان کو رکتے دیکھ کر روپی نے چہرہ ہاتھ کران کو دیکھا، پھر ان کو اپنی جانب دیکھتایا کہ چہرہ جھکا لیا۔

روپی کی باتوں کے بعد وہ انہیں اپنا چہرہ دکھانے کے مقابلہ میں کہاں بھی رہی تھی جو طوفانی رات میں پہلے ہی اس کی جانب سے غلط فہمی کا شکار ہو چکے تھے۔

بلال کچھ دیر حیرت سے کھڑے اس کو دیکھتے رہے، اس کے چہرے پر فسر دگی، حزن و ملال چھا گیا تھا۔ اس کے وہ ہونٹ جن پر دائمی مسکراہٹ ناچتی رہتی تھی مرجھا کر رہ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بسنے والی شوخی و شرارت کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ یہ اس کو کیا ہوا۔ وہ سوچ رہے تھے۔

روپی نے بلال کو مسلسل اپنی جانب دیکھتے پایا تو اٹھ کر اندر چلی گئی اور بلال چونک پڑے۔ پھر سر جھٹک کر یہ سوچتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے گئے کہ یہ بھی اب اس کی کوئی نئی چال ہو گئی۔ مگر مجھے کیا میں تو آج ہی واپس جا رہا ہوں۔

اسی رات وہ سب گھر والوں سے مل کر ایسٹ آباد کے لیے روانہ ہو گئے اور جاتے وقت شمشاد بیگم نے انہیں بطور خاص تاکید کی تھی کہ اگلے ماہ وہ صرف خود آئیں بلکہ سب گھر والوں کو ساتھ لے کر شادی پر لازمی آئیں اور بلال نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ وہ سب گھر والوں کو لے کر لازمی آئیں گے۔



اگلی صبح بلال اپنے قلعے کی اونچی دیواروں والی آبائی حویلی میں پہنچ گئے جو ایٹ آباد کی مشہور الیاسی مسجد کے قریب ہی تھی۔ ان کی یہ آبائی حویلی نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ بہت بڑی بھی تھی۔ خاندان کے لوگوں کا رہائشی حصہ پچھلی جانب تھا۔ سامنے کی جانب مردانہ تھا۔ ایک جانب ملازمین کے کوارٹر تھے۔ تو دوسری سائیڈ پر بہت بڑا باغ بھی اس حویلی کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا تھا۔ بلال کو دیکھتے ہی سب ملازموں نے سلام کیا اور رہائشی حصے میں بھی اطلاع پہنچادی کہ چھوٹے خان صاحب آگئے ہیں۔ یہ خبر سن کر سب ہی خوش ہوئے تھے کہ وہ دو دن قبل چلے آئے تھے۔

بلال حویلی میں داخل ہوتے ہی سیدھے اپنے بابا جان کے پاس مردانے میں آئے تھے اور ان کو سلام کرنے، گلے ملنے کے بعد ان کی خواہش پر وہیں بیٹھ گئے۔ وہاں ان کے کرنے کو بہت زیادہ کام تھا۔ دوپہر کے قریب بمشکل اجازت لے کر اٹھے اور جب زنا نہ حصے میں آئے تو ان کی والدہ بہت غصے میں تھیں۔ وہ سلام کرنے کے بعد گلے کرالگ ہوئے تو انہوں نے غصے سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے تم صبح صبح آگئے تھے مگر زنا نے میں اب آرہے ہو۔ تین ماہ بعد تم گھر واپس آئے ہو کیا یہ تمہارا فرض نا تھا کہ آتے ہی ماں کو سلام کرنے حاضر ہوتے۔“

”مجھے فسوس ہے امی جان! میں آتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ وجہ یہ کہ وہاں مردانے میں تو بابا کے پاس مسائل کا ایک ڈبیر تھا۔ بابا جان نے ہی مجھے مردانے میں روک لیا تھا۔ اب بھی بڑی مشکل سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ ویسے یہ بھائی جان آج کل کہاں ہوتے ہیں؟“ بلال نے وضاحت کرتے ہوئے کمال کے بارے میں پوچھا۔

”تمہیں کچھ بتایا نہیں انہوں نے۔“ بھابی نے ٹیپو کو کھانا کھلاتے ہوئے کہا اور بلال نے ان کو سلام کرتے ہوئے کہا۔

”انہوں نے اگر مجھے بتایا ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا۔“

”کمال کا ٹرانسفر تو لاہور ہو گیا ہے اور وہ آج کل لاہور جانے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔“ اب کے بیگم اخلاق نے محبت سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے بتایا۔ بلال کی وضاحت کے بعد ان کی غصے دور ہو گئی تھی۔

”آپ بھی ساتھ جائیں گی؟“ بلال نے پوچھا۔

”نہیں میں یہاں تمہارے پاس رہوں گی۔ بھلا بیٹی آبائی حویلی چھوڑ کر میں کہاں جاؤں گی۔“ انہوں نے کہا پھر پوچھا۔

”آئے ہائے! میری تو غصے میں مت ماری گئی۔ لاہور والوں کے بارے میں تو میں نے پوچھا ہی نہیں کیسے ہیں وہ سب لوگ۔ شمشاد کیسی ہے، بچے کیسے ہیں اور نصیر بھائی کیسے ہیں؟“ بلال نے ان کے سب سوال اطمینان سے سنے پھر بولے۔

”خالہ جان بھی اچھی ہیں اور خالو جان بھی اور بچے بھی سب ٹھیک ٹھاک ہیں اور وہ سب لوگ آپ سب کو سلام دعا کہتے تھے۔“

”ویکرم اسلام! میرا تم سے پوچھتی تھیں شمشاد؟“ بیگم اخلاق نے اشتیاق سے پوچھا۔

”جی امی جان! خالہ جان آپ کا کٹر پوچھتی ہی رہتی تھیں اور مجھے آتے ہوئے انہوں نے یہ تاکید کی تھی کہ روجی کی شادی پر گھر کے سبھی لوگ آئیں۔“ بلال نے بتایا۔

”اچھا! تو روجی کی شادی ہے۔ کب ہو رہی ہے یہ شادی؟ بہت پیاری اور لائق گھڑ پنچ ہے۔ روجی اور بہت زیادہ اخلاق بھی۔ پہلی بار مجھے یوں محبت سے ملی جیسے برسوں سے جان پہچان ہو۔“ بیگم اخلاق روجی کی تعریف کر رہی تھیں۔

”جی امی جان! آپ بالکل درست کہتی ہیں۔“ بلال نے ان کی بات کی تائید کی۔ پھر بتایا۔

”شادی اگلے ماہ ہے اور امی جان ان لوگوں نے مجھے بھی بہت محبت سے اپنے گھر تین ماہ رکھا۔ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ اپنے گھر سے دور غیروں میں ہوں میں۔“

”اسی لیے تو میں نے تمہیں ان کے یہاں بھیجا تھا۔ چلو اب روجی کی شادی کے بہانے کمال کا گھر بھی دیکھ لوں گی اور شادی میں شرکت بھی کر لوں گی۔ کیوں گل ٹھیک ہے نا۔“ انہوں نے بہو سے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک امی جان!“ گل نے ٹیکن سے ٹیپو کا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھابی جان! اب آپ سنائیں آپ کا کیا حال چل ہے؟“ بلال نے ٹیپو کو پیار کرتے ہوئے پوچھا جو کھانے سے فارغ ہو گیا تھا۔



”میں ٹھیک ہوں۔“ گل نے مسکرا کر کہا تو یگم خلاق بولیں۔

”بلال اب تم کو لازمی شادی کرنی ہوگی۔ گل ٹیپو تو کمال کے ساتھ لاہور چلے جائیں گے اور میں یہاں اکیلی رہ جاؤں گی۔ اگر تم شادی کر لو گے تو پھر تمہاری لہن تو ہوگی نامیرے پاس۔ میرا دل بہلانے کو۔“

بلال ماں کی بات سن کر خاموش رہے۔ نگاہوں میں یکدم روٹی کا گھنی اداسی والا سوکار چہرہ ابھرا تھا۔ جو ایسٹ آباد آتے ہوئے انہوں نے دیکھا تھا اور وہ چہرہ لاہور سے ایسٹ آباد آنے تک ان کو ڈسٹرب کرتا آیا تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا تھا۔ انہوں نے ہر بار سر جھٹک کر سوچا تھا ہوں اداکاری یا کوئی نئی چل ہوگی مجھے متاثر کرنے کیلئے۔ مگر میں متاثر ہونے والا نہیں۔

ادھر بلال کو خاموش دیکھ کر یگم خلاق کو تھوڑا حوصلہ ہوا کہ خاموشی پوری نہیں تو نیم رضامندی ضرور ہوتی ہے۔ اس لیے پھر کہنے لگیں۔

”بلال! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ امریکہ جانے سے پہلے تمہیں لازمی شادی کرنی ہوگی اور تمہاری غیر موجودگی میں..... میں تمہارے لیے لڑکی پسند کر چکی ہوں۔ اب میں تمہارا انکار نہیں سنوں گی، سنا تم نے۔“ انہوں نے رعب سے کہا۔

”اچھا امی جان! کر لوں گا مگر روجی کی شادی کے بعد۔“ بلال نے کہا تو یگم خلاق حیران و ششدری بلال کو دیکھتی رہ گئیں۔ ان کو امید نہیں تھی کہ بلال اتنی جلدی مان جائے گا۔ وہ تو بلال کے لاہور جانے سے پہلے سوچتی تھیں کہ بلال اور بلال کے بابا سے کہہ کر بلال کو شادی کے لیے رضامند کرائیں گی۔ مگر وہ تو خود ہی رضامند ہو چکا تھا۔ بل اس کے کہ وہ کچھ اور کہتیں خان اخلاق خان آگئے اور ان کو دیکھتے ہی گل نے ٹیپو کو آیا ماں کے حوالے کیا اور پھر بڑی خاموشی سے کھانے کا آغاز ہو گیا۔ کھانے کے بعد قبوہ پیتے ہوئے یگم خلاق نے بڑے خان صاحب کو بتایا۔ ”بلال نے شادی کے لیے اپنی رضامندی دے دی ہے۔“

”یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“ بڑے خان بھی خوش ہو کر بولے۔ ”اب تم جلدی سے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ ڈالو۔“

”میں اس کے لاہور جاتے ہی لڑکی پسند کر چکی ہوں۔“ یگم خلاق نے کہا اور پھر ان لڑکی کے بارے میں بتانے لگی۔ بلال بھی پاس بیٹھا خاموشی سے سنتا رہا۔

☆☆☆☆

روجی نے بلال کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو ہر بات سچی سچی بتا دے اور یہ کہ تمہارا یہ سچ میں کبھی بھی کسی کو نہیں بتاؤں گی اور بلال کی موجودگی میں اس نے یہ وعدہ نبھایا بھی تھا مگر اب جب بلال موجود نہیں تھا وہ اس ایسٹ آباد جا چکا تھا تو روجی کو بے چینی ہو رہی تھی کہ وہاں کو کیسے یہ بتائے کہ روٹی نے آصف اور توصیف کی طرح بلال کے ساتھ بھی غلط حرکت کی تھی۔ بلکہ بہت زیادہ کی تھی۔

ہوسکتا ہے وہ بلال کے ساتھ کیے گئے اپنے وعدے پر قائم رہتی مگر ماں کی روٹی کے ساتھ بڑھتی ہوئی محبت روجی سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ بلال کے جاتے ہی روجی نے طوفانی رات کے حوالے سے طعنے مارا کہ روٹی کی زندگی دوزخ بنا کر رکھ دی تھی۔ روٹی کی مسلسل خاموشی کے باوجود وہ گھر میں چلتے پھرتے اس کو سننا نہ کیلئے کہتی رہتی۔

”آوارہ نے خاندان کا اندر کیلا بر بھی کسی کو نہیں چھوڑا۔“ پھر وہ رک کر اس پر اس کا نگاہ ڈالتی اور جتانے والے انداز میں کہتی اور تو اور گھر آئے مہمان کو بھی نہیں چھوڑا۔ صرف ایک دن رات کے لیے تنہا چھوڑا تو مہمان سے ہی فری ہونے لگی۔ آوارہ تو مہمان ہی شریف تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہماری ناک تو کٹا دی تھی نا آوارہ نے۔“

روٹی اتنا کچھ سن کر بھی جواباً خاموش ہی رہتی تھی۔ بلال نے خود اس کے ساتھ جو کیا تھا وہی کیا کہ جانے سے پہلے ساری ستوری روجی کو سنا کر اس کی جان مزید عذاب میں ڈال گئے تھے۔ روٹی کے دل میں اب بلال کے لیے شدید ترین نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ اس کی خواہش وہ نہیں تھی جو بلال سمجھتے تھے۔ وہ تو صدا کی ڈرپوک تھی اور بارش، بجلی، مابل سے تو وہ بطور خاص ڈرتی تھی۔ اسی خوف کی وجہ سے وہ بلال کے پاس گئی تھی اور بجلی کے خوف سے وہ ناانستہ بلال سے لپٹی تھی۔ ناانستہ نہیں ہاں دوبارہ صرف یہ سوچ کر بلال کے سینے سے لگی تھی کہ نئی بات بکڑ نہ جائے کہ نہ ہوتے ہوتے بلال نے یکدم اپنا رویہ سر دکر لیا تھا۔

اس وقت جو بھی ہوا اس کا وہ مطلب ہر گز نہیں تھا جو بلال سمجھتے تھے۔ وہ تو صرف اپنے محبوب کی محبت حاصل کرنے کیلئے ان کے سینے سے لگی تھی کہ وہ واقعی بلال سے محبت کرنے لگی تھی اور محبوب اس کے جذبات سمجھنے کی بجائے غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے اس کی محبت یکدم ہی نفرت میں بدل گئی تھی۔ اور یہ سب روٹی کے حق میں بہت برا ہوا تھا۔ بلال



نے جو سخت اور سرد رویہ روپی کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ اس نے روپی کے اندر سے ہر نرم گرم جذبے کو جلا کر رکھ کر ڈالا تھا اور اب وہ بھی اور بلال کی نفرت۔ بلال تو کیا اب تو اسے دنیا کے ہر مرد سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ جس ناقابل برداشت اذیت کو سہہ رہی تھی وہی کیا کم تھی کہ اس پر روجی کا ناقابل برداشت رویہ وہاں اپنی اوقات بھول چکی تھی کہ ہر لڑکے کو خود ہی لے کر لکھنے میں پہل کرتی تھی۔

اس دن روپی کی طبیعت کچھ سا زنجیری۔ یہی وجہ تھی وہ پہر کے کھانے کے بعد وہ برتن صاف کرنے کی بجائے دل بہلانے کو ناول پڑھنے بیٹھ گئی۔ ماں کھانے کے بعد پیٹ میں گیس کا کہہ کر محلے میں پھرنے نکل گئی تھی۔ زوپی ٹیوشن پڑھنے اور روجی اپنے روم میں آرام کرنے چلی گئی تھی۔ مگر رات کی اس طوفانی رات کے بعد روپی کی نیند جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ اس لیے وہ پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔

سب پہر کو روجی اپنے لیے چائے بنانے اپنے روم سے باہر آئی۔ روپی برآمدے کے ستون سے ٹک لگائے پڑھ رہی تھی۔ روجی یکن میں آئی تو دیکھا ویسے ہی وہ پہر والے گندے برتنوں سے یکن بھرا پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر روجی کا موڈ خراب ہو گیا اور اس نے وہیں سے جھج کر کہا۔

”آوارہ! یہ برتن کیوں نہیں صاف کئے۔“ یہ سنتے ہی نجانے کیوں روپی کو غصہ آ گیا اور اس نے جواباً کہا۔

”آوارہ میں نہیں تم ہو۔ بات کرنے سے پہلے اگر اپنے اندر جھانک لیا کرو تو اچھا ہو اور برتن اگر میں نے صاف نہیں کیے تو تم خود کرو۔ تمہارے ہاتھ ٹوٹے ہوئے تو نہیں ہیں۔“ روپی کی بات سنتے ہی روجی دوڑ کر یکن سے باہر آئی اور روپی کو بالوں سے پکڑ کر ایک زوردار چھڑا اس کے چہرے پر رسید کرتے ہوئے بولی۔

”تمہاری یہ جرات کہ تم مجھے آوارہ کہو۔ اس گھر میں آوارہ صرف تم ہو۔“ وہ دوبارہ اس کے منہ پر چھڑا مارتے ہوئے بولی۔ اسی وقت شمشاد بیگم گھر میں داخل ہوئیں۔ روجی کی آخری بات بھی سن لی اور چھڑا مارتے بھی دیکھا تھا۔ یہ سارا منظر دیکھ کر زندگی میں پہلی بار روجی پر سخت غصہ آیا۔ یہی وجہ تھی قریب آ کر روجی کے ہاتھ سے روپی کے بال چھڑاتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔

”شرم نہیں آتی چھوٹی بہن کو یوں مارتے ہوئے۔ اب تم مہمان ہو اور پھر روپی اب بچی نہیں کہ تم جب چاہو اس پر ہاتھ اٹھانے لگو۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ انہوں نے سخت لہجے میں تنبیہ کی۔ وہ دیکھتی تھیں سارے گھر کا کام بھی روپی کرتی تھی۔ پانچ وقت کی نماز بھی وہاں قاعدگی سے پڑھتی تھی۔ دن میں ایک بار قرآن پاک بھی لازمی کھوتی تھی اور پھر چپ چاپ گھر میں پھرتی تھی۔ وہ بہت بدل چکی تھی۔

روپی کو ماں کی یہ پہلی ڈانٹ سخت ناگوار گزری تھی اور وہ بھی روپی کے حوالے سے۔ وہ جو بات ماں کو کئی دنوں سے بتانا چاہ رہی تھی یہ سنہری موقع مل گیا تھا بتانے کو۔ اس نے روپی کو گھورتے ہوئے ماں سے کہا۔

”چھوٹی بہن کے کروت بتاتی ہوں میں آپ کو۔ جب ہم چچا کے گھر شادی پر گئے تھے تو روپی نے بلال کے ساتھ صدمہ سے زیادہ فری ہونے کی کوشش کی تھی۔ جاتے ہوئے بلال مجھے سب کچھ بتا کر گیا ہے۔“ یہ کہہ اس نے بلال کی سنائی ہوئی کہانی حرف بہ حرف ماں کو سنائی بلکہ کچھ اضافہ اپنی طرف سے بھی کر دیا۔ ماں کی نفرت اور غصے میں اضافہ کرنے کو۔ روجی کی بات ختم ہوتے ہی روپی نے مار سے بچنے کیلئے بھاگ کر سٹور میں جا کر دروازہ بند کر لیا اور شمشاد بیگم ہمارے شدید صدمے کے وہیں دل تھام کر بیٹھ گئیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہنے لگیں۔

”بلال کیا سوچتا ہوگا ہمارے بارے میں اور اگر اس نے اپنی ماں کو بھی جا کر یہ بات بتادی تو وہ کیا سوچے گی۔ یہی نا کہ چھوٹی ایسی ہے تو بڑی بھی ویسی ہی ہوگی۔“ ظاہر ہے یہی سوچیں گے وہ لوگ۔“ روجی نے اپنی کامیابی پر دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کہا۔ جب شمشاد جی بھر کر رو چکی تو انہوں نے جھج کر روپی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”روپی! تم ذرا سٹور سے باہر تو آؤ۔ آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ روپی مارے ڈر کے اس رات سٹور سے باہر آئی ہی نہ تھی۔ صبح اپنی خلد کی موت کی خبر سن کر حمیدہ بیگم گھر سے چلی گئیں تو روپی سٹور سے باہر آئی اور سیدھی یکن میں چلی گئی۔ فریج سے آٹا لے کر اس نے اپنے لیے پراٹھا بنایا۔ ساں ختم ہو چکا تھا یا روجی نے جان بوجھ کر ختم کر دیا تھا۔ روپی نے دودھ لے کر چائے بنائی اور اس کے ساتھ پراٹھا کھا کر پھر سٹور میں چلی گئی۔ روجی اس کو یکن میں جانا دیکھ کر اپنے روم میں چلی



گئی تھی۔ ناشتے کے بعد روپی برتن صاف کر کے اب گھر کی صفائی بھی کر دے گی۔ مگر کافی دیر بعد جب وہ روم سے باہر آئی تو نہ صرف کچن برتنوں سے بھرا ہوا تھا بلکہ سارے گھر کی صفائی بھی ہونے والی تھی۔ یہ دیکھ کر مارے غصے کے روجی کا داغ الٹ گیا اور وہ چیخی۔

”روپی! آوارہ! برتن اور گھر کی صفائی تیرے یاروں نے کرنی تھی جو تو آرام سے سٹور میں جا کر بیٹھ گئی ہو کھاتن کر۔“  
 ”میرے کیوں؟ تمہارا ساپنے یا بھی تو یہ کام کر سکتے ہیں۔ ان کی تعداد کم تو نہیں۔“ روپی نے سٹور سے باہر آتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”ارے بد معاش! آوارہ! روجی مارنے کو آگے بڑھی تو روپی غرائی۔“

”مجھے ہاتھ لگانے کا انجام آج بہت برا ہوگا۔ میں بھی آج تمہیں ماروں گی۔ اپنے ناخنوں سے تیرے چہرے پر ایسی خراشیں ڈال دوں گی کہ تمہارے لہن بننے تک درست نہ ہوں گی اور اگر آج ہی تمہارے سرال سے کوئی آگیا تو ان کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہو گی۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ روجی کے روم میں گئی اور اپنا سارا سامان، سوٹ جوتے اور دوسری چیزیں لے کر سٹور میں گئی۔ اب اس نے روجی کے روم کی بجائے سٹور میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اچھی خاصی قاتل جگہ تھی اس میں چار پائی لگانے کی۔  
 روجی روپی کی بات سن کر گرم صدم کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ جی جابا پکڑے اس آوارہ کو اور مارا کر حلیہ بگاڑ دے۔ مگر اس کا حلیہ بگاڑتے اپنا بکڑ گیا تو کیا ہوگا۔ شادی قریب ہونے کی وجہ سے سرال سے روز کوئی نہ کوئی آیا گیا رہتا تھا۔ بمشکل وہ خود کو کنٹرول کرتے ہوئے کچن میں آئی۔ پہلے برتن صاف کیے۔ پھر کچن صاف کرنے کے بعد جلدی جلدی گھر کی صفائی کرنے لگی۔ حالانکہ دوپہر کا کھانا بنانے کا نام تھا۔ مگر مسئلہ پھر وہی کہ سرال سے کوئی نہ کوئی روز آ جاتا تھا اور وہ سمجھتے تھے یہ سب صفائی وغیرہ روجی کرتی ہے۔ اب گھر کو گند دیکھتے تو اس کے بارے میں کیا سوچتے۔ صفائی سے فارغ ہوئی تو ایک بج چکا تھا۔ وہ ابھی سو راور چاول چین رہی تھی کہ روپی سکول سے آگئی۔ روجی نے اس کو روٹی کے ساتھ انڈا بنا کر دیا۔ پھر دل بھگو کر چاول چھنے لگی۔ سلمان ماں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ شام ہونے سے کچھ پہلے وہ کھانا بنا کر فارغ ہوئی تو سلمان اور ماں بھی واپس آ گئے۔ شمشاد نے آتے ہی کہا۔

”روجی! جلدی سے کھانا لاؤ، ہم تو جنازہ ٹھتھے ہی ماں بیٹا چلے آئے۔“  
 روجی نے جلدی سے ماں اور بھائی کے سامنے کھانا رکھا اور پھر پاس بیٹھ کر کہنے لگی۔  
 ”امی! روپی نے آج گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کی وجہ سے آج کھانا بھی میں نے ابھی ابھی پکایا ہے۔“  
 شمشاد سلمان کے سامنے بلال والی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی وہ یہ سب سنتے ہی اس کو جان سے مار دے گا۔ اس لیے کہا تو صرف اتنا۔  
 ”تم صبر کرو میں صبح خود اس کو دیکھ لوں گی۔“ اور روجی مان گئی۔

اگلی صبح روپی خاموشی پا کر سٹور سے باہر آئی اور کچن میں آ کر اپنے لیے پراٹھا بنایا اور دل کے ساتھ کھا کر اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور جب چائے پی کر کچن سے باہر آئی تو روجی ماں کے ساتھ لاؤنج میں کھڑی تھی۔ روپی ماں کی عادت کو جانتی تھی کہ بلال والی کہانی کی وجہ سے ماں بہت غصے میں ہے۔ جب تک وہ روپی کو جی بھر کر مار نہیں لیں گی تب تک ان کا غصہ ختم نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کو سکون ملے گا۔ وہ سٹور کی جانب بڑھی تو ماں نے اس کو آواز دے کر بلایا۔  
 ”جی! روپی نے قریب آ کر کہا۔“

”کل گھر کا کام کیوں نہیں کیا تھا؟“ انہوں نے گھورتے ہوئے پوچھا۔  
 ”موڈ نہیں تھا۔“ روپی نے کہہ دیا۔ ماں کا پروگرام وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ انہیں بولنے اور مارنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا۔  
 ”تمہارے موڈ کو کیا ہوا۔ ذرا مجھے بھی تو پتہ چلے آوارہ!“ ماں نے غصے سے کہا تو روپی نے کہا۔ ”بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔“ یہ سنتے ہی حمیدہ بیگم پکڑ کر اس کو مارنے لگی۔ روجی پاس خاموش کھڑی تماشہ دیکھتی رہی اور حمیدہ بیگم مارنے کے ساتھ ساتھ زبان بھی چلاتی رہیں۔ ”آوارہ! تم نے ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔ خوب اچھی طرح مارنے کے بعد انہوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ پھر کہا۔

”اتھو! اور اب گھر کا کام کرو۔“ روپی خاموشی سے اٹھی۔ ایک نظر ماں بہن کو دیکھا پھر سٹور میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ حمیدہ بولتی ہی رہ گئی مگر روپی پھر باہر نہیں آئی تھی۔



ماں کی اس مار کے بعد روپی نے مکمل طور پر گھر کا کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سارا وقت بیٹھی ناول اور رسائل پڑھتی۔ ریڈیو سنٹی یا پھر اوٹ ہٹا نگ قسم کے شاعر لکھتی رہتی۔ بیٹھتی بھی باہر لاؤنج میں تھی۔

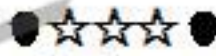
روٹی جب بھی اس کو کام کرنے کا کہتی وہ سنی ان سنی کر دیتی۔

”روپی! تم نے سنا نہیں بہن کیا کہہ رہی ہے۔“ شمشاد بیگم چیخ کر رعب ڈالنے کی کوشش کرتی مگر روپی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتی۔ تب ماں بیٹی دونوں جی بھر کر اس کو برا بھلا کہتیں اور وہ ان دونوں کو چڑانے کے لیے چپ چاپ مسکراتی رہتی۔ ایسے میں شمشاد کو زیادہ غصہ آتا تو پکڑ کر دو چار ہاتھ روپی کو حرا دیتی مگر وہ اس قدر دھیت ہو گئی تھی کہ اس پر کسی بات کا اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ آخر تنگ آ کر شمشاد بیگم نے شوہر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے تو سہی! یہ روپی دن بدن بکڑتی جا رہی ہے۔ گھر کا کام بھی نہیں کرتی اور آگے سے زبان درازی بھی بہت زیادہ کرنے لگی۔ اب اس پر میری ڈانٹ اثر کرتی ہے نا مار۔“ بیوی کی بات سن کر نصیر صاحب نے ایک نظر بیوی کو دیکھا پھر سنجیدگی سے کہا۔

”زیادہ سختی مت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ گھر سے بھاگ جائے اور ہماری عزت خاک میں مل جائے۔ الفاظ تھے یا گھلا ہوا سیدہ جو کسی نے روپی کے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔“ ”اُف! بابا جان! یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔“ باہر کھڑی روپی نے مارے کافیت کے آنکھیں بند کر کے سوچا۔ آپ تو بہت پید کرتے تھے مجھے سے۔ بابا جان! کاش آپ نے ہی مجھے سمجھا ہوتا۔ اچانک وہاں کی بات سن کر چونک پڑی۔

”اچھا ہے بھاگ جائے۔ روز روز کی اس مصیبت سے تو جان چھوٹ جائے گی۔ سارا وقت آوارہ کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔“ ماں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا اور اسی لمحے روپی نے یکدم گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔



رات ہوئی تو روپی نے ٹھنڈے سول وداغ سے سوچا گھر سے بھاگنا اچھی بات نہیں۔ ویسے بھی شریف لڑکیاں گھر سے بھاگنا نہیں کرتیں۔ یوں بھی اگر میں گھر سے بھاگ گئی تو محلے اور سارے خاندان میں بابا جی کی کیا خاک عزت رہ جائے گی اور سلمان بھائی تو اپنے دوستوں میں منہ دکھانے کے بھی لائق نہ ہیں گے۔ یہ میرے ساتھ جو بھی ہوا ہے یا ہو رہا ہے یہ سارے کا سارا کیا دھرا تو روٹی آپلی کا ہے۔ پھر میں کیوں گھر سے بھاگ کر اپنے باپ اور بھائی کی ناک کاٹ دوں۔ خواہ وہ کچھ بھی ہو جائے میں گھر سے بھاگنے کا جرم مہر گز نہ کروں گی۔ جس کی وجہ سے میرے خاندان کی عزت پر حرف آئے اور پھر وہ سب کچھ ہموش کر کے مطمئن ہو کر سو گئی۔

لیکن جب بات بہ بات گھر میں اس کی بے عزتی ہونے لگی اور ماں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کو دھتک کر رکھنے لگی۔ سارا وقت آوارہ۔ آوارہ کی آوازیں لگنے لگیں تو وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا سوچنے لگی۔ اس کے پاس تو ارمہ کرن کی آخر کی صورت میں ایک اچھا آپشن بھی موجود تھا۔ اس دن تو حد ہی ہو گئی۔ جب سہ پہر کی چائے پیتے ہوئے روٹی نے ماں سے کہا۔

”امی جان! شادی میں اب گئے جنے دن رہ گئے ہیں اور مجھے تو اب یہ خوف کھانے لگا ہے کہ اگر روپی نے میرے سولہا کے ساتھ بھی کوئی ایسی ایسی غلط حرکت کر دی تو کیا ہوگا۔ میں تو سسرال میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔“ ماں نے اس کی بات سن کر بجائے اس کو سمجھانے کے فکر مندی سے کہا۔

”ارے! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ اب تم بس دعا کرو یا تو یہ مرجائے یا پھر اس کا رشتہ طے ہو جائے تو تب ہی ہماری جان اس مصیبت سے چھوٹ سکتی ہے اور تو کوئی صورت نظر نہیں آتی اس مصیبت سے ہماری جان چھوٹنے کی۔ تب تک تمہیں خود ہی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ادھر ذرا کم کم ہی آنا۔ بڑا شرارتی ہوتا ہے سالی بہنوئی کا رشتہ۔ کہاں تک آخر ہم اس کی نگرانی کریں گے۔ اس نے تو لگتا ہے شرم حیا گھول کر پی لی ہے۔“

بس یہی وہ لمحہ تھا جب روپی نے گھر چھوڑنے کا پکا پکا فیصلہ کر لیا۔ ماں کے اس رویے اور ان باتوں نے اس کو باغی کر دیا تھا۔

اس نے ارمہ کی ہدایت پر اس کاغذ نمبر اسٹور کی الماری میں پچھنے گئے اخبار پر لکھ دیا تھا جو آج بھی وہاں موجود تھا۔ اور اب روپی نے وہ نمبر لکھ کر اپنی کاپی میں رکھ لیا۔



اب مسئلہ ارم کفون کرنے کا تھا اور فون روبی کے گھر میں تھا ہی نہیں فون کرنے کے لیے گھر سے باہر جانا ضروری تھا۔ اور وہ اکیلی تو اب گھر کی چھت پر نہیں جاسکتی تھی۔ گھر سے باہر جانا تو بہت دور کی بات تھی۔

☆☆☆

گھر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ گڈو شادی سے دس دن پہلے ہی ان کے گھر آ چکی تھی۔ وہاں گھر کی ہونے والی بہو تھی۔ گڈو کے آنے سے غزالہ بھی روز آ نے لگی تھی۔ ادھر روبی نے بھی گھر والوں سے انتظام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

روبی کی مہندی سے ٹھیک چار دن پہلے روبی کے سکول میں مینا بازار تھا اور یہ گھر سے بھاگنے کا سنہری موقع تھا اگر مل جاتا۔ روبی نے اسی دن گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر مینا بازار جانے سے پہلے ارم کے گھر فون کرنا ضروری تھا۔ روبی کا روم آ پی کے خط میں لکھے ہوئے یہ الفاظ تو آج بھی ازر تھے۔  
”دیکھو روبی چندا تم جب بھی چاہو ہمارے گھر آ کر مستقل رہ سکتی ہو۔ میں جس طرح کرن کو عزیز رکھتی ہوں اسی طرح تم بھی مجھے عزیز ہو۔ ہمارے گھر کا ایک روم آج سے تمہارا کمرہ ہے بلکہ تمہارا مختصر ہے۔ میں اپنا فون نمبر لکھ رہی ہوں۔ تم جب آنا چاہو اپنے گھر والوں سے چھپ کر مجھے فون کر دینا۔ میں اپنی گاڑی لے کر تمہارے سکول کے سامنے جو پارک ہے اور اس کے سامنے روڈ پر جو کلاڈ کارز ہے وہاں آ جاؤں گی۔“

اصل مسئلہ فون کرنے کا ہی تھا اور فون سارے محلے میں نزدیک ترین صرف خلمہ منوری کے گھر تھا۔ روبی ہر وقت ارم کا نمبر ہاتھ پر لکھ کر رکھتی تھی کہ اگر اتفاق سے موقع مل جائے تو وہ بھاگ کر ارم کفون کرے۔ مگر کوشش کے باوجود یہ موقع مل نہیں رہا تھا۔ جبکہ اس کے گھر سے بھاگنے کا سارا دار و مدار ہی فون کل پر تھا۔ پھر مینا بازار سے ایک دن پہلے یہ سنہری موقع روبی کو مل ہی گیا۔ یہ موقع یوں ملا کہ روبی گڈو اور غزالہ کے ساتھ اپنے روم میں اپنے جیمز کے جوڑے پیک کر رہی تھی۔ ماں صبح کی ہی سلمان کو ساتھ لے کر بچے بچے رشتے داروں کو شادی کا کارڈ دینے گئی ہوئی تھیں۔ شام سے پہلے ان کی واپسی ناممکن تھی۔

روبی نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر منوری خلمہ کے گھر کی راہ لی۔ وہاں فون کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ منوری خلمہ خود گھر میں موجود نہیں تھی۔ ان کی بہو تھی۔ روبی نے سلام کرنے کے بعد ان کا حل پوچھا۔ پھر بڑے ادب سے کہا۔

”بھابی جان! ایک ضروری فون کرنا ہے۔“

”وہ سامنے لاؤنج میں رکھا ہے کرلو۔“ بھابی نے جوابی چھوٹی پچی کو صاف کرنے میں بڑی تھی وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا تو روبی نے جلدی سے نمبر پیش کیے۔ دوسری جانب سے یہ کال کرن نے رسیو کی اور اس کی آواز سنتے ہی روبی نے جلدی مگر آہستگی سے کہا۔

”آ پی سے کہو کل صبح آٹھ بجے مجھے رسیو کر لیں۔“ اوفون بند کرنے کے بعد شکریہ ادا کر کے چلی آئی۔

روبی، گڈو اور غزالہ ابھی تک اپنے کام میں بڑی تھیں۔ روبی کے محل کی دھڑکن جو پکڑے جانے کے خیال سے بے ترتیب ہو رہی تھی اعتدال پر آ گئی۔ گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی کہ وہ کتنا بڑا کام کر کے آئی تھی۔ اور یہ کہ کتنا بڑا قدم اٹھانے والی تھی۔

اب مسئلہ گھر والوں سے اجازت لینے کا تھا۔ اس کے لیے اس نے گڈو سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب گڈو بچن میں برتن صاف کر رہی تھی جبکہ روبی کو مکمل ریسٹ کرنے کا کہہ دیا تھا۔ کوکہ روبی گھر کا کام کرنا مکمل طور پر چھوڑ چکی تھی لیکن اب اگر گڈو اس کو کوئی کام کہتی تو روبی اس کو انکار نہیں کرتی تھی بلکہ گڈو کے کہنے پر وہ اکثر گھر کے کام کرنے لگی تھی۔ اب اس کو تہادیکھ کر روبی اس کے پاس آئی اور کہا۔

”گڈو بھابی! صبح زو بی کے سکول میں مینا بازار دیکھنے کو چاہ رہا ہے۔ میں بھی زو بی کے ساتھ سکول جانا چاہتی ہوں۔ مگر امی شاید جانے کی اجازت نہ دیں۔ باجی آپ امی سے کہیں نا۔ وہ مجھے بھی مینا بازار دیکھنے کی اجازت دیں۔“

”تم زو بی کے ساتھ جانے کی اپنی تیاری مکمل رکھو۔ اجازت مل جائے گی۔“ گڈو نے محبت سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا رویہ ہمیشہ روبی کے ساتھ نرم ہی رہا تھا۔ وہ جب نرگس کے ساتھ رہنے آئی تھی تب بھی وہ روبی کا بہت خیال رکھتی تھی۔ ”اگر امی نے آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو؟“ روبی نے اپنا خدشہ ظاہر کیا کہ اندر کے حالات صرف وہ جانتی



تھی۔

”ارے واہ! کیسے اجازت نہیں دیں گی۔ تم اپنی تیاری کرو۔ اجازت مل جائے گی بلکہ سمجھیں گئی۔“ اور روبی خوشی خوشی اسٹور میں چلی آئی۔

صبح روبی نے فجر کے وقت جب سب گھر والے سو رہے تھے سارے گھر کی اٹھ کر آخری بار صفائی کی، پھر نہائی اور اسٹور میں چلی آئی۔

دراصل گڈو کے ساتھ بات کرنے سے پہلے روبی نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے زوبی کی اپنے طور پر منت کی تھی کہ وہ اس کو بھی اپنے ساتھ سکول لے جائے تاکہ وہ بھی مینا زار کا رونق میلہ دیکھ سکے۔ مگر زوبی ماں کی بے حد چیمٹی تھی۔ اس نے صاف صاف انکار کرتے ہوئے روبی سے کہا تھا۔

”اگر میرے ساتھ جانا چاہتی ہو تو پہلے امی جان سے اجازت لینا ہوگی۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو پھر میں آپ کو اپنے ساتھ سکول لے جاؤں گی۔“

مگر روبی نے ماں سے بات کرنے کی بجائے گڈو باجی سے بات کی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی امی سے بات کرنے کی صورت میں صاف اور سیدھا جواب ملنا تھا۔ مگر اب اس کو امید ہی نہیں تھی کہ اجازت مل جائے گی۔ آخر گڈو باجی اس گھر کی ہونے والی اکلوتی بہوگی۔

اور وہ بھی یہی صبح جب زوبی ناشتہ کر رہی تھی۔ روبی نے ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”امی جان! میں بھی زوبی کے سکول مینا زار دیکھنے چلی جاؤں؟“

”تو اس قابل روگنی ہے کہ تجھے گھر سے باہر جانے کی اجازت دی جائے۔ تمہیں تو روڈ پر چلتے کسی اجنبی لڑکے نے بھی مسکرا کر دیکھا تو تم اس کے پیچھے چل دو گی اور ہماری عزت خاک میں مل جائے گی، آوارہ! ماں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

آپ کما سی نامناسب رویے کی وجہ سے میں آج اس وقت گھر سے بھاگ رہی ہوں۔ جب میری غیر موجودگی کی سارے خاندان کے سامنے آپ کو وضاحت کرنی پڑے گی۔ اگر آپ کو میری عزت کا خیال نہیں تو میں کیوں آپ کی عزت کا خیال کرو۔“ روبی نے مارے نفرت کے دل میں سوچا پھر منت کرنے والے انداز میں کہا۔

”امی! میرے ساتھ جانے سے آپ کا کیا بکڑ جائے گا۔ ذرا میں بھی مینا زار کا رونق میلہ دیکھ لوں گی۔ پھر امی! اجازت دے دیں۔“

”کیا مسئلہ ہے۔ کس چیز کی اجازت مانگی جا رہی ہے۔“ گڈو نے ناشتہ شمشاد ٹیگم کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ اور روبی نے جلدی سے کہا۔

”گڈو باجی! زوبی کے سکول میں مینا زار ہے۔ میں بھی مینا زار دیکھنے زوبی کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ مگر امی اجازت نہیں دے رہیں۔ آپ ان سے کہیں نا مجھے بھی زوبی کے ساتھ جانے دیں۔“

”پھوپھو! جانے دیں یا زوبی بھی تو جا رہی ہے۔ پھر روبی کے ساتھ جانے سے کیا فرق پڑے گا۔ رونق میلہ دیکھ کر آ جائے گی۔“

شمشاد زکار کرنا چاہتی تھی مگر گڈو نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی کہا۔

”جاؤ روبی! تم بھی تیار ہو جاؤ۔“ اور روبی تو پہلے ہی ساری تیاری مکمل کر چکی تھی۔ ”گڈو کی طرف سے اجازت ملنے ہی روبی کا مسئلہ حل ہو گیا بلکہ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے یکدم دماغ سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ بہت بڑا قدم اٹھانے جا رہی تھی۔ مگر اپنی خوشی سے نہیں بہت مجبور ہو کر کیونکہ اس کے سوا اب اس کے پاس اور کوئی چواؤں بھی ہی نہیں۔ گھر والوں کے رویے اور باتوں نے اس کو باغی بنا دیا تھا۔ اب وہ ان سب کو رسوا کر کے سزا دینا چاہتی تھی۔

روبی نے روجی کی شادی کے لیے رکھے گئے پیسوں میں سے دس ہزار نکال کر رات ہی اپنے پرس میں رکھ لیے تھے۔ اس رقم کے علاوہ اس نے اور کوئی چیز نہیں لی تھی۔ مطلب اپنے سوٹ وغیرہ۔ پہلے روبی نے سوچا تھا گڈو باجی سے ان کا شولڈر بیگ مانگ لے۔ اس میں دو سوٹ تو آسانی کے ساتھ آ ہی سکتے تھے۔ مگر اس طرح سب کو شک ہو سکتا تھا۔ زوبی کے ساتھ گھر سے نکلنے سے پہلے روبی نے پلٹ کر اک آخری نگاہ گھر پر ڈالی۔ وہ گھر جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا، جہاں اس کی جوانی کو سوائے بدنامیوں اور رسوائیوں کے کچھ نہ ملا تھا، جہاں اس سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا گیا تھا۔ آج وہ ان تمام بدنامیوں اور رسوائیوں کو سیٹھے میٹھے کے لئے اس گھر کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی اور ان نم آنکھوں کے ساتھ اس نے جو آخری منظر دیکھا وہ یہ تھا۔

گڈو باجی کچن کے دروازے کے قریب کھڑی مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ نجانے ایسی کیلیات سلمان بھائی سے کہہ رہی تھیں کہ ان کے لب بھی مسکرا رہے تھے۔ ماں روجی کے



پاس بیٹھی جائے پی رہی تھی اور ذرا پرے صوفے پر بیٹھے باجی پوری توجہ سے ناشتہ کر رہے تھے۔ یہی آخری منظر تھا جو روبی نے آخری بار دیکھا۔ پھر نرم آنکھوں سے ہمیشہ کیلئے زوہلی کے ساتھ گھر کی دھیز پا کر گرائی۔

دونوں پیدل ہی چلتے ہوئے سکول کی جانب روانہ ہوئیں۔ سکول کے سامنے پارک والی روڈ پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے کلفڈ کاز کے قریب ارم کی گاڑی دیکھ لی تھی۔ گاڑی دیکھنے کے بعد اس نے عجیب سی نظروں سے زوہلی کو دیکھا اور بات کرنے کا سوچنے لگی۔

”کیا ہوا باجی! رک کیوں گئی۔“ اس کے پروگرام سے بے خبر زوہلی نے اس کو دکتے دیکھ کر پوچھا۔

”اب تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن اب ہونے والا ہے۔“ روبی نے زوہلی کو گھورتے ہوئے سخت اور سرد لہجے میں کہا۔

”کیا ہونے والا ہے؟“ زوہلی نے کچھنا سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”سنو زوہلی! تم سکول نہیں اب گھر واپس جاؤ گی۔“ روبی نے سڑک پر سے گزرتی ہوئی گاڑیوں پر ایک نگاہ ڈال کر کہا۔

”آپ کو یہیں چھوڑ کر۔“ زوہلی نے حیرانی سے پوچھا۔ پھر کہا۔

”سوری باجی! میں آپ کو چھوڑ کر آؤں تو سکول جاؤں گی نہ ہی گھر۔“

”میرے ساتھ فضول گواہ مت کرو ورنہ مزادی۔“ روبی نے دانت پیس کر کہا۔ پھر کچھ سوچ کر مسکرائی اور بولی۔

”اب جو بات میں تم سے کہنے لگی اس کو نہ صرف غور سے سننا بلکہ ایک ایک لفظ یاد رکھنا کیونکہ یہ میری تم لوگوں کے ساتھ آخری بات چیت ہے۔“

”سنو! میں عاملز کیوں کی طرح رات کی تاریکی میں گھر سے بھاگنا نہیں چاہتی تھی۔ میں تو دن کے روشن اجالے میں تم سب گھر والوں کے بے رحم اور سفاک چہرے دیکھ کر

رخصت ہونا چاہتی تھی تاکہ باقی کی تمام عمر تم لوگوں کو دیکھنے کی مجھے حسرت نہ رہے۔ کسی گھر میں ایک بندہ غلط ہوتا ہے وہ بندہ غلط ہوتے ہیں۔ تین بھی ہو سکتے ہیں مگر اس گھر میں تو

آدے کا آدہ ہی بکڑا ہوا تھا۔ کسی بھی بات کی کوئی حد ہوتی ہے مگر تم لوگوں نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا حد سے بڑھ کر کیا۔“ وہ رکی۔ پریشان زوہلی کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر

بولی۔

”اب تم سکول جانے کی بجائے واپس گھر جاؤ اور جا کر اپنے شریف ترین اور عزت دار گھر والوں سے کہہ دو آج آوارہ روبی شریف لوگوں کے گھر سے بھاگ گئی۔ آوارہ تھی نا۔“ روبی

کے ہونٹوں پر یہ بات کہتے ہوئے ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں باجی! آپ ہوش میں تو ہیں۔“ زوہلی نے پریشان ہو کر بہن کو دیکھا وہ سڑک کے کنارے دکانوں کے سامنے بنے فٹ پاتھ پر کھڑی تھیں اور آنے جانے

والے اکثر راگیران کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک اچھٹی نگاہان دونوں پر ضرور ڈالتے تھے۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں زوہلی۔“ ضبط کے باوجود روبی کی آواز بھرا گئی۔ ”آج سے میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ میں گھر سے بھاگنا نہیں چاہتی تھی مگر تم لوگوں نے زندہ رہنے

کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ میرے لیے چھوڑا ہی نہیں۔ بات ختم کرتے ہی وہ زوہلی کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھی تو زوہلی نے لپک کر اس کا آنچل تھام لیا۔

”نہیں روبی باجی! میں آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گی۔ پلیز باجی! ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔“ زوہلی رو دینے کے قریب تھی۔ بہن کی یہ کیفیت دیکھ کر روبی کا دل ڈانواں ڈول ہو گیا۔ مگر

جو قدم وہ گھر سے نکال چکی تھی۔ ان قدموں سے واپس گھر جانا ناممکن تھا۔ ایسی صورت میں جب ارم بھی اپنی گاڑی لیے اس کا انتظار میں کھڑی تھی۔ روبی نے خود کو سنبھال کر زوہلی کو

دیکھا۔ پھر زہری سے کہا۔

”میرا آنچل چھوڑ دو زوہلی۔ میں نے کہنا میری واپسی ناممکن ہے۔ اپنا اور میرا نام ویسٹ مت کرو۔ مجھے جانے دو۔“

”ایسے مت کریں روبی باجی! چار روز بعد روجی آپ کی شادی ہے۔ ان کی شادی میں آپ کو موجود نہ پا کر لوگ ہم سے پوچھیں گے تو ہم کیا جواب دیں گے اور پھر کیا کیا نا باتیں ہوں

گی خاندان اور محلے بھر میں۔“ زوہلی چھوٹی تھی مگر اتنی بھی چھوٹی نہیں تھی کہ گھر سے بھاگنے کے مطلب کو نہ سمجھتی۔

زوہلی کی بات سن کر روبی نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا اور نفرت آمیز لہجے میں کہا۔



”ابنی عزت کا اتنا خیال تھا تو میری عزت کا بھی رکھنا تھا۔ ذیل لڑکی! تم بھی تو میرے ساتھ کھیلنے سے انکار کرتی رہی ہو۔ تم اپنی ماں کی بہت چیتتی ہونا۔ اب واپس گھر جا کر اپنی ماں سے کہنا آوارہ رو بی بھاگ گئی۔ اب وہ سکون سے اس گھر میں اپنی شریف بیٹیوں کے ساتھ۔ اور اپنا آنچل چھڑا کرتی تیز قدموں سے بھاگنے والے انداز میں چلتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ پھر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ زو بی اب بھی وہیں کھڑی ہے یا گھر چلی گئی ہے۔ ہاں موڑ مڑنے سے پہلے اس نے آخری بار دیکھا مگر اب زو بی وہاں نہیں تھی۔ وہ یقیناً گھر کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔“

یہ دیکھ کر زو بی بھی فوراً واپس مڑی۔ لکڑ کا رز بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ محض زو بی کو دھوکا دینے کے لیے آگے آگے بڑھائی تھی لیکن اب وہ چند قدم ہی اٹھاپائی تھی کہ ارم کی گاڑی بڑی تیزی سے اس کے پاس آ کر کی اور اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ اوپن کرتے ہوئے کہا

”بیٹھو رو بی پلیز بھری آپ۔“ اور اس کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور زو بی ایک نئی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

ماں باپ، بہن بھائی ان سب کا خیال دل سے نکال کر وہ اپنی نئی زندگی کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ گھر کے کسی فرد کو یاد کر کے پریشان ہونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خود بھی حیران تھی کہ وہ اتنی بے تحشر دل کیسے ہو گئی جبکہ وہ تو شروع ہی سے خاموشی کے ساتھ ہر الزام اپنے سر لیتی آئی تھی۔ روجی تو روجی اس نے تو غزالہ کا الزام بھی بڑے حوصلے سے اپنے سر لیا تھا۔ حالانکہ اس کی شکایت کرنے والی خود غزالہ کی اپنی ماں بھی۔ وہ جب کانوں کو ہاتھ لگاتے تو بے توبہ کہتے چلی گئی تھی تو وہ اس کو روک کر یہ وضاحت کر کے بے عزت کر سکتی تھی یہ خط میرا نہیں تمہاری بیٹی کے پارکا ہے اور ایسے کئی خط میں اس کو لا کر دے چکی ہوں۔ مگر وہ تو ہر بات خاموشی سے برداشت کرنے کی عادی بن چکی تھی۔ ایک تو وہ چھوٹی تھی دوسرا روجی بہت چالاک، ہوشیار اور تیز لڑکی تھی۔ زو بی اگر کسی بات کی وضاحت کرتی تھی تو یقیناً کس نے کرنا تھا۔

”زو بی! تم کس سوچ میں گم ہو؟“ ارم نے پہلی بار اس کو مخاطب کیا۔

زو بی نے چونک کر چہرہ اٹھایا اور نہ اب تک وہ یہی سمجھتی تھی کہ وہ کسی وین میں سفر کر رہی ہے۔

”کچھ نہیں آپی!“ زو بی نے انہیں دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”فکر مت کرو۔ کسی بات سے ڈرنے یا گھبرانے کی اب ضرورت نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ بس ذرا خیریت سے گھر پہنچ جائیں۔“

ارم نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ سر جھٹک کر ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی، جن سے اب اس کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ جبکہ ارم سامنے دیکھتے ہوئے تیزی سے کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ بالآخر خیریت سے وہ اپنے گھر پہنچ گئی۔

☆☆☆☆

زو بی اپنی زندگی میں پہلی بار جتنا تیز چل سکتی تھی چل کر گھر آئی اور گھر میں داخل ہوتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نجانے گھر تک کیسے وہ ضبط کرتے ہوئے آئی تھی۔

”ارے ارے! کیا ہوا۔ زو بی تم رو کیوں رہی ہو۔“ روجی نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا۔

”ارے تم تو سکول گئی تھی، واپس کیوں چلی آئی۔ کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے؟“

”ہائے واپس آ گئی۔“ شمشاد بیگم نے اپنے روم سے باہر آتے ہوئے کہا پھر کسی انجانے خطرہ کا احساس ہوتے ہی چونک کر پوچھا۔

”ارے تمہارے ساتھ تو زو بی بھی گئی تھی۔ وہ کہاں ہے؟“

”امی جان!“ زو بی ان کی بات کا جواب دینے بغیر اور زور شور سے رونے لگی۔

”ارے کمبخت کچھ بتائے گی بھی یا یونہی روئے جائے گی۔ وہاں مراد کہاں ہے؟“ شمشاد بیگم نے تھوڑے غصے سے پوچھا۔

”امی جان! وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔“ زو بی نے روتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ”کیا بکواس کر رہی ہو۔“ روجی نے ڈانٹ کر پوچھا۔

تب تک گڈو بھی روجی کے روم سے نکل کر باہر آ گئی تھی اور حیرانی سے روتی ہوئی زو بی کو دیکھ رہی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں آپ! وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔“ سکول کے سامنے جو پارک ہے وہاں پہنچ کر وہ رک گئی پھر مجھ سے کہا۔



”اب گھر واپس جاؤ اور اپنے گھر والوں سے یہ کہہ دو کہ آوارہ روٹی گھر سے بھاگ گئی ہے۔“ یہ کہہ کر روٹی نے باقی کی ساری باتیں بھی حرف بہ حرف ان کو بتادیں تو شمشاد بیگم ہل تھام کر وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ یہ کیا کیا تم نے روٹی۔ ان کو جیسے سکتے ہو گیا۔ چار روز بعد شادی بھی اب کیا ہوگا۔

”پھوپھو جی! امی جان! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ پلیز! خود کو سنبھالیں۔ گڈ اور روجی گھبرائی ہوئی ایک ساتھ دوڑ کر ان کے قریب آئیں تو حمیدہ بیگم نے کہا۔

”میری فکر چھوڑ دو اور جلدی سے جا کر منوری کے گھر سے اپنے باپ اور بھائی کفون کر کے بلاؤ۔ چار دن بعد تمہاری شادی ہے۔ کیا منہ دکھائیں گے ہم لوگوں کو۔ وہ آئیں اور اس آوارہ کو ڈھونڈ کر لائیں۔ ہائے اللہ! یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ میں نے تو اس کو سکول جانے کی اجازت دینی ہی نہیں تھی مگر گڈو نے کہا پھوپھو جی جانے دیں۔ تو میں چپ ہو گئی۔“

روٹی ان کو اس حالت میں چھوڑ کر چار دن اور ڈھکھڑکھڑ سے باہر نکل گئی۔ گڈو پانی کا گلاس بھر کر ان کے قریب آئی۔ پھر بیٹھ کر گلاس ان کے منہ سے لگاتے ہوئے بولی۔

”پھوپھو جی! مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ایسی حرکت کرے گی۔ رات روٹی نے مجھ سے کہا تھا کہ سکول میں بیٹنا زار ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔ مگر امی شاید اجازت نہ دیں۔ آپ مجھے اجازت لے دیں اور میں نے وعدہ کر لیا کہ اجازت لے دوں گی اس لیے میں نے آپ سے کہا تھا پھوپھو جانے دیں۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس نے بہت پہلے ہی گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔“ شمشاد بیگم نے پانی پینے کے بعد کہا پھر روٹی سے پوچھا۔

”اور کیا کہا تھا روٹی بے غیرت نے؟“

”امی جان! وہ کہتی تھی آج کے بعد میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔“ روٹی نے آنکھیں پونچھتے ہوئے بتایا۔

”ارے! خدا تجھے غارت کرے۔ روٹی! اس سے بہتر تھا کہ تو پیدا ہوتے ہی مر جاتی اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو بڑی ہو کر ہماری عزت سے کھیلے گی تو اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا گھونٹ کر مار دیتی۔ اس طرح ہماری عزت تو بچ جاتی۔ خدا تجھے برباد کرے۔“ تجھے کبھی خوشی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔“ وہ منہ بھر بھر کر روٹی کو بددعا میں دیتی رہیں اور مارے دکھ کے روتی رہیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اتنی شدت سے اس بات کو محسوس نہ کیا جاتا مگر اب تو چار روز بعد روجی کی شادی تھی۔ سب نے پوچھنا تھا سگی بہن کی شادی میں چھوٹی بہن موجود نہیں؟ کہاں گئی؟ آگے پیچھے تو کہا جاسکتا تھا ایٹ آباد چلی گئی مگر اب تو ایک قیامت تھی۔ جس کا سب کو سامنا کرنا تھا۔ شمشاد انہی سوچوں میں گم تھی کہ روٹی فون کر کے واپس آگئی۔

شمشاد نے پوچھا۔

”کیا کہہ کر گھر بلا دیا ہے تم نے ناچنے ابو کو۔“

”میں نے کہا ابو امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ فوراً گھر آئیں اور آتے ہوئے ساتھ سلمان کو بھی لیتے آئیں۔“ روجی نے چار دن اتارتے ہوئے کہا۔

”اچھا! شمشاد نے کہا اور پھر کبری سوچ میں گم ہو گئیں۔

”اب کیا ہو گا امی جان؟ چار روز بعد میری شادی ہے۔ اگر میرے سرال کو بتا چل گیا تو۔“ روجی رشتہ ٹوٹ جانے کے خوف سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو گڈو نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”صبر کرو روجی۔ سلمان اور پھوپھو چاہا جان اس کو یقین دلاتے ہوئے سے پہلے تلاش کر کے گھر لے آئیں گے کہاں جائے گی وہ۔ جبکہ اس کی تو کوئی فرینڈ بھی نہیں۔ اور اھر گھونٹی پھرتی یا کسی پارک میں بیٹھی مل جائے گی۔“

”وہ ملے گی تو تب نا۔“ روجی نے سسکی بھر کر کہا۔ ”امی میرے تو دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ ہائے اللہ! ہم کیا کریں۔ یہ تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔“

”اللہ بہتر کرے گا۔ روجی تو کیوں فکر کرتی ہے۔“ شمشاد ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔ ”جس نے یہ مصیبت نازل کی ہے وہ اس کا حل بھی بتائے گا۔“

”مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا۔ وہ اس وقت اکیلی جائے گی کہاں؟ اس کی تو کوئی سہیلی بھی نہیں۔ کہیں غلط لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔“ شمشاد آخر ماں تھیں بیٹی کی عزت کی بھی فکر تھی۔ جانتی تھی گھر کے باہر قدم قدم پر شکاری گھات لگائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر خود ہی تسلی کے لیے بولیں۔ ”دیکھنا تمہارا باپ اس کو شام تک ڈھونڈ کر لے آئے گا۔“ پھر دل پر ہاتھ رکھ کر صوفے پر ہی لیٹ گئیں۔ یہ دیکھ کر روجی نے کہا۔

”امی آئیں میں آپ کو آپ کے روم میں چھوڑ آؤں۔ یہاں بے آرامی میں نالینیں۔“



”نہیں اندر کمرے میں میرا دل زیادہ گھبرائے گا۔“ انہوں نے کہا اور چہرے پر بازو رکھ لیا۔ گڈ روجی بھی خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ بات کرنے کا موڈ کسی کا بھی نہ رہا تھا۔ بس ایک ہی سوچ اور فکر تھی روٹی نہ ملے گی تو کیا ہوگا۔

نصیر صاحب بے حد پریشان اور گھبرائے ہوئے سلمان کو ساتھ لے کر جب گھر آئے تو شمشاد پر دوپٹہ باندھنے والے پر لپٹی تھیں۔ پاس روجی اور گڈو کے علاوہ زوہبی بھی تھی۔ وہ سیدھے بیوی کی جانب آئے اور پھر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیا ننگ نہیں کیا ہوا۔ صبح ٹھیک ٹھاک تو چھوڑ کر گیا تھا۔“ شوہر کی بات سن کر شمشاد رونے لگی۔ یہ دیکھ کر سلمان نے کہا۔

”ابو جی! میں جلدی سے ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“ وہ جانے لگا تو شمشاد بیگم نے روکتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ حوصلے سے بات سنو بیٹا! ہم پر قیامت گزر گئی ہے۔ اتنی بات کہہ کر ہی وہ چپ ہو گئیں۔ حلق میں جیسے کوئی چیز آ کر اٹک گئی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے رونے لگیں اور یہ دیکھ کر نصیر صاحب نے روجی سے کہا۔

”روٹی! تم بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ اور روجی نے بغیر کسی تمہید اور ہچکچاہٹ کے ساری بات باپ کو بتادی۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“ نصیر صاحب اور سلمان نے بیک وقت کہا۔ پھر پوچھا۔

”کب اور کیسے وہ بھاگ گئی اور اس وقت تم سب کہاں تھیں۔“ اشارہ گڈو اور شمشاد کی سمت بھی تھا۔

”وہ صبح زوہبی کے ساتھ اس کے سکول میں تیار نازدیکھنے گئی تھی۔ مگر سکول کے قریب پہنچ کر اس نے زوہبی سے کہا اب تم سکول جانے کی بجائے گھر واپس جاؤ اور جا کر سب سے کہہ دو۔ آج آوارہ روٹی گھر سے بھاگ گئی ہے اور زوہبی کو وہیں فٹ پاتھ پر چھوڑ کر خود آگے چلی گئی۔ زوہبی پکارتی ہی رہ گئی مگر وہ رکی نہیں۔“ روجی نے ہی پھر بتایا۔

”مگر اس کو زوہبی کے ساتھ سکول جانے کی اجازت دی کس نے تھی؟“ سلمان یکدم غرایا۔ یہ دیکھ کر روجی نے کہا۔

”تمہارے سامنے ہی تو گئی تھی۔ جب تم بچن کے دروازے پر کھڑے گڈو سے بات کر رہے تھے اور ابو جی تب سامنے صوفے پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔“ یہ سچ تھا۔ دونوں باپ بیٹوں میں سے کسی نے بھی روٹی کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ نصیر صاحب کی ساری توجہ ناشتے پر تھی اور سلمان جب گڈو کے قریب ہوتا تھا تو پھر دوسرا کوئی اس کو کم ہی دکھائی دیتا تھا۔ روجی کی بات سن کر سلمان نے پھر غرا کر کہا۔

”جب میں نے اس کو شادی پر چچا کے گھر ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی تھی تو تم لوگوں نے زوہبی کے ساتھ کیلے جانے کی اجازت کیوں دی؟“ یہ سن کر شمشاد نے کہا۔

”میں تو اجازت نہیں دے رہی تھی، پر گڈو نے کہا پھوپھو جانے دیں اور میں چپ ہو گئی۔“ یہ سب سننے کے بعد سلمان کے پاس اب سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا۔ گڈو کو ڈانٹنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا جبکہ گڈو نے روتے ہوئے ایک بار پھر ساری بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھائے گی۔ اس کی بات سن کر سلمان خاموش ہی رہا۔ ہم روٹی کی اس حرکت پر اس کا خون کھول رہا تھا۔

”اس لیے میں تم سے کہتا تھا زیادہ سختی اچھی نہیں ہوتی۔ مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔ آخر وہی ہونا جس کا مجھے ڈر تھا۔“ نصیر صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ اس لمحے وہ اپنی عمر سے کئی برس بڑے لگنے لگے تھے۔ پھر دونوں باپ بیٹا روٹی کی تلاش میں گھر سے نکل گئے۔

☆☆☆☆

اپنے گھر کے پورچ میں گاڑی روکتے ہی ارم نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ پھر پلٹ کر روٹی کو دیکھتے ہوئے یوں مسکرائی جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر کے آرہی ہو۔ پھر انجن بند کر کے گاڑی سے باہر نکل آئی۔

یہ دیکھ کر روٹی نے بھی اس کی تقلید کی اور اپنا چھوٹا سا پرس سنبھالتی ہوئی کار سے باہر نکل آئی۔ ارم نے گاڑی لاک کی۔ پھر روٹی کے قریب آئی اور اس کو محبت سے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

”اب تمہیں قطعاً پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تم محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکی ہو جہاں کوئی تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا۔ آؤ میرے ساتھ۔“ روٹی خاموشی سے اس کے ساتھ



چل دی۔ ارم اس کلاپنے ساتھ لے کر سیدھی اپنی والدہ کے روم میں آئی اور وہاں ماں کے ساتھ کرن بھی موجود تھی۔ روبی کو دیکھتے ہی لپک کر اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

”ہو سکتا ہے تم یقین نہ کرو۔ مگر یہ سچ ہے تمہارے گھر سے ہو کر آنے کے بعد وہ کونسا دن ہو گا جب میں نے تمہیں یاد نہیں کیا یا تمہارے فون کا ویٹ نہیں کیا مگر حضور آتے آتے بہت دیر کر دی۔“

”یقین کیوں نہیں کرے گی۔ جبکہ وہ تمہاری بیسٹ فرینڈ ہے۔“ زبرہ خانم نے کرن کو پرے کرتے ہوئے روبی کو گلے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی چومی۔ پھر بید سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”کرن نے جب تمہارے گھر سے ہو کر آنے کے بعد پہلی بار تمہارے حالات بتائے تو مجھے بہت زیادہ دکھ ہوا۔ میں نے ہی ارم سے کہہ کر تمہیں لے کر لکھنا کر بھیجا تھا۔ کوئی ماں اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی؟ اچھا کیا تم نے جو گھر چھوڑ کر آ گئی ہو۔ اس گھر کو آج سے پکا پکا اپنا ہی گھر سمجھنا اور میں بھی آج سے سمجھوں گی میری دو تین بیٹیاں ہیں۔“

یہ سن کر روبی رونے لگی تو انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”نامی رونا نہیں۔ گزرے ہوئے برس کو بھیا نک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ آج سے تمہاری نئی زندگی کا آغاز ہو گا۔ جس میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ خواہ کسی کو یاد کر کے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی یاد تو بندھان کو کرنا ہے جو آپ سے محبت کرتے ہوں۔ وہ سب تو تم سے شدید نفرت کرتے تھے۔“ پھر روبی کو ساتھ لے کر بستر پر بیٹھتے ہوئے ارم سے پوچھا۔

”کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تمہیں؟“

”پریشانی تو کوئی نہیں ہوئی مگر ویٹ کافی کرنا پڑا۔ نو بجے روبی آئی۔ پھر فٹ پاتھ پر کھڑی ہو کر چھوٹی بہن سے باتیں کرتے ہوئے بھی کافی دیر لگا دی روبی نے۔“ ارم نے روم چیئر پر بیٹھتے ہوئے بتایا تو روبی نے کہا۔

”وہ زوبی مجھے آنے نہیں دے رہی تھی۔ اس نے میرا آنچل بھی پکڑ لیا تھا۔“ یہ سن کر زبرہ خانم نے کہا۔

”چلو! اب دفع کرو ان سب کو۔ یہ بتاؤ کوئی کپڑا بھی ساتھ لائی ہو۔“

”نہیں آنٹی! اس طرح سب گھر والوں کو شک ہو سکتا تھا۔“ روبی نے کہا۔

”اچھا کیا جو کچھ ساتھ نہیں لائی۔ میں آج ہی کسی اچھی سی بوتیک سے تمہارے لیے دس بارہ سوٹ لے کر آؤں گی۔ بیٹی کہا ہے تو ماں بن کر دکھاؤں گی۔“

”کپڑے نہیں مگر دس ہزار روپے ضرور لائی ہوں۔“ روبی نے پرس کھول کر رقم نکال کر ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ دکھ لیں۔ مجھے ان پیسوں کا کرنا ہی کیا ہے۔“

”نہیں نہیں! زبرہ خانم نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ یہ تمہارے پیسے ہیں۔ تم ان کلاپنے پاس رکھو مگر دیکھو مجھے آنٹی نہیں ماں کہنا یا ماما بھی کہہ سکتی ہو۔ میں نے تمہیں اپنی بیٹی کہا ہے، کہا جاتا۔ ان کی بات سن کر روبی نے کہا۔

”آپ برا محسوس نا کریں۔ مگر مجھے اس لفظ ماں سے شدید نفرت ہے۔ میں آپ کو آنٹی ہی کہوں گی۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر آنٹی نہیں آپا کہو۔ ارم اور کرن بھی مجھے آپا ہی کہتی ہیں۔“ زبرہ خانم نے پیسے واپس روبی کے پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔“ ساتھ یہ نہیں بتایا کہ میں نے خود ہی بیٹیوں کو ماں کہنے سے منع کر رکھا ہے۔

اتنے میں پومی روم میں داخل ہوا تو زبرہ خانم نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”روبی یہ میرا کلوتا بیٹا پومی ہے۔“

”ہائے! پومی نے روبی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور روبی ہاتھ ملانے کی بجائے زبرہ خانم کی جانب دیکھنے لگی تو انہوں نے پومی سے کہا۔

”اپنا ہاتھ پیچھے کر لو۔ وہ جس ماحول سے نکل کر آئی ہے وہاں ان باتوں کی گنجائش نہیں۔ وہاں ان باتوں کو برا معیوب سمجھا جاتا ہے۔“ ویسے تمہاری پہلے کبھی روبی سے ملاقات نہیں ہوئی۔



”نو! میں نے آج فرسٹ ٹائم روٹی کو دیکھا ہے۔ سو سوٹ اور نام بھی بہت پیارا ہے روٹی۔“ پومی نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”امی جان! روٹی صرف دو تین بار ہی تو ہمارے گھر آئی ہے۔“ کرن نے بتایا تو زبرہ خانم نے چوٹکتے ہوئے کہا۔

”ارے! مجھے خیل ہی نہیں رہا پوچھنا کاشتہ کرو گی۔ دیکھو شرمناک لکل نہیں۔ میں نے کہا ہے نا آج سس گھر کو پکا پکا پتی گھر سمجھنا۔“

”آپ! آپ کن باتوں میں پڑ گئی ہیں۔ سیدھی طرح کاشتہ منگوائیں۔ مجھے یقین ہے روٹی نے کاشتہ نہیں کیا ہوگا۔“ ارم نے کہا تو روٹی خاموش ہی رہی۔ اس نے واقعی کاشتہ نہیں کیا تھا گھر سے بھاگنے کے چکر میں۔

”کرن! تم روٹی کو اپنے روم میں لے جاؤ۔ میں ملازمہ سے کہہ کر تم دونوں کاشتہ بھجواتی ہوں۔“ ماں کی بات سنتے ہی کرن، روٹی کا ہاتھ تھام کر اس کو اپنے روم میں لے گئی تو زبرہ خانم نے پومی سے کہا۔

”تم ملازمہ سے بولو وہ کرن کے روم میں دو کاشتے بھیج دے اور جب پومی چلا گیا تو ارم سے کہنے لگیں۔

”ٹر کی تو واقعی بہت پیاری ہے بلکہ بے حد خوبصورت۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں آپ! اگر اس کو فلم میں چانس مل گیا تو فلم فلاپ ہونے کی صورت میں بھی ہیر و فن فلاپ نہیں ہو گی۔ قیامت ہے قیامت۔“ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

”اب میں سوؤں گی۔ آج تو نیند خراب ہونے سے میرا شہر ہو گیا ہے۔ صبح اٹھنا واقعی شہر کر دیتا ہے۔“ پھر وہ چلی گئی تو پومی نے روم میں داخل ہو کر بتایا۔ ”مما میں نے ملازمہ سے کاشتے کا کہہ دیا۔“ پھر آہستہ سے کہا۔

”کیا خیال ہے ٹر کی یہاں تک جائے گی۔ بہت گھبرائی اور خفزدہ سی لگتی ہے۔

”وہ تو لگتا ہی ہے۔ گھر سے بھاگنا کوئی چھوٹی بات تو نہیں۔ سمجھو ہماری لڑی نکل آئی۔“ زبرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور اگر اس کے گھر والے اس کو یہاں لینے آ گئے؟“ پومی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”ان کو ہمارے گھر کا پیہ پی نہیں اور ویسے بھی روٹی کی ماں نے کرن کو بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکالا تھا اور روٹی کا بھی کافی عرصہ سے مطلب تب سے گھر سے باہر جانا بند تھا۔“ زبرہ خانم نے اطمینان سے کہا۔

”پھر بھی آپ کا بیتی تیاری مکمل رکھنی چاہیے اس امکان کا انور نہ کریں کہ وہ یہاں نہیں آئیں گے بلکہ سوچیں وہ آئیں تو کیا کہنا ہے۔“ پومی نے کہا تو زبرہ خانم نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

”آج تو تم نے بڑی عقلمندی کی بات کی۔ ہاں ہو سکتا ہے وہ یہاں آئیں۔ اب ارم سو کر اٹھتی ہے تو بات کرتی ہوں۔“

”مما! میں ہمیشہ عقلمندی کی بات کرتا ہوں۔ مگر آپ غور کم کرتی ہیں۔“ پومی نے کہا۔ پھر ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا اور زبرہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے کہا۔

”مما! مجھے دس ہزار کی ضرورت ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔“

”دس ہزار سے کم کی بھی کبھی ضرورت محسوس ہوئی ہے تمہیں۔“ زبرہ خانم اس کے گود میں سر رکھ کر لیٹنے سے سمجھ گئی تھیں۔ وہ کوئی مطلب کی بات ان سے کرنے والا ہے۔

”مما! سب دوست وزٹ کے لیے مری جا رہے ہیں۔ مجھے بھی جانا ہے۔ پلیز!“ پومی نے ایک بار پھر ان کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

”ابھی نہیں آج مجھے روٹی کے لیے شاپنگ کرنی ہے۔ اس کے پاس نا تو کوئی سوٹ ہے نہ جوتانا نہ جیلری نا بیگ، پرس کچھ بھی اس کے پاس نہیں۔ پچاس ہزار میں تو اس کی شاپنگ مکمل ہو گی۔ مفت میں تو کچھ بھی نہیں ملتا۔“ زبرہ خانم نے بتایا۔

”مما! شاپنگ چالیس ہزار میں کر لیں دس مجھے دے دیں۔“ پومی نے کہا، پھر تو زبرہ نے گلے میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا بٹوانا نکالتے ہوئے کہا۔ ”خدا جو کرو پوری کر کے رہتے ہو۔“ پھر دس نوٹ ایک ہزار والے گن کر اس کو دیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”ارم اور کرن کو خبر نا ہو کہ میں نے تمہیں پیسے دیئے ہیں۔ ورنہ پھر وہ دونوں خفا ہوتی ہیں۔“



”میرا داغ خراب ہوا ہے جوان کو بتاؤں گا۔“ پومی اٹھا، پاکٹ سے والٹ نکل کر پیسے اس میں رکھتے باہر نکل گیا۔ زبرہ روبی کے گھر والوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ آئے تو کیا کہنا ہے۔ ان کے آنے سے پہلے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

ادھر روبی کی تلاش ناممکن ثابت ہوئی تھی۔ روبی کو زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود پتہ نہیں چل سکا تھا۔ کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔ یوں بھی کوئی سر پیر تو تھا نہیں۔ سنا ہی روبی نے کوئی نشان چھوڑا تھا۔ نہ ہی کوئی اس کی فرینڈ تھی۔ جس کے گھر روبی کا پوچھنے جاتے۔ وہ دونوں باپ بیٹا اپنے طور پر اس کو پارکوں میں اور ادھر ادھر گھوم پھر کر تلاش کرتے رہے تھے۔ صبح سے شام ہوئی مگر روبی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ پولیس میں رپٹ درج کروا کر وہ اپنی اور اپنے خاندان کی رسوائی نہیں چاہتے تھے۔ وہ باپ بیٹا میاؤں اور نا کام جب واپس گھر آئے تو غم سے دونوں مڑھل تھے۔

ان کی دن بھر کی ناکامی ان کے چہروں پر لکھی ہوئی تھی۔ اس لیے کسی نے ان سے روبی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ انہوں نے خود ہی بیوی کے پاس بیٹھتے ہوئے غم سے بھرے ٹھکن سے چور لہجے میں کہا۔ ”کوشش کے باوجود نہ روبی ملی نہ روبی کا کوئی سراغ ملا۔ شاید اس لیے لوگ بیٹیوں کی دعا نہیں مانگتے۔ دیکھ لو تمہاری بیٹی نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اچھا زمانہ تھا جب لوگ بیٹیاں زندہ دفن کر دیتے تھے۔ کم از کم اس ذلت سے تونج جاتے تھے جس کی زد میں ہم آئے ہیں۔ اب مجھے بتاؤ میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟ روجی کی شادی سر پر ہے اور شادی میں اس کو نہ پا کر سب ہی اس کے بارے میں سوال کریں گے اور میں کیا جواب دوں گا۔“ وہ بچوں کی طرح چہرہ چھپا کر رونے لگے۔

سلمان الگ کھڑا ذہن سے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ رات ہو رہی تھی مگر ان لوگوں کے یہاں آج چولہا گرم نہیں ہوا تھا جبکہ پرسوں سے مہمانوں کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ وہ سب یونہی گم سم بیٹھے تھے کہ اچانک ہی بلال آگئے۔ سب گھر والوں کو یوں پریشان بیٹھ دیکھا تو خود بھی پریشان ہو گئے۔

”کیا ہوا سلمان؟“ انہوں نے بیگ ایک جانب رکھتے ہوئے پوچھا۔ سلمان ماں باپ کی شکل دیکھنے لگا کہ بات چھپائی جائے یا بتادی جائے۔ مگر کسی جانب سے کوئی اشارہ نہ پا کر اس نے خاموشی اختیار کر لی اور اس کو خاموش دیکھ کر وہ شمشاد بیگم کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”کیا ہوا خلع جان؟ کیوں پریشان ہیں آپ سب لوگ۔ مجھے بھی بتائیں میں بھی آپ کا بیٹا ہوں نا۔“ اور اس کی بات سن کر شمشاد بیگم اس کے گلے لگ کر بلک کر رونے لگیں۔ کچھ دیر یونہی روتی رہیں پھر بولیں۔

”بلال، ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ اس نے ہماری ساری عزت خاک میں ملا دی ہے۔ ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیا۔“

”کس کی بات کر رہی ہیں آپ خلع جان؟“ بلال نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”مگر رونے اور مارے غم کی شدت سے ان سے بولا ہی نہ گیا تو بلال نے استفسار کرنے والی نگاہوں سے روجی کو دیکھا۔

”بلال! روبی گھر سے بھاگ گئی ہے۔“ روجی بتاتے ہوئے رو پڑی۔

”کیا کہا۔ روبی بھاگ گئی۔ مگر کب؟“ بلال نے پوچھا۔

”آج صبح۔“ روجی نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

”آپ لوگ کہاں تھے اس وقت۔“ بلال نے پھر پوچھا۔ ”ہم لوگ تو اس وقت گھر پر ہی تھے۔ وہ زوبی کے ساتھ اس کے سکول میں تبا زار دیکھنے گئی تھی اور زوبی کو راستے میں ہی چھوڑ کر بھاگ گئی۔“ روجی نے وضاحت سے بتایا۔

”اگر وہ ایسی ہی تھی تو آپ نے اس کو گھر سے باہر جانے کی اجازت کیوں دی۔“ بلال نے منھض نصیر اور سلمان کی وجہ سے کہا اور نہ وہ اور روجی کھل کر روبی کے بارے میں آپس میں ڈسکس کر چکے تھے۔ بلال کی بات سن کر شمشاد نے کہا۔

”بس بیٹا! انہوں نے کون روک سکتا ہے۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا اور میں نے اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ یہ سوچ کہ کافی عرصہ ہو گیا ہے وہ کبھی گھر سے باہر نہیں گئی آج کہہ رہی ہے جانے کو تو جلی جائے۔ ذرا تفریح ہو جائے گی اور وہ زوبی کو راستے میں ہی چھوڑ کر جلی گئی اور ہماری عزت خاک میں ملا دی۔“ شمشاد نے گڈو کی بجائے سارا الزام اپنے سر لیتے



ہوئے بتایا اور بات ختم کر کے ایک بار پھر شدت سے رونے لگیں۔ صبح سے رورو کران کا حشر ہو گیا تھا۔ اگر شر کے میں بتا چل گیا تو کیا ہوگا۔

بلال نے سوچا وہ تو بھی ہی آوارہ اس سے ایسی حرکت کے علاوہ اور کسی بات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ جو کچھ برسات کی اس طوفانی رات کو اس نے کیا تھا اس کے بعد یہ بات بلال کے لیے باعث حیرت نہیں تھی۔ ان کو تو اب اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ وہ روپی سے آٹھ دس برس بڑے تھے۔ اس کے باوجود وہ کتنی بے تکلفی سے ان کا نام لے کر ان کو مخاطب کرتی تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر سوچا شکر ہے وہ بچ گئے۔ ایسی آوارہ لڑکی کے ساتھ اگر شادی کر لیتے تو پھر انجام کیا ہوتا تھا۔ ایسی عادتیں جاتی نہیں۔ اب وہ گھر والوں کی پریشانی سمجھ سکتے تھے۔

روٹی کی شادی سر پر تھی۔ پرسوں سے مہمانوں کی آمد شروع ہوتی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید لوگ نہ پوچھتے مگر شادی پر تو اس کی غیر حاضری کا سب نے پوچھنا تھا۔ اس مسئلے کا حل اب ہر حل لازمی ہو چکا تھا۔

”بلال تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ ہمیں بتاؤ ہم کیا کریں؟“ روٹی نے پوچھا۔

”آپ لوگوں نے اس کو تلاش کیا ہے؟“ بلال نے پوچھا۔

”ابا اور سلمان صبح سے سارے پارک، گلی بازار پھر کرائے ہیں مگر وہیں ملی۔“ روٹی نے بتایا تو بلال نے پوچھا۔

”اس کی سہیلیوں کے گھر سے تلاش کیا ہے؟“

”اس کی کوئی سہیلی تھی ہی نہیں۔“ روٹی ہی نے پھر بتایا۔ گڈ تو بلال کو دیکھتے ہی اندر روم میں چلی گئی تھی اس نے بلال کے بارے میں سن رکھا تھا مگر دیکھا آج پہلی بار تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کوئی سہیلی نہ ہو؟“ آپ کہتے ہیں کہ وہ کافی عرصہ سے گھر سے باہر نہیں گئی اور گھر سے بھاگنا کوئی چھوٹی بات نہیں۔ ممکن نہیں کہ وہ بغیر کسی پروگرام کے بھاگ جائے۔ یقیناً کسی نے اس کو پتاہ کی آفر کی ہوگی۔ آپ اس کی سکول کی سہیلیوں کے گھر سے پتا کریں۔ ہو سکتا ہے وہ ان میں کسی کے گھر ہو۔“

یہ سن کر شمشاد نے اس کو کرن کے بارے میں بتا دیا تو بلال نے کہا۔

”ہو سکتا ہے وہ آپ سے چھپ کر ملنے آتی ہو۔ آپ انھیں بھی ان کے گھر جا کر چیک کرتے ہیں۔“

”مگر کرن کے گھر کا ہمیں معلوم نہیں کہاں ہے؟“ روٹی نے کہا۔

”کرن کی کسی فرینڈ کو تو معلوم ہو گیا پھر اس کے سکول سے کرن کے گھر کا ایڈریس لیں۔“ بلال نے کہا تو سلمان پہلی بار بولا۔

اس کے لیے کل صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت تو سکول بند ہو گا اور پھر یہ طے ہو گیا کہ شمشاد، سلمان اور بلال خود کرن کے گھر جائیں گے روپی کو تلاش کرنے۔ اس کے بعد بلال نے کہا۔

”اب مزید رونے کی ضرورت نہیں۔ انھیں اور کھانے کا انتظام کریں۔ یقیناً آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوگا بلکہ رہنے دیں اب اس حالت میں۔ ہو سکتا ہے پکانے کا موڈ نہ ہو

میں سلمان کے ساتھ جا کر بازار سے کچھ پکا پکایا لے آتا ہوں۔“ پھر روٹی روکتی ہی رہ گئی مگر بلال سلمان کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی سلمان روٹی کو ساتھ لے کر روپی کے سکول گیا اور پھر دونوں بہن بھائی کرن کے گھر کا ایڈریس لے کر ہی آئے تھے۔ گھر آتے ہی ساری بات طے کرنے کے بعد شمشاد، روٹی بلال اور سلمان کرن کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

روٹی کو آخر میں پروگرام میں شامل اس لیے کیا تھا کہ حمیدہ خاتون سب بات کرے گی اور روٹی جلدی سے گھوم پھر کر روپی کو تلاش کرے گی۔

کرن کے گھر کا ایڈریس پرچو کیدار موجود تھا۔ روٹی نے کہا۔

”اندرا اطلاع دو کرن کی سہیلی روپی کی بہن اور امی آتی ہیں۔“ چو کیدار گیٹ کی کھڑکی کھول کر اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد آ کر بولا۔

”اندرا چلے جائیں۔“ وہ چاروں گھر میں داخل ہو گئے۔ سامنے ہی ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ ان چاروں کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ پھر ان کو بیٹھکا کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد کرن کے ساتھ زہرہ خانم بڑے سٹائل سے اپنے نائٹ گاؤن کی ڈوریاں کستی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ کچھ دیر ان سب کو دیکھتی رہی۔ پھر منہ بناتے



ہوئے ناکاری سے بولیں۔

”بندہ کہیں جاتے ہوئے نام دیکھ لیتا ہے۔ صبح ہی صبح ہماری نیند خراب کر دی فرمائیے کیسے آنا ہوا۔“

”پہلے روپی کو بلائیں۔“ حمیدہ بیگم نے کہا۔

”کون روپی؟ اور کہاں سے بلائیں۔“ زہیرہ بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔

”اندرا نے سے پہلے ہم نے چوکیدار کو بتایا تھا کہ روپی جو کرن کی ٹیلی ہے اس کے گھر والے آئے ہیں۔“ سلمان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”دیکھوڑ کے میں بارہ بجے سو کر اٹھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے میں نے نام نہ سنا ہو بہر حال اصل بات کیا ہے۔ وہ کہو۔“ وہ ذرا سا بھی ڈرے بغیر بولی۔

”اصل بات یہ ہے روپی کل صبح گھر چھوڑ کر جی گئی اور ہمیں کسی نے بتایا ہے وہ یہاں سیدھی آپ کے گھر آئی ہے۔“ بلال نے سلمان کو پیچھے کرتے ہوئے خود بات کی۔

اور بلال کے یہ کہنے پر کہ ہمیں کسی نے بتایا ہے کہ وہ گھر سے نکل کر سیدھی ادھر آئی ہے۔ چالاک ذہن رہا سمجھ گھٹیں کہ وہ نکلا رہا ہے۔ اس لیے تیزی سے بولی۔

”کڑ کے جھوٹ بولتے ہوئے تمہیں شرم آتی چاہیے۔ روپی یہاں نہیں آئی۔“

”میری بیٹی بہت پہلے روپی سے ملنا چھوڑ چکی ہے۔ وہ بھی روپی کی ماں کے کہنے پر۔“

”ہم گھر کی تلاشی لیں گے۔“ شمشاد بھی کھڑی ہو گئی۔ ان کے ساتھ روجی بھی جبکہ بلال اور سلمان تو پہلے ہی کھڑے تھے۔

”بی بی! تم ہوش میں ہو۔ تم ہوتی کون ہو ہمارے گھر کی تلاشی لینے والی؟ جاؤ اور پولیس کو لے کر آؤ۔ خبردار اگر پھر یہ کہا کہ روپی ہمارے یہاں آئی ہے۔ میری بیٹی کے ساتھ اس کی

دوستی ضرور بھی مگر جب وہ روپی کے سکول چھوڑنے کے بعد کرن اس کو ملنے گھر گئی تو تم نے میری بیٹی کی بے عزتی کر کے گھر سے نکال دیا اور اس کے بعد میری بیٹی بھی روپی سے نہیں ملی

اور اب جاؤ اور دوبارہ اگر یہاں آنا ہو تو ساتھ پولیس کو لے کر آنا۔“ وہ لوگ یہ سنتے ہی ان کے گھر سے باہر چلے آئے مزید وہاں رکنا فضول ہی تھا۔

گھر آ کر سب نے سوچنے کے بعد یہ طے کیا کہ وہ سب لوگوں سے یہی کہیں گے کہ شمشاد روپی کو ساتھ لے کر ایٹ آباد شادی کا کہنے گئی تھیں۔ چونکہ اتنا لمبا سفر کبھی نہیں کیا اس

لیے وہ وہاں جاتے ہی شدید بیمار ہو گئی۔ پھر اس کو ہیضہ بھی ہو گیا تو شمشاد بلال کو ساتھ لے کر لاہور آ گئی۔ شادی میں دن ہی کتنے رو گئے تھے۔ اب صحت مند ہونے تک روپی وہاں

ایٹ آباد میں ہی رہے گی۔ اس طرح وقتی طور پر یہ مسئلہ حل ہو گیا اور شمشاد نے بلال کو بھی سمجھا دیا کہ وہ اپنی امی اور بھابی گل کو بھی سمجھا دیں کہ اگر کوئی اپنے طور پر ان کو پوچھے تو وہ بھی

یہی جواب دیں۔ کچھ رشتے دار کہنے بھی تو ہوتے ہیں اور بلال نے تسلی دیتے ہوئے کہہ دیا۔

”آپ فکر نہ کریں ایسا ہوگا۔“

”پھر شمشاد نے گڈو کو بھی سمجھا دیا کہ تم سے سب نے بطور خاص پوچھنا ہے۔ ان سب کو اچھے طریقے سے مطمئن کرنا۔“ اور گڈو نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

روپی نے گھر سے بھاگ کر شادی کو مرگ کے سوگ میں بدل دیا تھا۔ یوں اس صدمے کا سامنا اندر ہی اندر کرتے ہوئے کڑے ضبط سے گزرتے ہوئے وہ سب لوگ شادی کے

انتظامات میں لگ گئے۔

بظاہر سب مہمانوں کو دکھانے کے لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی تھی مگر اندر سے سب کا جو حال تھا وہ ہی جانتے تھے۔ بلال کے سب گھر والے ابھی آ چکے تھے کیونکہ کمال کو رہائش

کے لیے بنگلہ مل گیا تھا۔ بلال نے اپنے گھر والوں کو آتے ہی روپی کے گھر سے بھاگنے کا بتاتے ہوئے باقی کی ساری بات بھی سمجھا دی تھی۔ یہ سب سن کر ان سب نے افسوس کا اظہار

کیا تھا مگر کسی کا افسوس روپی کو واپس نہیں آ سکتا تھا۔

☆☆☆☆

ادھر جب چوکیدار نے بتایا روپی کے گھر والے آئے ہیں تو زہیرہ خانم فوراً چوکس ہو گئیں۔ خیر چوکس تو وہ کل سے ہی تھیں۔ جب پوی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے

اسی وقت چوکیدار کو اندر بلا کر اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر کوئی روپی کی تلاش میں آئے اور تم سے روپی کے بارے میں پوچھے تو صاف صاف کہہ دے کون روپی؟ کیسی روپی؟ میں کسی

روپی کو نہیں جانتا۔ میں تو یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔ پھر ارم کا ٹھٹھنے کے بعد انہوں نے اس کے سامنے بھی پوی کے خدشے کا اظہار کیا تو ارم نے کہا۔



”ڈرنے کی کوئی بات نہیں مگر جو بھی کرنا ہے خود ہی کیجئے گا مجھے جگانے کی ضرورت نہیں۔ کل ہی صبح اٹھنے سے میرا حشر ہو گیا۔“

”ارم کے بعد انہوں نے روپی اور کرن کو بھی ساری بات اچھی طرح سمجھا دی تھی اور اب جب روپی کے گھر والوں کے آنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے روپی کو فوراً کچن میں چھپا دیا تھا۔ مل کے کسی حصے میں تھوڑا خوف بھی تھا۔ چونکہ ارم نے بتایا تھا۔ دوسرے بھی آئے ہیں۔ زہرہ خانم نے سوچا کہ میں وہ زبردستی گھر کی تلاشی نہ لے لیں۔ شوہر صاحب چند روز پہلے اپنے آبائی گاؤں گئے تھے اور پوری کل کا دس ہزار لیتے ہی دوستوں کے ساتھ وٹ پر چلا گیا تھا۔“

ان لوگوں نے جب تلاشی کا کہا تو زہرہ خانم ڈر گئیں۔ انہوں نے سوچا وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ مگر خیر گزری بات زیادہ نہیں برہمی تھی۔ پولیس کا نام سنتے ہی وہ لوگ تلاشی کا پروگرام ختم کر کے واپس چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ بھی اطمینان کی سانس لے کر اپنے روم میں واپس آ گئی تھیں جبکہ کرن سے کہا تھا کہ اب وہ روپی کو کچن سے نکال کر لے آئے۔ روپی کرن کے ساتھ ان کے روم میں آئی تو رنگت مارے خوف کے پیلی پڑ چکی تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی تلاشی کی صورت میں اگر وہ پکڑی گئی تو پھر سلمان اس کو گھر لے جا کر کبھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ زہرہ خان نے اس کو دیکھتے ہی گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”آئی بلائل گئی۔ وہ لوگ واپس چلے گئے ہیں۔ وہ لوگ تلاشی لینا چاہتے تھے لیکن جب میں نے کہا تلاشی کے لیے پولیس کو ساتھ لے کر آؤ۔ یہ سنتے ہی وہ ٹھنڈے ہو کر چلے گئے۔ مگر تمہارا بھائی بہت غصے میں تھا۔ کہتا تھا ایک بار روپی مجھ سے مل جائے میں اس کو قتل کر کے کسی چھوڑوں گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت بکواس کر رہا تھا۔“ زہرہ خانم نے محض روپی کو خوفزدہ کرنے کو کہا۔

”کون کون آیا تھا؟“ روپی نے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری می تھی۔ آپنی تھی اور تمہارے بھائی کے علاوہ ایک نوجوان اور تھا جس کو جاتے ہوئے تمہاری ماں نے بلال کہہ کر مخاطب کیا تھا۔“ زہرہ خانم نے بتایا تو روپی کے چہرے پر ایک دنگ سا آ کر گزر گیا اور اس نے کہا۔

”آئی جی! مطلب آپاجی! میں اب اپنے روم میں چلی جاؤں۔“ زہرہ خانم نے ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

”تم خوفزدہ ہو۔“ کرن نے روپی کو واپس اپنے روم میں آتے ہوئے پوچھا؟ تو روپی بولی۔

”کیا مجھ سے نہیں ڈرنا چاہیے جبکہ تم میری می کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ کتنی کرخت مزاج ہیں اور سلمان بھائی ان سے بھی کئی ہاتھ آگے ہیں۔“

”ساتھ میں روحی آپا کا ذکر خیر کیوں نہیں کیا۔ وہ اپنی ماں سے کم سفاک تو نہیں۔“ کرن نے مسکرا کر کہا۔ مگر روپی جواباً مسکرائے۔ کرن نے ہی پھر کہا۔

”یار کل بھی تمہاری وجہ سے کالج نہ جا سکی اور آج پھر چھٹی ہو گئی۔“

”آئی ایم سوری! میں آپ لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔ کل ارم آپنی بھی اپنی نیند خراب ہونے کا شکوہ کر رہی تھیں۔“ روپی نے آہستہ سے کہا۔

”اے! بکواس نہیں۔ میں نے یونہی ایک بات کی ہے اور تم بیٹھ گئیں سوری کرنے۔“ باقی رہی ارم آپنی تو انہوں نے بھی بس یونہی تذکرہ کیا تھا اور تم دل پر لے کر بیٹھ گئی۔ ارم آپنی رات

گئے تو شوٹنگ سے واپس آتی ہیں۔ اس لیے ان کے پاس سونے کا یہی نام ہوتا ہے اور تمہیں سچی بات بتاؤں تمہارے آنے سے میں بے حد خوش ہوں۔ پہلے میں گھر میں کی گئی تھی۔

آپا تو خود بھی سائے کی طرح آپنی کے ساتھ رہتی ہیں۔ اب مجھ سے بات کرنے کے لیے اپنی فیورٹ دوست مل گئی۔“

”اچھا یار! اب میں بھی سونا پسند کروں گی اور تمہیں بھی میرا یہی مشورہ ہے۔ فضول میں کسی کو یاد کر کے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔ مجھ سے وقت نیند نہیں آتی۔“ روپی نے کہا تو کرن بولی۔

”اگر یہ بات ہے تو ملازمہ سے کہو تمہیں ناشتہ بنا دے اور پھر کمبل منہ پر کھینچ لیا۔ روپی اٹھ کر باہر لان میں آ گئی۔ کرن کی امی نے یہ بتا کر کہ بلال بھی ان کے ساتھ آیا تھا روپی کا دل

دکھایا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی وجہ سے اسے اپنا گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ اگر وہ روحی کو طوفانی رات کی سٹوری نہ سنانا تو کیا بکڑ جاتا۔ اب وہ سوچ رہی تھی بلال اس کے گھر سے بھاگنے کا سن

کر سوچتے ہوں گے۔ وہ تو تھی ہی آوارہ وہ لان میں بیٹھی بلال کے بارے میں ہی سوچتی جا رہی تھی۔

بارات والے دن بلال باہر گیٹ پر کھڑے تھے۔ بارات آنے میں تھوڑی ہی تاخیر ہو گیا تھا۔ کبھی استقبال کی تیاری کر رہے تھے۔ بلال کو گیٹ پر کھڑے بھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی



کہا چنانک جمشید وہاں سے گزرا اور بلال پر نظر پڑتے ہی ٹھٹھک کر رک گیا۔ تبھی بلال کی نگاہ بھی اس پر پڑی تو بڑی حیرت سے بولا۔

”جمشید تم اور یہاں۔ تم تو اسلام آباد چلے گئے تھے! اپنی محبوبہ کی یاد کو بھولنے کیلئے پھر دوبارہ یہاں کیسے چلے آئے۔“

”یہی بات میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ایسٹ آباد کی بجائے تم یہاں کیسے؟“ جمشید نے حیرت سے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا تو بلال اس کے گلے ملتے ہوئے بولے یہ میری خالہ کا گھر ہے۔ تم بتاؤ لاہور کب آئے۔ تم نے تو مجھے کہا تھا کہ ”تم بھی زندگی میں لاہور کا رخ نہیں کرو گے جہاں تمہاری محبت چھن گئی۔“

جمشید بلال کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس کو بازو سے پکڑ کر ایک جانب لے گیا۔ پھر بلال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ تمہاری سگی خالہ کا گھر ہے؟“

”سگی ہو یا سوتیلی مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔“ بلال نے جمشید کے پر اسرار رویے سے پریشان ہو کر پوچھا۔

”دیکھو بلال! تمہارے لیے یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ یہ تمہاری سگی خالہ کا گھر ہے ورنہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔“ جمشید نے پھر پہلے والے انداز میں کہا تو بلال نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

”جتنا نہیں تم کیسی پر اسرار سی باتیں کر رہے ہو۔ بتانا بہت ضروری ہے تو سنو جمشید خالہ میری امی کی منہ بولی بہن ہیں۔ اب تم بتاؤ تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔“ بلال نے بات ختم کر کے پوچھا۔

”تمہاری خالہ کی مٹی روجی کی آج بارات ہوتا۔“ جمشید نے سامنے لگے شامیانوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں! آج روجی کی بارات ہے۔ مگر تم کیسے جانتے ہو۔“ بلال نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”میں؟“ جمشید ہنس پڑا۔ ”جیسے بھی سمجھ لو۔“

”یار جمشید! ایسی باتیں مت کرو پر اسرار سی۔ مجھے سیدھی طرح بتاؤ تم روجی کو کیسے جانتے ہو۔“ بلال نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بڑے بیوقوف ہو جواب بھی نہیں سمجھتے تو میں تمہیں کھل کر بتاتا ہوں۔“ میری وہ محبوبہ روجی ہی تھی۔ جس کی وجہ سے میں نے لاہور چھوڑا تھا۔ بڑا زبردست عشق کیا تھا اس نے مجھ سے اور اپنی سادگی اور محبت کی دیوانگی میں یہ سمجھا تھا کہ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ ویسے ہی جیسے میں اس کو دل کی کبراہیوں سے چاہتا تھا مگر افسوس! ایسا نہیں تھا۔ روجی ایک دھوکے باز لڑکی تھی۔“

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا مطلب ہے تمہاری ان باتوں کا۔“ بلال نے الجھ کر پوچھا تو جمشید بولا۔

”مطلب تو صاف ہے اس کے باوجود اگر تمہیں سمجھ نہیں آئی تو میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں اور جمشید نے شروع سے لے کر آخر تک بلال کو ساری کہانی سنا ڈالی اور سب کچھ سن کر بلال نے پوچھا۔

”یار جمشید! تم نے روجی کہا تھا یا روبی۔“

”روجی! جمشید نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا تو لہجے میں حسرت نمایاں تھی۔ یہ اور بات ہے اس کے ساتھ بے بسی اور بے چارگی بھی اس میں شامل تھی۔

”یار! تم غلط تو نہیں کہہ رہے۔“ روجی کو پار سا سمجھنے والے بلال نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”میرا خیال ہے تم یہ سب روبی کے بارے میں کہہ رہے ہو۔ یہ سب حرکتیں روبی نے کی ہوں گی۔“

”تمہارا دماغ درست ہے بلال!“ جمشید نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔ عشق میں نے کیا تھا یا تم نے۔ میں روبی کو نہیں روجی کی بات کر رہا ہوں۔ روبی تو روجی سے چھوٹی ہے اور اس وقت تو وہ بالکل بچی تھی۔ روجی تو روبی کے ہاتھ ہی تو مجھے خط بھیجا کرتی تھی اور جو باتیں بھی روبی کوئی اس کی سکول واپسی پر رقعہ پکڑا دیا کرتا تھا۔ اور روجی کا خط وہ مجھے سکول جاتے ہوئے دے کر جاتی تھی۔ روبی تو بہت پیدی بچی تھی۔ دراصل روجی اور اس کی آوارہ سہیلی غزالہ یہ دونوں اپنے اپنے لولہ شربوبی کے ہاتھ ہی اپنے دوستوں کو بھیجتی تھیں کیونکہ اس وقت وہ چھوٹی تھی اور گھر سے باہر ونی آتی جاتی تھی۔ جانتے ہو روجی کے تمام لولہ شربوبی کے پاس محفوظ ہیں اور آج میں یہ تمام لولہ شربوبی کے دولہا میاں کے حضور پیش کر کے روجی کو اس کی مکاری اور بے وفائی کا مزہ چکھا دوں گا۔



”کیا بکواس کر رہے ہو۔ تم ایسا برگز نہیں کرو گے۔“ بلال نے غصے سے کہا۔

”نہیں بلال! تم مجھے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتے بلکہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی۔ میں یہ لیٹراس کے دلہا کو ضرور پیش کروں گا۔ اس نے لڑکی ہو کر مجھے بے وقوف بنایا۔ میں تو پوری شدت سے روجی سے محبت کرتا تھا اور اپنے طور پر سمجھتا تھا وہ بھی مجھ سے چاہتی ہے جیسا کہ وہ مجھ سے کہتی تھی۔ آخری بار وہ مجھ سے ملنے آئی تو بہت افسردہ تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو روتے ہوئے کہنے لگی۔

”میری منگنی ہو گئی ہے۔ اگرچہ میں گھر والوں کے سامنے بے بس اور مجبور تھی۔ اس لیے منگنی سے انکار نہ کر سکی، تاہم اگر اسی طرح زبردستی شادی کرنے کی کوشش کی گئی تو کسی اور کی ہونے سے پہلے وہ خودکشی کر لے گی کہ وہ میرے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ یہ سن کر میں نے کہا۔

”روچی ڈیئر! تم ایسا مت کرنا۔ میں خود تمہارے والدین کے پاس آؤں گا اور ان کے پاؤں پکڑ کر تمہارا ہاتھ اپنے لیے مانگ لوں گا۔“

مگر اس نے روتے روتے مجھے روک دیا۔ یہ کہہ کر کہ میرے گھر والے بہت ظالم ہیں۔ وہ کبھی رضامند نہیں ہوں گے اور ان کا مجھے بھی بے عزت کریں گے۔ تم مجھے مرنے دو۔ مگر میں نے کہا۔

”روچی! خدا کی یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے، ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتے ہیں۔ مگر پہلے مجھ سے وعدہ کرو تم خودکشی نہیں کرو گی۔“ مگر وہ یہ کہہ کر آخری بار میرے گلے لگ کر روتے ہوئے کہہ کر چلی گئی کہ۔

”میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔“

اس کے بعد منگنی کے چند ہفتے بعد ہم نے یہ محلہ چھوڑ دیا اور پھر روجی کی جدائی کا غم سینے سے لگا کر میں نے لاہور کو ہی ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ دیا۔ اب میں اپنے والد کی وفات پر لاہور آیا تو میرا ایک دوست جو روجی کے گھر کی پچھلی جانب رہتا ہے اس نے مجھے لاہور چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو میں نے صاف صاف بتا دیا تمہارے محلے کی ایک لڑکی میرے لاہور چھوڑنے کی ذمہ دار ہے اور جب میں نے اس کو روجی کے بارے میں بتایا تو وہ بولا یا تم کن چکروں میں پڑ گئے بلکہ کسی لڑکی کے جل میں پھنس گئے۔ روجی کا تو کام ہی لڑکوں سے دوستی کرنا ہے۔ میرے اسلام آباد سے آنے والے ایک دوست سے وہ محبت کرتی رہی ہے۔ محبت نہیں محبت کا ناک کرتی رہی ہے اور اس کی کبریٰ سیلی غزالہ تو بہت زیادہ بد معاش لڑکی ہے۔ بیک وقت دو دو تین تین لڑکوں کو پھانس رکھا ہے اس نے۔

روچی اور غزالہ اپنے دوستوں کو ایک دوسرے کے بارے میں بھی لکھتی رہتی ہیں۔ غزالہ لکھے گی۔ ”میری کبریٰ سیلی روجی آپ کو سلام کہتی ہے۔“ اور روجی اپنے لولہٹر میں اپنے دوست کو لکھے گی۔ ”غزالہ آپ کو سلام کہتی ہے۔“ دونوں اپنے دوستوں سے گفتگو بھی وصول کرتی رہتی ہیں۔

یہ ساری باتیں سن کر میری آنکھیں کل گئیں۔ یہ محض اتفاق ہے میں نے روجی کی محبت میں اس کے تمام لولہٹر سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ آج میں اس مکار اور دغا باز لڑکی سے خود کو بے وقوف بنانے کا انتقام لوں گا۔ آج جب بارات واپس جائے گی تو روجی کو اپنی چالاکیوں کا سزا ملے گا۔ جب ساری دنیا کے سامنے رسوا ہو گی۔ ”تمہیں اگر اب بھی یقین نہیں آیا تو روجی کے لیٹر پڑھ کر دیکھ لو جو میں اس کے دلہا کو پیش کرنے والا ہوں۔“ جمشید کے لہجے میں شدید نفرت تھی۔

”مجھے یقین آ گیا ہے مگر سنو! تم یہ لولہٹر روجی کے دلہا کو پیش نہیں کرو گے۔“ بلال نے جمشید کے کان دھڑے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں یہ ضرور کروں گا اور میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم مجھے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتے۔“ جمشید نے ٹھونس لہجے میں کہا اور بلال کو وہیں چھوڑ کر ادھر بڑھ گیا جدھر سے بینڈا بے جی ہلکی ہلکی آواز آنا شروع ہوئی تھی۔



یہ دیکھ کر بلال نے تیزی سے آگے بڑھ کر جمشید کا راستہ روکتے ہوئے پوری سنجیدگی سے کہا۔ ”سنو جمشید! قصور روجی کا ہے اس کے والدین اور خاندان کا نہیں اور اس وقت سوال روجی کی عزت یا رسوائی کا نہیں بلکہ پورے خاندان کی عزت کا ہے۔ اگر بارات واپس چلی گئی تو والدین اور بھائی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ تمہاری



بھی پانچ بہنیں ہیں، ان کا سوچ کر ہی رک جاؤ اور یہ سارے لیٹرز بھی مجھ سے دو۔“ بلال کی بات سن کر جمشید چند لمحے سوچتا رہا پھر لیٹرز والا لفافہ بلال کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے دوست! میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن اگر آج تم یہاں نہ ہوتے تو میں کبھی روجی کو معاف نہ کرتا۔ مگر اس کی ماں تو اس کی حرکتوں سے باخبر ہوگئی۔“

”شکر یہ میرے دوست! اب تم جاؤ بات آرہی ہے۔“ بلال نے منت کرنے والے انداز میں کہا۔ جمشید وہاں سے جانے ہی والا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی غزالہ پر نظر پڑ گئی اور وہ ہیں رک کر بولا۔

”وہ دیکھو بلال! روجی کی پہلی غزالہ آرہی ہے۔“ بلال نے پلٹ کر دیکھا وہ غزالہ کو پہلے ہی سے جانتا تھا اور عزت اور احترام سے اس سے بہن کہتا تھا۔ وہ روجی اور غزالہ کو کیا سمجھتا تھا اور وہ کیا لگتی تھیں اور روجی کو کیا سمجھتا تھا اور وہ کیا تھی۔ یعنی جن کو اچھا سمجھا اور برائی کا حرف آخر تھیں اور جس کو برا سمجھا تھا وہ معصوم اور بے گناہ تھی۔ اس کی وجہ سے گھر چھوڑ کر نجانے کہاں گئی تھی مگر یہ وقت ان باتوں کو سوچنے کا نہیں تھا کہ بات آرہی تھی۔

گیٹ کے قریب پہنچ کر اچانک غزالہ کی نگاہ جمشید پر پڑ گئی۔ وہ گھبرائی ہوئی یوں بھاگ کر گھر میں داخل ہو گئی جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ آج اسے بلال کو سلام کرنا بھی یاد نہ رہا تھا۔ بلال نے جمشید کو جانے کا اشارہ کیا اور خود غزالہ کے پیچھے آیا۔ وہ روجی سے ان لیٹرز کے حوالے سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر اندر سے آتی غزالہ کی آواز سن کر ان کو دروازے پر ہی رکتا پڑا۔ وہاں پہنچے ہوئے روجی سے کہہ رہی تھی۔

”ارے روجی! میں نے ابھی ابھی باہر تمہارے جمشید کو دیکھا ہے۔“ پھر روجی نے لا پروائی سے شانے اچکاتے ہوئے غزالہ کو دیکھا۔ ”یار کہیں وہ کوئی گڑبڑ کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ مجھے تو ابھی سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اگر اس نے کوئی غلط حرکت کر دی تو کیا ہوگا۔“ غزالہ بے حد خوفزدہ تھی مگر روجی نہیں۔

”وہاں پر گز نہیں کرے گا۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف ہے۔ آج بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ میں اب بھی اس کو چاہتی ہوں۔ یہ شادی مجبوری کی حالت میں کر رہی ہوں۔“ روجی نے بات ختم کر کے ایک ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”بڑی ظالم ہو تم۔“

”کیا اس کی محبت بھری باتیں تمہیں یا نہیں آ رہیں اور اس کے بازوؤں کے حصار میں جتنے لمحے بھی تمہیں نہیں ستاتے۔“ غزالہ نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ ”قطعاً نہیں یار! اس کی یاد اب کیوں آئے گی جبکہ میں عامر کی ہو رہی ہوں۔ میں تو اپنی منگنی ہوتے ہی اس کو بھول گئی تھی۔ جو وقت بیت گیا سو بیت گیا۔ تم نے خود ہی تو مجھ سے ایک بار نہیں کئی بار کہا ہے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور میں چاہیے کہ اس کا ایک ایک لمحہ کا نچوڑ کر لیں۔ اچھا وقت گزرا ہے جمشید کے ساتھ میرا۔“ وہ اپنی چلائی اور جمشید کی بے وقوفی پر ایک بار پھر قہقہہ مار کر ہنسی۔

”ہاں بھئی! یہ بات تو ہے۔“ غزالہ نے روجی کی بات کی تعریف کی۔ پھر ہنس کر کہا اور دیکھو۔ ”لوگ کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا مگر ہم نے تو بڑے کامیاب عشق کیے بلکہ میں تو اب بھی بیک وقت تین لڑکوں سے کر رہی ہوں۔“ غزالہ بات کرتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر روجی نے مسخیدگی اختیار کرتے کہا۔

”غزالہ تم بھول رہی ہو ہمارے حصے کی ساری بدنامی اور رسوائی تو روٹی نے اٹھائی ہے۔ تمہارے پرویز کا لیٹر پکڑا گیا تو لازم روٹی پر آیا۔ میرے جمشید کا جب پکڑا گیا تو نام پھر روٹی کا لگا۔ آخر امی نے اس کا نام ہی آوارہ رکھ دیا۔ ان طعنوں اور ماں کی مار سے تنگ آ کر وہ گھر چھوڑ کر ہی بھاگ گئی۔“

”تم بھی تو پیچھے نہیں رہتی تھیں روٹی کو مارنے اور طعنے دینے میں۔ خاص کر بلال نے برسات کی طوفانی رات کی کہانی تمہیں جو ایسٹ آ باؤ اپس جانے سے پہلے سنائی تھی۔ بلال کے جاتے ہی تم نے اس طوفانی رات کے طعنے مار مار کر خود بھی اس کا جینا حرام کیا اور ماں کو بھی بتا دیا اور نہ وہ ایسی نہیں تھی کہ گھر چھوڑ کر جلی جاتی۔“

غزالہ نے جتا دیا۔ روجی خاموش رہی۔ غزالہ نے ہی پھر کہا۔

”سچی بات کہوں گی چاہے تمہیں بری لگے روٹی بہت اچھی لڑکی تھی۔ میں اس کے لیے پریشان ہوں۔ نجانے اب اکیلی کہاں بھٹکتی پھر رہی ہوگی۔ گناہ ہم نے کیا اور سزا وہ بھگتی رہی ہے۔ بلال والا قصہ سن کر خالہ جان نے بھی تو مارنے کی حد کر دی تھی۔ پھر سارا وقت ایک ہی لفظ آوارہ، آوارہ، پھر وہ گھر سے بھاگتی نہ تو کیا کرتی ورنہ میں نے کہا نہ وہ ایسی نہ تھی۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو وہ ایسی تو نا تھی مگر ماحول کا کچھ نہ کچھ اثر تو اس پر بھی لازمی ہونا تھا اور پھر سب نے لوگ غلط نہیں کہہ گئے کہ خبر بوزے کو دیکھ کر خبر بوزہ رنگ پکڑتا ہے۔“ روجی نے پہلی



بارعتراف کیا۔ اس سے زیادہ بلال سننا سکے کچھ مہمان خواتین آگئی تھیں۔ جلدی سے بلال دروازے کے پاس سے ہٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے باہر کھلی ہوئی آگئے۔ ان کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو روٹی کا مجرم سمجھ رہے تھے۔ ان کو پہلی بار شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ بھیا نک غلطی کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ جس کا کفارہ ادا کرنے کا موقع بھی پتہ نہیں۔ اب ان کو ملے گا یا نہیں۔ روٹی گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔

انہوں نے پہلی بار سنجیدگی سے سوچا۔ انہوں نے اگر روٹی کو راہ راست پر لانے کی کوئی کوشش بھی کی تھی تو تلخ، تند و تیز لہجے میں۔ کیا ایک پڑھا لکھا انسان اسی لہجے میں بات کرتا ہے، جس لہجے میں انہوں نے روٹی سے کی۔ کسی کو سمجھانے کا یہ طریقہ ہے کہ نازیبا زبان استعمال کی جائے۔ بازاری عورت، آوارہ اور بچانے کیا کیا کچھ اس کو کہہ دیا تھا۔ حالانکہ اس کے برعکس وہ ایک نیک اور معصوم لڑکی تھی۔

انہوں نے پہلی بار خود کو ہر ریش کرتے ہوئے سوچا۔

”سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے بلال کہ تم خود اپنے سے غمزہ تھے۔ تمہیں خود پر کنٹرول رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ مان لو کہ وہ محض تمہاری وجہ تمہارے برا بھلا کہنے سے گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی۔ یہ سب لوگ اس کو آوارہ بد چلن اور بچانے کیسے کیسے القابات سے نواز رہے تھے اور جو حقیقت میں آوارہ بد چلن اور بد کردار تھی وہ معتبر بن کر اس گھر سے پورے باعزت طریقے سے رخصت ہو رہی تھی۔ بلال کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اب کسی کو سچ بتا بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کا نام گزر چکا تھا۔ روٹی بچانے اس وقت کہاں بھٹکتی پھر رہی ہوگی۔ پھر بینڈا بے کی آواز سن کر وہ اپنے خیالات سے چونک پڑے۔ یقیناً بات قریب آ پہنچی تھی۔ بھی انہوں نے دیکھا سلمان تیزی سے ان کی جانب آ رہا تھا۔ پھر قریب آ کر بولا۔

”بلال بھائی! بات آگئی ہے۔ آپ بھی آئیں نا۔ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔“

وہ سلمان کے ساتھ بات کے مستقبل کے لئے چلے آئے۔ شادی کی تمام رسومات بخیر خوبی انجام پا گئیں۔ بلال تمام کاموں میں بری طرح بڑی رہنے کے باوجود روٹی کے خیل سے پیچھانا چھڑا سکے۔ سارا وقت ان کا ذہن روٹی کے خیالات میں ہی الجھا رہا۔ یہاں تک کہ بات دہن لے کر رخصت ہو گئی۔ سب نے گھر سے سکون کا سانس لیا کہ سب اچھا اچھا ہو گیا تھا۔ اب سب کی یہی دعا تھی اللہ دونوں کو خوشگوار زندگی عطا کرے۔

رات گئے جب سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ گھر کے اندر آئے تو محفل گرم تھی۔ سب ہی روجی کی تعریف کر رہے تھے۔ ان میں خود ان کی اپنی والدہ پیش پیش تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں

تھیں

”بہت گھڑ پئی تھی۔ بہت سکھ اور سکون دیا اس لڑکی نے والدین اور بہن بھائی کو۔ بے حد نیک اور سمجھ دار پئی تھی۔ جب تک گھر میں رہی ماں کو کسی بات کی فکر نہ تھی۔“

”ہاں آپا! بہت سکون دیا مجھے میری اس بیٹی نے۔ اللہ ایسی بیٹی سب کو دے۔ جو گھر میں ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کی طرح رہے۔ بس سارا وقت کھانا پکانے اور گھر کی صفائی سہرائی میں ہی لگی رہتی تھی۔“ حمیدہ بیگم نے دل ہی دل میں روٹی کی کروت یاد کر کے روتے ہوئے کہا۔ روجی کے ہوتے ہوئے مجھے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ اب سلمان کی شادی تک مجھے گھر سنبھالنا ہوگا۔ تبھی بیگم خلاق کی نظر بلال پر پڑی اور انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

”آؤ بیٹا! رک کیوں گئے۔ کیا فارغ ہو گئے؟“

”جی امی جان! سب کام ہو گیا ہے۔“ بلال نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔

”اور بیٹا آپ بھی فارغ ہو گئے۔“ اب کہا انہوں نے سلمان سے پوچھا۔

”جی آئی! سب کام مکمل ہو گیا ہے۔“ سلمان نے اب سے جواب دیا۔

”اگر یہ بات ہے تو آؤ پھر یہاں تم دونوں بیٹھو۔“ انہوں نے محبت سے کہا۔

سلمان تو بیٹھ گیا مگر جہاں روجی کی تعریف، روجی کی باتیں ہو رہی ہوں وہاں اب بلال کیسے بیٹھ سکتے تھے جبکہ ساری حقیقت ان پر کھل چکی تھی۔ وہ شمشاد خالہ کے صرار کے باوجود انکار کر کے سیدھے اوپر چھت پر چلے گئے جہاں سب مردوں کے لیے بستر لگائے گئے تھے۔ لیکن اب تک سوائے بلال کوئی بھی اوپر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ بلال لیٹنے کو بستر پر لیٹ گئے تھے مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اتنی دور جتنی دور اس سے روٹی بھی۔ بلال دونوں بازو سر کے نیچے رکھے آسمان پر چمکتے روشن چاند اور ستاروں



کو دیکھنے لگے۔ کوکہ اہل اپریل کے دن تھے مگر راتیں ابھی قدرے ٹھنڈی تھیں۔ چاند بھی اپنے پورے جوہن پر تھا۔ یقیناً چودھویں رات کا تھا۔ خنک فضا میں ہر طرف زرد زرد چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ بہت خوبصورت سماں تھا مگر بلال کو روپی کی وجہ سے سکون نہیں تھا۔ ایک بے چینی سی ان کماندرباہر تھی۔ وہ بنا پلکیں جھپکائے چاند ستاروں کو دیکھتے ہوئے روپی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ نجانے وہ اس وقت کہاں ہوگی اور کس حل میں ہوگی۔ یکدم ہی ان کی سماعتوں میں روپی کی آواز آنے لگی۔

”مجھڑ رلگتا ہے۔ میں باہر نہیں جاؤں گی۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں مجھڑ رلگتا ہے۔ پلیز بلال! دروازہ کھولیں۔ پلیز بلال!“ وہ چیخ رہی تھی۔ روپی تھی۔ بلال کو یوں قفل ہوا جیسے اس وقت وہ دور بہت دور کسی طوفان میں گھری ڈر کے مارے روتے ہوئے ان کو پکار رہی ہو۔ بلال یکدم تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔ اپنے بے رحم رویے کا احساس اب پوری شدت سے ہو رہا تھا۔ کیسے کس کس کے نرم و نازک دھڑکنے پر ہاتھ پڑ مارے تھے۔ حالانکہ وہ پہلی نظر میں ہی ان کو اچھی لگی تھی۔

”کیا ہوا بلال بھائی!“ سلمان جوا بھی ابھی آ کر بستر پر لیٹا تھا ان کے یوں اٹھ جانے پر پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں۔“ بلال نے چونک کر سمجھتے ہوئے کہا اور پھر لیٹ گئے۔ روپی کے خیالوں میں گم نہیں سلمان کتا نے کا احساس تک نہ ہو سکا تھا۔

سلمان کو دکھانے کے لیے بلال لیٹ تو گئے مگر ان کے اطراف میں ایک ہی صدا تھی۔ ایک آواز بلال مجھڑ رلگتا ہے۔“

”یا اللہ! یہ کیا کر دیا میں نے۔ یہ کیا ہو گیا ہے مجھ سے۔ اور اب کیا ہوگا۔“ پھر انہوں نے عہد کیا خواہ کچھ بھی ہو وہ روپی کو تلاش کر کے ہی دم لیں گے۔ اس کے بعد نیند بھی ان پر مہربان ہو گئی تھی۔ وہ مطمئن ہو کر سو گئے۔ انہوں نے ناجائبی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

اگلی صبح وہ نماز سے فارغ ہوتے ہی روپی کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے مگر روپی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ ملتی بھی تو کیسے کوئی اناجتا تو اس نے چھوڑا ہی نہ تھا۔ یونہی ایک بی نام سی امید کے سہارے وہ اس کو تلاش کر رہے تھے۔ سارا دن مارے مارے پھرنے کے بعد جب وہ اپنی گھر واپس آئے تو سب لوگ جاگ رہے تھے۔

ویسے کی رسم کے بعد روتی بھی اپنے دلہا کے ساتھ گھر آ چکی تھی۔ وہ اس وقت بہت خوش و خرم دکھائی دے رہی تھی۔ باقی گھر والوں کے چہروں پر بھی کچھ خاص پریشانی نہیں تھی۔ بیگم خلاق گل اور گڈو نے روپی کے حوالے سے سب کو خود گائیڈ کیا تھا۔ بیگم خلاق کہتی بے چاری روپی سگی بہن کی شادی میں شامل نہ ہو سکی۔ اپنی ناگہانی بیماری کی وجہ سے۔ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہو سکا تھا۔ ان کا وقت اچھا گزر گیا تھا۔ بلال کو ان سب کا رویہ دیکھتے ہوئے بے حد فاسوس ہو رہا تھا۔ وہ مجبور تھا۔ ان سب کو بتا نہیں سکتا تھا کہ اصل مجرم روپی نہیں روتی ہے۔

جب روپی نے سارے لازم خاموشی سے اپنے سر لے کر حوصلے سے سب کچھ برداشت کر لیا تھا، کبھی منہ نہ کھولا تو پھر بلال اس کی اس قربانی کو ضائع کیوں کرتے۔ انہوں نے سوچ لیا اس معاملے میں وہ بھی ہمیشہ اپنا منہ بند ہی رکھیں گے اور روتی کو یونہی عزت کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی بسر کرنے کا موقع دیں گے کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

”کہاں چلے گئے تھے تم بغیر بتائے؟“ بیگم خلاق نے انہیں دیکھتے ہی ناراضگی سے پوچھا۔

”امی جان! ایک بہت ضروری کام آن پڑا تھا۔ وہ بھی بالکل اچانک۔ اس لئے مسجد سے نکلتے ہی سیدھا دھڑپلا گیا تھا۔“ بلال نے آہستہ آہستہ سے بتایا۔

”پھر بھی تمہیں بتا کر جانا چاہیے تھا۔ جبکہ تمہیں یہ بھی معلوم تھا کہ آج روتی کا ولیمہ ہے۔“ بیگم خلاق ان سے سخت تھیں۔

”سوری امی جان! پھر بھی ایسا نہیں ہوگا۔ مگر میں نے بتایا نا کام اچانک ہی آن پڑا تھا۔“ بلال نے افسوس بھرا کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ خیر اب بتاؤ تمہارا کام ہو گیا ہے۔“ اب انہوں نے نرمی سے پوچھا اور یہ بھی بتاؤ کھانا باہر سے کھا کر آئے ہو یا اب کھاؤ گے۔

”جی نہیں امی جان!“ بلال نے کہا اور پھر ماں کے مزید سوالوں سے بچنے کیلئے زوپی سے پوچھا۔

”میرا بستر اوپر ہی لگایا گیا ہے یا۔۔۔۔۔“ انہوں نے دانستہ بات دھوری چھوڑ دی۔

”جی بھیا جان! اوپر چھت پر ہی آج بھی سب کے بستر لگے ہیں۔“ زوپی کا جواب سنتے ہی وہ اوپر جانے کے لیے مڑا۔ بیگم خلاق نے پھر کھانے کے لیے پوچھا۔ مگر وہ معذرت کر کے اوپر آگئے کہ باہر ہی سے کھا کر آئے ہیں۔ حالانکہ صبح سے لے کر ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ پھر بھی بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تھکے تھکے سے جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گئے اور پھر کل کی طرح آج بھی چمکتے ہوئے چاند ستاروں کو دیکھنے لگے۔ یہ سوچ ان کے دماغ میں در آئی کہ جتنے دور یہ چاند ستارے مجھ سے ہیں اتنی ہی دور روپی بھی مجھ سے ہے۔



روٹی کا سوچتے سوچتے ہی نجانے کیسا ان کی آنکھ لگ گئی۔ شاید اس لیے کہ سارے دن کے تھکے ہوئے تھے۔

انکی صبح وہ پھر تھکے تھکے گھر ایک نئے عزم کے ساتھ روٹی کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ پھر روٹی تو اسی زمین پر موجود تھی وہ کیوں نہیں ملے گی۔ وہ اب اس کو تلاش کر کے ہی دم لیں گے۔

جبکہ بیگم اخلاق حمیدہ سے اجازت لے کر کمال کے بنگلے میں چلی آئی تھیں۔ گل نے بیگم اخلاق کو ابھی اپنے یہاں روک لیا تھا۔ روٹی کی تلاش کے بغیر واپسی ایسٹ آباد جانے کا پروگرام بلال کا بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ بھی ابھی تک لاہور ہی میں موجود تھا۔

روٹی کی شادی کے چند روز بعد غزالہ کی ماں بطور خاص منوری کے گھر آئی۔ پھر چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بات روٹی کی شادی پر لے آئی اور کہا ماشاء اللہ بہت اچھا جنم دیا ہے شمشاد نے بیٹی کو اور بارات کو کھانا بھی بہت اچھا دیا تھا۔ دونوں طرف کے مہمان کھانے اور اچھا رنج کی تعریف کر رہے تھے۔

”ہاں اپنی حیثیت سے بڑھ کر سب کچھ کیا شمشاد نے۔“ منوری نے بھی تعریف کی تو غزالہ کی ماں خالدہ نے کہا۔

”کھانا بچ بھی کافی سارا گیا تھا۔ رات کو روٹی زردہ پلاؤ اور ساتھ قورمہ بھی دے کر گئی تھی۔ تمہارے گھر بھی آیا ہوگا۔“ خالدہ نے پوچھا۔

”ہاں ہمارے گھر بھی آیا تھا۔“ منوری نے بتایا۔ پھر بہو کو آواز دے کر کہا۔

”ذرا اپنی خالہ کے لیے چائے تو بنا دو۔“ پھر غزالہ کی ماں کی طرف متوجہ ہوئی جو آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

”اور منوری! بہن سب تو ٹھیک تھا پر تجھ ایک بات کی خبر ہوئی۔“ منوری کے کچھ کہنے سے قبل ہی ان کی بہو آئی اور اپنا بیٹا ان کی گود میں ڈالتے ہوئے بولی۔

”امی! آپ ذرا اس کو دودھ پلا دیں میں خالدہ خالہ کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔“ اور فیڈ رساں کو تھما کر چلی گئی۔ منوری نے فیڈر پوتے کے منہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

”کس بات کی خبر خالدہ بہن۔“

”ارے! روٹی کی شادی میں روٹی موجود نہیں تھی۔“ انہوں نے فوراً کہہ دیا۔

”ہاں! میں نے بھی اس کو نہ دیکھ کر پوچھا تھا۔ شمشاد بتا رہی تھی کہ جب وہ روٹی کو ساتھ لے کر ایسٹ آباد اپنی منہ بولی بہن کے گھر شادی کی دعوت دینے گئی تو روٹی وہاں جاتے ہی بیمار ہو گئی تھی۔ اس کو ہیضہ بھی ہو گیا تو وہ اس کو وہیں چھوڑ آئیں۔ شادی میں دن ہی کتنے تھے۔ خود بلال کے ساتھ لاہور واپس آ گئی۔ وہی لڑکا جو تین ماہ ان کے یہاں رہ کر گیا تھا۔“

منوری نے وضاحت کے ساتھ بتایا۔

”ارے جھوٹ بولتی ہے شمشاد! روٹی تو اپنے کسی یار کے ساتھ روٹی کی شادی سے چار روز پہلے گھر سے بھاگ گئی تھی۔“ خالدہ نے رازداری سے منوری کو سرکشی میں بتایا۔ پھر ادنیٰ آواز میں کہنے لگی۔

”ارے روٹی تو ابھی بہت چھوٹی تھی جب لونڈوں سے آنکھ لڑاتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک بار اس کو ایک لڑکے سے رقعہ لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ سچی بات ہے میں تو اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے سیدھی اس کی ماں کے پاس لے گئی اور جو دیکھا تھا وہ سب شمشاد کو بتا دیا۔“

”اچھا!“ منوری نے کہا۔ وہ سخی سب کی تھی مگر خود کم ہی ایسی ایسی بات کرتی تھی۔ اتنے میں منوری کی بہو چائے لے کر آ گئی۔ خالدہ نے چائے والا کپ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”ارے بیٹی تم کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ کہہ کر وہ ہیں ساس کے پاس بیٹھ گئی۔ غزالہ کی ماں نے چائے پی۔ پھر مزید کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی تو منوری کی بہو نے ساس سے کہا۔

”محلے کے ہر گھر کی خالدہ خالہ کو خبر ہوتی ہے مگر خود اپنے گھر مطلب اپنی بیٹی کی خبر نہیں۔ غزالہ اپنے گھر کے سامنے والے دو گھر کے دو لڑکوں سے بیک وقت آنکھ لڑا رہی ہے۔ کافی عرصہ سے اپنے گھر کے پیچھلی جانب بھی کسی کو پھانس رکھا ہے۔ چھت پر کھڑی کھلے عام اشارے کر رہی ہوتی ہے۔ بے شرم، بے حیائی زیادہ ہے کہ اس بات کی بھی پروا نہیں کرتی کہ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ کیا سوچے گا اس کے بارے میں۔“

”بس بہو زمانہ ہی ایسا خراب آ گیا ہے۔ اپنے گریبان میں کوئی نہیں جھانکتا۔ دوسروں کی ٹوہ لیتے رہتے ہیں۔ ارے میری ایک سہیلی کے بھائی کی شادی ہوئی۔ اس کی بھابی ایک



مکار عورت تھی۔ حالانکہ اس کی میری سہیلی کے بھائی کے ساتھ یہ دوسری شادی تھی مگر وہ میری سہیلی کی سارا وقت نگرانی کرتی کہ اس کی کوئی ایسی ویسی بات ہاتھ آئے کہ نند کو رسوا کر سکے۔ جبکہ خود وہ اتنی بد معاش تھی کہ بڑی بہن کا شوہر پھانس رکھا تھا۔ اس کی وجہ سے اپنے پہلے شوہر سے اس نے طلاق لی اور تب تک اپنے بہنوئی کے گھر رہی جب تک بہنوئی کی اپنی بیٹی جوان نہیں ہو گئی۔ جب بہنوئی کی بیٹی چودھ پندرہ برس کی ہوئی تو اس کی ماں نے بیٹے سے کہا بلکہ ساتھ بڑی بہنوں نے بھی سمجھایا۔

”اگر تم نے سالی کو یونہی اپنے سینے سے لگا کر رکھا تو تمہاری اپنی بیٹی کا رشتہ کسی نے خاندان میں نہیں لینا۔ اگر اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتے ہو تو پہلے اپنی اس لاڈلی سالی کو بیاہ دو ورنہ اپنی بیٹی نہ بیاہ سکو گے۔“ یہ سب سننے کے بعد اس نے سالی کو بیاہ دیا اور وہ مکارا آتے ہی لگی نند کی نگرانی کرنے۔ اتفاق سے میری سہیلی کی بھابی کا نام بھی خالدہ ہی تھا۔ ہاں تو جب دوسری شادی کے بعد بھی اس نے اپنے بہنوئی کا پیچھا نہ چھوڑا تو میری سہیلی کے بھائی نے اس کو طلاق دے دی۔ بس بی بی آج کل لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہر کوئی آئینے میں اپنی ہی شکل دیکھتا ہے۔“ منوری نے کہا۔

پھر بولی۔ ”بہو یہ شہر یا روڈ پیتے پیتے سو گیا۔ اس کو اندر لٹا آؤ۔“ اور بہو نے بیٹے کو لے کر کاندھے سے لگاتے ہوئے بولی۔

”امی ویسے روپی کے بھاگنے کی بات سچ ہو سکتی ہے۔ روجی کی شادی کے پانچ دن پہلے جب آپ گھر نہیں تھیں تو وہ فون کرنے آئی تھی اور بے حد گھبرائی ہوئی بھی تھی فون کرتے ہی جلدی سے چلی گئی۔ مجھے آپ کو بتانا یا نہیں رہا۔ اب میں سوچ رہی ہوں وہ جس کے ساتھ گھر سے بھاگ رہی تھی یقیناً فون اس نے اس کو ہی کیا ہوگا۔“

”اچھا“ منوری نے چونکتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ”اب یہ بات اپنے تک ہی رکھنا کسی اور کو بتانا مت ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ سارا الزام ہم پر ہی آئے گا۔“

”امی میں کوئی پاگل ہوں۔ اگر بتانا ہوتا تو خالدہ خالہ کے سامنے نہ بتا دیتی۔“ بہو نے کہا اور بیٹا لے کر چلی گئی جبکہ منوری کبری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ اب واقعی خالدہ کی بات سچ معلوم ہو رہی تھی انہیں۔

☆☆☆☆

غزالہ جس راستے سے گزر کر پرویز کو ملنے جاتی تھی اس کے دائیں بائیں ابھی چند پلاٹ خالی تھے۔ تاہم ایک دو پر گھر بننے کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک دن موسم خراب ہونے کی وجہ سے جن لوگوں کا گھر بن رہا تھا بلکہ گھر تو بن چکا تھا اب پلستر وغیرہ ہو رہے تھے اس روز شدید بارش کی وجہ سے لڑکے کو مجبوراً رکنا پڑا تھا۔ اب بنتے ہوئے گھر میں چارپائی تو تھی اس لڑکے کے کٹھن بٹھنے کے لیے مگر بستر نہیں تھا جبکہ گھر اس کا اس رہائش سکیم سے کافی دور تھا۔ وقت گزارنے کیلئے وہ لڑکا درہیچے سے ٹیک لگا کر باہر برستی بارش دیکھتے ہوئے رات گزارنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ سگریٹ پیتا رہا اور جاگتا رہا۔ جسے بارش ہلکی ہوئی تو لڑکے نے دیکھا ایک جوان لڑکی پھسلن کے ڈر سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس ہلکی بارش میں اکیلی ہی آگے جا رہی تھی۔ بات صرف یہاں تک ہی رہتی تو ٹھیک بھی مگر فجر سے کچھ پہلے اس نے دیکھا ایک ینگ لڑکا اس لڑکی کا ہاتھ تھام کر گویا اس کو چھوڑنے جا رہا تھا لڑکا چونکہ خود بھی اوباش اور عیاش قسم کا تھا اس لیے شک میں پڑ گیا اور سوچا معاملہ کچھ گڑبڑ والا لگتا ہے۔

اگلے روز کو کہ بارش نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ لڑکا اس لڑکی کو چیک کرنے کے لیے بنتے ہوئے گھر میں رک گیا تھا تاہم آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کا ایک فریڈ بھی تھا جس کو اس نے خوفن کر کے بلایا تھا۔ جو بد معاشی میں اس سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ اب وہ کل والی لڑکی کے انتظار میں درہیچے میں ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ٹھیک دس بجے اس نے لڑکی کو آتے دیکھا تو سرکشی میں دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جی! دیکھو وہ آ رہی ہے۔“ یہ سنتے ہی جی اچھل کر چارپائی سے اٹھا اور لپک کر کھڑکی کے قریب آیا۔ پھر دیکھا ایک ینگ لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ پھر وہ ہوا کے جھونکے کی طرح ان دونوں کے سامنے سے گزر کر آگے چلی گئی تو جی نے کہا۔

”یارو کی لڑکی تو فل جوان ہے۔“

”لڑکی نہیں عورت کہو۔ اگر وہ اس وقت لڑکے کو ملنے جاتی ہے تو پھر لڑکی نہیں رہ سکتی۔“ وکی نے کہا۔

”اچھا اب یہ بتاؤ واپسی کب تک ہوگی اس لڑکی کی۔“ جی نے کہا۔



”بتایا تو تھا تجھے کچر سے کچھ پہلے ایک لڑکا اس کو چھوڑنے آیا تھا جس کو ملنے یہ گئی تھی۔“ وکی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے فلاسک پکڑتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اپنے لیے مگ میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے لیے بھی چائے ڈالوں؟“

”نہیں بس تم ہی چائے پیو۔ میں اپنا ذاتی مشروب پیوں گا۔“ جی نے فلاسک کے قریب رکھی وکی والی بوتل اٹھائی اور پینے لگا تو وکی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”پہلے کیا پیتے رہے ہو جواب اپنا ذاتی مشروب پیو گے۔“

”پہلے پینے سے زیادہ دوست کھانے میں مصروف رہا۔ تم نے تو شاید بھی چکھا بھی نہیں کھا کر دیکھو بہت مزے کا ہے۔“

”ارے“ وکی نے چارپائی پر رکھے شاہ پر میں ہاتھ ڈال کر اپنے لیے ایک لیگ پیس لیا پھر اس پر دانت مارتے ہوئے بولا۔

”یار! اگر یہ لڑکی خراب موسم میں بھی گھر سے باہر نکلنے سے باز نہیں آتی تو اس کا صاف مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ہر روز اپنے دوست سے ملنے جاتی ہے۔“

”دو چار روز اور چیک کرتے ہیں پھر اپنے ڈزکوٹا مندار بنانے کا پروگرام بناتے ہیں۔“ جی نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے پر اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی پتہ کرنا ہوگا کیسے لوگ ہیں۔ کیا وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ ان کی جوان بیٹی ہر رات گھر کے باہر اپنے دوست کے ساتھ بسر کرتی ہے اور بیٹی کے گھر واپسی نہ آنے پر ان کا ری ایکشن کیا ہوگا۔“

”چلو تم کہتے ہو تو یہ کام بھی کر لیتے ہیں۔ جی نے کہا اور لگے لڑکی کی واپسی کا انتظار کرنے۔ آج فجر سے کچھ پہلے کی بجائے وہ عین فجر کے ٹائم کل کی طرح لڑکے کا ہاتھ تھام کر واپس آتی ہوئی دکھائی دی تو درجے کے قریب کھڑے جی نے اس کو دیکھتے ہی کہا۔

”وکی! وہ واپس آ رہی ہے۔“ یہ سنتے ہی وکی پھرتی سے اسٹھ کر اس کے قریب آیا اور جب وہ دونوں ان کے سامنے سے گزر گئے تو جی نے کہا۔

”ظفر اور نوید کو بھی اس پروگرام میں شامل کرنا ہوگا۔“ اور لگے دونوں اسی وقت بیٹھ کر لڑکی کو اٹھانے کا پروگرام طے کرنے۔

اگلی رات جی اور وکی کے ساتھ ظفر اور نوید بھی تھے۔ ان چاروں نے لڑکی کو آتے بھی دیکھا اور پھر لڑکے کا ہاتھ تھام کر جاتے بھی دیکھا تھا۔ اب اس وقت وہ چاروں لڑکے کا چھہ خاصے پر جوش تھے۔ انہوں نے وقت ضائع کرنے کی بجائے آنے والی رات ہی اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ لیا تھا۔ جی لڑکی کے گھر والوں کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیا تھا۔ خاصے شریف لوگ تھے۔ ایسی ایسی بات ہونے کی صورت میں کسی پر پرچہ کٹوانے کی بجائے خاموشی اختیار کرنا زیادہ مناسب سمجھیں گے۔ فرض کرو وہ رپٹ لکھواتے بھی ہیں تو ہم پر تو شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم ادھر رہتے ہی نہیں۔ اگر کوئی پکڑا گیا تو وہ اس کا یہی عاشق ہوگا۔ مگر پکڑیں گے کل ہی۔ یگ لڑکی کو دیکھتے ہی ان کے منہ میں پانی بھر آیا تھا اور پھر ساری بات طے ہو گئی کہ آنے والی رات ان چاروں نے کیا کرنا ہے اور کس طریقے سے کرنا ہے۔

☆☆☆☆

غزالہ سامنے لگے وال کلاک پر نظر پڑتے ہی فوراً اٹھ بیٹھی۔ اس کے جانے کا ٹائم ہو گیا تھا بلکہ آج کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اس نے جھک کر بستر کے قریب کارپٹ پر رکھا اپنا سوٹ اٹھایا پھر بولی۔

”پرویز اب دو چار دن میں نا آسکوں گی۔ پرسوں چونکہ وعدہ تھا اس لیے برستی بارش میں بھی وعدہ نبھانے چلی آئی کہ تم ویٹ کر رہے ہو گا اور میرے سن آنے پر پریشان ہوں گے مگر کل ویٹ نہیں کرنا۔“

”تو کیا تمہارا ویٹ نہیں کر رہا تھا۔ کھانا تمہارے ساتھ ہی کھایا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔“ پرویز نے کہا۔

”اس لیے میں آگئی تھی کہ کھانا سامنے رکھے میرا ویٹ کرتے کرتے رات بھر بھوکے بیٹھے ہو گئے مگر اب میں تمہیں بتا دیتی ہوں موسم بھی مجھے ٹھیک ہونا نظر نہیں آ رہا۔ اس لیے کل میں نہیں آؤں گی۔ ہاں ہو سکتا ہے پرسوں آ جاؤں۔ مگر پرسوں والی بھی یہی بات نہیں۔“

”اور اگر موسم اچھا ہو گیا تو پرویز نے لیٹے لیٹے اس کو دیکھا۔“



”پھر بھی سوچوں گی۔ پکا وعدہ نہیں۔ اگر گیارہ بجے تک میں نہ آئی تو کھانا کھا لیا۔“ یہ کہتے ہوئے غزالہ بستر سے نکل آئی۔

”یار کر لو جتنے فخرے کرنے ہیں۔ اگلے ماہ گھر والے آرہے ہیں۔ ان کے آتے ہی امی سے بات کر کے تمہارے گھر بھیجوں گا اور پھر منگنی وغیرہ کے چکر میں پڑے بغیر سیدھی طرح تمہیں بیاہ کر ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے آؤں گا۔“ پرویز نے محبت سے دیکھتے ہوئے اس کو کہا۔

پرویز خاموشی سے اٹھا اور پھر تیار ہو کر غزالہ کا ہاتھ تھام کر ہمیشہ کی طرح گھر سے باہر آ گیا۔ راستے میں کبھی کوئی بات نہ کرتے تھے۔ پرویز اس کو گھر کے دروازے پر چھوڑ کر واپس مڑ جاتا تھا۔ یہی اس کا روز کا معمول تھا۔

☆☆☆☆

وہ چاروں دوست آج بڑی بے تابی سے لڑکی کا انتظار کر رہے تھے مگر ہوا یہ کہ وہ تو کیا ساڑھے دس بج گئے اور لڑکی نہ آئی تو تب انہوں نے مایوس ہو کر سوچا کہیں آج لڑکی نے اپنا آنے کا پروگرام کینسل نہ کر دیا ہو ورنہ تو خراب موسم میں بھی ٹھیک دس بجے آ جاتی تھی۔ حتیٰ کہ برستی بارش میں بھی وہ آئی تھی۔ مگر آج وہ نہیں آئی تھی۔ چاروں چپ چاپ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ چہروں پر ہلکی ہلکی مایوسی پھیل گئی تھی۔ یہ سوچ کر اگر واقعی آج لڑکی نہ آئی تو ان کا سارا پروگرام چوہٹ ہونے کا اندیشہ تھا جس کو ان چاروں دوستوں نے بڑی محنت اور پر جوش ہو کر بنایا تھا اور آنے والے لمحوں کا نشانہ ان کو ابھی سے پاگل کر رہا تھا۔ لڑکی نہ آنے کی صورت میں یہ نشہ برن ہو جاتا تھا۔ سارا دن بھی ہلکی کبھی تیز بارش ہوتی رہی تھی مگر شام سے کچھ پہلے بارش کا یہ سلسلہ رک گیا تھا تاہم آسمان اب بھی کالے سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کوئی ایک آدھ ستارہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر چونکہ چودھویں کی رات تھی اس لیے چاند بڑی جدوجہد کر کے زمین پر جھانکنے کی کوشش کرنا مگر چند سیکنڈ بعد ہی ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے پورے چاند کو اپنے بھاری وجود کے پیچھے چھپا لیتے اور وہ اس قدر تیز اور سخت بھی کہ کوشت میں اتر کر ہڈیاں تو کیا کودے کو چھوٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، تاہم بارش جو شام سے کچھ پہلے رکی تھی تو ابھی تک مدتی ہوئی تھی۔

غزالہ نے کل پرویز سے کہا تھا وہ آج نہیں آئے گی مگر سچی بات تو یہ تھی کہ وہ پرویز کی عادی ہو چکی تھی اس لیے اب اس کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کبھی سوچتی چلی جاؤں کبھی سوچتی نہیں۔ آج نہیں جاؤں گی مگر جب کوشش کے باوجود نیند نہ آئی کہ یہ سب تو اس کے جاگنے کا تھا کچھ دیر پہلو پہ پہلو بدلتی رہی اور جیسے ہی کلاک نے گیارہ بجنے کا اعلان کیا وہ روز کی طرح بستر چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ صحن میں آتے ہی پہلے چہرہ اوپر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تو آسمان دکھائی نہ دیا کہ اس وقت اس پر کالے سفید بادلوں کی حکمرانی تھی۔ مگر غصہ تھا کہ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ غزالہ نے وہیں صحن میں کھڑے کھڑے تھوڑی دیر سوچا پھر ہمت کر کے گھر سے باہر آ گئی۔ دل میں سوچتی کہ شکر ہے بارش تو بھی ہوئی ہے۔

وہ روز والی بے فکری سے ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی چلی جا رہی تھی۔ دل میں سوچ رہی تھی پرویز یقیناً اس کلائیٹ کر کے مایوس ہو کر کھانا کھا چکا ہوگا اور اب چانک سے سامنے پا کر کتنا خوش ہوگا۔ پھر سوچا اگلے ماہ اس کے گھر والے آرہے ہیں۔ ان کے آتے ہی شادی ہو جائے گی اور یہ رات کو بار بار گھر سے باہر آنے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے پرویز کی بن کر پرویز کے گھر آ جائے گی۔ وہ انہی خوش کن اور خوشگوار سوچوں میں گم خود ہی تنہا مسکراتی ہوئی چلی جا رہی تھی کہ یکدم رکتا پڑ گیا۔

☆☆☆☆

جب دس کے بعد گیارہ بھی بج گئے تو جی نے مایوسی سے کہا۔

”لگتا ہے آج لڑکی نہیں آئے گی۔ تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟“

”نو پرابلم آج نہیں توکل سہی۔۔۔ تاہم ابھی ایک دو گھنٹے مزید انتظار کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ ظفر نے کہا۔ تبھی مارے خوشی اور جوش کے ایک دم دکی نے ہلکی آواز میں چیخ کر کہا۔

”وہ مارا! لڑکی آرہی ہے۔“ وہی کی بات سنتے ہی فوم کے گدے پر لیٹا ظفر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے بڑی محنت کر کے گھر کے سامنے والے حصے میں ریت اور مٹی ڈال کر کچھ اس طرح بارش کا پانی روکا تھا کہ خشک اور صاف راستہ اب صرف ان کے گھر کے سامنے ہی بچا تھا۔ اور آگے جانے کے لیے لڑکی کا ان کے دروازے کے آگے سے گزر جانا ضروری تھا۔ اسی لمحے انہوں نے کارروائی کرنے کا سوچا۔ دروازہ انہوں نے پورا کا پورا کھول رکھا تھا۔ غزالہ اپنے ہی خیالوں میں گم جیسے ہی دروازے کے پاس سے گزرنے لگی ظفر بڑی پھرتی سے باہر آ کر اس کا راستہ روک چکا تھا۔ البتہ نوید اور کی اندر رہتے کچھ قریب کھڑے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔



اس بات کا خدشہ بالکل نہیں تھا کہ لڑکی چلائے گی، شور وغیرہ کرے گی۔ ایسی خراب لڑکیوں میں یہ جرات ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ اگر وہ چلانے کی کوشش کرتی بھی تو وہ اس کو منہ پر ہاتھ رکھ کر پھرتی سے اندر کھینچ لاتے۔ باقی لڑکی کے دوست کی جانب سے کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ اس کا گھر کافی آگے جا کر تھا۔ کل وہ جب لڑکی کو چھوڑ کر واپس جا رہا تھا تو نوید اس کے پیچھے جا کر اس کا گھر دیکھا یا تھا۔ اپنے پلان میں انہوں نے کوئی جھول نہیں رہنے دیا تھا۔ بس لڑکی نے لیٹ ہو کر ضرور ان کو تھوڑا پریشان کیا تھا۔

ادھر اچانک اپنے سامنے دو لڑکوں کو دیکھ کر غزالہ کا دل مارے خوف سے پوری شدت سے دھڑکا تھا۔ کیا آج کوئی انہوں نے ہونے والی ہے۔ پہلی بات یہی اس کے ذہن میں آئی تھی۔ مگر یہ وقت مزید سوچنے کا نہیں تھی۔ ان حالات سے بچ نکلنے کا تھا۔ جن میں وہ اس وقت گھر گئی تھی۔ یہی وجہ تھی خود کو سنبھالتے ہوئے پورے اعتماد سے کراہی آواز میں پوچھا۔

”کیا بات ہے مسٹر راستہ کیوں روکا ہے تم لوگوں نے؟“

”اب تم اتنی چھوٹی محصور یا بھولی نہیں ہو کہ راستہ روکنے کا مطلب نہ سمجھ سکو۔“ ظفر نے اس کو دیکھتے ہوئے طنز یہ کہا۔ پھر پوچھا۔

”کہاں سے آ رہی ہو؟ کہاں جانے کا ارادے ہیں ہیڈم۔“

”دیکھو! غزالہ نے اندر کے خوف کے باوجود خود کو مارل رکھتے ہوئے بڑے مدد سے کہا۔

”تم نے کچھ غلط سوچ یا سمجھ کر میرا راستہ روکا ہے تو میں تمہیں بتا دوں میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ میں ریڈیو پر جاب کرتی ہوں اور اس وقت وہیں سے اپنی ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد آ رہی ہوں اور اب اپنے گھر جا رہی ہوں۔ پلیز! میرا راستہ چھوڑ دو۔ آج میں پہلے ہی لیٹ آ رہی ہوں۔“

”اپنے گھر جا رہی ہو یا اپنے یار کے پاس جا رہی ہو۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ غزالہ نے مزید مدد سے ڈالنے کے لیے کہا۔

”الوکی پٹھی! بکواس ہم کر رہے ہیں یا کتنا تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ ظفر نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا تو جی نے طنز بھری دنگا ہوں سے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

”باقی رہا یہ کہ تم ایسی ویسی لڑکی نہیں ہو تو تم کیسی لڑکی ہو یہ ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں اور سنو اچھی لڑکیاں اس وقت اپنے گھروں میں اپنے بستر میں سو رہی ہوں گی اور تم جیسی ایسی ویسی لڑکیاں شریف گھروالوں کے سوتے ہی اپنے یا رکھ بستر گرم کرنے گھروں سے نکل پڑتی ہیں۔ سناتم نے ایسی ویسی بد معاش لڑکی!“

”یہ سب سنتے ہی غزالہ سمجھ گئی آج وہ بری طرح پھنس چکی ہے۔ ایسا شاید زندگی میں پہلی بار ہوا تھا اس لیے بجائے اڑنے کے جھکنے کا فیصلہ کرتے ہوئے منت کرنے والے انداز میں ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پلیز مجھے جانے دو۔“

”تمہیں جانے دیا تو ہمارے اس پروگرام کا کیا ہوگا جو چار دن لگا کر ہم نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے۔“ جی نے مکروہ انداز میں کہا۔

یہ سنتے ہی غزالہ نے ان کے ارادے سمجھتے ہوئے جلدی سے پانی میں تر کر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو جی نے لپک کر کافی سختی سے اس کی کلائی تھامتے ہوئے کہا۔

”کہاں جلی میری چھمک چھلو!“

”میں کہتی ہوں مجھے جانے دو، ہر مزاد اور نہ شور مچا دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ظفر نے پھرتی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ پھر دونوں اس کو کسی گڑیا کی طرح ہاتھوں میں اٹھائے اندر لے آئے۔ غزالہ نے بچوں کی طرح مانگیں چلائیں مگر خود کو چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ اس کو آسانی سے اندر لے آئے۔ ان کے اندر آتے ہی نوید نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اور جی ظفر نے غزالہ کو زمین پر ڈال دیا تو وہاں چھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا جو دو لڑکے اس کا ٹھا کر دم میں لائے تھے ان دو کے علاوہ دم میں دو لڑکے اور بھی تھے۔

”غزالہ ان لڑکوں کے ارادے اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ مسئلہ اس وقت صرف عزت جانے کا نہیں تھا ایسی بات ہوتی تو وہ ان لوگوں کو خوش کر کے جلی جاتی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ سمجھ چکی تھی عزت کے ساتھ ساتھ آج جان بھی جائے گی۔“ یہی وجہ تھی سینے کے اندر مارے خوف کے دل اتنی شدت سے دھڑکا تھا جیسا بھی سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔ پیشانی پر سرد موسم کے باوجود پسینے کی ننھی لگی بوندیں موتیوں کی طرح چمکنے لگی تھیں۔ پہلے بھی وہ لیٹ ہوتی تھی تو پرویز اس کی تلاش میں گھر سے نکل پڑتا تھا مگر آج اس کو معلوم تھا وہ نہیں آئے گی۔ اس نے آخری کوشش کرنے کا سوچتے ہوئے ایک لڑکے سے کہا۔ جو بظاہر شریف لگتا تھا۔



”دیکھو میں ایک شریف لڑکی ہوں۔ پلیز! تم ہی ان سے کہو مجھے جانے دیں۔ ورنہ کا جس کو میں ملنے جاتی ہوں میرا منگیترا ہے۔ اگلے ماہ میری اس کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔ میرا یقین کرو۔“ نوید جولنا کچھ کہہ نہی چاہتا تھا کہ ظفر نے تیز لہجے میں کہا۔

”یار کیوں نام ویسٹ کر رہے ہو اپنا۔“ پھر وہ چاروں بیک وقت کتے بن کر اس پر جھپٹے تھے۔

☆☆☆

خلدہ کی آنکھ آج ذرا دیر سے کھلی تھی۔ یعنی سورج نکلنے کے بعد فجر کی نماز خلدہ نے کبھی نہ پڑھی تھی۔ فجر کیا اس نے تو زندگی میں کوئی نماز پڑھی ہی نہ تھی۔ پھر بھی سورج نکلنے سے پہلے لازمی اٹھ جاتی تھی۔ شوہر کو ناشتہ خود بنا کر دیتی تھی۔ اپنی بیماری کی وجہ سے شوہر صاحب ناشتہ ذرا سیرے ہی کرتے تھے۔ اسی طرح وہ خود بھی ان کے ساتھ ہی ناشتہ کر لیتی تھی۔ باقی سب گھر والوں کا ناشتہ بنا کر دینا بہو کی ذمہ داری تھی۔

مگر آج رات اس کی آنکھ ذرا دیر سے لگی تھی۔ غزالہ جو اس کے ساتھ ہی سوتی تھی بار بار کروٹ بدلتی رہی تھی۔ یہی وجہ تھی آج اس کی آنکھ اپنے مخصوص نام پر نہ کھلی تھی اور اب جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا بستر میں وہ کیلی ہی تھی۔ یہ دیکھتے ہی ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ غزالہ تو دن کے گیارہ بجے اٹھنے کی عادی تھی۔ ناشتہ تو اس نے کبھی کیا ہی نہ تھا۔ وہ اٹھ کر دوپہر کا کھانا ہی ہمیشہ کھاتی تھی پھر پل کو بلی دینے کے لیے سوچا ہو سکتا ہے آج جلدی اٹھ گئی ہو۔ یہ سوچ کر جلدی سے باہر آئیں۔ دل میں ایک انجنا خوف بھی تھا۔ سارے گھر میں گھوم پھر کر دیکھا مگر غزالہ کہیں نہیں تھی۔ باہر کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ بہو بچن میں ناشتہ بنا رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ پھر بوچھل قدموں سے چلتے ہوئے بہو کے پاس آئی تو بہو نے سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

”امی جان! طبیعت تو ٹھیک ہے نہ آپ کی۔ آج آپ نے اٹھنے میں بہت دیر کر دی۔“

”بہو میرے معدے میں بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے اور سر بھی بھاری ہو رہا ہے۔ رات نیند بھی دیر سے آئی تھی اس لیے جلدی نہ اٹھ سکی۔“ انہوں نے اپنی پریشانی کو بیماری میں چھپانے کی کوشش کی۔

”یہ لیجئے امی جان! میں نے آپ کا اور بابا جی کا ناشتہ پہلے بنایا ہے۔ غزالہ تو ابھی حسب عادت سو رہی ہوگی۔“ بہو نے ناشتہ والاٹرے ان کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ وہ جواب دینے کی بجائے خاموشی سے ٹرے تھام کر اپنے کمرے میں آگئیں۔ ناشتے والی ٹرے شوہر کے سامنے رکھی اور خود بھی پریشان پریشان سی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ پہلی بار دل میں سوچا کیا غزالہ گھر سے بھاگ گئی؟ حمیدہ کی روٹی کی طرح۔ اگر وہ بھاگ چکی ہے تو پھر یہ بہت برا ہوا۔

”تم نہیں کرو گی۔“ شوہر نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی میں نے منہ نہیں دھویا آپ کریں میں آج ابھی ابھی تو اٹھی ہوں۔“ خلدہ نے جواب دیا اور جلدی سے واش روم میں چلی گئی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو شوہر صاحب ناشتہ کر چکے تھے۔ خلدہ کا دل ناشتہ کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے ناشتے والی ٹرے اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور خود دونوں ہاتھوں میں ہر تھام کر بیٹھ گئی۔ اگر واقعی غزالہ گھر سے بھاگ چکی ہے تو اب کیا ہوگا۔ بیٹے تو اس کی جان حذاب میں ڈال دیں گے کہ یہ سب آپ کی نرمی کی وجہ سے ہوا ہے۔

”کیا ہوا تمہیں طبیعت تو ٹھیک ہے نا ناشتہ کیوں پرے رکھ دیا۔“ شوہر صاحب نے کچھ محبت اور فکرمندی سے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک بھی ہوں اور نہیں بھی۔ سر ذرا بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا ہے۔“ خلدہ نے بمشکل آنسو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ابھی سے بیمار شوہر کو سب کچھ بتا کر مزید بیمار یا پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی حالانکہ ان کا دل کہہ رہا تھا انہونی یقیناً ہو چکی ہے۔

اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ غزالہ ہر رات اپنے کسی دوست کو ملنے جاتی ہے کیونکہ جب وہ جاتی تھی۔ وہ جاگ رہی ہوتی تھی مگر واپسی کب ہوتی تھی یہ اس کو معلوم نہ تھا۔ تب وہ سو رہی ہوتی تھی۔ اس کو سب معلوم تھا۔ یہ الگ بات تھی سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے بیٹی کو سمجھنا تو دور کی بات کبھی جتانے کی بھی کوشش نہ کی تھی کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہے۔ ہر رات کسی کو ملنے گھر سے باہر جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی کہ وہ اکثر غزالہ سے رقم لے کر بیمار شوہر کی میڈیسن کے علاوہ اپنی ذاتی ضروریات بھی پوری کرتی تھ۔ بیٹے گئے چنے پیسے دیتے تھے جس کے ساتھ گھر کا خرچہ ہی بمشکل پورا ہوتا تھا باقی کی ضروریات کیسے پوری ہوتیں۔ اچھا کھانا اچھا پینا اور پہننا اس کی شروع کی عادت تھی۔



دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ صرف تین بہنیں ہی تھیں۔ اختر، خالدہ اور کوثر وہاں بھی چھوٹی ہی تھیں کہ ان کے والد فوت ہو گئے۔ ماں ان کی ایک آزاد خیل عورت تھی۔ انہوں نے ان بہنوں پر کوئی روک ٹوک نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی ان تینوں بہنوں نے اپنی مرضی کی زندگی بسر کی اور اپنی اپنی پسند کی شادیاں کر کے ماں کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ماں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے جانتے ان تینوں کو کسی بات پر ناٹو کا تھا۔ گھر کا خرچہ وہ تینوں میں کر ہی چلاتی تھیں۔ خود بھی عیش کرتی تھیں۔ اپنی ماں کو بھی خوب عیش کرواتی تھیں۔ پھر ماں کو ٹوکنے کی کیا ضرورت تھی۔

جورویاں کی ماں شہناز نے ان کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ ان کو کھلی اجازت تھی۔ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی کہ وہ صرف تین بہنیں تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا جبکہ اس کے یہاں بیٹیوں کے علاوہ جانچ بیٹے بھی تھے اور بڑی بیٹیاں بھی کچھ زیادہ بے باک نہیں تھیں۔ بس غزالہ ہی ان سب میں زیادہ تیز اور ہوشیار تھی۔ وہ اندر ہی اندر غزالہ سے خائف رہنے لگی تھی اور سوچتی اگر اس کے بھائیوں کو اس کی ان حرکتوں کا پتہ چل جائے تو اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مگر سمجھانے کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ اب اس کا نام گزر چکا تھا۔ تاہم اگر بھی ہلکی پھلکی کوشش بھی کی تو غزالہ ایک لفظ بھی سننے کی رو دینے لگی تھی۔ آج رات وہ بار بار کروٹ بدلتی رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا وہ پریشان بھی مگر کیوں کیا گھر سے بھاگ رہی تھی۔ اس لیے اب جب بہو بیٹے اس کا پوچھیں۔ گتو وہ کیا جواب دیں گی۔ وہ اگر کسی کے ساتھ پسند کی شادی کرنا چاہتی تھی تو ان کو بتا دیتی وہ بغیر کسی اعتراض کے اس کی شادی اس کے پسندیدہ لڑکے سے کر دیتی مگر وہ گھر سے بھاگ گئی۔ سب کی عزت خاک میں ملا گئی۔ اس کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس لڑکے کو ملنے کہاں جاتی تھی۔ وہ تو پچھلے کئی برسوں سے ملنے جا رہی تھی۔ ہمیشہ مل کر آ جاتی تھی۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا وہ اپنے دوست سے پیسے لے کر اپنا جہیز خود بنا رہی تھی۔ اگر وہ شادی کے لیے جہیز بنا رہی تھی تو پھر گھر سے بھاگ کیوں گئی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی غلط تربیت کی وجہ سے ان کی لاڈلی بیٹی کے ساتھ کیا ہو چکا تھا۔

ابھی چند روز پہلے منوری کے گھر بیٹھ کر شمشاد کی بیٹی روبی کا قصہ مزے لے لے کر سن رہی تھی اور آج اپنی بیٹی گھر سے بھاگ گئی تھی۔ وہ جو سب نے لوگ کہہ گئے آدی کو چاہیے خدا اور وقت سے ڈر کر رہے کہ اس کی لاٹھی ہمیشہ بے آواز ہوتی ہے۔

اب اس وقت پہلی پریشانی تو یہ تھی کہ گھر کے اندر بیٹیوں کو کیا کہنا ہے اور گھر سے باہر محلے والوں سے کیا کہنا ہے۔ غزالہ کی عدم موجودگی کے بارے میں اس کے گھر شمشاد کی طرح شادی نہیں بھی جو غزالہ کے بھاگنے کا قصہ اس کفوری طور پر پریشان کرنا۔ محلے والوں سے بھی کوئی بھی مناسب بہانہ کیا جاسکتا تھا۔ مطلب کہا جاسکتا تھا وہ کراچی اپنی خالہ کے گھر چلی گئی ہے۔ چند ماہ دھر رہے گی اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

اصل مسئلہ بہو بیٹیوں کا تھا۔ ان سب نے رات سونے سے پہلے یہاں بیٹھ کر صرف ٹی وی دیکھا بلکہ غزالہ سے باتیں بھی کرتے رہے تھے۔ اب وہ پوچھیں گے آدھی رات کو وہ کہاں گئی۔ بات چھپانے والی تھی بھی نہیں مگر وہ فوری طور پر سب کو بتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی بیٹے ناشتہ کر کے گھر سے جائیں تو وہ پہلے اپنے طور پر اس کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گی۔ ہو سکتا ہے وہ مل ہی جائے۔ سب سے پہلے روجی کھون کر کے پوچھتی ہوں۔ وہ کس لڑکے کو ملنے جاتی تھی۔ دونوں ایک جیسی تو تھیں۔ ایک دوسری کے دوستوں کو جانتی تھیں۔ اگر روجی نے بتا دیا تو وہ جا کر اس لڑکے کے گھر سے غزالہ کو لے آئے گی۔ اگر روجی نے نہ بتایا تو یا اس کو معلوم نہ ہوا تو پھر بہو بیٹیوں کو غزالہ کے بارے میں بتانا مجبوری ہوگی۔ وہ انہی پریشان سوچوں میں گم سمٹ گئی تھی کہ بہو اندر آئی اور کہا۔

”امی جان! برتن صاف کرنے لگی تھی۔ آپ آج ناشتے والے برتن بھی دیئے نہیں آئیں۔ لائیں اب مجھے بڑے پکڑا دیں۔“

”وہ سامنے پڑی ہے لے جاؤ۔“ انہوں نے بیزاری سے کہا۔ ان کا بولنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا اور ہونے لڑے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”امی جی! آپ نے ناشتہ نہیں کیا۔ کیوں؟“

”تمہیں کہا تو تھا کہ معدے پر بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ تو چائے ہی پی لی ہوئی۔ بہو نے رکی مروت سے کہا۔

”جی نہیں چاہتا تو کسے پی لوں۔ تم یہ بتاؤ سب ناشتہ کر کے چلے گئے۔“ انہوں نے پوچھا تو بہو نے کہا۔

”بھائی سب چلے گئے ہیں، بس وہی رہ گئے ہیں۔ ابھی تیاں ہو رہے ہیں۔ آپ نے ان سے کچھ کہنا ہے۔“

”نہیں مجھے صبح صبح ان سے کیا کہنا ہے۔“ خالدہ نے اب کے کچھ منہ بنا کر جواب دیا۔ ان کا خراب موڈ دیکھ کر بہو جانے لگی تو غزالہ کے خالی بستر پر نگاہ پڑ گئی۔ اس نے پوچھنا



ضروری سمجھا۔

”امی جان! غزالہ صبح صبح کہاں گئی ہے؟“ وہ تو بارہ بجے اٹھنے کی عادی ہے۔“

”کہاں جاسکتی ہے؟ باہر باتھ روم میں ہوگی۔“ اب کس نے اپنے مخصوص تلخ لہجے میں کہا تو بہو خاموش ہو کر باہر چلی گئی۔ مزید ایک بھی لفظ پوچھیے یا کہ بغیر اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ بیٹیوں کو تو خوب نرم ماحول میں رکھا تھا مگر بہو کے آتے ہی سخت رویہ اختیار کر لیا تھا۔ بہو بھی اچھی تھی چپ چاپ صبر سے ان کے یہاں گزار رہی تھی۔ شوہر ماں بہن کی خلاف بات سننے کا روادار نہیں تھا۔

اب بہو بھی بہو تھی۔ اندر سے تو چپ چاپ ڈانٹ کھا کر باہر آ گئی تھی۔ مگر باہر آ کر سب سے پہلے اس نے برتن پکٹن میں رکھے۔ پھر ان کو دھونے کی بجائے باہر آئی۔ پہلے واش روم چیک کیا۔ وہ کھلا ہی تھا۔ نیچے والے حصے میں ایک ہی باتھ روم تھا۔ باتھ روم چیک کرنے کے بعد اس نے سارا گھر گھوم پھر کر دیکھا۔ مگر غزالہ کہیں بھی نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر بہو کے ہوتوں پر ایک پر اسرار سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب ساس کی پریشانی اور خراب طبیعت کی وجہ اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ بڑی پھرتی سے اوپر آئی کہ وہ خود اوپر والے پورشن میں رہتی تھی۔ وہ غزالہ کے بارے میں شوہر سے بات کرنا چاہتی تھی مگر شوہر کے ساتھ بات کرنے سے پہلے اوپر والا پورشن بھی چیک کرنا ضروری تھا۔ حالانکہ غزالہ شام کے بعد ہی چھت پر آتی تھی۔ اس نے جلدی جلدی اوپر والا سارا پورشن بھی چیک کر لیا مگر غزالہ کہیں بھی نہیں تھی۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ غزالہ گھر پر نہیں تو بہو کا دل مارے خوشی کے جھوم اٹھا۔ اب وہ ایک سیکنڈ سے بھی پہلے سمجھ چکی تھی کہ غزالہ گھر سے بھاگ چکی ہے۔ بہت تپلیا تھا۔ ان ماں بیٹی نے اس کو گھر اب ساس کی باری تھی۔ اب بدلہ لینے کا موقع آ گیا تھا۔ ایک تو گھر چھوڑ کر جا چکی تھی جبکہ دوسری سزا بھگتنے کے لیے گھر میں موجود تھی۔ بہو کا اس کو معاف کرنے کا رتی بھرا ادب نہیں تھا۔ دل کی خوشی دل میں چھپائے اپنے بیٹھ روم میں آئی اور آفس جانے کی تیاری کرتے ہوئے شوہر کو تنبیہ کی سے مخاطب کیا۔

”آپ برائے نام جائیں تو ایک بات کہوں آپ سے۔“

”برا کیوں مانوں گا۔“ شوہر نے اس کو دیکھے بغیر کہا۔

”تو پھر میری بات ذرا دھیان سے سنیں۔ غزالہ اپنے بستر میں موجود نہیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

”کہیں گئی ہوگی۔“ اس میں پریشان ہونے والی کوئی بات ہے۔ انہوں نے مائی باندھتے ہوئے جواب دیا۔

”رات سونے تک تو گھر میں موجود تھی اب آدھی رات کو وہ کہیں جانے سے رہی۔ امی جان بھی پریشان ہیں۔ انہوں نے تو آج ناشتہ بھی نہیں کیا۔“ بیوی نے پھر کہا۔

”ہیں کہیں گھر کے اندر ہوگی۔ اور کہاں جاسکتی ہے۔ تمہیں آخر کیا پریشانی ہے؟“ شوہر نے اب کے کچھنا کواری سے کہا۔

”میں اس کو سارے گھر میں ڈھونڈنے کے بعد آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ آخر میری بات سمجھتے کیوں نہیں۔“ غزالہ تو ویسے بھی گیا رہے اٹھنے کی عادی تھی۔ اب اچانک

کہاں جاسکتی ہے۔“ اس نے دب دے لہجے میں کہہ دیا۔

”اچھا یار!“ جعفری نے کہا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

”ابھی نیچے جاؤ دیکھتا ہوں اور امی سے پوچھتا ہوں۔“

”پوچھتے گا ضرور۔ مگر میرا نام نہ لیجئے گا۔ ورنہ امی جان مجھ پر خفا ہوں گی۔ آپ ان کے مزاج کو تو جانتے ہیں۔“ بہو نے چالاکی سے کہا۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔“ انہوں نے تیزی سے کہا اور نیچے ماں کے روم میں آئے۔ پہلے ماں باپ کو سلام کیا۔ ان کا حال احوال پوچھا۔ پھر غزالہ کا پوچھا کہاں ہے وہ؟

”باہر باتھ روم میں گئی ہے۔“ ماں نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔ دل میں سمجھ گئی تھی بہو نے بھیجا ہے۔

”امی! جلدی سے غزالہ کو بلا لیں مجھے اس سے کام ہے۔“ جعفری نے ریسٹ ڈائج پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”وہ باتھ روم میں کھیلنے نہیں گئی کہ میں بلا لاؤں۔ فارغ ہو کر خود ہی آ جائے گی۔ تمہارے جانے کا نام ہو چکا ہے تم جاؤ۔ کام مجھے بتاؤ میں اس کو بتا دوں گی۔“ انہوں نے تھوڑی

بیزاری سے کہا۔



قبل اس کے کہ جعفری ماں سے کچھ مزید کہتا دوڑا رہے پر دستک ہوئی۔ جعفری سمجھ گیا منوری خالہ کا بیٹا راجہ آیا ہوگا۔ دونوں ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے۔ جعفری آج کل اپنی موٹر بائیک خراب ہونے کی وجہ سے راجہ کے ساتھ آفس جا رہا تھا۔ وہاں سے مزید کچھ کہے بغیر ہی باہر آ گیا۔ باہر واقعی راجہ موجود تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر آفس روانہ ہوا۔ راستے میں ایک گندنا لہ بھی پڑنا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے تو دیکھا کافی ہجوم اکٹھا ہے۔ موٹر بائیک روک کر پوچھا۔

”کیا ہوا ہے یہاں؟“ معلوم ہوا کسی نوجوان لڑکی کی برہنہ لاش گندے سٹالے کے کنارے کوئی پھینک گیا ہے۔

دونوں موٹر بائیک روک کر نوجوان لڑکی کی برہنہ لاش دیکھنے آئے۔ اور پھر سوچا کاش کہ نہ آئے ہوتے۔ لاش دیکھتے ہی بجلی کے شاک سے زیادہ بڑا شاک جعفری کو لگا تھا۔ وہ نوجوان لڑکی خود اس کی اپنی سگی بہن غزالہ کی لاش تھی۔ جعفری میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مڑ کر منوری کے بیٹے راجہ کا سامنا کرتا۔ بہن کی حالت دیکھ کر دل درد سے بھر آیا۔ کوٹ اتار کر جلدی سے جھک کر بہن کی برہنہ لاش ڈھانپنے کی کوشش کی مگر برہنگی پھر بھی نہ چھپ سکی۔ تب پیچھے کھڑے راجہ نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کیا۔ وہ دونوں کوٹ ڈال کر ابھی سیدھا بھی نہ ہوا تھا کہ پولیس کی گاڑی آگئی۔ سارے ہجوم کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیتے ہوئے پولیس لاش کے قریب آئی اور لاش اٹھا کر فوراً چلتی بنی۔ غزالہ کی جگہ کوئی اجنبی لڑکی ہوتی تو وہ بھی چند لمحے کھڑے ہو کر دیکھتے پھر چلے جاتے۔ مگر اب تو قیامت کا سامنا تھا۔ آہستہ سے راجہ سے کہا۔

”چلو پولیس کے پیچھے چلو۔“ چند لمحوں بعد ہی ان کی موٹر بائیک پولیس گاڑی کے پیچھے جا رہی تھی۔ وہاں ہجوم میں خود کو مرنے والی کا بھائی کہہ کر وہ رسوا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور اگر منوری کا بیٹا ساتھ نہ ہوتا تو وہ اپنے علاوہ کسی سے اس واقعہ کو شہر نہ کرنا کہ اس کی بہن کیسی اذیت ناک اور ذلت آمیز موت مری ہے۔ مگر اب مجبوری تھی۔ پولیس لاش لیکر سیدھی ہاسپٹل آئی تھی۔ وہاں جعفری نے پولیس کو اپنا تعارف کرایا۔ پھر پولیس کے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد منوری کے بیٹے کو وہیں چھوڑا اور خود ماں سے بات کرنے گھر چلا آیا۔ گھر آیا تو ماں پریشان پریشان سی ابھی تک وہیں اپنے شوہر کے پاس بیٹھی تھی۔ جعفری نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

”امی جان! جلدی سے غزالہ کو بلائیں، مجھے اس کے ساتھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”تم تو چلے گئے تھے۔ اب اس وقت واپس کیوں آئے ہو۔ اس لیے نا کہ تمہاری بیوی نے تمہیں بہن کے بارے کوئی جھوٹی بیٹی پر مہادی ہے۔ وہ تمہارے جانے کے بعد اپنی یاجی کے گھر چلی گئی تھی۔“ ماں نے نمکس اپنی عزت بچانے کے لیے مصنوعی غصے سے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ بیٹے کے گھر سے جاتے ہی وہ پی سی او سے جا کر بڑی بیٹی کفون کر آئی تھی کہ اگر کوئی بھائی فون کرے غزالہ کے بارے میں پوچھتو کہنا۔

”ہاں، غزالہ میرے یہاں ہے۔ تب تک میں اس کو ڈھونڈ لوں گی۔“ خالدہ نے بیٹی کو ساری بات بتانے کے بعد کہا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ بات چھننے والے مقام سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ ماں کی بات سن کر چند لمحے افسوس بھری نظروں سے ماں کو دیکھتا رہا پھر ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مدہم اور سوگوار لہجے میں کہا۔

”امی جان! آپ کے اس نامناسب رویے کی وجہ سے میری بہن کی جان چلی گئی۔ آج اس وقت جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں کاش کہ وہ سب دیکھنے کے لیے میں زندہ نہ ہوتا۔ غزالہ مر چکی ہے۔ میں ابھی ابھی اپنی مری ہوئی بہن کا چہرہ دیکھ کر آ رہا ہوں اور آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ باجی کے گھر چلی گئی۔ یہ بات چھپانے والی تھی جو آپ نے چھپانے کی کوشش کی۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ اپنی ہی پریشان سوچوں میں گم اس کی بات کی خالدہ کو سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس لیے پھر سے پوچھنے لگی۔

”امی جان! میں کہہ رہا ہوں آپ کی بیٹی اور میری چھوٹی بہن اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ مر چکی ہے اور اس کی لاش صبح میرے دفتر کے راستے میں آنے والے گندے سٹالے کے کنارے اس حالت میں پڑی ہوئی ملی ہے کہ اس کے جسم پر لباس نام کی ایک دھجی تک بھی نہ تھی۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ آپ کی وجہ سے آج ہمیں اس ذلت آمیز صورتحال کا سامنا ہے۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا آپ کی بیٹی نے اور خود بھی پتہ نہیں کتنی اذیت سہہ کر جان دی ہوگی۔“ جعفری کے لہجے میں غصے کے ساتھ ساتھ دکھ کی آمیزش بھی شامل تھی۔

”میری غزالہ مر گئی۔ سچی مچی مر گئی۔“ بیٹے کی ساری باتیں سن کر خالدہ کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہاں باپ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں ان کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ مگر ان کے اس طرح رونے سے اذیت ناک۔ بھیا ناک موت مرنے والی غزالہ واپس نہیں آ سکتی تھی۔ بہو غزالہ کی



موت کی خبر سن کر دل ہی دل میں بے حد خوش ہوئی تھی۔ خالدہ نے تو بہو کو رکھائی بڑی سختی میں تھا۔ اس لیے وہ خوش تھی۔ مگر بظاہر چہرے پر سو کواری طاری کرتے ہوئے بولی۔  
”یہ بتائیں لاش اس وقت کہاں ہے؟“

”ہسپتال میں پڑی ہے۔ ظاہر ہے پوسٹ مارٹم ہونے اور پولیس کی مٹھی گرم کرنے پر ہی اب ملے گی۔ ابھی تو خالدہ منوری کے بیٹے راجہ کو ہسپتال چھوڑ کر آیا ہوں۔ اب جا کر بھائیوں کفون کر کے بلاتا ہوں۔“ وہ جانے لگا تو بیوی نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔  
”باجیوں کو بھی فون کر دیجئے گا اور باقی خاندان میں بھی اطلاع کر دینا۔“ جعفری سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔  
خالدہ اونچی اونچی رو رہی تھی مگر بہو خاموش کھڑی تھی۔ ساس کو تسلی دینے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔

☆☆☆☆

لاش ہسپتال سے پوسٹ مارٹم کے تین دن بعد ملتی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا لاش تین گھنٹے کے اندر راندر فون کر دیں اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ تھی۔ ”لڑکی اجتماعی زیادتی کا شکار ہوئی اور بعد میں گلا دیا کر ہلاک کر دیا گیا۔“  
خاندان اور محلہ والے لاش آنے سے پہلے ہی آچکے تھے۔ اخبار میں خبر چھپنے کی وجہ سے لوگ دور دور سے غزالہ کا چہرہ دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ ایک کہرام مچ گیا تھا۔ ایک حشر برپا تھا۔ لوگ لاش دیکھتے ہوئے تو بتو بہ کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے اللہ ایسی موت کسی کو نہ دے۔  
لاش کو غسل خالدہ نے بہو اور بیٹیوں کے ساتھ مل کر خود دیا تھا۔ غسل دیتے ہوئے خالدہ خود بھی لاڈلی بیٹی کے پور پور زنجی جسم کو دیکھ کر شدید دکھ اور صدمے سے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اور بہو بھی رو دی تھی۔

خاندان کی کچھ عورتیں محلے کی عورتوں کو بتا رہی تھیں کہ خالدہ کی ایک بہن بھی قتل ہوئی تھی۔ اللہ ایسی اولاد کسی کو نہ دے جیسی خالدہ ویسی بھانجی۔ جیسی تربیت خالدہ کی ماں نے کھلے ماحول میں ان کی کی تھی ویسی ہی تربیت خالدہ نے اپنی بیٹیوں کی کی۔ ماں خود اچھی ہو تو کیا بیٹیاں ایسی ہو سکتی ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ بات کرنے والوں کے منہ کون بند کر سکتا ہے۔

منوری کی بہو بھی ساس کے ساتھ غزالہ کا چہرہ دیکھنے آئی تھی۔ چہرہ دیکھ کر وہ بھی رو پڑی تھی۔ باقی اس کا شوہر اس کو ساری کہانی سنا چکا تھا۔ اس وقت خالدہ کی جو حالت تھی وہ بھی دیکھنے والی تھی۔ وہ اپنے ہی بال نوچتی جا رہی تھی۔ بیٹیاں روتے ہوئے اس کو سنبھال رہی تھیں۔ جنازہ ٹھہر گیا تو عذرا بھی ساس کے ساتھ گھر آنے کو اٹھ گئی۔ تبھی خالدہ کی بہو چینی۔  
خالدہ اور بیٹیاں اٹھ کر اندر بھاگیں۔ ”امی جی! اذرا جلدی سے آ کر دیکھیں ابو جی کو کیا ہوا ہے۔“  
ساتھ کچھ مہمان خواتین بھی بھاگیں مگر سب کا جانا بیکار ثابت ہوا۔ بیٹی کا جنازہ اٹھتے ہی باپ کی روح جسم سے نکل گئی تھی۔ جوان بیٹی کی شرمناک موت کا صدمہ بوڑھا یا بیا باپ برداشت نہیں کر سکا تھا۔ مرد غزالہ کو فون کر کے آئے تو گھر میں دوسرا جنازہ تیار تھا۔

☆☆☆☆

منوری کی بہو چھوڑی دیر مزید وہاں بیٹھی رہی پھر ساس کو لے کر گھر آ گئی۔ اور گھر آتے ہی کہنے لگی۔ ”امی جان! اچھا ہے مگر بے چارہ عذاب سے چھوٹ گیا۔ ایک تو بیماری ایک بیٹی کی اذیت ناک موت کا صدمہ۔ یہ جینا بھی کوئی جینا تھا۔ اس پر لوگوں کی رنگ برنگی باتیں اب سکون سے قبر میں رہے گا۔“  
”ٹھیک کہتی ہو۔ مگر اللہ ایسی کسی دشمن کے ساتھ بھی نہ کرے جیسے ان کے ساتھ ہوئی۔ خاص کر خالدہ کے ساتھ۔ ایک تو جوان بیٹی کی شرمناک موت کا صدمہ اور رسوائی، اس پر زندگی کا سا بھی ساتھ چھوڑ گیا۔“ منوری خاموش ہو کر آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگی۔ تب ان کی بہو نے کہا۔

”امی جان! آپ نے خالدہ کی حالت دیکھی۔ بیٹی کی موت نے پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔ اپنی بیٹی ہنا جبکہ چند روز پہلے کس طرح مزے لے لے کر شمشاد کی بیٹی روپی کے گھر سے بھاگنے کی داستان سن رہی تھی اور آج اپنی بیٹی نے بھائیوں کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ جاتے جاتے خاندان کی عزت کے ساتھ باپ کی جان بھی لے گئی۔ اس لیے



کہتے ہیں خدا سے ڈرتے رہو اس کی لاشی ہمیشہ بے آواز ہوتی ہے۔ وہ جو سیانے لوگ کہتے ہیں ”ذممن مرے تے خوشی نہ کریے سبحان دی مر جانا“ ان کی تو پھر خلدہ شمشاد سے گہری دوستی تھی اور یہ محلے بھر میں ان کی بیٹی کو بدنام کرتی رہی۔ اب پتہ چلا ہوگا جب اپنی بیٹی منہ پر سر عام کالکسل کر مر گئی۔

”بس بس بہو! اور کچھ نہ کہنا۔ تو بہ کر ڈوب۔“ منوری نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو عذرا سنجیدگی سے بولی۔

”امی جان! میں انجوائے کرنے کیلئے نہیں بس یونہی ایک بات کر رہی ہوں۔ وہ بھی اپنے گھر کے اندر صرف آپ سے آپ ذرا خود ہی سوچیں سارے محلے کو تو اس کی بیٹی کی کالی کرتوتوں کا پتہ تھا۔ کیا خود اس کو معلوم نہ ہوگا کہ اس کی بیٹی کیا کیا کارنامے انجام دے رہی ہے۔ یوں کہئے کہ جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ آج اس نے سارے خاندان کو منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔ بہنوئی بہنوں کو کیا کیا طعنے نہیں دیں گے۔ اگر خلدہ خالہ اپنی بیٹی کی صحیح تربیت کرتی تو کیا وہ خراب ہو سکتی تھی۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔ خلدہ خالہ کو اچھی طرح معلوم تھا ان کی بیٹی کس وقت کیا کرتی ہے۔

”بہو بے چاری سارے گھر کا کام کیلی ہی کرتی۔ نا خلدہ خالہ خود مدد کرتی اور نہ ہی غزالہ۔ غزالہ تو کہتے ہیں مل کر خود پانی بھی نہیں پیتی تھی۔ گیارہ بارہ بجے تو وہ سو کر اٹھتی تھی۔ جیسے کہیں کی نواب ہو۔ اب پتہ چل گیا ہوگا سب کو کیوں گیارہ بارہ بجے سو کر اٹھتی تھی۔ ساری رات تو گھر سے باہر رہتی تھی۔ مڈری دیکھو پانچ بجائوں کی موجودگی میں گھر سے باہر رہتی تھی۔ پھر ظاہر ہے دن کو سو کر ہی نیند پوری کرتی تھی۔ اس کو معلوم نہ ہوگا کہ بیٹی ہر رات گھر سے باہر بسر کرتی ہے۔ اب رونے دھونے کا قاعدہ۔ جب سب کچھ تباہ ہو گیا۔“

”بس کرو! اب چھوڑ بھی دو اپنی تقریر۔“ منوری نے اکتا کر کہا تو عذرا بار بار ماننے کی بجائے ہنس پڑی۔ تاہم پھر خاموش ہی رہی تھی۔

غزالہ کی موت پر سارے علاقے میں کہرام مچ گیا تھا۔ لوگ دور دور سے اس بے رحم موت مرنے والی کو دیکھنے آتے تھے۔ مگر وہ جس کو سب سے پہلے آنا چاہیے تھا وہ آخر تک نہ آئی تھی۔ یہاں تک کہ جنازہ چلا گیا۔ بیٹی کے بعد باپ بھی چل بسا۔ ایک کے بعد دوسرا جنازہ بھی اٹھ گیا مگر وہ پھر بھی نہ آئی تھی۔ وہ ہستی کون تھی؟ وہ کون تھی؟ وہ غزالہ کی بے حد عزیز، بے تکلف اور اکلوتی دوست دوستی۔

روحی کیوں نہیں آئی تھی وجہ۔۔۔۔۔ وجہ یہ تھی غزالہ کی موت کے دوسرے روز جب روحی عامر کے ساتھ بیٹھی میز پر ناشتہ کر رہی تھی۔ گھر سے سب سے پہلے عامر اپنے آفس جاتے تھے اور ان کی یہ عادت تھی ناشتہ کرنے کے ساتھ ساتھ اخبار کی ہیڈ لائن پر بھی ایک سرسری نظر ڈالتے جاتے۔ باقی اخبار وہ آفس جا کر پڑھتے تھے۔ اس وقت بھی وہ حسب عادت ناشتہ کرتے ہوئے اخبار سرسری دیکھ رہے تھے کہ اجتماعی عصمت دری کے واقعہ کی ہیڈ لائن پڑھ کر پوری خبر پڑھ ڈالی کہ ایسی نیوز لوگ ذرا دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ پوری خبر پڑھ کر انہوں نے اچھی طرح تصویر دیکھنے کے بعد اخبار روٹی کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

”روحی یہ تمہارے محلے کی لڑکی ہے نا جس کو اجتماعی عصمت دری کے بعد قتل کر دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ لڑکی رسم دودھ پلائی کی ٹیم میں شامل تھی اور شاید وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ تمہاری دوست غزالہ ہے۔ بخدا! اگر یہ لڑکی تمہاری دوست تھی تو بہت گھٹیا لڑکی تھی۔ شریف لڑکیوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ جو اس کے ساتھ ہوا ہے۔ رات کے وقت یقیناً وہ اپنے کسی دوست کو ملنے گئی اور شکار کر لی گئی۔ ایسی بے غیرت لڑکیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے بھائی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتے۔“ یہ بات کہتے ہوئے عامر کی آنکھوں میں ہی نہیں لہجے میں بھی نفرت تھی۔ یہ دیکھ کر روحی نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”وہ میری دوست نہیں محلے کی لڑکی تھی۔ اس لیے میری کزنز کے ساتھ دودھ پلائی کی رسم میں شامل ہو گئی ہوگی۔ ہر محلے میں اچھے لوگوں کے ساتھ برے لوگ بھی ہوتے ہیں۔“

”اوکے! میں تو اب جانتا ہوں۔“ عامر نے کہا اور اٹھ کر روحی اس کو دروازے تک خدا حافظ کہنے آئی۔ عامر کے جانے کے بعد جب اپنے روم میں آئی تو اس کا فون آ گیا۔ انہوں نے غزالہ کو بتاتے ہوئے کہا۔

”خلدہ کی حالت دلچسپی نہیں جاتی۔ ہماری روٹی نے جو ہمارے ساتھ کیلیہ اس سے بھی چار ہاتھ آ گئے۔ خاندان والوں کے ساتھ کرگئی ہے۔ لاش تو ایک دو دن تک ملے گی۔ تم یہ بتاؤ اپنی ساس کے ساتھ آؤ گی یا عامر کے ساتھ کہ کھانے کا اہتمام کیا جاسکے۔ تمہاری تو سہیلی تھی۔ میرا خیال ہے ساس کو ساتھ لے کر آ جاؤ۔ عامر کو ساتھ لانا مناسب نہیں۔“ شمشاد نے بات ختم کی تو روحی جلدی سے بولی۔

”امی جان! خدا کے لیے آہستہ بولیں اور میری بات غور سے سنیں۔ عامر اور اس کے گھر والوں کو کبھی بھی اس بات کا پتہ نہ چلے کہ غزالہ میری دوست تھی۔ عامر تو صبح ناشتے پر ہی غزالہ



کی اخبار میں تصویر اور خبر پڑھ کر سو باتیں بنا رہے تھے۔ مجھ سے بھی پوچھ رہے تھے تمہاری سیلی ہے اور میں تو صاف مگر گئی، کہہ دیا محلے کی لڑکی ہے اس لیے شادی میں شامل تھی۔ میں تو اب ہرگز نہ آؤں گی۔ آپ کہہ دیجئے گا میری طبیعت ٹھیک نہیں اور فون بند کر دیا۔

شمشاد فون بند کر کے آئی تو منوری نے پوچھا۔

”ہو گیا فون۔ کب آ رہی ہے روجی! غزالہ تو اس کی پکی سیلی تھی۔“

”وہ نہیں آ رہی۔ کہہ رہی تھی امی میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ بعد میں آ کر فوس کر لوں گی۔ ابھی تو بہت مجبوری ہے۔“ حمیدہ نے منوری کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی منوری نے کہا۔

”اللہ خیر کرے کیا ہوا۔“ پھر خود ہی چوکتے ہوئے خوش ہو کر بولیں۔

”اچھا اچھا! سمجھ گئی۔ اللہ نے جاتے ہی اپنی رحمت کر دی۔ مبارک ہو۔“ شمشاد یہ سن کر چپ بی رہی۔ پھر بولی تو کہا۔

”اللہ ایسی نافرمان اولاد کسی دشمن کو بھی نہ دے جو سارے خاندان کے منہ پر کا لک بھیر کر مرے۔ اب لوگ خالدہ کو سو باتیں بنا رہے ہیں۔ غزالہ کی اس موت کا ذمہ دار خالدہ کو ٹھہرا رہے ہیں۔ بھلا کوئی ماں چاہتی ہے کہ اس کی اولاد ایسی نکلے۔“ یہ بات کہتے ہوئے حمیدہ روپی کو یاد کر کے خود بھی رو پڑی۔ جب سے غزالہ کی موت کا سنا تھا تب سے یہی سوچ رہی تھی کہیں روپی کی ایسی حالت کرنے کے بعد کسی نے قتل کر کے لاش نہیں دبا نہ دی ہو۔ معاشرہ اتنا اچھا بھی نہیں کہ کوئی لڑکی اکیلی شا پنگ کرنے کیلئے جائے وہ تو پھر گھر سے بھاگی تھی اور قدم قدم پر شکاری گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ معصوم لڑکیوں کو شکار کرنے کیلئے اگر ماں باپ کی عزت کا خیل نہیں کیا تو خود بھی تو ایک بری موت مرتی ہیں۔ جیسے ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔ ویسے ہی ایک گندہ سارے خاندان کی عزت کا بیڑا غرق اور خانہ خراب کر کے دکھ دیا ہے۔

آج نہیں تو کل روپی کی بھی گھر سے بھاگنے کی بات کھل جائے گی۔ آخر وہ اور کتنے دن اس بات کو چھپالیں گے۔ کب تک اس کو ایسٹ آباد میں رکھیں گے۔ جب خاندان اور محلے والوں کو معلوم ہوگا کہ روپی ایسٹ آباد نہیں گئی تھی بلکہ گھر سے بھاگی تھی تو ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا جو آج غزالہ کی ماں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جلد یا بدیر ان کو بھی ایسی حالت کا سامنا کرنا تھا کوشش کے باوجود اس ذلت سے بچنے کا کوئی حل ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ خاص کر آج کل کچھ زیادہ ہی پریشان تھیں شمشاد۔

”حمیدہ! تم کس سوچ میں پڑ گئیں۔ بھلا ہوئی لکون مل سکتا ہے۔“ منوری نے کہا تو شمشاد آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر اپنے گھر آ گئی۔

منوری کہتی ہی رہی ارے اب آئی ہو تو تھوڑی دیر بیٹھو، چائے کی پیالی تو پیٹی جاؤ۔ روجی کی شادی کے بعد تم تو ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول چکی ہو۔ مگر حمیدہ ر کے بغیر معذرت کر کے چلی آئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو گڈو نے جس کو شادی کے بعد حمیدہ نے اپنی سہولت کے لیے روک لیا تھا یہ کہہ کر کہ جب روپی ایسٹ آباد سے گھر واپس آئے گی تو پھر میں گڈو کو بھیجوں گی۔ دیکھتے ہی پوچھا۔

”روجی اکیلی آ رہی ہے یا دولہا بھائی بھی ساتھ آ رہے ہیں۔ یا پھر ساس جی۔“

”وہ خود بھی نہیں آ رہی۔ دولہا ساس تو بعد کی بات ہے۔“ یہ کہہ کر شمشاد نے ساری بات گڈو کو بتادی۔ پھر پوچھا۔

”اب یہ بتاؤ آج پکانا کیا ہے تاکہ ہمیں ہبزی لاؤں۔ گوشت تو فرنج میں لازمی ہوگا۔ جو جو نکلوانا ہے ایک بار ہی بتا دو۔ مجھے تو آج ادھر مرگ والے گھر میں رہنا ہے۔ بھری جوانی کی موت ہے اور پھر خالدہ کی حالت بھی بہت خراب ہے۔“

”بازار سے کچھ بھی لانے کی ضرورت نہیں، میں سر اور چاول پکالوں گی۔ پر آپ رو کیوں رہی ہیں۔ طبیعت پہلے ہی بہتر نہیں آپ کی۔ پھوپھو جی! جو ہونا تھا ہو گیا۔“ گڈو نے محبت سے کہا۔

”غزالہ کی موت سے زیادہ روپی کا سوچ کر رونا آ گیا۔ یقیناً اس کا بھی یہی انجام اور یہی حشر ہوا ہوگا۔ بس ہمیں ہی خبر نا ہو سکی کہ اس کو مار کر گندے سٹالے کی بجائے کسی نے زمین کھود کر دبا دیا ہوگا کفن نصیب میں ہوا اور نہ ہی نماز جنازہ ہوئی۔ اگر ہمیں ذلت دے کر گئی ہے تو خود کو کھانا کھائی رہی ہوگی۔“

وہ تو پچھلے کئی مہینوں سے گھر میں بند تھی۔ بس مارے غصے کے بغیر سوچے سمجھے نکل پڑی گھر سے۔ اب خود بھی کتے کی موت مری ہوگی اور ہمیں بھی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں



چھوڑا۔

گڈو کہنا چاہتی تھی۔ آپ نے بھی تو ظلم کی حد ہی کر دی تھی معصوم بچی کے ساتھ۔ کوئی جوان اولاد کو ایسا کہتا یا یوں بے رحمی سے مارتا ہے جیسے آپ مارتی رہی ہیں۔ آخر کب تک برداشت کرتی اور پھر ماں سخت تھی تو بڑی بہن ہی نرم ہوتی۔ مگر وہاں سے بھی چارہا تھا۔ آگے تھی۔ اب جو کچھ تار ہے ہیں سب تو پہلے ہی اپنے رویے میں نرمی پیدا کی ہوتی۔ اس گھر میں اس کا ہمدرد تھا ہی کون جو وہ کسی کا سوچتی۔ ایک بھائی تھا اور وہاں بہن سے بھی زیادہ مناسب رویہ اس کے ساتھ اختیار کیے ہوئے تھا۔ آخر تنگ آ کر اس نے بھاگنا ہی تھا۔ وہ یہ سب باتیں کہہ کر پھوپھو کا دل اور دکھانا نہیں چاہتی تھی اس لیے کچھ کہنے کی بجائے ان کی ہی سختی رہی۔

”سب لوگ غزالہ کی ماں پر سارا الزام رکھ رہے ہیں۔ بیٹے بھی سارا غصہ اپنی ماں پر نکال رہے تھے۔ بھلا کوئی ماں یہ کہتی ہے کہ اس کی بیٹی خراب نکلے اور پھر رونا کن موت مر کر پورے خاندان کے منہ پر کا لکسل جائے۔“ شمشاد بات ختم کر کے پھر رونے لگی۔ اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا غزالہ نہیں آج روپی مری ہے، آخر ماں تھی۔ اس لیے بار بار دل بھرا رہا تھا۔

”پھوپھو! آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں چھوڑیں، اب روپی کے قصے کو چلیں آپ لیٹ کر تھوڑا سا آرام کر لیں۔“ یہ سن کر شمشاد لیٹ گئی اور گڈو آہستہ آہستہ ان کے پاؤں دبانے لگی۔ ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان کا دل بہلانے لگی۔ اس کی باتیں سنتے سنتے شمشاد کی آنکھ لگ گئی۔ یہ دیکھ کر گڈو نے ان کے پیر چھوڑ دیئے اور لگی دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے۔ اس نے کھانا بھی پکالیا مگر شمشاد روتی ہی رہی کہ بات بھر خلدہ کے گھر جاگ کر گزاری تھی۔

کھانا بنانے کے بعد وہ سلا دینا رہی تھی کہ سلمان آگیا اور کچن میں داخل ہو کر گڈو سے پوچھا۔ ”آج کا دن کیسا گزرا جناب کا۔“ گڈو نے اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ بھلا چوروں کی طرح دبے پاؤں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھوپھو بھاٹھ جائیں گی۔ چلو اب چلو۔“

”یار! ان ہی کی وجہ سے تو..... آہستہ آہستہ آیا تھا۔“ سلمان نے خمورنگا ہوں سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بھی حمیدہ بیگم کی آواز آئی۔“

”گڈو سلمان آگیا ہے؟“ سلمان جو گڈو کا ہاتھ تھام کر جو منے کے چکر میں تھا ہاتھ چھوڑ کر گھبرا کر کچن سے باہر نکل آیا۔ پھر ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بیٹی ان کی مری ہے پریشان آپ ہیں۔ پلیز! خود کو سنبھالیں ہمارے گھر میں تو ساری برکت ہی آپ کے وجود کے دم سے ہے۔“ حمیدہ اس کی بات سن کر خاموش رہی کہ بات کی تو کہیں روپی کی کوئی بات منہ سے نہ نکل جائے اور سلمان کا سوڈ آف ہو جائے۔ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

”اچھا گڈو! اب میں خلدہ کے پاس جا رہی ہوں۔“

”پھوپھو جی! کھانا پک کر تیار ہے، کھا کر جائے گا۔ پھر نجانے آپ کب آئیں۔ بس میں ذرا بیاز کی سلا دینا لوں۔“ حمیدہ نے انکار کرنا چاہا مگر سلمان نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ اب وہ کھانا کھا کر ہی گھر سے نکل سکتی تھی۔ صبح ناشتہ بھی گڈو نے یونہی زبردستی کروا دیا تھا۔

☆☆☆

روپی کی شادی ہوئے کافی روز ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود بلال ابھی تک لاہور میں ہی موجود تھے۔ وجہ روپی کی تلاش تھی۔ وہ روپی کو تلاش کئے بغیر واپس ایبٹ آباد جانا نہیں چاہتے تھے۔ ایک پھانس تھی جو روپی کی صورت میں انہیں چھٹی گئی تھی۔ بلال جو انچ وقتی نمازی اور لوگوں کو تبلیغ کرنے میں ہر دم پیش پیش رہتے تھے کسی کو برا کام کرتے دیکھ کر روکتے تھے۔ اچھائی اور نیکی کی جانب راغب کرتے تھے۔ نجانے اب تک کتنے لوگوں کی اصلاح کر چکے تھے۔ اب ایک ایسا گناہ ان سے سرزد ہوا تھا جو ان کے سب کیے کرائے پر پانی پھیر گیا تھا۔ ان کی جان بھی عذاب میں ڈال گیا تھا۔ بے سکون کر گیا تھا۔ بلال جواب تک اپنے آپ کو بہت ذہین، عقل مند اور معاملہ فہم سمجھتے تھے اس کے باوجود وہ ایک غلطی کر چکے تھے بلکہ وہ تو سمجھتے تھے یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے جو ان سے سرزد ہوا ہے۔ اس احساس نے ان سے ان کا ذہنی سکون چھین لیا تھا۔ یہی وجہ تھی وہ سارا وقت روپی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ محبت تھی یا اس گناہ کا کفارہ جو وہ نجانے میں کر چکے تھے۔ اس ایک گناہ کی وجہ سے انہیں اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں تھا۔ دن رات ایک ہی سوچ، ایک ہی لگن تھی اور ہر دم ایک ہی دعا یا اللہ! بس ایک بار مجھے روپی سے ملا دے۔

ان کو یہ خوف تھا کہ اگر روپی برے لوگوں کے ہتھے چڑھ کر گناہوں کی لہلہ میں جا دھنسی تو اس کے قصور وار وہ خون ہوں گے۔ وہ محض ان کی وجہ سے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ محض روپی کی



وجہ سے وہ ابھی تک واپس ایبٹ آباد نہ جاسکے تھے۔ اس کی وجہ سے ہی ان کی والدہ بھی ابھی تک لاہور میں ہی مقیم تھیں اور بہت پریشان تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بلال آخر سارا دن رہتا کہاں ہے۔ جب بھی بلال سے یہ بات پوچھتیں، یہی جواب ملتا۔

”امی جان! ایک بہت ضروری اور ذاتی کام میں مصروف ہوں۔ اس لیے میں تو فی الحال واپس نہیں جاسکتا۔ مگر آپ تو جلدی جائیں۔ وہاں بابا جان اکیلے پریشان ہوں گے۔ آخر آپ کیوں نہیں جاتیں۔“

”میں تمہیں لاہور چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ نہ ہی کام کی نوعیت بتاتے ہو اور نہ ہی کام ہوتا ہے۔“ بیگم خلاق نے تھوڑے غصے سے کہا۔ تو بلال جواب دینے کی بجائے اپنے روم میں آگئے۔ کام کسی کو بتانے والا تھا ہی نہیں، پھر کیا بتاتے۔

روہی کی تلاش کے دوران ہی ایک اور بھیا نک سانحہ ہو گیا۔ یہ سانحہ تھا ناگہانی طور پر ہونے والا غزالہ کا قتل۔ انہوں نے غزالہ کے اس سفاکانہ قتل کی خبر پیپر میں پڑھی تھی اور خبر پڑھتے ہی غزالہ کی تصویر دیکھ کر ان کو گویا سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ روجی کی شادی کے بعد ان کے گھر کا راستہ ہمیشہ کیلئے ہی بھول چکے تھے۔ اپنی زندگی میں ادھر بھی نہ جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ گو کہ وہ روجی اور غزالہ کے بارے میں بھی کچھ ہی تو جان چکے تھے اس کے باوجود معاملہ اس حد تک بڑھ جائے گا وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ بہر حال انہیں غزالہ کے قتل کی خبر پڑھ کر افسوس ہی ہوا تھا۔

قصور داروہ نہیں اس کی ماں تھی۔ چھوٹی مولیٰ غلطی کرنا بچوں کا کام ہے اور اصلاح کرنا والدین کا۔ اگر بیٹیوں کی اچھی تربیت کی جائے تو ایسے حالات پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غزالہ کی موت کے بعد وہ پہلے سے بھی زیادہ روہی کے لیے پریشان اور فکر مند تھے۔ کہیں اس کا انجام بھی یہی نہ ہو کہ برے کام کا برا نتیجہ بنا ہم وہ یہ سوچتے تھے کہ اگر ایسا ہوا قتل خواہ کوئی بھی کرے مگر اصل قاتل وہ خود ہی ہوں گے۔ بات اب پوری طرح ان پر کھل چکی تھی کہ روجی صرف اور صرف ان کی وجہ سے گھر سے بھاگ گئی۔ انہوں نے جو غلطی سے طوفانی برسات کی رات والی کہانی روجی کو سنا دی تھی۔ اس کی وجہ سے بلال کے ایبٹ آباد جاتے ہی روجی نے نہ صرف طعنے مار مار کر روہی کا خود جیسا حرام کر دیا بلکہ ماں کو بھی پوری کہانی سنا کر روہی سے مزید متنفر کر دیا تھا۔ اس کے بعد ان حالات میں اپنے ہی گھر میں رہنا روہی کے لیے بہت دشوار ہو گیا تھا۔ آخری راستہ یہی تھا جو اس نے اختیار کیا اور پھر گھر سے بھاگ گئی۔ بس یہی وجہ تھی جو وہ روہی کی بجائے خود کو نا صرف پورا قصور دار بلکہ خود کو روہی کا مجرم سمجھتے تھے۔ وہ اپنے اس ظلم کے کفارے کے لیے ہی باقی سب کچھ فراموش کر کے دن رات روہی کو تلاش کر رہے تھے۔

یہاں بات ہے کہ ان تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک نہ ملتی تھی۔ روہی کو اپنا گھر چھوڑے ہوئے ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ گھر چھوڑتے وقت اگر اس کے دل میں ذرا سا بھی افسوس یا کوئی ملال تھا تو اب گزرتے وقت کے ساتھ وہ سب ختم ہو چکا تھا۔ زہرہ خانم نے اگر اس کو بیٹی کہا تھا تو سگی ماں سے زیادہ سگی ماں بن کر دکھایا بھی تھا۔ پہلے ہی روز وہ کرن کو ساتھ لے کر روہی کے لیے شاپنگ کرنے چلی گئی تھیں۔ ارم آپنی کو ان کے ساتھ جانے کا نام نہیں تھا۔ بہر حال جب وہ واپس آئیں تو روہی کے لیے ایک دو تین نہیں پورے ایک درجن سوٹ لائی تھیں اور ساتھ آدھی درجن جوتے بھی لائی تھیں۔ اس کے علاوہ چند پریس بیگ اور چھوٹی چھوٹی آرٹیفیشل جیلوری اور کئی طرح کی پونیاں اور کلب وغیرہ۔ روہی کو اپنے لیے کی گئی یہ شاپنگ دیکھ کر نہ صرف حیرت ہوئی تھی بلکہ خوشی بھی۔ وہ چھوٹی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ زہرا اس پر سٹیکھیل رہی تھی جس پر ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ روہی کی صورت میں ان کی گویا لٹری نکل آئی تھی۔

روہی جب اپنا گھر چھوڑ کر آئی تو محض اپنے ڈر خوف کی وجہ سے چند روز کرن کے روم میں سوئی تھی۔ حالانکہ پہلے روز ہی اس کے لیے الگ بیڈ روم سیٹ کر دیا گیا تھا۔ جب چند روز بیت گئے تو ارم نے اس کو بے حد محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”روہی! اب حوصلہ کرو۔ اب تمہیں کسی سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تو میری اجازت کے بغیر چڑیا کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں۔ تمہارے گھر والے تو پھر بھی انسان ہیں اور ویسے بھی گھر کے گیٹ پر ہر وقت چوکیدار موجود ہوتا ہے۔“ یہ سب سن کر روہی نے اپنے الگ بیڈ روم میں سونا شروع کر دیا تھا۔ یہاں بات ہے کہ اپنے بیڈ روم میں وہ اس وقت آتی تھی جب بستر پر لیٹتے ہی نیند اس کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیتی تھی۔ کیونکہ کرن کے گھر کے سب لوگ باتیں کرتے ہی وغیرہ دیکھتے سوتے ہی رات کے دو تین بجے تھے۔ اس کے بعد صبح سویرے اٹھنا ناممکن ہی بات تھی۔



ویسے بھی نماز کرن کے گھر کوئی بھی نہیں پرہتا تھا۔ روپی نے بھی جو بلال کو خوش کرنے کیلئے پانچ وقت کی نمازیں شروع کی تھیں۔ وہ سندرہ جو خود کو بہت بڑا تبلیغ کار، پرہیز گار اور بچا نہیں کیا کیا سمجھتا تھا۔ اس نے غصے میں جو زبان روپی کے لیے استعمال کی تھی۔۔۔ کیوں اس کو زیب دیتی تھی۔ ویسے بھی جس محبوب کو خوش کرنے کیلئے روپی نے پانچ وقت کی نمازیں شروع کی تھیں جب وہ محبوب ہی نارہا تھا تو پھر نمازیں پڑھنے کی ضرورت بھی باقی نہ رہی تھی۔ اب نام بھی کب باقی بچتا تھا اس کے پاس نمازیں پڑھنے کا۔ بارہ ساڑھے بارہ تو وہ سو کر ہی اٹھتی تھی۔ اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر غسل کر کے لباس بدلتی کیونکہ نام نے کہا تھا روزانہ نہا کر لباس بدلا کرو۔ شروع کے دنوں میں روپی روز نہیں نہاتی تھی۔ تیار ہو کر وہ ٹھیک ایک بجے ناشتے کی میز پر آ جاتی کہ یہی نام ناشتے کا تھا۔

ناشتے کی میز پر کئی طرح کے ناشتے اس کے لیے موجود ہوتے۔ تازہ جوس، بریڈ، انڈیا جام، مکھن، دودھ، چائے، پرائٹھے، بھنا ہوا قیمہ، شامی، آلیٹ فروٹ وغیرہ وغیرہ آپ کا جو جی چاہتا ہے وہی ناشتہ کریں۔ دو بجے تک ناشتہ ختم ہو جاتا۔ اس کے بعد ظہر ہے رات کا کھانا ہی باقی بچتا تھا۔ تاہم ناشتہ اور رات کے کھانے کے درمیان سپہر کی چائے لازمی ہوتی تھی اور چائے کے ساتھ بھی کئی طرح کے لازمات موجود ہوتے تھے۔ سپہر کی چائے پیتے ہی ارم آپی جلی جاتی تھیں۔

باقی سارے گھر کی صفائی اور دھلائی کیلئے دو تین ملازمہ رکھی ہوئی تھیں۔ کھانا پکانے کے لیے خانساں بھی گھر میں موجود تھا۔ یعنی روپی کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا تھا اور ان سب سہولتوں کے ساتھ ساتھ سگی ماں سے زیادہ محبت کرنے والی زہرہ خانم اور پھر ان کے شوہر جو اپنے آبائی گاؤں گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو روپی کو بے حد شفقت اور محبت سے ملے تھے۔ وہ سب سے زیادہ روپی سے ہی محبت کرتے تھے۔ روپی کو گڑیا کہہ کر پکارتے تھے۔ یعنی ماں باپ کی محبت کی جو شگنی روپی کا اندر موجود تھی وہ ان دونوں میاں بیوی نے اپنے پر خلوص محبت بھرے دویے سے منا ڈالی تھی۔

کرن نام آپی، روحی، زوپی سے زیادہ محبت روپی کے ساتھ کرتی تھیں اور وہ جوارم آپی نے لکھا تھا جس طرح مجھے کرن عزیز ہو ویسے ہی تم کو عزیز رکھوں گی تو یہ سب انہوں نے سچ کر دکھایا تھا۔ اگر وہ کرن کے لیے کوئی چیز لاتی تھیں تو وہ ساتھ روپی کے لیے بھی ویسی ہی لاتی تھیں۔ پوی کا رویا ایک بھائی سے زیادہ ایک اچھے دوست کا ساتھ۔ روپی نے پہلے دن پوی سے ہاتھ نہیں ملایا تھا مگر اب جب وہ باہر سے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔

”اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔“ اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔

”اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔“ اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔

”اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔“ اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔

”اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔“ اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔

”اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔“ اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔

”اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔“ اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔

”اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔“ اب تم اس دقیانوسی ماحول میں بھی واپس جاؤ گی اور یہاں ہمارے گھر کا اندر آتا تو سب کے ساتھ روپی سے بھی ہاتھ ملاتا تھا۔ روپی بھی اب بغیر اعتراض ملا لیتی تھی کہ زہرہ خانم نے سمجھایا تھا۔



کاچانس بھی مل سکتا ہے۔“ روپی ان کی یہ سب باتیں سن کر خاموش ہی رہتی تھی۔ اس کی اس خاموشی کو دیکھتے ہوئے ایک دن ارم نے براہ راست ہی روپی سے پوچھ لیا۔  
 ”روپی تم فلموں میں کام کرنا پسند کروں گی۔ تم جانتی ہو نا یہ بات میں نے بہت پہلے تم سے تمہارے سکول میں بھی کہی تھی۔“

روپی کو انکار نہیں تھا کڈیڑھ ماہ سے وہ جس ماحول میں رہ رہی تھی وہ بے حد آزاد خیال تھا۔ سارا وقت ہر طرح کی کھلی باتیں زیادہ فلموں، اداکاروں اور گلوکاروں کی باتیں ہی اس گھر میں ہوتی تھیں۔ اس فلموں میں کام کرنا اچھا بھی لگتا تھا۔ ڈرتھا تو گھر والوں کا صرف۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی جیسے ہی سلمان کو اس کے فلموں میں کام کرنے کی خبر ملے گی وہ اسی وقت اسٹوڈیو پہنچ جائے گا اور اس کے اسٹوڈیو سے باہر نکلتے ہی فائر مار کر اس کو ہلاک کر دے گا۔ یہ سوچ کر اس نے ایک بار پھر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ یہ دیکھ کر ارم نے بھی پھر دوبارہ یہ بات نہ کی تھی۔

چند روز یونہی گزر گئے۔ ایک دن زہرہ خان نے چائے کی میز پر جب سب ہی چائے پی رہے تھے باتوں ہی باتوں میں کہا۔  
 ”کڑکیاں فلموں میں کام کرنے کو ترستی ہیں، مشہور ہونے کوڑپتی ہیں، تم سے تمہاری ارم آپ نے پوچھا، مگر تم نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ روپی بیٹا فلم میں کام ملنا کوئی مذاق کی بات نہیں۔ وہ تو تمہاری ارم آپ خود اس فیلڈ میں موجود ہے اس لیے اس کی کوشش سے تمہیں کام مل سکتا ہے۔ دیکھو میں تمہاری بھی ماں ہوں۔ مجھے سچی سچی بتا دو کیا تم فلموں میں کام کرنا چاہتی ہو؟ کیا تمہارا دل مشہور ہونے کو نہیں چاہتا؟“

ان کی باتیں سن کر روپی نے اپنے دل میں موجود شدائت سے ان کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے فلموں میں کام کرنا اچھا لگتا ہے مگر وہ مجھے زندہ چھوڑیں گے تو کام کر سکوں گی نا۔“  
 میرا بھائی تو مجھے قتل کر دے گا۔ اس کی باتیں سن کر ارم جو آرام سے پاس بیٹھی ایک کھار ہی تھی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

”بھول جاؤ اس بات کو کہ وہ تمہیں قتل کر دے گا۔ فلموں میں کام کرتے دیکھ کر تم نے میری منی بہن! ابھی لائف میں وہ کچھ نہیں دیکھا جو میں دیکھ چکی ہوں۔ بے بی! پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ وہ جو سیانے کہتے ہیں۔ جھوٹ نہیں ہے باپ بڑا نا بھیا، سب سے بڑا روپیہ دار ہے! جب تمہارے پاس شہرت ہوگی، پیسہ ہوگا وہ تمہیں قتل کرنے کی بجائے کتا بن کر تمہارے پاؤں میں لپٹیاں لگائے گا۔“

یہ کہتے ہوئے ارم نے پہلے باپ، پھر بھائی پوی کو دیکھا۔ پھر بولی۔ ”تمہارے روپے پیسے پر قبضہ کرنے کے لیے وہ تمہارا منت ترا کر کے حتیٰ کہ تم سے معافی مانگ کر تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائے گا تا کہ تمہاری شہرت سے مزید فائدہ اٹھا سکے اور تمہاری کمائی پر وہ اور اس کی اولاد عیش کر سکے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے تمہارے مشہور ہونے کے بعد اگر تمہارے گھر والے تمہیں لینے آئے تو تم ہمیں چھوڑ کر ان کے ساتھ نہ چل دو کہ اس دنیا میں آج سے نہیں، ہمیشہ سے یہی کچھ ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہی ہوتا رہے گا۔“

”روپی پاگل نہیں جوان کی زیادتیاں بھول کر ہمیں چھوڑ کر ان کے ساتھ چل دے۔“ زہرہ خانم نے جلدی سے یوں کہا جیسے روپی واقعی ابھی ان سب کے ساتھ جا رہی ہو۔  
 روپی دل میں سوچ رہی تھی یہ سب کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔ یہ میرے خاندان کو نہیں جانتے۔ وہ پیسے سے زیادہ عزت کو عزیز رکھتے ہیں۔ ان کو پیسہ ہی نہیں میری ماں ان کو پہلے ہی سو سوا تمیں کرتی ہیں بلکہ کجتریاں کہتی ہیں۔ پھر وہ ارم آپ کی بات سن کر چونکی۔ وہاں سے کہہ رہی تھی۔

”آپا! آج رات کا کھانا گھر سے باہر کھائیں گے۔ جب سے روپی آئی ہے تب سے گھر کے اندر بند ہے۔ آج اس کی بھی ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی۔ آپ سب تیار رہیے گا میں شوٹنگ سے فارغ ہوتے ہی آپ کفون کر دوں گی۔“ یہ سنتے ہی روپی نے گھبرا کر ارم سے کہا۔

”آپ! میں گھر میں بند رہنے کی عادی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میرا یقین کریں میں یہاں گھر کے اندر ہی بہت خوش ہوں۔“ اور دل میں سوچا سلمان میری تلاش میں ہوگا۔  
 جب تک وہ مجھے تلاش کر کے قتل نہیں کر دے گا تب تک وہ سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ یہ لوگ میرے خاندان کو نہیں جانتے۔ مگر میں خود کو اپنے خاندان کا اچھی طرح جانتی ہوں۔  
 ارم نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آپا! آپ سب تیار رہیے گا۔“ پھر روپی کی جانب کن انگیوں سے دیکھتے ہوئے ذومعتی انداز میں کہا۔ ”ہاں ذرا دھیان رکھیے گا۔“ پھر وہ بیگ شولڈر پر ڈالتے ہوئے چلی گئی تو روپی کبری سوچ میں ڈوب گئی۔ یہ دیکھ کر زہرہ خانم نے اپنا نیت سے کہا۔

”میری گڑیا! ساری زندگی گھر کے اندر رہ کر نہیں بتائی جاسکتی۔ فکر مت کرو ہم سب تمہارے ساتھ ہوں گے اور دل میں سوچا۔ یہ بیچاس ہزار کی رقم گھر کے اندر رہ کر ضائع کرنے



کے لیے میں نے تم پر خرچ نہیں کی۔ بے بی گھر سے باہر نکلو گی تو ہمارا مطلب مقصد پورا ہو گا۔ پھر کرن سے کہا۔

”بہن کو ٹھیک گیارہ بجے تک اچھی طرح تیار کر دینا اور خود بھی ہو جانا۔ کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔“ پھر وہ اپنے روم میں چلی آئی تھی۔ اس کا دل گھر سے باہر جانے کو نہیں مانتا تھا۔ اس کو گھر سے باہر سلمان کی صورت میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ مگر اب مزید انکار فضول ہی تھا۔ ارم آپلی حکم دے کر جا چکی تھیں۔ یہاں آ کر روپی نے پہلی بار یہ دیکھا تھا ان کے گھر میں ماں سخت تھی مگر یہاں بیٹی بہت زیادہ سخت مزاج تھی۔ جب کوئی ایسی وکسی بات ہوتی یا ارم آپلی بکڑنے لگتی تو زہرہ خانم فوراً خاموشی اختیار کر لیتی تھیں۔ باپ بھی ارم آپلی کے سامنے منہ کھولنے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔

کرن، پومی تو تھے ہی ان سے چھوٹے اور آج ارم آپلی اس کے لیے بھی حکم دے کر جا چکی تھیں۔ روپی نے سوچا اس اوکے۔ جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ سلمان اس کو مار دے گا اور ہمیشہ زندہ تو کسی نے بھی نہیں رہتا۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ تاہم اس کے باوجود تھوڑی تھوڑی خائف بھی تھی کہ اب بھی مرنے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ ابھی ابھی تو زندگی کا خوبصورت پرسکون چہرہ اس کے سامنے آتا تھا۔ اس نے تو ابھی زندگی کو پوری طرح نچائے بھی نہیں کیا تھا۔ سات دن بچا ارم آپلی نے فون کر کے یاد دہانی کرواتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ گیارہ بجے تک شوٹنگ سے فارغ ہو جائے گی اور ٹھیک سا گیارہ بجے تک آپ لوگوں کو لینے پہنچ جاؤں گی۔ آپ سب تیار رہیں گے گاؤ فون بند کر دیا۔ فون سنتے ہی کرن نے اپنی من پسند کا ایک خوبصورت ڈریس کا انتخاب روپی کے لیے کیا تھا۔ جب روپی اس سوٹ کو پہن کر آئی تو کرن نے کہا۔

”اب بیٹھنا کہ میں تمہارا میک اپ بھی کر سکوں۔“

”میں نے کبھی میک اپ نہیں کیا۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔“ روپی نے کہا تو کرن نے اس کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ہاں! بہت اچھی طرح جانتی ہوں تم نے چاہنے کے باوجود بھی میک اپ اس لیے نہیں کیا کہ تمہاری می بے حد سخت مزاج تھیں مگر اب یہاں نہ تو تمہاری می موجود ہیں اور نہ ہی وہ گھر دیکھو جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں بھی لڑکیاں اور خواتین میک اپ میں ہوں گی۔ خود میں، آپلی اور آپا بھی میک اپ میں ہوں گی۔ ایسے میں تمہارا، تم خود ہی ذرا سوچو یہ سادہ چہرہ کتنا برا لگے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم بہت خوبصورت ہو۔ چلو اچھا لائٹ سائی میک اپ کروالو۔“ روپی مان گئی۔ کرن نے بے حد محنت سے اس کا میک اپ کر کے اس کو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا۔

ارم آپلی سو گیا رہ کی بجائے ساڑھے گیارہ بجے آئی تھیں ان سب کو لینے۔ جبکہ وہ سب تو گیارہ بجے کد یڈی ہو کر ان کا ویٹ کر رہے تھے۔ اس لیے ارم کی گاڑی کا بارن سنتے ہی وہ سب جلدی سے مارچ کرتے ہوئے گھر سے باہر آ گئے۔ کرن اور روپی کے علاوہ زہرہ خانم اور پومی بھی ساتھ جا رہے تھے۔ باہر آتے ہی زہرہ خانم فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے اس عمر میں بھی بے حد شوخ میک اپ کر رکھا تھا جبکہ پچھلی سیٹوں پر کرن، روپی اور پومی کچھ اس طرح بیٹھے کہ ایک جانب کرن بھی تو دوسری سمت پومی اور سنٹر میں روپی کو بٹھایا گیا تھا۔ ارم آپلی کے کہنے پر۔ روپی سمجھ گئی تھی کہ اس کو محض حفاظتی نکتہ نظر سے سنٹر میں بٹھایا گیا تھا۔ کسی بھی ناخوشگوار سانحہ سے بچنے کیلئے۔ اور یہ بات روپی کے سکون کا باعث ہونی چاہیے تھی مگر روپی پھر بھی تھوڑی بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ کچھ گھروالوں کی جانب سے خفزدہی تو کچھ پومی کی وجہ سے پریشان تھی۔ جو روپی کے ساتھ جڑ کر بیٹھا تھا۔ حالانکہ کرن ذرا سا بھی اس کے ساتھ نہیں لگد ہی تھی۔ وہ تینوں ہی بڑے سمارٹ جسم کے تھے۔ پومی یقیناً جان بوجھ کر اس کے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔ کیونکہ جب کوئی سپیڈ بریکر آتا تو پومی کی کہنی اس کے جسم کے نازک حصے کے ساتھ لازمی چبھتی تھی۔ اور روپی مارے شرم کے نہ پومی سے کچھ کہہ سکتی تھی نہ ہی کرن یا کسی اور سے کہ وہ برانہ مان جائیں۔ ہمارے ہی گھر میں رہتی ہو اور ہمارے ہی بھائی اور بیٹے پر اہرام رکھتی ہو۔ خدا خدا کر کے ریٹائرمنٹ آیا تو روپی نے سکون کی سانس لی۔ ارم ان سب کو فائیو سٹار نیو ریٹائرمنٹ میں لے کر آئی تھی جہاں روپی کی کلاس کا آنا تو دور کی بات پاس سے گزرتے ہوئے بھی نظریں جھکا لیتے ہیں۔ یہاں سلمان یا اس کے گھروالوں کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی گاڑی میں کوئی خطرہ تھا کیونکہ اس کی کھڑکیوں کے شیشے کلرڈ تھے۔

روپی جب ریٹائرمنٹ کے اندر آئی تو وہاں کا آزاد فلی ماحول دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کیونکہ وہ زندگی میں پہلی بار کسی ریٹائرمنٹ میں آئی تھی۔ سامنے ڈانس فلور پر نو جوان جوڑے اپنے آس پاس سے بے خبر ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ڈانس کر رہے تھے اور ہال میں ہر میز کے سامنے لگی کرسیوں پر بیٹھے اکثر نو جوان لڑکے لڑکیاں سگریٹ نوشی کے ساتھ مے نوشی میں بھی مصروف تھے۔ کھانے پینے کا دور بھی ساتھ چل رہا تھا۔ باتیں بھی اور ہنسی کے ساتھ اونچے قبچہ بھی۔ بنگ اولڈ سب ہی خوش گپیوں میں مصروف تھے اور روپی حیرت



سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

ارم کو دیکھتے ہی ایک وٹریٹری سے ان کی جانب بھی لپک کر آیا تھا۔ اور پھر ان کو ان کی میز پر بٹھا کر چلا گیا۔ اس میز پر کل چھ کرسیاں لگی تھیں جبکہ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ اس لیے ایک کرسی فارغ رہی مگر زیادہ دیر وہاں نہ رہ سکی کہ چائیکارم آپی کا ایک فرینڈ وہاں آگئے اور انہوں نے بیٹھتے ہی روٹی کو بخور دیکھتے ہوئے ارم سے کہا۔

”باقی سب کٹو میں جانتا ہوں مگر یہ ہیرا کس کان سے نکل کر لائی ہو؟“ ارم نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تمہاری بات کرنے کا انداز کبھی نہیں بدل سکتا۔ یہ میری امی کی بھانجی ہے۔ یعنی میری خالہ کی بیٹی اور بتو کی سلا ہو آئی ہے وٹ کی کرنے۔“ پھر ارم نے روٹی سے کہا۔ ”روٹی یہ میرے فرینڈ وسیم ہیں۔“ وسیم کی عمر تقریباً 35 سال رہی ہوگی۔ ارم کی بات ختم ہوتے ہی وسیم نے ہیلو کہتے ہوئے روٹی کی جانب ہاتھ بڑھایا اور یہ بات گھر سے نکلنے سے پہلے زبرہ خانم نے بطور خاص خود روٹی سے کہی تھی۔

”وہاں کوئی تم سے ہاتھ ملانا چاہے تو انکار نہیں کرنا۔ اب تم نے پلیٹ کرکڑا دیا نویں ماحول میں واپس جانا ہے۔ روٹی کا دل تو نہیں چاہتا تھا ہاتھ ملانے کو مگر وہ جو کہتے ہیں۔“ جیسا ویس، ویسا بھیجیں“ سو روٹی نے دل پر جبر کر کے وسیم سے ہاتھ ملایا تو وسیم چند لمحے اس کے ہاتھ کو دیکھتا رہا پھر دبا کر چھوڑ دیا۔ وہ بھی نرمی سے نہیں کافی سخت انداز میں۔ پھر وہ مسکرا کر اس کو دیکھنے لگا۔

روٹی کا اس کی اس ذلیل حرکت پر غصہ تو بہت زیادہ آیا۔ جسم کا اندر یکدم خون کھول کے رہ گیا تھا۔ مگر یہاں بھی ویسے ہی صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ جیسے گاڑی میں بار بار پوی کی کہنی لگنے پر ہتی آتی تھی۔ وسیم نے ارم کرن کے ساتھ ساتھ پوی اور زبرہ خانم سے بھی ہاتھ ملایا تھا۔ زبرہ خانم نے بڑی محبت سے اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے ڈھیروں دعاؤں سے بھی نوازا تھا۔ باتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں آ کر روٹی نے پہلی بار ارم اور زبرہ خانم کو سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیونکہ وسیم نے اپنے کوٹ کی پاکٹ سے سگریٹ کیس نکال کر سب سے پہلے زبرہ خانم کے سامنے کیا تھا اور انہوں نے سو سو پٹ کہتے ہوئے ایک سگریٹ اٹھا کر ہونٹوں میں دیا لیا تھا۔ پھر ایسے ہی یہ سگریٹ کیس ارم کے سامنے کیا۔ تو اس نے بھی ایک سگریٹ نکال کر انگلیوں میں دبا لی تھی۔ اس کے بعد وسیم نے ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا کر سگریٹ کیس بند کیا۔ لیٹر نکال کر پہلے زبرہ خانم کی سگریٹ سلگایا پھر ارم کا اس کے بعد اپنا سگریٹ سلگا کر لیٹر اپنی پاکٹ میں واپس رکھتے ہوئے ایک طویل کش لیا اور دھواں پورا منہ کھول کر روٹی کے چہرے پر پھینکتے ہوئے ہنس پڑا۔ اس کے ساتھ ہی باقی سب بھی ہنسنے لگے تھے۔ مگر روٹی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ اس نے گھور کر وسیم کو دیکھا۔ پھر اس کو برا بھلا کہنے لگیوں کو جنبش دے رہی تھی کہ ارم جو بخور اس کے اثرات نوٹ کر رہی تھی جلدی سے بول پڑی۔

”روٹی! خفا ہونے کی ضرورت نہیں یہ صرف مذاق تھا صرف جوک کبھی۔“ روٹی نے منہ بند کر لیا۔ وہ سب باتیں کرتے ہنستے مسکراتے تھے بھلا گاتے رہے مگر روٹی نے پھر منہ نہیں کھولا تھا۔ یہاں تک کہ کھانا آیا اور کھا بھی لیا گیا۔ ارم کا فرینڈ وسیم بھی کھانے میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ روٹی کا جواب کھانا کھانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ اندر مارے غصے کے اس کا برا حال تھا۔ مگر بظاہر چپ رہنے پر مجبور تھی۔ تاہم دل میں وہ وسیم کو ابھی تک برا بھلا کہہ رہی تھی۔

کھانے کے بعد وہ لوگ کافی پی کر ریستورنٹ سے باہر آئے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ ہم بات جو روٹی نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ کھانے کا بل ارم کا فرینڈ وسیم نے ادا کیا تھا۔ ساتھ بھاری ٹپ بھی دی تھی۔ باہر آتے ہی وہاں سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے مسکرائی ہوئی نگاہوں سے روٹی کو دیکھتے ہوئے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ جس کا چہرہ مارے غصے کا بھی تھکا ہوا تھا۔

وسیم کے جانے کے بعد یہ سب بھی گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ ان کی گاڑی دیکھتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا اور ارم کا راند رلے آئی۔ اندر آ کر گاڑی سے باہر آتے ہی زبرہ خانم نے روٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”روٹی! تم یونہی ڈر رہی تھیں۔ دیکھ لو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اب ہر قسم کا خوف اپنے دل سے نکال دو۔“ پھر وہ سب ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے روم میں چلے گئے تھے۔ تب روٹی بھی تھکے تھکے قدم اٹھاتی اپنے بیڈ روم میں آ گئی تھی۔ گھر کے باہر کسی ریستورنٹ میں کھانا کھانے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا اور یہ تجربہ کچھ زیادہ خوشگوار نہیں رہا تھا۔ محض وسیم کے نامناسب رویے کی وجہ سے باقی سب اس کو اچھا ہی لگا تھا یا پھر آتے جاتے وقت پوی کی وجہ سے ذرا پریشانی ہوئی تھی۔ روٹی نے یہ بھی نوٹ کیا تھا۔ ارم آپی کا فرینڈ یوں بخور بار



باردیکھتا تھا جیسے بچپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کا جسم دیکھ رہا تھا۔ روبی کو تو زبردہ خانم اور ام کا سگریٹ نوشی کرنا بھی بہت برا لگتا تھا۔ وہاں ہل میں تو اکثر جوڑے سگریٹ نوشی میں مصروف تھے۔ انہی سوچوں میں گمروبی نے ڈریس چھینج کیا پھر نائی پین کر روم میں واپس آئی۔ سائٹ بلب روشن کیا۔ پھر نرم گرم بستر پر لیٹ کر سوچا۔

جو بھی ہے جیسی بھی ہے اس گھر سے بہر حال یہ زندگی ہزار درجے بہتر ہے۔ نہ کوئی روک نہ کوئی ٹوک اس گھر میں۔ ایسی پرسکون زندگی کا تصور بھی ناممکن تھا۔ باقی ہر گھر کا اپنا ماحول ہوتا ہے۔ یہ گھر جس میں وہ اس وقت رہ رہی تھی کسی مولوی کا نہیں ایک اداکار کا تھا۔ اور شوہر سے تعلق رکھنے والوں کے گھروں کا ماحول ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی کیا اس کو اداکار بن جانا چاہیے اور پھر یہ سوچتے سوچتے ہی سو گئی مگر فیصلہ نہیں ہو سکا تھا شوہر میں جانے کا۔

☆☆☆☆

روبی کی شادی کا ایک ماہ بعد ہی شمشاد نے بھی اپنے گھر پر فون لگوا لیا تھا بلکہ ان کے دادا عامر نے سفارش وغیرہ کر کے خود ان کو لگوا کر دیا تھا۔ عامر ایک بے حد اچھا دادا تھا اور ویسے بھی منوری کے گھر اتنا بڑا بچہ کوئی تھا ہی نہیں جو ان کو روبی کے دروازے والی فون کا لڑ سننے کے لیے بلانے آتا۔ جبکہ روبی کے علاوہ سارے رشتہ دار بھی ایسی ویسی صورتحال میں منوری کے گھر ہی فون کرتے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ روبی کے آئے روز آنے والے فون کا تھا اور منوری کبھی گھر میں ہوتی تھی۔ کبھی ضروری کام سے کہیں جاتا بھی پڑ جاتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کی بہنوئی آپ بیتی دینے سے رہی۔ بس یہی وجہ تھی اپنا ہی فون لگوا لیا تھا۔ اس طرح روبی کو بہت سہولت ہو گئی تھی۔ وہ روبی کے بارے میں کھل کر پوچھ سکتی تھی ٹی یا نہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ سلمان اب بھی اس کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا اور وہ بھی تک نہ ملتی تھی۔ جبکہ سچی بات تو یہ تھی کہ گڈو کی محبت اور قربت میں گم ہو کر وہ اس کی تلاش ترک کر چکا تھا۔ بلکہ شمشاد تو ہر نماز کے بعد اب یہ دعا مانگتی تھی اللہ کرے روبی کبھی نہ ملے کہ سلمان یہ ضرور کہتا رہتا تھا جس روز روبی اس کو مل گئی وہ اسی وقت اسی لمحہ اس کو قتل کر کے خود کو قتل کر کے خود کو جگائے گا اور پھر جلدی نہیں تو چند برس بعد لازمی رہا ہو جائے گا کہ یہ قتل غیرت کے زمرے میں آئے گا۔ قید ہو گئی۔ بچائی نہیں ہوگی۔

یہ سب سن کر شمشاد کا دل بھی رونے لگتا تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ اگر اس کو کچھ ہو جاتا تو وہ زندہ کیسے رہتی۔ سو سلمان کی زندگی کے لیے وہ چاہتی تھی اللہ کرے روبی ان کو بھی نہ ملے۔ کبھی ان کے گھر واپس نہ آئے۔ خاندان میں اکثر لوگوں کو تو شک ہو چکا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ جو ابھی تک روبی ایٹ آباد سے واپس نہیں آئی۔ روبی کے گھر سے بھاگنے والی ذلت آج نہیں تو کل لازمی اٹھانی تھی۔ مگر بیٹے کی بچائی یا قید کا صدمہ نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ غزالہ کی موت کا صدمہ اٹھا کر اس کی ماں خالدہ کی جو حالت تھی وہ اس کے سامنے تھی۔ وہ خالدہ کے دکھ کو محض اس لیے اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اس نے بھی روبی کے بھاگنے کا صدمہ اٹھایا تھا۔ وہ زندہ تھی یا مر چکی تھی۔ شمشاد نہیں جانتی تھی۔ ہاں وہ چاہتی تھی اگر وہ زندہ بھی ہے تو مر جائے۔ کچھ بھی ہو مگر وہ کبھی لوٹ کر ان کے گھر نہ آئے۔ وہ ان سب کے لیے اسی دن مر گئی تھی جب وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ غزالہ کی ماں آوارہ بیٹی کی موت کا صدمہ اٹھا کر پاگل ہو رہی تھی جس کی وجہ سے شوہر کی زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ سلمان تو پھر اس کا کلوتا بیٹا تھا اور وہ اپنے بیٹے کی زندگی چاہتی تھی موت نہیں۔

ادھر گڈو کی ماں کا بھی فون آ گیا کہ اب گڈو کو بھیج دو۔ یہ سن کر شمشاد نے کہہ دیا تمہارے پاس تو ابھی گڈو کے علاوہ بھی تین بیٹیاں ہیں گھر کا کام کاج کرنے کو اور یہاں جو ایک تھی وہ بیاہ ہو کر اپنے گھر تو کیا شہر سے بھی دور بیٹھی ہے۔ ابھی چند روز صبر کرو۔ پہلے روبی کو جا کر لے آؤں پھر خود آ کر گڈو کو تمہارے گھر چھوڑ جاؤں گی۔ مگر روبی نے کہاں سے آنا تھا۔ مگر کوئی نہ کوئی پروگرام تو اب روبی کے بارے میں طے کرنا ہی تھا۔ اس کو ساری عمر تو اب ایٹ آباد میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ مگر گڈو کو بھی کب تک اپنے گھر میں رکھ سکتی تھی۔ یہ ٹھیک۔ ہاں اپنے بھاری جسم کی وجہ سے اب گھر کی صفائی وغیرہ نہیں کر سکتی تھی باقی کھانا وغیرہ پکانا تو اب بھی اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

گھر کے کام کے لیے لڑکی رکھی جاسکتی تھی۔ یہ لڑکی روبی کی شادی کے فوراً بعد بھی رکھی جاسکتی تھی مگر اس لیے نہ کبھی کام کے بہانے گڈو کو روک لے۔ سلمان روبی کے حوالے سے بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اور حمیدہ نے گڈو کو یہ سوچ کر روک لیا تھا کہ وہ سلمان کا دھیان بنانے کا باعث بنے گی۔ روبی ان کو بتا چکی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور یہی ہوا تھا۔ گڈو سلمان کا دل بہلانے میں کامیاب رہی تھی۔ سلمان جو رات دن روبی کی تلاش میں مارا مارا پھرنا تھا اب اس کی تلاش ترک کر چکا تھا۔ تاہم اس کا کہنا تھا اگر کبھی اس کو روبی مل گئی تو وہ وہیں اس کو مار ڈالے گا۔ زندہ ہر گز نہیں چھوڑے گا۔ اور اب انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ جب گڈو کو چھوڑنے جائیں گی تو بھانج سے سلمان اور گڈو کے رشتے کی بات لازمی کر کے آئیں گی۔ اسی برس سلمان کی شادی بھی کر دیں گی تا کہ سلمان بالکل روبی کو فراموش کر دے۔ یوں بھی جب سے روبی کی شادی ہوئی تھی تب سے وہ گھر میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ اکثر روبی رات کو عامر کے ساتھ ملنے چلی آتی تھی مگر زیادہ دیر بیٹھتی نہیں تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھتی پھر چلی جاتی۔ وہ اپنے گھر بے حد خوش تھی۔ شوہر ہی نہیں سارا سر مل ہی اس



کو بہت اچھا لگتا تھا۔ بھی اس کا خیل رکھتے تھے۔ بات منہ سے بعد میں نکلتی تھی پوری پہلے کر دی جاتی تھی اور شمشاد اس کو خوش دیکھ کر اکثر یہی سوچتی تھی روجی نے مجھ اور اپنے خاندان کو خوش رکھا اس لیے اللہ نے اس کو بھی خوش رکھا ہے۔ پھر روٹی کو یاد کر کے کوئی تھیں کہ روٹی جس طرح تم نے ہماری خوشی برباد کی۔ جس طرح تم نے ہمیں بے سکون کیا ہے۔ ذلت دی ہے اگر تم زندہ تو تمہیں بھی کبھی خوشی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ اللہ کرے ساری زندگی بے سکون رہو اور ذلت پہ ذلت اٹھاتی رہو۔

☆☆☆☆

بلال نے جب لاہور سے واپس ایبٹ آباد جانے کے بعد شادی کے لیے اپنی رضامندی دے دی تھی تو نیگم اخلاق جو بلال کی عدم موجودگی میں اس کے لیے لڑکی تلاش کر چکی تھیں بلال کی جانب سے ہاں ہوتے ہی بہت دھوم دھام سے ان کی منگنی کی رسم ادا کرنا چاہتی تھیں مگر بلال چونکہ مذہبی بندہ تھا اس لیے کہا۔

”امی جان! بہت زیادہ دھوم دھام سے منگنی کرنے کی ضرورت نہیں۔ سادگی سے رسم ادا کریں بلکہ فضول میں کوئی رسم ادا کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ زبانی بات پکی کر لیں۔“

”میرے چھوٹے بیٹے کی منگنی ہے دھوم دھام سے ہوگی۔“ نیگم اخلاق نے کہا تو بلال بولے۔

”دھوم دھام بہت ضروری ہے تو شادی پر کر لیجئے گا۔ ابھی صرف بات پکی کر دیں۔“ اور نیگم اخلاق ان کی بات مان گئیں۔ ان کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی کہ بلال جو کہتے تھے امریکہ سے واپسی پر شادی کریں گے۔ اب امریکہ جانے سے پہلے ہی شادی کے لیے ایگری ہو گئے تھے۔ انہوں نے بہت سادگی کے ساتھ لڑکی والوں سے بلال کی منگنی کی بات پکی کر دی تھی۔ اور لڑکی خاندان ہی کی تھی۔

کمال اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے لاہور چلے آئے اس کے بعد خان اخلاق خان کو چھوڑ کر باقی سب لوگ روجی کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور آ گئے۔ انہی دنوں کمال کی رہائش کے لیے بنگالہ گیا تھا۔ شادی دیکھنے کے بعد وہ لوگ بنگالہ میں شفٹ ہو گئے اور گل نے نیگم اخلاق کو چند روز کے لیے اپنے پاس روک لیا۔ اور بلال تو روجی کے ولیمو لے دن سے ہی اپنے نجی کام میں ایسے مصروف ہوئے تھے کہ ابھی تک ان مصروفیات سے نکل نہیں سکے تھے نہ ہی اپنا کام ہی ادا کر چھوڑ کر وہ واپس جانا چاہتے تھے۔ تاہم انہوں نے والد کو واپس جانے کا مشورہ ضرور دیا تھا کہ بابا جان وہاں اکیلے ہیں، آپ چلی جائیں مگر نیگم اخلاق ان کو لاہور میں چھوڑ کر واپس جانا نہیں چاہتی تھیں۔ بلال نے کہا تھا وہ امریکہ جانے سے پہلے لازمی شادی کر لیں گے اور آج کمال نے ماں کو بتایا تھا بلال کا بلا واپس آج کل میں امریکہ سے آنے ہی والا ہے۔ یہ سنتے ہی نیگم اخلاق کو غصہ آ گیا۔ بلال رات گئے گھر آتے تھے اور صبح سویرے نکل جاتے تھے۔ اس لیے بابا ان سے بات کرنے کا موقع بھی ذرا کم ہی ملتا تھا۔ مگر آج انہوں نے بلال سے بات کرنے کے لیے جاگنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے روم میں سونے کی بجائے بلال کے روم میں آ کر ان کے بستر پر لیٹ کر لگی ان کا انتظار کرنے۔ آج وہ ان سے صاف صاف بات کر کے ان کو ساتھ لے کر صبح واپس ایبٹ آباد جانا چاہتی تھیں۔

☆☆☆☆

بلال روز کی طرح تھکے ہارے آج بھی ناکام ہی گھر واپس لوٹے تھے۔ اپنے روم میں داخل ہوئے تو ماں کو اپنے بستر میں لیٹے دیکھ کر حیران ہوئے۔ پھر سلام کرنے کے بعد بڑے ادب سے پوچھا۔

”امی جان! آپ اور اس وقت میرے روم میں، خیریت تو ہے؟“

”دن میں تم ملنے جو نہیں۔ ظاہر ہے پھر تم سے ملنے کے لیے یہاں لیٹ کر تمہارا انتظار کرنا ضروری تھا۔ کہاں رہتے ہو سارا دن؟“ نیگم اخلاق نے بے حد غصے سے پوچھا۔ یہ غصہ تو تب سے ہی ان کو بلال پر آ رہا تھا جب سے کمال نے بتایا تھا کہ آج کل میں امریکہ سے بلال کا بلا واپس آنے والا ہے۔ اگر بلا واپس آج کل میں آ گیا تو پھر شادی کب ہوگی۔ یا بلال نے پھر شادی کا پروگرام مؤخر کر دیا ہے۔

”امی جان! میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا میں اپنے ذاتی کام میں مصروف ہوں۔ اسی کی وجہ سے گھر سے باہر رہتا ہوں۔“ بلال نے چیخ پر بیٹھ کر بوٹا تارنے کے بعد سوکس اتارتے ہوئے بتایا۔

”کوئی ذاتی کام؟“ نیگم غصے کے مارے ٹھٹھکی۔



”ذاتی کام، ذاتی کام۔ نہ یہ تمہارا ذاتی کام ہوتا ہے اور نہ ہی تم یہ بتاتے ہو کہ وہ کام کیا ہے۔ کل جبکہ کمال بتا رہا تھا آج کل میں تمہارا بلاوا آنے والا ہے اور تم نجی کام میں بھی مصروف ہو۔“ بلال نے بڑے محل سے ان کی یہ ساری باتیں سنیں، پھر سنجیدگی سے کہا۔

”امی جان! اگر میرا یہ نجی کام ہوتا تو پھر فی الحال میری شادی کو کیمنسل سمجھ لیں۔ پھر یہ شادی امریکہ سے واپسی پر ہوگی۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو لڑکی والے اتنا لبا انتظار نہیں کر سکتے۔“ انہوں نے غصے سے بلال کو گھورتے ہوئے کہا۔

”تو ٹھیک ہے پھر وہ اپنی لڑکی کی شادی اپنی پسند پر کہیں اور کر لیں۔“ بلال نے کہا اور جلدی سے باتھ روم میں گھس گئے۔

ان کی بات سن کر بیگم اخلاق مارے غصے کے کھول کر رہ گئیں۔ پھر بلال کا انتظار کرنے لگیں۔ وہ کب واش روم سے باہر آئیں تاکہ ان سے آج ہی شادی کا قائل کرا سکیں مگر بلال تب واش روم سے باہر آئے تھے جب وہ ان کا ویٹ کر کے تھک ہار کر واپس اپنے روم میں چلی گئی تھیں۔ مگر انہوں نے سوچ لیا کہ صبح مسجد جانے سے پہلے ہی بلال کو پکڑیں گی۔ بغیر شادی کے امریکہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جبکہ منگنی کرتے ہوئے شادی والوں کو کہہ دیا تھا کہ تیاری کر لیں اور بتا دیا تھا امریکہ جانے سے پہلے بلال کی شادی ہوگی۔

☆☆☆☆

زہرہ خانم بہت تیز اور ہوشیار خاتون تھیں۔ انہوں نے وہاں ریٹائرمنٹ کے اندر ہی محسوس کر لیا تھا کہ روپی کوان دونوں ماں بیٹی کا سگریٹ نوشی کرنا اچھا نہیں لگا، مگر وہاں وہ سیم کے سامنے وضاحت نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے اگلے روز ناشتے کی میز پر ناشتہ کرنے کے بعد اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے روپی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”روپی بیٹی! میرے پیٹ میں اکثر گیس رہتی ہے۔ چند برس پہلے تو میں بالکل ٹھیک تھا کہ تھی مگر دو برس پہلے مجھے گیس کی شکایت ہو گئی تو میں ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے مجھے حقہ پینے کا مشورہ دیا۔ حقہ گرم کرنا کتنا مشکل کام ہے یہ تم جانتی ہی ہوگی۔ اس لیے میں حقے کی بجائے سگریٹ پینے لگی۔ پرانے زمانے میں بھی تو ہماری بزرگ خواتین حقہ پیتی تھیں اور حقہ سگریٹ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔“

یہ سب سنتے ہی روپی کو یاد آیا اس کی نانی بھی حقہ پیتی تھی۔ اس کی بڑی خالہ بھی حقہ پیتی تھی۔ وہ زہرہ خانم کی سن رہی تھی جو کہہ رہی تھیں۔

”سچی بات تو یہ ہے گڑیا جیسا دس ویسا بھیس۔ تم نے خود بھی دیکھا ہو گا وہاں سب ہی پی رہے تھے۔ اس لیے تمہاری ارم آپی نے مروت میں ایک سگریٹ پی لی تاہم تو پتہ نہیں کتنی باتیں سنی پڑیں اور نہ وہاں قاعدگی سے نہیں پیتی۔“ زہرہ خانم کی یہ بات سچ بھی تھی۔ ”ہاں البتہ میں ناشتے اور رات کے کھانے کے بعد لازمی پیتی ہوں۔ یہ میری دوانی بھی ہے اور مجبوری بھی بلکہ اب تو میں سپہر کی چائے پر بھی لازمی پیتی ہوں۔“ تم میری بات سمجھ رہی ہونا۔

روپی نے اثبات میں سر ہلا دیا تو زہرہ خانم نے کہا۔ ”میں نے وضاحت تمہارے سامنے اس لیے کی ہے کہ میں نے محسوس کیا تھا تم نے ہمارا سگریٹ پینا پسندیدگی سے دیکھا تھا۔“ اب کہ روپی چپ رہی اور وہ یہ بات نہیں جانتی تھی آنے والے دنوں میں وہ خود بھی اس بری چیز کی عادی ہو جائے گی۔

گھر سے باہر ریٹائرمنٹ میں کھانا کھائے ابھی بمشکل ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ ایک دن سپہر کی چائے پر ارم کہنے لگی۔

”آپا! میری دوست کے ہاں ایک زبردست پارٹی ہے۔ آپ سب بھی تیار رہیں گے۔“ اور آپا کو کیا اعتراض تھا۔ انہوں نے خود ارم سے کہا تھا۔

”اب اس لڑکی کو ہانے بہانے باہر نکالو تاکہ اس کا خوف ختم ہو سکے۔ جب خوف ختم ہو جائے تو پھر اس کو بھی اپنے ساتھ شوٹنگ پر ساتھ لے جانا شروع کر دینا۔ اس کا چہرہ شوکر واؤ۔ اپنے سب ملنے جلنے والوں کو بلکہ خود سب سے کہنا کہ وہ کام کرنا چاہتی ہے۔ اگر کسی فلم ساز یا ہدایتکار نے روپی کو پسند کر لیا تو پھر میں خود اس کو فلموں میں کام کرنے پر ایگری کر لوں گی۔ بس تم ذرا اس کو گھر سے باہر نکالو۔“

یہی وجہ تھی ریٹائرمنٹ کی دعوت کے بعد ارم اب اس کو گھر کے اندر ہونے والی ایک ڈنر پارٹی میں لے کر جا رہی تھی کیونکہ ارم نے خود بھی محسوس کر لیا تھا روپی ضرورت سے زیادہ شرمیلی لڑکی ہے اور فلموں میں کام کرنے کے لیے بے شرم ہونا تو کیا بے حیا ہونا بھی بے حد ضروری تھا۔

اب وہ روپی کو ایسی پارٹی میں لے کر جا رہی تھی۔ جس میں شو بزز کے بہت سارے مشہور اور معروف لوگ آ رہے تھے۔ خاص کر ٹی وی کے چند مشہور آرٹسٹ جن کے ڈرامے آج کل بے حد مقبول جا رہے تھے۔ جن کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے عام لوگ بے تاب رہتے تھے۔ ڈنر پارٹی دینے والی سستی بھی ٹی وی کی ایک مشہور پروڈیوسر آمنہ خان تھیں۔ ارم نے



ابھی سے ماں کو کہہ دیا تھا کہ۔

”اگر ڈنر پارٹی میں روپی کسی پروڈیوسر کو پسند آگئی تو سمجھو روپی کھور کسی ٹی وی ڈرامے میں کوئی نہ کوئی اچھا رول مل جائے گا۔“ اور ارم کی بات سنتے ہی زہرہ خانم نے کہا۔  
”دفع کرو ڈرامے کو تم اس کے لیے فلم تلاش کرو۔“

”آپا! بندہ ٹی وی کی معرفت بھی تو فلم میں چلا جاتا ہے۔ آپ ڈرامہ روپی کو اچھی طرح تیار کیجئے گا۔“ وہ یہ کہہ کر جلی گئی تھی۔

کوکہ مارچ کا مہینہ تھا اس کے باوجود زہرہ خانم نے روپی کے لیے پارٹی میں جانے کے لیے جس ڈریس کا انتخاب کیا تھا اس کے بازو یعنی آستینیں برائے نام ہی تھیں۔ روپی کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا مگر چونکہ کرن نے بھی بالکل ویسا ہی ڈریس پہنا تھا بس کلر کا فرق تھا اس لیے وہ خاموش ہی رہی تھیں۔ ڈریس کے ساتھ مچنگک پرس، جوتا اور آرٹی فیشل جیلوری جب وہ تیار ہوئی تو زہرہ خانم نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”میری بیٹی تو پری لگ رہی ہے۔ ہاں آج بال کھلے ہی رہے۔“ اور روپی ان کی کسی بات سے انکار کرنے کی جرأت کر ہی نہ سکتی تھی۔ ٹھیک دس بجے ارم ان کو لینے آگئی۔ وہ خود بار بار سے تیار ہو کر آئی تھی۔ ساڑھی کے ساتھ بے حد اوپن گلے والا سیولیس بلاؤز پہن رکھا تھا۔ آدھا پیٹ بھی عریاں ہو رہا تھا۔ روپی کو یہ سب دیکھ کر بے حد شرم آئی مگر اس نے آج یہ بھی محسوس کیا تھا ارم آپا آج بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ زہرہ خانم نے خود بھی آج ساڑھی باندھی تھی۔ مگر بلاؤز کی ہاف آستین تھی۔ پوی بھی خوب تیار ہو کر ان کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہ گھر سے روانہ ہوئے تو بیٹھنے کا طریقہ وہی پچھلی بار والا اختیار کیا گیا۔ یعنی فرنٹ سیٹ پر زہرہ خانم، پیچھے ایک جانب پوی، دوسری طرف کرن اور سچ میں روپی۔ وہ لوگ جب پارٹی والے گھر پہنچے تو پارٹی شروع ہو چکی تھی۔

تاہم اچھی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ بیٹھنے کا اہتمام کھلے لان میں کیا گیا تھا۔ یہاں آ کر تو روپی دنگ رہ گئی۔ ٹی وی کے کتنے ہی مشہور اداکار پارٹی میں موجود تھے۔ ریسٹورنٹ سے بھی زیادہ کھانا ماحول۔ ارم خود ایک ایک سے روپی کا تعارف کروا رہی تھی اور روپی کو سب سے ملنا اچھا بھی لگ رہا تھا۔ ان میں ٹی وی کے ایک دو وہ چہرے بھی تھے جن سے اس کا اکثر ملنے کو مل جاتا تھا۔ مگر جو بات اسے بری لگی وہ یہ تھی کہ یہاں ہر طرح کے مشروب موجود تھے۔ مہمان اپنی اپنی پسند کا مشروب پی رہے تھے۔ سگریٹ تو بہت ساری لڑکیاں اور خواتین پی رہی تھیں مگر اس کے ساتھ ساتھ چند خواتین اور اکا اکا لڑکیاں ایسی بھی تھیں جو نہ صرف چرس بلکہ سگریٹ کے ساتھ ڈسکی بھی پی رہی تھی۔ روپی کو چرس کی بو سخت ناگوار گزر رہی تھی۔ مگر وہ اپنی مرضی سے پارٹی چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتی تھی۔ آج تو کرن نے بھی ایک سگریٹ پی لی تھی بلکہ ہنستے ہوئے روپی کو بھی دعوت دی تھی مگر روپی نے معذرت کر لی تھی۔ چرس اور برانڈی کی بو کے علاوہ جو چیز روپی کو پریشان کر رہی تھی وہ بھی سخت سردی۔ برائے نام آستین کی میٹھ اس نے پین رکھی تھی اور شال وغیرہ ساتھ لائی نہیں تھی۔ پارٹی ابھی دو دو رنگ ختم ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ابھی تک مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔

پارٹی میں ارم نے جب فلمی رسالے کا ایک ایڈیٹر سے روپی کا تعارف کروایا تو ایڈیٹر نے اپنے فلمی رسالے کے سرورق کیلئے روپی کی تصویر مانگ لی۔ اور ارم سے کہا میرا فوٹو گرافر کل گھر آ کر اسی ہفتے کے پرچے کے لیے روپی کی تصویر لے آئے گا۔ ارم نے اس بات کے لیے نہ صرف ہاں کر دی تھی بلکہ وہ بے حد خوش بھی تھی کہ یہ فلمی رسالہ شوبز کا بڑا بندہ پر مہتا تھا۔ کھانے کے بعد سب مہمانوں کی رخصتی شروع ہو گئی۔ ارم بھی ان سب کو لے کر گھر کے لیے روانہ ہوئی۔ پھر راستے میں روپی سے پوچھا۔

”روپی یہ پارٹی کسے لگی تھیں؟“

”بہت اچھی آپا! مگر وہاں خواتین اور لڑکیاں بھی ڈسکی پی رہی تھیں۔“ روپی نے منہ بنا کر نا کھاری کا ٹھہار کیا۔ ارم نے ہنس کر کہا۔

”بے بی ٹی نئی ہو اس لیے ایسا کہہ رہی ہو۔ یہ سب چیزیں ہائی سوسائٹی کی ضرورت ہے۔ باقی سب تو ٹھیک رہا ہے۔ یہ بتاؤ۔“

”جی آپا! مگر مجھے سردی بہت لگتی رہی تھی۔ بلکہ اب بھی لگ رہی ہے۔“ روپی واقعی سردی سے کانپ رہی تھی۔ روپی کی بات پر پوی نے چونک کر اس کو دیکھا پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے

لگا اور ارم سے کہا۔

”ہاں یہ مسئلہ تو تھا مگر ایسے ماحول میں سردی کی پروا کون کرتا ہے۔“ گھر پہنچنے تک سب چپ ہی رہے تھے۔ گھر آتے ہی روپی سب کو شب بخیر کہہ کر جلدی سے اپنے روم میں چلی آئی۔ روم میں آتے ہی پارٹی ڈریس اتار کر نائی پہنی پھر بستر میں گھس کر کمبل اوڑھ لیا مگر سردی اس کے جسم کا اندر تک اتر چکی تھی۔ روپی نے سوچ لیا دوبارہ وہ بھی ایسا ڈریس پہن کر



کسی پارٹی میں نہیں جائے گی۔ اگر گئی تو شال لازمی لے کر جائے گی۔ وہ چارٹی اور اس میں آنے والے مہمانوں کے بارے میں سوچ رہے تھی کہ اچانک لائٹ چلی گئی اور پھر روپی نے محسوس کیا کوئی اس کے بستر میں آہٹگی سے گھس آیا تھا۔

”کون؟“ اس نے مارے خوف کے کانپتے ہوئے پوچھا اور مل میں سوچا کیا سلمان بھائی اس کو قتل کرنے کیلئے یہاں پہنچ گیا ہے۔ تبھی پومی کی باریک آواز سنائی دی۔ وہ آہٹگی سے کہہ رہا تھا۔ روپی! ”وہ۔۔۔ وہم گاڑی میں کہہ رہی تھیں نہ کہ تمہیں سخت سردی لگ رہی ہے اس لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”پومی بھائی پلیز! اپنے روم میں جائیں۔“ روپی نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اب وہ سمجھ گئی تھی کئی گئی نہیں تھی روم کی لائٹ پومی نے خود بند کی تھی کہ مارے سردی کے روم میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کرنے کی بجائے وہ اپنا ڈریس بدلنے چلی گئی تھی اور پھر سیدھی بستر میں گھس گئی تھی۔ یعنی دروازہ بند کرنا یا انہیں رہا تھا۔ جس کا قائد ہاتھ کر پومی روم میں تو کیا بستر میں گھس آیا تھا۔

”روپی! مجھے بھائی نہ کہا کرو۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں نے ماما سے کہہ دیا ہے کہ میں تم ہی سے شادی کروں گا۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی پومی نے اس کو زبردستی بانہوں میں بھر لیا۔ روپی زور سے چیخی۔ ”بچاؤ، بچاؤ، آ پارم آپی، کرن، ابو، پلیز، پلیز، مجھے بچاؤ۔“



ارم اور کرن اپنے روم میں جانے کی بجائے ماں کے ساتھ اس کے روم میں گئیں۔ ایک تو ابو کی طبیعت خراب تھی اس لیے وہ پوچھنے دوہرا روم ماں کو بتانا چاہتی تھی کہ ملک کے سب سے مشہور قلمی رسالے کے سرورق پر اس ہفتے روپی کی تصویر لگے گی۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی کہ یہ قلمی رسالہ بھی شوبز کے لوگ پڑھتے تھے اور روپی کو ایک وقت کئی فلموں میں کام مل سکتا تھا۔ وہ بیٹھی ماں کو یہ سب بتا رہی تھی۔ آخر میں بولی۔ ”صبح ذرا جلدی اٹھ جائے گا۔ رسالے کا فوٹو گرافر 12 بجے تک آ جائے گا۔ تبھی روپی کی چیخ سنائی دی۔

وہ چاروں ہی گھبرا کر کھڑے ہو گئے کہ یہ کیا ہوا۔ کیا اس کا بھائی گھر کا اندر آ گیا۔ مگر کیسے جبکہ گیٹ کے باہر چوک پدا بھی موجود ہے۔ روپی کی آواز پھر سنائی دی جیسے اس کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ چاروں بھاگتے ہوئے روپی کے روم میں آئے تو لائٹ بند تھی۔ کرن نے جلدی سے سوچ آج کیا تو زہرہ خانم نے بلکہ سب ہی نے دیکھا پومی روپی کے بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ مارے غصے کے وہ پاگل ہو کر تیزی سے پومی کی جانب بڑھی مگر اس سے بھی پہلے ارم اپنی ہائی ہیل کا جوتا اتار کر اس کی جانب بڑھی تھی۔

ان سب کو دیکھتے ہی پومی جلدی سے روپی کو چھوڑ کر بستر سے باہر نکل آیا اور ارم اپنی جوتی سے اس کی ٹھیک ٹھاک ٹھکانی کرتے ہوئے اس کو روم سے باہر لے گئی۔ ابو بھی ان دونوں کے پیچھے چلے گئے تھے جبکہ زہرہ خانم معذرت کرنے اور روپی کو تسلی دینے کے لیے ابھی روم کے اندر موجود تھی۔ ان کے ساتھ کرن بھی تھی۔ ادھر روپی ابھی تک کمبل پر اپنا چہرہ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ زہرہ خانم نے آگے بڑھ کر اس کو پوری محبت سے گلے لگایا۔ پھر سر منہ چوم کر پوچھا۔

”روپی گڑیا! سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ تمہیں دروازہ بند کرنا یا انہیں رہا تھا یا پومی کے نوک کرنے پر خود کھولا تھا۔“

”آپا! مجھے سردی لگ رہی تھی اس لیے آتے ہی سیدھی ڈریس پہنچ کرنے چلی گئی اور ڈور بند کرنا بھول گئی۔“ روپی نے روتے ہوئے بتایا۔

”خیر! اب تم اپنے روم کا دروازہ کھلا بھی رکھو گی تو تب بھی پومی تمہارے روم کا رخ نہیں کرے گا۔ دیکھو اس کی جگہ میں معافی مانگتی ہوں تم سے۔“ روپی خاموش رہی اور زہرہ خانم نے پھر کہا۔

”چلو بیٹی! غصہ تھوک دو میں معافی مانگ رہی ہوں۔“

پلیز آپا! آپ ایسی بات نہ کریں۔ میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔“ روپی نے کہا۔ حالانکہ اس کا بو لنے کا موڈ نہیں تھا۔ تب زہرہ خانم نے کہا۔

”ہم سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ باقی رہا پومی تو وہ پھر کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ تم نے دیکھا ہے جس طرح تمہاری ارم آپی اس کو جوتی سے مارتی ہوئی تمہارے روم سے لے کر گئی ہے۔ اچھا اب تم سو جاؤ۔“ انہوں نے کہا تو کرن نے روپی کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”آئی ایم سوری روپی! آؤ اب تم دروازہ بند کر لو۔“ پھر وہاں کے ساتھ روم سے باہر نکل گئی۔ اب زہرہ خانم کا رخ اپنے روم کی جانب تھا۔ اس کو یقین تھا ارم پومی کو لے کر وہیں گئی



ہوگی۔

کرن اور زہرہ خانم کے روم سے نکلتے ہی روبی نے اٹھ کر دو زہندہ کر لیا تھا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ کر دیر تک روتی رہی اور روتے روتے سو گئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس گھر میں اس کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

ادھر جب زہرہ خانم اپنے روم میں داخل ہوئیں تو پومی ایک جانب کھڑا رو رہا تھا۔ ارم ابھی تک غصے میں بھری اس کے سامنے کھڑی اس کو گھور رہی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ حرکت دکھی آپ نے اس کتے کے پلے کی۔ ابھی سے لڑکی کو ہم سے متنفر کرنے لگا تھا۔ اس کی جرات کسے ہوئی روبی کے بیڈ روم میں جانے کی۔ حرام زدہ، الوکا پٹھا۔ ارم گالیاں دیتی جا رہی تھی۔ مگر باپ چپ چاپ سنا جا رہا تھا۔ زہرہ خانم کو برا تو لگا مگر وہ ارم کو ٹوک یا ڈانٹ کر خفا نہیں کر سکتی تھی کہ سارا گھر اس کے دم سے چلتا تھا۔ نرمی سے صرف اتنی ارم سے کہا۔

”تم اپنے روم میں جا کر آرام کرو۔ میں خوشخبری لیتی ہوں۔ اس کمینے بے غیرت نسل کی۔“ ان کی بات سنتے ہی ارم جلی گئی تھی۔ کرن بھی ان کے ساتھ آنے کی بجائے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔ ارم کے روم سے جاتے ہی پومی ان کے قریب آیا پھر اپنا سر ان کے آگے کرتے ہوئے بولا۔

”دو دیکھئے کتنی زور زور سے کتیا نے جوتیاں ماری ہیں اور پھر زور زور سے رونے لگا۔“ زہرہ خانم نے اس کا سر پکڑ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”پوری چنڈال ہے۔ اتنا زیادہ بھائی کو مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ عزت تو نہیں لوٹ لی تھی روبی کی۔ اس کو بہانہ چاہیے تمہیں ڈانٹنے اور مارنے کا کئی گشتی۔“ پومی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ارم کو گالیاں دیتی رہیں اور جب پومی روتے روتے چپ ہو گیا تو نرمی سے بولیں۔ ”تم جانتے ہو نا ہمارے جو پروگرام روبی کے بارے میں ہیں۔ جس چیز کی بڑی بولی لگتی ہے تم اس کو ضائع کرنے لگے تھے۔ غصہ تو مجھے بھی بہت زیادہ آیا تھا مگر اب جب ارم نے ہی اتنا مارا اور ڈانٹ کر گئی ہے تو میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ تم اب بچے نہیں رہے کہ ان باتوں کو سمجھ نہ سکو۔ آخر تمہیں عقل کب آئے گی؟ ہماری ساری محنت ضائع کرنے لگے تھے۔ تم باہر سے کوئی لڑکی نہیں پھانس سکتے۔ یعنی ضرورت کے لیے۔“

”مما! روبی مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ پومی نے لاڈ سے ان کے کانڈھے پر اپنا چہرہ رکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے! اچھی لگتی ہے! کر لیا شادی بھی۔ اس نے اب جانا ہی کہاں ہے۔ جس خاندان کی وہ ہے ایسی لڑکی کے لئے وہاں واپسی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر پہلے اس کو کچھ بن تو لینے دو۔ دوبارہ بھی میں تمہیں ایسی حرکت کرتے ہوئے نہ دیکھوں، ورنہ ارم نے تمہارا ہواگا میں زیادہ ماروں گی سمجھ۔“ زہرہ خانم نے دھمکی دی۔

”مما! روبی کی کی میری بہنا۔“ پومی نے پھر پوچھا۔

”ہاں ہاں کی کی تمہاری ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو تم صبح روبی سے معافی مانگو گے نا کہ اس کے دل سے خوف دور ہو سکے۔ کہنا روبی بہن مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔ پھر کبھی ایسا نہیں ہوگا۔“

”اوو! بہن کبھی نہیں کہوں گا، ہاں ایکسکیوز ضرور کروں گا۔“ پومی نے کہا تو زہرہ خانم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تم نے کونسا دل سے بہن کہنا ہے یا روز روز کہنا ہے۔ بس ایک بار ہی تو کہنا ہے۔“ اور پومی مان گیا۔ تب زہرہ خانم کے شوہر نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بیٹی کی زبان کچھ زیادہ ہی پھٹتی جا رہی ہے۔ کسی دن میں نے کچھ کہہ دیا تو تمہیں برا لگے گا۔ بہتر ہے تم خود ہی اس حرام زادی کو سمجھا دو ورنہ چھا نہیں ہوگا۔“

”آپ کو کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب کمائی نہیں کرتے تو پھر باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس سن لیا کریں چپ چاپ اور یہ سمجھ لیا کریں کہ کتیا بھونک رہی ہے اور پھر وہ کونسا روز روز بولتی ہے۔ تمہارے بیٹے نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔“ پھر پومی کا اپنے روم میں جانے کا کہتے ہوئے وہ ہونے کیلئے لیٹ گئی تھیں۔

☆☆☆☆

صبح جب بلال وضو کر کے مسجد جانے کے لیے اپنے روم سے باہر آئے تو نیگم اخلاق ان کے انتظار میں پہلے سے لاؤنج میں ٹہل رہی تھیں۔ بلال کو دیکھتے ہی بولیں۔

”رات ماں باہر بیٹھی انتظار کرتی رہی اور تم جان بوجھ کر واش روم سے باہر نہیں آئے۔ اب مسجد جانے سے پہلے تمہیں میری بات سنی ہوگی۔ میری بات سننے بغیر آج تم مسجد نہیں جاسکتے، سنا تم نے۔“



”امی جان! جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔ آپ کو پتہ ہے میں ہمیشہ نماز باجماعت ادا کرتا ہوں۔“ بلال نے کہا پھر ماں کی بات کا جواب دیئے بغیر مسجد چلے گئے۔ مسجد سے نکل کر پھر وہ روپی کی تلاش میں چل پڑے۔ روپی کے سوا اب ان کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا جبکہ ماں اپنی جگہ غصے سے کھل کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆☆

جب روز روز گڈو کی ماں کفون آنے لگے تو حمیدہ نے رات کے کھانے پر جب سب ہی گھر والے موجود تھے کہا۔

”آخر کب تک روپی کو ایسٹ آباد رکھیں گے اور گڈو کو اپنے گھر میں بس کر سوچو خاندان والوں سے روپی کے بارے میں کیا کہنا ہے نا کہ ہمیشہ کے لیے یہ مسئلہ ختم ہو سکے۔“

”کیا کہنا چاہیے؟“ نصیر صاحب نے پوچھا۔

”یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیا کہنا چاہیے؟“ شمشاد نے کہا تو گڈو روپی۔

”چھو بھو! آپ اجازت دیں تو میں کچھ کہوں۔“

”اجازت کیسی۔ بتاؤ اگر اس مسئلے کا کوئی اچھا حل ہے تمہارے پاس تو میری اجائی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔“

آپ سب خاندان والوں سے کہہ دیں روپی کی زیادہ خراب طبیعت کی خبر آنے پر میں اور اس کے دو مسلمان کو ساتھ لے کر ایسٹ آباد گئے مگر ہمارے جانے سے پہلے ہی وہ مر چکی تھی۔ ہم اس کو وہیں دفن کر کے واپس آ گئے۔ اب چہلم کا ختم یہاں اپنے گھر پر کریں گے اور پھر چہلم کا ختم کر کے لوگوں کو یقین دلادیں کہ روپی واقعی مر چکی ہے۔“ گڈو نے بات ختم کر کے سب کی جانب دیکھا۔

”تمہارے خیال میں لوگ یقین کر لیں گے؟“ شمشاد نے کہا۔ جبکہ سلمان کا چہرہ تو ایک بار پھر مارے غصے کے سرخ ہو رہا تھا اور وہ روپی کا ذکر سنتے ہی دانت پیسنے لگا تھا۔

”یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں اور اگر نا بھی کریں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ظاہری طور پر تو سب کے منہ بند ہو جائیں گے۔“ گڈو کی بات میں وزن تھا۔ پھر کچھ نہ کچھ حل تو اس مسئلے کا نکالنا ہی تھا۔ سو پھر یہ طے ہو گیا کہ پہلے وہ یہ ساری بات بیگم خلاق کو سمجھا دیں جو خلاق سے ابھی تک لاہور ہی میں مقیم تھیں۔ پھر خاندان والوں سے بھی کہہ دیا جائے گا۔ روپی کے سرال سے بھی نا کہ یہ مسئلہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو سکے۔ خاندان والے تو دور ہیں محلے والے جو روز روز پوچھتے ہیں ان سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔

اگلی صبح سب سے پہلے تو شمشاد نے کپڑوں کی دھلائی اور گھر کی صفائی کے لیے ایک لڑکی ملازمہ رکھ لی۔ حالانکہ زوہبی نے کہا بھی تھا کہ وہ سکول جانے سے پہلے گھر کی صفائی کر دیا کرے گی۔ مگر شمشاد نے اس کو مناسب نہ سمجھا کیونکہ زوہبی سائنس پڑھ رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور شمشاد نہیں چاہتی تھی کہ اس کی پڑھائی کا خرچ ہو۔ ڈاکٹری تو ویسے بھی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے ملازمہ رکھ لی تھی۔ اور بیگم خلاق کے گھر جانے کا پروگرام بنانے لگی۔

☆☆☆☆

اگلی رات بلال گھر آئے تو ماں کے ساتھ کمل بھی ان کے منتظر تھے۔ مگر ان کے روم میں نہیں باہر لاؤنج میں۔ بلال جیسے ہی اندر داخل ہوئے کمال نے ان کو دیکھتے ہوئے تھکمانہ پکارا۔

”بلال! اپنے روم میں جانے سے پہلے میری اور امی جان کی بات سن لو۔“

بلال روز کی طرح آج بھی نا کام ہی تھکے ہارے گھر واپس آئے تھے۔ اور وہ نہیں جانتے تھے کہ گھر کا اندر آج بہت بڑی خوشخبری بھی ان کی منتظر ہے۔ انہوں نے مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جانا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے امریکہ کی ایک فرم میں ملازمت کے لیے بھی اپلائی کیا ہوا تھا۔ وہاں سے بھی بلال کا بلاوا آ گیا تھا۔ سب گھر والے خوش بھی تھے اور پریشان بھی کہ بلال کا رویہ شادی کے حوالے سے پھر بدل چکا تھا۔

رات اس نے ماں سے صاف کہہ دیا تھا اگر لڑکی والے انتظار نہیں کر سکتے تو اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور کر لیں۔ بیگم خلاق نے یہ بات کمل کو بتادی تھی۔ یہی وجہ ہے اس وقت ماں کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی بلال کے ساتھ بات کرنے کے لئے موجود تھے۔ بلال سیدھا ان کی جانب ہی آئے۔ پھر سلام کیا۔ جس کا جواب دیتے ہوئے کمال نے پوچھا۔

”رات کیا بکواس کی ہے تم نے امی جان کے ساتھ۔ وہ کوئی ذاتی کام ہے جس کو نہ تم ادھورا چھوڑ سکتے ہو اور نہ ہی وہ مکمل ہوتا ہے۔ جبکہ امریکہ کی جس فرم میں تم نے جاب کے لیے



اپلائی کیا تھا وہاں سے تمہارا بلاوا آ گیا ہے۔“ یہ سنتے ہی بلال نے سوچا۔

”اوہ! تو بلاوا آ گیا امریکہ سے۔ بہر حال جانے سے پہلے شادی نہیں روٹی کو تلاش کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کروں گا تا کہ پورے سکون سے امریکہ جاسکوں اور اگر روٹی نہ ملے تو پھر ہو سکتا ہے امریکہ جانا کینسل کرنا پڑے۔“

”تم چپ کیوں ہو؟ میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ آج تم کو اپنے ذاتی کام کے بارے میں بتانا ہوگا۔“ کمال نے ان کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”میں نے اپنے ذاتی کام کے بارے میں آپ کو بتا دیا تو میرے کام کا سن کر آپ لوگوں کو اور زیادہ غصہ آئے گا صرف اتنا کہتا ہوں اب میں امریکہ جانے سے پہلے شادی نہیں کرنا چاہتا کہ میرے پاس اس کا نام نہیں رہا۔ ہاں واپسی پر سوچا جاسکتا ہے۔“

بلال نے ان کے سامنے دھڑکنے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

”تم بتاؤ تو سہی، یقین کرو میں غصہ نہیں آئے گا؟“ کمال نے کہا۔ ماں تو ابھی تک خاموش ہی بیٹھی ان کو غصے سے گھورتی جا رہی تھیں۔

”بھائی جان مجھے کسی کی تلاش ہے۔ مگر وہ سستی کوشش کے باوجود ابھی تک نہیں مل سکی۔“ بلال کہہ کر چپ ہو گئے۔

”کس کی تلاش ہے تمہیں کون ہے وہ۔“ اب کہ بیگم اخلاق نے غصے سے پوچھا۔ بلال خاموش ہی رہے تو کمال نے کہا۔

”دیکھو بلال تمہیں جس کی تلاش ہے ہمیں بھی اس کے بارے میں بتاؤ۔ ہو سکتا ہے ہم بھی تمہارے ساتھ مل کر تلاش کر کے تمہاری پریشانی ختم کر سکیں۔“ تب بلال نے بے حد مدہم لہجے میں کہا۔

”بھائی جان! مجھے شمشاد خالہ کی بیٹی روٹی کی تلاش ہے۔ روتی کو ایسے سے لے کر اب تک اس کی تلاش میں ہوں مگر افسوس کہ اپنی پوری کوشش کے باوجود میں ابھی تک اس کو تلاش نہیں کر پایا۔“

”کیا کہا تمہیں روٹی کی تلاش ہے۔“ بیگم اخلاق نے چونک کر بلال کو دیکھا۔ پھر سخت غصے سے پوچھا۔ ”تمہیں اس آوارہ کی تلاش ہے۔ وجہ بتانا پسند کرو گے مجھے کہ کیوں تلاش ہے؟“ بلال نے بمشکل ماں کے روٹی کے لیے ان الفاظ کو برداشت کیا پھر کہا۔

”ہونہہ! وہ آوارہ نہیں تھی۔“

”میں پوچھتی ہوں اگر وہ آوارہ نہیں تھی تو پھر گھر سے کیوں بھاگی؟ تم کون ہوتے ہو اسے شریف سمجھتے والے جبکہ اس کے بچے سگوں کو اس کی پردہ نہیں تو تم کون ہوتے ہو اس کے لیے پریشان ہونے والے اس کی فکر میں دلبے ہونے والے۔ تمہاری ذاتی دلچسپی کی وجہ کیا ہے۔ بس ذرا یہ مجھے بتاؤ۔ جب اس کے گھر والے اس کو تلاش نہیں کر رہے تو تم کس لیے کر رہے ہو۔“

”امی جان! وہ صرف میری وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگی تھی اس لیے میں اس کو تلاش کر رہا ہوں۔ اپنے گناہ کے کفارے کے لیے۔“ بلال اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

”تمہاری وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگی تھی۔ میں سمجھی نہیں۔“ بیگم اخلاق نے پوچھا۔

”جی امی جان! صرف میری وجہ سے۔“ بلال اتنا کہہ کر پھر خاموش ہو گئے تو بیگم اخلاق نے پریشانی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بلال! تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ مجھے ذرا وضاحت سے بتاؤ۔ وہ کیسے تمہاری وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگی؟“ ماں کی بات سن کر بلال کچھ دیر سوچتے رہے پھر پوری تفصیل کے ساتھ تمام واقعات سے ان کو آگاہ کر دیا۔ روٹی کا برسات کی طوفانی رات کو ڈر کر ان کے پاس آنا اور ان کا اس کو غلط سمجھ کر صرف روٹی کو برا بھلا کہنا بلکہ ساری بات سننے کے بعد بیگم اخلاق نے محبت سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر بات صرف اتنی ہی ہے تو اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس سے بھی برا رویہ اس کے ساتھ اختیار کرتا۔“

”قصور ہے امی جان! آپ نہیں سمجھتیں صرف میں سمجھتا ہوں۔“ بلال اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولے۔

”یہ دیکھ کر بیگم اخلاق اٹھ کر بیٹے کے پاس آئیں پھر محبت سے ان کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔



”میرے پیارے اور نیک بیٹے، تمہارا رویہ حالات کے مطابق تھا۔ یہ روپی کی بد قسمتی ہے کہ بجائے تمہاری باتوں کو سمجھ کر اپنی اصلاح کرنے کے وہ گھر سے ہی بھاگ گئی اور یہ بہت بڑا اقدام تھا جو اس نے اٹھایا۔ اچھی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں۔ مان لو اس کے خیالات اچھے نہیں تھے اس لیے وہ آدھی رات کو تمہارے پاس آئی جبکہ گھر میں بھی کوئی نہیں تھا۔ مان لو وہ بھی ہی آوارہ اور۔“

”امی جان پلیز! میرے سامنے آپ اس کو آوارہ نہیں کہیے گا۔ وہ بچی مابل ہلوفان سے بہت زیادہ ڈرتی تھی۔ یہ مجھے بعد میں شمشاد خلع نے بتایا تھا بے شک خود بھی شمشاد خلع سے پوچھ لیجئے گا وہ گھر میں کیلی تھی اس لیے۔“ مگر نیگم خلاق نے ان کو بات پوری کرنے کا موقع دیئے بغیر غصے سے کہا۔

”وہ کیلی تھی۔ وہ بچی مابل مباشر سے ڈرتی تھی۔ وہ یہ تھی وہ تھی فلاں ہو گیا۔ فلاں ہو گیا۔ میں کہتی ہوں جو ہونا تھا ہو گیا اور اس میں تمہارا کوئی قصور بھی نہیں۔ یہ سب انجانے میں ہوا۔ اب مجھے صرف یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو جبکہ امریکہ جانے کا بلاوا بھی آ گیا ہے اور امریکہ جانے سے پہلے تمہیں شادی بھی لازمی کرنی ہے۔ کسی بھول میں نہ رہنا کہ تم انکار کرو گے تو ہم مان لیں گے۔“ انہوں نے جتنی لہجے میں کہا تو بلال نے بھی ان کے غصے کی پرواہ کیے بغیر کہا۔

”میں ہر حال میں امریکہ جانے سے پہلے روپی کو تلاش کرنا چاہتا ہوں تا کہ سکون سے اپنے سفر پر روانہ ہو سکوں۔ اگر روپی نہ ملے تو شادی کرنا تو دور کی بات میں امریکہ جانا بھی ملوثی کروں گا۔“ بلال نے بھی قطعیت سے کہا۔

”میں کہتی ہوں روپی کی تلاش اس کے گھر والوں کا مسئلہ ہے۔ جب وہ اس کو تلاش نہیں کر رہے تو تمہیں کیا تکلیف ہے۔“ انہوں نے غصے سے کہا۔

”امی جان! میں نے صاف صاف آپ کو بتادیا ہے آپ پھر بھی پوچھتی ہیں مجھے کیا تکلیف ہے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ تکلیف میں روپی ہے۔ وہ بھی میری وجہ سے کہ میرے نامناسب رویے کی وجہ سے وہ گھر سے بھاگی۔ وہ چھوٹی تھی۔ مجھے چاہیے تھا اس کو زنی سے سمجھاتا۔ مگر میں نے حد سے زیادہ نامناسب لہجہ اختیار کیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ جتنے گناہ کرے گی ان کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوگی۔ مجرم میں ہوں گا۔“

”کیا فضول بکواس کر رہے ہو؟ جو گناہ کرتا ہے مجرم کرتا ہے مجرم بھی وہی کہلاتا ہے۔ مجھ سے بے وفائی کی باتیں مت کرو۔ صبح تم میرے ساتھ ایٹ آباد واپس چلو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔“ نیگم خلاق نے شدید غصے سے کہا۔

”امی جان! کبھی بھی اس دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے کہ گناہ کوئی اور کرتا ہے اور سزا کسی اور کو ملتی ہے۔ آپ ایٹ آباد جانے کی بات کرتی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں اگر روپی نہ ملے تو میں امریکہ بھی نہیں جاؤں گا۔ شادی کرنے کا فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں میں نے زندگی ہمیشہ گناہ اور ثواب کو سمجھتے ہوئے بسر کی ہے اور میں اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے بعد ہی کچھ اور کر سکوں گا اور یہ میرا جتنی فیصلہ ہے۔“

”ہوں تو روپی کی وجہ سے نہ تم شادی کرو گے اور نہ ہی امریکہ جاؤ گے۔ اب میں تمہاری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ تم نے محض روپی کے ساتھ شادی کرنے کیلئے رات شادی سے انکار کیا اور اب بھی کر رہے ہو۔ حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو ایسی بدکردار آوارہ لڑکی کی ہمارے خاندان میں بالکل گنجائش نہیں ہے۔ تم نے سوچا بھی کیسے کہ ہم اس آوارہ کا بیٹی بہو تسلیم کر لیں گے۔“ انہوں نے بے حد غصے سے کہا۔

بلال خود بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے خاندان میں روپی کو کوئی بھی بطور بہو قبول نہیں کرے گا ورنہ شروع میں انہوں نے بھی یہی سوچا تھا کہ وہ روپی کو تلاش کر کے خود اس کے ساتھ شادی کر لیں گے مگر اب وہ چاہتے تھے بس ایک بار روپی مل جائے تو وہ اس کو ساتھ لے کر شمشاد خلع کے گھر جائیں گے۔ شمشاد خلع کے پاؤں پکڑ کر سلمان کو سمجھا کر نصیر صاحب کو اللہ رسول کا واسطہ دے کر روپی کو معاف کر دینے کا کہیں گے اور بلال کو پورا یقین تھا کہ وہ اس میں کامیاب رہیں گے۔ آخر وہ ان کا اپنا خون تھی۔ اور بلال کے ضمیر کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور وہ سکون سے امریکہ جائیں گے۔ لیکن اب ماں نے جب یہ بات کی تو ان کو غصہ تو بے حد آیا مگر انہوں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”امی جان! آپ اچھی طرح جانتی ہیں میں نے بھی آپ سے تو کیا کسی سے بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میرا مقصد صرف روپی کی تلاش ہے۔ اگر آپ نے دعا یہ بات کی تو پھر روپی کے ساتھ شادی کے لیے میں سنجیدگی سے سوچوں گا۔ بہتر ہے آپ پہلی ہی اپنے رویے پر غور کر لیں۔“ اور بلال کی یہ دھمکی سن کر نیگم خلاق سمجھ گئیں وہ جو کہہ رہا ہے ویسا کر گزرے گا۔ اس لیے اب کبار ساری شادی وادی کی بات بھول کر زنی سے بولیں۔



”بیٹا اگر تم شادی نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے مگر روپی کی تلاش میں اپنا مستقبل تباہ مت کرو۔ اب مجھے تمہاری بات پر یقین آ گیا ہے اور سنو بیٹا! اب تم بھی اپنی ماں پر یقین کرو۔ تم امریکہ جاؤ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ اب روپی کو میں اور کمال میں کر تلاش کریں گے اور ملنے پر میں شمشاد سے مل کر خود کہہ کر روپی کو معاف کروادوں گی۔“

”امی جان! آپ سچ کہہ رہی ہیں۔“ بلال نے بے یقینی سے پوچھا۔ کیونکہ امریکہ جانے کی بلال کی اپنی خواہش تھی، بلکہ خوشی۔

”اگر تم نے بھی جھوٹ نہیں بولا تو کیا کبھی ماں کو جھوٹ بولتے ہوئے دیکھا ہے۔“ بیگم خلاق نے تھوڑی سی تکی سے کہا۔

”سوری امی جان بلال نے معذرت کی۔“ اب اس کو ماں کی بات پر پورا یقین آ گیا تھا۔ مگر اچانک پریشان ہو کر پوچھا۔

”امی جان! اگر روپی کے گھر والوں نے اس کو اپنانے سے انکار کر دیا تو۔“ بلال دل کا خدشہ زبان پر لے آئے۔

بیگم خلاق بچی نہیں تھیں جو بلال کی یہ کیفیت نہ سمجھتیں۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار بلال کو کسی لڑکی کے بارے میں پریشان اور بے تاب ہوتے دیکھا تھا۔ انہوں نے سوچا تین ماہان کے گھر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اچھی لگی ہو۔ خوبصورت بھی تو بہت زیادہ تھی۔

”میں نے کہا تو ہے کہ میں خود شمشاد سے کہوں گی وہ بچی کو معاف کر دیں۔“

انہوں نے بلال کو پھر یقین دلانے کی کوشش کی۔

”او کئی جان! میں امریکہ چلا جاتا ہوں۔ تاہم اگر انہوں نے روپی کو معاف نہ کیا تو پھر آپ اس کو یہاں کمال بھائی کے گھر لے آئیے گا۔ ٹھیک ہے نا۔“ بلال نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک۔“ بیگم خلاق ان کی ہر شرط مان کرنی لگی۔ بلال ان کو جلد از جلد امریکہ بھیجنا چاہتی تھیں۔

روپی کو انہوں نے تین برس پہلے دیکھا تھا۔ تب ان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ بچی ایسی بد معاش نکلے گی اور اپنے گھر والوں کے ساتھ ساتھ ان کو بھی پریشان کرے گی۔ ان کو جو کچھ خود شمشاد نے اپنی زبانی بتایا تھا اسی پر یقین تھا اور شمشاد ایسی ماں تھی کہ بیگم خلاق کو آصف اور تو صیف کے بارے میں بھی صاف صاف بتا دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی بلال کی روپی میں دلچسپی ان کو ایک آنکھ نہ بھاری تھی۔ اور وہ دل پر جبر کر کے ان کی ہر شرط مان رہی تھی۔ شادی تو امریکہ واپسی پر بھی ہو سکتی تھی لیکن اگر وہ روپی کی تلاش کو بہانہ بنا کر امریکہ نہ گئے تو پھر روپی سے شادی کی بات تھی اور وہ یہ نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے کہ وہ روپی کو خود تلاش کریں گی۔

بلال روپی کو بھول کر ماں کو ان کا روپی کے بارے میں وعدہ یاد دلاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ان کو رخصت کرنے خان اخلاق خان بھی لاہور آ گئے تھے۔ ان کے جانے پر شمشاد بھی ملنے آئی تھیں اور روپی کے بارے میں ان کو اپنا پروگرام بتا دیا تھا۔ بیگم خلاق نے کہہ دیا تھا وہ جیسا چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔ اور پھر اسی رات وہ بلال سے روپی کے حوالے سے کیا ہوا بروعدہ بھول کر اپنے شوہر کے ساتھ ایسٹ آبا د واپس چلی گئیں۔ ان کا روپی کو تلاش کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

☆☆☆☆

روپی کو معلوم تھا صبح وہ شوبز کی دنیا کی جانب پہلا قدم بڑھا رہی تھی۔ ملک کے سب سے مشہور فلمی پرچہ کا فوٹو گرافر رسالے کے مہرورق کے لیے اس کی تصویر لینے آ رہا تھا اور روپی نے پہلی بار سنجیدگی سے سوچا تھا کیا اس کو یہ سب قبول کر لینا چاہیے۔ گھر والوں کو جب پتہ چلے گا وہ شوبز میں چلی گئی ہے تو وہ کیا سوچیں گے؟

اوپہ! جو بھی سوچیں روپی نے نفرت سے سر جھکا پھر سوچا۔

بہن بھائی کی غیرت ہوتی ہے اور جب بھائی خود ہی بہن کو آوارہ کہہ دے تو غیرت اپنے آپ مرجاتی ہے۔ مٹی باپ کی عزت ہوتی ہے اور اگر باپ ہی مٹی پر شک کر کے اس کو بد چلن کہہ دے تو عزت خود ہی روٹھ کر کہیں چلی جاتی ہے۔ مٹی ماں کی آبرو ہوتی ہے اور جب ماں خود مٹی کو چھچھ کر مار مار کر آوارہ بد کردار، بے غیرت کہنے لگے تو آبرو لٹ جاتی ہے اور جہاں بہن بھی اپنے ذاتی مفاد کے لیے بہن کی دشمن بن جائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور یہ سب حادثے روپی کے ساتھ گزر چکے تھے۔ ان سب باتوں کے بعد محبت کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

روپی کے لیے بھی ان سب کی محبت ہمیشہ کے لیے مرنے لگی تھی اور بہت کچھ سوجھنے کے بعد اس نے شوبز جو ان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اس قدر مشہور ہو جائے کہ اس کے ایک ایک لمبے ایک حرکت کی خبر اس کے والدین اس کے بہن بھائیوں تک پہنچتی رہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہونا، جاگنا اخبار کی سرخیوں کی زینت بننے لگے۔ وہ ان سے دور رہ کر بھی



◆☆☆◆

★ ★ ★

غزالہ نے کہا تھا صرف گیارہ بجے تک میرا انتظار کرنا۔ پھر کھانا کھالیا۔ مگر گیارہ بجنے کے باوجود پرویز نے کھانا نہیں کھایا تھا کہ وہ غزالہ کے ساتھ کھانے کا عاری ہو چکا تھا۔ بے حد ٹوٹ کر چاہے ہلکا تھا اس کو۔ اگر وہ نہ ہوتی تو یہ تنہائی اس کو بہت اذیت دیتی۔ مگر اس نے پرویز کی زندگی میں آ کر اس کی تنہائی کو مٹا ڈالا تھا۔ اس کی ہر بات وہ مان لیتی تھی۔

گیارہ بجے کے بعد بارہ بھی بج گئے۔ پھر ایک، دو، تین مگر غزالہ نہ آئی اور وہ کھانا سامنے رکھ کر اس کا انتظار کرنا رہا اور سوچتا رہا۔ فجر کے قریب سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ



بھوکا ہی سو گیا تھا۔ اپنی محبت کا انتظار کرتے۔

تاہم آفس جانے کے نام پر آنکھ خود بخود ہی کھل گئی تھی کیونکہ وہ ہر روز سوتا ہی اس وقت تھا۔ غزالہ کو اس کے گھر چھوڑ کر آنے کے بعد تاہم وہ الارم لگا کر سوتا تھا۔ مگر آج بغیر الارم کے بھی آنکھ کھل گئی تھی۔ طبیعت میں کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھ تو نام پر ہی کھل گئی تھی۔ مگر گھر سے نکلتے نکلتے بھی تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔ رات اچھی نہیں جی تھی۔ سارا وقت غزالہ یاد آتی رہی تھی۔ پرویز نے اکیلے کھانا کھلایا ہی نہ تھا اور وہ بھوکا ہی سو گیا تھا۔ اب ناشتہ کیے بغیر ہی آفس چلا آیا تھا کہ آفس کی کینٹین سے ناشتہ منگوا کر کرے گا۔ اس نے ایسا کیا بھی تھا۔ ہر حل روز کی طرح یہ دن بھی گزر گیا اور وہ اپنا کام ختم کر کے آفس سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ شام ہو رہی تھی۔ کبھی گھروں میں جانے کی تیاری میں تھے۔ ہر جانب رش ہی رش تھا۔

گھر آتے ہوئے حسب معمول وہ کھانا لے کر آیا تھا۔ حالانکہ کل رات والا کھانا بھی وہ آفس آتے ہوئے فریج میں رکھ کر آیا تھا۔ مگر وہ ابی کھانا غزالہ کو کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کو یقین تھا غزالہ آج لازمی آئے گی۔ اس نے پرسوں جاتے ہوئے کہا تھا کہ آج رات نہ آئی تو کل رات لازمی آؤں گی۔

مگر ہوا یہ کہ غزالہ اس رات بھی نہ آئی تھی اور عرصہ بعد پرویز کو آج غزالہ پر شدید غصہ آیا تھا۔ غصے میں کھانا کھانے کی بجائے اٹھا کر پرے پھینک دیا تھا۔ غصے سے کھولتا ہوا وہ سو گیا۔ بل میں سوچ لیا آج رات اگر غزالہ آئی بھی تو بات نہیں کرے گا۔ وہ ابھی تک اس بات سے بے خبر تھا کہ غزالہ اب اس کو ملنے کبھی نہیں آئے گی۔ وہ اس کو تو کیا یہ دنیا ہی چھوڑ کر جا چکی تھی۔

صبح وہ شدید غصے کی حالت میں تیار ہو کر آفس آیا تھا۔ رات اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اپنی خفگی غزالہ پر ظاہر کرنے کو پرویز نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر وہ فائلیں چیک کرنے کی بجائے سوچوں میں گم ہو گیا۔ موڈ غزالہ کے نہ آنے سے سخت آف تھا۔ کچھ وقت یونہی گزرا پھر اس نے اپنے معمولات کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے میز پر رکھنا یوز پیپر اٹھا کر کھولا۔ پھر حسب معمول سب سے پہلے فرنٹ کی بیڈلائن پر نظر دوڑانے لگا۔ اس کی نظریں یکدم اخبار میں لگی غزالہ کی تصویر پر آ کر رک گئیں۔ فرنٹ پیج پر ہی غزالہ کی تصویر اور اس کی شرمناک اور اذیت ناک موت کی خبر موجود تھی۔

پرویز کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ایسا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بار نہیں کئی بار یہ خبر پڑھی اور بالآخر اس کو یقین کرنا پڑا یہ سب سچ ہے۔ غزالہ اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد مزید آفس میں رکنہ فضول تھا۔ جسم کام کرنے والی حالت میں نہیں رہا تھا۔ اس کی محبت، اس کی جان، اس کے دل کا سکون اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔ وہ اپنی مری ہوئی محبت پر غصہ کھانا رہا، کھولتا رہا تھا حالانکہ گھر بیٹھ کر غصہ کرنے سے بہتر تھا کہ اس کی تلاش میں نکل جاتا اور ہو سکتا ہے وہ سچ جاتی۔ مگر وہ خود ہی آتی تھی۔ ہاں چھوڑنے وہ اس کو لازمی جاتا تھا۔ اس نے کئی بار غزالہ سے کہا تھا وہ اس کو لینے بھی آ جلیا کرے مگر وہ نہیں مانی تھی، بولی تھی۔

”اگر مجھے کچھ دیر ہو جائے اور تمہیں کوئی مصلوہ لادیکھ لے یا کچھ بات نہیں۔ اس لیے میں خود ہی آ جایا کروں گی۔ وہ فوراً اٹھا اور اخبار ساتھ لے کر گھر واپس آ گیا۔ گھر واپس آنے سے پہلے اس نے راستے میں رک کر چھوٹے بڑے کئی اخبار اور بھی خرید لیے تھے تا کہ اچھی طرح جان سکے غزالہ کے ساتھ کیا ہوا۔

سارا راستہ وہ یہی سوچتا آیا تھا۔ جتنی وہ پرسوں رات ملنے آئی تھی مگر افسوس مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ کون تھے وہ لوگ جنہوں نے اسے اٹھایا اور پھر یہ حالت کرنے کے بعد موت دے کر بے رحمی سے گندے نالے کے کنارے اس کے نرم و نازک جسم کو ڈال گئے اور یہ سب بالکل چانک یا اتفاقیہ نہیں ہوا تھا۔ یقیناً کسی نے باقاعدہ پلاننگ کر کے غزالہ کو شکار کیا تھا۔ پہلے وہ کئی روز تک غزالہ کی روٹین چیک کرتے رہے۔ پھر موقع پا کر پکڑ لیا۔ یہ کام کسی فرد واحد کا نہیں وہ ایک دو نہیں تعداد میں اس سے بھی زیادہ تھے۔ پولیس اندازے کے مطابق چار یا پانچ۔ حتیٰ بات پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد ہی کہی جاسکتی ہے۔ یہ سب اخبار میں لکھا تھا۔ مگر وہ سب تھے کون؟ بہت زیادہ سوچنے کے بعد پرویز کا سب سے پہلا خیال اسی گھر کی جانب ہی گیا تھا جو زیر تعمیر تھا۔ پرویز کو یقین تھا اس کا خیال غلط نہیں ہو سکتا۔ وہاں ہو سکتا ہے کچھ روزات کورجے ہوں۔ یقیناً یہ حرکت ان لوگوں کی ہو سکتی ہے۔ غزالہ ہر روز اس گھر کے سامنے سے ہو کر پرویز کے پاس آتی تھی۔ وہ لوگ ہر رات اس کو آتے جاتے دیکھتے ہوں۔ گارڈ آف پلان بنا کر پکڑ لیا۔ مگر یہ کئی بات نہیں کہی جاسکتی اور کئی بات ہو سکتی تھیں تو مجھے ان کو پکڑتے ہوئے خود اپنا خیال بھی رکھنا ہوگا کہ ہر رات غزالہ کو اس کے گھر چھوڑنے میں خود جاتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب خود تو وہ جان بوجھ کر خود کو مشکل میں ڈالنے کا قائدہ کہ جانے والی کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے دنیا چھوڑ کر جا چکی تھی۔ کسی کے پکڑنے سے وہ واپس نہ آ سکتی تھی۔ پھر دوسروں کو پکڑتے ہوئے خود کو رسوا کرنے کا قائدہ۔ یہ تو بھی پرویز کے دماغ کی



اور دل کی بے چینی، بقراری اس کو بے سکون کرتی جا رہی تھی۔ اس نے سنا تھا کالی سیاہاگن راتیں عورت کے وجود سے چاندنی راتوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ پھر غزالہ نے اس کا یہ سنا ہوا بچ کر دکھایا تھا۔ اس نے اپنی قربت سے پرویز کی بے نور راتوں کو پر نور بلکہ دن بنا کر رکھ دیا تھا۔ ورنہ تنہائی میں مارے وحشت کے پرویز کا کیا حال ہوتا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اسے چاہنے لگا تھا اور وہ اس کو تنہا چھوڑ گئی تھی۔ وہ جو اس کی محبت، اس کی زندگی، اس کے دل کا سکون تھی اب اس کے بارے میں اخبار میں لکھا تھا وہاں چھ چال چلن کی لڑکی نہیں تھی۔ اس کی بہت سے لڑکوں سے دوستی تھی۔ جن سے ملنے کے لیے وہ روزانہ گھر سے باہر جاتی تھی۔ وہ ایک لوز کریمٹرز کی تھی۔ اور یہ تو صرف پرویز ہی جانتا تھا کہ وہ رات صرف اس کے لیے گھر سے نکلتی تھی۔ اس رات بھی جب شکاری کتے اس کو شکار کرنے کا پروگرام بنا کر بیٹھے تھے وہ محبوب سے ملنے ہی گھر سے آئی تھی۔ مینول کی سوہنی کی طرح خراب موسم کی پرواہ کیے بغیر۔ مگر اپنے محبوب تک نہ پہنچ سکی کہ راستے میں گھات لگا کر بیٹھے شکاری کتوں نے اس کو شکار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ پرویز سوچ رہا تھا تب غزالہ کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ کیا اس نے اپنے آپ کو خطرے میں دیکھ کر اس کو پکارا ہوگا کہ آگے چنر لاٹک کے قافلے پر اس کا گھر تھا۔ مگر وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ انہوں نے اس کو چپخنے کا موقع بھی نہیں دیا ہوگا۔

ایک ہفتہ وہ آفس نہ جاسکا۔ ایک تو غزالہ کی ناگہانی موت کے صدمے کی وجہ سے۔ دوسرا پولیس کے خوف سے کہ وہ اس کو پکڑ نہ لے۔ غزالہ کی اکلوتی سہیلی روجی اس کے بارے میں سب جانتی تھی۔ غزالہ نے اس کو ایک بار بتایا تھا کہ روجی سے کوئی بات اپنی نہیں چھپاتی۔ اب غزالہ کی اس اذیت ناک موت کے بعد وہ غزالہ کے گھر والوں کو اس کے بارے میں بتا سکتی تھی۔ مگر جب ایک ہفتہ خیریت سے گزر گیا تو طبیعت بھی کچھ حد تک سنبھل گئی تو پرویز نے آفس جانا شروع کر دیا۔ جب اس کا دل پولیس کے خوف سے مکمل طور پر نکل گیا تب ایک شام جب وہ غزالہ کی یاد میں گم ہو کر اور تھکا تھکا سا گھر واپس آ رہا تھا پولیس نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس کو غزالہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا اور پھر تھانے لے گئی۔ پرویز نے پولیس سے کوئی بات بھی چھپائی نہیں تھی۔ چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی محبت کے بارے میں بتاتے ہوئے کھل کر اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ ہاں وہ رات آج کل اس کو ملنے آتی تھی۔ مگر وہ اس کی محبت تھی۔ وہ اپنی محبت کو قتل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو اگلے ماہ اپنے والدین کی آمد پر اس کے ساتھ شادی کرنے کا پروگرام رکھتا تھا۔ پھر پرویز نے زیر تعمیر گھر کے بارے میں اپنے شک و شبہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ غزالہ کے راستے میں یہی ایک گھر آتا تھا۔ باقی پلاٹ تھے۔ اس گھر میں ٹھہرے ہوئے مستریوں ہنز دوروں کو پکڑا جائے۔ غزالہ کی اس موت کے ذمہ دار یقیناً ہی لوگ ہوں گے۔

”اؤئے! اس گھر میں کوئی مستری مز دور نہیں رہتا۔ جن لوگوں کا گھر بن رہا ہے ان کا ایک لڑکا صبح کام شروع ہونے پر مستریوں ہنز دوروں کی نگرانی کے لیے آتا تھا اور شام ختم ہونے پر مستری مز دوروں کے جانے کے بعد وہ بھی اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ تاہم اس کے باوجود ہم نے مستری بھی پکڑے اور مز دور بھی مگر وہ سب بے گناہ نکلے، اس لیے چھوڑ دیئے۔ پرویز نے وضاحت سے بتایا۔

”وہ لڑکا جو مستریوں ہنز دوروں کی نگرانی کرنے کیلئے آتا تھا اس کو بھی پکڑیں ہو سکتا ہے یہ حرکت اس کی ہو۔“ پرویز نے اپنا شک ظاہر کیا۔

”اس کو بھی پکڑا تھا۔ اب اس کو بھی پکڑا تھا۔ مگر وہ بھی بے گناہ تھا۔ اس لیے اس کو بھی چھوڑ دیا۔“ انسپکٹر نے اس کی لمبی جرح سے اکتا کر کہا۔

مگر یہ نہیں بتایا کہ اس لڑکے کا تایا ایک بڑے اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اس کی ایک فون کال پر بغیر تفتیش کے فو رائس کو عذرت کر کے چھوڑنا پڑا۔ لوگ کہتے ہیں پولیس بڑی خراب ہے، بڑی بد معاش ہے، ورنہ کا قائد ماٹھا کر غنڈا گردی کرتی ہے مگر اصل خرابی تو میڈیا کے ان لوگوں میں تھی جو پولیس سے بھی زیادہ خراب اور بڑے بد معاش تھے۔ قلم کے زور پر بد معاشی کرتے تھے۔ میڈیا کے سارے نہیں مگر یہ چند لوگ جن کی ایک کال پر اصلی مجرم کو چھوڑنا بھی پولیس کی مجبوری بن جاتا تھا کہ میڈیا والے ان کے بارے میں کچھ غلط لکھ کر ان کی ٹوکری کے لیے خطرہ بن جائیں۔

وکی نے یہ کھیل کھیلا بھی تایا کہ قلم کی طاقت پر تھا اور اس کو پکارا۔ یقین تھا کہ وہ یہ سب کر کے صاف بچ جائے گا اور وہ صاف بچ نکلا تھا۔ اس کی ماں نے خود اپنے جیٹھ سے کہا تھا کہ اس رات گھر کے اندر ان کے پاس موجود تھا۔ پولیس پیسے کھانے کے چکر میں وکی کو پھانس رہی ہے۔ بھابی کی بات سنتے ہی انہوں نے وکی کے لیے پولیس کفون کر کے چھوڑنے کا کہہ دیا تھا۔



”سنوڈ کے اہم نے سب کو چھوڑ دیا ہے مگر تمہیں چھوڑنے کا اب کوئی ارادہ نہیں کہ تم نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ روز تجھ سے ملنے آتی تھی۔“

”صاحب! ساتھ میں یہ بھی تو کہا ہے کہ ہم شادی کرنے والے تھے اور یہ کہ میں غزالہ سے محبت کرتا تھا۔ میں نے اس کو قتل نہیں کیا۔“ پرویز نے بھی تیزی سے کہا تو انسپکٹر دھاڑا۔  
”اُوئے! تم نے قتل کیا ہے یا نہیں اس کا پتہ بھی چل جائے گا اور اعتراف کرنا بھی ہمیں آتا ہے اور پھر وہی ہوا جو اس معاشرے میں ہوتا آیا تھا۔ پرویز کو غزالہ کے قتل میں جیل بھیج دیا گیا جبکہ اصل مجرم اپنے ظلم کی طاقت کے بل بوتے پر بچ گئے تھے۔“

☆☆☆

ادھر خاندان میں روبی کی موت کا اعلان کرنے کا نام بھی آپہنچا تھا۔ شمشاد نے نصیر صاحب، سلمان، گڈو، روبی کو سب کچھ وضاحت سے سمجھا دیا تھا۔ محلے، خاندان میں کوئی روبی کے بارے میں پوچھے تو کیا کہنا ہے۔ صبح خاندان میں سلمان نے روبی کی موت کی خبر دینے جانا تھا اور اسی شام جب وہ کھانے کے بعد اپنے پروگرام پر آخری ڈسکس کر رہے تھے تو شمشاد کا دیورڈیورانی اور بڑی تند چائناں کے گھر چلے آئے تھے۔ حمیدہ نے ان کو دیکھتے ہی چہرے پر سوکاری طاری کر لی۔ یہ سوچ کر کہ جو خبر سلمان نے ان کو دینی تھی اب خود ہی ان کو سلمان سے ذرا بہتر انداز میں دے دیں اور کہہ دیں کہ آج ہی ہم لوگ ایسٹ آباد سے واپس آئے ہیں۔ ہماری روبی مر گئی۔ ہم پر قیامت گزر گئی۔ مگر ان کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی بڑی تند نے پوچھا۔

”شمشاد روبی ابھی ایسٹ آباد میں ہی ہے۔ آخر کب لینے جاؤ گی اس کو۔ اب تو وہ صحت مند ہو چکی ہو گی۔ ایسٹ آباد ایک پر فضا مقام ہے۔“

”شمشاد روبی کی ناگہانی موت کی خبر دینے کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہی تھی کہ آخر اتنا بڑا جھوٹ بولنا تھا کہ اس کی دیورانی نے اپنی بے چین طبیعت کے باعث اس کو ایک بڑی شرمندگی اور ذلت سے بچایا اور بغل میں دبایا ملک کا مشہور فلمی رسالہ نکال کر شمشاد کے سامنے رکھتے ہوئے طنز یہ کہا۔

بھائی شمشاد! روبی ایسٹ آباد گئی تھی اور پھر وہاں جا کر بیمار ہو گئی۔ یہ کیوں نہ بتایا کہ وہ روجی کی شادی سے پہلے ہی گھر سے بھاگ گئی تھی۔“ شمشاد کی جیسے کسی نے جسم سے جان ہی نکال لی تھی کہ ان کے سامنے جو فلمی رسالہ ان کی دیورانی نے رکھا تھا اس کے سرورق پر روبی کی فل سائز کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ روبی اپنے پورے بال کھول کر ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ تصویر خاصی بڑی تھی اور نہ ہیچانے کا سول ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی وہ کوئی غیر تو نہ تھی۔ انہوں نے پہچان لیا تھا وہ ان کی روبی ہی تھی۔ تب تک سلمان اور نصیر صاحب بھی اندر سے اٹھ کر باہر آ چکے تھے۔ انہوں نے بھی روبی کی یہ تصویر دیکھ لی تھی۔ اب اس وقت سب ہی گم سم اور خاموش بیٹھے تھے۔ آنے والے بھی اور گھر والے بھی۔ کچھ وقت یونہی خاموشی کی نظر ہوا۔ پھر شمشاد کی تند نے پوچھا۔

”اگر تم لوگ ہم پر اعتبار کر کے ہمیں بتا دیتے تو یہ ذلت ہمارے خاندان کو نا اٹھانی پڑتی جواب اٹھانی پڑی ہے۔ اب تو سب جاننے والوں کو پتہ چل جائے گا کہ روبی گھر سے بھاگ گئی۔ یہ بات بھلا اچھپائی جاسکتی تھی جو تم لوگوں نے چھپائی وہ کوئی سوئی تھوڑی تھی جو تم پہلے نہیں بعد میں کہہ دیتے۔ گم ہو گئی ہے پوری جوان لڑکی تھی۔“

شمشاد کی بات سن کر خاموش ہی رہی۔ کہتی تو کیا۔ روبی نے ان کو کسی کے سامنے کچھ کہنے کے قابل کب چھوڑا تھا۔ شمشاد کو خاموش دیکھ کر تند صاحبہ بھائی کو ڈانٹتے ہوئے بولیں۔  
”بیوی نے نہیں بتایا تھا۔ تم تو بتا سکتے تھے۔ مگر بیوی کی بات حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ خاندان کی عزت کی اہمیت نہیں۔ اب بولو کیا کہتے ہو تم لوگ۔ کب بھاگی وہ ذلیل لڑکی گھر سے۔ اپنی خوشی سے کوئی گھر سے نہیں بھاگتا۔ جب تک گھر کے اندر کوئی کسی کی زندگی عذاب نہ بنادے۔ کیا ہوا تھا۔ کیا کہا تھا تم لوگوں نے اس کو۔ اس نے گھر سے بھاگنے کا اتنا بڑا فیصلہ کیا۔ ورنہ ہمارا خون اتنا گندہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی خوشی کے لیے پورے خاندان کے منہ پر کا لکھلکھ دے۔“ اس پر شمشاد نے بہت سوچ کر کہا۔

”آپا! ہمارا یقین کریں ہمیں خود معلوم نہیں وہ گھر سے کیوں بھاگی؟ اگر کوئی ایسی ایسی بات ہوتی تو ہم اس کی عمرانی نہ کرتے۔ ہاں اس کو فلمیوں میں کام کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس لیے اس نے مجھ سے کئی بار اجازت بھی مانگی تھی جو میں نے دینے سے نہ صرف انکار کیا تھا بلکہ مارا بھی کہ بات ہی اس نے مار کھانے والی کی تھی اور میرا خیل ہے اب وہ فلموں میں کام کرنے کے لیے ہی گھر سے بھاگ گئی ہے اور بتایا اس لیے نہیں کہ لازم ہم پر ہی آئے گا۔“

شمشاد کی بات سن کر وہ لوگ چپ ہو گئے۔ پھر بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دیوراند کا خیل تھا اس کو جا کر واپس لے آئیں مگر نصیر نے خود ہی کہہ دیا۔  
”ہمارے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب وہ ہمارے لیے مر گئی ہے اور میری زندگی میں وہ اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔“ یہ سن کر وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ سلمان غصے سے کھل رہا



تھا۔ ان کے جاتے ہی بولا۔

”وہ ارم اور کرن کے گھر پر ہی گئی تھی۔ مگر ان لوگوں نے کہا وہ یہاں نہیں آئی۔ اب رسالے میں تصویر لگنے سے سب کو پتہ چل گیا۔“ پھر وہ روپی کے ساتھ ساتھ ارم اور کرن کو بھی گالیاں دینے لگا۔

اگلی صبح روجی کو بھی عامر ان کے گھر چھوڑ گیا تھا بلکہ روجی نے خود ہی کہا تھا آفس جاتے ہوئے اس کا ہی جان کے گھر چھوڑ کر جائیں اور وہ باہر ہی سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ صبح کا ٹائم تھا اور اس کو آفس بھی جانا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی روجی ماں کے گلے لگ کر رونے لگی۔ پھر روتے ہوئے بولی۔

”امی جان! ان کو روپی کے بارے میں سب پتہ چل گیا ہے۔ یہ دیکھیں۔“ روجی نے اپنا بیگ کھول کر ان کو بھی فلمی رسالہ نکال کر دیا جس پر روپی کی تصویر تھی حیران کرنے کو۔ حمیدہ تو کیا سارے گھر والے یہ رسالہ رات کا ہی دیکھ چکے تھے۔ شمشاد نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”تم امید سے ہو۔ اس طرح رونے اور پریشان ہونے سے بچے پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ بتاؤ عامر نے تم سے کیا کہا اور تم نے ان سے کیا کہا۔“ تب تک گڈو بھی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی جبکہ زوپی سکول اور نصیر صاحب کے ساتھ سلمان بھی گھر سے جا چکے تھے اپنے اپنے آفس۔

ای وہ رات کو گھر آئے تو رسالہ ان کے ہاتھ میں تھا اور ساتھ میرا دیور بھی تھا۔ پھر سب گھر والوں نے وہ رسالہ دیکھ کر پوچھا۔

”تم لوگ تو کہتے تھے روپی ایسٹ آباد گئی تو یہاں ہو گئی اور اس کی یہ تصویر بتا رہی ہے وہاں ہو رہی ہے۔“ تب میں نے کہہ دیا۔

”وہ فلموں میں کام کرنا چاہتی تھی۔ مگر ہم نے اجازت نہ دی جس کی وجہ سے وہ میری شادی سے چار دن پہلے زوپی کے ساتھ مینا بازار دیکھنے گئی پھر واپس نہ آئی۔ شادی سر پر تھی پھر لوگوں سے اور کیا کہتے۔ اس کے بعد اس کو بہت ڈھونڈا وہ ملی ہی نہیں۔ اب میرے سر پر والے آپ سے پوچھیں تو آپ بھی یہی کہیں گے۔ ویسے مجھے یقین ہے وہ آپ سے نہیں

پوچھیں گے۔ اگر پوچھیں تو آصف تو صیف اور بلال کا قصہ نہ سنانے بیٹھ جائے گا جیسے بلال کی امی کو سب بتا دیا تھا۔ عامر کو بتایا تو وہ سوچیں گے۔ بڑی بہن ایسی ہو گئی تو چھوٹی بھی ایسی نکلی۔ اگر بڑی اچھی تھی تو چھوٹی کیسے خراب ہو سکتی تھی۔ امی آپ ان مردوں کو نہیں جانتیں۔ اگر ان کے دل میں ذرا سا بھی شک پڑ گیا تو میری ساری زندگی حذاب بن جائے گی۔“

”اب میں اتنی بھی پاگل نہیں مگر اس حرامزادی ارم کی ماں کو دیکھو، کجی کہہ رہی تھی روپی یہاں نہیں۔ اگر ذرا سی ہمت کر کے ان کے گھر کی زبردستی تلاشی لے لیتے تو روپی نے مل جانا تھا۔ پر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ اب بھی ان ہی کے گھر ہو گئی۔“ پھر وہ روجی کو بتانے لگی کہ انہوں نے روپی کے بارے میں کیا پان بنایا تھا مگر بات پہلے ہی کھل گئی۔ ”رات تمہارا چچا، چچی اور بڑی بھوی بھو بھی آئی تھیں۔“ کہہ کر انہوں نے ساری بات بتانے کے بعد کہا وہ تو روپی کی تلاش میں جانا چاہتے تھے مگر تمہارے باپ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

”وہ اب ہمارے لیے مرجلی ہے اور یہ کہ میری زندگی میں اب وہ اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔“

”اچھا کیا۔“ روجی نے کہا۔ ”جب اس کے بھاگنے کی ذلت اٹھا ہی لی ہے پھر گھر لانے کا فائدہ۔ بس آپ اب جلدی سے سلمان کی شادی کر دیں تاکہ گڈو اس کا دھیان ہٹانے کا سبب بنے۔“ اتنے میں گڈو روجی کے لیے تازہ میب کا جوس بنا کر لے آئی اور حمیدہ نے کہا۔

”شادی تو اب لازمی کرنی ہی ہے۔ گھر سے باہر بھی بندے کو سو کام ہوتے ہیں۔ اب گھر کو ٹالا لگا کر تو جانے سے رہے۔“ گڈو چپ چاپ بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی، پھر خود کچھ بھی نہ بولی تھی۔

جس روز رسالہ مارکیٹ میں آیا تھا اسی وقت پومی ماں کے کہنے پر جا کر بازار سے لے آیا تھا اور رسالے پر اپنی تصویر دیکھ کر روپی بے حد خوش ہوئی تھی۔ باقی گھر والے تو خوش تھے ہی مگر اس سے بھی بڑی خوشی دو دن بعد ملی تھی۔ جب ارم نے گھر آتے ہی سونے کی بجائے ماں کو جگا کر بتایا تھا کہ ملک کے ایک بڑے ہدایت کار نیاز نے فلمی پرچے پر روپی کی تصویر دیکھتے ہی پرچے کا ایڈیٹر کفون کر کے روپی کے بارے میں پوچھا۔

کون لڑکی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ تب اس نے بتا دیا پومی کی آرنسٹ ارم کی کزن ہے اور آج فلمی پرچے کا ایڈیٹر نے مجھے فون پر ساری بات بتانے کے بعد کہا۔

”نیاز صاحب کہتے تھے ارم سے کہیں گادہ مجھ سے فون پر بات کریں اور اب کل میری ان سے بات ہوئی۔ مجھے یقین ہے وہ جو وہی فلمیں بنانے کا اعلان کر چکے ہیں ان دونوں



میں سناپک میں لازمی رپوی بطور ہیر فٹن کاسٹ کریں گے اور فلم کامیاب ہونے کی صورت میں ہم سب لاکھوں میں کھیلیں گے۔“

”یہ تو واقعی بہت بڑی خوشخبری ہے۔“ زہیرہ خاتم کے ساتھ اب بھی خوش ہو کر بولے تھے۔ کتنی دیر وہ تینوں آنے والے خوبصورت وقت کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ارم اٹھ کر اپنے روم میں ہونے کے لیے چلی گئی تھی مگر زہیرہ خاتم کافی دیر تک شوہر کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہی تھی۔

ادھرام بستر میں لیٹی سوچ رہی تھی اگر روپی کو فلم میں کامل کیا تو پھر ہو سکتا ہے مجھے بھی اس فلم میں کوئی چھوٹا موٹا رول مل جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا اور روپی کے ہیروئن بننے کی صورت میں گھر کے خرچے کا جو سا ابوجھ مجھ پر ہے وہ بھی ذرا ہلکا ہو جائے گا۔ مگر روپی کا فلمی نام کیا رکھیں گے۔ پھر اس نے فوراً ہی سوچ لیا ہنی رکھیں گے۔ چھوٹا سا بھی ہے۔ پیارا بھی اور ابھی فلم انڈسٹری میں اس نام کی کوئی لڑکی موجود نہیں۔ ان ہی خوش کن سوچوں میں روزِ دہرے سے آئی تھی اور یہی حل زبرہ خانم کا بھی تھا۔

اگلے روز ناشتے کے بعد ارم نے ہدایت کار کفون کیا۔ پہلے تو اس نے پوچھا۔ کون ارم؟ اور جب ارم نے فلمی رسالے کے ایڈیٹر کا حوالہ دینے کے بعد اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

”ماؤں کا ہارم اب میں اتنی بھی گنہگار نہیں کہ آپ پوچھیں کون ارم؟“

”نام یاد نہیں پر چہرہ آپ کیا ہے۔ دیکھتے ہی پہچان لوں گا مگر اس وقت بات کوئی اور ہے۔ یہ بتائیں نام کیا ہے اس لڑکی کا جس کی تصویر فلمی رسالے پر لگی ہے۔“  
 ”روٹی“ ارم نے جلدی سے بتایا۔

”ارم! میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ہدایت کار نیاز نے فوراً کہا۔

”کب۔“ ارم نے خوشی سے کانٹے لہجے میں کہا۔

”دیکھو اگر اس کو فلم میں کام کرنے کا شوق ہے تو آج رات ہی لے آؤ۔ گیارہ بجے تک میں فارغ ہو جاؤں گا۔ یا پھر ابھی لے کر آ سکتی ہو تو ابھی آ جاؤ۔ نہیں میرا خیل ہے رات کو یہی مناسب ہے گا۔ ابھی تو میں شوٹنگ میں مصروف ہوں اور آؤٹ ڈور بھی چلتا ہے۔ رات گیارہ بجے تک میں فارغ ہو جاؤں گا تب آ جائیں۔“ نیاز نے سوچتے ہوئے کہا۔ تو ارم بولی۔

”جی آ جاؤں گی۔ آپ ایڈریس سمجھا دیں۔“

نیاز نے کہا فتر لے آنا۔ پھر اس کو کٹھنی کانبر بتا دیا جس میں قلمی لوگوں سے ملنے کے لیے فتر قائم کیا گیا تھا۔ جہاں رت جکے ہوتے تھے۔ ارم نے ایڈریس نوٹ کرنے کے بعد فون بند کیا۔ پھر ماں سے کہا۔

”آپا! ہمیں کئی سال ہو گئے ماڈلنگ کرتے اورٹی وی کی ٹوکری کرتے مگر دیکھو روپی کی خوش قسمتی کتنے بڑے ہدایتکار نے خود ملنے کے لیے بلایا ہے۔ مجھے یقین ہے اپنی فلم میں ہیروئن کاسٹ کرے گا۔ مبارک ہو روپی!“ روپی خاموش رہی اور کرن نے کہا۔

”ارم آبی! رسالے دالے سے کہیے گا اگلی بار میری تصویر بھی رسالے میں لگا دے۔ ہو سکتا ہے اس طرح میرا کام بھی بن جائے۔“ یہ سن کر ارم نے کہا۔

”آپ! آپ کرن کی بات سن رہی ہیں۔ کہتی ہے میری تصویر بھی اسی قلمی رسا لے میں لگا دیں جس میں روپی کی لگی ہے۔ اس طرح ہو سکتا ہے میرا کام بھی بن جائے۔ اس کا کام بنے نا بنے رسا لے لے کا ضرور بکڑ جائے گا۔ کرن کی تصویر دیکھ کر کسی نے پرچہ ہی نہیں خریدنا۔“ آدم کی بات پر بھی ہنسنے لگا اور پوئی نے فخر سے روپی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”روبی.....روبی ہے۔ کیوں آپ!۔“ اور ام نے مسکرا کر سر ہلادیا۔ پوی دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا شادی تو روپی کی میرے ساتھ ہی ہونی ہے۔ چلو ساری زندگی کے لیے کمانے کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ذرا میری روپی سے شادی ہو جائے پھر دیکھتا ہوں آپ کیسے مجھے گالیاں دیتی ہے۔ 35 برس کی ہو چکی ہے اور سب سے کہتی ہے پچیس برس کی ہوں۔ پھر وہ ام کی بات سن کر چونک پڑا وہ روپی سے پوچھ رہی تھی۔

”یہ تو کئی بات ہے کہ تمہیں فلم میں کام لازمی مل جائے گا۔ آخر اتنے بڑے ہدایتکار نے بلایا ہے تو کچھ نہ کچھ سوچنے اور فائل کرنے کے بعد ہی بلایا ہوگا۔ یہ بتاؤ تم اپنا فلمی نام کیا رکھنا پسند کرو گی۔ حالانکہ میں نے تو رات سونے سے پہلے ہی تمہارا فلمی نام سوچ بھی لیا تھا۔“

”کیا سوچا تھا؟ آبی جلدی سے بتائیں۔“ کرن نے پوچھا جبکہ پوی کہنا چاہتا تھا روپی اس کی ہونے والی بیوی ہے اس لیے روپی کا فلمی نام وہ خود رکھے گا۔ مگر اچھی جانتا تھا ایسا کہنے



سے صاف ارم آپ اس کو گالیاں دیں گی بلکہ شادی بھی مشکوک ہو جائے گی۔ اس لیے خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت تھی۔

”میں نے ہنی نام رکھا ہے۔ کیسا ہے؟“ ارم نے پوچھا۔

”اچھا ہے۔ سب نے کہا۔“ پومی کو بھی یہ نام پسند آیا تھا۔ مگر رومی خاموش تھی۔ یہ دیکھ کر زہرہ خانم نے خود پوچھا۔

”کیوں رومی تم کیوں چپ ہو۔ کیا نام پسند نہیں آیا۔ اگر یہ بات ہے تو تم اپنی پسند کا نام بتا دو۔ ہم وہی رکھ لیں گے۔“

”یہ بات نہیں آیا! نام اچھا ہے مگر میں اپنا نام بدلنا نہیں چاہتی۔ جتنی ٹکٹیں مجھے میرے خاندان والوں نے دی ہیں اس کے بعد میں اپنے اصلی نام یعنی رومی نصیر ہی کے نام سے کام کرنا پسند کروں گی۔“ رومی نے وضاحت سے کہا۔

”چلو اگر یہی تمہاری خوشی ہے تو یہ تو اور بھی اچھی بات۔“ زہرہ خانم نے جلدی سے کہا کہ رومی تو ان کو سونے کے انڈے دینے والی تھی۔ پھر وہ اس کی بات سے انکار کیسے کر سکتی تھی۔ انہوں نے تین ماہ رومی کی خدمت نہیں کی تھی بلکہ سونے کے انڈوں کی حفاظت کی تھی جو رومی کی جانب سے انہیں ملنے والے تھے اور اب یہ وقت زیادہ دور نہیں تھا۔

ارم نے آج شوٹنگ پر جانے کا پروگرام ہی کینسل کر دیا تھا۔ وہ ٹھیک دس بجے رومی کو تیار کر کے گھر سے نکل پڑی تھی۔ رومی سے کہا تھا وہاں گھبرانا نہیں۔ جو بات پوچھیں صاف صاف بتا دیں۔ مگر یہ بات یاد رکھنا کہ جگہ میں نے یہی کہا ہے کہ تم میری امی کی سگی بھانجی ہو اور پتوکی سے لاہور آئی ہو۔ یہ بات ہر وقت یاد رکھنا۔ اور رومی نے جی اچھا، کہہ دیا تھا۔

ٹھیک گیارہ بجے وہ اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گئی تھی۔ تھوڑی دیر ان کو پینٹنگ روم میں بیٹھنا پڑا۔ پھر نیاز صاحب نے ان کو اپنے روم میں بلوایا۔ مگر وہاں کیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے۔ ارم کے ساتھ رومی کے علاوہ زہرہ خانم بھی آئی تھیں۔ نیاز صاحب زیادہ دو فلمیں بناتے اور پنجابی فلم کو کہنا تے تھے مگر آٹے میں نمک کے برابر آج کل وہ

دونوں فلمیں بنا رہے تھے بلکہ بنانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک اردو، ایک پنجابی۔ اور ان دونوں فلموں میں وہ نئی لڑکی بلکہ نئی لڑکیاں چاہ رہے تھے۔ نئے چہرے وہ اکثر متعارف کرواتے ہی رہتے تھے۔ اس ہفتے رسالے پر رومی کی تصویر دیکھ کر انہوں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا اپنی نئی فلم میں اسی لڑکی کو ہیر وڈن لے لیں گے۔ رسالے کا ایڈیٹر ان کا بہت کبرا

دوست بھی تھا۔ دوست بنا بھی ہوتا پھر بھی لڑکی کے بارے میں وہ اس سے پوچھ ہی سکتے تھے کہ رسالے پر فتر کا فون نمبر موجود ہوتا ہے۔

بہر حال انہوں نے اسی وقت رسالے کا ایڈیٹر اپنے دوست کفون کر کے سرورق پر دی گئی تصویر والی لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ جب اس نے بتایا وہ مشہور ٹی وی اداکارہ و ماڈل کرن کی کزن ہے تو انہوں نے کہا تھا تم میرا نمبر ارم کو لکھوا کر کہو وہ فوراً مجھ سے بات کرے۔ اب اس وقت ارم، زہرہ خانم اور سرورق والی لڑکی ان کے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان کو معلوم تھا

ارم ایک کامیاب ماڈل تھی اور اداکارہ بھی مگر زیادہ دیر وہ اپنا دھندا کرنے میں مشہور تھی۔ نیاز صاحب کے پاس ایک اور شخصیت بھی موجود تھی اور یہ تھے ان کی دونوں فلموں کو فنانس کرنے والے حاجی سردار محمد۔ نیاز نے ارم اور دوسرے لوگوں کو عزت کے ساتھ بٹھایا تھا پھر رومی کو دیکھتے ہوئے رومی سے پوچھا۔

”میری فلم میں کام کرو گی؟“

”جی۔“ رومی نے آہستگی سے کہا۔ نیاز صاحب نے پہلی نظر میں ہی محسوس کر لیا تھا لڑکی کسی شریف خاندان کی ہے۔ اس لیے ارم کی والدہ سے پوچھا۔ ”کہاں سے اڑا کر لائی ہو اس ہیرے کی کئی کو؟“ نیاز صاحب رضوی کو اچھی طرح جانتے تھے جو فلم میں چھوٹے چھوٹے رول میں آتا تھا۔ زیادہ دن کا، مار کٹائی والا سا تھی بن کر۔ اور ان کو یہ بھی معلوم تھا زہرہ خانم

سے شادی کے بعد رضوی نے اس کو دھندے پر لگا دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی بیٹی کو چھوٹی عمر میں ہی اسٹوڈیو لے آیا تھا۔ مگر فلمی اداکارہ کی بجائے وہ ماڈل اور ٹی وی اداکارہ بن گئی اور پھر اس نے بھی ماں والا دھندا شروع کر دیا تھا کئی وی ڈرامے کا معاوضہ ہی کتنا ملتا ہے اور پھر یہ دھندا تو بڑی چھوٹی براہ کارہ کی مجبوری تھی۔ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہ تھی۔

”توبہ کریں نیاز صاحب توبہ! یہ آپ نے کیسی بات کہہ دی۔“ یحیٰن کریں میری امی کی بھانجی ہے۔ چھ ماہ پہلے اس کی ماں مر گئی تو میں اس کو اپنے ساتھ لاہور لے آئی کہ اور کوئی بہن بھائی اس کا تھا نہیں اور باپ دوسری شادی کی تیاری میں لگ گیا تھا۔ پہلے تو یہ اپنی ماں کی ناگہانی موت کے صدمے کی وجہ سے گھر سے نکلتی ہی نہ تھی پھر اس دن پروڈیوسر آمنہ خان کی

پارٹی میں اس کا دل بہلانے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئی اور وہاں رسالے کے ایڈیٹر کو رومی پسند آ گئی اور سرورق کی تصویر کے لیے انہوں نے خود بات کی تھی ارم سے اور پھر ہماری خوشی قسمتی کہ آپ نے تصویر دیکھ کر ہمیں یاد کیا اور آپ کا حکم ملتے ہی ہم چلے آئے۔ آپ میری بھانجی سے میری باتوں کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“ زہرہ خانم نے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ

سجا کر بڑی ادب اور انکساری سے کہا۔



نیا صاحب نے ان کی باتوں کا اعتبار نہیں کیا تھا مگر مزید کچھ کہا بھی نہیں تھا۔ ان کلڑکی سے انٹرسٹ تھا جس کی ایک ہی تصویر نے فلم انڈسٹری میں ہل چل مچا دی تھی۔ بہت سارے فلم ساز اور ہدایتکار اس کو اپنی فلم میں لینے کا سوچ رہے تھے۔ نیا صاحب نے سوچنے کی بجائے عملی طور پر لڑکی سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب فلمی رسالے کے سرواق کی زینت بننے والی لڑکی ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ نیا صاحب نے زہرہ خانم سے بات کرنے کی بجائے اپنے پاس بیٹھے حاجی سردار سے پوچھا۔

”کیا خیال ہے آپ کلڑکی کے بارے میں۔“ روہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے بس فوراً بھی اسی وقت اس لڑکی کو میری اردو فلم کے لیے بیک کرلو۔“

حاجی سردار نے سر تا پیر روہی کو غور دیکھتے ہوئے کہا۔ روہی جب سے آئی تھی حاجی سردار کی نظریں تب سے اس کے جسم پر جمی تھیں۔ حاجی صاحب کی بات سن کر نیا صاحب نے ان کا تعارف بے حد احترام سے زہرہ خانم اور روہی سے کروایا۔ یہ ہمارے نئے فلم ساز حاجی سردار صاحب ہیں۔ بہت پیسے والے ہیں اور ساتھ بہت بڑے دل والے بھی۔

”السلام علیکم!“ اور زہرہ خانم نے جلدی سے سلام کیا۔ پھر روہی سے زہرہ خانم نے کہا مٹی تم بھی سلام کرو۔ تب روہی نے بھی سلام کیا۔ حاجی سردار نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لڑکی پسند ہے اور اردو کے لیے اس کو لے لو، پنجابی کے لیے کسی اور کا انتخاب کرلو۔ میرا خیال ہے۔ ابھی کہانی بتا کر پیپر سائن کروالو۔“ اور نیا نے ارم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں معلوم ہوگا میں مشکل کہانیوں پر فلم میکنگ کا ماسٹر ہوں۔ اس فلم کی کہانی بھی یہی آرتھ کلاسک میوزیکل فن پارہ ہے۔ موسیقی کے حوالے سے بھی یہ ایک اہم فلم ہے۔ فلم کی کہانی بے حد منفرد ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس فلم کی تہا سیر فن روہی ہوگی۔“ پھر روہی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھی ہے ییاری ہے تما شائی بھاری، بڑی عمر کی ہیر وٹن دیکھو دیکھ کر اکتا چکے ہیں۔ یہ فلم جس کا نام ابھی نہیں سوچا گیا کامیاب ہونے کی صورت میں روہی شہرت کے آسمان کو چھو لے گی۔ حاجی صاحب دہلی سے پاکستان آئے ہیں اور اس فلم انڈسٹری اور فن کاروں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر لڑکی کافی شرمیلی اور ماناڑی ہے اور فلم میں کام کرنے کے لیے بے شرم ہونا ضروری ہے۔“

”درست فرمایا آپ نے۔ فلم میں کام کرنے کیلئے شرم کو خود سے الگ کرنا پڑتا ہے۔ پر آپ کو بتایا تو ہے چھ ماہ پہلے گاؤں سے آئی ہے۔ آپ کے زیر سایہ رہی تو سب کچھ جلد ہی سیکھ جائے گی۔“ ارم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بہت ساری باتیں طے کرنے کے بعد نیا صاحب نے بتایا۔ ”ہیر وٹن کی عمر اتنی ہی ہوئی ہے جتنی روہی کی اس وقت ہے۔ مجھے روہی اس رول کے لیے مناسب معلوم ہوئی۔“ پھر روہی فلم کے پیپر سائن کر کہی وہاں سے اٹھی تھی۔ پیپر سائن ہوتے ہی فلم ساز حاجی سردار نے ان کو آدمی رقم کی ادائیگی بھی کر دی تھی اور نیا صاحب نے ارم سے کہا تھا۔

”اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم روہی کو اپنے ساتھ یہاں لے کر آؤ تا کہ روہی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اپنی جھجک دور کر سکے اور اگر ابھی یہاں نہ لاسکو تو اپنے ساتھ ٹی وی سٹیشن ہی لے جایا کرو بلکہ میرا خیال ہے افتتاح تک خود نہ آسکو تو اپنی امی کے ساتھ اھر بھیج دیا کرو کئی وی پر گانا وغیرہ نہیں ہوتا۔ ویسے تھوڑا بہت ڈانس وغیرہ تو آتا ہی ہوگا روہی کو؟“ نیا صاحب نے ارم سے پوچھا۔

”ڈانس وغیرہ ابھی اس کو نہیں آتا۔ ابھی آپ کو بتایا تو ہے ابھی چھ ماہ پہلے گاؤں سے لاہور آئی ہے اور پھر شرمیلی بھی بہت ہے۔“ ارم کی بات سن کر نیا صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”حیرت ہے روہی کو ڈانس نہیں آتا۔ ورنہ آج کل ہمارے یہاں شادی بیاہ پر شریف لڑکیاں جو ڈانس کرتی ہیں وہ بھی سرعام ٹوکی پھرتی اور مہارت سے تو کوٹھے پر بیٹھی طوائف بھی نہیں ناچتی۔ طوائفیں بے چاری تو اب صرف نام کی طوائفیں رہ گئی ہیں۔ ورنہ ان کے سارے کام تو اس معاشرے کے معزز مسنبال چکے ہیں۔“ دبا دبا اشارہ ارم اور زہرہ خانم کی جانب بھی تھا مگر وہ دونوں برا منانے کی بجائے شرمندگی سے مسکراتی ہوئی بولیں۔

”جی جی! درست فرمایا آپ نے۔ اب ہمارے یہاں شادی بیاہ پر ایسے ہی ہوتا ہے۔ شریف لڑکیاں جو ڈانس سرعام کرتی ہیں خدا کی پتا اب مٹی ہی ناچ کر پوچھتی ہے ڈیڈی میں نے کیسا ڈانس کیا۔ حالانکہ پہلے شادی بیاہ پر بڑے لوگ طوائف کو بلاتے تھے ناچ دیکھنے کو۔“ زہرہ خانم نے کہا۔ اب کے نیا صاحب چپ ہی رہے تھے۔ اس پر زہرہ خانم نے کہا۔

”خیر اب ہمیں اجازت دیں، کافی دور جانا ہے اور رات بھی کافی گہری ہو چکی ہے اور ہم ہیں بھی صرف لڑکیاں۔“ زہرہ خانم کلڑکیاں کہنے پر نیا صاحب چونکے تھے اور نہ حاجی



سرکار کہ جب وہ لوگ بات کرتے تھے تو وہ بھی ہمیشہ یہی کہتے تھے اسی منڈیاں منڈیاں نے مل کر اے پروگرام بنایا۔ یعنی ہم لوگوں لوگوں نے مل کر فلاں پروگرام بنایا۔“  
بہر حال نیاز صاحب نے ان کو جانے کی اجازت دے دی تھی اور وہ تینوں سلام کرتی ہوئی اٹھ کر باہر آ گئی تھیں۔



واپسی کا یہ سفر بڑا خوشگوار تھا۔ اس پر موسم بھی بہت سہانا تھا۔ اوپر آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور ستاروں کے درمیان پہلی پہلی راتوں کا باریک سا چاند بھی چمک رہا تھا۔ ملکی ملکی ہوا چل رہی تھی۔ فضا میں ٹنکی بکھری پڑی تھی۔ ملکی ملکی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ سڑک کے دونوں کنارے لگے درخت بجلی کی ٹیوب لائٹ میں پیارے لگے۔ تھے۔ شاید اس لئے کہ سب اچھا اچھا ہو گیا تھا۔

گاڑی کے اندر اس وقت تین ”لڑکیاں“ موجود تھیں۔ اس کے باوجود خاموش تھیں۔ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم تھیں۔ ارم اور زبرہ خانم کی سوچ ایک ہی تھی۔ اس وقت دماغ الگ الگ ہونے کے باوجود دونوں ماں بیٹی کے دل مارے خوشی کے ملیں اچھل رہے تھے۔ انہوں نے تو اس حد تک سوچا بھی نہیں تھا جیسا ہو گیا۔ ناقابل یقین بات لگتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ کتنی آسانی سے ہو گیا تھا۔ روبی نے بغیر کسی بڑی اور طویل جدوجہد کے اپنی پہلی فلم بطور ہیر وئن سائن کر لی تھی۔

وہ بھی ملک کے بے حد مشہور و معروف ہدایت کار نیاز صاحب کی جو فلم انڈسٹری میں اچھی اور معیاری فلمیں بنانے میں بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی فلمیں کم کم ہی ناکامی سے دوچار ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ مضبوط کہانی لے کر کام شروع کرتے تھے۔ کہانی فلم کی کامیابی کی اساس ہوتی ہے اور یہ سب کچھ ارم اور زبرہ خانم کی موجودگی میں ہوا تھا۔ اس کے باوجود ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ ارم مشہور و معروف ماڈل وی وی دا کارہ بھی اور پچھلے کئی برسوں سے کوشش کرنے کے باوجود فلم میں ہیر وئن تو کیا سائیڈ ہیر وئن کا کردار حاصل کرنے میں بھی ناکام رہی تھی۔ اپنی تمام تر کوشش اور مشہوری کے باوجود اس کو کسی فلم ساز نے لفٹ نہیں کرائی تھی اور روبی نے ایک تصویر فلمی رسالے میں لگتے ہی اپنی پہلی فلم سائن بھی کر لی تھی۔ شاید اس کو قسمت یا مقدر رکھتے ہیں۔ ارم نے یہ سب سوچنے کے بعد بیک مرمر میں روبی کو دیکھا وہ بہت چپ چاپ سی پچھلی سیٹوں پر تہا بیٹھی تھی۔ سوچوں میں گم یہ دیکھ کر ارم نے پوچھا۔

”روبی اس خوشی کے موقع پر تم کن سوچوں میں گم ہو۔ دیکھو بغیر کسی محنت اور کوشش کے اللہ نے تمہیں کتنی بڑی کامیابی سے نوازا ہے کیا تم خوش نہیں ہو۔“

”میں خوش ہوں آپ بہت زیادہ خوش ہوں۔“ روبی نے کہا۔ آواز دھیمی تھی اور چہرہ بھی خوشی کے تاثر سے محروم تھا۔

”مگر یہ خوشی تمہارے چہرے پر نظر نہیں آ رہی۔“ ارم نے ہنس کر کہا۔ اور روبی کے مزید کچھ کہنے سے قبل ہی زبرہ خانم نے محبت سے روبی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہنسی ہے تھک گئی ہو گی رات بھی تو زیادہ ہو چکی ہے۔ کیوں روبی یہی بات ہوتا ہے۔“ انہوں نے اپنی بات کی تائید چاہی۔

”جی آیا ہر سب فرمایا آپ نے۔“ روبی نے کہا اور پھر پورا منہ کھل کر ایک جرائی لے کر گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ یہ دیکھ کر زبرہ خانم ارم سے باتیں کرنے لگیں۔ روبی خاموشی سے سنتی رہی۔ خود ان کی بات چیت میں حصہ نہیں لیا۔ اس کا بولنے کا موڈ نہیں تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ گاڑی سے باہر آئی اور سونے کا کہہ کر ان دونوں ماں بیٹی کو شب بخیر کہہ کر اپنے روم کی جانب چل دی۔ مسلسل بیٹھ بیٹھ کر وہ تھک چکی تھی۔ اب آرام سے اپنے نرم بستر میں لیٹ کر پرسکون ہونا چاہتی تھی۔ اس لئے ان کے ساتھ جانے کے بجائے اپنے روم میں آئی تھی اس نے محسوس کر لیا تھا مارے خوشی کے ان دونوں ماں بیٹی کافی الحاح سونے کا دور دور تک کوئی پروگرام نہیں تھا۔

ارم کو واقعی آج رات نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ بھی گاڑی لاگ کرنے کے بعد وہ اپنے روم میں جانے کے بجائے ماں کے روم میں چلی آئی۔ وہاں رضوی صاحبہ بھی تنہا ان کا انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کو بھی روبی کی مکمل کامیابی کا یقین تھا۔ اس لئے زبرہ خانم کو دیکھتے ہی بڑی بے صبری سے پوچھا۔

”کیا بنا روبی کا؟ بات کچھ بن گئی یا۔۔۔۔۔“ انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

”رضوی خدانے ہماری سہیلی۔ روبی کی قسمت دیکھو پہلی ہی ملاقات میں فلم انڈسٹری کے نامور ہدایت کار نیاز صاحب نے روبی کا اپنی نئی آنے والی اردو فلم میں بطور ہیر وئن کا سٹ کر لیا ہے۔ فلم ساز حاجی سردار ہیں جو نئے نئے دہلی سے پاکستان آئے ہیں اور بہت بڑے سرمایہ دار ہیں اور ہم فلم کے پیپر سائن کرنے کے بعد گھر آئے ہیں۔“ زبرہ خانم نے ان



کفریب بیٹھتے ہوئے بتایا۔ جبکہ ارم مارے خوشی کے بیٹھنے کے بجائے کمرے میں ٹہلتی جا رہی تھی۔

”اگر فلم کے پیپر سائن کرنے کے بعد آئی ہو تو پھر تو آدھی رقم بھی ساتھ لگنی ہوگی۔ ہنا۔“ انہوں نے اب کے زہرہ خانم کے بجائے کمرے میں مارے جوش کے ٹہلتی ہوئی ارم سے پوچھا۔

اس نے بھی ایک لمبا عرصہ فلم انڈسٹری میں بسر کیا تھا اور وہاں کے اصول جانتا تھا۔ ان کی بات سن کر ارم رک گئی تاہم رضوی کو جواب دینا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اپنا بیگ کھول کر فلم ساز حاجی سردار نے اس کو جو رقم دی تھی بلکہ حاجی صاحب نے تو روپیہ کو اپنے پاس بلا کر یہ رقم اس کو پکڑ لینی چاہی تھی مگر روپیہ نے مودبانان کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”سردار صاحب یہ رقم میری خالہ کو دیں یا آپ ارم کو پکڑا دیں کہ میں اس وقت جو بھی ہوں ان کی محبت اور مہربانی سے ہوں۔“ روپیہ کی بات سن کر حاجی سردار نے مسکرا کر نیاز صاحب کی سمت دیکھا۔ پھر رقم زہرہ خانم کی جانب بڑھائی مگر درمیان میں بیٹھی ارم نے جلدی سا ٹھہ کر یہ رقم ان سے خود وصول کر لی تھی۔ پھر فوراً اپنا بیگ کھول کر اس میں رکھ کر بیگ کی زپ کھینچ کر بند کر دی تھی۔

زہرہ خانم کو اکتا تو گزارا تھا مگر موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مسکرا کر رہ گئیں۔ اب وہ رقم ارم نے بیگ سے نکال کر آدھی ماں کو دی اور پھر حکم دینے والے لہجے میں کہا۔ ”اس میں تھوڑی رقم روپیہ کو بھی لازمی دیجئے گا۔“ باقی آدھی ایک دم اپنے بیگ میں رکھ کر وہ ان دنوں میاں بیوی کو شب بخیر کہہ کر اپنے روم میں چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی رضوی نے شدید غصے سے کہا۔

”میں نے تم سے کئی بار پہلے بھی کہا تھا کہ تمہارا بیٹا میری چرس چرا کر لے جاتا ہے مگر تم مانتی ہی نہیں تھیں کہ وہ حرام زدہ تمہارے سامنے بڑی بڑی قسمیں اٹھا لیتا ہے مگر آج میرے پاس وہ چرس کی آخری ڈلی تھی اور وہ لو کا پٹھا اس کو بھی اڑا لے گیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ شام کے بعد میں لازمی بیٹا ہوں کہ اس وقت میری طلب شدید ہوتی ہے۔ میں سارا دن برداشت کر سکتا ہوں مگر اس وقت نہیں اور آج شام سے لے کر اس وقت تک جبکہ رات آدھی سے بھی زیادہ گزر چکی ہے۔ میں نے ایک بھی سگریٹ نہیں پیلا اب میری جو حالت ہو رہی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ تمہارے پاس اگر چرس موجود ہے تو فوراً مجھے دے دو۔ ورنہ یقین کرو تمہارے لئے بڑا مسئلہ ہو جائے گا کہ میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے اور اگر میں نے فوراً چرس بھری سگریٹ نہ لی تو رضوی اتنا کہہ کر خاموش ہو کر زہرہ خانم کو دیکھنے لگے جس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

زہرہ خانم کو شوہر کی یہ بکواس سن کر غصہ بہت آیا مگر خوشی کے اس موقع پر جب روپیہ کی پہلی کمائی گھر آئی تھی وہ بدکلامی، بدزبانی کر کے نخوت پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی ضبط کرتے ہوئے اٹھی کہ ایسی ہی صورت حال کو فیس کرنے کیلئے وہ تھوڑی بہت چرس لازمی اپنے پاس رکھتی تھی۔ انہوں نے اپنی ذاتی سیف کھول کر ایک ڈلی نکال کر شوہر کو تھماتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

”ارم بات کرے تو بہت غصہ آتا ہے تمہیں۔ میں کہتی ہوں کہ تم میں رتی بھر بھی غیرت ہو تو خود ہی سوچو ایک تو تم کھاتے نہیں۔ اس پر سو سو طرح کے نشے اور پھر تمہارا لہذا اب ہی کیا کم تھا کہ اب بیٹے کو بھی نشہ لگادیا۔ پتا نہیں وہ کونسا نخوت بھرا تار یک دن تھا میری بد قسمتی کا جب میں نے تم سے شادی کرنے کی ناقابل تلافی غلطی کی اور ساری زندگی شریف لوگوں میں بیٹھنے کے قابل نہ رہی۔“

”میں نے تمہارے بیٹے کو نشہ لگایا ہے یا تمہارے بیٹے کے دوستوں نے اس کو لگادیا ہے۔“ رضوی زہرہ خانم کی باتوں کا برا منائے بغیر چرس پکڑ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ”جو باپ خود بیٹے کے پاس بیٹھ کر نشہ کرے گا تو پھر ظاہر ہے بیٹا بھی لازمی نشہ کرے گا۔“ زہرہ خانم نے نفرت بھری نگاہوں سے گھورتے ہوئے شوہر سے کہا۔ جو سگریٹ میں چرس بھر کر پینے میں مصروف تھا۔ پھر ایک طویل کش لگاتے ہوئے بولا۔

”واہزہ آ گیا۔“ پھر مزید تین چار کش اوپر تلے لگا کر پوچھا۔

”میری جان! یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ شوٹنگ کا آغاز کب ہو رہا ہے۔“

”ابھی تو پہلے نمبر پر روپیہ نے پیپر سائن کئے ہیں ابھی کاسٹ مکمل ہونا باقی ہے بلکہ ابھی تک تو اس فلم کا نام تک نہیں رکھا گیا وہ تو بس یہ سمجھو ہماری ہی قسمت اچھی تھی جو روپیہ ان کا تانی زیادہ پسند آئی کہ انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں ساری تفصیلات طے کر کے پیپر سائن کر لئے جہاں تک میرا پتا خیال ہے مجھے لگتا ہے روپیہ کی فلمی رسالے پر لگنے والی تصویر نیاز



صاحب کے علاوہ بھی کچھ اور لوگوں کو پسند آئی ہوگی۔ ظاہر ہے روپی خوبصورت بھی اتنی زیادہ ہے پھر عمر کی بھی چھوٹی ہے۔ نیاز صاحب نے تصویر دیکھ کر سوچا ہوگا قبل اس کے کہ کوئی اور ہدایت کار روپی کو اپنی فلم میں کاسٹ کر کے قائد ماثلاً نے ہمیں ابھی سے سارا کام کر لینا چاہئے۔ اور ان کے اس طرح سوچنے اور پھر عمل کرنے سے ہماری لائبریری نکل آئی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے ابھی کچھ اور فلم ساز ہدایت کار روپی سے رابطہ کریں گے۔ ذرا نیاز صاحب کی فلم کی رسم افتتاح ہو لینے دو۔“

زہرہ خانم نے خاصے پر جوش لہجے میں کہا۔ وہ بے حد خوش تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ اب دن بدن ارم کاروبار میں تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ اگر آج کل میں ارم کو کوئی اچھا مرہلہ گیا تو وہ شادی کر کے ان کو بے سہارا چھوڑ جائیں گی اور کرن کی شکل اور اس پر قدا یہ لانا تھا کہ کئی وی ڈراموں میں کام ملتا اور نئی وہ کوشش کے باوجود ماڈل بن سکی تھی اور کالج پڑھنے چلی گئی تھی۔ دھندے پر تو وہ بھی لگ سکتی تھی مگر ارم نے سختی سے کہا تھا۔

”میری بہن کے بارے میں کسی نے ایسا سوچا کہ دھندا کرے گی تو میں اس کمینے کی آنکھیں نکال لوں گی۔“ اس نے ماں اور رضوی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بچانے والا کوئی نہیں تھا مگر میں زندہ ہوں اپنی چھوٹی بہن کی عزت کی حفاظت کیلئے۔“ اس کے بعد بات ختم ہو گئی تھی۔ وہ اگر کچھ زبردستی کرتے تو ارم نے کرن کو ساتھ لے کر چلی جانا تھا۔ اس لئے زہرہ خانم کے ساتھ ساتھ رضوی نے بھی صبر کا گھونٹ لی لیا تھا۔

مگر روپی کی صورت میں اللہ نے ان کو بھر پور کی پکی پکی روٹی روزی کا بندوبست کر کے زہرہ خانم کی فکر دور کر دی تھی۔ اب اگر ارم شادی کر بھی لیتی تو ان لوگوں کو کچھ خاص فرق نہ پڑتا۔

”میری جان زہرہ! روپی لڑکی نہیں قسم خدا کی قیامت ہے قیامت میں نے بہت غور سے دیکھا ہے روپی کو۔“ رضوی کش لگاتے ہوئے بولا۔  
 ”مقبول ہو اس کرنے سے گریز کرو اور سنو لڑکی کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرو دینا تمہاری ہونے والی بہو ہے۔ پوی کہتا ہے وہ روپی سے شادی کرے گا۔ تمہارے سامنے ہی تو کہا تھا اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔“ زہرہ خانم چونکہ رضوی کی فطرت کو اچھی طرح جانتی تھی اس لئے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔  
 ”تو بے توبہ تم نجانے کیا سمجھی ہو یقین کرو میں تو یونہی تعریف کر رہا تھا۔ مٹی سمجھتا ہوں میں روپی کو بہت بہت بعد میں بنے گی۔“ رضوی نے زہرہ خانم کے خفا ہو جانے کے ڈر سے جلدی سے وضاحت کی۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے ختم کرو اس بات کو جو پریشانی مجھے بے سکون کر رہی ہے اب وہ سنو۔“ زہرہ خانم نے سنجیدگی سے کہا۔  
 ”تمہیں اب کیسی پریشانی اور بے سکونی ہے؟ ابھی تو ارم ایک لمبی رقم تمہارے حوالے کر کے گئی ہے پھر بھی کوئی پریشانی ہے تو کہو۔“ رضوی نے بغور اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”مجھے تو اب اس بات کی فکر کھائے جا رہی ہے کہ روپی کے مشہور ہوتے ہی اس کے گھر والے آکر اس کو ہمارے یہاں سے لے نہ جائیں اگر ایسا ہوا تو ہمارے ساتھ بہت برا ہوگا۔“ زہرہ خانم نے کھل کر اپنی پریشانی بتادی۔

”اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ بھی نہیں آئیں گے۔ بکار میں پریشان نہ ہو۔“ رضوی نے اپنی آخری سگریٹ سلگاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔  
 ”رضوی پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے جب ان کو یہ پتا چلے گا کہ ان کی بیٹی لاکھوں کماری ہے تو کیا وہ یونہی اس کو ہمارے پاس چھوڑ دیں گے؟ سوچو۔“ زہرہ خانم واقعی پریشان تھیں۔

”اگر یہ بات ہے تو ایک کام کرو۔“ رضوی نے سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”کونسا کام۔۔۔؟“ زہرہ خانم نے بے صبری سے پوچھا۔  
 ”تو پھر یہ کام کرو کہ خود روپی کے ہاتھوں سے ہی اس کے گھر والوں کو ایک سخت قسم کا خط لکھا کر پوسٹ کرنے کے بجائے دتی ہی ان کے گھر بھجوا دو اس طرح تو یقین ہوگا کہ خط ان کو مل گیا ہے اور خط پڑھ کر روپی کے پاس آنا تو دور کی بات وہ روپی کے بارے میں کبھی سوچیں گے بھی نہیں۔“ رضوی نے اپنا مشورہ دے دیا۔ جی بھر کر جس پینے کے بعد وہ عقل مندوں والی باتیں کرنے لگتا تھا۔

”مگر خط میں لکھواؤں کیا۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو۔“ زہرہ خانم کو شوہر کی بات بے حد پسند آئی تھی اس لئے جلدی سے پوچھا۔



”خط میں چند سخت قسم کی باتیں لکھواتا۔“ یہ کہہ کر رضوی نے خط کا پورا مضمون زیرہ کو سمجھا دیا بلکہ ساتھ یہ بھی کہہ دیا۔ روبی جب میرے پاس بیٹھی تھی تو اس نے گھر والوں کے رویے کے بارے میں کھل کر مجھے بتا دیا تھا۔ تم اگر خود خط لکھوانے میں مشکل محسوس کرو تو روبی سے کہنا وہ کاغذ قلم لے کر میرے پاس بیٹھ جائے تو یہ خط میں اس کو لکھوا دوں گا۔“ مگر خیر دارم کرن کو اس خط کے بارے میں بتانا نہ چلے۔ وہ شاید اس بات کو پسند نہ کریں۔ رضوی نے آخری سگریٹ پی کر بچہ ہوا کلکٹرائش رڑے میں مسل کر بچھاتے ہوئے کہا۔

”میرا دماغ خراب نہیں جو ان کو بتاؤں گی۔ مگر میرا خیال ہے تمہارا خط لکھوانا مناسب نہیں۔ میں خود ہی لکھوا دوں گی اور یہ کام آج ہی ہو گا۔ ارم کے جاتے ہی جب روبی اپنے روم میں جائے گی تو میں بھی اس کے پیچھے چلی جاؤں۔“ ساری بات طے کرنے کے بعد سکون سے سونے کیلئے لیٹ گئی۔ سارا روم چرس کی ناکارو اور دھوئیں سے بھرا ہوا تھا مگر زیرہ خانم کسی ناکاروی کا اظہار کئے بغیر ایسے سو گئی تھی جیسے وہ اس چیز کی عادی ہو۔ مگر رضوی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا روبی کی پہلی کمائی جو زیرہ خانم کے پاس آئی ہے اس میں سے اپنا حصہ کیسے وصول کرے۔

ادھر روبی اپنے بستر میں لیٹی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے پیپر سائن کر کے باقاعدہ فلم لائن جو ان کر لی تھی۔ ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ گناہ روبی سے وہ مشہور روبی بننے والی تھی۔ کوئی بھی شوٹنگ کا شیڈول طے نہیں ہوا تھا مگر کام تو اب یہی کرنا تھا۔ وہ بہت خوش تھی مگر ساتھ ساتھ تھوڑی فسر د بھی تھی۔ مگر افسوس بالکل نہیں تھا۔ اس کے اپنے گھر والوں نے اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ چھوڑا ہی نہ تھا۔ تین ماہ سے کرن اور اس کے گھر والے اس کو بستر پر بٹھا کر کھلا رہے تھے بھی لوگ ہر طرح سے اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ مگر روبی ساری عمر یوں بیٹھ کر کھاتے ہوئے تو ان لوگوں کے گھر نہیں گزار سکتی تھی۔ اس کو خود بھی تو اپنے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔

یہی کیا کم تھا کہ انہوں نے اسے محبت کے ساتھ قبول کیا تھا۔ ورنہ اگر ان کا سہارا نہ ہوتا تو اس کو خودکشی کرنی پڑنی تھی کہ زندہ رہنے کیلئے کوئی صورت تھی ہی نہیں۔ ان اچھے لوگوں کی وجہ سے وہ حرام موت مرنے سے بچ گئی تھی۔ اس نے سوچا زندگی یوں بھی گزر جائے تو بری نہیں۔ پتا نہیں گھر والوں نے میری تصویر والا فلمی رسالہ دیکھا ہے یا نہیں اور اگر دیکھ چکے ہیں تو پھر ارم کرن اور ان کی والدہ کو خوب گالیاں پڑتی ہوں گی امی اور سلمان بھائی سے۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اور اب ہونا ہی رہے گا۔ پھر وہ سب کچھ بھول کر سونے کی کوشش کرنے لگی اور جلد ہی سو بھی گئی۔

اگلے روز ناشتے پر کويا جشن کا سماں تھا۔ کرن تو سوچ چکی تھی جب وہ لوگ ہدایت کار نیاز صاحب سے مل کر آئے تھے اور پوی اس وقت تک گھر واپس ہی نہیں آیا تھا۔ اب کرن کے ساتھ ساتھ پوی بھی ناشتے کی میز پر موجود تھا اور یہ خوشخبری سنتے ہی کہ روبی بطور میرٹن رات اپنی پہلی فلم سائن کر آئی ہے دونوں مارے خوشی کا چھل پڑے۔ پوی تو یہ سوچ کر خوش ہوا تھا کہ ساری زندگی کیلئے روزی روٹی کا سلسلہ حل ہو گیا اور کرن کی وہ بہر حال دوست بھی اس لئے روبی کو اپنا نیت سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

”مبارک ہو روبی پہلی کامیابی۔ اللہ تمہیں ہر قدم پر کامیابی بلکہ ڈھیروں کامیابیاں عطا کرے۔ مگر اس کے بعد مجھے نہیں بھولنا۔ میں ہمیشہ سے تمہاری اچھی دوست ہوں اور رہوں گی۔“ بات ختم کر کے اس نے روبی کا ہاتھ پکڑ لیا تو روبی نے اپنا دوسرا ہاتھ محبت سے اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”کرن میں ساری دنیا کو بھول سکتی ہوں مگر آپ سب لوگوں کو بھول نہیں سکتی اور نہ ہی آپ لوگوں کی محبت اپنا نیت بھولنے والی چیز ہے۔ یہ تم نے کیسی بات کی ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھولنا تو دور کی بات آپ لوگوں سے دور ہونا بھی اپنی زندگی میں کارہ نہیں کروں گی۔ آپ سب کے ساتھ رہوں گی۔“

”روبی ڈیر! میں سب کی نہیں اپنی بات کر رہی ہوں سمجھی۔“ کرن نے پھر مسکرا کر کہا تو پوی کا جی چل ا بھی ایک اس کمیٹی لڑکی کے چہرے پر لگا دے۔ بہت اہم بتانا چاہ رہی ہے اپنی دوستی کو گروہ چپ رہا۔ ارم آپ کی جوتی کے ڈر سے اور روبی نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا اچھا یار! تم سب سے پہلے۔“ پھر سب ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ارم آپ جلدی چلی گئی۔ تب زیرہ خانم نے روبی سے کہا۔

”روبی بیٹی! گڑیا! اگر تم ہر روز مناؤ تو ایک بات کہوں۔“

”آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟ میں آپ کی کسی بھی بات کا کبھی بھی برا نہیں مناسکتی۔ جتنی چاہے کہیں۔“ روبی نے کہا تو زیرہ خانم بولیں۔

”بیٹی! اب تم ایک مشہور رستی بننے والی ہو میں چاہتی ہوں تم اپنے گھر والوں کے نام ایک لیٹر لکھ دو صرف اس لئے کہ وہ تمہیں فلم میں کام کرنا دیکھ کر سمجھیں گے چونکہ ارم ہاؤٹنگ کرتی ہے اداکاری کرتی ہے اس لئے تم ہمارے ہی گھر ہو۔ اب ان کو خط لکھ کر بتا دو کہ تم ہمارے گھر میں نہیں ہو اور یہ کہ یہ میری زندگی ہے میں جو چاہے کروں تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے



والے اور اگر روکنے کی کوشش کی تو انجام بہت برا ہوگا۔ یاد رکھیں آپ سب میرے لئے مر چکے ہیں۔“

”مگر آپ مجھے معلوم نہیں کیسے لکھنا ہے۔“ روبی نے اپنی مجبوری بتائی۔

”میں لکھا دوں؟“ زہرہ خانم نے چالاکی سے پوچھا۔

”جی آپ بتاتی جائیں میں لکھتی جاؤں گی۔“ روبی نے کہا تو زہرہ خانم نے پوی کو قلم کا پیلا لانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ قلم کا پیلا لے کر آ گیا تو اس کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے زہرہ خانم نے روبی سے کہا۔

”یہ خط میں صرف تمہاری حفاظت کیلئے لکھا رہی ہوں۔ اگر تمہیں کوئی بات بری لگے تو تم مجھے ٹوک سکتی ہو۔“ روبی نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے قلم سنبھال لیا۔ گھر سے بھاگنے کے چند ماہ بعد روبی کا خط گھر والوں کے نام آیا تھا اور یہ خط پوسٹ میں لے کر نہیں آیا تھا بلکہ دتی آیا تھا۔ دروازے پر زور دار دستک ہونے کی صورت میں حمیدہ بیگم ٹھہ کر باہر آئیں تو دروازے کے سامنے چبوترے پر ایک خط پڑا تھا۔ ویسے یہ بھی پوسٹ میں کتا نے کاٹا تھا۔ صبح کے کس بجے تھے۔ شمشاد بیگم خط اٹھا کر دروازہ بند کر کے اندر آئی پھر خط گڈو کو دیتے ہوئے روجی سے کہا۔

”ابھی ڈاکٹے کے آنے کا وقت شروع نہیں ہوا یہ خط کوئی خود پھینک کر گیا ہے۔ گڈو پڑھ کر دیکھو کس کا ہے۔“ شمشاد نے کہا اور خود چھو لیا بنانے لگی۔ روجی نے کہا امی چھو لیا پلاؤ کھانے کو مل چاہتا ہے۔ اور شمشاد فوراً جا کر چھو لیا لے آئی تھی۔

گڈو نے خط دیکھا۔ باہر شمشاد بیگم کا نام تھا اور دوسری جانب لکھا تھا منجانب روبی آوارہ۔ گڈو کی سمجھ میں نہ آیا اب کیا کرے۔ اگر روجی اس وقت سامنے نہ ہوتی تو وہ کہہ دیتی پھوپھو کوئی یونہی کاغذ پھینک گیا ہے۔ مگر اب سنا مجبوری تھی۔ اس کے باوجود وہ صبح میں گم تھی۔

”کس کا ہے گڈو پڑھتی کیوں نہیں ہو؟“ حمیدہ نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”پھوپھو جان یہ خط روبی نے بھیجا ہے۔“ گڈو کا اتنا کہنا تھا کہ روجی نے خط اس کے ہاتھ سے چھپٹ لیا پھر کھول کر اونچی آواز میں پڑھنے لگی۔ روبی نے بہت بے ادبی اور طنز یہ انداز میں لکھا تھا۔

”بے حد نیک اور شریف شمشاد صاحبہ!

میں اگر سلام کروں تو کیا قبول کرو گی؟ نہیں شاید۔ آپ ایک ماں ہیں شاید میری بھی ماں ہیں کہ مجھے پیدا کرنے کا جرم بہر حال آپ نے کیا ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ حدیث نبوی ہے کہ ہر ماں جنت کی حق دار نہیں ہوتی اور مجھے پورا یقین ہے یہ حدیث صرف آپ کیلئے ہے۔ آپ مجھے برا بھلا کہتے ہوں گے کہ وہ بھی ہی آوارہ اس لئے بالآخر گھر سے بھاگ گئی۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔ میں گھر سے کبھی نہ بھاگتی مگر کیا کروں برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مگر آپ لوگوں نے تو ہر حد کو توڑ ڈالا۔ میں گناہ گار ہوتی تو پھر بھی میں یہ سب کوارہ کر لیتی مگر مجرم میں نہیں کوئی اور تھی۔ آوارہ میں نہیں کوئی اور تھی اگر آپ خود بھی تک سمجھ نہیں پائیں تو میں بھی اس آوارہ اور مجرم کا نام بتانا پسند نہیں کرتی۔ آپ نے میرے اپنے ہو کر جو کچھ میرے ساتھ کیا وہ کوئی اپنے دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ میں بے گناہ تھی۔ یہ بات میں جانتی ہوں یا میرا خدا یا پھر وہ اصل مجرم جو اب بھی سب کی نگاہوں میں محترم ہی ہوگی۔ آپ لوگ کہتے تھے کہ یہ آوارہ گھر سے بھاگ گئی تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔ اس آوارہ کا بطور خاص خیال رکھا کرو۔

آپ مجھے برا بھلا کہنے اور میری نگرانی کرنے کے بجائے اگر مجھ سے محبت کرتے تو میں شاید یہ قدم کبھی نہ اٹھاتی مگر جب آپ لوگوں نے ظلم کی حد کر دی تو پھر میں بھی سب کچھ بھول گئی۔ معلوم ہو چکا ہوگا آپ لوگوں کو کہ آپ لوگ تب تک عزت دار تھے جب تک میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اب کہاں ہے آپ کی عزت؟ کیسے میں عین شادی سے چار دن پہلے بھاگ گئی تھی؟ خوشی برباد کی ہے؟ خاندان اور محلے والے میرے بارے میں پوچھتے تو ہوں گے تو پھر کیا جواز پیش کیا آپ نے اس اہم موقع پر میری عدم موجودگی کے بارے میں بہت سخت نگرانی تھی میری۔ میں چھت پرا کیلی نہیں جاسکتی تھی پھر دیکھ لیا اپنی نگرانی کا انجام؟ کر لی میری نگرانی؟ روک لیا مجھے گھر سے بھاگنے کو؟

اور سلمان! تم کہاں ہو بے غیرت! کوئی جانور کو بھی اتنی بے رحمی سے نہیں مارتا جیسے تم اپنی چھوٹی بہن کو مارتے تھے۔ بے غیرت انسان! خود گھر میں ماموں کی بیٹی کو ساری رات اپنے بستر میں رکھتے تھے۔ یہ تو بے حد گھٹیا بات ہے کہ غیرت مند ہونے کے دو انداز ہوں۔ اپنے لئے اور دوسروں کیلئے اور۔ اوائے بے غیرت تم ابھی تک زندہ کیسے ہو! جو ذلت گھر



سے بھاگ کر تم لوگوں کو دی ہے اس کے بعد تم زندہ کیسے ہو؟ بے غیرت تمہیں تو یہ سنتے ہی کہ تمہاری بہن گھر سے بھاگ گئی ہے خودکشی کر لینی چاہئے تھی۔ مگر تم سب بے غیرت ہو اس لئے زندہ ہو اور میں چونکہ بے گناہ تھی اس لئے تم سب کو چھوڑ کر صرف زندہ ہوں بلکہ بہت خوش بھی ہوں۔ زندگی میں کبھی تم منحوس لوگوں کی شکلیں دیکھنے کا ارادہ نہیں۔

تم تو کہتے تھے اگر میں نے کچھ غلط ملط کیا تو جان سے مار دو گے اب سارے کیوں نہیں ہو جاتا کہ میں ای شہر میں موجود ہوں۔ بزدل! بے غیرت! اب پھانسی کے ڈر سے مجھے زندہ چھوڑ کر اپنی جان بچائے بیٹھے ہو میں تم لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتی اس کے باوجود میں تمہاری بہن اور اس خاندان کی بیٹی ہوں وہ جو کہتی ہیں۔

ہاتھی پھرے گراں گراں جس کا ہاتھی اس کٹاں

سو میں تمہاری بہن ہوں لوگ تم سے میرے بارے میں پوچھتے ہوں گے۔ کیسی کالک پھیر دی میں نے گھر سے بھاگ کر اور اب فلموں میں کام کر کے مزید کالک تمہارے منہ پر پھیرتی رہوں گی۔ اپنی ماں سے بھی پوچھو وہ اب تک زندہ کیوں ہے خودکشی کیوں نہیں کرتی۔ زبان دراز عورت تربیت تو میری کرنا سکی۔ باقی مارنے کا کام ٹھیک ٹھاک کرتی تھی۔ پھر کیسی ہزا دی میں نے تم لوگوں کو۔ تمہاری ان زیادتیوں کی اب اور دیتی رہوں گی یقیناً۔ ساری زندگی یاد رکھو گے۔ ایک کے بعد ایک ذلت تم لوگوں کو دیتی رہوں گی۔

اور نیک پروین تمہارا کیا حال ہے یقیناً اچھا ہی ہوگا اور سلمان اب میں فلموں میں کام کرنے لگی ہوں۔ مجھے مار کر دکھاؤ۔ ارے مجھے مارنا تو دور کی بات میری جانب میلی آنکھ سے دیکھنے والوں کی بھی میرے باڈی گارڈ آنکھیں نکال لیں گے۔ فلموں میں کام کرنے کا سن کر بیٹا سمجھنا کہ میں ارم کرن کے گھر پر موجود ہوں۔ وہ تو ساری زندگی میں ایک فلم میں بھی کام حاصل نہ کر سکی جبکہ میں بہت ساری فلموں میں کام کر رہی ہوں اور بے حد خوشی ہوں۔ مگر تم لوگوں کو اب کبھی خوش رہنا نصیب نہ ہوگا۔ جب میری فلم ریلیز ہوگی تو خاندان اور محلے والے میرے بارے میں تم لوگوں سے ضرور پوچھیں گے۔ آج کیلئے اتنی کافی ہے۔

شمشاد صاحبہ باقی پھر کسی ہاں میرے باپ سے کہنا انہوں نے کبھی اپنی آنکھوں سے میری کوئی غلط حرکت دیکھی تھی جو انہوں نے کہا شمشاد زیادہ سختی اچھی نہیں ہوتی ایسا نا ہو وہ تنگ آ کر گھر سے بھاگ جائے اور ہماری ساری عزت خاک میں مل جائے۔ ان کو میرے بارے میں یہ کہتے ہوئے شرمنا آتی اور میں نے گھر سے بھاگ کر ان کی عزت خاک میں ملا دی۔ اب کیا حل ہے اس بے وقوف بڑھے کا مرادہ بھی نہیں ہوگا۔ اونہ باب۔ فقط آوارہ روی۔

روبی کا خط سن کر شمشاد کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ تو کبھی بھی وہ ہر چکی ہوگی غزالہ کی طرح۔ مگر جب اس کی تصویر والا فلمی رسالہ گھر آیا تو وہ سمجھی اب وہ ارم کی طرح ماڈلنگ کرے گی مگر وہ فلموں میں کام کر رہی تھی۔ بجائے اپنی حرکت پر شرمنا ہونے کے وہ خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ انہوں نے منہ بھر بھر بددعا کی دینی شروع کیں۔ اگر ہماری خوشی برباد کی ہے تو اللہ تمہاری تمام عمر کی خوشیاں برباد کر دے۔ ہمیں بے عزت کیا ہے خود بھی ساری زندگی بے عزت ہوتی رہ۔ عزت کو رستی رہ ہمارے منہ پر کالک پھیری ہے تو ایسی ہزاروں کالکیں اللہ تمہارے منہ پر پھیرے۔ ہمیں ذلت دی ہے تو تمہاری ساری عمر ذلتیں اٹھاتے ہوئے گزر جائے۔ وہ بددعا کی دینے کے ساتھ ساتھ روتی بھی جا رہی تھیں۔

جبکہ روجی دل ہی دل میں خدا کا شکرا دا کر رہی تھی کہ کہیں روبی نے خط میں اس کے بارے میں اور اس کے دوستوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھ دیا۔ اگر وہ لکھ دیتی تو کیا ہوتا۔ لکھ بھی دیتی تو میں نے ماں سے کہنا تھا ذلیل لڑکی اپنے پاروں کے داغ دھونے کیلئے مجھ پر الزام رکھ رہی ہے۔ امی میں بھلا ایسی ہو سکتی ہوں۔

ادھر گڈو بھی اپنی جگہ شرمندہ شرمندہ ہی بیٹھی تھی کہ روبی نے اس کے بارے میں بھی ٹھیک ہی لکھا تھا۔ شمشاد نے اچانک روجی کے ہاتھ سے خط پکڑا پھر اس کے پرزے پرزے کر کے گڈو کو دیتے ہوئے بولیں۔

”اس کو ڈسٹ بن میں ڈال دو اور سنو ہم تینوں کے سوا گھر میں کسی اور کو کبھی پتہ نہ چلے کہ روبی کا خط آیا تھا۔ خاندان کی عزت کی قائلہ اب باب اور بھائی کی جان لینا چاہتی ہے۔ بے غیرت۔“ وہ پھر روبی کو بددعا کی اور کو سننے دیے لگیں جبکہ گڈو خط کے پرزے ڈسٹ بن میں ڈالنے چلی گئی تھی۔ روجی وہیں صوفے پر لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆☆

زہرہ خانم جب ارم کی شادی کے بارے میں سوچتی تھی تو ان کو گھبراہٹ ہونے لگتی تھی کہ اب حالات خراب ہوئے تو کیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی وہاں ہونے کے باوجود یہ دعا کرتی تھی کہ اللہ کرے ارم کو شادی کیلئے اچھا مرد بھی نہ ملے مگر ارم کی شادی سے پہلے ہی اللہ نے اس کی سن لی تھی اور روبی کو اس کے گھر بھیج کر ان کو ہمیشہ کیلئے خوشحال کر دیا تھا اب اس کو اس بات کی پروا نہ رہی تھی کہ ارم کب شادی کرتی ہے بلکہ جتنا تلخ رویہ اس کا دن بدن ہوتا جا رہا تھا اب وہ چاہتی تھی ارم کو جلد ہی کوئی اچھا مرد مل جائے اور وہ شادی کر کے یہاں سے دفعتاً



ہو جائے کہ وہ پرسکون ہو سکیں۔

ایک مسئلہ ان کو پریشان کر رہا تھا۔ روپی فلم لائن کی لڑکی نہیں تھی۔ وہ شرم و حیا والی لڑکی تھی۔ اس کی یہ شرم دور کرنا بے حد ضروری تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی شوٹنگ میں جانے کا بھی نام ہے۔ وہ کل سے گھر کے اندر ہی اس کو ادا کاری کرنے کا کہیں گی۔ بلکہ سب مل کر اس کو سکھائیں گے تو وہ لازمی اپنی جھجک دور کرے گی وہ تو ایسی لڑکی تھی کہ سیلیولس نمبض پہننے سے اس نے انکار کر دیا تھا اور فلم میں پتہ نہیں کیا کیا لباس زیب تن کرنا پڑتا ہے۔

اور رہا پوی ایک تو وہ سب سے چھوٹا تھا۔ پھر بیٹا برماں کو عزیز ہوتا ہے ان کو بھی عزیز تھا۔ مگر اس وقت جو کچھ کہہ کر گیا تھا ان کے دل سے اتر گیا تھا مگر اس کے باوجود انہیں ضبط ہی کرنا تھا۔ ارم پہلے ہی باپ بیٹے کو اب کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ چند ماہ پہلے رضوی کو دل کا دورہ پڑا تو ہسپتال لے جانا پڑا۔ مجبوری تھی علاج پر اچھی خاصی رقم لگ گئی تھی۔ ارم کی اخبار میں خبر لگ گئی تھی کہ ارم کے والد علیل ہیں صحت مند ہو کر اب رضوی گھر آیا تو ارم نے نفرت آمیز لہجے میں ماں سے کہا تھا۔ میں تو کبھی بھی بڑھامر جائے گا۔ اب تو ہماری جان اس نشی سے چھوٹ جائے گی۔ کتنی دعا کی تھی اس کی موت کی مگر برے کی رسی اللہ دراز مانتا ہے اس لئے یہ برائی بھی بچ کر واپس ہمارے گھر آ گئی ہے۔“ زہرا اس کی بات سن کر چپ رہی تھی اور اب ارم ویسے ہی پوی سے خار کھاتی تھی۔ اگر وہ بھی اس کو بتا کر ساری بات پوی کے خلاف کان بھرتی تو پھر یہ دونوں باپ بیٹا اس گھر میں نہیں رہ سکتے تھے۔ سو رو رو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ مگر اپنے روم میں آنے سے پہلے وہ روپی کو سمجھا آئی تھی کہ وہ ارم کو اس دن ہزار کی رقم کے بارے میں نہ بتائے جو الماری سے گم ہو چکی ہے۔

انکی سپر زہرہ خانم کا پروگرام خاک میں ملاتے ہوئے ارم روپی کو اپنے ساتھ لے وی سٹیشن لے گئی تھی۔ اس کے ڈرامے کی یہ آخری قسط تھی۔ اس دن روپی نے پہلی بار اپنی آنکھوں سے شوٹنگ دیکھی تھی۔ ارم نے کہا ہر چیز غور سے دیکھنا اور سمجھنا۔ پھر واپسی پر مجھے کر کے دکھانا۔ روپی نے ان کی بات مان لی تھی۔ اس کے بعد ارم تو اپنا سکرپٹ پکڑے مصروف ہو گئی۔ اس کو اپنے مکالمے یاد کرنے تھے۔ سیٹ پر اور بھی کافی لوگ موجود تھے مگر ارم نے کسی سے بھی روپی کا تعارف کروانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

رات گئے تک شوٹنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ درمیان میں کئی دفعہ چائے پی گئی۔ پھر ارم کا کام مکمل ہو گیا اور وہ سب کو خدا حافظ کہتے باہر چلی آئی۔ بلکہ اب تو باری باری سب ہی رخصت ہونے لگے تھے۔ ارم روپی کو گھرا لانے کے بجائے کھانا کھلانے ہیرا منڈی کے نواح میں بنے ریسٹورنٹ میں لے آئی تھی۔ لی وی سٹیشن کی عمارت سے باہر نکلتے ہی ارم نے روپی کو محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کیا خیال ہے روپی کھانا باہر ہی نہ کھالیا جائے۔“

”میرے خیال میں گھر چل کر کھلایا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔“ روپی نے اس خیال سے کہا کہ کہیں آبا اور کرن ٹھکانہ ہوں کہا۔

”گھر نہیں گھر کے باہر۔“ ارم نے کہتے ہوئے پوچھا۔

”یقیناً تم نے پہلی بار شوٹنگ دیکھی ہوگی کیسی لگی؟“

”اچھی لگی۔“ روپی کا جواب مختصر تھا پھر وہ ریسٹورنٹ پہنچ گئیں۔ جونہی باتیں کرتے ہوئے وہ ریسٹورنٹ پہنچا ارم کا اس دن والا دوست پہلے سے ہی میز پر موجود تھا۔ ارم نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہیلو۔“ اور وہ ارم کو ہیلو کہہ کر روپی کو دیکھنے لگا چند ثانیے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔

”کیسی ہو روپی؟“ اور اپنا ہاتھ روپی کی جانب بڑھایا۔ روپی پچھلی ملاقات میں اس کا رویہ بھولی نہ تھی۔ اس لئے جواباً ہاتھ بڑھائے بغیر سرد لہجے میں کہا۔

”اچھی ہوں۔“

وسیم نے شرمندہ ہوئے بغیر ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے انگلیوں میں دبے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں سا رمانہ کھل کر روپی کے چہرے پر اچھال دیا۔ روپی نے گھور کر پہلے وسیم کو دیکھا پھر ارم کا اور ارم محبت سے وسیم کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ روپی کی حلقی محسوس کرتے ہوئے مزید مسکرا کر بلکہ ہنس کر کہا۔

”روپی! وسیم تمہیں چڑھاتا ہے اور تم چڑھ جاتی ہو۔“ پھر مزید کہا۔ ”ابھی تک میں نے کسی کو نہیں بتایا بس پہلی بار تمہیں بتا رہی ہوں۔ وسیم کے ساتھ میں شادی کرنے والی ہوں اس برس ہم منگنی کر لیں گے۔ وسیم کے گھر والے ابھی ایگری نہیں ہو رہے۔ وہاں گئے تو منگنی دھوم دھام سے ہوگی ورنہ ہم دونوں چپکے سے نکاح کر کے اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ تم میری



بہن ہو اب سوچو میرے حوالے سے تمہارا وسیم سے کیا رشتہ بنتا ہے۔ یہ بہت اہم اور شرارتی رشتہ ہوتا ہے۔ جانتی ہوں سالی کو آدھی گھر والی کہا جاتا ہے۔ وسیم جان بوجھ کر تمہیں تنگ کرنا ہے اور تم پریشان ہو جاتی ہو۔“ ارم مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وسیم بھی مسکرا رہا تھا۔ مگر روپی روجی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

روپی اچھی طرح جانتی تھی روپی بے گناہ ہے۔ اس کے باوجود وہاں کے سامنے کتنی ڈھٹائی سے بلکہ بے غیرتی سے کہہ رہی تھی۔ ”امی مجھے تو اب یہ خوف رہتا ہے اگر روپی نے عام کے ساتھ بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کر دی تو میرا کیا ہوگا۔“ ماں نے بجائے اس کو سمجھانے کے الٹا روپی کے خلاف ہی زہر اگلاتھا۔ کیا وہاں کی مینی نہیں تھی؟

”تم کن سوچوں میں پڑ گئی روپی! وسیم پوچھ رہا ہے کیا کھانا پسند کرو گی۔“ روپی ارم کی بات سن کر چونکی پھر کہا۔

”آپی آپ کا جو جی چاہتا ہے منگوا لیں۔“ ارم نے اپنی پسند کا آرڈر نوٹ کروانے کے بعد روپی کو دیکھا۔ وسیم سے کہنے لگی۔ ”وسیم تم نے فلمی رسالے پر روپی کی تصویر دیکھی تھی نا روپی نے ایک تصویر کی وجہ سے نامور ہدایت کار نیاز صاحب کی اردو فلم سائن کر لی ہے۔ فلم کا نام بھی نہیں رکھا گیا اور فلم کی تہلہ ہیر وئن روپی ہے۔“

”اچھا؟ حیرت ہے۔ کب سائن کی۔“ وسیم نے چونکتے ہوئے روپی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تین دن پہلے۔“ ارم تفصیل سے ساری بات وسیم کو بتانے لگی۔ جب اس نے بات ختم کی تب تک کھانا بھی آ گیا اور کھانے کے بعد کافی پی کر وہ تینوں خاموشی سے اٹھ گئے مرام کے یہ بتانے کے باوجود کہ وہ وسیم سے شادی کرنے والی ہے روپی نے محسوس کیا تھا وسیم آج بھی اس کو بخور دیکھ رہا تھا۔ باہر آتے ہی وہاں دونوں کو خدا حافظ کہہ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد روپی ارم کے ساتھ اس کی گاڑی میں آ بیٹھی اور گاڑی سٹارٹ کر کے باہر سڑک پر لانے کے بعد ارم نے روپی کو دیکھا۔ پھر پوری سنجیدگی سے کہا۔

”روپی گھر میں تم آپایا کرن کو یہ بات نہیں بتاؤ گی کہ میں وسیم کے ساتھ شادی کرنے والی ہوں۔ اس کی ایک وجہ ہے جو میں بھی تمہیں نہیں سمجھا سکتی بس تم میری اور وسیم کی شادی والی بات اپنے تک ہی محدود رکھو گی اوکے۔“

”جی آپی آپ نے جیسا کہا ہے میں ویسا ہی کرو گی۔“ روپی نے کہا تو ارم بولی۔

”آپا نے جو پروگرام تمہارے بارے میں طے کیا ہے میرا خیال ہے اس پر کل سے پورا عمل ہونا چاہئے تاکہ تمہاری جھجک دور ہو سکے۔ سب سے پہلے تو تم مجھے یہ سب کر کے دکھاؤ گی جو مجھے بولتے اور کرتے دیکھا ہے سیٹ پر۔ اس کے بعد تم گھر میں ہی اداکاری کرو تمہیں آپا نے بتا دیا ہوگا اب بھی فلموں میں کام کرتے رہے ہیں ان کا شمار فلم انڈسٹری کے چھوٹے ہنرمندوں اور آرٹسٹوں میں ہوتا تھا۔“ یہی بات کرتی وہ گھر پہنچ گئیں۔ چونکہ دار نے ان کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ ارم گاڑی اندر لائی پھر انجن بند کر کے گاڑی سے باہر آئی۔ روپی نے بھی ان کی تقلید کی پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے روم کی جانب چل دیں۔

اگلے روز ارم سو رہی تھی جب نیاز صاحب کا فون آ گیا۔ ”بارہ بجے تک روپی کو ساتھ لے کر سٹوڈیو آ جاؤ میں آج ایک گانا فلمارہا ہوں اور میں چاہتا ہوں روپی اپنی آنکھوں سے دیکھے گانا کیسے فلمایا جاتا ہے۔“

”جی ٹھیک میں بارہ بجے روپی کو لے کر آپ کے پاس موجود ہوں گی۔ ویسے میں کل اس کو اپنے ساتھ ٹی وی سٹیشن لے کر گئی تھی۔“ ارم نے مودبانہ بتایا اور نیاز صاحب نے ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا۔ اب سونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دس بجنے والے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر چپل پہن کر باہر آئی۔ سب سے پہلے روپی کاٹھا کر نیاز صاحب کا شیج دیا پھر کہا۔ ”بس جلدی سے اپنا غیر وزی والا ڈریس پہن کر تیاں ہو جاؤ۔ بری آپ!“ اور پھر واپس اپنے روم میں آ گئی۔ بھی گھر والے ابھی سو رہے تھے۔ وہاں کا ٹخنے سے پہلے ہی روپی کو ساتھ لے کر گھر سے نکل پڑی۔ ناشتہ راستے میں کرنے کا پروگرام تھا۔ کوکہ وہ ٹکی ہوئی چیزیں زیادہ پسند نہ کرتی تھی۔ مگر آج جب روپی سے ارم نے اس کی پسند کناشتے کا پوچھا تو روپی نے کہا تھا۔ وہ حلوہ پوری کناشتہ کرے گی۔ راستے میں حلوہ پوری کناشتہ کر کے سٹوڈیو پہنچ گئی تھیں۔ سٹوڈیو فلور پر اس وقت ہدایت کار نیاز بے حد مصروف تھے۔ اس کے باوجود وہ ارم اور روپی کو دیکھتے ہی اٹھے تھے اور پھر اپنی مشہور فلمی اداکارہ نسیم سے تعارف کروانے لگے جو اس فلم کی ہیر وئن بھی جو مکمل ہونے کے قریب تھی۔

”روپی یہ ہماری ہر پنجابی فلم کی ہیر وئن ہوتی ہیں اور ہمارے ملک کی مشہور اداکارہ بھی ہیں۔ ان کو پہچانتی ہو گی نام بتاؤ گی ان کا۔“

”نسیم!“ روپی نے فوراً پہچان لیا۔ بلکہ اس وقت اپنے سامنے دیکھ کر خوش بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد نیاز صاحب نے نسیم سے کہا۔

”نسیم یہ ہے ہماری نئی فلم کی نئی ہیر وئن روپی۔“ نسیم نے مسکرا کر روپی سے ہاتھ ملایا پھر کہا۔ ”جس فلم کی تم ہیر وئن بنائی گئی ہو۔ اس کی کہانی بہت زبردست ہے۔ مجھے پورا یقین ہے



تمہاری یہ پہلی فلم ہی تمہیں شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچا دے گی۔“ روہی اس کی بات سن کر خوش ہو گئی تھی۔ نسیم سے مل کر ایک نیا جوش اس کا اندر آ یا تھا۔ وہ سارا دن روہی کا سیٹ پر گزرتا تھا۔ پھر گنا فلمایا گیا۔ نسیم نے بہت خوبصورتی اور مہارت سے ڈانس کیا تھا۔ ایک تو وہاں کارہ تھی۔ پھر اس کا تعلق اس شادی محلے سے تھا جہاں پیدا ہوتے ہی ڈانس کی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں پیدا ہوتے ہی اذان کی آواز کے ساتھ گھونگھرو کی آواز بھی سماعتوں میں جاتی ہے۔ یہ سیٹ دولہا کی شادی کا تھا جس میں ہیر و من پطو رطو ناف بلائی جاتی ہے ناچنے کیلئے۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر یعنی گنا فلمانے کے بعد نسیم اپنی دوسری فلم کے سیٹ پر چلی گئی تھی۔ جو اسی سٹوڈیو میں لگا ہوا تھا۔ نیاز صاحب بعد میں بھی کام کرتے رہے۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے روہی اور ارم کو اپنے ساتھ کھلایا تھا۔ رات گئے وہ رخصت ہو کر واپس آئیں۔ ارم نے گھر سے جانے کے بعد سٹوڈیو سے آپا کفون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ روہی کے ساتھ اس وقت سٹوڈیو میں موجود ہے فکر نہ کریں۔ آپ سورہی تھیں اس لئے ہم بتائے بغیر چلے آئے۔ اب فون اس لئے کر رہی ہوں کہ آپ یہ سوچ کر پریشان نہ ہوں کہ ہم شاید رات کو گھر واپس نہیں آئیں۔ رات جب ہم آئے تھے تب بھی آپ سورہی تھیں۔“ کہہ کر ارم نے فون بند کر دیا تھا۔ دن بج رہے تھے جب وہ گھر پہنچیں تب سبھی ہال کمرے میں بیٹھے گپ شپ میں محو تھے۔ روہی نے ہال میں داخل ہوتے ہی پر جوش لہجے میں کرن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”کرن! آج میں نے مشہور اداکارہ نسیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ میری فیورٹ اداکارہ ہیں۔ ان پر آج ایک گنا فلمایا گیا اور انہوں نے اتنا اچھا ڈانس کیا کہ کیا بتاؤں۔ یار! مزہ آ گیا۔“

”واقعی! کرن نے بھی خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اس کو بھی فلموں میں کام کرنے کا بے حد شوق تھا۔ پھر ارم سے بولی۔

”آپ! اگر آپ سٹوڈیو جا رہی تھیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں۔“

”مجھے کیا پتہ کہ تم گھر پر ہو۔ میں کبھی تم کا لچ جا چکی ہو۔“ ارم نے ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے جواب دیا تو زبرہ خانم نے کہا۔

”اچھا کیا جو تم نے فون کر دیا ورنہ میں تو بہت پریشان تھی کہ تم شاید رات کی واپس نہیں آئی ہو۔ تمہارا فون آیا تو مجھے سکون ملا ورنہ میں ٹی وی سٹیشن فون کرنے ہی والی تھی۔“

”آپا! نیاز صاحب نے کہا ہے روہی کو روز لے کر آیا کرو۔ ابھی تو چند روز تک میں بھی فارغ ہوں۔ روہی کے ساتھ چلی جایا کروں گی پھر بعد میں آپ کو روہی کے ساتھ جانا ہوگا۔“ ارم نے کہا تو پوی نے پوچھا۔

”آپ! ساتھ میں بھی چلا جایا کروں اگر آپ اجازت دیں۔“

”تم۔“ ارم نے اس کو دیکھا پھر کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے جب آپا کے ساتھ جانا شروع کرے تو تم بھی چلے جایا کرنا تب۔“ کرن نے کہا۔

”آپا کل میں بھی آپ کے ساتھ سٹوڈیو جاؤں گی شوٹنگ دیکھنے۔“

”اور کالج کون جائے گا۔“ ارم نے محبت سے بہن کو دیکھا۔

”آپ! اکل چھٹی کر لوں گی۔ ایک دن چھٹی کرنے سے کیا ہوتا ہے۔“ کرن نے لاڈ سے کہا تو ارم نے اس کو ساتھ لے جانے کی حامی بھر لی۔

ہال میں اس وقت رضوی صاحب بھی تھے مگر اب وہ بولتے کم کم ہی تھے۔ صرف سنتے تھے۔ بولنے کا کوئی قاعدہ بھی نہیں تھا۔ ارم کے چہرے اور آنکھوں اور لہجے میں ان کیلئے ہمیشہ شدید نفرت ہوتی تھی۔ ان کو اس جگہ بیٹھ کر چرس پینے کی بھی اجازت نہ تھی۔ جہاں ارم موجود ہوتی۔ وہ بس حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کیلئے تھوڑی دیر ہال میں ان سب میں بیٹھتے تھے۔

پھر اٹھ کر چلے جاتے تھے۔ اس وقت بھی انہوں نے یہی کیا تھا۔ گلے روز ارم اور روہی کے ساتھ کرن بھی سٹوڈیو گئی تھی۔ جانا تو پوی بھی چاہتا تھا مگر ارم نے اس کو ساتھ لے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد تو روہی روز سٹوڈیو آنے لگی۔ یہاں تک کہ خود اس کی اپنی فلم کی رسم افتتاح آن پہنچی تھی روہی کے ملک کا مشہور اداکار آ زہیر ولیا گیا تھا۔ روہی کو ہدایتکار سے زیادہ ارم کرن اور زبرہ خانم نے وہ سکرپٹ یاد کرایا تھا اور سمجھایا تھا۔ کیسے بولنا ہے؟ اور کیا کرنا ہے؟

فلم کے لئے روہی کا یہ پہلا سین پہلی بار ہی اوکے ہو گیا تھا۔ رسم افتتاح کے بعد ایک بڑی ضیافت کا اہتمام بھی سٹوڈیو کے فلور پر کیا گیا تھا۔ رسم افتتاح سے لے کر ضیافت کے



اختتام تک حاجی سردار سٹوڈیو میں موجود رہے تھے۔ پھر اس ضیافت کا اختتام پر جب روپی رخصت ہونے لگی تو نیاز صاحب نے زہرہ خانم سے رازداری سے کہا۔

”حاجی صاحب! روپی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ ساتھ آپ بھی چلی جانا۔“ زہرہ خانم کو معلوم تھا ایسا لازمی ہوگا۔ کیونکہ شہرت کی ایک قیمت ہوتی ہے جو لازمی ادا کرنی پڑتی ہے۔ ارم اسی وجہ سے رسم افتتاح میں شامل نہ ہوئی تھی۔ وہ دونوں حاجی سردار صاحب کی گاڑی کی پیچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئی تھیں۔ حاجی سردار آگے اپنے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے تھے۔ گاڑی ان کی کٹھی میں پہنچ کر رک گئی۔ روپی زہرہ خانم کے ساتھ گاڑی سے باہر آئی۔ زہرہ خانم یہ کہہ کر گئی تھیں کہ حاجی سردار کہتے ہیں روپی سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ رہائشی حصے میں پہنچ کر حاجی نے ان دونوں کو ایک روم میں بٹھایا پھر خود اپنے روم میں چلے گئے۔

”یہاں اتنی دور لا کر جوابات کرنی ہے وہاں سیٹ پر نہیں کر سکتے تھے۔“ روپی نے کچھ نفی لہجے میں کہا تو زہرہ خانم بولیں۔

”میری گڑیا بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ہم انکار کرنے کا حق نہیں رکھتے کہ انہوں نے تمہیں اپنی پہلی فلم میں ہیروئن لیا ہے۔ نئی لڑکی ہونے کے باوجود نیاز صاحب بتا رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں میری ہر اردو فلم کی ہیروئن روپی ہی ہوگی۔“ روپی اب کے چپ ہی رہی۔ زہرہ خانم ہی اس کا دل بہلانے کو باتیں کرتی رہی تھی۔ اچانک حاجی سردار کے ملازم نے روم میں داخل ہو کر کہا۔

”حاجی صاحب روپی پی پی کو بلا رہے ہیں۔“ یہ سنتے ہی زہرہ خانم نے روپی سے کہا۔

”جاؤ بیٹی حاجی صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔“

”آپ بھی ساتھ آئیں نا۔“ روپی نے دوپٹہ سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا۔

”بیٹی انہوں نے تمہیں بلاایا ہے میرا ساتھ جانا مناسب نہیں۔“ زہرہ خانم کو معلوم تھا حاجی سردار کیوں ان کو یہاں لے کر آئے ہیں۔

”مگر میں! مجھ سے کیلے جاتے گھبراہٹ ہوتی ہے۔“ روپی نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”ارے بیٹی! حاجی صاحب بہت نیک انسان ہیں۔ گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں جاؤ میری بہن۔“ اور روپی ملازم کے ساتھ چلی گئی۔ کئی راہ داریاں گھومنے کے بعد ملازم اس کو سردار صاحب کے بیڈ روم میں لایا تھا۔ حاجی سردار سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ روپی کو دیکھتے ہی اپنے پاس صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ملازم سے کہا۔

”اب تم جاؤ اور جو کہا تھا ویسا کرتے جانا۔“

ملازم جی اچھا کہہ کر چلا گیا تو حاجی سردار نے روپی کی جانب دیکھا۔ مگر روپی ان کے بجائے صوفے کے سامنے رکھی میز پر برف پانی کی بوتل کو دیکھ رہی تھی۔ آدھا بھراؤ کی کا گلاس بھی تھا۔ اور سوچ رہی تھی۔ آپا کہتی ہیں حاجی صاحب بہت نیک انسان ہیں اور یہ شراب پی رہے ہیں۔ کتنا بڑا گناہ ہے شراب پینا۔

یکدم وہ یوں اچھلی جیسے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو۔ حاجی سردار نے اچانک اس کی کلائی تھام لی تھی۔ روپی نے ان کی طرف چہرہ گھما کر دیکھا۔ پھر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”یہ کیا کرنے لگے ہیں انکل! آپ؟“

”انکل!“ حاجی سردار نے پہلی بار اس کے سامنے پورا منہ کھول کر قہقہہ لگایا۔ پھر کہا۔ ”تمہیں پیار کرنے لگا ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ میں مضبوطی سے تھامی کلائی کھینچ کر روپی کو اپنے قریب کر لیا۔

”انکل! آپ ہوش میں تو ہیں میں آپ کی بیٹی جیسی ہوں۔“ روپی نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

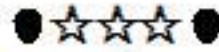
”میں نے شادی ہی نہیں کی پھر بیٹی کہاں سے آگئی۔“ وہ منہ پھاڑ کر ہنسا تو روپی نے جلدی سے کلائی چھڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر حاجی سردار نے اس کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اب مجھ سے انکل نہیں کہنا بے بی! اور نہ میں تمہارے منہ پر کس کرا ایک تھپڑ ماروں گا۔“ بات ختم کرتے ہی وہ اپنا چہرہ روپی کے قریب لایا تو روپی نے روتے ہوئے کہا۔

”پلیز انکل! میں شریف لڑکی۔۔۔۔۔“ بات پوری ہونے سے پہلے ہی حاجی سردار نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا اور غرایا۔

”انکل!! نہیں کہنا سنا۔ انکل!! نہیں کہنا طوائف۔ اور شریف لڑکیاں فلموں میں کام نہیں کرتیں۔“ کہتے ہوئے اس نے کسی بچی کی طرح روپی کو اٹھایا اور اپنے بستر میں لے آیا۔ روپی نے خود کو بچانے کیلئے مزاحمت شروع کی مگر سب بے کار ثابت ہوا۔ پھر اپنا مطلب مقصد پورا ہونے کے بعد حاجی سردار تو فریٹش ہو کر گہری نیند سو گیا اور روپی جہازی سائز کے اس بیڈ



پرایک جانب بے حس و حرکت پڑی کی پڑی رہ گئی تھی۔



کتنی ہی دیر وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ جیسے مر گئی ہو۔ جسم سے جیسے کسی نے جان نکال لی ہو۔ آج کی رات اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ سب ناقابل یقین لگتا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہ سب اس کے ساتھ ہو چکا تھا۔ ایک ناقابل فراموش سانحہ۔ یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہی تو تھا۔

اب وہ ایک عزت دار لڑکی نہیں رہی تھی اس کی عزت ناموس شرافت و پاکیزگی لٹ چکی تھی۔ کسی نے اپنی ناپاک خواہش پوری کرنے کیلئے اس کو ناپاک کر ڈالا تھا۔ زندگی میں ایسا ذلت آمیز مقام بھی آئے گا اس نے تو بھی تصور نہ کیا تھا۔ اب یہ ذلت اس کے پور پور پر مل دی گئی تھی۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو اس نے ماں کے نام اپنے پہلے خط میں بڑے تحارت آمیز انداز میں لکھا تھا۔

تم لوگ تب تک عزت دار تھے جب تک میں گھر سے بھاگ گئی نہیں تھی۔ پھر اس نے کہا تھا۔ گھر سے بھاگ کر کیسی کالک بھیر دی میں نے تم سب کے چہروں پر؟ کیسی ذلت دی تم لوگوں کو؟ کبھی نہ بھولنے والی اور ہمیشہ دیتی رہوں گی یاد رکھنا اب تم لوگ عزت دار نہیں رہے۔

اور اب وہ خود بھی عزت دار نہ رہی تھی۔ چند ماہ پہلے جو کالک اپنے خاندان کے منہ پر بھیری تھی۔ وہی کالک آج رات اس کے چہرے پر بھی بھیر دی گئی تھی۔ چند ماہ پہلے جو ذلت دن کے روشن جالوں میں اس نے اپنے خاندان والوں کو دی تھی۔ وہی ذلت آج رات کی تاریکی میں اس کے وجود کا حصہ بنادی گئی تھی۔ یہ بات اپنے آپ طے ہو گئی تھی نا کہ وہ بھی صرف تب تک ہی عزت دار تھی جب تک اپنے خاندان کے ساتھ اپنے گھر کی چار دیواری کا اندر تھی۔ گھر سے بھاگنے کے بعد آج رات وہ بھی عزت سے محروم ہو کر عزت دار نہ رہی تھی۔

اچانک روم کی خاموشی میں زوردار خراٹوں کی آواز آئی تو وہ چونک پڑی۔ چہرہ اٹھا کر اس خبیث بڑھے اڈیل بند کردار مکار حاجی سردار کو دیکھا جو چپت لپٹا کبریٰ نیند سو رہا تھا۔ منہ کتے کی طرح پورا کھل گیا تھا۔ روپی نے بے حد نفرت سے بڑھے بد معاش کتے کو دیکھا پھر خود کو دیکھا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کتنی ہی دیر وہ مسک مسک کر روتی رہی پھر چپکے سے اٹھی اور لباس پین کر روم سے باہر نکل آئی۔ اس کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا کہ زہرہ خانم کس کمرے میں موجود تھی۔ ملازم بہت ساری رہداریاں گھمانے کے بعد اس کو بڑھے کے کمرے میں لے کر گیا تھا۔ لیکن اگر وہ کوشش کرتی تو زہرہ خانم کے روم کا تلاش کر ہی سکتی تھی۔ یہی سوچ کر وہ روم سے باہر نکل آئی تھی۔ اور اب اس کو زہرہ خانم پر بھی غصہ عود کر آیا تھا کہ اس نے ان سے کہا بھی تھا کہ میرے ساتھ چلیں مگر وہ نہیں آئی تھیں۔ ان کے ساتھ نہ آنے کی وجہ سے روپی کو اپنی عزت سے محروم ہونا پڑا تھا۔ کم عمر تھی لٹاڑی تھی اور نہ سمجھ جاتی وہ سب کچھ جانتی تھی جو اس کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اس لئے ساتھ نہیں آئی تھی۔ بہر حال کافی ساری رہداریاں گھومنے کے بعد اس نے زہرہ خانم کا کمرہ تلاش کر ہی لیا۔ وہ دروازہ کھل کر روم میں داخل ہوئی تو زہرہ خانم صوفے پر لیٹے لیٹے سو رہی تھی۔ روپی کچھ دیر کھڑی ان کو دیکھتی رہی پھر ان کے پیروں کی طرف بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ضبط کے باوجود یہ آنسو خود بخود آنکھوں سے بہہ بہہ کر باہر آ رہے تھے۔

پہلے تو زہرہ خانم سوتی بن گئی کیونکہ وہ ایک تجربہ کار عورت تھی۔ سمجھ گئی تھی کہ حاجی اپنی خواہش پوری کر کے سو چکا ہے جو روپی ان کے پاس واپس آئی ہے۔ پہلے تو جان بوجھ کر سوتی بنی رہی مگر کب تک۔ جب روپی نے رونے دھونے کا سلسلہ جاری رکھا تو جو نکلنے کی ادا کاری کرتی ہوئی بڑبڑا کر اٹھی اور جلدی سے روپی کی جانب لپکتے ہوئے لہجے میں محبت بھر کر پوچھا۔

”ارے ارے روپی بیٹی کیوں رو رہی ہو۔“ مگر روپی ان کو جواب دینے کے بجائے روتی ہی۔ یہ دیکھ کر زہرہ خانم نے اس کو کھینچ کر گلے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہوا میری بچی اس طرح رو کیوں رہی ہو مجھے بتا۔ میں تو تمہارے جاتے ہی سو گئی۔ سارا وقت وہاں سٹوڈیو میں بیٹھ بیٹھ کر میں بری طرح تھک چکی تھی۔ آخر بوڑھی عورت ہوں۔ بتاؤ کیا ہوا؟ کب واپس آئی؟ ارے کہیں انہوں نے فلم سے جواب تو نہیں دیدیا جو تم یوں رو رہی ہو۔“ انہوں نے بنتے ہوئے پوچھا۔

”کاش کہ ایسا ہوتا۔ وہ مجھے فلم سے جواب دے دیتے۔ مگر انہوں نے۔۔۔۔۔“ روپی اور بھی شدت سے رونے لگی۔

”ارے اگر انہوں نے فلم سے انکار نہیں کیا تو پھر ایسا کیا ہوا کہ تم رہی ہو؟ کچھ پتہ تو چلے؟“ زہرہ خانم نے پوچھا۔



”انہوں نے..... انہوں نے.....“ روٹی پتکیوں کے درمیان اتنا کہہ کر پھر رونے لگی۔ زہرہ خانم اس کذاتی نقصان اور صدمے کو سمجھ رہی تھی اور جب روٹی خوب جی بھر کر رو چکی تو پوچھا۔

”اب بتاؤ کیا کیا انہوں نے؟ کیا کہا انہوں نے؟“

”آپاجی انہوں نے میری عزت..... بات پوری کئے بغیر وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

”ہائے میں مر گئی۔ ہائے یہ یہ کیسا ظلم ہو گیا؟ یہ کیا قیامت توڑی انہوں نے معصوم بچی پر؟ کاش کہ میں تمہارا کہاں کر تمہارے ساتھ چلی جاتی۔ پر مجھے کیا معلوم تھا وہ ذلیل بڑھا کھوسٹ ایسا کرے گا۔ ارے تمہاری عمر کی تو اس حرام زادے کی پوتی نواسی ہوگی۔ اس کو شرم نہ آئی تمہارے ساتھ یہ ظلم کرتے ہوئے۔“ وہ روٹی کو بہلانے کیلئے حاجی سردار کو برا بھلا کہتی رہی۔ پھر ڈرائیور کے روم کا نمبر ملایا جو سردار صاحب کا ملازم روٹی کے سردار صاحب کے روم میں جانے کے بعد ان کو دے گیا تھا۔ اور جاتے ہوئے کہہ گیا تھا۔ ”حاجی صاحب کہتے ہیں صبح تک رکتا چاہیں تو خوش آمدید۔ اگر جانا ضروری ہو تو ڈرائیور کفون کر کے بلا لیجئے گا۔ وہ آپ کو گھر چھوڑ آئے گا۔“ زہرہ خانم نے اس کمرے میں رکھفون سے نمبر ڈائل کئے اور اس کی آواز سنتے ہی فوراً گاڑی نکالنے کا کہتے ہوئے روٹی کو لے کر پورچ کی جانب چل دی۔ ان کے ہاں پہنچنے سے پہلے ہی ڈرائیور ہاں پہنچ چکا تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور ان کے بیٹھتے ہی دروازہ بند کر کے خود سیئرنگ پر آ بیٹھا۔ پھر گاڑی سٹارف کرتے ہوئے ڈرائیور نے روٹی کو بغور دیکھا۔ وہ زہرہ خانم کے ساتھ بیٹھی ابھی تک رو رہی تھی۔ ڈرائیور کو اس کے رونے پر حیرت تھی۔ کیونکہ یہ پہلی لڑکی تھی جو رو رہی تھی۔ ورنہ لڑکیاں تو حاجی سردار کی خواہش اور خوشی پوری کرنے کے بعد یوں اٹھلاتی اور مسکراتی ہوئی ان کے روم سے باہر آتی تھیں جیسے جتنا نہیں کتا بڑا کارنامہ انجام دے کر آ رہی ہوں۔ اس نے سوچا۔ شریف خاندان کی لگتی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر فلم لائن میں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کے بعد وہ ان کو ان کے گھر کے باہر اتار کر بیگنے کی جانب روانہ ہو گیا۔ چونکہ انہوں نے ان کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب سورج طلوع ہو رہا تھا۔ زہرہ خانم کو بہت زور کی نیند آ رہی تھی۔ وہ روٹی کا ہاتھ تھام کر اندر آئی اور اندر آتے ہی پوچھا۔

”اپنے بیڈ روم میں چلی جاؤ گی یا میں بھی تمہارے ساتھ تمہارے بیڈ تک چلوں۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھامے تھامے محض رسمی طور پر پوچھا۔

اور پھر وہ ان کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے بیڈ روم کی جانب چل دی۔ زہرہ خانم چند لمحے وہی کھڑی اس کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچتی رہی پھر سر جھٹک کر اپنے روم میں چلی آئیں۔ پہلے ڈریس چنج کیا پھر اپنے بیڈ پر لیٹ گئیں۔ سارے دن رات کی چٹکی ہوئی تھیں۔ بیڈ پر لیٹتے ہی نیند نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

ادھر روٹی نے اپنے روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا۔ پھر ڈریس چنج کئے بغیر ہی بیڈ پر اوندھ منہ لیٹ کر پوری شدت سے رونے لگی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ فلم میں کام نہیں کرے گی۔ صاف صاف ارم آپی اور آپا کے سامنے انکار کر دیے گی۔ ورنہ یہ بڑھا کتا جب جی چاہے اس کو لوٹ کھسوٹ لیا کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ سو گئی تھی۔ وہ بھی اس وقت شدید تھکن کا شکار تھی۔ سارا دن تو کیا اس کی ساری رات بھی ہری گزری تھی۔

ابھی وہ سو رہی تھی جب دروازہ ٹوک ہوا۔ روٹی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ملگنی اندھیرا کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ نجانے کب سے مسلسل اس کے کمرے کا دروازہ ٹوک کیا جا رہا تھا۔ کچھ دیر یہ دسک سختی رہی۔ اٹھنے کا موڈ بالکل نہیں تھا۔ سارا جسم ابھی تک تھکن کی زد میں تھا۔ مگر پھر اٹھنا پڑا۔ پہلے روم کی لائٹ آن کی پھر دروازہ کھولا۔ صرف ارم کرن بلکہ ساتھ میں پوی اور زہرہ خانم بھی سب کھڑے تھے۔ سب بہت پریشان تھے۔ روٹی کو دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی اور ارم نے اس کے روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”اگر تم ایک منٹ اور دروازہ نہ کھولتی تو ہم سب نے مل کر تمہارے روم کا دروازہ توڑ دیتا تھا۔ کیا ہوا تمہارے ساتھ جو ابھی تک سو رہی ہو؟“ یہ بات سنتے ہی روٹی نے پہلے آپا کو دیکھا۔ انہوں نے ابھی تک ارم آپی کو کچھ نہیں بتایا جبکہ اس پر رات ایک قیامت آ کر گزری تھی۔ پھر ارم کو دیکھا مگر چپ رہی کہ روم کا اندر پوی بھی موجود تھا۔

”کیا ہوا بھئی یوں کیا دیکھ رہی ہو؟“ ارم نے پوچھا اور روٹی منہ سے کچھ بھی کہے بغیر ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ اپنی ہمدرد اور بڑی بہن سمجھ کر اپنا دکھ ہلکا کرنے لگی تھی۔

”ارے ارے کیا ہوا؟“ کوکہ آپا اس کو ساری سٹوری سنا چکی تھی اور اس کو خود بھی معلوم تھا جو اس کے ساتھ ہونا تھا۔ اسی لئے وہ رسم افتتاح میں شامل نہ ہوئی تھی۔ مگر حیرانی کا اظہار ضروری تھا۔ اس کا روم سے لپٹا دیکھ کر زہرہ خانم نے پوی کو کمرے سے جانے کا اشارہ کیا۔

پوی روٹی کو روتے دیکھ کر بے چین ہو رہا تھا۔ ماں کے اشارے پر ضبط کرتا ہوا روم سے باہر چلا گیا تو زہرہ خانم نے ارم سے کہا۔



”میں بھی تو ابھی ابھی اٹھی تھی اور پھر وہاں بھی موجود تھے اس لئے مجھے تمہیں یہ سب بتانے کا موقع نہیں ملا۔ ارے وہ حاجی سردار بڑا خراب اور بد معاش بندہ نکلا۔ ارے اس نے رات روپی کی عزت خراب کر دی۔ میں تو سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ بے غیرت ایسا بھی کر سکتا ہے۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ ارم نے کہا۔ پھر روپی کو ساتھ لے کر ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر دوسرے ہاتھ سے روپی کے کھڑے بال سنوارتے ہوئے محبت سے کہا۔

”تو یہ روننا دھونا اس کی وجہ سے ہے۔ میں یہ کہوں گی جو ہونا تھا ہو گیا کو کہ برا ہوا۔ از حد برا ہوا مگر افسوس ہو گیا۔ سواب تم بولڈ لڑکی بنو۔ یہ روننا دھونا بند کرو۔ شہرت کیلئے بہت قیمت چکانی پڑتی ہے۔ بغیر قیمت کے یہاں کچھ نہیں ملتا۔ کچھ پانے کیلئے کچھ کھنا بھی پڑتا ہے۔ یہی دستور ہے اس دنیا کا۔ بھول جاؤ جو کچھ رات ہوا۔ شاباش اور خود کو سنبھالو۔“

روپی حیرانی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ بھلا عزت بھی کوئی چھوٹی موٹی یا عام چیز تھی کہ کھو گئی اور بھول جاؤ۔ عورت کی زندگی کا کوہِ نایاب ہوتا ہے۔ مگر وہ پھر ارم کو دیکھ رہی تھی جو کہہ رہی تھی۔

”سب کچھ بھول کر یہ کل ہونے والی رسم افتتاح کفو ٹوگراف دیکھو۔ کتنی خوبصورت اور یاری آئی ہیں تصویریں۔“ کہتے ہوئے ارم نے تصویریں اس کے سامنے رکھیں تو روپی نے دیکھے بغیر ان کو ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے نفرت اور غصے کے ساتھ کہا۔

”سوری آپ! مجھے نہیں دیکھنی یہ تصویریں۔ پرے کریں بلکہ ان کو پھاڑ دیں۔“

”کیوں۔۔۔؟“ اب کہ واقعی ارم نے حیرانی سے پوچھا۔

”آپ جی میں نے بہت سوچ سمجھ کر اب فلم میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر یہ تصویریں دیکھنے کا قاعدہ۔“ روپی نے ڈرتے ڈرتے ان کو کہہ دیا۔

”کیا کہا فلم میں کام نہیں کرو گی؟“ ارم نے چونک کر اس کو دیکھا۔

”جی آپ! مجھے نفرت ہو گئی ہے اس کام سے۔“ روپی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”روپی! کہا تو ہے جو ہونا تھا ہو گیا۔ جب گئی چیز واپس آئی نہیں سکتی تو پھر فضول میں افسوس کرنے یا رونے دھونے کا قاعدہ اس لئے لگڑیا! سب کچھ بھول کر شوٹنگ پر جانے کی تیاری کرو۔“ ارم نے ایک بار پھر روپی کو زبردستی اور محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جو بھی ہے آپ! اب ہر حل مجھے فلموں میں کام نہیں کرنا۔ آپ ہدایتکار نیاز صاحب کفون کر کے میری طرف سے صاف صاف انکار کر دیں۔“ روپی نے اب کھڑنے کے بجائے جرات سے کام لے کر صاف صاف انکار کر دیا۔

روپی کا یہ کھلا انکار سن کر سب حیرت سے اسے ٹکنے لگے اور دل میں سوچنے لگے اب کیا ہو گا۔ سوچ تو ارم بھی رہی تھی کہ اب کیا کرے پھر خود ہی ایک فیصلہ کرتے ہوئے خاص تندو تیز لہجے میں پوچھا۔

”فلم میں کام نہیں کرو گی تو پھر اور کیا کرو گی؟ یہ بتاؤ مجھے۔“

”کچھ بھی کر لوں گی مگر یاد رکھیں فلم میں کام ہرگز نہیں کروں گی۔“ روپی نے شدید نفرت سے کہا تو ارم نے گھور کر روپی کو تھوڑے غصے سے پوچھا۔

”مثلاً اور کیا کچھ کر لو گی۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔ تعلیم تمہاری شاید میٹرک بھی نہیں۔ ڈپلومہ کسی چیز یعنی ہنر کا تم نے نہیں لے رکھا کہ جاب کر لو پھر اور کیا کرو گی اور سنو اچھے برے لوگ تو ہر فیلڈ میں ہوتے ہیں۔ تم اپنا گھر چھوڑ چکی ہو۔ اکیلی لڑکی ہو۔ ایسے میں کس کس سے بچو گی۔ معاشرہ اتنا خراب ہو چکا ہے کہ بھی مردوں کا باطنی روپ ایک سا ہے۔ جو عورت کو ہاتھ لگا کر چھونے میں نا کام رہتے ہیں وہ آنکھوں سے اندر تک عورت کو چھو لیتے ہیں۔“ روپی حیرت سے دیکھ اور سن رہی تھی۔ ارم خاص لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”جو پیپر تم سائن کر کے آئی ہو ان کی اہمیت جانتی ہو؟ تمہارا انکار کی صورت میں نیاز صاحب ہم پر لاکھوں کے ہر جانے کا کس دائرہ کر دے گا اور کہاں سے آئے گا ہر جانے کا یہ لاکھوں روپیہ۔ آپ تو وہ پہلے پیسے بھی خرچ کر چکی ہیں جو حاجی سردار نے دیئے تھے۔ اب بولو کیا کہتی ہو۔“ ارم نے پوچھا۔ اور روپی کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا ہی نہیں۔ اپنا گھر چھوڑ چکی تھی اور ظاہر ہے جہاں رہنا تھا وہاں وہی کرنا مجبوری تھی جو وہ کہتے۔ وہ ارم آپ کی ایک ایک بات سمجھ گئی تھی اور مطلب اور مقصد بھی جان گئی تھی کہ وہ روپی سے کیا چاہتی ہیں۔

”بھول جاؤ وہ سب کچھ جو رات ہوا۔ یاد رکھنا اب تمہیں صرف فلموں میں ہی کام کرنا ہے۔ شاباش اور انکار نہیں کرنا۔“ ارم نے کہا اور پھر فوراً ہی اٹھ کر باہر چلی گئی۔ روپی نے کرن کو



دیکھا پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ یہ دیکھ کر زبرہ خانم جلدی سے اس کے قریب آئی مگر اس سے پہلے کرن اس کو گلے لگا چکی تھی۔ پھر بھی زبرہ خانم نے روپی کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے نرمی اور محبت سے کہا۔

”نارو میری بچی! نارو۔ تمہیں تو اپنی ارم آپ کے مزاج اور عادت کا پتہ ہے جب اس کو غصہ آتا ہے تو وہ میرا بھی لحاظ نہیں کرتی۔ دو منٹ میں ماں ہونے کے باوجود وہ بے عزت کر کے رکھ دیتی ہے۔ تم تو اس کی چھوٹی بہن ہو اور چھوٹی بہن کو بڑی بہن ڈانٹ بھی سکتی ہے مگر پھر بھی میں یہی کہوں گی کہ ارم نے تمہیں جو کچھ بھی کہا اس کو بھول جاؤ۔ میں اس کے ساتھ اب تمہاری بھی ماں ہوں۔ اگر تم فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتی تو ٹھیک ہے دفعہ کرو۔ ماں ہوں میں خود نیاز صاحب سے بات کر لوں گی۔ ارے بات کیا میں ان کے پاؤں پکڑ کر صاف کہہ دوں گی نیاز صاحب! میری بچی کے ساتھ بڑا ظلم ہوا۔ آپ کے حاجی صاحب کو شرم نہ آئی بچی کی عزت برباد کرتے ہوئے۔ میری بچی کا دل ہی اچاٹ ہو گیا ہے اس کام سے۔ میری بچی کو معاف کر دیں اور اپنی اس فلم کے لئے نئی لڑکی ڈھونڈ لیں۔ مجھے یقین ہے وہ میری بات مان لیں گے۔“ بات کرتے ہوئے وہ روپی کے کنٹریکٹ بھی نوٹ کرتی جا رہی تھیں۔ آخر میں بولیں۔

”بس ذرا بیسوں کا مسئلہ ہو گا کہ وہ میں خرچ کر چکی ہوں جب تو آئی تھی تو بیچاس ہزار کی تو تمہارے لئے شاپنگ کی تھی۔ خیر ان کا میں کسی نا کسی طرح بندوبست کر لوں گی مگر روپی بیٹی! تو یوں ناہ رویہ رکھو کہ مل کو کچھ ہوتا ہے کہ بیٹی کہا ہے تمہیں اور میری موجودگی میں روئیں تمہارے دشمن۔ ارم کو بھی میں خود سنبھال لوں گی بس اب چپ ہو جاؤ۔“ یہ سن کر روپی رونے سے تو چپ نہ ہوئی تاہم اس نے آہستگی سے کہا۔

”آپا جی پلیز! آپ آپ ارم سے کچھنا کہئے گا وہ ٹھیک کہتیں ہیں۔ نا میرے پاس تعلیم ہے نہ کوئی ہنر میں فلموں میں ہی کام کروں گی۔ یہ تو ہے نا اس کام میں جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“ زبرہ خانم کی باتوں نے اس پر اثر کیا تھا۔

روپی کی بات سن کر زبرہ خانم چند لمحے اس کو دیکھتی رہی۔ پھر کہا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔ میں نے تو کہا تھا میں نیاز صاحب کے پاؤں پکڑ کر ان کو راضی کر لوں گی اور تمہاری ارم آپ کو بھی۔“ بات کرتے ہوئے ہی وہ روم سے باہر نکل گئی۔ کرن وہیں تھی بلکہ ابھی تک روتی ہوئی روپی کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ ماں کے جانے کے بعد بولی۔

”اب رونا دھونا بند کرو ورنہ میں بھی رونا شروع کر دوں گی۔ یا ر! شہرت یونہی نہیں مل جاتی۔ آخر آپ نے بھی کچھ نہ کچھ قیمت چکانی ہو گی۔ پلیز کچھ غلط نہ میرے بارے میں سوچنا گھر والوں کے بارے میں جو بھی سوچو مجھے اعتراض نہیں مگر میری دوستی پر شک مت کرنا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے کاش کہ ایسا نا ہوتا۔ مجھے تمہارے دکھ اور صدمے کا احساس ہے۔ مگر افسوس میں تم کو تسلی دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی۔“

”مجھے معلوم ہے تم ہمیشہ سے میری اچھی دوست ہو۔“ روپی نے کہا تو کرن بولی۔

”اب رونا بند۔ دیکھو تو سہی آزر کے ساتھ تمہاری تصویریں کتنی پیاری آئی ہیں۔“ اور روپی محض کرن کی خاطر تصویریں دیکھنے لگی تھی۔ حالانکہ دل چاہ رہا تھا سب کی سب پھاڑ ڈالے۔

پھر کرن بھی اٹھ کر چلی گئی۔ حالانکہ وہ اس کو بھی ساتھ باہر لے جانا چاہتی تھی۔ مگر روپی کا تو جیسے رات کا دل ہی مر گیا تھا۔ اس نے باہر جانے سے معذرت کر لی۔ اور پھر کرن کے جانے کے بعد اس نے ان سب گھر والوں کے رویے پر غور کیا اور جب غور کر چکی تو آخر میں سوچا۔

ارم آپا ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ وہ کر بھی کیا سکتی ہے۔ نہ تعلیم ہے۔ نہ ہنر اور پھر ارم آپا تو کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتی۔ مجھے تو جو کچھ بھی انہوں نے کہا نرمی سے کہا اور پھر کون ساری زندگی کسی کو بستر پر بٹھا کر کھانا ہے۔ اپنے لئے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ ویسے بھی اب ان لوگوں کے سوا میرا ہے ہی کون۔ میں اپنا سارا خاندان چھوڑ چکی ہوں۔ مگر اب ان کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ سبھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ ابو میرے سکے باپ سے زیادہ شفقت و محبت سے میرے ساتھ پیش آتے ہیں۔ آپا نے ماں کے پیار کی تشنگی مٹا ڈالی۔ کرن نے بہن کی اور ارم آپا ذرا غصے والی ہیں صرف۔ ان کا موڈ خراب ہو جائے تو ان کا رویہ سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور پوئی وہ میرا دوست بنا ہوا ہے۔ اس رات جو بدترین لڑائی اس نے میرے ساتھ کی اس کی اس نے باقاعدہ معافی مانگ لی ہے۔ پھر میری عزت جانے میں ان کا کیا قصور۔



گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنا گھرا یعنی مرضی سے تو نہیں چھوڑا تھا۔ ہاں ماں کو جو خط لکھا تھا۔ وہ شاید بہت غلط بات تھی۔ میرا خط پڑھ کر ماں نے یقیناً مجھے بہت بددعائیں دی ہوں گی جس کی وجہ سے میری عزت لٹ گئی، لٹی عزت کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس بڑھے بدمعاش کی اس ذالیت اور بے غیرتی پر۔ دوسری جانب ہال کمرے میں سب ہی اس وقت جمع تھے۔ سب ہی چپ چاپ کسی سوچ میں گم تھے۔ بہر حال زہرہ خانم نے ہی اس گمبھیر خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی اور رونے میں پہل کرتے ہوئے تنبیہی انداز میں ارم سے کہا۔

”تم رو بی کو یہاں سے بھی گائیڈ کر سکتی تھیں۔ مگر تم نے اس کے ساتھ بہت نامناسب رویہ اختیار کیا۔ بلکہ سخت لب و لہجہ اختیار کیا۔ جانتی ہو تمہارا اس رویے سے متغیر بھی ہو سکتی ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس کو آئندہ قابو میں رکھنے کیلئے ابھی سے یہ لب و لہجہ اختیار کرنا بہت مجبوری اور ضروری تھا۔ اگر میں یہ رویہ اختیار نہ کرتی تو رو بی نے کبھی فلموں میں کام کرنے کی حامی نہیں بھرتی تھی۔ وہ بہر حال ایک شریف خاندان کی بیٹی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کس وقت کیا کرنا ہے اور کس سے کیا کہنا ہے۔ کس لب و لہجے میں کہنا ہے۔ میں نے جو بھی کیا، مطلب کہا خوب سوچ سمجھ کر کہا۔“ ارم نے مسکرا کر ماں کو دیکھتے ہوئے وضاحت کی تو بھی مسکرانے لگے۔ سوائے کرن کے۔

”بہر حال اب اگر تم اپنے رویے کی اس کے ساتھ معذرت کرو تو شاید مزید اچھا ہو جائے۔“ ماں نے ارم کو شورہ دیا۔

”معذرت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ ارم نے ہلکی نا کواری سے کہا۔ ”تاہم میں اس کو بہالوں گی۔ آپ میرے حوالے سے بے فکر رہئے۔“ حاجی سردار نے جو کیا تھا ان کو اس پر حیرت نہیں تھی۔ اس فیلڈ میں ایسی ہوتا تھا۔

کچھ دن بعد رو بی کی شوٹنگ کا قاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ حاجی سردار اپنی اس فلم کو جلد از جلد مکمل کر کے عید الفطر پر عام نمائش کیلئے پیش کرنا چاہتے تھے۔ زہرہ خانم ہر روز رو بی کو خود ساتھ لے کر سٹوڈیو جاتی تھی۔ عزت لٹنے کے بعد جب رو بی کا سٹوڈیو کے فلور پر حاجی سردار سے سامنا ہوا تو وہ رو بی کو دیکھتے ہی اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرایا تھا۔ رو بی نے مارے نفرت کے منہ پھیر لیا۔ پھر اس بدمعاش بڑھے کی آواز پر چونکی جو ہدایتکار نیاز کو ہستے ہوئے بتا رہا تھا۔

”فلم کی رسم افتتاح والی رات بہت پر لطف اور یادگار رہی، بہت انجوائے کیا میں نے۔“

نیاز صاحب نے جواب میں صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا کہ سیٹ پر اس وقت اور لوگ بھی موجود تھے۔ زہرہ خانم حاجی کی ذومعنی باتوں کو سمجھ رہی تھی۔ رو بی کے چہرے پر لہجہ بہ لہجہ بھیلی نفرت بھی دیکھ رہی تھی۔ مگر چپ تھی اور پھر ہدایتکار کے کہنے پر اس کو سیک اپ روم میں لے گئی تھی۔

کافی دن سٹوڈیو کے اندر لگے سیٹ پر ہی شوٹنگ ہوتی رہی۔ پھر آؤٹ ڈور شوٹنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس دن رو بی نے فلم کی شوٹنگ کیلئے یونٹ کے ساتھ سوات جانا تھا ارم آپلی نے اس کو سمجھاتے اور پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

”کاش کہ میں تمہارے ساتھ جاسکتی۔ سوات کے موسم کو بھی انجوائے کرتی اور شوٹنگ بھی دیکھتی۔ مگر میری نئی سیریل کی شوٹنگ دن رات ہو رہی ہے اس لئے میں نہ جاسکوں گی۔“ یہ سن کر کرن نے کہا تھا۔ آپلی چھٹیاں ہو چکی ہیں آپ نہیں تو میں تو جاسکتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو پلیز انکار مت کیجئے گا۔“ اور ارم نے رو بی کو ساتھ جانے کی اجازت دیدی تھی۔

جانا تو پوی بھی چاہتا تھا۔ مگر زہرہ نے ارم کے منع کرنے سے پہلے ہی خود انکار کر دیا تھا۔ اچھی طرح سمجھتی تھی وہاں صرف رو بی کا ایک روم ملے گا۔ اور وہ پوی کا اپنے روم میں سونا پسند نہیں کرے گی۔ کرن تو اس کی دوست تھی اور پھر لڑکی بھی تھی اور زہرہ کو تو ساتھ جانا ہی تھا۔

فلم کے ہیر و آزر کو رو بی ذاتی طور پر بے حد پسند آئی تھی اس کو دس برس ہو چکے تھے فلم انڈسٹری جو ان کئے۔ اس وقت آزر کا شمار ملک کے مشہور اور نامور ہیر وز میں ہوتا تھا بلکہ مصروف ترین ہیر و تھے۔ مگر ابھی تک غیر شادی شدہ تھے عمر بھی ابھی ان کی زیادہ نہیں تھی۔ وہ رو بی کو ہدایتکار سے زیادہ خود گائیڈ کرتے تھے۔ ان کی ایک آدھ فلم چھوڑ کر ہر فلم ملک گیر کامیابی حاصل کر رہی تھی۔ رو بی ان کا چھی لگی تھی۔ وہ بہت شرمیلی لڑکی تھی مگر آزر کی وجہ سے وہ ڈراما ہی ہولڈ ہونے لگی تھی۔

وہاں سے بہت اچھے طریقے اور پیار سے سمجھاتے تھے کہ یہ جو کچھ ہم کرتے ہیں۔ یہ ہدایتکار یا فلم ساز کی خواہش نہیں ہوتی بلکہ کہانی کی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ اب اگر فلم لائن جو ان کر



ہی لی ہے تو یار ذرا سی بولڈ بھی ہو جاؤ اور روپی مان گئی تھی۔

سوات میں روپی کا پہلا دن بہت اچھا گزرا تھا۔ کرن بھی ساتھ تھی۔ اور شوٹنگ سٹوڈیو کے فلور پر لگے سیٹ کے بجائے اوپن پہاڑوں پر ہو رہی تھی۔ روپی کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پھر شوٹنگ کے دوران ہی بارش شروع ہو گئی تو ان سب کو اپنا سارا سامان سمیٹتے ہوئے واپس ہوئے بھاگتا پڑا تھا۔ سارا پونٹ ہی ہستے مسکراتے موڈ کے ساتھ واپس آیا تھا۔ ہدایتکار البتہ پریشان تھا۔ اس طرح اس کی دوسری فلموں کا شیڈول متاثر ہو سکتا تھا۔ جن کی ہدایتکاری وہ دے رہا تھا۔ مگر یہاں جو کام مکمل کرنے آیا تھا مکمل چھوڑ کر واپس نہیں جاسکتا تھا۔ بس دعا کر سکتا تھا کہ موسم بہتر ہو جائے۔

ادھر کرن اور روپی بہت خوش تھیں۔ حالانکہ خوش تو صرف کرن تھی۔ گھومنے کا موقع ملا تھا اور روپی افسردہ ہو کر اس کی خوشی خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ حالات سے کمپرومیز کرتی جا رہی تھی۔ اس میں آزر کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ وہ رات کا کھانا کھا کر ابھی تینوں لیسٹی ہی تھیں کہ دروازہ کھولا۔ زبردہ خام خوراک ٹھہ کر باہر گئیں۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے روپی کو آواز دے کر کہا۔

”روپی نیاز صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔ کہانی پر کچھ بات کرنی ہے۔“

ان کی بات سن کر روپی خاموشی سے اٹھی اور چپل پہن کر باہر آ گئی۔ آج اس نے زبردہ خام کو ساتھ چلنے کا نہیں کہا تھا۔ رات کے کھانے پر نیاز صاحب نے آزر اور اس کو کہا تھا کھانے کے بعد میرے روم میں آنا۔ کہانی پر بات کرنی ہے۔ وہ جانے لگی تو زبردہ خام نے خود ہی چلا کی سے پوچھا۔

”بئی میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں تمہارے۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ آپ دروازہ بند کر لیں۔“ روپی نے کہا اور روم سے باہر چلی آئی۔

دروازے کی چابی وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس کو وہاں دیر بھی ہو سکتی تھی۔ وہ لڑکے کے ساتھ نیاز صاحب کے روم میں آئی تو وہاں صرف آزر ہی نہیں چند اور فنکار بھی موجود تھے۔ جو اس فلم میں کام کر رہے تھے۔ روپی کو دیکھتے ہی سب نے مسکرا کر وہلک کہا۔ اور آزر نے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سو گئی تھی جو خود نہیں آئی۔ ویٹ کرنے کے بعد لڑکا بھیجنا پڑا۔“

”میں دراصل بھول گئی تھی۔“ روپی نے شرمندگی سے کہا۔ نیاز صاحب نے اس کو اپنے پاس بیٹھنے کے لئے جگہ دی۔ پھر کہانی پر کافی دیر تک ڈسکس ہوتی رہی۔ پھر بات ختم ہو گئی تو سب سے پہلے اٹھ کر جانے والا آزر تھا۔ اس نے مسکرا کر سب کو شب بخیر کہا اور چلا گیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے باقی لوگ بھی اٹھ کر چلے گئے تھے۔ جانے کیلئے تو روپی بھی آزر کے ساتھ ہی اٹھی تھی۔ مگر نیاز صاحب نے بہت آہستگی سے اس کو کہا تھا۔

”تم ابھی رکو مجھے تم سے چند اور باتیں کرنی ہیں۔“ یوں روپی رک گئی تھی اور باقی سب لوگ چلے گئے تھے۔ اب وہ تنہا نیاز صاحب کے پاس بیٹھی تھی۔ دل تھوڑا سا گھبرانے لگا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں آج یہ نیاز صاحب بھی حاجی سر دار والی حرکت تو نہیں کرنا چاہتے۔ مگر نیاز صاحب کہانی کا مسودہ سامنے رکھے محویت سے مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ جیسے روم میں روپی کی موجودگی کو بھول چکے تھے۔ یہی سوچ کر روپی نے پوچھا۔

”سر کیلیات کرنی ہے آپ نے۔ مجھے سخت نیند آرہی ہے۔“ روپی کی بات سن کر نیاز صاحب نے یوں چونک کر چہرہ ڈالنا کر اس کو دیکھا جیسے اب تک روپی کی موجودگی سے بے خبر ہی رہے تھے۔ پھر ایک گہری سانس لے کر چشمہ اتار کر سامنے میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں نیند آرہی ہے جبکہ میرا پروگرام کچھ اور ہے۔“

”کیسا پروگرام سر؟“ روپی نے کچھنا سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”بتانا ہوں۔“ نیاز صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی روپی بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ نیاز صاحب نے پہلے جا کر دروازے کو لاک لگایا پھر مڑ کر مسکراتی نظروں سے روپی کو دیکھنے لگے۔ روپی ان کے اس طرح دیکھنے سے زروں ہو گئی۔ پھر گھبرا کر دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”سر! یہ آپ نے دروازہ کیوں بند کر دیا۔“

نیاز صاحب جواب دیئے بغیر روپی کے قریب آئے۔ پھر کہا۔ ”روپی! میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تم فلمی لائن کی لڑکی نہیں ہو۔ تمہیں اندسٹری میں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اب بھول کر



تم نے فلمی لائن جوائن کر لی ہے پھر تم پسند کرو یا نا کرو تمہیں وہی کرنا ہے جو یہاں کا دستور ہے۔ آؤ میرے ساتھ بستر میں۔“  
 ”کیا مطلب؟“ روٹی ہلکائی اور دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”اب تم اتنی بھی چھوٹی نہیں ہو کہ اس روم میں اپنی موجودگی اور بستر کا مطلب نہ سمجھ سکو۔“ نیاز صاحب نے کہا۔ پھر روٹی کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 ”سر میں شریف لڑکی!“ روٹی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ نیاز صاحب ہنس دیئے۔ پھر کہا۔

”شکر ہے تم نے مجھے انکل نہیں کہا۔ ویسے اگر تم مجھے قادر بھی کہتیں تو میں برا نہ منانا۔ میں نے کوٹاہ بن جانا تھا۔ حاجی سردار بہت بے ذوق بے رحم انسان ہے جس نے تمہیں تھپڑ مارا مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اپنے بستر پر لے آئے۔ اور روٹی پچھٹی پچھٹی نگاہوں سے نیاز صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ حاجی سردار ساٹھ برس کا تھا تو نیاز بچپن کے قریب تھا۔ روٹی نے سوچا تھا۔

چلو جو ہونا تھا ایک بار ہو گیا۔ مگر وہ سب آج دوبارہ ہونے لگا تھا۔ اس نے سوچا وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ روٹی کی جانب مڑے پھر اس کی آنکھوں میں آئے آنسو دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”اب یہ آنسو بے کار ہیں۔ یہ فلموں میں آنے سے پہلے سوچنا تھا۔“ یہ کہیے کرو اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ رات کا پچھلا اپہر تھا۔ نیاز صاحب سگریٹ سلگا رہے تھے اور روٹی ایک طرف پڑی ضبط کے باوجود آنسو بہا رہی تھی کہ یہ اس کا اختیار کی بات نہ تھی۔ نیاز صاحب نے روتی ہوئی روٹی کو دیکھا اور تنہی انداز میں کہا۔

تم جس نگری جن لوگوں میں آئی ہو ان کے نزدیک تمہارے ان آنسوؤں کی اہمیت پانی سے زیادہ نہیں۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ میں بے مول ہو کر بہنے سے روکو۔ ضبط کرنا سیکھو۔ اس فیلڈ میں کیا اس جیسی ہر فیلڈ میں مرد کے نزدیک عورت کے جسم کی تو اہمیت ہوتی ہے مگر آنسوؤں کی نہیں۔ تم جسم کے بھوکے کسی بھی مرد کو آنسوؤں سے متاثر نہیں کر سکتیں پھر اپنے آپ کو بے مول کرنے کا قائدہ؟ اب تم اپنے روم میں جا سکتی ہو۔ اور سنو یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ یہاں اس روم میں جو کچھ ہوا اسے کہانی بنا کر دوسروں کو سنا کرنا خود کو مزید بے عزت کرنا اور نہ ہی دوسروں کو پریشان کرنا۔ یہ جو کچھ میں نے کیا یا کہا۔ زہرہ خان کو کیا کرن کو بھی مت بتانا۔ جیسے حاجی سردار کے بارے میں درود کر بتایا تھا۔ زہرہ خانم حاجی کے رویئے کے حوالے سے مجھ سے شکایت کر رہی تھی۔ ہر بات سب کو بتانے کیلئے نہیں ہوتی کچھ باتیں قبر میں ساتھ لے جانے کیلئے ہوتی ہیں۔ اٹھو اور اب جاؤ اور جب تک عکسبندی کے سلسلے میں ہم سوات میں ہیں تم خود ہی ہر رات میرے روم میں آ جایا کرنا۔ مجھے کانہ بلانے کیلئے بھیجنا پڑے۔ کبھی؟“ آخر میں ان کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

روٹی اٹھی اور پھر آنسو صاف کرتی ہوئی اپنے روم میں چلی آئی۔ وہ جب روم میں داخل ہوئی کرن اور زہرہ خانم کبری نیند سو رہی تھیں۔ روٹی پہلے دھاش روم گئی ڈریس چھینج کیا پھر باہر آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ روم میں ڈبل بیڈ موجود تھا۔ مگر زہرہ خانم زمین پر گدا بچھائے سو رہی تھی اور کرن بیڈ پر۔ روٹی نے تو زہرہ خانم سے کہا تھا وہ بھی بیڈ پر ہی سو جایا کرے کہ بیڈ خاصا بڑا تھا۔ مگر زہرہ نے کہا تھا۔

”اس طرح مجھے بے آرامی ہوگی۔ میں زمین پر سکون سے سوؤں گی۔“ اور روٹی نے ان کی بات مان لی تھی۔

حالانکہ وجہ کچھ اور تھی۔ زہرہ خانم کو معلوم تھا وہاں لاہور میں حاجی سردار تھا تو یہاں نیاز۔ وہ روٹی کو ضرور بلائے گا۔ پھر وہ روتی ہوئی واپس آئے گی تو میں کیسے کن الفاظ میں تسلی دوں گی؟ اس لئے وہ زمین پر سوئی تھی۔ اگرچہ وہ اس وقت جاگ رہی تھی۔ مگر روٹی کو دیکھ کر سوئی بن گئی۔ یہی نہیں روٹی کی عزت لئے کی زہرہ نے حاجی سردار سے ایک ایسی رقم لی تھی اور جب نیاز نے ان سے کہا رات کو روٹی کو میرے روم میں بھیجنا تب زہرہ خانم نے ان کو ساری بات بتانے کے بعد کہا تھا۔

”لڑکا بھیج کر خود بلانا اور پھر اچھی طرح سمجھا کر واپس بھیجنا تا کہ وہ بعد میں مجھے رو کر پریشان نہ کرے اور باقی ساری بات بھی سمجھا کر اپنے روم میں آئی تھی۔ یہ زہرہ کی باتیں ہی تھیں جن کی وجہ سے اپنی خواہش پوری کرنے کے بعد نیاز نے کھل کر روٹی کو سمجھایا تھا۔ اب جب روٹی ان کو اٹھائے بغیر بیڈ پر لیٹ گئی تو وہ سمجھ گئیں نیاز کی باتوں کا روٹی پر اثر ہو چکا ہے اور وہ مطمئن ہو گئی۔“

روٹی ڈرامی بھی آواز پیدا کئے بغیر بیڈ پر لیٹی تھی کہ کسی کی نیند خراب نہ ہو۔ اس کے ساتھ تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ مزید اپنے آپ کو سوا کرنے کا قائدہ۔ مگر تھی تو چھوٹی۔ چوٹ پر پھر چوٹ لگی تھی۔ لیتے ہی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ چپکے چپکے بے آواز روتی رہی کہ کسی کے سامنے نہیں مگر تنہائی میں تو آنسو بہائے جاسکتے تھے۔ بلکہ وہ تو خود بخود ہی موتی بن کر



آنکھوں سے گرتے جا رہے تھے ضبط کرنے کے باوجود پھر یونہی روتے روتے وہ سو گئی تھی۔

وہ لگ ایک ہفتے کا پروگرام بنا کر آئے مگر بارش کی وجہ سے یہ سلسلہ کچھ لمبا سا ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے حاجی سردار خود بھی قلمی یونٹ سے آ ملے تھے۔ وہ رات کو اس وقت آئے تھے جب سب لگ رات کا کھانا کھا کر جا چکے تھے۔ روٹی نیاز صاحب کی ہدایت کے مطابق جب رات کو ان کے روم میں آئی تو وہاں نیاز صاحب کے پاس حاجی سردار بھی بیٹھے تھے۔ روٹی ان کو دیکھ کر تھوڑا گھبرا گئی اور وہیں دروازے کے قریب ہی رک گئی۔ یہ دیکھ کر نیاز صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آؤ آؤ روٹی رک کیوں گئی۔ یہ فلم ساز حاجی سردار صاحب ہیں کیا تم نے پہچانا نہیں۔“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ روٹی کو نہ حاجی سردار بھولا تھا نہ اس کا تھپڑ۔ وہ درندہ تھا جس نے پہلی بار اس کو اس کی عزت سے محروم کر کے شریف لڑکی سے طوائف بنایا تھا۔ اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کتوں کو مار دیتی۔ اس وقت اس کا آگے جانے کو بل نہیں چاہتا تھا۔ مگر مز کر دیا پس نہیں جاسکتی تھی۔ اس لئے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مرقدوں سے ان کے پاس آ کر رک گئی۔ حاجی سردار نے چہرہ اٹھا کر روٹی کو دیکھا۔ پھر کہا۔

”نیاز بہت انجوائے کر لیا تم نے آج یہ میرے ساتھ جائے گی۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اٹھے اور روٹی کا ہاتھ تھام لیا۔ روٹی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ نیاز صاحب نے لفر انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے زیادہ تم پر حاجی سردار کا حق ہے کہ یہ نہ ہوتے میں نہ ہوتا۔ ان کے پیسوں سے فلم بن رہی ہے۔ آج تم ان کے ساتھ جاؤ۔ ہاں اگر جلدی فارغ ہو جاؤ تو میرے روم میں آ جانا۔“

نیاز کی بات سن کر روٹی نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی اور حاجی سردار یونہی اس کا ہاتھ تھام کر اپنے روم میں لے آئے۔ پھر اپنے روم میں آ کر انہوں نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔

اس رات پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا اور حقیقت تمہارے نکل کہنے پر مجھے غصہ آ گیا تھا اور میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ مجھے افسوس ہے۔ ورنہ عورت تو صرف یہاں کیلئے بنائی گئی ہے۔ اب میں تمہیں کبھی تھپڑ نہیں ماروں گا۔

روٹی نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ مگر ان کے روم سے واپسی پر نیاز کے روم میں جانے کے بجائے وہ اپنے روم میں آئی اور ڈریس چھینج کرنے کے بعد بستر پر لیٹ کر روتے ہوئے سو چا کتا سو پر تو کسی کا اختیار نہیں۔

جواس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ خود اس کے گھر والے لایا بلال اور بلال روٹی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ کاش تم میری زندگی میں نہ آتے۔ تم نے خود ہی مجھے اپنی جانب متوجہ کیا اور جب میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی تو تم نے اپنا رویہ بدل لیا۔ بات اگر تمہارے بدلے روئے تک ہی رہتی تو ٹھیک تھا۔ مگر تم نے تو روجی کو سُوری بنا کر پہلے مجھ سے میرا خاندان چھیننا پھر میری محفوظ پناہ گاہ اور اب عزت بھی میری مجھ سے چھین لی گئی ہے۔ یہ سب صرف اور صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔

ہاں ہاں میری عزت لئے کے قاتل تم ہو صرف تم۔ بلال میں پوری دنیا کو معاف کر سکتی ہوں مگر تمہیں نہیں۔ اللہ کرے زندگی بھر تم کو خوشی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ میرا گھر چھیننے والے تم کو بھی عمر بھر اپنا گھر آباد کرنا نصیب نہ ہو۔ میری راتوں کو بے آرام بنانے والے۔ پرسکون نیند سونا تمہیں بھی نصیب نہ ہو۔ کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے مجھے تم سے محبت کرنے کی۔ کاش کہ تم میری زندگی میں کبھی نہ آتے۔ مجھے عمر بھر کی تنہائی سونپنے والے اللہ کرے محفلیں تمہارا مقدر کبھی نابینا کیں۔ مجھے میرے خاندان سے جدا کرنے والے اپنے خاندان میں مل جل کر بیٹھنا تمہیں کبھی نصیب نہ ہو۔ تم کبھی نا جان سکو گے تم نے روجی کو ساری سُوری سنا کر ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کو محرم بنا کر کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ تم لوگوں کو یونہی صدا تبلیغ کرتے رہو گے مگر اس کے باوجود یہ ایک گناہ ہی تمہاری ان سب نیکیوں سے بھاری ہے جو تم نے انجانے میں ہی سہی مگر کیا تو ہے۔ وہ روٹی رسی بلال کو بددعا میں دیتی رہی پھر یونہی بددعا میں کرتے کرتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ سوات کی ہر رات سوتے وقت وہ اسی کیفیت سے دوچار ہوتی رہی۔

ایک ہفتے کے بجائے وہ دو ہفتے بعد واپس لاہور آئے اور باقی ماندہ فلم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی کبھی جب ارم کے بجائے وہ وزیرہ خانم کے ساتھ سٹوڈیو جاتی تو پوی بھی ساتھ چلا جاتا۔ چھٹی والے دن کرن بھی اس کی شوٹنگ دیکھنے ساتھ جاتی تھی۔ وہ سب گھر والے بے حد خوش تھے۔ اور خوش تو بظاہر روٹی بھی تھی۔ مگر اندر کی حالت اب اندر تک ہی رہتی تھی۔ ہونٹوں پر ہمیشہ کیلئے چپ کتنا لے لگ گئے تھے۔



سوات میں جو چند روز اس نے گزارے تھے وہ سب اس کے اندر ہی رہا تھا۔ سوات میں زہرہ خانم تو کیا اپنی دوست کرن کو بھی اس نے کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا تھا۔ نانی لاہور واپس آ کر آپ کو بتایا تھا۔ نیاز صاحب نے جو اس کو سمجھایا وہ اس نے اپنے دل پر لکھ لیا تھا کہ خود کوروا کرنے کا قاعدہ۔

تاہم اس کو جو یہ خطرہ تھا کہ لاہور آ کر بھی ہدایت کار اس کو رات میں طلبنا کرنے لگے تو راپا نہیں ہوا تھا۔ ہاں حاجی سردار کبھی کبھار جب رات کی شوٹنگ ہوتی تھی تھوڑے نام کیلئے اس کو ساتھ ضرور لے جاتا تھا۔ اور اب وہ حاجی سردار کے ساتھ جاتے ہوئے زہرہ خانم کو ساتھ لے جانا پسندنا کرتی تھی۔

وقت یونہی گزرتا گیا اور فلم بن کر تیار ہو گئی۔ اس ایک فلم کو مکمل کرتے ہوئے اس نے کتنے لوگوں کو خوش کیا تھا وہی جانتی تھی۔ ادھر فلم کی شوٹنگ مکمل ہوئی۔ ادھر بابرکت مقدس عبادت والے مہینے کا آغاز ہو گیا تھا۔ مگر زہرہ بیگم کے گھر میں جیسے کسی کو اس مہینے کی اہمیت کا احساس ہی نہیں تھا۔ روپی چونکہ دن رات شوٹنگ میں مصروف رہی تھی۔ رمضان سے ایک روز پہلے اس کی شوٹنگ مکمل ہوئی تھی۔ چاند نظر آنے کے بعد جب قریبی مسجد سے اعلان ہوا تب وہ سب ہل میں بیٹھے مکمل ہونے والی روپی کی فلم کے بارے میں ڈسکس کر رہے تھے۔ اعلان سن کر روپی نے چونکتے ہوئے ان سب سے کہا۔

”ارے مجھے پتا نہیں چلا اور رمضان کا مقدس مہینہ سر پر آ پہنچا۔“ روپی کی بات سن کر سب خاموش رہا البتہ زہرہ خانم نے روپی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں رمضان کا مہینہ آ گیا ہے۔ ادھر رمضان جانا ہے ادھر آ جانا ہے۔ سال گزرتے تو اب پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب پرانا سال ختم ہوا اور کب نیا برس شروع ہوا۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ترس جاتے تھے۔ اماں جی سے اکثر پوچھ پوچھ کر کہ عید کب آئے گی۔ رمضان کے آتے ہی عید کی تیاری گھر کے اندر شروع ہو جاتی۔ خدا خدا کر کے رمضان رخصت ہوتا پھر جس خوشی سے عید منائی جاتی وہ بھی دیکھنے کے لائق ہوتی۔ ہم جو صبح عیدی لے کر گھر سے نکلتے پھر شام کو ہی گھر واپس آتے تھے وہ زمانے بھی اچھے تھے۔ نہ ماں باپ کو فکر ہوتی کہ بچے گم ہو جائیں گے۔ اور نہ بچے ڈرے سہے کہ کوئی ان کو اٹھا کر لے جائے گا۔ مگر اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ اب تو رمضان کا پتا ہی نہیں چلتا۔“ زہرہ خانم لمبی بات کر کے چپ ہو گئیں تو ارم نے ہنس کر کہا۔

”آپ اس وقت عید کی عید بچوں کو نئے کپڑے پہننے کو ملتے تھے۔ اور بچے سارا سال عید کا شدت سے انتظار کرتے تھے۔ اب کے ہمیشہ ہی عید ہوتی ہے۔ ورنہ عید تو اب بھی اپنے نام پر آتی ہے۔“ ارم خاموش ہوئی تو روپی نے پوچھا۔

”آپ میں سے روزہ کون کون رکھتا ہے۔“

”کوئی بھی نہیں۔“ کرن نے فوراً بتا دیا۔

”کیا مطلب.....؟“ روپی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یار! کوئی بھی نہیں۔ ہمارے گھر میں کوئی بھی روزہ نہیں رکھتا۔“ اب کے کرن نے ہنس کر کہا۔

”کیا واقعی تم میں سے کوئی بھی روزہ نہیں رکھتا؟“ روپی نے سب کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو پومی نے مارے جوش کے کہہ دیا۔

”روپی! اس گھر میں صرف میں روزہ رکھتا ہوں۔“

”جھوٹ، کھلی بکواس۔“ کرن نے مسکرا کر کہا۔ پومی کے جی میں تو یہی آیا کہ وہ اٹھ کر ایک زوردار مکا اس کرن کی پچی کے منہ پر جڑ دے مگر ضبط کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

”مما! روپی کو بتائیں نا میں نے پچھلے برس روزہ رکھے تھے۔“

”ہاں بھئی روپی! سارے نہیں مگر چند روزے پومی نے بھی رکھے تھے۔“ زہرہ خانم نے پومی کی عزت رکھ لی۔ حالانکہ پچھلے برس پومی نے مارے جوش کے دو روزے رکھے تھے اور

افطاری سے پہلے ہی دوپہر کے وقت دھروں کو ناشتہ کرتے دیکھ کر توڑ لیا تھا۔ زہرہ خانم نے محسوس کیا تھا کہ روپی نے روزہ نہ رکھے والی بات کو کچھ زیادہ پسند نہیں کیا۔ اس لئے بڑی

ہوشیاری سے بولی۔

”روپی مئی تمہارے باپ کے مریض ہیں۔ وہ روزہ نہیں بھا سکتے۔ میں شوگر کی مریض ہوں اس لئے مجھے بھی ڈاکٹر نے روزہ رکھنے سے منع کیا ہے۔ تمہاری ارم آپ کی عید شو اور پھر عید

پر پیش کئے جانے والے ڈراموں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی مصروف ہوتی ہے۔ وہ بھی نہیں رکھتی اور پھر ہماری دیکھا دکھی کرن بھی روزہ نہیں رکھتی۔ کہ میں اکیلی روزہ رکھ کر کیا کروں گی



اور اب تم بھی نہ رکھنا۔ کتنے ہفتوں سے مسلسل عکسبندی میں حصہ لے کر تھک چکی ہو اب آرام کرو۔“

”آپ میں سے بے شک کوئی بھی روزہ نہ رکھے مگر میں سارے ہی روزے رکھوں گی۔ میں خود اٹھ کر سحری بنا لیا کروں گی۔“ روبی نے حتمی لہجے میں کہا تو زہرا خانم نے محبت سے کہا۔

”تمہیں سحری پکانے کی ضرورت نہیں۔ ملازمہ خود بھی روزے رکھتی ہے وہ تمہارے لئے سحری بنا دیا کرے گی اور افطاری پر ہم بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جایا کریں گے۔“

”مما مجھے بھی روزہ رکھنا ہے۔ اور ہم اکٹھے ہی سحری کھالیا کریں گے۔“ پومی نے سوچا ویسے تو دن میں تنہائی میں روبی کے پاس بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا اب رات کو سحری کے بہانے ہی سہی وہ میرے قریب پورا مہینہ بیٹھے گی تو پھر میں آہستہ آہستہ فری ہونے کی کوشش کروں گا اور پھر چاند رات پر میں اس کو صاف صاف بتا دوں گا تمہاری شادی میرے ساتھ کرنے کا مما نے فیصلہ کیا ہے۔ مگر روبی نے یہ کہہ کر اس کا پروگرام خاک میں ملا دیا وہ کہہ رہی تھی۔

”آپ ملازمہ سے کہہ دیں میں سحری اپنے روم میں کیا کروں گی اور افطاری بھی اپنے روم میں کیا کروں گی۔ آپ کو میرے لئے اپنی روٹین چھینج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اور پھر ان سب کو شب بخیر کہہ کر اپنے روم میں چلی گئی۔ روم میں آ کر اس نے سب سے پہلے دروازہ بند کیا پھر بستر پر اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پچھلے سال تک وہ اپنے گھر اپنے خاندان میں موجود تھی اور تب وہ روبی لڑکی تھی۔ آج وہ بغیر نکاح کے زبردستی عورت بنادی گئی تھی۔ بلکہ طوائف اور تب وہ صرف روبی تھی۔ اب وہ صرف روبی نہیں فلم سٹار روبی تھی۔

کو کہ اس کے قلمی مستقبل کا فیصلہ عید پر ریلیز ہونے والی اس کی پہلی فلم ”ایک بار چلے آؤ“ نے کرنا تھا۔ مگر قلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی روبی دو نئی فلمیں سائن کر چکی تھی۔ جن کے ابھی چند منٹ شاٹ ہی شوٹ ہوئے تھے۔ مگر یہ دونوں فلمیں پنجابی تھیں۔ روبی کو اچھی طرح یاد تھا۔ رمضان سے دو ہفتے پہلے ہی ان کے گھر رمضان کی تیاری شروع ہو جاتی تھی۔ سارے گھر کے کمروں کے پردے نیڈ ٹیٹ تک کی دھلائی ہوتی کہ عبادت والا مہینہ آ رہا ہے۔ پھر خوب اچھی طرح گھر کی صفائی ہوتی۔ پکوان کے بارے میں طے کیا جاتا۔ افطاری پر کیا بنانا اور سحری میں کیا کھانا ہے۔ عید سے پہلے چاند رات کی تیاری۔ پھر عید ٹرور و تینوں دن خوب اہتمام کیا جاتا تھا۔ پہلے دن ان کے گھر مہمان آتے دوسرے دن وہ مہمان بن کر جاتے۔ مگر یہ سب اب اس کی زندگی میں نہ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر روٹی رہی۔ پھر اٹھ کر وضو بنانے چلی گئی کہ عشاء کی نماز کا نام ہو رہا تھا۔

کو کہ روبی نے کہہ دیا تھا گھر والے اس کی خاطر اپنی روٹین نہ بدلیں۔ مگر اس کے باوجود ان سب نے سہ پہر کی چائے کو افطاری میں بدل لیا تھا۔ البتہ سحری ملازمہ اس کو اس کے روم میں دے جاتی تھی۔ مگر افطاری پر سارا خاندان موجود ہوتا۔ یہاں تک کہ لاؤ بھی اور پومی محض روبی کو دکھانے کیلئے سارے روزے دکھ رہا تھا۔ ایک بات روبی نے محسوس کی تھی کہ کوئی بھی ان میں سے روزہ نہیں رکھ رہا تھا۔ مگر عید کی تیاریاں پورے روزے زور شور سے جاری تھیں۔ ایک نہیں کئی کئی سوٹ بنانے کے پروگرام بن رہے تھے۔ اس کی شاپنگ پہلے زہرا خانم خود کرتی تھیں۔ لیکن جب سے روبی نے قلمی لائن جو اُن کی تھی تو شاپنگ کی ذمہ داری خود اُم نے اٹھالی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ روبی کوئی وی پر ہونے والے شو پر انوائٹ کیا گیا تھا۔ اور اس شو کی ریکارڈنگ عید سے ایک ہفتہ پہلے ہونی تھی۔ پھر عید پر اس کی فلم بھی ریلیز ہو رہی تھی۔ اس کے بعد عید پارٹیوں کے سلسلے کئی روز تک چلتے تھے۔ فلم کے گگنے قلم کی ریلیز سے پہلے ہی لوگوں کو اس فلم کی جانب متوجہ کر چکے تھے۔ سب فلم بین جو دیکھنے کا مزاج رکھتے تھے بڑی بے تابی سے اس فلم کے منتظر تھے۔

بہر حال وہ سب عید کی تیاریوں میں محو تھے۔ روبی عبادت میں لگی۔ یہ الگ بات ہے کہ روزے رکھنے اور کثرت سے عبادت کے باوجود وہ ذہنی سکون سے ابھی تک محروم تھی۔ دل کی بے چینی کم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ اس کے باوجود وہ عبادت کر رہی تھی۔

عید والا مبارک دن بھی آپہنچا تھا۔ مگر وہ سب عید والے دن بھی حسب معمول سوئے ہوئے تھے۔ نہ کسی عورت نے عید کی نماز پڑھی نہ کوئی مرد نماز عید پڑھنے گھر سے باہر گیا۔ ڈاکٹر نے روزے رکھنے کے ساتھ ساتھ کیا نمازیں پڑھنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ وہ اپنے روم میں بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ ملازمہ شیر خرمہ کا بیلا لئے اس کے روم میں داخل ہوئی۔ پہلے سلام کیا پھر عید مبارک کہہ کر یہاں اس کے سامنے میز پر رکھا۔ روبی نے جواباً عید مبارک کہتے ہوئے اٹھ کر ایک ہزار کا نوٹ پرس سے نکال کر ملازمہ کو دیا۔ ملازمہ نے شکریہ کہتے ہوئے نوٹ تھا لیا تو روبی نے پوچھا۔ ”گھر والے کب تک اٹھیں گے؟“ اس کو معلوم تھا کہ یہ ملازمہ بہت پرانی ہے۔ ورنہ کھانے پکانے کو تو یکن میں خانسامہ موجود تھا۔

”وہ تو روز والی اپنی روٹین کے مطابق ہی اٹھیں گے۔“ ملازمہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ وہ پھر اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچنے لگی کہ عید سے دو تین دن قبل ہی عید کے سوٹ استری



غیرہ کر کے رکھ لئے جاتے تھے۔ عید نماز سے پہلے ہی ای خود شیر خرمنہ بناتی اور اس کو کھانے کے بعد عید والے سوٹ پہن کر مرد مسجد چلے جاتے اور گھر کی عورتیں بھی نماز پڑھنے لگ جاتی تھیں۔ ایک دوسرے کو اپنے اپنے کپڑے کھانے کیلئے عید کی نماز کے بعد عید ملتیں۔ پھر وہ رچی آپی کے ساتھ یکن میں مصروف ہو جاتی کہ دوپہر کے کھانے پر کافی مہمان انوائٹ ہوتے تھے۔ چند چیزیں تو بنا کر پہلے ہی فرنج میں رکھ لی جاتیں۔ آنے والے مہمان بھی بچوں کو عید دیتے تھے۔ وہ سب چچی پھوپھو لوگ ہی تو ہوتے تھے اور یہاں ابھی تک کبھی سورے تھے۔

روبی نے کوکہ فلمیں سائن کی تھیں۔ ایک تو نیاز صاحب کی ہی تھی۔ دوسری ایک۔ نئے ہدایتکار کی مگر اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی شوٹنگ میں حصہ عید کے بعد لیں گی۔ کوکہ دونوں فلموں کی رسم افتتاح ہو چکی تھی۔ نیاز صاحب کی فلم کا صرف ایک لانگ شاٹ عکس بند ہوا تھا۔ وہ بھی افتتاح والے دن اور دوسری فلم کے مڈ شاٹ اس پر عکس بند کئے گئے تھے۔

ملازمہ نے کہا تھا کہ وہ حسب معمول یعنی گیارہ بجے اٹھیں گے۔ روپی شیر خرمنہ کھا کر روم میں ہی ٹہلنے لگی تھی کہ سب سے پہلے زہرہ خانم روم میں داخل ہوئیں۔ سب سے پہلے روپی کو عید مبارک کہا۔ پھر گلے سے لگا لیا اور روپی کو بے ساختہ ماں یا داد گئی۔ ماں عید کی نماز پڑھ کر جب آتی تھی تو گھر والوں کے ساتھ ساتھ روپی کو بھی بہت محبت سے گلے لگاتی تھی۔

”ارے آج خوشی کا موقع ہے اور تم روری ہو۔ بری بات۔“

”یونہی۔“ روپی نے جلدی سے آنسو صاف کر لئے۔ یہ دیکھ کر زہرہ نے شکوہ کرنے والا انداز میں کہا۔

”اگر تمہیں مجھ کو دیکھ کر ماں یا داد آئی ہے تو یہ قدرتی بات ہے کہ وہ تمہاری ماں ہے مگر تباہ ضرور کہوں گی کیا میں نے ماں بن کر نہیں دکھایا؟ کیا بیٹی نہیں سمجھتی؟“

”ماں سے زیادہ ماں بن کر دکھایا ہے۔“ کہتے ہوئے روپی ایک بار پھر ان سے لپٹ گئی۔ اتنے میں ارم کرن بھی عید مبارک کہتے ہوئے باری باری اس کے گلے ملیں تو روپی نے کہا۔

”میں نے سنا ہے آپ عید والے دن بھی گیارہ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتے۔ آج کیسے جلدی اٹھ گئے ذرا زیادہ بھی بتادیں۔“

”تمہارے لئے۔“ کرن نے ہنس کر کہا اور ارم آپی نے کہا۔

”ہمارا دماغ خراب ہے جو گیارہ بجے سو کر اٹھتے۔ آج گیارہ بجے تو تمہاری فلم کا پہلا شو ہے۔ کیا بھول گئیں تم کہ یہ شو ہم سب گھر والوں نے ایک ساتھ دیکھنا ہے۔“

”سوری آپی! میں تو آپ کے ساتھ نہ جاسکوں گی۔“ روپی نے معذرت کرتے ہوئے کہا تو کرن بول پڑی۔

”ارے تمہاری فلم کا پہلا شو ہے اور تم نہیں دیکھو گی۔ سبھی اداکار، ہیر، رتن اپنی پہلی فلم کا پہلا شو لازمی دیکھتے ہیں۔ ہم سب جائیں گے اور محترمہ روپی صاحبہ آپ بھی میرے ساتھ جائیں گی۔“ مگر روپی نے کرن کو جواب دینے کے بجائے ارم آپی سے کہا۔

”آئی ایم سوری آپی! میرا موڈ نہیں۔ آپ چلے جائیں اور آکر مجھے بتائیں فلم فلاب ہوئی یا۔۔۔۔۔“ مگر روپی بات پوری نہ کر سکی۔

”ارے ارے۔“ ارم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”کتنی بری بات منہ سے نکالنے لگی تھی۔ تمہاری فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی بہت شہرت حاصل کر چکی ہے۔ اور نیاز صاحب کی فلمیں تو ویسے بھی کم کم فلاب ہوتی ہیں۔ اس برس تمہاری فلم سے پہلے جو تین فلموں کی نمائش ہوئی ان تینوں نے بہت زبردست کامیابی حاصل کی۔ آج کو کہ سات فلمیں نمائش کی جا رہی ہیں۔ وہ بھی بہت بڑے بڑے آرٹسٹوں کی۔ مگر مجھ سے شرط لگا لو سب سے زیادہ کامیابی تمہاری فلم حاصل کرے گی۔ بہتر ہوگا اگر تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

”نہیں آپی آپ جائیں اور آکر مجھے بتادیں۔“

”وہ تو ہم نہ بھی جائیں تو تمہارا ہدایتکار تم کو فون کر کے بتا دے گا۔“ ارم نے ہنس کر کہا۔ پھر وہ تینوں چلی گئیں تو تھوڑی دیر بعد پوی اس کے دروازے کوناک کرتے ہوئے روم میں داخل ہوا۔ روپی جو بستر پر لیٹ چکی تھی۔ مات ارم آپی کے ساتھ مارکیٹ اور سڑکیں ناچتے ہوئے گزری تھی۔ پوی کو دیکھتے ہی روپی جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ پوی بڑی تیز سے روپی کے قریب آیا۔ پہلے عید مبارک کہا پھر ایک گفٹ بیک اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میری جانب سے عید کا گفٹ۔ روپی میں زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کو گفٹ دے رہا ہوں۔“

”شکریہ پوی!“ روپی نے جواباً عید مبارک کہتے ہوئے گفٹ تھا لیا تو پوی روم سے باہر چلا گیا۔ حالانکہ دل روپی کو گلے ملنے اور اپنے سینے سے لگانے کو چاہ رہا تھا مگر پھر ویسے ارم آپی



کا خوف۔ اپنی خواہش مل میں دبائے روم سے باہر چلا گیا۔

ٹھیک دس بجے وہ سب روپی کی فلم کا پہلا شو دیکھنے سینما چلے گئے تھے۔ جب دو بجے کے بعد گھر واپس آئے تو بھی خوشی سے سناچ رہے تھے۔ کیونکہ روپی کے کیمریز کی پہلی فلم جو ملک بھر میں عام نمائش کیلئے پیش کی گئی تھی باکس آفس پر کامیاب رہی تھی۔ پہلا شو ختم ہوتے ہی جنگل میں لگی آگ کی طرح فلم ”ایک بار چلے آؤ“ کی کامیابی کی خبر پھیل گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ روپی کے کردار کے ناقابل فراموش چرچے۔ روپی نے اپنی پہلی فلم میں ہی لا جواب یا نگار بہترین اور کبھی نہ بھولنے والی سپر کا اس پر فائرس دی تھی۔ روپی کی اس پہلی فلم نے ہی روپی کو فلم انڈسٹری کی سپر کا اس ہیر وئن بنا دیا تھا۔ ہر طرف روپی کی لا جواب اداکاری کی دھوم تھی۔

فلم دیکھنے والے تماثائی یہ نہیں جانتے تھے کہ فلم کی کہانی روپی کی اس زندگی سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے چہرے پر جو گہنی اداسی تھی وہ کو کہ کہانی کی ڈیمانڈ بھی تھی۔ مگر یہ اداکاری نہیں حقیقت تھی۔ ان دنوں روپی اپنی زندگی کے دردناک موڑ سے گزر رہی تھی اور یہ درد اور گہری اداسی اس کے چہرے سے عیاں ہوتی تھی۔ اور پھر فلم کا ہیر و بھی آزر تھا۔ جس کی فلم میں موجودگی فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ یہ ایک روحانی فلم تھی جو ہر لحاظ سے باکس آفس پر کامیاب رہی تھی۔ ہدایتکار نیاز تو ویسے بھی کامیاب فلمیں بنانے میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔

ارم کے گھر اس وقت جشن کا سماں تھا۔ کو کہ فلم کا پہلا شو ختم ہوتے ہی ارم لوگوں کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی ہدایتکار نیاز کا فون آ گیا تھا۔ جب ملازمہ نے روپی کو بتایا کہ نیاز صاحب آپ کو بلا رہے ہیں تو روپی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”ان سے کہو میڈم سورہی ہیں اور یہ پیغام خود وصول کر لو۔“ ملازمہ نے پیغام وصول کر کے اس کو بتا دیا تھا کہ وہ کہتے ہیں فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کامیابی کا سن کر روپی کو رتی بھر خوشی نہ ہوئی تھی۔ اپنے اس فلمی کیمریز کی جو قیمت روپی نے چکانی تھی وہ صرف وہی جانتی تھی۔ حاجی سردار نے جب پہلی بار اس کی عزت برباد کی تھی تب یہ داستان اس نے زبردہ خاتمہ کوروتے ہوئے سنا دی تھی اور جو نتیجہ نکلا تھا اس کے بعد باقی کی ذلتیں جو اس نے سوات میں ہر رات اٹھائی تھیں وہ اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں تھیں۔ اب اس وقت کرن کیا ارم آپ بھی ڈانس کر رہی تھیں۔ پھر روپی کے قریب آئیں اور منہ چوم کر کہا۔ بہت زبردست روپی! بہت بہت مبارک ہو یا ارم! تم نے تو بڑی بڑی ہیر وئن سے بھی اچھی فائرس دی ہے۔“ جواب میں روپی خاموش رہی تھی۔

مبارکباد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ روپی نے ارم سے کہہ دیا تھا وہ تو کسی سے بات کر سکی اور نہ ہی کسی پارٹی میں جائے گی اور اپنے روم میں جلی گئی جبکہ ارم فون سنجال کر بیٹھ گئی تھی کہ ایک فون ختم ہوتا تھا تو دوسرا آ جاتا۔ فلم ساز حاجی سردار کا بھی آیا ہدایتکار نیاز کا بھی ہیر و آزر کے علاوہ بھی فلم یونٹ کے بہت سارے لوگوں نے فون کئے۔ حاجی سردار اور ہدایتکار کی جانب سے تو مٹھائی کے ٹوکے بھی آئے تھے۔

آز نے بھی روپی کو مٹھائی کے بجائے ایک بھجھوایا تھا۔ ارم کو تو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ کئی برسوں کی محنت کے بعد بھی وہ مقام حاصل نہ کر سکی تھی جو روپی نے ایک ہی فلم کرنے کے بعد حاصل کر لیا تھا۔ ہر کوئی روپی سے بات کرنی چاہ رہا تھا۔ اور ارم بتا رہی تھی کہ وہ سورہی ہیں۔ کرن پومی رضوی اور زبردہ خانم ارم سے کم خوش نہیں تھے۔ مگر اچانک پھر ایک ایسا فون آیا جس نے ان سب کی خوشی پل بھر میں خاک میں ملا دی تھی۔ ارم نے سب کو اس فون کے بارے میں بتانے کے بعد زبردہ خانم سے بہت فکر مندی سے پوچھا تھا۔ اب کیا ہوگا۔



فون تھا اسلام آباد سے مشہور سیاسی و سماجی شخصیت چودھری نواز کی طرف سے جو خیر سے لاہور ہی کے رہائشی تھے۔ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری قدیر نے فون کیا تھا فون چونکہ ارم نے خود ریسیو کیا تھا اس لئے ارم کا نام سنتے ہی سیکرٹری صاحب نے بغیر کسی تمہید کے کھل کر بات کرتے ہوئے کہا۔

چودھری نواز صاحب کا حکم ہے کہ رات ایک بجے تک فلم سٹار روپی کو ان کے بیگنے پر بھیج دیں اور اگر کنونشن کا کوئی مسئلہ ہو تو پھر چودھری صاحب کی اپنی گاڑی روپی کو لینے آ سکتی ہے۔“

فون کو کہ بہت اہم تھا ارم کی سمجھ میں نہ آیا کہ وفوری طور پر اس بات کا سیکرٹری صاحب کو کیا جواب دیں۔ کچھ اور سوچا تو کہا۔



”قدیر صاحب! اس وقت عید کی وجہ سے گھر پر کافی سارے مہمان آئے ہوئے ہیں پلیز ماسٹرنہیں کیجئے گا۔ مناسب سمجھیں تو ایک گھنٹے بعد دوبارہ فون کر لیں۔“ اور فون بند کر دیا۔ پھر ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکا کر سوچ میں پڑ گئی۔ اگر یہ بلاؤ خود اس کا اپنے لئے ہوتا تو وہ مارے خوشی کا چھل پڑتی۔ اس کو چودھری نواز کے بنگلے پر جانے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اتنے بڑے بندے نے اگر طلب کیا ہے تو ظاہر ہے گفت بھی تو اپنی حیثیت کے مطابق دے گا۔ مگر اب بات روٹی کی تھی۔ چودھری نواز نے روٹی کو طلب کیا تھا۔ اور روٹی کو اس کام سے شدید نفرت تھی۔ اس نے تو فلم میں کام تک کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد پھر کچھ زبردہ خانم کے نرم رویے اور تھوڑے سا دم کے سخت رویے سے اس نے فلم میں کام کرنے کی دوبارہ حامی بھری تھی کہ اس کی دانست میں جو کچھ وہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا نہ ہی وہ اس معاملے میں ملوث سمجھتی تھی۔ مگر اب۔

اب روٹی سے یہ کہنا کہ فلاں بندہ تمہاری رفاقت شب کا خواہش مند ہے بہت مشکل کام تھا۔ وہ سوچے گی بلکہ کہے گی آپ نے میری کمائی کھانے کیلئے مجھے دھندے پر لگانے کیلئے پتا دی تھی۔ بلکہ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ یہ سب کام کروانے کیلئے مجھے گھر سے بھگایا تھا۔ ارم نے فون بند کر کے ساری بات ماں کو بتا دی تھی۔ ارم کی بات سن کر سبھی پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ سب اچھی طرح جانتے تھے۔ اول تو چودھری صاحب نے ان کا کیا انکار قبول ہی نہیں کرنا تھا۔ کر بھی لیتا تو پھر ان کے سارے خاندان کی خیر نہیں تھی۔ چودھری نواز ان سب کو چیل میں بند کرنا تو چھوٹی بات ان کے پورے خاندان کو قتل کرانے کی طاقت رکھتا تھا۔ اب وہ بھی معذرت کرنے کا کوئی ایسا طریقہ سوچ رہے تھے جس کو چودھری صاحب خندہ پیشانی سے قبول کر لیں۔

روٹی کا توان کے بنگلے پر جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ پہلے والی عام روٹی نہیں تھی جو ان سے ڈرجاتی۔ اپنی پہلی ہی فلم کی باکس آفس پر کامیابی سے وہ سپر سٹار بن چکی تھی۔ یہ نہ ہو کہ اس بات سے خفا ہو کر ان کا گھر ہی چھوڑ کر چل جائے۔ پھر وہی بات۔ یہ تو طعنا کا انکار ہی کرنا تھا مگر کیسے کیا جائے۔ سب یہی سوچ رہے تھے کہ فون کی بیل پھر سے ہونے لگی۔ سی ایل آئی پر نمبر دیکھا تو چودھری نواز کے سکرٹری کا تھا۔ یعنی کہ ایک گھنٹہ اتنی جلدی بیت گیا تھا ان کو پتہ بھی نہ چلا تھا۔ ابھی تک اس مسئلے کا حل سوچ سکے تھے۔ اب ان میں سے کوئی بھی فون انٹینڈنٹ نہیں کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ فون خاموش ہو گیا۔ مگر چند لمحوں وقف سے بیل پھر ہونے لگی۔ پھر ہوتی ہی چلی گئی مگر ریسورسور بھی کسی نے نہ اٹھایا تھا۔ یہ دیکھ کر رضوی نے کہا۔

میرے خیال میں چودھری کو انکار کرنا نامناسب بات ہوگی۔ روٹی کا نگری کرنے کا کوئی طریقہ سوچو۔ میرے خیال میں تو روٹی کو نگری کرنے کا فریضہ آپ کرن کو منپ دیں۔ روٹی کرن کی دوست ہے۔ وہ کسی نا کسی طریقے سے بہلا پھسلا کر روٹی کو چودھری نواز کے بنگلے پر لے جانے کیلئے نگری کر ہی لے گی۔ انہوں نے کرن سے محبت سے پوچھا تو باقی سب کی نگاہیں کرن کی جانب اٹھ گئیں۔ کرن نے سب کا امید بھری نگاہوں سے اپنی جانب دیکھتے پایا تو خاصے خشک لہجے میں کہا۔

”مجھے تو آپ اس کام کیلئے معاف ہی رکھیں آئی ایم سوری۔“

”جذباتی ہوئے بغیر ذرا سوچو کرن میٹی! اگر تمہارے سمجھانے سے روٹی مان جاتی ہے تو ہمیں آج ہی کتنی بڑی رقم مل سکتی ہے؟ جتنی روٹی نے دس فلموں میں کام کرنے کے بعد کمائی ہے۔“ رضوی نے منت کرنے والے انداز میں کرن سے کہا۔

”پھر بھی ہرگز نہیں۔ روٹی میری دوست ہے۔ یہ بات روٹی سے کبھی نہیں کہوں گی۔“ کرن نے زبان کے ساتھ سر بھی ہلایا تھا۔

”کرن بات صرف پیسوں کی نہیں جان کی بھی ہے۔ ہمارا انکار سن کر کیا وہ وفاقی وزیر ہمیں معاف کر دیں گے؟ تم اچھی طرح جانتی ہو وہ صرف وفاقی وزیر ہی نہیں بہت بڑی مشہور اور سیاسی شخصیت بھی ہیں اور خاندانی جاگیر دار بھی ہیں۔ وہ تو ہمیں اٹھوا لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ہمارا انکار سن کر وہ کہیں گے ہم جان بوجھ کر انکار کر رہے ہیں۔ شاید بات کہیں اور طے کر چکے ہیں۔ پھر وہ برداشت نہیں کریں گے۔ تم بات کر کے دیکھو تو میری میٹی! اب کے زبردہ خانم نے بھی کہا تو کرن نے ماں کو جواب دینے کے بجائے ارم کو مخاطب کرتے ہوئے سخت اور سخت لہجے میں کہا۔

”آپی! آیا سے کہہ دیں مجھے اس معاملے میں ناگھسیٹیں۔ آپ کے جوتی میں آتا ہے کریں مگر مجھے اس سلسلے میں معاف ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ میں نے کہا میں روٹی سے اس حوالے سے کچھ بھی نہ کہوں گی۔“

کرن کی بات سن کر زبردہ خانم غصہ آ گیا۔ مگر ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ارم نے کرن کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے۔ ماں سے کہا۔



”کرن کو آپ اس معاملے سے الگ ہی رہنے دیں۔ چودھری نواز ہمارا دوسرا ہے۔ کرن کا نہیں۔ اور میری بات غور سے سنیں اب اگر چودھری صاحب کے سیکرٹری کا فون آیا تو فون تو خیر لازمی آئے گا۔ ہاں تو اب جب فون آئے تو آپ خود ہی سیکرٹری کے بات کریں اور میرا خیال ہے آپ ان کو صاف صاف بتادیں اور کہہ دیں کہ وہ آپ کی سگی بھانجی ہے۔ وہ گاؤں سے شہر آئی ہے۔ فلموں میں کام کرنا اس کا شوق ہے۔ مگر دوسری باتوں کو وہ پسند نہیں کرتی۔ ہاں اگر آپ پسند کریں تو روٹی کی جگہ میری بیٹی ارم حاضر ہو جائے گی۔ اگر انہوں نے آپ کی یہ بات مان لی تو ٹھیک ہے ورنہ بات اچھے طریقے سے ختم تو ہو ہی جائے گی۔“ یہ تو تھی ارم کی رائے۔ اور دونوں باپ بیٹا بے چینی سے صوفے پر بیٹھے پہلو پہلو بدل رہے تھے۔ پوی کے بس میں نہیں تھا ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ روٹی سے جا کر کہتا۔ روٹی یہ ایک بہت بڑی آفر ہے۔ پیسز انکار کر کے میرا اور اپنے ہونے والے بچوں کا مستقبل تباہ مت کرو۔ تمہیں آخر فکر کس بات کی ہے میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔

پریشان تو زبردستی بھی تھیں انکار کا سوچ سوچ کر۔ یہ واقعی ایک بڑی آفر تھی اگر روٹی مان جاتی تو وہ کرائے کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر والے تو بن سکتے ہیں۔ اتنی بڑی شخصیت تھی مگر یہ نہ ہو کہ زیادہ کھانے کے چکر میں یہ تھوڑا بھی ہاتھ سے نکل جاتا۔ یہی سوچ کر انہوں نے ارم کی بات مان لینے کا فیصلہ کیا تھا اور جب انہوں نے اس بات سے ارم کو آگاہ کیا تو رضوی جوان کی باتیں سنتے ہوئے کچھ سوچ بھی رہے تھے جلدی سے بولے۔

”ارے کدو کو انکار کرنا کرنا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کو دیکھتے رہے پھر ایک طویل سانس کھینچتے ہوئے بولے۔

”ارم بیٹی اگر تم ہمت کرو تو بات بن سکتی ہے۔ یہ کام ہو سکتا ہے۔ وزیر صاحب کو انکار کرنا بہت بڑی ناشکری ہوگی۔ اگر اللہ نے ہم پر یہ فضل کیا ہے تو ہمیں اس کو شکریے کے ساتھ قبول کرنا ہوگا۔ اور یہ سب کام تمہاری جرأت سے ہوگا۔“

”مثلاً مجھے کیا ہمت اور جرأت کرنا ہوگی۔“ ارم نے سنجیدگی سے پوچھا۔ انکار کرنے کو خود اس کا بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہ انکار کرنا مجبوری تھی۔ تب رضوی نے ان کو اپنا پروگرام بتاتے ہوئے کہا۔

”اب جب وزیر صاحب کے سیکرٹری کا فون آئے تو تمہاری ماں صاف ان سے وہی بات کہہ دے۔ جو تھوڑی دیر پہلے تم نے کہی تھی۔ یعنی وہ میری بھانجی ہے۔ بہت شریف لڑکی ہے۔ فلموں میں کام کرنا اس کا شوق ہے مگر ان باتوں کو یعنی اس کام کو وہ پسند نہیں کرتی۔ اگر ہم نے زبردستی اس کو آپ کے ہنگامے پر جانے کا کہا تو وہ مارے خفگی کے فوراً ہمارا گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ ہاں اگر آپ ہمارے یہاں آ جائیں تو ہو سکتا ہے آپ کی بات بننے کی کوئی صورت نکل آئے۔“

”فرض کریں وہ یہ بات مان کر ہمارے یہاں آ گئے تو پھر کیا ہوگا۔“ ارم نے بے صبری سے پوچھا۔

”پھر تم ان کو روٹی کے درم میں لے جانا اور روٹی سے کہنا تم سے ملنے ایک بہت بڑی ہستی آئی ہے۔ وزیر صاحب کو اپنے یہاں آنے پر کھل کر ساری بات بتادینا کہ کیسی ان کا کام یا بات بن سکتی ہے۔ اس تعارف کے بعد تم چودھری صاحب کو روٹی کے درم میں یہ کہنے کے بعد چھوڑ کر آ جانا کہ چودھری صاحب آپ بیٹھیں میں ابھی آتی ہوں۔ اس کے بعد چودھری صاحب جانے اور ان کا کام وہاں میدان کے پرانے کھلاڑی ہیں۔ حالات کو اچھے طریقے سے ڈیل کر لیں گے۔ روٹی کو شور کرنے کا موقع نہیں دیں گے۔“ رضوی صاحب اپنی بات ارم کو بتا کر خاموش ہو گئے۔

اور صبح کیا ہوگا؟ کچھ یہ بھی سوچا ہے آپ نے؟“ ارم نے پوچھا۔

وہی جو پہلے کہا ہے۔ یہاں پر ہی تو تم نے ہمت اور جرأت دکھائی ہے۔ صبح تم سخت کو بن جانا اور تمہاری ماں زبردستی روٹی سے کہہ سکتی ہو یہ سب کرنا ہماری مجبوری تھی۔ وہ خود ہی چل کر ہمارے گھر آ گئے تھے۔ اگر ہم چودھری صاحب کی بات نہ مانتے تو انہوں نے ہمارے سارے خاندان کو قتل کر دینا تھا۔ مزید کیا کیا کہنا ہے تم خود بھی سوچ سکتی ہو۔ ماشاء اللہ خوب سمجھاؤ۔ روٹی چھوٹی سی ہے۔ وہ تمہاری باتیں سن کر ڈر جائے گی۔ مجھے یقین ہے خاموشی اختیار کر لے گی۔“ یہ سب سنتے ہی ارم کا رنگ مارے جوش کے سرخ ہو گیا۔ اس نے فوراً کہا۔ ”فلم انڈسٹری میں بھی بہت سارے لوگ روٹی کو ہمارے خلاف بہکا سکتے ہیں۔ اس کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھنے کیلئے میرا اب مستقل سخت رویہ اختیار کرنا ضروری ہے۔“ صرف چودھری صاحب کے حوالے سے نہیں بعد میں بھی سخت رہنا ضروری ہے۔ آیا آپ کا بعد میں نرم ہو کر روٹی کو سنبھالنا ضروری ہے۔ پھر جب ساری بات طے ہو گئی۔ سارا پروگرام سیٹ کر لیا تو نکلے بے تابی سے سب چودھری صاحب کے سیکرٹری کا فون کا انتظار کرنے۔ زیادہ لمبا ویٹ نہیں کرنا پڑا تھا۔ جلد ہی سیکرٹری صاحب کا فون آ گیا تھا۔ ارم نے



خود ہی ماں کے بجائے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ریسورٹ اٹھالیا۔ ارم کی ساری بات سننے کے بعد سیکرٹری نے کہا۔

”میں ابھی چودھری صاحب سے بات کر کے آپ کو دوبارہ فون کرتا ہوں۔ چند منٹ بعد ہی سیکرٹری صاحب کا فون آ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا دو بجے رات کو چودھری صاحب آپ کے گھر آ جائیں گے اور پھر گھر کا ایڈریس پوچھ کر فون بند کر دیا فون بند کرتے ہی ارم نے کہا۔

”لو بھئی آپا کام بن گیا۔ چودھری صاحب رات دو بجے تشریف لارہے ہیں۔“ یہ سن کر سب ہی خوش ہو گئے تو ارم نے پھر کہا۔

”اب مسئلہ یہ ہے کہ روپی نے نہیں مگر ہمیں تو عید ملن پارٹی میں بھی لازمی جانا ہے۔“ تو اس میں پریشان ہونے والی کوئی بات ہے۔ آپ وہاں زیادہ دیر رکنے کے بجائے ایک بجے تک واپس گھر آ جائیں۔“ پومی نے جلدی سے کہا۔ پومی کی اس بات کو سب ہی نے پسند کیا تھا۔ روپی کو کہ پارٹی میں جانے سے انکار کر چکی تھی اس کے باوجود ایک بار رسمی طور پر اس کو ساتھ چلنے کا کہنا ضروری تھا۔ یہی سوچ کر کرن کو روپی کے روم میں بھیجا۔ مگر روپی نے پارٹی میں جانے سے معذرت کر لی تھی۔ یوں عید ملن پارٹی کے ٹائم پر وہ تینوں ماں بیٹیاں تیار ہو کر چلی گئی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد روپی صرف رات کا کھانا کھانے ہی اپنے روم سے باہر آئی تھی۔ کھانا کھاتے ہی وہ دوبارہ اپنے روم میں چلی گئی تھی۔ گھر پر صرف پومی اور ابو ہی رہ گئے تھے۔ روپی نے کھانا پومی ابو کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر اس لئے کھایا تھا کہ ارم جاتے ہوئے تاکید کر کے گئی تھی کھانا پومی ابو کے ساتھ کھایا۔ عید کا کچھ تو اہتمام کر لیا۔ ورنہ روپی نے کھانا اپنے روم میں کھانا تھا اس نے تو عید پر سلوائے گئے بطور خاص سوٹوں میں سے ایک بھی سوٹ نہیں پہنا تھا وہ سادہ سوٹ میں ملبوس تھی۔ کتنی دیر وہ اندر روم میں ٹہلتی رہی۔ پھر جب تھک گئی تو سونے کیلئے لیٹ گئی۔ نچانے سوئے ہوئے کتنی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ ٹاک ہونے لگا۔ روپی کی آنکھیں رانی کھل گئی۔ بے سکونی کی نیند تھی اس کی۔ جس کی وجہ سے سارا گھر خوش و خرم تھا وہ خود اس خوشی سے محروم تھی۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ وہ اٹھنے کے بجائے لیٹی سوچتی رہی۔ اٹھنے کا موڈ بالکل نہیں تھا مگر جب بار بار دروازہ ٹاک کیا گیا تو روپی کو اٹھنا پڑا۔ وہ بے زاری سے اٹھ کر دروازے کے قریب آئی۔

”کون ہے بھئی اس وقت۔“ لہجے میں ہلکی نا کاری تھی۔

”ارے روپی بہت ضروری کام ہے پلیز جلدی سے دروازہ کھلو۔“ ارم آپ کی آواز سن کر روپی نے فوراً دروازہ کھل دیا۔ باہر ارم اکیلی ہی کھڑی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی ارم نے روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سوچ چکی تھی کیا؟“

”جی آپ! روپی نے آہستہ سے کہا تو ارم بولی۔

”روپی ڈیر! میں اس وقت تمہیں بھی ڈسٹرب نہ کرتی مگر تم سے ملنے ایک بہت بڑی ہستی خود چل کر ہمارے گھر آ رہی ہے۔ اس وجہ سے مجھے اس وقت تمہاری نیند خراب کرنی پڑی۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

”اس وقت؟“ روپی نے دل کلاک پر ناظم دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ جو ایک بجا رہا تھا۔

”یار! ابھی ایک ہی تو بجا ہے۔ چلو آؤ میں تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے تیار کرتی ہوں۔“ پھر عید کیلئے بطور خاص سلوائے گئے سوٹوں میں سے ایک سوٹ کا انتخاب کرتے ہوئے بولی۔

”یہ لو پیٹر اور جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر پہن کر آ جاؤ۔“ یہ سن کر روپی نے کہا۔

”آپ! اس وقت رات کو تیار ہونا کیا ضروری ہے؟ ویسے ہی مل لیتی ہوں میں آپ کی اس بہت بڑی ہستی سے۔“ روپی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آنے والی ہستی کیلئے وہ یہی سمجھی کہ ارم آپ کی کوئی سہیلی ملنے آ رہی ہے۔

”ارے ایسے کیسے مل لوگی تم۔ کیا عالم لڑکی ہو۔ سپر کلاس پر فارمنس دینے والی سپر سٹار ہو۔ اور جو بہت بڑی ہستی سپر سٹار سے ملنے آ رہی ہے۔ اس کو فلم سٹار والے روپ میں ہی دیکھنا پسند کرے گی۔ چلو شاباش یہ سب جلدی سے پہن کر آ جاؤ۔“ ارم نے کہا تو روپی نے بے دلی سے ان کے ہاتھ سے سوٹ لیتے ہوئے سوچا۔



”اے کاش کہ گناہ ہی رہتی۔“ وہ سوٹ چھینچ کر کے باہر آئی تو ارم آپلی نے بڑی محنت سے اس کا میک اپ کیا۔ پھر بس ابھی آئی کہہ کر باہر چلی گئی۔ روبی پریشان سی ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ کوئی ہے وہ مشہور ہستی جو دن کے بجائے رات کو آ رہی ہے۔ کبھی ارم پھر چلی آئی۔ لیکن اب وہاں کئی نہیں تھی۔ اب اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا جس کی عمر 55 اور 60 کے درمیان ہوگی۔ ارم اس کو ساتھ لئے روم میں داخل ہوئی۔

وہ سمجھ گئی آدھی رات کو یہ مرد اگر اس کے روم میں آیا ہے تو اس کا کیا پروگرام ہوگا۔ وہ اس وقت صرف اس کو دیکھنے نہیں آیا ہوگا۔ روبی نے جو بات سوچی وہ یہی تھی کہ اس کو اس وقت جب آدھی رات ہو رہی ہے تیار ہونے سے پہلے ہی ارم آپلی سے پوچھ لینا چاہئے تھا کہ آدھی رات کو آنے والی یہ مشہور ہستی کس سے ملے گی۔ مگر ارم آپلی نے جلدی ہی اتنی مچائی تھی کہ وہ آنے والی ہستی کے بارے میں وضاحت سے نہ پوچھ سکی۔ اب اس غلطی کا نتیجہ روبی کے سامنے تھا وہ مرد ارم کے ساتھ خود بھی روم میں داخل ہو چکا تھا۔ ارم کھڑی مسکرا کر تعارف کروا رہی تھی۔

”روبی یہ ہیں وہ مشہور سیاسی شخصیت جاگیر دار اور وفاقی وزیر چودھری نواز صاحب جو اس وقت اپنے قیمتی نام سے وقت نکال کر صرف اور صرف تم سے ملنے آئے ہیں۔ تم نے اخبارات میں اکثر ان کی تصویریں دیکھی ہوں گی اور ان کے بڑے بڑے سیاسی جلسوں کی خبریں پڑھی ہوں گی۔“

”میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی ان کے بارے میں پڑھا ہے۔“ روبی سمجھ گئی تھی ہال میں ضرور کچھ کالا ہے جو چودھری نواز اس وقت آیا ہے۔ آخر فلم انڈسٹری کے مردوں میں گھومتے پھرتے کچھنا کچھنا تو آگئی تھی اس کو بھی۔ بے شک ابھی وہ پورے بیس کی بھی نہ تھی۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو روبی؟“ ارم نے تھاہو کر اس کو دیکھا۔ قبل اس کے کہ وہ سر فٹش کرتی چودھری نواز نے ہاتھ کا اشارہ سے ارم کو خاموش رہنے کا کہتے ہوئے روبی کو مسکرا کر دیکھا پھر کہا۔

”اگر تم نے مجھے تپانے کیلئے کہا ہے تو بھی کوئی بات نہیں۔ اس عمر میں اکثر لڑکیاں ہری مرچ ہوتی ہیں اور میں ایسی ہی لڑکیوں کو پسند کرتا ہوں اور اگر تم واقعی مجھے نہیں جانتیں کہ ابھی چھوٹی سی ہو تو پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ مجھے تمہارا بیچ اچھا لگا۔ میں اپنا تعارف تم سے خود کراؤں گا۔ ابھی ارم نے جو کراہا وہ بھی تعارف تھا۔“ یہ کہتے ہوئے چودھری نواز نے ارم کی جانب یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو تم ابھی تک یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو چلتی پھرتی نظر آؤ۔ ارم ان کی نظروں کا مطلب فوراً ہی سمجھ گئی اور روبی کو دیکھتے ہوئی بولی۔

”روبی میں چائے کا کہہ کر ابھی آتی ہوں۔“ قبل اس کے کہ روبی انہیں رکنے کا کہتی۔ وہ جلدی سے روم سے باہر نکل گئیں۔ ارم کے جاتے ہی چودھری نواز نے پہلے دروازے کو لاک لگایا پھر روبی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کو آواز دے کر روکنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اگر اس وقت مجھے تمہارے روم میں چھوڑ کر چلی گئی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ میرا پروگرام جانتی ہے۔“

”پروگرام! کیسا پروگرام؟“ روبی نے پوچھا۔ چودھری نواز اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے قریب آ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”تم میرے اندازے سے زیادہ خوبصورت اور پیداری ہو۔ بہت بیوٹی فل۔“ چودھری نے کہا۔ روبی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اب کچھ بھی کہنا فضول تھا۔ نہ وہ اس وقت حاجی سردار کے گھر میں تھی اور نہ ہی سات کے ہوٹل میں۔ وہ اپنے گھر کے کاندھ مو جو تھی۔ گھر والی خولٹیرے کو اس کے روم میں چھوڑ کر گئی تھی پھر بچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یہ گھر تھا مگر اسے اپنا گھر کہنا شاید نامناسب بات تھی۔ چودھری نواز صرف ایک رات نہیں تین روزان کے گھر رہا تھا اور ان تین روز میں نا تو کوئی گھر کا روم میں آیا تھا اور نہ ہی چودھری نواز نے روبی کو روم سے باہر جانے کی اجازت دی تھی۔ ہاں ملازمہ آ جاتی تھی ناشتہ کھانا لے کر اور چودھری نواز کو جس چیز کی ضرورت ہوتی تھی ملازمہ سے کہہ دیتے تھے۔ تیسرے روز جب چودھری نواز جانے لگے تو روبی سے کہا۔

”میں جب تک زندہ ہوں اب تمہیں چھوڑنے یا تم سے جدا رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اچھی لگی ہو تم مجھے۔ دل کا اندر تک تر گئی ہو میرے۔ لیکن میں تم سے ملنے روز روز یہاں اس گھر اس ایریا میں نہیں آ سکتا۔ اب تم سے میری ملاقات نئے گھر میں ہوگی۔ ہاں کوئی ضرورت ہو تو مجھے سے کہو۔“ روبی نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے ان کی جانب دیکھتے



ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ چودھری نواز نے روپی کے رخسار کو خمی سے چھو کر کہا۔

”بہت بولتی ہیں لڑکیاں خاص کر اس عمر میں اور تم نے ان تین یوم میں بمشکل چند باتیں کی ہوں گی بلکہ خود سے تم نے ایک بات بھی نہیں کی۔ میری باتوں کے جواب ہی دیئے تھے۔ کہ دو گن کر رہا سکتا ہوں۔“ آخر میں انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ روٹی پھر بھی خاموش ہی رہی اور وہ خدا حافظ کہہ کر باہر چلے گئے۔

باہر آئے تو لاؤنج میں ارمین کی منتظر تھی۔ چوہری نواز نے اکنگما اس کو دیکھا اور نفرت سے سوچا یہ وہ کال گرل ہے جو ہر وقت ہر کسی کیلئے خود کو تیار رکھتی ہے۔ کہتی تھی آپ میرے لئے کہتے تو میں خوشی خوشی آ جاتی۔

”مجھے یقین ہے یہ تین دن بہت خوشگوار گزرے ہوں گے۔“ چودھری نواز کو دیکھتے ہی ارم نے مسکرا کر بے باکی سے پوچھا۔  
 ”یقیناً۔“ چودھری نواز مسکرائے پھر کہا۔

”میرا یہاں روز روز آنا مناسب نہیں۔ میڈیا والے ویسے ہی میرے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس ملک میں ایک میں ہی برا آدمی ہوں۔“

”تو کیا ہم لگے یہ گھر بدل لیں۔“ ارم نے فوراً ہی پوچھا۔

”ہاں وہ تو بدلنا ہی ہوگا۔ گلبرگ میں میری ایک کوٹھی خالی پڑی ہے۔ وہاں آج کل میں شفٹ ہو جائیں۔ سیکرٹری ابھی میرے جانے کے بعد فون کر کے بتا دے گا۔“ بات ختم کرتے ہی وہ باہر چلے گئے۔ ان کا ڈائریکٹوریٹ لے کر آ گیا تھا۔ مگر جاتے جاتے بھی ان کا رام کی ایک بات کا جواب مزید دینا پڑا۔ رام نے پھر ببا کی سے پوچھا تھا۔

”روٹی پسند آئی کیسی لگی؟“

”جو سوچا تھا روپی کی تصویریں دیکھ کر اس سے زیادہ پیاری لگی۔“ چودھری نواز نے کہا اور چلے گئے۔ ارم کچھ دیر وہیں کھڑی سوچتی رہی۔ روپی کے روم میں جائے یا نا پھر سر جھٹک کر ماں کے روم کی جانب چل دی۔ وہ بہت خوش تھی گوشتی کاسن کر۔ زبرہ خانم کے روم میں سب ہی موجود تھے۔ پونی کرن اور ابو نے تو ظاہر ہے ماں کے روم میں ہی ہونا تھا۔ ارم کو دیکھتے ہی زبرہ خانم نے پوچھا۔

”چلے گئے چوہری صاحب!“

”جی ہاں چلے گئے۔“ ارم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو زبر و خانم نے جلدی سے پوچھا۔

”مجھ تو کچھ نہیں دیا روٹی کو یقیناً کچھنا کچھ دے کر گئے ہوں گے۔“

”مجھے صرف ایک خوشخبری دے کر گئے ہیں۔ بھلا بوجھیں تو سہی۔ وہ خوشخبری کیا ہو سکتی ہے؟“ ارم نے بڑے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ارم کی بات سن کر سبھی سوچ میں پڑ گئے۔ مگر بہت سوچنے پر بھی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پھر ارم ہی سے پوچھا۔ تب ارم نے ہنستے ہوئے بتایا۔

”وہ کہتے تھے میں روز روز یہاں نہیں آ سکتا اس لئے ہم سب ان کی کوٹھی میں شفٹ ہو جائیں جو گلبرگ میں ہے۔“

”ارے کیا واقعی؟“ زہرہ خانم نے پوچھا۔ پھر ارم کے جی ہاں کہنے پر بولیں۔

”کوٹھی روپی کس نام کرنے کا ارادہ ہوگا ان کا۔“

”یہ تو فی الحال پہنچ نہیں۔ مگر شفٹ ہونے کا ضرور کہہ گئے ہیں۔“ ارم نے پھر بتایا۔ ”ارے چلو جو بھی ہے عارضی طور پر ہی سہی اس کرائے کے گھر سے بلکہ کرائے سے تو جان چھوٹ جائے گی۔ ادھر مہینہ جاتا جا رہا آجنا ہے۔ یہ بتاؤ چلنا کب ہے آج ہی یا۔۔۔۔۔۔ زبرہ خانم نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”آج ہی اگر ان کے سکرٹری کا فون آ گیا تو وہ خبر آج نہیں تو کل پرسوں ترسوں۔“ ارمنا کہہ کر خاموش ہو گئی تو وزیرِ دفاع نے فکر مندی سے پوچھا۔  
”ابدوہی کا کیا کرنا ہے یہ بھی سوچا ہے تم نے؟“

”سوچنا کیا آیا جی! ابھی دیکھ لیجئے کیا کرتی ہوں میں روٹی کا۔“ یہ کہہ کر ارم نے سارا پروگرام ان کو بتایا پھر ملازمہ سے کہا۔

”روپی کے پاس جاؤ اور اس کو بولوارم آپی کہتی ہیں جلدی سے تیار ہو کر آیا جی کے روم میں آ جاؤ کہ سٹوڈیو جانا ہے بری آپ۔“



چودھری نواز کے جانے کے بعد روٹی پھر سے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ جو بھی ہوا تھا یا ہو رہا تھا وہ اب اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ سانی اب اس پر رونا چاہتی تھی۔ رونے کا قلم نہ تھا نہ سوچنے کا۔ ہدایت کار نواز نے سوات کے ہوٹل میں اس کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

”روٹی تم ایک ایسی طفل میں متری ہو جس سے پابرا آنا اب تمہارے لئے بے حد ناممکن ہے۔ مرد کے نزدیک عورت کے جسم کی اہمیت ہے آنسوؤں کی نہیں۔ تم فلمی لائن کی لڑکی نہیں ہو روٹی! تمہیں فلم لائن جوائن نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اب اگر کر چکی ہو تو بھگتو۔ یہ لوگ تمہیں بھاگنے نہیں دیں گے۔“ روٹی کم سن تھی فلم میں کام کرنے سے پہلے وہ بالکل بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کی قیمت بار بار عزت خراب کروا کر لٹا کر چکائی ہوگی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ارم آپی نے چودھری نواز کو اس کے روم میں لانے اور پھر چھوڑ کر جانے کی جرات کیسی کی۔ کیا وہ طوائف تھی یا کال گرل؟ وہ آپا سے صاف صاف کہہ دے گی دوبارہ ایسا ہوا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ خود بھی تو لڑکی ہی تھی۔ اپنے روم میں لے جاتی یا پھر اپنی بہن کرن کے روم میں لے جاتی۔ وہ انہی سوچوں میں بیٹھی کھول رہی تھی کہ ملازمہ نے روم میں داخل ہو کر روٹی کو ارم کا میسج دیا۔

”ارم بی بی آپ کو بلا رہی ہیں۔“ اور واپس چلی گئی۔ روٹی تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر دوپٹہ لے کر ان کے روم کی جانب چل دی۔ مگر وہاں نہیں تھی۔ روٹی نے سوچا آپا جی کے روم میں ہوں گی اور پھر آپا کے روم کی جانب چل دی۔ ابھی وہ آپا کے روم سے تھوڑی دور ہی تھی کہ ارم آپی کو گر جتی برستی آواز سنائی دی۔ وہ شاید آپا پر ہی گرنے لگی تھی۔ ”آپ کو روٹی کی فکر پڑی ہے اور مجھے پورے خاندان کی۔ آپ اچھی طرح ان چودھریوں کو جانتی ہیں۔ انکار سننے کی ان کو عادت نہیں ہوتی۔ ان کے سکریٹری سے جب میں نے کہا سوچ کر بتاتی ہوں تو اس نے کہا سوچنے کی گنجائش۔ اجازت وہاں ہوتی ہے جہاں چو اس کی اجازت ہو۔ آپ نے صرف ہاں کہنا ہے کہ انکار سننا چودھری نواز کی عادت نہیں۔ آپ کا انکار خود آپ کے تو کیا آپ کے خاندان کے حق میں بھی اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے تو پھر بھی آخری کوشش کی کہ روٹی کی جگہ میں خود آ جاؤں مگر وہ نہ مانے۔ انہوں نے کہا فوراً لڑکی لے کر بیٹنگے پر آ جاؤ مگر میں نے انکار کر دیا۔ تو وہ خود ہی گھر آ گئے پھر میں مرنے کیلئے کرتی۔“ ارم نے بات ختم کی تو پوی نے کہا۔

”مجھے بتانا تھا میں اس چودھری کی ایسی ٹیسی کر دیتا۔“

”شٹ اپ!“ ارم غرائی اور ایک زوردار تھپڑ پوی کے منہ پر رسید کرتے ہوئے مزید کہا۔ ”تم مجھ سے زیادہ بولند ہو؟“ روٹی نے بس اتنا ہی سنا اور روم میں جانے کے بجائے واپس اپنے روم میں چلی آئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دل کو اس وقت کچھ کچھ ہونے لگا۔ جس گھر سے بھاگ کر وہ یہاں کرن کے گھر آئی تھی۔ وہاں روتی آپا کی بھی وہاں سے ہمیشہ دقتی رہی ڈرتی رہی خوفزدہ رہی۔ ان کے خط ان کے دوستوں کو دینے کے باوجود محرم ہو کر وہ مستر رہی اور روٹی کو آواز نہ دیا گیا۔

اب اس وقت روٹی قفل کر رہی تھی۔ وہ جس روتی کو چھوڑ کر بھاگی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ آ کر ارم کے جسم میں گھس گئی تھی۔ اس نے جو ارم آپا اور آپا سے کہنا تھا وہ سب بھول گئی تھی۔ اس کو اس وقت ارم آپا کا سوچ کر ہی خوف آ رہا تھا۔ ان سے کوئی بات کہنا اب دور کی بات تھی۔

☆☆☆☆

ملازمہ کے جانے کے بعد ارم نے پوی سے کہا تھا۔

”تم کھڑکی میں کھڑے ہو جاؤ اور جیسے ہی روٹی آتی دکھائی دے مجھے ہاتھ سے اشارہ کر دینا۔ میں شروع ہو جاؤں گی۔“ اور ایسا ہی ہوا تھا۔ روٹی کو آتے دیکھ کر پوی نے اشارہ کر کے بتا دیا تھا۔ اب اس کو جاتے دیکھ کر وہ بتا رہا تھا۔

”آپی! روٹی روم میں آنے کے بجائے واپس اپنے روم میں جا رہی ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“ ارم کو امید نہیں تھی وہاں کے پاس آنے کے بجائے واپس چلی جائے گی۔ گھبرا کر ماں کو دیکھا پھر پوچھا۔

”آپا! اب کیا کرنا ہے۔ کہیں وہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ نہ کر لے۔ اب ایک بار پھر ملازمہ بھیجواں کہ وعدہ دیکھتے ہیں۔“ اور ملازمہ پھر روٹی کو بلا نے لگی تو روٹی نے کہا۔

”ان سے بولو میری طبیعت ٹھیک نہیں میں آرام کر رہی ہوں۔“ ملازمہ یہ سب سن کر واپس چلی گئی۔ جب یہ بات ارم کو بتائی تو اس نے ماں کو گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہائے اللہ آپا جی! مجھے تو معاملہ گڑبڑ والا لگ رہا ہے اب کیا کرنا ہے۔“



”اب جو بھی کرنا ہے خود مجھے ہی کرنا ہے۔ تمہارا کام ختم۔ میں روہی کے روم میں جا رہی ہوں۔ مگر تم میں سے کوئی میرے پیچھے نہ آئے۔“ زہرہ خانم نے کہا اور روم سے نکل کر روہی کے روم کی جانب چل دی۔ وہ روہی کے روم میں آئی تو روہی بستر پر لیٹی آرام کر رہی تھی۔ ان کو دیکھتے ہی اٹھنے کی کوشش کی تو زہرہ خانم نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”ارے ارے اگر طبیعت خراب ہے تو بیٹی لیٹی رہو۔“ پھر روہی کے قریب آئیں اور اس کے سر ہانے بیٹھتے ہوئے اس کا سر پیشانی چوم کر اپنی گود میں رکھتے ہوئے محبت میں چور لہجے سے بولی۔ ”اگر تمہاری طبیعت خراب نہ ہوتی تو میں نے تمہارے روم میں بالکل نہیں آنا تھا۔ ارم نے مجھے تمہارے پاس آنے کے لائق چھوڑا ہی نہیں۔ ارے مجھے تو بتائی نہیں چلا کہ وہ کمینہ چوہری نواز ہمارے گھر آیا اور ارم اس کو تمہارے روم میں چھوڑ گئی۔ وہ تو رووا لے دن جب تم ناشتے پر نہ آئیں تو میں نے تمہارا سبارے میں دریافت کیا۔ تب ارم نے مجھے بتایا تم بیزی ہو۔ میں تمہارے روم میں آنا چاہتی تھی لیکن ارم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم کیوں بیزی ہو۔ اس نے مجھے تمہارے روم میں آنے سے نہ صرف روک دیا بلکہ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک میں اجازت نہ دوں آپ روہی کے روم میں نہیں جائیں گی۔ تم اس کی حکم دینے والی عادت کو تو جانتی ہو یہی وجہ ہے میں تمہارے روم میں نہ آئی۔ ارے وہ تو آج ہی ابھی مجھے اس بے غیرت چوہری کا پتہ چلا ہے اور میرا تو مارے غصے کے خون کھول کر رہ گیا۔“ اتنا کہہ کر روہی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے ضبط کے باوجود آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر زہرہ خانم نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ندو میری بیٹی! ندو۔ ارم کہتی ہے اس نے یہ سب بے حد مجبور ہو کر کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو چوہری صاحبہ انکار کی صورت میں ہمارے ساتھ تمہیں بھی قتل کروا دیتا۔ پھر بھی ارم نے تمہیں بچانے کیلئے اپنا آپ چوہری صاحبہ کو پیش کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے صرف تمہارا کہا کہ تم کو ان کی کوٹھی پر بھیج دیا جائے اور جب ارم نے انکار کیا تو وہ خود ہی گھر آ گئے۔ اس کے بعد جو بھی ارم نے کیا بہت مجبور ہو کر کیا۔ جو بھی ہوا غلط ہوا۔ مگر بے حد مجبوری کی حالت میں ہوا۔ پھر بھی میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ میری مجبوری سمجھ کر مجھے معاف کر دو۔“

بات ختم کر کے زہرہ خانم کو وہ وقت یاد آ گیا تھا۔ جب شریف خاندان کی ہونے کے باوجود انہیں اس کام پر لگایا گیا تھا۔ وہ بھی تو شروع شروع میں یونہی روتی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت تھیں۔ انہیں پیسوں کیلئے ایسے ایسے مردوں کے ساتھ جانا پڑتا تھا جن پر تھوکنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ ارم ان کی کاپی تھی اور کرن اپنے باپ کی۔ ان کے پہلے شوہر خوبصورت نہیں تھے۔ چھوٹا قد اور غیر پرکشش شخصیت تھی ان کی۔ مگر بے حد محبت کرنے والے۔ غیرت مند شوہر تھے۔ ان کی زندگی میں زہرہ کو گھر سے باہر بیزی بھی خود جا کر لانے کی اجازت نہ تھی۔ ان کے بعد حالات نے خاص کر جس راہ پر رضوی نے ان کو لگایا تھا۔ پھر ان کی بیٹی۔ یہ ایک طدل تھی جس میں اترنے کے بعد کوئی اپنے آپ باہر نہیں آ سکتا۔ باہر کھڑے لوگ بھی جب بچانے اور باہر نکالنے کے بجائے مزید اندر تک دھکیل دیں تو پھر بندہ کیا کر سکتا ہے۔ انہوں نے روتے اور سوچتے روہی کو دیکھا۔ وہ وہ تو اب بھی رہی تھی مگر چپ چاپ۔ آج اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ زہرہ خانم اس کے بعد بھی کتنی دیر بیٹھی رہی پھر دوسرے نکلنے کے نیچے رکھے نوٹوں کی گڈی پر نظر پڑی تو اٹھا کر روہی کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ رقم چوہری صاحبہ دے کر گئے ہیں؟“ ان کی بات سن کر روہی نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ چوہری نے اس کو بیورو کھڈ کی چند چیزیں گفٹ کی تھیں۔ مگر پیسے بڑے لوگوں کی بڑی باتیں اس کو دینا مناسب نہیں سمجھا ہو گا۔ جاتے جاتے نکلنے کے نیچے رکھ گئے تھے۔ روہی کو خاموش دیکھ کر زہرہ نے پھر پوچھا تو روہی نے دھیمی اور نرم آواز میں کہا۔

”مجھے نہیں دیئے تھے انہوں نے۔ جاتے ہوئے خود ہی رکھ گئے ہوں گے۔“

”ارے بڑے لوگوں کی بڑی باتیں بیٹی! اپنی ارم آپ کو معاف کر دے اور تیار ہو جاؤ تمہاری فلم کی آج شوٹنگ ہے۔“ روہی پھر بھی چپ رہی تو زہرہ نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”یہ دیکھ میں ماں ہو کر تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ اب کہ روہی اٹھ بیٹھی اور روتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

”آپا جی ایسا نہ کریں مجھے آپ کی ہر بات پر یقین ہے۔ غلطی تو میری اپنی ہی ہے جب میں نے اپنے والدین اپنے خاندان کی عزت کا خیال نہ کیا تو پھر میری عزت کا خیال کون کر سکتا ہے۔ آپ جائیں میں تیار ہو کر آتی ہوں۔ میں تو اپنے گھر سے بھاگی تھی اس وقت بھی جب گھر میں پہلی خوشی تھی۔ لوگوں نے میری عدم موجودگی کا لازمی پوچھنا تھا۔“

”خیر بیٹی! تم نے خوشی سے تو وہ گھر نہیں چھوڑا تھا۔“ اب کہ زہرہ خانم نے جتانے والے انداز میں کہا اور روم سے باہر چلی گئی۔ پھر جاتے جاتے واپس آتے ہوئے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کچھ بھولی بن کر کہا۔



”اے لو میں تمہارے پیسے بھی ساتھ لے کر جا رہی تھی۔“

”آجی آپ لے جائیں میں نے کیا کرنے ہیں۔“ روپی نے کہا تو زہرا آدھی رقم واپس رکھتے ہوئے بولیں۔

”اے لڑکی! جی میں لے جاتی ہوں اور آج ہی تم رکھ لو۔“ انہوں نے اب کے رقم روٹی کو دینے کے بجائے نکلے پر رکھی پھر باہر چلی گئیں۔ روٹی نے وہ رقم اٹھا کر المیاری میں رکھ دی جہاں پہلے بھی کچھ رقم موجود تھی۔ ارم کی تاکید یا حکم تھا کیا پاجی جب پیسے دیں تو ان کا مانا کیا کرو۔ سو لوگ مانگنے والے ہی مل جاتے ہیں۔ خیرات دینے کیلئے ہی تھوڑی رقم اپنے پاس اور پرس میں رکھا کرو۔ تب سے وہ رقم اپنے پاس رکھنے لگی تھی۔ اسی لئے تو عید والے دن ملازمہ کو ایک ہزار دیا تھا اور پومی جو عید والے دن گفٹ اس کو دے کر گیا تھا وہاں بھی اس نے دیکھا ہی نا تھا۔

وہ تیار ہو کر دم سے باہر آئی تو اور فورا اس کو لے کر چل دی۔ راستے میں اس نے نرمی سے کہنا شروع کیا۔

”روبی! تمہارے محل میں اس وقت میرے لئے شدید نفرت ہو گئی۔ میں دھوکے سے چودھری صاحب کو تمہارے کمرے میں چھوڑ گئی۔ مگر میں نے یہ سب مجبوری کی حالت میں کیا۔ بڑے لوگوں کے سامنے ہماری حیثیت ہی کیا ہے۔ جب میں نے یہ لائن جو ان کی بھی تب یہ میرے ساتھ بھی ہوا تھا اب تک ہو رہا ہے اصل میں فلم انڈسٹری میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کا تعلق ہیرا منڈی سے ہے شاہی محلے سے جہاں زار حسن سے ہے اس لئے جو شریف لڑکی بھی اس فیلڈ میں آتی ہے اس کو بھی لوگ طوائف ہی سمجھتے ہیں۔ میں ایک سکریو نہیں کر رہی لیکن جو ہوا مجھے اس پر افسوس ہے اگر وہ تمہاری جگہ مجھے قبول کر لیتا تب بھی میں تمہیں بچا لیتی۔ مگر اس کی ایک ہی ضد تھی صرف روپی اور پھر میں تمہیں کتنوں سے بچا سکتی ہوں۔ یہاں تو ہر قدم پر ایسے بیویاری میوے موجود ہیں۔“

روپی نے خاموشی سے ان کی ساری باتیں سنی تھیں اور پھر ان کی مجبوری سمجھ کر معاف کرتے ہوئے فقط اتنا کہا۔

”آپنی مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔“ اور پھر سٹوڈیو آ گیا۔

عید کی رات ٹی وی پر آنے والا عید شو دیکھنے کیلئے شمشاد نصیر صاحب گڈ وروچی زروبی سب اس وقت ٹی وی آن کئے بیٹھے تھے۔ سلمان گھر سے باہر دوست کے پاس گیا ہوا تھا۔ شو شروع ہوا تو آگے والی چیزز پر بیٹھی مہمان شخصیات پر کمرہ ڈالا گیا تو ان میں روپی بھی شامل تھی۔ سبھی گھر والے چونک پڑے۔ یہ تو اس نے خود ہی خط لکھ کر بتا دیا تھا کہ وہ فلموں میں کام کرنے والی ہے۔ پھر اس کی فلم ”اک بار چلے آؤ“ کی رسم افتتاح کی خبر اور تصویریں بھی اخبار کے فلمی جج کی زینت بنی تھیں۔ اب عید سے چند روز پیشتر اخبارات میں فلم کے اشتہارات اور سینرز تک آویزاں کر دیئے گئے تھے۔ جو سلمان اور نصیر صاحب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے۔ غصے کے ساتھ شدید دکھ اور صدمہ بھی ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ مگر وہ اب کر ہی کیا سکتے تھے۔ وہ شہر بھر میں ان کی عزت نیام کر رہی تھی۔ وہ گھر آ کر جب شمشاد کو ان سینرز کے بارے میں بتا رہے تھے تو آنکھیں لپٹی ہوئی تھیں۔ شمشاد کو تو غصہ ہی آیا تھا۔ انہوں نے پھر یہی کہا۔ ”اللہ کرے تو بھی غزالہ کی طرح کتوں کے ہاتھوں ذلیل اور رسوا ہو کر مرے۔ جیسے ہمیں سارے شہر اور خاندان میں رسوا کر رہی ہو۔“

اس وقت وہ ٹی وی کے عید شو میں موجود تھی۔ شوخ لباس شوخ میک اپ اور ہنسی سکراتی۔ شمشاد بیگم نے مارے غصے کے کہا۔ ”ارے بند کرو ٹی وی میں اس حرامزادی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ دیکھو گھر سے بھاگ کر کتنی خوش ہے۔ خاندان کی عزت کی قاتل باپ اور بھائی کی جان کی دشمن اللہ کرے مرجائے سب بروں کو موت بھی کب جلدی آتی ہے۔“

”اب پھوپھو جی شو تو دیکھنے دیں۔“ رونی کے علاوہ بھی کتنے لوگ ہیں۔ گڈونے کہا۔

”اب بھو بھوجی شو تو دیکھنے دیں۔“ روپی کے علاوہ بھی کتنے لوگ ہیں۔ گڈو نے کہا۔

”اے اگر تم نے ٹی وی بند کیا تو میں کوئی چیز مار کر توڑ دوں گی۔“ شمشاد نے دھمکی دی تو گڈو نے جلدی سے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ یہ ٹی وی اس کے حیز کا تھا۔ شمشاد مسلمان کی منگنی کرنے کے بجائے شادی کر کے گڈو کو گھر لے آئی تھی۔ مسلمان کامل بہلانے اور دھیان بنانے کو اور اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ پھر آتے ہی اللہ نے اپنی رحمت بھی کر دی تھی۔ گڈو بھی روجی کی طرح امید سے تھی۔ اب مسلمان روپی کو بھل کر بیوی بچے کا سوچنے لگا تھا۔ اب روپی پر وہ کم ہی برستا تھا۔ گڈو نے ٹی وی بند کیا تو روجی جو آج رات دعوت پر سسرال والوں کے ساتھ میکے آئی تھی عید کی دعوت کھا کر وہ سب لوگ تو چلے گئے تھے جبکہ روجی چند روز کے لئے رک گئی تھی۔ اب گڈو نے ٹی وی بند کیا تو روجی کہنے لگی۔

”امی ادھر عامر اور اس کے گھر والے بھی یہ شہر دیکھ رہے ہوں گے۔“

”مجبوری ہے دیکھتے رہیں۔ اب کیا کر سکتے ہیں ہم۔ سارے محلے اور خاندان والے بھی تو دیکھتے ہوں گے۔ پتا نہیں کوئی منحوس گھڑی تھی جب یہ بے غیرت ہمارے گھر پیدا ہوئی



تھی۔ ”حمیدہ غصے سے بولنے لگیں اور نصیر صاحب اٹھ کر اپنے روم میں چلے گئے۔ وہ لوگ آج بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ سب درست تھے اور آج بھی وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ روٹی تھی ہی آدھا اس لئے گھر سے بھاگ گئی۔

☆☆☆☆

چودھری نواز کے جانے کے دو ہفتے بعد ہی وہ لوگ ان کی کوٹھی میں شفٹ ہو گئے تھے۔ چودھری کے سکرٹری نے تو فون دوسری دن کر دیا تھا۔ مگر کوٹھی کا رنگ و روغن خراب ہو رہا تھا۔ وہ چودھری صاحب نے نیا کروانے کا حکم دیا تھا۔ نیا رنگ و روغن مکمل ہوتے ہی وہ ان کی کوٹھی میں چلے آئے تھے۔ کوٹھی میں آنے سے پہلے تو نہیں مگر آنے اور سامان وغیرہ سیٹ کرنے کے بعد ارم نے روٹی کو بتا دیا تھا کہ ”یہ کوٹھی چودھری نواز کی ہے۔ انہوں نے وہ گھر چھوڑ کر اس میں شفٹ ہونے کا حکم دیا تھا۔ یہ بھی ان کا حکم تھا کہ تمہیں شفٹ ہونے سے پہلے نہیں بعد میں بتایا جائے۔ یہی وجہ ہے میں نے اب بتایا ہے اس میں میرا قصور نہیں۔“

اُنہیں انہوں نے کہا تھا۔ ارم آپ یوں کہہ رہی ہیں جیسے وہ میرے شوہر ہیں۔ روٹی نے صرف سوچا تھا کہ نامناسب نہیں سمجھا۔ ارم آپ نے بھی بتاتی تب بھی روٹی کو معلوم تھا گھر چودھری نواز کی وجہ سے بدلا گیا ہے۔ اس نے خود روٹی سے کہا تھا۔ اپنی زندگی میں اب میں تمہاری جدائی کا رونا نہیں کروں گا۔ یوں بھی جب وہ مزید دوئی فلموں میں کام شروع کر چکی تھی تب اس نے دیکھا تھا اس جگہ صرف گندگی ہی گندگی تھی یا منافقت ہی منافقت۔

وہاں کارہ جو فلم میں انسان دوستی کا کردار ادا کر رہی ہے۔ پوری دنیا کو وہ بااخلاق بننے کا درس دیتی ہے اور خود وہ ایسی سڑی اور بداخلاق کہ سیٹ پر موجود اپنے سے جو نیئرئی اداکارہ کی بات کا جواب دینا تو دور کی بات اس پر اکڑا دینا بھی پسند نہ کرتی۔ ابھی تک اداکارہ نسیم کے علاوہ کسی اداکارہ نے روٹی سے سیدھے منہ بات نہ کی تھی۔ مطلب پرانی اور سینئر اداکارائیں سب سڑی سڑی رہتی تھیں روٹی سے۔ روٹی کان کھدوئے پر حیرت ہوتی تھی۔ انہی دنوں اس نے ایک ایسی فلم سائن کی جس میں دو ہیروئن تھیں۔ ایک وہاں دوسری اتفاق سے نسیم وہ رسم افتتاح پر بڑی محبت کے ساتھ روٹی سے ملی۔ روٹی سے رہا نہ گیا اور اس نے اداکارہ نسیم کا ہاتھ تھام کر محبت سے پوچھا۔

”فلمی لائن جو اُن کرنے سے پہلے ہی آپ میری فیورٹ اداکارہ تھیں اور اب تو صرف آپ ہی میری فیورٹ اداکارہ رہ گئی ہیں۔“

”یہ تو میرے لئے بہت خوشی کی بات ہے۔“ نسیم نے ہنس کر کہا پھر راز داری سے پوچھا۔

”ویسے وجہ بتانا پسند کرو گی کہ میں کیلی ہی فیورٹ کیسے رہ گئی۔“

”باقی سب اداکارائیں سڑی ہوئی ہیں۔ کوئی مجھ سے بات تک کرنی پسند نہیں کرتا۔ بھلا میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔“ روٹی نے منہ بسورتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے ان کا ذاتی طور پر کچھ نہیں بگاڑا۔ کیمریز جس دھوم دھام سے تمہارا شروع ہوا ہے اس نے ان کو خنجر دہ کر دیا ہے۔ آنے والے دور میں تم ساری انڈسٹری پر چھا جاؤ گی۔ بتا نہیں ان کیلئے جگہ بچے گی یا نہیں۔ ہر آنے والی نئی ہیروئن کے ساتھ سینئر اداکارائیں ایسا ہی سلوک کرتی ہیں۔ صرف تمہارے ساتھ نہیں ہر دور میں یہی رویہ رہا ہے۔ جب نئی پرانی ہو جاتی ہے تو وہ خود بھی پھر وہی کچھ کرتی ہے جو اس کے ساتھ ہوا ہوتا ہے۔ یہ ہر دور میں ہوتا رہے گا۔“

”میں تو کبھی ایسا نہ کروں گی۔“ روٹی نے جلدی سے کہا۔

پھر پوچھا۔ ”آپ بھی تو مجھ سے ان جیسا سلوک نہیں کرتیں۔ آخر آپ بھی تو بڑی ہیں مجھ سے اور پرانی بھی۔“

”بس تمہارے ساتھ نہیں کیا ایسا۔ بتا نہیں کیوں؟ باقی میں بھی ساری کی ساری ان جیسی ہوں۔ جو وہ کرتی ہیں وہی میں کرتی ہوں۔“ نسیم نے ہنس کر کہا اور چلی گئی۔

☆☆☆☆

روٹی کو چودھری صاحب کی کوٹھی میں شفٹ ہوئے وہ تیسرا ہفتہ تھا۔ جب چودھری نواز سے اس کی دوسری ملاقات ہوئی۔ آنے سے پہلے اب کی بار بھی انہوں نے روٹی کو بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ہاں کوٹھی میں شفٹ ہونے کے بعد انہوں نے اپنا بندہ چوکیدار رکھا تھا۔ اور روٹی کی حفاظت کیلئے بھی دو باؤی گارڈ رکھے تھے۔ وہ اکثر ارم سے فون پر بات چیت کرتے رہتے تھے۔ آج آنے سے پہلے انہوں نے ارم کو بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہ ان کی اپنی کوٹھی تھی اپنا چوکیدار اور روٹی کیلئے بھجوائے باؤی گارڈ۔ وہ سیدھے روٹی کے بیڈ روم میں نہیں آئے تھے۔ ان کو معلوم ہی نہیں تھا کہ روٹی کا بیڈ روم کہاں ہے۔ وہ رات کا ایک بجے آئے تھے اور اس وقت سب گھر والے جاگ رہے تھے۔ یہاں بات ہے کہ



روبی ان میں نہیں تھی۔ گاڑی کا ہارن سنتے ہی ارم نے کہا۔ آجی! لگتا ہے چودھری صاحب آگئے۔ پھر وہ دونوں ماں بیٹی ان کے استقبال کیلئے روم سے باہر چلی آئیں۔ مگر چودھری صاحب ان کے پاس زیادہ نہیں رکے تھے۔ انہوں نے روبی کے روم کا پوچھا اور ارم ان کو روبی کے روم کی جانب لائی پھر روم کا دروازہ ہٹا دیا۔

اندرونی سوچتی تھی۔ تین فلموں کا شیڈول کچھ اس طرح کا تھا کہ ہر روز صبح دس بجے سٹوڈیو جاتی تو رات دس گیارہ بجے کہیں فارغ ہوتی۔ پہلے عید الفطر پر حاجی سردار نے فلم اکسار چلے آؤ کی شوٹنگ دن رات لگا کر مکمل کروائی تھی۔ اب ان میں سے ایک یا دو فلمیں فلم پروڈیوسر بکرا عید پر ریلیز کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے مسلسل عکسبندی ہو رہی تھی۔ سارا دن شوٹنگ میں مصروف رہنے کی وجہ سے روبی ہر طرح تھک جاتی۔ ان کے ساتھ کوہ زہرہ خانم بھی لازمی جاتی تھیں۔ مگر وہ بیٹھی بیٹھی اگلے کرنل کی کمی پوری کر لیتی تھیں۔ مگر روبی کو تو گھرا کر ہی سکون سے سونا نصیب ہوتا تھا۔ وہ گھرا آتے ہی کھانا کھاتی پھر اپنے روم میں آ جاتی۔ اس وقت بھی روبی کبری نیند سو رہی تھی اس لئے تیسری چوتھی دستک پر اس کی آنکھ کھلی۔ مگر اٹھنے کا موڈ نہیں تھا۔ اس نے وہیں لیٹے لیٹے پوچھا۔

”کون ہے؟“

”روبی دروازہ کھلو۔“ ارم کی آواز آئی۔ روبی کے جسم میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ اس نے لیٹے لیٹے سوچا کیا آج پھر ارم آپ کی کسی مرد کو لے کر آئی ہے۔ پھر آدھی نیند میں ہونے کے باوجود خیال آیا۔ زہرہ خانم نے اس کو خود بڑے فخر سے بتایا تھا۔ روبی اب تو ہر فکر سے آزاد ہو جا۔ اب کوئی فلم ساز یا ایڈیٹر کار نہیں ہاتھ نہ لگا سکے گا۔ چودھری صاحب نے اس لئے تو تمہارے لئے باڈی گارڈ بھجوائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میرے علاوہ کسی نے اب روبی کو چھونے کی کوشش کی تو جان سے مرادوں گا۔ اور اب پھر اس وقت ارم آپ کیوں دروازہ ہٹا کر رہی ہے۔ ارم نے دوبارہ آواز دی تو کسبندی سا بھی۔ دروازہ کھولا تو باہر ارم اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ چودھری صاحب بھی ہاتھ میں اپنا سیاہ ریف کیس لئے کھڑے تھے۔

”اتنی کبری نیند سو رہی تھی کہ اٹھتے اٹھتے دس منٹ لگا دیئے۔ دیکھو تو چودھری صاحب آئے ہیں۔ اتنا کہتے ہی وہ واپسی کیلئے مڑ گئی۔ مردوں کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی جلدی سے روبی کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو روبی نے چودھری صاحب کی جانب نظر اٹھائی۔ وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے روبی کو دیکھ رہے تھے۔ نظریں ملتے ہی پوچھا۔

”اندرا نے کانٹیں کھو گئی۔“

روبی منہ سے کچھ کہنے کے بجائے ایک جانب ہٹ گئی۔ بل میں سوچا۔ اوہ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا کسی اور مرد کو وہ مجھے چھونے کی اجازت نہیں دیں گے کوئی اور مرد یہاں نہیں آ سکتا۔ مگر خود چودھری صاحب تو آ ہی سکتے تھے۔ چودھری صاحب روم کے اندر جا چکے تھے۔ مگر وہ ابھی تک دروازہ پکڑے ہوئے کھڑی تھی۔ چودھری صاحب نے ریف کیس رکھنے کے بعد مڑ کر روبی کو دیکھا۔ پھر بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”روبی کب تک دروازے میں کھڑا رہنے کا پروگرام ہے۔“

روبی نے مڑ کر ان کو دیکھا تو انہوں نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”اب دروازہ بند کر کے یہاں آ جاؤ۔“ روبی کا روم کے اندر آ نے کے بجائے باہر بھاگ جانے کو بل چاہ رہا تھا۔ چودھری نواز اس کے والد سے بھی عمر میں بڑے ہوں گے مگر اس قدر عیاش۔ پیسہ ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپس پیسے کدور پر اپنی پوتی تو اسی برابر لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے رہیں۔ وہ باطل خواستہ دروازہ بند کر کے ان کے قریب آئی۔

”نیند آ رہی ہے؟“

روبی نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر وہ کہہ دے ہاں نیند آ رہی ہے تو کیا وہ اس کو سونے کی اجازت دے دیں گے۔ اس وقت وہ روبی کے گھر سونے کیلئے تو نہیں آئے تھے۔ چودھری نواز روبی کے تاثرات بغور نوٹ کر رہے تھے۔ اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ گئے۔ یہی وجہ ہے بولے۔ ”اچھا چھوڑو نیند کا گرا بھی رہی ہے۔ یہ بتاؤ خود کیسی ہو؟“

ان کی بات سن کر روبی نے سوچا۔ اب یہ بھی کتنی فضول بات ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے ٹھیک ٹھاک بیٹھا ہے اور آپ پوچھیں کیسی ہو۔ اونہہ دکھائی نہیں دیتا کہ اچھی ہوں۔ عیاش انسان! روبی نے کھولتے ہوئے صرف بل میں سوچا۔

”خفا ہو نیند خراب ہونے پر۔ بولنے کا موڈ نہیں بیاری! میں نے پوچھا ہے کیسی ہو؟“ چودھری صاحب نے روبی کا ہاتھ تھام کر مزید اپنے قریب کرتے ہوئے پوچھا تو روبی کو کہنا



”جی اچھی ہوں۔“

”مجھ سے نہیں پوچھو گی میں کیسا ہوں؟“ انہوں نے کہا تو روپی کو پوچھنا پڑا۔

”آپ کیسے ہیں؟“ اور دل میں کہا۔ الو کے پٹھے! ٹھیک تھے تو یہاں آئے ہو۔ مگر وہ یہ بات صرف سوچ سکتی تھی۔ جبکہ اس کے حال پوچھنے پر چوہری نواز مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”روپی! ایک تو فون تمہارے روم میں نہیں تھا۔ پھر تم اتنی کم کوہرور و گنتی کی چند باتیں کی تھیں فون پر سوچا تمہیں مشکل میں ڈالنے کا فائدہ؟ اس لئے فون نہیں کیا مگر میں ہر وقت تمہیں مہم کرتا رہا ہوں۔ اب تو صبح ہی یہاں تمہارے روم میں فون لگ جائے گا۔ مجھے ایک ہفتہ یہاں قیام کرنا ہے۔ میرے اپنے بھی کچھ ذاتی کام ایسے ہیں جن کیلئے فون کا ہر وقت میرے پاس ہونا ضروری ہے۔ (ان دنوں موبائل ابھی پاکستان میں متعارف نہیں ہوا تھا۔) روپی ان کی بات سن کر چپ رہی تو چوہری صاحب اس کو چھوڑ کر اپنا بریف کیس کھولنے لگے اس میں سے ایک کانڈاٹ والا بڑا لفافہ نکال کر روپی کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ لاؤ سنبھالو۔ یہ صرف تمہارے لئے ہے۔“

”یہ کیا ہے؟“ روپی نے لفافہ ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

”اس گھر کی رجسٹری۔ یہ کوٹھی میں نے تمہارے نام کر دی ہے۔“ انہوں نے روپی کو خوش کرنے کو بتایا۔

”کیوں بھلا۔۔۔؟“ روپی نے ان کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ واقعی حیران تھی کہ انہوں نے کیا سوچ کر یہ کوٹھی میرے نام کر دی۔ روپی کی بات سن کر چوہری صاحب نے محبت سے اس کو دیکھا پھر کہا۔

”تم بہت معصوم ہو روپی! لڑکیاں ایسی چیزیں دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ مگر اس پہلی ملاقات میں جو تمہیں چند چیزیں کھانڈ کی میں نے گفٹ کی تھیں۔ تب بھی تم نے خوشی کے بجائے حیرانی کا ہی اظہار کیا تھا۔ محض اس وجہ سے واپس جاتے ہوئے پیسے تمہارے ہاتھ پر رکھنے کے بجائے میں نکلنے کے نیچے رکھ گیا تھا۔ وہ رقم تم نے اٹھائی تھی یا گھر کا کوئی اور فرد لے گیا۔“

”آجی نے دیکھ لی تھی۔ آدمی مجھے دی اور آدمی خود رکھ لی تھی۔“ روپی نے بتایا تو چوہری صاحب مسکرائے پھر کہا۔

”اگر تم سچ بولنے کا وعدہ کرو تو ایک بات پوچھوں۔“

روپی نے نگاہ اٹھا کر ان کو دیکھا۔ مگر چپ رہی اور چوہری صاحب نے کہا۔

”اچھا چھوڑو رات بتی جا رہی ہے تاہم پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں اس دن میں پہلی بار تم سے ملنے آیا تو تم لوہن کی طرح بنی بنی بیٹھی تھی۔ آج سوچا چانک جا کر دیکھوں تو سہی سادگی میں کیسی لگتی ہو۔“ ان کی بات سن کر روپی نے دل ہی دل میں سوچا بلکہ دانت پیس کر سوچا۔

”تم دن جیسے میں لوہن بن کر رہی رہی تھی۔ وہ لباس اتار کر میں نے دوبارہ نہیں بلکہ سادہ سوٹ پہنا تھا، مگر وہ چپ رہی۔ یہ دیکھ کر چوہری صاحب اٹھے بریف کیس صوفے کے کونے میں رکھی بتائی پر رکھا۔ یہ دیکھ کر روپی نے ہاتھ میں پکڑا لفافہ سائڈ میز پر رکھا اور سوچا۔

”یہ میری بربادی کی قیمت ہے اور کسی مرد کے پاس نہ جانے کی وارنگ بھی ہے۔“ مگر اس سے زیادہ سوچ سکی کہ چوہری صاحب لباس بدل کر واپس بیڈ پر آ گئے تھے۔

☆☆☆☆

اس بار چوہری صاحب ایک ہفتہ روپی کے پاس رہے تھے۔

فون کو کہ گھر میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ مگر اب روپی کے روم میں صرف اس کا استعمال کے لئے لگ گیا تھا۔ چوہری صاحب نے کہا تھا۔

”اب میں تم کو فون کرتا رہوں گا۔“ اس ایک ہفتے میں چوہری صاحب نے اس کے ساتھ بیٹا باتیں کی تھیں مگر روپی سے بھی چند باتیں بار بار پوچھی تھیں۔ جن میں سب سے اہم



یہ تھی کذبہ خاتم تمہاری سگی خالہ ہے؟  
 ”آپ کو کوئی شک ہے۔“ روبی نے جواب دینے کے بجائے التماس کیا۔  
 ”ہاں شک ہے۔“ چودھری صاحب نے کہہ دیا۔  
 تو روبی کو کہنا پڑا۔

”جی وہ میری سگی خالہ ہیں۔ میری مائی فوت ہو گئی تھیں (اللہنا کرے) روبی نے دل میں سوچا) اور میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ میری دوسری ماں یعنی سوتیلی ماں کا سلوک مجھ سے اچھا نہیں تھا۔ میری سوتیلی ماں بہت تیز عورت تھی۔ وہ بڑی بدمعاش عورت تھی۔ میری خالہ مجھ سے ملنے آئیں تو میں نے ان کو بتا دیا۔ خالہ نے میری بات سن کر بابا سے شکایت کی تو انہوں نے کہا۔

”تم کو اگر زیادہ محبت ہے تو اپنے ساتھ لیتی جاؤ۔“ اور میں خالہ کی سگی بہن کی بیٹی تھی یعنی سگی بھانجی اس لئے وہ مجھے ساتھ لے آئیں۔“ چودھری نواز نے بہت غور سے روبی کی بات سنی پھر پوری سنجیدگی سے پوچھا۔  
 ”سوتیلی ماں بدمعاش عورت تھی؟“ رے کا ایک بار پھر روبی کو دیکھا اور اپنی پوری بات مکمل کی۔  
 ”سوتیلی ماں بدمعاش عورت تھی اور زہرہ خاتم کیا شریف عورت ہے۔ وضاحت کرنا پسند کرو گی۔ بلکہ ان کی بیٹی ارم بھی۔“ ان کی بات بہت وزنی تھی۔ روبی کے پاس چپ رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر چودھری صاحب نے پھر پوچھا۔  
 ”کہاں کی رہنے والی ہو۔“

”پتو کی۔“ روبی نے اب کفورا کہہ دیا۔  
 ”ہوں پتو کی شہر یا کسی دیہات کی۔“ انہوں نے پھر پوچھا۔  
 ”گاؤں کی۔“ روبی نے پھر کہا۔  
 ”کون سے گاؤں کی؟ مجھے بس نام بتا دو۔ میرے ہند کا ایک منٹ میں سارا پتا کر لیں گے تم کچ کہہ رہی ہو یا۔“ انہوں نے روبی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔



”چودھری صاحب آپ کو آم کھانے سے مطلب ہونا چاہئے یا پیڑ گٹنے سے نہیں۔“ روبی نے پہلی بار تلخ لہجے میں کہا۔ چودھری اس کا س لہجے پر چوٹے اور پھر ہستے ہی چلے گئے اور روبی نے دل میں سوچا۔  
 ”کیا یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا جو وہ منہ نہ لگے ہیں۔ ہستے ہستے چودھری صاحب نے روبی کی کلائی تھام کر اپنی جانب کھینچ لیا۔  
 ”کہاں آؤ بولنے کی زحمت کا رہ نہیں کرتی ہو اور اب یہ لب و لہجہ۔ بھئی واہ زہ آ گیا۔“ مگر اس کے بعد روبی کا زہر و خراب ہوا تھا۔ اس ہفتے کے درمیان ارم اور زہرہ خاتم صرف دو بار اس کے درم میں آئی تھیں چودھری کی خیریت دریافت کرنے اور روبی کو دیکھنے۔ چودھری صاحب کے آتے ہی شوٹنگ کیلئے سٹوڈیو جانے کا سلسلہ رک گیا تھا۔ ایسے میں سائیڈ میز پر پڑے لفافے کو دیکھتے ہوئے زہرہ خاتم نے روبی سے پوچھا تھا۔  
 ”روبی گڑیا اس لفافے میں کیا ہے۔“

”اس کوٹھی کی رجسٹری۔“ روبی نے بتایا۔ زہرہ خاتم کا دل جیسے ہڑکنا بھول گیا تھا پھر بھی تصدیق کرنا ضروری تھا۔ مصنوعی حیرت سے پوچھا۔  
 ”اس کوٹھی کی رجسٹری تمہاری میز پر کیوں؟“  
 ”چودھری صاحب نے یہ کوٹھی میرے نام کر دی ہے۔“ یہ بتا کر روبی نے رجسٹری والا لفافہ اٹھا کر زہرہ خاتم کے حوالے کرنا چاہا۔ مگر چودھری نواز نے فوراً ہاتھ سے لفافہ پرے



کرتے ہوئے تنہی لہجے میں کہا۔

”اسا اپنے پاس رکھو۔“ یہ دیکھ کر زبرہ خانم نے خود بھی جلدی سے کہا۔

”ہاں ہاں نیٹا اس اپنے پاس رکھو۔ یہ تمہاری چیز ہے۔“ روبی چپ رہی تاہم رجسٹری والا لفافہ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ زبرہ خانم اب روبی کے بجائے چوہری نواز سے کہہ رہی تھی۔

”چوہری صاحب اگر یہ کرم کیا ہے تو ایک نوازش اور کر دیں۔“

”کیسی نوازش.....؟“ چوہری صاحب نے اپنا غیر ملکی سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

”روبی کو ارم کی گاڑی میں سٹوڈیو جانا ہوتا ہے اور بھی کبھار ارم خود بھی مصروف ہوتی ہے۔ اس وجہ سے پھر ٹیکسی میں جانا پڑتا ہے۔ اب آپ نے کوٹھی گفٹ کی ہے تو اس کوٹھی کے پورچ میں ایک گاڑی بھی روبی کے نام کی لا کر کھڑی کر دیں۔“

”مگر مجھے گاڑی چلانی نہیں آتی۔“ روبی نے جلدی سے کہا تو ارم بھی جلدی سے بول پڑی۔

”ارے گاڑی چلانا کوئی مشکل بات ہے۔ میں سکھا دوں گی تمہیں۔“

”ہاں ہاں ارم سکھا دے گی۔“ زبرہ خانم نے ارم کی بات کی تائید کی تو چوہری صاحب نے پہلے ان ماں بیٹی کو دیکھا پھر روبی کو جو ان کی بات سن کر چپ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر روبی کو دیکھتے رہے پھر سگار کا ایک کش لے کر پوچھا۔

”ینگم صاحبہ گاڑی چاہئے یا نہیں.....؟“ روبی پھر بھی خاموش ہی رہی۔ یہ سوچ کر کہ کیا کبھی اپنی عزت کی قیمت چاہئے۔ کتنی بری بات کی ہے آپاچی نے۔ چوہری صاحب اس کو خاموش دیکھ کر خود ہی سوچ کر بولے۔

”میرے جاتے ہی نہ صرف نئی کار بلکہ ساٹھ ڈائریور بھی آجائے گا۔“ یہ سن کر زبرہ خانم نے کہا۔

”یہ بات ہوئی نہ۔ بڑے لوگوں والی۔ گاڑی آنے سے کوٹھی مکمل ہو جائے گی۔“ پھر وہ روبی کو مبارکباد دیتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں تو چوہری نواز نے روبی کو شرارت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”زبرہ خانم تمہاری خالہ ہے نا وہ بھی سگی والی۔“

”بتا چکی ہوں سگی خالہ ہیں۔ پھر آپ کو شک کیوں ہے؟“ روبی نے زچ ہو کر کہا تو چوہری صاحب بولے۔ ”اگر وہ سگی خالہ ہیں تو تم نے ان کو خالہ کہنے کے بجائے آپاچی کیوں کہا۔“

”آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ چونکہ ارم کرن ان کو ماں کے بجائے آپاچی کہتی ہیں اس لئے میں بھی آپاچی کہتی ہوں۔ کیونکہ وہ کہتی ہیں پہلے میری دو بیٹیاں تھیں مگر اب تین ہیں۔“ روبی نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی تو چوہری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہت بچی ہو۔ چھوٹی ہونے کے باوجود۔“ اور پہلی بار روبی کے ذہن میں ایک گندی بات آئی اور اس نے سوچا کہہ دے۔

”آپ جیسے بچی عمر کے مردوں کے ساتھ رہنے سے۔“ مگر وہ کہہ نہ سکی اور پھر چوہری صاحب چلے گئے۔ انہوں نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ ان کے جانے کے دوسرے ہی دن گاڑی ان کی کوٹھی میں آ گئی تھی۔ ساتھ گاڑی کے کاغذات بھی۔ یہ گاڑی بھی روبی کے نام پر خریدی گئی تھی۔

چوہری صاحب کے رخصت ہوتے ہی ارم اور زبرہ خانم بڑی بے تابی سے کوٹھی کی رجسٹری دیکھنے روبی کے روم میں آئی تھیں۔ رجسٹری والا لفافہ بھی سائڈ میز پر پڑا ہوا تھا مگر زبرہ خانم نے خود اٹھانے کے بجائے روبی سے کہا۔

”روبی بیٹی لاؤ ذرا مجھے بھی رجسٹری دکھانا۔“ روبی نے لفافہ اٹھا کر رجسٹری نکال کر زبرہ خانم کو تھما دی۔ دونوں ماں بیٹی نے بڑے غور سے رجسٹری کو دیکھا پھر چند باتیں کرنے کے بعد یعنی کوٹھی کی مالک بننے کی مبارکباد دینے کے بعد جیسے دم لے کر جاتی تھیں ویسے رجسٹری ساتھ لے کر جانے لگی اور روبی نے کہا۔



”رجسٹری مجھے واپس کرتی جائیں آپاجی! چودھری صاحب نے بہت تاکید کی تھی کہ رجسٹری کو کسی کے حوالے نہیں کرنا۔ اگر کسی کو دی تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔“

روپی کی بات سنتے ہی زہرہ خانم نے جلدی سے رجسٹری روپی کو واپس کر دی۔ روپی کی بات کا برا منائے بغیر کہ رجسٹری ان کے پاس ہوتی یا روپی کے ہاتھ ایک ہی بات تھی۔ وہ چودھری صاحب کو تھا نہیں کر سکتی تھیں اور ام نے رجسٹری کو دیکھنے کے بعد حسرت سے کہا۔

”بہت خوش نصیب اور لگی ہو روپی اتنی چھوٹی عمر میں سب حاصل کر لیا۔ اس کا ش تمہاری جگہ میں ہوتی۔ دیکھو کتنے برسوں سے میں بھی شوہر جو ان کئے ہوئے ہوں مگر یہ شہرت میرا مقدر رہی اور نہ ہی کسی چودھری صاحب جیسی شخصیت کا قرب نصیب ہوا جو مجھے بھی شہرت کی بلند یوں تک پہنچا دیتا۔ دولت مند بنا دیتا۔“

روپی ان کی باتیں سن کر چپ ہی رہی۔ مگر ان کو ام آپ کی بات اچھی نہ لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر جانے لگی تو زہرہ نے پوچھنے کے بجائے چودھری صاحب کوئی رقم بھی دے کر گئے ہیں۔ خود ہی نکلے اٹھا کر دیکھنے لگی۔ مگر آج ان کے نیچے کچھا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ واپس چلی گئیں۔ اور روپی کرن کے بارے میں سوچنے لگی جو اس کی دوست تھی۔

جب چودھری نواز پہلی بار اس کدم میں تین یوم رہ کر گیا تھا تب اس نے روپی سے بطور خاص کہا تھا۔

”تمہارے ساتھ جو بھی ہوا بہت برا ہوا۔ مگر یہ سب کچھ مجبوری کی حالت میں ہوا اور جب تک تم شوہر میں ہوا یہاں ہوتا رہے گا۔ میرے ساتھ ایک مہربانی کرو میں ہاسٹل جانا چاہتی ہوں۔ پیلیز مجھے ہاسٹل بھجوا دو۔ جب تم روتی ہو تو میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے گھر والوں کے ساتھ ساتھ تم مجھے بھی اپنا مجرم سمجھتی ہو اور میں زیادہ وضاحت کرنے کے بجائے اتنا ہی کہوں گی میں تمہاری مجرم ہوں یا دوست اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ فی الحال تو میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“

مگر اس بار تو میں نہیں روئی کسی کے بھی سامنے۔ روپی نے ساری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف رونے والی بات کا جواب دیتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”پھر بھی اب اکیلے میں اس گھر کی سنسان خاموشی میں میرا دل گھبراتا ہے۔ جب کالج سے گھر آتی ہوں تو آپ کی وی سٹیشن جا چکی ہوتی ہے۔ آپا تمہارے ساتھ سٹوڈیو گئی ہوتی ہیں اور میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔ اس تنہائی سے ڈرنے لگی ہوں میں۔“

”ابو اور پوی تو گھر پر ہی ہوتے ہیں پھر تم گھر میں تنہا کیسے ہوئی۔“ روپی نے کہا۔

”مجھے ان دونوں باپ بیٹے سے شدید نفرت ہے۔“ کرن نے پہلی بار روپی سے کہا۔

”کیسی بری بات کرتی ہو۔ تم کو اپنے باپ بھائی سے نفرت ہے۔“ روپی نے حیرت سے کہا تو کرن نے تنک کر جواب دیا۔

”مجھے تو صرف باپ اور بھائی سے نفرت ہے تم کو اپنے پورے خاندان سے نفرت ہے۔ یا را میرے ہاسٹل کا خرچہ اٹھا لو اب کے کرن نے منت کرنے والے انداز میں کہا تو روپی بولی۔

”یار! ایسی باتیں کر رہی ہو۔ میرا جو کچھ بھی ہے تم لوگوں کا ہی ہے۔ مجھے تم لوگوں کو چھوڑ کر اور کہاں جانا ہے؟ مگر تمہارے ہاسٹل جانے سے میں تمہارا ہواؤں گی۔ میرا بھی تو سوچو۔ مگر کرن نے روپی کی ایک نہ مانی اور ہاسٹل چلی گئی۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ سمجھتی تھی یہ کوئی چودھری صاحب کی ہے۔ وہ شاید ہر روز ہی آیا کریں گے جبکہ چودھری نواز تین ہفتے بعد آیا تھا۔ اس ایک ہفتے میں وہ چودھری نواز سے تھوڑی بہت فری ہو گئی تھی مگر چودھری نواز کے بار بار پوچھنے کے باوجود روپی نے ان کو اپنے خاندان کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی کبھی بتانے کا پروگرام تھا۔

چودھری نواز نے کہا تھا اس کی زندگی میں کوئی مرد اس کو چھو نہیں سکتا۔ مگر ایک دن فلم ساز تو کیا روپی کے میک اپ مین نے میک اپ کرتے ہوئے روپی سے کہا۔

”میڈم میں کب خوش کریں گی آپ؟“ روپی بھی اس کا اشارہ پیسوں کی جانب ہے۔

”بولی کب سے کیا مطلب؟“ بھی کر دیتی ہوں۔“ روپی کی بات سنتے ہی میک اپ مین حد سے بڑھنے لگا تو روپی نے ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا پھر میک اپ روم سے باہر آ گئی۔

پھر ایسی ہی ایک دن فضول بات جب اس کے کمرہ مین نے بھی اس کو تنہا دیکھ کر کہہ دی تو وہ اس کو تھپڑ تو نہ مار سکی البتہ خوب جی بھر کر برا بھلا کہا اور شوٹنگ چھوڑ کر طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنا کر زہرہ خانم کے ساتھ گھر آ گئی تھی۔



دو دن بعد وہ آئی اور ہدایتکار سے میک اپ مین کی شکایت کی۔ ہدایتکار تیار ہی تھے۔ بولے اچھا اور چپ ہو گئے۔ یہ دیکھ کر روبی نے کہا۔  
”آپ اس کو سمجھائیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

یہ سن کر ہدایتکار نے کہا۔ ”اچھا میں اس کو سمجھاتا ہوں۔ مگر ابھی تو جاؤ۔“ وہ زبردستی خاتم کو ساتھ لے کر میک اپ روم میں آئی۔ میک اپ مین نے میک اپ کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ تاہم جب وہ میک اپ کروا کر باہر سیٹ پر آئی تو اداکارہ نسیم نے جو اس فلم کی دوسری ہیروئن تھی اس کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے مسکرا کر پوچھا۔  
”کیا میک اپ مین سے تمہاری ناراضی چل رہی ہے آج کل روبی؟“

”آپ کو کس نے بتایا۔“ روبی نے جلدی سے پوچھا۔

”تمہارے خراب میک اپ نے۔“ نسیم نے ہنس کر کہا۔ وہ بہت خوش اخلاق اور اچھی تھی۔ روبی کو ایک جانب لے جا کر سمجھاتے ہوئے بولی۔

”کل تم تو آئی نہیں تھی۔ فلم کا کمرہ مین بھی ڈائریکٹر سے تمہارے رویے کی شکایت کر رہا تھا۔ ان لوگوں سے ناراضی اچھی نہیں ہوتی۔ ان کے بغیر ہم سٹار بن ہی نہیں سکتے۔“

”کیا مطلب؟“ روبی نے کچھنا سمجھتے ہوئے پوچھا۔ نسیم نے پوری سنجیدگی سے دوستانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو ابھی تمہاری ایک فلم ریلیز ہوئی ہے اور فلم انڈسٹری میں ایک مضبوط مقام بنانے کیلئے ایک لمبے عرصے تک راج کرنے کیلئے ابھی تم کو بڑوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے لوگوں کو بھی خوش کرنا پڑے گا۔ ہاں جب تمہاری مارکیٹ ویلیو مضبوط ہو جائے جب صرف ایک فلم نہیں بہت ساری تمہاری فلمیں کامیابی سے ہم کنار ہو جائیں جب تم ہر فلم ساز اور ہدایتکار کی ضرورت بن جاؤ پھر ان چھوٹے لوگوں کو تو کیا بڑے لوگوں کو بھی جوتے کی نوک پر رکھ سکتی ہو۔ لیکن ابھی تمہارا رویہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ نسیم کی پوری بات سن کر اور پھر اس کا مطلب سمجھ کر روبی نے رخ لہجے میں کہا۔

”میں طوائف نہیں ہوں کہ سب کو خوش کرتی پھروں۔ کبھی فلم ساز، کبھی ہدایتکار اور اب میک اپ مین اور کمرہ مین۔“ وہ نہیں جانتی تھی نسیم کا تعلق بھی بازار سے تھا۔ وہ پیدائشی طوائف تھی۔ نسیم نے بڑے تحمل سے روبی کی بات سنی پھر برامانے بغیر کہا۔

”تم ابھی چھوٹی ہو روبی! اور بتائیں کیوں مجھے اچھی بھی لگتی ہو۔ اگر تمہارا تعلق شریف خاندان سے تھا تو پھر فلم انڈسٹری کو جوائن نہیں کرنا تھا۔ اور اب اگر کر چکی ہو اور عزت بھی گنوا چکی ہو تو پھر اس لائن کے جو تقاضے ہیں وہ تمہیں لازمی پورے کرنے ہونگے۔ ہمیشہ نہیں صرف تھوڑے عرصہ کیلئے۔ جب تک تمہارا ایک مقام نہیں بن جاتا۔ پیر نہیں جم جاتے۔ ورنہ میں تم کو صاف صاف بتا دوں اگر تم کمرہ مین کو ناخوش رکھو گی تو وہ فلم میں تمہارے چہرے کا کلور اپ اچھے طریقے سے پیش نہیں کرے گا۔ تمہارے ساتھ جو نیر چہرے کا ہمیت دے گا۔ مگر تم کو نہیں اور میک اپ مین ایسی مہارت سے تمہارا میک اپ خراب کرے گا کہ جب سینما میں فلم شروع ہوگی تو لوگ تم کو ہیروئن کے بجائے چڑیل سمجھ کر چیخیں مار کر بھاگ جائیں گے۔ اگر فلم میں اچھا کام کرنا ہے اور خوب صورت بھی نظر آنا ہے تو پھر شروع شروع میں بتائیں کس کس کو خوش کرنا پڑے گا۔ جب مقام بنا لو تو پھر سب کو جوتے کی نوک پر رکھو۔ مگر پھر بھی میں تم کو بتا دوں روبی ڈیر! جب کوئی غیر ملکی وفد آئے گا پاکستان تو تم کو پر فارم کرنے کیلئے بلایا جائے گا۔ اور ایک فلم کے کبھی دوسری تیسری فلم کے سونگ پر پر فارم کرنا ہی پڑے گا۔ تم کتنی بھی بڑی بن جاؤ حکومت کے آگے انکار نہیں کر سکتی۔ وہ تم کو زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے۔ اب تم خود ہی خوب اچھی طرح سوچ لو کہ کام کرنا ہے تو پھر سب کو خوش بھی کرنا ہوگا۔ ورنہ فلم انڈسٹری چھوڑ دو۔“ اور فلم انڈسٹری کو نہ چھوڑنا اس کی مجبوری تھی۔ وہ اپنی ساری ہی کشتیاں جلا کر اپنی دوست کرن کے گھر آئی تھی مگر کیا وہ گھر تھا۔

چودھری نواز کے یہ کہنے کے باوجود کہ جب تک وہ روبی کے ساتھ ہے کوئی اور مرد روبی کو چھو نہیں سکتا۔ مگر اسے بتائیں اپنی فلموں کی کامیابی کیلئے کتنوں کو خوش کرنا پڑا تھا۔ اور سب کو خوش کرنے کے بعد اس نے ایک بار روتے ہوئے سنجیدگی سے سوچا تھا۔

”کیا اپنی بار بار کی بربادی کی ذمہ دار وہ خود تھی۔ رسوائی اور تباہی کے جس مقام پر آج وہ تنہا کھڑی تھی؟ کیا واقعی اس کی ذمہ دار وہ خود تھی؟ یا وہاں جس میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ تربیت ہوئی تھی۔ یا پھر اس کی ماں کہ بیٹی ہونے کے نا طووان کی اولین ذمہ داری تھی یا پھر بڑی بہن کہ ماں کے بعد وہ اس کی زیر تربیت رہی۔ وہ بڑی بہن کی ذمہ داری تھی۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نہ نبھاسکا تھا۔ بلکہ انہماں کو مجرم بنا دیا گیا تھا۔ کیا وہ واقعی مجرم تھی؟ وہ سب اپنی ذمہ داری بھول کر اس کو غلط سمجھے اور پھر پوری سختی سے اپنے اس غلط فیصلے پر قائم بھی رہے۔ سب اس کا نام بھول کر اس کو آوارہ آوارہ کہہ کر پکارنے لگے۔ ماں بجائے دھروں کو سمجھانے کے اس نام سے اس کو خطاب کرنے میں پیش



پیش تھی۔ وہ یہ سب صبر سے دیکھتی رہی۔ خاموشی سے سختی اور ضبط بھی کرتی رہی۔ لیکن جب اس کے محبوب نے بھی اس کو آوارہ کے لقب سے نوازا تو وہ مارے دکھا اور صدمے کے پاگل ہو گئی۔ پہلی بار اس نے سنجیدگی سے سوچا۔

آوارہ تو پھر آوارہ ہی تھی اور شاید اسی بات کو ثابت کرنے کیلئے وہ بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکل بھاگی۔ گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کی باقی کی ساری عمر پھر بھاگتے بھاگتے ہی بسر ہوتی ہے۔ گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کو پھر خاندان تو کیا معاشرہ بھی قبول نہیں کرتا۔ گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کی کوئی بھی عزت نہیں کرتا۔ ان کو پھر ہر جگہ نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔ خاندان کی عزت کی چادر تار تار کرنے والیوں کے اپنے سر سے بھی عزت کی یہ چادر زبردستی چھین لی جاتی ہے۔ اور یہی روپی کے ساتھ ہوا تھا۔ شوہر بظاہر روشنیوں کی دنیا بھی مگر درحقیقت اندر سے غلامت کا ذمہ دار۔ روپی کو اگر یہ سب پہلے سے معلوم ہوتا تو وہ گھر سے بھاگنے والی یہ بھیا نک غلطی کبھی نہ کرتی۔ مگر وہ کہڑی سہانے لگتے ہیں قریب آنے پر اب جب روپی کو اس تلخ ترین حقیقت کا ادراک ہوا تو گھر واپسی کا ہر راستہ بند ہو چکا تھا۔ بلکہ وہ خود بھی بے خبری میں ایک ایسی طبل میں دھنس چکی تھی جس سے باہر نکلنا اب اس کیلئے ناممکن تھا۔ اب تو بس اندر ہی اندر دھنستے ہوئے یہ دلتیں اٹھاتے ہوئے اس کو ختم ہونا تھا۔ وہ تو اپنے گھر سے نکل کر ایک دوسرے گھر میں آئی تھی۔ مگر افسوس وہ ایک گھر نہیں ایک بازار تھا۔ جس میں وہ آ بیٹھی تھی۔ اپنی مرضی سے۔ مگر اس گھر سے جانا اس کی مرضی کی بات نہ تھی۔ اس نے اپنے بھی دیکھ لئے تھے اور غیر بھی اور اس کے بعد جیسے سارے رشتے سارے سناٹے سارے جذبے روپی کے اندر سے مر گئے تھے۔ شاید وہ خود بھی مر چکی تھی۔ کبھی کبھی انسان زندہ دھاش بن کر بھی تو چلتا پھرتا ہے۔

مگر ان سب حالات کا ذمہ دار کون تھا؟ اس نے سوچا اور ایک بار پھر سسک پڑی۔

”اوہ بلال! اوہ بلال! کاش تم میری زندگی میں نہ آتے ہوتے۔“ بلال کا خیال آتے ہی اس نے ایک بات محسوس کی تھی کہ اس کے اندر سے کوہ سب کچھ ہی مر گیا تھا۔ مگر بلال کیلئے نفرت اور ایک خواہش اب بھی زندہ تھی۔ کاش کہ وہ ایک بار اپنی زندگی میں اپنے محبوب کو دیکھ سکے۔ جس کی وجہ سے وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور پھر تنہائی بربادی اور تنہائی کے اس مقام پر آ کھڑی ہوئی تھی جہاں نہ کوئی منزل رہی تھی اور نہ ہی راستہ۔

وہ جب بھی نئی ذلت نئے صدمے سے آشنا ہوتی تو بے ساختہ بلال یاد آ جاتا۔ وہ روتے ہوئے اسے کوہ سے ملتی۔ وہ اب چاہتی تھی کہ اس کا بلال اس کو ملے تو وہ بھی اس کے ساتھ ویسا ہی حقارت بھرا رویہ اختیار کرے جیسا کبھی اس نے روپی کے ساتھ کیا تھا۔ وہ اس کو بتائے کہ تم نے آوارہ کہا تھا۔ آوارہ تو پھر آوارہ ہی تھی۔ مگر وہ ملنا بھی تو کہاں؟ وہ تو امریکہ جا چکا تھا اور روپی چلتے پھرتے شہر بھر میں اس کو تلاش کرتی تھی۔

اس دن وہ سٹوڈیو فلور پر تنہا بیٹھی تھی۔ آج اس پر اور نیم پر ایک گانا فلمایا جانا تھا۔ مگر نیم ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ہدایتکار کئی فون اس کے گھر کر چکا تھا۔ یہی جواب ملتا تھا گھر سے سٹوڈیو جانے کیلئے نکل چکی ہے۔ آخری با فون کرنے کے بعد نیاز نے زیر لب ایک گالی دیتے ہوئے کہا۔ رات کہیں مجرے پر گئی ہوگی اور اب اپنی نیند پوری کر رہی ہوگی۔ ادا کارہ بننے سے طوائف کا پیشہ تو نہیں بدل جاتا۔ بلکہ مجرے کا ریٹ پٹنے سے زیادہ ہو جاتا ہے۔

تب روپی کو پہلی بار پتہ چلا تھا کہ نیم بھی طوائف ہے۔ اس کو یہ بھی یاد آیا کہ اس نے کیسے منہ بھر کر نیم کے سامنے ہی کہہ دیا تھا کہ میں طوائف نہیں کہ سب کو خوش کرتی پھروں۔ اور نیم نے برا تک نہیں منایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نیم آ گئی۔ ہدایتکار نیاز نے خوب بے عزت کیا۔ وہ جواب دیئے بغیر میک اپ روم میں چلی گئی۔ اس کا میک اپ مکمل ہوتے ہی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ جب شوٹنگ میں ایک وقفہ آیا تو نیم نے روپی سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے اس دن کہا تھا میں طوائف نہیں کہ سب کو خوش کرتی پھروں۔ تم لوگ طوائف کو بتائیں برا کیوں کہتے اور سمجھتے ہو۔ میرا اپنا تعلق بھی بازار سے تھا۔ جہاں سکے ماں باپ اپنی بیٹیوں سے پیشہ کرواتے ہیں۔ بھائی بہنوں کی کمائی کھاتے ہیں۔ ماموں بھانجیوں کی۔ لوگوں کی نگاہ میں جو طوائف ہے۔ وہ کتنے لوگوں کا پیٹ پالتی ہے یہ صرف وہی جانتی ہے۔ بازار سے اٹھ کر فلم انڈسٹری میں آنے پر اس کے پیشے پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ ریٹ بڑھتا ہے مگر حیثیت نہیں بدلتی۔ فلم انڈسٹری میں شریف لڑکیوں کو مشکل پیش آتی ہے۔ طوائف کو نہیں کہ وہ عزت کا مطلب ہی نہیں سمجھتی۔

جسم بیچنا اس کا کام ہے۔ جہاں بڑے بڑے لوگ اس کے ساتھ لیتے ہیں وہاں فلم ساز ہدایتکار کے ساتھ ساتھ میک اپ مین۔ کمرہ مین بھی اس کے ساتھ لیٹ جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ان دونوں کی خلاف جانے پر میک اپ مین جیسے کہ میں نے تم کو پہلے بتایا تھا تمہارا میک اپ خراب کر کے تم کو چڑیل بنا دے گا اور کمرہ مین اول تو تمہارے چہرے کا کلوز اپ ہی



ٹھیک سے پیش نہیں کرے گا یا پھر کوئی ایسی تکنیکی خرابی کر دے گا کہ سینما میں تمہارا فیس دیکھتے ہی لوگ ڈر کر چٹخیں مار کر بھاگ جائیں گے۔ شریف لڑکیوں کو شہر میں نہیں آنا چاہئے اور اگر آئیں تو باقی سب کچھ بھول جائیں۔ شہرت کی قیمت تو چمکنی ہی پڑتی ہے اور میری سنو۔

تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں اس فلم میں ایک ایسی غیرت مند لڑکی کا کردار ادا کر رہی ہوں جو عزت پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔ آج رات میں نے تین مردوں کو خنایا ہے۔ یہاں سٹوڈیو سے فارغ ہو کر گھر گئی تو باپ ایک مرد لیکر بیٹھا تھا۔ اس کو فارغ کیا ہی تھا کہ بھائی ایک بندہ لے کر آ گیا۔ اس کو فارغ کر کے سونے کیلئے لیٹی تو ماموں اپنا گاہک لے کر آ گیا۔ میری یہ جرات نہیں تھی کہ انکار کرتی۔ سو تیسرے کمرے کے کھانے کے بعد سونے کیلئے لیٹی تو جلدی آ نکھٹا کھل سکی۔ یہاں ہدایتکار نے جو سب کے سامنے بے عزتی کی وہ الگ تم نے دیکھی ہی ہے۔

”آپ ان کو چھوڑ دیں۔“ روپی نے مشورہ دیا۔

”گھر چھوڑنے کا کام شریف لڑکیاں کرتی ہیں۔ طوائف پر پورے خاندان کا ایسا سخت پہرہ ہوتا ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ یہاں تمہارے ساتھ تمہارے باڈی گارڈ یا زبردہ خانم ہے میرے ساتھ میرا ماموں اور دو بھائی ہیں۔ میں ذرا سا بھی ادھر ادھر ہونے کی کوشش کروں گی تو وہ مجھے شوٹ کر دیں گے یا اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ نسیم نے یہ بات کہی تھی کہ ہدایتکار نیاز نے ایک بار پھر ان دونوں کو بلایا لیا تھا۔ دونوں دوبارہ سیٹ پر آ گئیں۔

☆☆☆☆

عید الفطر پر روپی کی ایک فلم نمائش کیلئے پیش کی گئی تھی تو بکر عید پر دو فلمیں ریلیز ہو رہی تھیں۔ ایک پنجابی ایک اردو۔ اردو فلم میں تو ایک بار پھر اس کے ساتھ آ رہا تھا۔ جبکہ پنجابی فلم میں مشہور پنجابی ہیر و تھا۔ پہلی فلم کی طرح ان دونوں فلموں نے بھی زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ اس بار پھر سارا خاندان خوش تھا۔ کرن بھی ہاسٹل سے گھر آئی ہوئی تھی۔ چاند رات وہ تینوں یعنی ارم، کرن اور روپی لانگ ڈرائیونگ کرتی رہیں۔ فجر کے قریب گھر آ کر سو گئی تھیں۔ پھر بھی ایک فلم کا پہلا شو دیکھنے وہ سب گئے تھے۔ روپی کو چھوڑ کر۔ روپی نے تو ویسے بھی نہیں جانا تھا۔ اس کی طبیعت بھی دن رات عکسبندی میں حصہ لینے سے بہتر نہیں تھی۔ وہ بہت تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔ اور ٹھیک بھی ہوتی تو وہ اپنی پہلی فلم دیکھنے نہیں گئی تھی۔ یہ تو پھر دوسری اور تیسری فلم تھی۔ ٹرہوا لے دن چودھری نواز نے بھی آنا تھا بے آرام کرنے۔ روپی نے آرام کرنا ہی بہتر سمجھا تھا۔

بکر عید پر روپی کی دو فلموں نے شاندار کامیابی حاصل کر کے اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ روپی نے بھی کہانی وغیرہ پر غور کئے بغیر ایک درجن کے قریب فلمیں سائن کر لی تھیں۔ ان میں دو فلمیں ایسی بھی تھیں جن میں ہیر وئن کے بجائے روپی کا رول سائیڈ ہیر وئن کا تھا۔ ایک فلم ایسی بھی تھی جس میں وہ صرف ایک ہی گانا کر رہی تھی۔ ارم کو جب ان باتوں کا پتا چلا تو اس نے روپی کو زبردستی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو روپی اب جب اوپر تلے اپنی تین فلموں کی شاندار کامیابی سے تم ہیر وئن بن چکی ہو تو ایسے میں تم کو سائیڈ ہیر وئن والی فلمیں سائن نہیں کرنی چاہئیں تھیں۔ اب بھی نام ہے تم یہ معاہدے کینسل کر دو۔ بلکہ میں خود ہی ان فلموں کے ڈائریکٹرز سے بات کر کے ان کو سمجھاتی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ ان جائیں گے۔ ورنہ یہ دو فلمیں تمہارے اس شاندار کیریئر پر برا اثر ڈال سکتی ہیں۔

اور سنو یہ جو تم نیاز صاحب کی فلم میں صرف ایک ہی گانا کر رہی ہو تو یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں۔ آخر تم خود کیوں نہیں سمجھتی ہو؟ اب جب تم مکمل ہیر وئن بن چکی ہو تو ڈیڑھ کسی فلم میں صرف ایک گانا گانے سے تمہاری مارکیٹ ویلو کم ہو جائے گی۔ اس کیلئے تو تم ابھی میرے سامنے نیاز صاحب کفون کر کے معذرت کر لو۔

”مگر آپ! میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں اور آپ کو بتاؤں انہوں نے مجھے اپنی تین نئی آنے والی فلموں میں بطور ہیر وئن لینے کا وعدہ کیا ہے۔“ روپی نے خاصے جوش سے بتایا۔

”یہ وعدہ پتہ نہیں وہ روز کتنی لڑکیوں سے کرتا ہے عیاش انسان۔“

”بس میں نے کہہ دیا تم یہ گانا نہیں کرو گی۔ برگز نہیں۔ چلو ابھی اسی وقت فون کر کے معذرت کرو۔“ ارم نے حکم دینے والے لہجے میں خاصے غصے سے کہا تو روپی نے جلدی سے نیاز صاحب کفون کر کے یہ ایک گانا کرنے سے معذرت کر لی۔ حالانکہ وہ ارم آپنی سے کہنا چاہتی تھی پہلے بھی تو میں نے ان کی دو فلموں میں کام کیا ہے۔ مگر اس کا ارم آپنی کے سامنے بولتے ہوئے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ اس لئے گانے کیلئے انکار کر دیا۔ پھر اس نے سنجیدگی سے یہ بھی سوچ لیا کہ آئندہ وہ انہی فلموں میں کام کرے گی۔ یعنی وہی فلمیں سائن کرے گی جن کی وہ تنہا ہیر وئن ہوگی۔



ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ ان ایک درجن فلموں میں سے تین فلموں کی گلوکارہ بھی وہ خود تھی۔ یعنی اپنی تین فلموں میں وہ گلوکاری بھی خود کر رہی تھی۔ آواز اس کی بہت خوبصورت اور سریلی تھی۔ یہ دیکھ کر دو میوزک ڈائریکٹرز نے اس گلوکاری کی آفر دی جس کو روپی نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ ارم آپی تو اس کو بہت پہلے جب سکول کے مینا بازار میں سنا تھا تبھی اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تمہاری آواز بہت خوبصورت اور سریلی ہے۔ اداکارہ نہیں تو تم گلوکارہ بن کر بھی دھوم مچا سکتی ہو۔“ اور اب اس نے گلوکارہ بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ارم یہ سب سن کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ اس کی تین فلموں کی سپر کلاس کامیابی سے فلمی رسالوں اور اخبارات میں تو روپی کے انٹرویوز مسلسل چھپ رہے تھے لیکن اہم بات یہ ہوئی کہ اب بکرامید پر روپی کی مزید دو فلموں کی سپر ہٹ کامیابی کے بعد پاکستان شو بزنس مارکٹ کی جانب سے روپی کے ساتھ ایک شام منانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مشہور سیاسی سماجی شخصیت ارشاد شاہ نے روپی کو بیورو کلفڈ کا تاج پہنانے کا بھی اعلان کیا تھا۔ تاج پوشی کی یہ رسم لاہور کے ایک بڑے ہوٹل میں ہونا تھی۔ یہ سب باتیں روپی کی شہرت میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ وہ ان سب باتوں سے خوش تھی یا ادا اس یہ اندازہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

فلموں کی کامیاب ہیر وئن بن جانے کے بعد ہیر وئن کو اپنی حفاظت کا بھی بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ایک جگائیکس لینے آتا ہے۔ تو کبھی کوئی دھوا جگا پریشان کرنے لگتا ہے۔ اور ان بہت سارے ملکوں سے بچنے کیلئے ہیر وئن کو کسی نا کسی بڑے جگے کے سپہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر روپی کے ساتھ ایسا بالکل بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ پہلی فلم کی کامیابی کے پہلے دن سے ہی وہ چودھری نواز کے زیر سایہ آ گئی تھی۔ یوں بھی روپی کے ساتھ ہر فلمی غیر فلمی تقریب میں زہرہ خانم کے ساتھ ساتھ ارم خود بھی لازمی جاتی تھی۔

ایک اور اہم بات یہ بھی کہ چودھری نے ایک درجن فلمیں سائن کی تھیں۔ ان میں آدمی درجن فلموں میں اس کے مقابل صرف آ زرعی اکلوتے ہیر و تھے۔ ان چھ فلموں کی عکس بندی کے دوران آ زر اور روپی کی دوستی کے چرچے ساری فلم انڈسٹری میں ہونے لگے تھے۔ فلمی صحافت نے ہمیشہ کی طرح نمک مرچ لگا کر اس دوستی کو محبت کا نام دے کر سکینڈل بنانے شروع کر دیئے۔ آ زر کو تو نہیں مگر روپی کو یہ سب پڑھ کر بے حد غصہ آتا تھا۔ جانتی تھی اس شہر میں اس کے خاندان والے بھی اپنی زندگی بتا رہے تھے۔ وہ بے شک ان کو چھوڑ چکی تھی مگر بیٹی تو اس خاندان کی تھی۔ مگر فلمی صحافی اپنے اخبار میں لمبی چوڑی خبر لگانے کے چند روز بعد ایک چھوٹی سی تردید چھوٹے سے کونے میں لگا کر روپی سے فون پر معذرت کر لیتے تھے۔ روپی سوائے ذات پینے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اس ذلالت پر آ زر مرتھتا۔ کنوارہ بھی اس لئے وہ یہ سکینڈل پڑھ کر صرف مسکراتا رہتا تھا۔ اور گھر میں ارم حسرت بھرے لہجے میں کہتی۔

”ارے بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ یہ سکینڈلزم کو مزید مشہور کر رہے ہیں۔ اس لئے ان سے پریشان ہونے کی بجائے تم کو انہیں انجائے کرنا چاہئے۔“ روپی یہ سن کر چپ بی رہتی۔

ایک درجن فلموں میں سے چونکہ تین چار میں اداکارہ نسیم بھی اس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اور فلم انڈسٹری کی یہ واحد اداکارہ تھی جس کے ساتھ روپی کی دوستی تو نہیں مگر تھوڑی فری ضرور تھی۔ یا پھر ہلکی پھلکی دوستی بھی کہی جاسکتی تھی۔ باقی تو سب روپی کو دیکھ کر سڑی سڑی رہتی تھیں۔ بلکہ پتی پتی بھی کے روپی نے انڈسٹری میں آتے ہی میدان مار لیا تھا۔

اداکاری کی طرح روپی گلوکاری میں بھی خاصی کامیاب رہی تھی۔ فلم انڈسٹری جو ان کرنے کے پہلے ہی برس روپی کی پانچ عدد فلمیں ریلیز ہوئی تھیں۔ جن میں سے دو فلموں میں اس نے گلوکاری بھی خود کی تھی۔ یہ پانچوں فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور پھر روپی سب کچھ بھول کر آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ زندگی کو آخر کسی نا کسی طرح گزارنا ہی تھا۔ ان ہی دنوں میں جب وہ شہرت کی بلندیوں پر تھی بلکہ بلندیوں کی جانب گھزن تھی۔ چودھری نواز کاٹل ہو گیا۔ سارا گھر سوگ میں ڈوب گیا تھا۔ روپی کی سمجھ میں نا آیا وہ کیا کرنے کیا کہے۔ اس کو نہ تو چودھری نواز کے مرنے کی خوشی ہوئی تھی اور نا ہی غم۔ وہ روپی کا دشمن تھا اور نا ہی دوست اور نا ہی شوہر۔ دشمن اس لئے نہیں سمجھا تھا کہ وہ کیلا ہی تو اس کی عزت سے ناکھلا تھا۔ اس نے اگر اس کو اپنے تک محدود رکھا تو اس کا ہر طرح سے خیل بھی رکھا۔ کہ وہ عورت کے ساتھ عزت کے ساتھ محبت کرنے والا مرد تھا۔ عورت کا خیال رکھنے والا کیتر کرنے والا مرد۔ ہر حال وہ اس کا شوہر نہیں تھا کہ وہ اس کی موت کا سوگ مناتی۔ وہ تو صرف چودھری نواز کی رکھیل تھی۔ اور وہ مر گیا تھا۔ روپی کی جان ایک اچھے بڑھے سے چھوٹ گئی تھی۔ باوجود اس کے کہ اس نے روپی کو کبھی کوئی تکلیف نہ دی تھی۔ ہمیشہ اس کے سکھ اور آرام کا خیال رکھتا تھا۔ مگر پھر وہی بات شوہر نہیں تھا۔ روپی نے سوچا جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا۔

بہر حال پھر یہ وقت بھی گزر گیا۔ وہ اپنے کام میں ایک بار پھر بری طرح بڑی ہو گئی۔ آ زر کے ساتھ صرف اس کی دوستی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سنجیدگی سے محسوس کرنے لگی تھی۔ آ زر اب اس سے کچھ زیادہ ہی فری اور مہربان ہونے لگا تھا۔ روپی کو آ زر کا اس رویے پر حیرانی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کیلیات وہی ہے جو وہ سمجھ رہی ہے یا یا اس کی خوش فہمی ہے۔ مگر یہ



اس کی خوش فہمی نہیں تھی۔ آرزو واقعی اس کے بارے میں کوئی پروگرام طے کر چکا تھا۔ کیونکہ ایک دن اس نے روپی کو چائے پر انوائٹ کر لیا۔ ایسا شاید پہلی بار ہوا تھا۔ کوکہ روپی پہلے کم ہی اکیلی کہیں آتی جاتی تھی۔ مگر نسیم کے سمجھانے پر کہ ہر وقت زہرہ خانم کو اپنا پلوٹا کر نہ رکھا کرو۔ کبھی بھی ان کے بغیر بھی ادھر ادھر آیا جایا کرو۔ اس کے بعد روپی لانگ ڈرائیونگ پر اکیلی جانے لگی تھی۔ اب جب آزر نے چائے پر انوائٹ کیا تو روپی نے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”روزانہ ہی تو عکسبندی کے درمیان ہماری ملاقات ہوتی ہے اب کوئی خاص بات ہے جو چائے پر بلا رہے ہو۔“

”خاص بات ہی سمجھ لو۔“ آزر نے ہنس کر کہا اور سنو آنا لازمی۔ اور روپی نے حامی بھری۔ پھر زہرہ خانم سے اجازت لے کر وہ ہوٹل چلی آئی۔ آزر اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بلکہ یوں خوش ہوا جیسے زندگی میں پہلی بار مل رہا ہو۔ پھر چائے آنے سے پہلے تو وہ روپی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں ہی کرتا رہا۔ مگر چائے پینے کے بعد اس نے روپی سے اظہار محبت کر ڈالا۔ روپی کے لئے یہ اظہار محبت بے حد حیران و ششدر کر دینے والا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آزر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ روپی کا چودھری نواز کے ساتھ کبریا تعلق تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ روپی کے پاس یہ جو گھر گاڑی اور بینک بیلنس تھا۔ یہ سب چودھری نواز کی مہربانی کا نتیجہ تھا۔ روپی کا بینک اکاؤنٹ چودھری نواز نے کھلویا تھا۔ انہوں نے روپی سے کہا تھا۔ یہ سب تم کلوٹ لوٹ کر اور بچ بچ کر کھا جائیں گے۔ اپنا کچھ پیسہ بینک میں بھی رکھا کرو تا کہ جب اکیلی رہ جاؤ تو تمہارے کام آسکے۔ روپی ان کی کسی بات سے انکار کر ہی نہ سکتی تھی۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی آزر کا یہ اظہار محبت اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی آزر کا تعلق ایک بے حد معزز خاندان سے تھا۔ آزر نے روپی کو یوں حیران ہوتے دیکھا تو پوچھا۔

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا میں نے کوئی انوکھی بات تم سے کہہ دی ہے جو یوں گم سم ہی ہو گئی ہو۔“

”تمہیں معلوم ہے نا آزر میری جولائف ہے۔“ روپی نے کھل کر بات کرنے کے بجائے ذومعنی بات کی۔

”ہاں چودھری نواز سے جو تمہارا تعلق تھا میں جانتا ہوں۔ مگر اب چودھری نواز زندہ نہیں رہا۔ اب تم میری ہو صرف میری۔“ آزر نے محبت سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی روپی رو پڑی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اب زندگی کے کسی موڑ پر کسی معزز خاندان کا کوئی مرد اس کے ساتھ محبت بھی کر سکتا ہے۔ وہ تو فلم لائن جوائن کرنے کے بعد صرف ایک جسم بن کر رہ گئی تھی۔ بلکہ ہڈی بن کر رہ گئی تھی جس پر ہر گندہ کتا منہ مارتا تھا۔ اس کو یوں روتے دیکھ کر آزر نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا کچھ دیر اس کو دیکھتا رہا۔ پھر بہت محبت سے پوچھا۔

”یوں رونے کا مطلب بتاؤ گی مجھے یا میں سمجھوں کہ تم کو میری محبت پر یقین نہیں ہے؟ مگر یقین کرو میں نے جو بھی کہا وہ سب سچ ہے۔“

”تمہاری محبت پر یقین ہے۔ مگر شاید میں اس محبت کے لائق نہیں ہوں۔ یا پھر کوئی مجھ سے محبت بھی کرے گا؟ ان حالات میں؟ میں اب سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ خاص کر کسی معزز خاندان کا کوئی فرد۔“ روپی نے وضاحت سے کہہ دیا۔

آزر اس کی بات سن کر چند ثانیے اس کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اگر میں معزز خاندان کا بیٹا ہوں تو تعلق تمہارا بھی بازار سے نہیں۔ کسی شریف خاندان سے ہی ہے۔ رضوی کا شمار فلم انڈسٹری کے چھوٹے آرٹسٹوں میں ہوتا تھا۔ رضوی کو جاننے والوں نے مجھے بتایا ہے جب رضوی نے زہرہ خانم سے شادی کی تو اس کی پہلے شوہر سے صرف دو بیٹیاں ہی تھیں۔ پھر رضوی سے ایک بیٹا ہوا۔ مزید اولاد نہ ہو سکی کہ رضوی نے زہرہ کو دھندے پر لگا دیا تھا۔ ان کے معاملے میں میری دلچسپی اور محبت صرف تم سے ہے۔ مجھے پورا یقین ہے تم زہرہ کی بھانجی نہیں ہو۔ وہ تمہیں کہاں سے آ کر لائی ہے۔ یہ بات صرف تم مجھے بتا سکتی ہو۔ تمہارا یہ معصوم چہرہ بتاتا ہے کہ تم ایک شریف خاندان کی بیٹی ہو۔ پھر زہرہ خانم کے ہاتھ کیسے لگی۔ فلم لائن کیوں جوائن کی۔ تمہاری خاندانی شرافت تمہارے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔

روپی کا دل چلا وہ آزر کو سب کچھ سچ بتا دے کہ گھر سے بھاگنے کے بعد یہ پہلا مرد تھا جس نے اس کے جسم کے بجائے محبت کی بات کی تھی۔ مگر ام آپی اور زہرہ خانم نے سختی سے منع کر رکھا تھا کسی کو ہر گز اپنے گھر والوں کے بارے میں نہ بتانا۔ صرف یہی کہنا ہے میری بھانجی ہو۔ یہی خیال آتے ہی روپی نے آنسو صاف کرتے ہوئے آزر سے کہا۔

”میں ان کی سگی بھانجی ہوں۔ میرا یقین کرو اور زہرہ خانم کو بھی برے کام پر رضوی نے لگایا تھا۔“

”تم کچھ بھی کہو۔ مجھے یقین نہیں۔“ آزر نے کہا تو روپی چپ رہی۔ آزر نے مزید کہا۔







”مٹی وہ طوائف ہے۔ بازار کی رہنے والی۔“ میری بات سن کر روپی کتنی دیر میری جانب یوں دیکھتی رہی جیسے بے لفظی زبان میں کہہ رہی ہو۔

”وہ اگر بازار کی رہنے والی طوائف ہے تو ہم گھروں میں رہنے والی طوائفیں۔“ پھر روپی تو صرف اتنا کہا۔

”آپا جی کوئی اور بات کریں میں نسیم کو نہیں چھوڑ سکتی۔ پھر بھی آپ نسیم کے حوالے سے میرے سے بات نہ کریں۔ میں نے کہا نا وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔“ اب تم خود ہی بات کرو زہرہ خانم نے ساری بات بتانے کے بعد کہا۔

”ابھی کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ بس اس کو اکیلے سٹوڈیو اب نہ جانے دیں۔ بلکہ کہیں بھی ہر جگہ خود اس کے ساتھ جائیں۔“ ارم نے کہا تو زہرہ خانم بولیں۔

”تم کرن کو ہاسٹل سے گھر کیوں نہیں بلا لیتی۔ وہ آجائے تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میرے ساتھ نہ جانے کی صورت میں وہ تو ساتھ جاسکتی ہے۔ آج ہی دیکھ لو جب وہ جارہی تھی تو میں نے پوچھا کہاں جارہی ہو تو روپی۔

”ایک دوست کے پاس۔“

”میں نے پوچھا کون سے دوست کے پاس؟“ تو روپی۔

”آپا کیا میں آپ کو بتائے بغیر اپنے کسی دوست کے ہاں بھی نہیں جاسکتی۔ جبکہ ارم آپا سارا وقت اکیلی ہی گھر سے باہر جاتی ہیں۔ وہ تو اب تم نے خود پوچھا ہے تو روپی نے بتا دیا۔ میں کہتی ہوں کرن کو گھر بلاؤ سٹوڈیو میں چلی جایا کروں گی اور ادھر ادھر نہیں جانا ہو تو کرن۔۔۔۔۔ وہ کالج کے بعد اب یونیورسٹی گئی ہے تو پھر ہاسٹل چلی گئی ہے۔ اس کو بلاؤ ایسا نہ ہو روپی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ ہمارے بتائے بغیر ہی نکاح نہ پڑھالے۔“ زہرہ خانم نے خاص فکر مندی سے کہا۔

”آپا! میں نے کرن سے کہا بھی تھا۔ اب گھر میں دو دو گائیاں ہیں تم کو ہاسٹل میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ مگر وہ نہیں مانی۔ خیر میں ایک بار پھر بات کرتی ہوں۔“ ارم نے کہا اور اٹھ کر گاڑی کی جانب چل دی۔ آج اس نے نسیم کے ساتھ شادی کا قائل کرنا تھا۔

☆☆☆☆

اگلے روز آزر کے ساتھ روپی کی شوٹنگ تھی۔ روپی کو دیکھتے ہی آزر نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”روپی تم میری باتوں کا جواب دیے بغیر ہی اٹھ کر چلی گئیں۔ یہ کوہ کوئی بات نہیں۔ مگر تم نے جو قطعہ مجھے جانے سے پہلے سنایا وہ تمہاری کہانی سمجھنے کیلئے کافی تھا۔ میرا یقین کرو میں کل سے لے کر اس وقت تمہارے پاس آنے تک تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہا۔ اور بہت بے چین رہا ہوں۔

”سوئے بالکل نہیں۔“ روپی نے ہستے ہوئے پوچھا۔

”سو یا تھا۔ مگر سوتے میں خواب بھی تمہارے حوالے سے دیکھے ہیں۔“ آزر نے بھی جواباً شرارت سے ہستے ہوئے کہا۔ اتنے میں زہرہ خانم نے آواز دی۔

”روپی مٹی ہدایت کار کہہ رہا ہے جلدی سے میک اپ کروا کر آؤ۔“ اور روپی آزر کو وہیں چھوڑ کر میک اپ روم کی جانب چل دی۔ پیچھے پیچھے زہرہ خانم بھی تھی۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ سیٹ پر وہ روپی کے ساتھ نہیں جاسکتی تھی۔ وہ صرف سامنے بیٹھ کر ان کو شوٹنگ کرتے دیکھتی اور ایک سین اوکے ہوتے ہی آزر روپی کے ساتھ سرکوشیوں میں مگن ہو جاتا۔ روپی اپنی عادت کے مطابق زیادہ تر خاموش ہی رہتی یا پھر مسکراتی۔ کبھی کبھار ہنس پڑتی تو زہرہ خانم کے دل کو کچھ ہونے لگتا کہ فلم انڈسٹری جو ان کرنے کے بعد وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ بلکہ ہنسنا تو کیا مسکراتا بھی بھول چکی تھی۔ اور اب مسکراتا تو کیا ہنسنے بھی لگی تھی۔ یہ بات زہرہ خانم کو پریشان کر رہی تھی۔

آزر نے روپی کو چائے کے بجائے رات کے کھانے پر انوائٹ کرنا چاہا تو روپی نے ارم آپا کے خوف سے معذرت کر لی۔ پھر کل رات اس نے آزر کے بارے میں بالکل بھی نہ سوچا تھا۔ کیونکہ اس کو آزر کی محبت پر یقین نہیں آیا تھا۔ آج پھر آزر نے کہا تھا۔

”روپی آئی لو یو۔ کو کہ تم سے پہلے بھی ہو سکتا ہے چند لڑکیوں سے کہا ہو۔ مگر تم کو سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ پلیز جانے سے پہلے صرف اتنا بتا دو کہ تم کو میری محبت پر یقین آیا کہ نہیں جبکہ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“

”بالکل نہیں کل بھی تو کہا تھا۔“ روپی یہ جواب دے کر گھر آ گئی تھی۔ مگر آج وہ سوچ رہی تھی اگر آزر واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے تو پھر یہ پوچھنا بہت ضروری ہے کہ کیا وہ مجھ سے شادی



بھی کرے گا۔ یا پھر مل بہلانے کو مجتہد ہی کرتا رہے گا۔ مگر یہ پوچھنے کا نام نہیں تھا۔ اس رات وہ اپنی ایک دوسری فلم کی عکسبندی کیلئے لیٹ نائٹ فلائٹ سے کراچی چلی گئی۔ اس فلم کے ایک سوئنگ کو ساحل سمندر پر فلمانا تھا۔ چند شاٹ سوئنگ کے علاوہ بھی تھے۔ فلم کا ہیرو جو تھا اس کے چند شاٹ کے لانگ شاٹ تھے اور گانا جو فلمایا جا رہا تھا اس میں روپی کے علاوہ دونی اداکارائیں بھی پر فارم کر رہی تھیں۔ فلم کے ڈائریکٹر نے ان تینوں کو برابر ایک سپوز کرنے کے بجائے سینئر ہونے کے باوجود روپی کو زیادہ تر کیمرے کی زد سے باہر رکھا تھا۔ رات اس کی روپی سے ملکی رنج کلائی ہوئی تھی۔ ڈائریکٹر کو روپی پر غصہ تو بہت آیا تھا۔ مگر فلم تقریباً مکمل ہونے کے قریب تھی۔ بس تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تھا۔ روپی کی ناراضی کی صورت میں یہ تھوڑا سا کام لمبا بھی ہو سکتا تھا۔ اپنے غصے پر تو اس نے قابو پا لیا تھا۔ مگر فلم کا ہم سوئنگ میں روپی کے چہرے کا، ہم کلوز اپ کم کم ہی پیش کیا تھا۔ روپی کے نزدیک اب یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ فلم کا یہ تھوڑا سا کام کراچی کے اندر ہی مکمل ہونا تھا۔ روپی ہر روز ساحل سمندر جاتی ایک شاٹ اوکے ہونے کے بعد وہ دوسرے کا انتظار میں تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے سمندر کو دیکھتی رہتی۔ اس کو سمندر اچھا لگتا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی فلموں کی شوٹنگ کیلئے یہاں آ چکی تھی۔ ہر حال اب اس نے اس فلم میں اپنا کام مکمل کروایا۔ پھر فلم یونٹ کی واپسی سے پہلے ہی خود لاہور چلی آئی۔ لاہور آتے ہی آرا ایک بار پھر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس نے روپی کو سٹوڈیو کے لان میں لے جا کر چائے پلائی۔ پھر پوچھا۔

”تم آخر میری محبت کا جواب کیوں نہیں دیتی۔ ہاں ناں کچھ تو کہو یوں خاموش نہ ہو۔“

”یہی تو سمجھ نہیں آتا کہ کیا کہوں۔“ روپی نے کہا تو آزر نے اس کو دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”اچھا آج پہلے مجھے یہ بتاؤ کیا تم اپنی اس زندگی سے خوش ہو۔ تم کو آخر شک کیوں ہے۔ ہاں میں خوش ہوں اپنی اس زندگی سے۔“ روپی نے آہستگی سے کہا۔ ”لیکن میری یہ دعا ہے کہ اللہ ایسی خوشی کسی کو نہ دے۔“ کہتے ہوئے روپی کی آنکھوں میں کی اتر آئی۔ یہ دیکھ کر آزر نے ایک بار پھر پوچھا۔

”تمہاری آنکھوں کی یہ نمی کہتی ہے کہ تم اس زندگی سے خوش نہیں ہو۔ اگر یہ بات ہے تو پھر میری محبت کا جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔ کیوں یہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہو۔“

”محبت پر اعتبار نہیں رہا۔“ روپی نے صاف صاف کہہ دیا۔

”ایک بار کر کے تو دیکھو۔ ایک بار آناؤ تو سہی۔ پلیز میری بقراری کو سمجھو تو سہی۔“ آزر نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

”چھوڑا زمانے کو۔ یہ بتاؤ محبت کے بعد کیا کرو گے۔“ روپی نے نجانے کیا سوچ کر پوچھا۔

”ظاہر ہے شادی ڈیڑ اور حقیقت میں تم سے شادی ہی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر براہ راست شادی کا کہنے سے پہلے تمہارے محبت بھی ضروری تھا۔ یہ محبت ہی تو مجھے تم سے ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے ہماری محبت کے سکیڈل مشہور ہوئے تھے۔“ آزر نے ہستے ہوئے کہا۔

”شادی؟ اور مجھ سے؟ سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔“ روپی نے آزر کی بات سن کر ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کو دیکھا تو آزر نے ایک دم جذباتی ہو کر کہا۔

”سنو روپی اللہ بھی قرآن میں فرماتے ہیں جو ہو چکا سو ہو چکا۔ میں بھی تم سے یہی کہوں گا جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں تمہارے کل کی نہیں آج کی بات کرتا ہوں۔ ہاں مجھے تم سے محبت ہے اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی فوراً۔“

روپی کے جواب دینے سے پہلے ہی زہرہ خانم چلی آئیں۔ روپی پھر ایک بار آزر کی بات کا جواب دیئے بغیر چپ چاپ اٹھ کر ان کے ساتھ سیٹ پر آ گئی۔ پھر زہرہ خانم نے ایک منٹ کیلئے بھی روپی کو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ گھر آتے ہی سیدی ارم کے روم میں گئی۔ اور پھر ساری بات بتا دی کہ آزر اس کو سیٹ سے لان میں لے گیا تھا۔ میں ذرا سا اگلی گئی تھی۔ اس موقع سے قائد کاٹھا کر اور آنکھ کھلتے ہی اس کو جا کر لے آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ نکاح پڑھا کر چکے سے گھر چھوڑ کر چلی جائے کچھ کرو۔“

”آپ آپ کیوں ہلکان ہوتی ہو۔ وہ حرامزادی کوئی ایسی ویسی بات یا حرکت کر کے دیکھے تو سہی۔ جس طرح پونی کو جوتیاں پڑتی ہیں ویسی ہی جوتیاں مارا کر دماغ درست کر کے رکھ دوں گی۔ آپ خواجہ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔ میں پہلے ہی بہت ٹینشن میں ہوں۔ اور زہرہ خانم خاموشی سے روم سے باہر آ گئیں۔ مگر باہر آتے ہی بولیں۔“ بد معاش کو ابھی تک اپنے یار کا سوگ پڑا ہے۔ وسیم نے شادی سے انکار کر دیا ہے تو کیا قیامت آگئی۔ سارا کام چھوڑ کر کمرہ بند کر کے پڑی رہتی ہے۔ کیا دنیا میں ایک وسیم ہی اکلوتا مرد تھا۔ ارے وہاگر والدین کی پسند پر خاندان کے اندر شادی کر رہا ہے تو تم بھی کوئی اور ڈھونڈ لو۔ ورنہ تم یہاں بند کمرے میں اپنا سوگ مناتی رہنا اور وہ چپکے سے نکاح پڑھا کر بھاگ جائیگی۔ آخر اپنے گھر سے بھی تو وہ بھاگ کر آئی تھی۔ اس کیلئے بھاگنا کون سی مشکل بات ہے۔“



روبی رات کا کھانا کھا کر سونے کیلئے ابھی لیٹی ہی تھی کہ سرھانے ٹیلی فون سینڈ پر رکھا فون بولنے لگا۔ روبی چند لمحے دیکھتی اور سوچتی رہی اٹھائے یا نا اٹھائے۔ اس کو پورا یقین تھا یہ فون آزر کا ہی تھا۔ وہاں سٹوڈیو لان میں زبرہ خانم کی اچانک آمد سنان کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ فون ریسو کرے یا نا کرے۔ فون بند ہو گیا۔ مگر چند لمحوں کا وقفہ کے بعد بیل پھر ہونے لگی تو روبی نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھالیا۔ دوسری جانب واقعی آزر تھا۔ روبی کی آواز سنتے ہی بولا۔

”فون اٹھانے میں اتنا توقف کیوں کیا؟“

”یونہی کچھ خاص وجہ نہیں تھی۔“ روبی نے جواب دیا تو آزر نے اب کے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

”زبرہ خانم کے آنے سے میری بات بلکہ ہماری بات ادھوری رہ گئی۔ یہ تمہاری آپا جی تو اب تمہارا سالیہ بن کر رہ گئی ہے۔ سو چافون کا سہارا لے کر ہی اپنی بات مکمل کروں۔“

روبی یہ سن کر چپ رہی۔ آزر نے پھر پوچھا۔

”روبی! مجھے ابھی اور اسی وقت تمہارا جواب چاہئے۔ بتاؤ مجھ سے شادی کرو گی۔ بولو شادی کرو گی میرے ساتھ۔“

”آزر نجائے تمہاری اس بات پر یقین کیوں نہیں آتا۔ کیا واقعی تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے روبی ایک بار پھر رو پڑی۔

”ہاں یار! میں واقعی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر سنو یہ! آسویہ بہت انمول موتی ہیں ان کو اکیلے بیچنے نہیں بہانا چاہئے۔ اسے شک اس وقت بہاؤ جب کوئی ان انمول موتیوں کو اپنی انگلیوں سے چنے والا سامنے موجود ہو۔ مجھ سے دور بیٹھ کر آسویہ بہاؤ۔ جہاں میں ان کو چین نہیں سکتا۔ یار! آؤ اور میرے کاندھے پر سر رکھ کر یہ آسویہ گراؤ تو میں اپنی انگلیوں سے جن لوں گا۔ مگر مجھ سے دور بیٹھ کر ان کو آنکھوں سے گرا کر ان انمول موتیوں کی توہین مت کرو۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے تم کو روتا دیکھ کر۔ پلیز چپ ہو جاؤ۔“ آزر نے کچھ بے چینی سے کہا تو روبی نے ایک بار پھر جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا۔

فون بند کرنے کے بعد اس نے سنجیدگی سے سوچا۔ اگر آزر واقعی سنجیدہ ہے تو پھر یہ گندی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ وہ آزر سے شادی کر لے۔ تاکہ گھر کے اندر بیٹھ کر عزت کی روٹی تو کھا سکے گی۔ مگر ام آپی کیلئے مجھے شادی کرنے دیں گی۔ میں ان کو انکار کرنے کا موقع ہی نہیں دوں گی۔ شادی کی بات کرنے سے پہلے ہی کہہ دوں گی۔ آپ یہ گھر اور گاڑی اپنے پاس رکھ لیں مگر مجھے شادی کرنے کی اجازت دیں۔ مجھے پورا یقین ہے یہ سب سن کر وہ مجھے شادی کرنے کی اجازت دیں گی۔ مگر پہلے آزر کو آناؤں گی۔ اگر وہ ثابت قدم رہا تو ٹھیک ہے۔ ورنہ یہ نہ ہو آج شادی ہو اور کل طلاق۔ میں اس کو صاف صاف بتا دوں گی کہ شادی کے بعد میں فلموں میں کام نہیں کروں گی۔ یہ سوچتے ہی وہ مطمئن ہو کر سو گئی تھی۔

اس کے بعد جب آزر سے اس کا سامنا ہوا تو آزر نے فوراً ہی پھر شادی کی پیشکش کی۔ اتفاق سے زبرہ خانم نے بھی سن لیا۔ وہ اب روبی کا سالیہ بنی رہتی تھی۔ مگر روبی کو اس بات کا پتہ نہ چلا تھا کہ زبرہ خانم بھی آزر کی بات سن چکی ہے۔ رات کو زبرہ خانم آرام کے روم میں آئی اور کہا۔

”آخر وہی ہونا جس کا مجھے ڈر تھا۔ آزر نے روبی کو شادی کی آفر دی ہے۔ یہ سب میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ تم یہاں بیٹھی رہنا اور وہ چپکے سے نکاح پڑھا کر اڑ جائے گی۔ پھر ہاتھ ملنے سے کیا فائدہ۔“

ماں کی بات سن کر ام روفو راٹھ کر روبی کے روم میں آئی۔ ویم کی شادی اپنے ہی خاندان میں ہو جانے کے بعد وہ ویسے ہی سارا وقت غصے سے بھری رہتی تھی۔ ام روم میں داخل ہوئی اور بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

”یہ میں کیا سن رہی ہوں تم آزر سے شادی کر رہی ہو۔ وہ بھی ہمیں بتائے بغیر۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھ سے پوچھے بغیر شادی جیسا برا فیصلہ کرنے کی۔“ یہ سن کر روبی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”آپی ابھی تو صرف آزر نے ہی بات کی ہے بلکہ آفر دی ہے۔ میں تو آپ سے بات کرنے کے بعد ہی آزر سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مجھے آپ کی قسم میں نے ابھی تک آزر کو شادی والی بات کا جواب نہیں دیا۔“ یہ سنتے ہی ام نے اپنا پروگرام بدل لیا اور لہجہ نرم کرتے ہوئے بولی۔



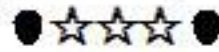
”اب اگر آزر شادی کے حوالے سے کوئی بات کرے تو صاف صاف اس کو کہنا مجھ سے بات کرنے کے بجائے میری آپا اور آپا سے بات کرو۔ شادی کی بات بڑے طے کرتے ہیں۔ جب وہ ہم سے بات کرے گا تو پھر ہی سوچیں گے کہ اس کو کیا جواب دینا ہے۔ جواب کیا دینا ہے اگر تم کو بات پسند ہے تو پھر تمہاری شادی کر کے رخصت کر دیں گے۔“

”جی بہتر آپا!“ روبی نے حیرانی سے ان کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ جس لمحے میں ارم آپا نے روم میں داخل ہوتے ہی بات شروع کی تھی۔ اس کے بعد روبی نے یہ سوچا تھا کہیں آج پوی کی طرح اس کو بھی جوتیاں نہ پڑ جائیں۔ مگر خیریت رہی تھی وہ زم ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا وہ ابھی آزر کفون کر کے یہ خوشخبری سنا دے۔ مگر سوچا صبح فیس نو فیس بات کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور وہ کل ہی آزر سے بات کرے گی۔

ادھر ارم روبی کے روم سے نکلتے ہی ہال کمرے میں آئی تھی کہ باقی لوگ اس وقت وہیں تھے۔ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”آپا میں نے سوچ لیا ہے روبی کی شادی پوی سے ہوگی۔“

”کیا واقعی۔ پوی نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا اور ارم نے اس کو جواب دینے کے بجائے ماں سے کہا۔“



”کل رات جب روبی سٹوڈیو سے واپس آئے گی تو یہ رسم نکاح سادگی سے ہوگی۔ ہاں بعد میں شادی محوم دھام سے کریں گے۔“ پھر حکمانا انداز میں رضوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”مولوی اور گواہوں کا انتظام کرنا اب آپ کی ذمہ داری ہے۔ ورنہ یہ کام لیٹ ہونے کی صورت میں روبی ہاتھ سے نکل جائے گی۔“ پھر وہ باقی کا پروگرام طے کرنے لگیں۔ اب سب کو ہی پریشانی لگ گئی تھی کہ سونے کا منڈ سونے والی یہ مرغی کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

کرن سپر کے بعد ہاسٹل سے گھر آئی تھی اور آتے ہی وہ سیدھی ارم کے روم میں آئی تھی۔ آپا نے فون پر اس کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ جب سے وسم نے ارم کو چھوڑ کر اپنے خاندان میں شادی کر لی تھی تب سے تمہاری آپا سارا وقت اپنے کمرے میں بند اداں اداں سوگنہ سنی اور روتی رہتی ہے۔ گھر سے باہر جانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس وقت ارم کا روم خالی تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ حالانکہ پورچ میں اس کی گاڑی ناپا کر بھی کرن یہ سوچ سکتی تھی کہ آپا گھر پر نہیں ہے۔ مگر آپا کی باتوں کی روشنی میں کرن نے سوچا گاڑی خراب ہو کر ورکشاپ میں بھی تو جانی رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے گاڑی ورکشاپ گئی ہو۔ اور روبی کا تو پکا بتا تھا وہ سٹوڈیو میں ہوگی۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ آپا بھی جاتی ہے۔ پوی اور رضوی سے ملنا تو دور کی بات کرن کا ان کی شکل دیکھنے کا بھی موڈ نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنا بیگ یونہی اٹھائے اٹھائے اپنے روم میں آئی اور پھر سو گئی۔ امتحان میں مصروف رہنے کی وجہ سے ٹھکن ہو رہی تھی۔ اب وہ جی بھر کر سونا چاہتی تھی۔ اس لئے سو گئی۔ جب آنکھ کھلی تو کمرہ کبری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کتنی دیر لیٹی رہی۔ تاریکی میں ہی آنکھیں گھماتی رہی۔ پھر اٹھی اور چپل پہن کر اپنے روم سے باہر آ گئی۔ اب اس کا رخ ہال کمرے کی جانب تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس وقت سب لوگ وہیں ہوتے ہیں۔ وہ ابھی روم سے کچھ دور ہی تھی کہ ارم آپا کے تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت پتہ نہیں کس کی شامت آئی ہوئی ہے۔ کرن نے مسکراتے ہوئے سوچا اور دروازے کے قریب پہنچتے ہی روبی کا نام سن کر رک گئی۔ ان کا سارا پروگرام سننے کے بعد روم کے اندر جانے کے بجائے وہ مڑی اور واپس اپنے روم میں جانے کے بجائے روبی کے روم میں آئی۔ دروازہ کھلا ہی تھا۔ وہ دبے پاؤں روم میں داخل ہوئی اور پھر دروازے پر ہی رک گئی۔ روبی بیڈ پر لیٹی کسی سوچ میں گم تھی۔ کرن نے آہستہ سے دروازہ ہند کر کے لاک لگایا۔ پھر مڑ کر روبی کو دیکھا اور دھیمی آواز میں پکارا۔

”روبی!“ اس کی آواز سننے ہی روبی مارے حیرت کے اچھل پڑی۔ اس بار کرن نے آنے سے پہلے بتایا نہیں تھا کہ وہ آ رہی ہے۔ ورنہ وہ آنے سے پہلے لازمی فون کرتی تھی کہ گاڑی بھیج دیں یا پوی کو۔

”ارے کرن!“ وہ جلدی سے اٹھی۔ اور اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ پھر گلے ملنے کے بعد الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”کیسی ہو کرن!“ آنے سے پہلے فون کر کے بتایا کیوں نہیں کہ آ رہی ہو۔“ روبی نے ایک ہی سانس میں یہ ساری باتیں کی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں۔ یہ بتاؤ تم کیسی ہو؟“ کرن نے اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ کیسی ہو؟ بلکہ میں تو بہت ہی ٹھیک ہوں۔“ روبی نے اپنی شادی کا سوچتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔



تب کرن نے بہت غور سے اس کو دیکھا اور پوچھا۔  
 ”بہت خوش ہو وجہ بتانا پسند کرو گی۔ میں نے یہ خوشی تمہارے چہرے پر بہت لمبے عرصے بعد دیکھی ہے۔“  
 ”ہاں میں خوش ہوں۔“

”کیونکہ میری شادی ہو رہی ہے۔“ روبی نے شرمانے کی اداکاری کی تو کرن نے دکھ سے اس کو دیکھا پھر پوچھا؟  
 ”کس سے کر رہی ہو یہ شادی ذرا یہ تو بتاؤ۔“

”میں نہیں کر رہی یا راہ آزر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔“ روبی نے بتاتے ہوئے کہا۔  
 ”اور کیا تم بھی آزر سے محبت کرتی ہو۔“ کرن نے پوچھا۔

”نہیں میں نے بلال سے جو محبت کرنے کی قیمت چکانی ہے وہی کافی ہے۔ اگر میں خود سے اس کے سینے سے لگ گئی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ وہ رویہ اختیار کرنا یا وہ سب مجھ سے کہتا جو کہا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف بلال سے محبت کی اور میرا تھین کرو میں اب بھی پوری دنیا میں نفرت بھی صرف بلال ہی سے کرتی ہوں۔ آزر سے شادی عزت کی زندگی گزارنے کے لیے کر رہی ہوں۔ شادی کے بعد میں فلموں میں کام کرنا چھوڑ دوں گی اور گھریلو عورت بن جاؤں گی۔ شوہر اور بچوں کی خدمت کرنے والی۔“  
 روبی نے ایمانداری سے ساری بات بتادی تو کرن نے شرارت سے کہا۔

”بچوں کا بھی ابھی سے سوچ لیا ہے۔“

”تم کو تھین ہے کہ آزر سنجیدہ ہے۔ اور شادی کے بعد تم عزت کی زندگی گزار سکو گی؟ کیا آزر نے یہ کہہ دیا ہے کہ شادی کے بعد وہ تم سے فلموں میں کام نہیں کروائے گا۔ تم کو گھر بٹھا کر کھلائے گا۔ یہ شوہر ہے یہاں ہر کام حتیٰ کہ شادی بھی برنس کے ذمے مل آتی ہے۔“ کرن نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیسی باتیں کرتی ہو کرن۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ کتنے محرز خاندان کا بیٹا ہے۔“ روبی فوراً آزر کی فیور میں بولی تو کرن نے کہا۔

”روبی میں اس وقت تم سے مذاق نہیں کر رہی۔ میری بات پوری سنجیدگی سے سنو۔ گھر والے تمہاری شادی پوری سے کر رہے ہیں اور تم یہاں بے خبر بیٹھی ہو۔ کسی پر اتنا اندھا اعتبار بھی اچھی بات نہیں۔ جہاں اپنے سکے قابل اعتبار نہ ہوں وہاں دوسروں پر سوچ سمجھ کر اعتبار کرنا چاہئے۔“

”کرن یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ روبی نے حیرانی سے کہا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں ابھی ابھی ان کا سارا پروگرام سننے کے بعد آ رہی ہوں۔ کل شام مطلب رات میں تمہاری پوی کے ساتھ رسم نکاح ہو گی۔ اب تم صبح اس گھر سے جاؤ تو واپس تب ہی آنا جب آزر سے نکاح پڑھا لو پھر تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ہاں پھر اس کو ساتھ لے کر ہی اس گھر میں آنا۔ اگر تم اس کے بغیر آئی تو یہ لوگ زبردستی تمہارا نکاح پوی سے پڑھا دیں گے۔ یہ تو سب لوگ اپنے اپنے مفاد کی جنگ لڑنے والے لوگ ہیں۔“ کرن نے ایمانداری سے کہا۔

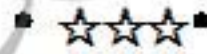
”کرن تم۔۔۔۔۔“ روبی گلے لگ گئی تو کرن نے اس کو پرے کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جب سہ پہر کے بعد آئی تو گھر میں نہ تم تھی نہ آپنی۔ اور نہ ہی آیا اس لئے میں اپنے روم میں جا کر سو گئی۔ ابھی اٹھ کر ہال کی جانب گئی اور باہر سے ہی ان کا پروگرام سن کر اندر جانے کے بجائے سڑ کر تمہارے روم میں آ گئی ہوں۔ پہلے کی طرح تم یہ نہ سمجھو کہ میں بھی ان کے ساتھ اس پروگرام میں شامل ہوں۔ ہاں ایک بات جو میں نے تم کو کبھی نہیں بتائی آج اس وقت بتا رہی ہوں۔ رضوی میرے سکے والد نہیں ہیں۔ میرے والد تو میری پیدائش سے بھی پہلے فوت ہو گئے تھے۔ یہی وہ انسان ہے جس نے میری ماں کو گندے کام پر لگایا اور پھر میری بہن کو بھی اور جب بندہ خود گندگی میں رہنے کا علوی ہو جائے تو پھر دوسروں کو بھی اس میں کھینٹے ہوئے شرم محسوس نہیں کرنا۔ میں خوبصورت ہوتی تو میسٹرک کے بعد میں بھی فلموں میں چلی جاتی۔ کیونکہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا شوق بھی تھا۔ اور پھر اس دھندے پر لگ جاتی۔ لیکن اب مجھے سب سے نفرت ہے۔ آج تک آپنی میری عزت بچانے کی بات اس لئے کر رہی تھی کہ وہ ایک امیر خاندان کے بیٹے سے شادی کر رہی تھی۔ لیکن اب جب تمہاری شادی کے بعد کھانے کو روٹی نہیں ملے گی تو وہ خود ہی مجھے دھندے پر بٹھا دیں گی۔ آخر سب نے روٹی بھی تو کھانی ہے۔ جب ماں یہ کام کرتی رہی۔ میں نے بھی کیا ہے تو پھر تم کو کرتے ہوئے کیا تکلیف ہے۔“ روبی خاموشی سے سن رہی تھی اور کرن کہہ رہی تھی۔



”اب میں صبح تک اس گھر میں رہوں گی۔ پھر تمہارے جانے کے بعد کبھی نہ لوٹ کر اس گھر میں آنے کیلئے جس خاموشی سے میں آئی تھی چوکیدار کو سمجھاتے ہوئے اسی خاموشی سے واپس ہاسٹل لوٹ جاؤں گی۔ جانتی ہو یونیورسٹی میں ایک لڑکا مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ ارے محبت تو کیا وہ کہتا ہے شادی بھی میرے ساتھ ہی کرے گا۔ وہ بھی اس دنیا میں بالکل اکیلا ہے اور خود ہی محنت مزدوری کر کے پڑھ رہا ہے۔ لیکن بہت اچھا بہت غیرت مند ہے۔“

میں صبح تمہارے سٹوڈیو جانے کے بعد گھر سے جاؤں گی۔ صرف اس لئے کہ تم ان سب سے ڈرتی بہت ہو۔ ابھی تک تو یہی پروگرام تھا ان کا جو میں نے تم کو بتایا ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے رات میں وہ اپنا پروگرام بدل لیں۔ میں تمہاری دوست ہوں میں نہیں چاہتی کہ تمہارا مزید کوئی نقصان ہو۔ اگر تم کو عزت کی زندگی گزارنے کا موقع مل رہا ہے تو اس کو مس مت کرو۔ پوی بے غیرت باپ کی بے غیرت نسل ہے۔ باپ بھی نشئی اور بیٹا بھی۔ وہ خود ہی تمہارے ساتھ شادی کرنے کے بعد بندے تلاش کر کے لایا کرے گا اور میری ماں ان کو اپنے کھانے پینے کا خیل ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ لیکن پوی سے محبت بھی سب سے زیادہ کرتی ہیں۔ جب تمہاری پوی کے ساتھ شادی ہو جائے گی تو وہ وہی کرے گی جو پوی کہے گا۔ اور سنو میں تمہیں بھی نہیں بھلوں گی۔ تم سے ملنے نہ آ سکی تو فون ضرور کرتی رہوں گی۔ اور روپی تم بھی میرے لئے اللہ سے دعا کرنا۔ وہ مجھے اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ ان لوگوں سے مجھے بھی بچالے۔“

روپی حیرت سے کرن کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ ساری رات ان دونوں نے باتیں کرتے ہوئے ہی گزاری تھی صبح ہوتے ہی کرن روپی سے گلے کر اپنے روم میں چلی گئی تھی۔ کرن کے جانے کے بعد روپی تیار ہوئی۔ بیگ کھول کر گھر کی رجسٹری اور گاڑی کے کاغذات بیگ میں رکھنے کے بعد چیک بک اور چند اہم کاغذات رکھنے کے بعد بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔



ناشتے کی میز پر زیرہ خانم خاصے پر جوش انداز میں موجود تھی۔ ان دونوں نے حسب معمول ناشتہ کیا۔ اور پھر روپی ان کے ساتھ گاڑی کی جانب آئی۔ وہاں اس کے دونوں باڈی گارڈ موجود تھے۔ روپی نے گاڑی کے لاک کھولے وہ دونوں پیچھے بیٹھ گئے۔ زیرہ خانم فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ وہ اس وقت بہت خوش تھیں۔ یہ خوشی ان کے چہرے سے چھپائے بھی نہیں چھپ رہی تھی۔ روپی نے پوچھنے کی زحمت کو اڑھائی کی تھی۔ ہاں اگر کرن نے ان کا سارا پول نا کھول دیا ہوتا تو وہ ضرور پوچھتی۔ رات کرن نے کہا تھا۔

”میری ماں کو ہم بہنوں سے محبت نہیں ان کو صرف پوی عزیز ہے۔ وہ ان کیلئے سب سے اہم ہے۔ بیٹا ہر ماں کیلئے اہم ہوتا ہے۔ ہم کو کمانے کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ ہم سے چوری اس کو پیسے دیتی رہتی ہیں۔ میں نے خود کئی بار سنا ہے۔ پیسے دینے کے بعد کہیں گی۔ ارم کرن کو بتانا نہ چلو ورنہ دونوں بھونگیں گی۔ پہلے باپ جس بیٹا تھا۔ اب بیٹا بھی بیٹا ہے۔ یاد رکھنا اب آزر کے ساتھ نکاح پڑھانے کے بعد ہی واپس آنا۔ مسئلہ کی گنجائش نہیں اب تمہارے پاس۔ روپی نے بھی سوچ لیا تھا وہ سٹوڈیو جاتے ہی آزر کو الگ لے جا کر ساری بات بتا دے گی اور پھر اس کے بعد وہی کرے گی جو آزر کہے گا۔ لیکن جب وہ سٹوڈیو پہنچی تو آزر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ روپی نے آزر کے بارے میں ڈائریکٹر سے پوچھا تو معلوم ہوا وہ آؤٹ ڈور عکس بندی میں حصہ لینے رات کا کراچی جا چکا ہے۔ یہ سنتے ہی روپی کی رنگت زرد پڑ گئی۔ روپی نے سوچا اب کیا ہوگا۔

آزر کے کراچی جانے کا سن کر روپی کا سارا پروگرام خاک میں مل گیا تھا جو کرن اور روپی نے بنایا تھا۔ اب کیا کروں وہاں کے پریشانی کے سوچتی جا رہی تھی۔ مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ دماغ جیسے یکدم ہی ماؤف ہو گیا تھا۔ ادھر گھر والے رات کلاس کا پوی کے ساتھ نکاح پڑھانے کا پروگرام بنا کر بیٹھے تھے۔ ادھر آزر کراچی کیلئے روانہ ہو چکا تھا۔ اب وہ کس کو بتائے اور کہاں جائے۔ سیٹ پر اس وقت نسیم بھی موجود تھی۔ روپی کو یوں پریشان دیکھا تو پوچھا۔

”کیلیات ہے جو یکدم ہی اس قدر پریشان ہو گئی ہو۔ آزر سے کوئی بہت ضروری کام تھا۔“

”جی بہت ضروری۔ از حد ضروری کام تھا۔“ روپی بمشکل بول سکی۔

”تو ڈیر! اتنا پریشان ہونے کی کیلیات ہے۔ شوٹنگ مکمل کروا کر وہ آ ہی جائیگا تب تک ویٹ کر لو۔“ نسیم نے مشورہ دیا۔

”تب تک سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ فنا ہو جائے گا۔“ اب کہ روپی نے رو دینے والے لہجے میں کہا تو نسیم نے حیران ہو کر اس کو دیکھا پھر پوچھا۔

”کیا فنا ہو جائے گا۔“ مجھے تو بتاؤ۔



روبی نے نسیم کو جواب دینے کے بجائے دوڑ بٹھی زبرہ خانم کو اگلا نگاہ دیکھا۔ وہ روبی کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ روبی نے فوراً نظریں ان کے چہرے سے ہٹالیں اور پھر نسیم کی جانب دیکھنے لگی۔

نسیم روبی کی اب بہت اچھی دوست بن چکی تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ روبی سے چند برس بڑی تھی۔ روبی کبھی نسیم کو آپ اور کبھی تم کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ اب اس وقت روبی سوچ رہی تھی آرتو نچانے کراچی سے کب آئے جبکہ اس کا مسئلہ آج ہی حل ہونا ضروری ہے۔ کیوں نا نسیم کو ساری بات بتا کر مدد مانگی جائے۔ آرتو کے بعد ایک نسیم ہی رہ گئی تھی جس پر اس وقت وہ اعتبار کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ نسیم کو اپنے گھر سے بھاگنے کا سارا واقعہ سنا چکی تھی۔ بلکہ وہ زبردستی روبی کو سنوارنے پر مجبور کر چکی تھی۔ ہوا یوں کہ باہر آؤٹ ڈور شوٹنگ پر اس کو زبرہ کے بغیر جانا پڑا۔ اور عکسبندی کے دوران نسیم نے روبی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”روبی کیا تم زبرہ خانم کی سگی بھانجی ہو۔“

”جی بالکل۔“ روبی نے اس کی بات سن کر فوراً کہا تو نسیم ہنس کر روبی۔

”روبی تم سوا رہی ہو یہ بات تو میں یقین نہیں کر سکتی۔ مجھے پورا یقین ہے زبرہ خانم تمہیں کہیں سے بھگا کر لائی ہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نا جواب دو۔“

”آخر آپ کو میری بات پر شک کیوں ہے؟“ روبی نے پوچھا۔

زبرہ خانم اور ام نے روبی کو گھر سے باہر متعارف کروانے سے پہلے ہی خوب اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ یہاں کے لوگ بہت تیز ہیں۔ وہ تم کو ہزاروں طریقوں سے پوچھیں ہمارے بارے میں تمہارے بارے میں۔ مگر تم نے کسی کی باتوں میں نہیں آنا۔ سب سے یہی کہنا ہے کہ تم میری سگی بھانجی ہو۔ مگر نسیم بھی بڑی تیز تھی اور پھر نا ٹیکہ چشمہ بانی کی نبی تھی۔ روبی کم عمر بھی تھی۔ اس لئے نسیم نے روبی سے ساری بات اگلائی تھی۔ اور پھر گھر سے بھاگنے کے بعد ایک نسیم ہی تھی جس کو روبی نے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ وہ گھر سے کیوں بھاگ گئی بلال اور اپنے خاندان کے بارے میں بھی۔ مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا خاندان رہتا کہاں ہے۔ نسیم کہتی تھی چلو میں خود تمہارے گھر چھوڑ آتی ہوں۔ وہ اب اپنے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے خاندان کی رہائش کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اور آخر میں یہ بتا کید بھی کی تھی نسیم کو کہ وہ یہ باتیں اپنے تک ہی رکھے۔ کسی اور کو اس کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔ نسیم نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ نسیم نے یہ اپنا وعدہ نبھایا بھی تھا۔ اب پھر روبی نسیم پر اعتبار کرنے کا سوچ رہی تھی۔ پھر وہ نسیم کی آواز سن کر چوکی تھی۔

”روبی کیلئے تم کو پریشان کر رہی ہے؟ کیا ہوا جو یوں مرمرز کر زبرہ خانم کو دیکھ رہی ہو۔“ نسیم نے اس کو پریشان دیکھ کر خود ہی پوچھ لیا۔ روبی نے ایک منٹ بھی مزید ضائع کئے بغیر ایک ہی سانس میں اپنی ساری پریشانی نسیم کو بتانے کے بعد کہا۔

”آزرا لاہور میں موجود نہیں ہے۔ وہ آؤٹ ڈور شوٹنگ کیلئے لاہور سے باہر گیا ہے۔ اب بس آپ ہی ہو جس پر میں اعتبار کر سکتی ہوں۔ پلیز کسی بھی طریقے سے مجھے زبرہ خانم کے ساتھ واپس گھر جانے سے روک لو۔ مجھان دونوں ماں بیٹی سے ڈر لگتا ہے۔ میں خود سے ان کے ساتھ گھر جانے سے انکار نہیں کر سکتی۔ انکار کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ انہوں نے ذرا سا بھی ڈانٹا تو میں خود ہی بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ کر ان کے ساتھ گھر واپس چلی جاؤں گی۔ پلیز میری مدد کرو۔“

”پرانا کرو۔ سمجھو تمہارا یہ کام ہو گیا۔“ مگر روبی نے یہ سب سننے کے باوجود جواباً مسکرا نہ سکی تھی۔ پھر مرمرز کر زبرہ خانم کو دیکھنے لگی تھی۔ دوڑ بٹھی زبرہ خانم نے فاصلہ ہونے کے باوجود محسوس کر لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ جو روبی یوں مرمرز کر دیکھ رہی ہے۔ اور نسیم کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ وہ بہت تیز عورت تھی۔ پہلا خیال یہی ان کے ذہن میں آیا کہ انہیں وہ بات والی ان کی ساری باتیں سن تو نہیں چکی لگتا تو یہی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو دیر کر نا خطرناک ہوگا۔ ابھی چیک کرتی ہوں۔ یہ سوچتے ہی وہ جلدی سے اٹھی اور روبی کو آواز دے کر اپنے پاس آنے کا کہا۔

”لگتا ہے تمہارے آہستہ آہستہ باتیں کرنے اور مرمرز کر ان کو دیکھنے سے زبرہ کو تم پر شک ہو گیا ہے۔ جو وہ تمہیں بلا رہی ہے۔“ نسیم نے زبرہ خانم کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

”پھر اب میں کیا کروں؟“ روبی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”کرنا کیا ہے اس نے بلایا ہے تو اب جاؤ۔“ نسیم نے کہا۔



زیرہ خانم نے روبی کو دیکھتے ہی پائے ہائے کر کے کہا۔

”اکیلی۔“ روبی نے بے بسی سے نسیم کو دیکھتے ہوئے کہا تو نسیم اس کو دیکھ کر ہنس پڑی پھر کہا۔

”اکیلی کیوں چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ نسیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دونوں اٹھ کر زیرہ خانم کے قریب آئیں اور زیرہ خانم نے روبی کو دیکھتے ہی کہا۔

”روبی بیٹی! میری طبیعت ٹھیک نہیں تم ڈائریکٹر کے ساتھ معذرت کر کے مجھے گھر واپس لے چلو۔“ ان کی بات سنتے ہی روبی نے گھبرا کر نسیم کو دیکھا تو نسیم نے کہا۔ ”اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو آپ ٹیکسی پکڑ کر گھر چلی جائیں۔ روبی کے ساتھ چند آخری سین فلما نے ہیں ڈائریکٹر نے۔ اور میں ان چند سین کیلئے اپنی دوسری شوٹنگ کا شیڈول خراب نہیں کر سکتی۔“ نسیم کی بات سن کر زیرہ خانم سمجھ گئیں کہ گزربڑھ چکی ہے کچی کچی نسیم کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”بی بی یہ تمہارا مسئلہ ہے یا ڈائریکٹر کا۔ روبی اس وقت میرے ساتھ گھر چلی گئی۔ چلو روبی۔“ اب کہاںوں نے حکم دینے والے لہجے میں کہا تو روبی نے کہا۔

”میں شوٹنگ چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ آپ مجھ سے کرایہ لیں اور چلی جائیں۔“ روبی کی بات سن کر زیرہ خانم دوبارہ اس کو کچھ کہنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ سٹوڈیو فلور سے باہر چلی گئی تھیں۔ سمجھ گئی تھیں اب روبی سے مزید کچھ بھی کہنا بے کار تھا۔ وہ یقیناً رات والی ساری باتیں سن چکی تھی۔ اور نسیم کو بھی بتا چکی تھی کہ وہ کتنی دیر سے نسیم کے ساتھ سرکوشیوں میں مصروف تھی۔ روبی یہی سمجھی کہ وہ گھر چلی گئی ہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی وہ واپس آ گئی تھیں۔ نسیم نے زیرہ خانم کو واپس آتے دیکھ کر روبی سے کہا تھا۔ تم یقین کرو یا نہ کرو مگر مجھے یقین ہے زیرہ خانم کو تم پر شک ہو گیا ہے اور جہاں تک میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ وہ اپنی بیٹی ارم کو فون کر کے آئی ہے۔ تمہارے رویے کے بارے میں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو یہاں سٹوڈیو بلایا ہو۔ بڑی توپ چیز تھی ہیں اپنی بیٹی کو مگر مجھے نہیں جانتی میں بھی چشمہ کی بیٹی ہوں چشمہ کی۔“

”تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔“ روبی نے کہا۔ مگر رنگت ارم کے آنے کا ہی سن کر زبرد پڑ گئی تھی۔ اب نسیم کچھنا کر سکیں گی۔ اگر ارم آ رہی ہے تو وہ مجھے پوی کی طرح جو تیاں مار کر اپنے ساتھ گھر لے جائے گی واپس اور پھر۔

”نہیں میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔ میں طوائف ہوں اور ہمارا ہنداسی یا اندازہ لگانے سے شروع ہوتا ہے کہ کون کتنا مالدار ہے؟ کس کی جیب میں کتنا مال ہے؟ ہماری تو تربیت ہی اندازہ لگانے سے شروع ہوتی ہے۔ تم یقین کرو وہ ارم کو فون کر کے آئی ہے۔“ نسیم نے پورے یقین سے کہا۔

”اگر تمہارا اندازہ درست ہے تو پھر ارم آپلی واقعی یہاں آ گئی تو بہت برا ہوگا۔ وہ مجھے جو تیاں مارتی ساتھ لے جائے گی۔“ روبی نے خوف بھرے لہجے میں کہا تو نسیم بولی۔

”اگر یہ بات ہے تو تم نہیں بولنا سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔“ نسیم کی بات سن کر روبی اس کو دیکھنے لگی تو نسیم نے کہا۔

”اب تک شریف لوگوں پر اعتبار کر کے لٹی ہو۔ اب ذرا ایک طوائف پر بھی اعتبار کر کے دیکھو کہ تباہی تو اداہر بھی ہے اور اب اداہر بھی سہی۔“

”میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ میں تو خیر سب کی عزت کرتی ہوں۔ خاص کر آپا اور ارم آپ کی مگر افسوس میری عزت کسی نے نہ کی۔ میری عزت کا خیال کسی نے نہ رکھا۔ میں سب کچھ آپ پر چھوڑتی ہوں۔ آپ کے جو جی میں آتا ہے کریں۔ بس مجھ کو ان کے ساتھ نہ جانے دیں۔ اگر ارم آپلی زبردستی مجھے ساتھ لے جانا چاہے تو کسی بھی طریقے سے روک لیں۔“ روبی نے اتنا کہا اور خاموش ہو گئی۔ شوٹنگ پھر شروع ہو گئی۔ ابھی چند شاٹ ہی اوکے ہوئے تھے کہ ارم طوقان بن کر سٹوڈیو فلور میں داخل ہوئی اور چیخ کر نسیم کے پاس بیٹھی روبی کو بلایا۔ آواز دے کر وہ تجھتی تجھتی جس طرح روبی گھر کے اندامان سے ڈرتی اور دھتی تھی اب بھی ڈر جائے گی۔ اور کرن نے کہا تھا۔

”دیکھو ڈرنا نہیں اور بغیر نکاح اور آزر کے اس گھر میں واپس نہیں آنا۔ ورنہ باقی کی ساری زندگی بھی تباہ کر بیٹھو گی۔ روبی اٹھ کر ان کے قریب آئی تو ساتھ نسیم بھی آئی تھی۔ روبی تو پاس آ کر خاموشی سے کھڑی ہو گئی اور نسیم نے ارم سے پوچھا۔

”جی فرمائیے کیلیات ہے؟“

”محترمہ! میں تم سے نہیں روبی سے بات کر رہی ہوں۔ تم کون ہوتی ہو مجھ سے پوچھنے والی؟“ ارم نے نفرت سے نسیم کو گھورتے ہوئے کہا۔ پھر روبی کو دیکھا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

روبی کو ڈرانا کیلئے۔

”آپا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ انہوں نے کہا گھر چلو تو تم نے جانے سے انکار کر دیا کیونکہ تمہاری ماں نہیں تھی؟ مرنے ہیں تو مر جائیں۔“ ان کی بات سن کر روبی تو چپ ہی رہی کہ وہ



سارا معاملہ نسیم کے سپرد کر چکی تھی۔ یہی وجہ تھی نسیم نے ارم کی بات سن کر کہا۔

”یہاں سیٹ لگا ہے شوٹنگ کیلئے۔ ان سے روٹی نے کہا تو تھا کہ کرایہ لیں اور ٹیکسی پکڑ کر گھر چلی جائیں۔ ظاہر ہے وہ شوٹنگ دھوری چھوڑ کر گھر نہیں جاسکتی تھی۔“

”تم نے تم سے نہیں روٹی سے بات کر رہی ہوں۔ تم کو بیچ میں بڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ ارم نے غصے سے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔ پھر روٹی کو دیکھا اور حکم دینے والے مخصوص انداز میں بولی۔

”چلو روٹی تم آپاچی کو لے کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں ابھی تمہارے ڈائریکٹر سے بات کر کے آتی ہوں۔“

”ڈائریکٹر سے بات کرنے کی اب کیا ضرورت ہے۔ اب آئی، ہوتاو اپنی والدہ کو خود اپنی گاڑی میں گھر لے جاؤ اور روٹی کو شوٹنگ کرنے دو۔“ نسیم نے اب بھی نرمی سے صرف یہی کہا تھا۔

”اوپر تم کون ہوتی ہو ہمارے درمیان بات کرنے والی۔ اپنا منہ بند رکھو۔ ورنہ میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔“ ارم نے سخت لہجے میں نسیم کو ڈانٹا پھر روٹی کو گھورتے ہوئے بولی۔

”تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہوں اور میرا منہ کیوں دیکھ رہی ہو۔ آپاچی کو لے کر جاتی ہو یا میں پاؤں سے جوتی اتار کر تمہارا بیڑا ہوا دماغ درست کروں۔“

اب کھل کر سامنے آنا مجبوری بھی تھی اور ضروری بھی۔ نسیم نے دونوں ماں مٹی کو دیکھتے ہوئے صاف اور دونوں کو بات کرتے ہوئے کہا۔

”روٹی آج تم لوگوں کے ساتھ نہیں جائے گی۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“ زہرہ خانم نے پہلی بار بات چیت میں حصہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اور اندر سے دل دھک سے رہ گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

”مطلب بھی وہی ہے جو کہا ہے۔ روٹی اب تم لوگوں کے ساتھ نہیں جائے گی۔“ نسیم نے پھر نرمی سے کہا۔ مگر ارم کو یہ سب سن کر غصہ آ گیا۔ بلکہ غصہ تو پہلے ہی سے آیا ہوا تھا اب

شدید ہو گیا۔

”مگر کیوں نہیں جائے گی؟ اور تم کون ہوتی ہو، ہم سے بات کرنے والی؟“ پھر آگے بڑھ کر روٹی کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”چلو روٹی ہمارے ساتھ گھر۔“ مگر نسیم نے درمیان سے ارم کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اب کڑوا سخت لہجے میں کہا۔

”تمہاری سمجھ میں ابھی تک میری بات نہیں آئی تو سنو۔ میں تم کو کھل کر بتا دوں کہ خود روٹی ہی اب تم لوگوں کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔ تاہی اب وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ تم

نے پوچھا ہے میں کون ہوں بیچ میں بات کرنے والی۔ تو میں تم کو بتا دوں ایک تو میں روٹی کی دوست ہوں اور پھر یہ بات بھی روٹی کی خواہش پر ہی کر رہی ہوں۔ کیونکہ وہ خود تم لوگوں

سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ وہ راہم کا کرم لوگوں نے رکھا ہوا تھا روٹی کو اس لئے اب بات ختم ہو گئی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ یہ بات اب کی ہے۔“

”روٹی تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہتی۔“ زہرہ خانم نے پوچھا۔ صاف بتا چل چکا تھا کہ وہ رات والی ساری باتیں سن چکی ہے۔ جبکہ اب ارم مسلسل نسیم کو گھورتی جا رہی تھی۔

روٹی نے زہرہ خانم کی بات سن کر خود جواب دینے کے بجائے نسیم کو دیکھا اور نسیم نے کہا۔

”اس لئے کہ وہ آپ لوگوں کا آج رات کا پروگرام جانتی ہے۔ وہ پومی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ نسیم کی باتیں سن کر زہرہ خانم نے روٹی کو دیکھتے ہوئے لہجے میں ظاہری طور پر

محبت اور مروت بھرتے ہوئے کہا۔

”ارے بس اتنی سی بات پر خفا ہو کر گھر چھوڑ رہی ہو۔ چلو ٹھیک ہے تم پومی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو نا سہی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا چلو

شاہ اش اب ہمارے ساتھ اپنے گھر چلو۔“

”آپ کچھ بھی کہیں۔ روٹی اب آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔“ اب کہ نسیم نے مزید سخت لہجے میں کہا تو ارم ہارے غصے کے آگے برہمتی ہوئی بولی۔

”دیکھتی ہوں کیسے نہیں جائے گی۔ اور تم کیسے روکو گی۔ چلو روٹی ہمارے ساتھ جو بھی شکوہ شکایت ہے تم کو ہم سے گھر کے اندر بیٹھ کر بھی کر سکتی تھی۔ یہاں سٹوڈیو میں تماشا لگانے کی

کیا ضرورت تھی۔ چلو۔“ کہتے ہوئے ایک بار پھر روٹی کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو روٹی جلدی سے نسیم کے پیچھے ہو گئی۔

سٹوڈیو فلور پر موجود سب لوگ تماشائی کی حیثیت سے ان کو دیکھا اور سن رہے تھے۔ جیسے یہ بھی کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ ابھی تک کسی نے ان کے درمیان مداخلت نہیں کی تھی۔

ابھی تک کوئی کچھ سمجھ ہی نہ سکا تھا۔ سوائے اس کے کہ روٹی ارم اور زہرہ خانم کے ساتھ جانا نہیں چاہتی اور وہ زبردستی لے جانا چاہتی ہیں۔ نسیم چونکہ روٹی کی دوست تھی اس لئے وہاں کے



حق میں بول رہی تھی۔ روپی کو نسیم کے پیچھے ہوتے دیکھ کر ارم نے نسیم سے کہا۔

”تم پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ تمہیں روپی کو روکنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے۔“

”روپی کو زبردستی اپنے ساتھ تم کسی طرح بھی نہیں لے جا سکتیں۔ ہاں زبردستی کوشش کرنا اور روپی کو ساتھ لے جانا تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو میں کون ہوں؟ اور کتنی طاقت رکھتی ہوں۔“ نسیم نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”ہاں بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں۔ تمہیں اور تمہاری طاقت کو بھی۔ مگر یہ بھی بتا دوں میں شریف خاندان کی بیٹی ہوں کہ تم جس بازار کی رہنے والی ہو میں نے وہ دیکھا تک نہیں۔ ایک شریف لڑکی کسی طوائف کا بازار والی کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔“ ارم نے کھل کر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ نسیم کو شرمندہ کرنے کیلئے۔ مگر وہ بھی چشمہ بانی کی بیٹی تھی۔

”بازار دیکھا نہیں مگر ہندو بازار والوں جیسا ہی کرتی ہو۔“ نسیم نے ہنسکراتے ہوئے پرسکون انداز میں جوابی چوٹ کی۔ تب تک نسیم کے دونوں بھائی، ماموں اور روپی کے دونوں باڈی گارڈ ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ زہرہ خاتمہ سمجھ گئی اب وہ روپی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ ہاں یہاں ایک بڑا فساد ضرور ہو جائے گا۔ نسیم کے بھائی روپی کے گارڈ اور ماموں کے تیور اچھے نظر نہیں لگ رہے تھے۔ بات بڑھنے پر یعنی روپی کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنے پر وہ ان دونوں ماں بیٹی کی بے عزتی کر دیتے۔ مار مار کر حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے۔ بھلا کتنے لوگوں کو کس بات کا ڈر؟ کس چیز کی شرم؟ یہی سوچ کر ارم کا ہاتھ تھام کر روپی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”روپی! خوب اچھا صلہ دیا تم نے ہماری نیکی احسان اور ہماری محبتوں کا۔ ارے جب تو اپنے سکے ماں باپ کے گھر سے بھاگ کر پناہ کیلئے ہمارے گھر آئی تو تیرے پاس نہ کھانے کو کچھ تھا اور نہ پہننے کو۔ سوائے ایک اس سوٹ کے جو تمہارے بدن پر تھا۔ ہم سب گھر والوں نے تم کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ستر پر بٹھا کر کئی مہینے کھلایا اور تو آج ہم کا ایک ایسی عورت کیلئے چھوڑ رہی ہے۔ جو گھر کی نہیں بازار کی رہنے والی ہے۔“ پھر وہ حسرت بھری نگاہوں سے روپی کو دیکھتے ہوئے روتے ہوئے یونہی ارم کا ہاتھ پکڑے جلی گئی۔ روپی درحقیقت روپی نہیں ایک بلینک چیک بھی ان سب کیلئے۔ جس کو کیش کروا کر وہ سب عیش کر رہے تھے۔ مگر اب وہ جانے کوڑی تو نسیم نے اونچی اونچی آواز میں کہا۔

”سنو ارم! ایک ہفتے کے اندر اندر روپی کی کوٹھی خالی کر دینا۔ ورنہ میں بازار کی رہنے والی ہوں اور بازار کے لوگ ہی تم سے کوٹھی خالی کرانے آئیں گے۔ اور وہ کیسے کوٹھی خالی کروائیں گے تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔“ ارم مڑ کر جواب دینا چاہتی تھی۔ مگر زہرہ خاتمہ اچھی طرح جانتی تھی یہاں جو ش میں آنے کا نہیں ہوش میں رہنے کا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اس لئے ارم کو بولنے کا موقع دیئے بغیر اس کا ہاتھ تھام کر اس کے بغیر چلتی گئی۔ بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے۔ جہاں نسیم ہنس رہی تھی اور فنی کی آواز دیر تک ان کی سماعتوں میں تخی پیدا کرتی رہی تھی بلکہ زہرہ گھومتی رہی تھی۔

روپی گھر سے بھاگنے کے بعد آج ایک بار پھر نئے دورا ہے پر کھڑی تھی۔ پہلے گھر چھوٹ گیا تھا۔ اب یہ لوگ بھی جن کو وہ پہلے اپنا محسن سمجھتی تھی۔ مگر اب معلوم ہوا تھا وہ سب شکاری تھے۔ انہوں نے باقاعدہ جل بچھا کر روپی کو شکار کیا تھا۔ بہر حال حسن تھے یا شکاری اب ان سب کا یہ ساتھ بھی پکا پکا چھوٹ رہا تھا۔ بلکہ چھوٹ گیا تھا۔ وہ اس کو چھوڑ کر واپس جا چکی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اب اس کے سامنے صرف ایک ہی سستی تھی اور وہ تھی نسیم۔ ایک طوائف۔ کیا وہ اس پر اعتبار کرے کہ آزر نے تو بتایا نہیں کب آنا تھا واپس۔ تب تک تو وہ سٹوڈیو میں تو نہیں رہ سکتی نا کیلی۔ اس کو اب کیا کرنا چاہئے۔ وہ انہی سوچوں میں گم سم کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر نسیم نے پوچھا۔

”کیا تم کو ان لوگوں کا ساتھ چھوٹنے کا فوس ہے۔“

یہ سن کر روپی چند لمحوں کے بعد نسیم کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”ایک حد تک تو وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ جب میں اپنے سکے والدین کے گھر سے بھاگ کر ان کے گھر آئی تو میرے پاس صرف وہی ایک سوٹ تھا جو میرے بدن پر تھا۔ جس دن میں آئی اسی دن آپا کرن کو ساتھ لے کر مارکیٹ گئی اور پچاس ہزار کی ٹاپنگ صرف میرے لئے کی وہ بھی پہلے ہی دن اور پھر جب تک میں نے فلم لائن جوائن نہیں کی انہوں نے مجھے ستر پر بٹھا کر کھلایا۔ کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیا بلکہ ہمیشہ میرا خیال رکھا۔“

”ارے بس بس رہنے دو یہ فضول باتیں۔“ نسیم نے ہاتھ اٹھا کر اس کو روکتے ہوئے کہا۔

”پہلے ہی دن پچاس ہزار تم پر اس لئے خرچ کئے کہ بعد میں تمہیں فلموں میں بھیج کر ہندوے پر لگا کر تمہارے پچاس لاکھ کھا سکیں۔ مجھے تو کرن پر حیرت ہے وہ ان دونوں ماں بیٹیوں کے اثر سے کیسے بچ گئی۔ لوگ تو کہتے ہیں جیسی کوکویسے بچے اور سچی بات تو یہ ہے اگر ارم تم کو اپنے گھر پناہ دینے کی آفر نہ دیتی تو بلال نے خواہ جو بھی کہا تھا تم اپنے گھر سے



بھاگنے کی جرات کبھی نہ کرتیں۔ انہوں نے تمہاری کمائی کھانے کیلئے تم کو دھندے پر لگانے کیلئے محبتوں کا جال بچھایا تھا۔ اور تم پھنس گئیں۔ اگر یہ آپشن تمہارے پاس نہ ہوتا تو تم کبھی گھر سے بھاگنے کی غلطی نہ کرتیں۔ اور نا آج اس حال کو پہنچتی۔ دیکھو ہم خاندانی طوائف ہیں بازار میں رہنے والے لوگ اپنا دھندا خود کرتے ہیں۔ شریف بن کر شریف گھروں میں نقب نہیں لگاتے اور نا ہی شریف لڑکیوں کو بہکاتے ہیں۔ بازار میں بیٹھ کر اپنا دھندا کھل کر کھیلتے ہیں اور کرتے ہیں۔ کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ بازار میں کوٹھے پر بر آنے والے مال دار کا پتا ہوتا ہے۔ کوٹھے والی کی محبت ان کی شخصیت سے نہیں بھری ہوئی جیب سے ہوتی ہے۔ جیب ادھر خالی ہوئی ادھر طوائف کی محبت ختم ہوئی۔ مگر یہ دونوں ماں بیٹی بظاہر معاشرے میں شریف بن کر رہتی ہیں مگر اندر خانہ دھند بازاروں میں کرتی ہیں۔ بے غیرت عورتیں نسیم اتنا کہہ کر خاموش ہوئی پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔

”اب یہی دیکھو ہمارے یہاں بہت ساری دکا کائیں ایسی ہیں جنہوں نے شادی نہیں کی اور نسیم خانے سے دو دو تین تین بچیاں لے کر پرورش کر رہی ہیں۔ وہ یہ کام نیکی کے حوالے سے بر گز نہیں کر رہیں۔ صرف اپنے بڑھاپے کو شامدار طریقے سے انجوائے کرنے کیلئے۔ یعنی ان کی کمائی کھانے کیلئے نورنا ایسی ہی اولاد کی محبت ہے تو بر عورت بیٹے کی خواہش رکھتی ہے بیٹی کی نہیں جبکہ چوائس بھی آپ کے پاس موجود ہو۔ اے یہ اب سے نہیں ہر زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ بہت لوگ بچیاں لے کر خود پال پوس کر جوان کرتے ہیں اور پھر دھندے پر لگا دیتے ہیں۔ نسیم ایک بار پھر خاموش ہو گئی تھی۔ جبکہ روپی اس کے چپ ہونے پر چپ چاپ سوچ میں گم کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر نسیم نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے محبت سے کہا۔

”یقیناً اب تمہارا مجھ پر بھی اعتبار کرنے کو دل نہیں چاہتا ہوگا۔ تمہارا رویہ غلط نہیں ہے۔ جن حالات سے تم اب تک گزری ہو جہاں اپنے بھی قاتل اعتبار نہ ہوں۔ وہاں مجھ جیسی طوائف پر بھروسہ کرنا بہت دشواریاں ہے۔ مگر میں کہتی ہوں ایک اور رٹائی کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ جہاں اتنے دھوکے کھائے ہیں۔ وہاں ایک دھوکا اور سہی۔ مگر ابھی میرا یقین کرو کہ ثابت تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ میں طوائف ضرور ہوں مگر تمہارے اعتبار کو مجھ سے نہیں لگے گی۔“

روپی پھر بھی خاموش ہی رہی تھی۔ نسیم ڈائریکٹر سے شوٹنگ ملتوی کرنے کی ریکوئسٹ کرنے کے بعد واپس آئی۔ پھر روپی کا ہاتھ تھام کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔ روپی نے بھی اب کے ہاتھ چھڑانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ نسیم نے گاڑی کے قریب پہنچ کر روپی سے اس کی گاڑی کی چابی لے کر اپنے بھائی کے حوالے کی اور پھر اپنی گاڑی کا لاک کھول کر سب سے پہلے فرنٹ ڈور اوپن کر کے روپی کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ پھر خود بھی اندر آ بیٹھی۔ گاڑی جیسے ہی سٹوڈیو سے باہر روڈ پر آئی تو روپی نے پوچھا۔

”آپ مجھے اس وقت لے کر اپنے بازار جا رہی ہیں۔“

روپی کی بات سن کر نسیم نے ایک ننگا ہاس کے پریشان چہرے پر ڈالی۔ پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو اپنے گھر اپنی کوٹھی میں لے کر جا رہی ہوں۔ جو ایک پوش اور شریف ایریا میں ہے۔ بازار میں تو رات کو جب کبھی مجھے بھرے کی محفل ہوتی جاتی ہوں۔ لیکن اگر بازار بھی لے کر جاتی تو کوئی تمہاری جانب میلی نظر سے بھی نہ دیکھتا۔ بہت سارے شریف گھرانوں سے یہ بازار اچھا ہے۔“ اس کے بعد گھر پہنچنے تک دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

☆☆☆☆

ارم نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ماں کو گھورتے ہوئے شدید غصے سے کہا۔

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ میں نے کہا بھی تھا پوی کے ساتھ نکاح ہونے کے بعد ہی اب روپی کو گھر سے باہر جانے کی اجازت دیں۔ ایسا نا ہو کچھ غلط ہو جائے۔ آپ نے میری ایک نہ سانی اور کہا شوٹنگ ملتوی کرنا مناسب نہیں۔ رسم نکاح تو رات کو ہی ہوگی۔ اب دیکھا روپی کو گھر سے باہر لے جانے کا انجام۔ وہ طوائف چشمہ بانی کی بیٹی تھی بھلا اس سے ہم جیت سکتے تھے۔“

”میری وجہ سے نہیں۔ یہ سب تمہاری اپنی غلطی سے ہوا۔ رات غصے سے بری طرح طرح تم چلا رہی تھیں۔ اس کے بعد یہی ہونا تھا۔ روپی ضرور تمہارے پیچھے پیچھے آئی ہوگی اور ساری باتیں سن کر چکے چکے واپس اپنے روم میں چلی گئی۔ مجھے یقین ہے گھر کے اندر جو اس کا کیش تھا رجنسٹری گاڑی کے کفحات چیک بک وغیرہ وہ سب اپنے ساتھ لے گئی ہوگی۔“ زبیر خانم نے بھی غصے سے جواب دیتے ہوئے کہا تو ارم نرم ہو کر بولی۔

”مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میرے پیچھے آ جائے گی۔ وہ لٹی ہوئی تھی۔ جب میں اس کو چھوڑ کر باہر آئی اور پھر میں نے آزر کے ساتھ اس کی شادی کرنے سے انکار تو نہیں کیا تھا جو وہ تو



لگانے میرے پیچھے آتی۔ باقی رہی گھر کی رجسٹری تو اب وہ اتنی بھی ذہین نہیں کہ جاتے ہوئے ہر چیز ساتھ لے کر جائے۔ وہ پوی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے صرف اپنی جان بچا کر بھاگی۔ اگر رجسٹری گھر کے اندر موجود ہے تو آپا پھر میں دیکھتی ہوں یہ نیکہ چشم کی طوائف مٹی مجھ سے کوئی خالی کیسے کرواتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے ارم کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ پھر گھر آتے ہی وہ دونوں ماں بیٹی روپی کے روم میں آئیں اور پھر ایک ہی منٹ میں سارے روم کے چپے چپے کی تلاشی لے کر ہارے ہوئے جواری کی طرح روپی کے بیڈ پر ہی بیٹھ کر مارے غصے کے دانت پیسنے لگیں۔ روپی رجسٹری، گاڑی کے کاغذات کیا کیش کے ساتھ ساتھ سارا کلاڈ بھی لے گئی تھی۔ جو بہت زیادہ تھا۔ چودھری نواز جب بھی آتے تھے اس کیلئے کلاڈ کی کوئی نہ کوئی چیز لازمی لے کر آتے تھے۔ اس وقت کلاڈ کے سارے ڈبے خالی پڑے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ وہ بیگ میں ڈال کر سب کچھ ساتھ لے گئی تھی۔ اب صرف اس کے کپڑے جوتے ہی رہ گئے تھے۔ زہرہ خانم کا جی تو چاہ رہا تھا جس طرح ارم پوی کو جوتیاں مارتی تھی آج ایک جوتی وہ بھی ارم کے سر پر مار کر توڑ دیں۔ اگر وہ رات اونچی اونچی بکواس ناکرتی تو یہ سب نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ یہ جرات نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے چپ چاپ بیٹھی کھوتی رہی پھر بہت سوچنے کے بعد بولیں۔

”ابھی بھی روپی گھر آ سکتی ہے۔ اگر کوشش کی جائے۔ ارم نے نگاہیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ یوں جیسے پوچھ رہی ہو کیسے؟ مگر منہ سے چپ ہی رہی تھی کہ بولنے کی سکت ہی نہ خود میں با رہی تھی۔ ابھی وسم کی جدائی کا صدمہ ہی کم نہ ہوا تھا کہ ایک اور بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ یہ نقصان ہی تو تھا۔ سونے کا منڈے دینے والی مرئی ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

”اگر کرن کفون کر کے بلایا جائے تو وہ جا کر یقیناً روپی کو منا کر گھر واپس لاسکتی ہے۔ روپی اس کی دوست ہے۔“ زہرہ خانم نے اپنی رائے ظاہر کی۔ مگر ان کا لہجہ زیادہ پر جوش نہیں تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ بازی ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ ارم نے ان کی اس بات کو رد کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت بڑا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے بولی۔

”اگر اس طرح کرنے سے روپی آ سکتی ہے تو یہ بھی کر دیکھیں۔ مگر مجھ لگتا ہے ہم بازی ہار چکے ہیں۔ ایک ہفتہ پورا ہونے سے پہلے ہی یہ گھر بھی ہم کو چھوڑنا پڑے گا۔ اب انھیں یہاں سے اور ابو، پوی کو تو ساری بات بتادیں۔ انہوں نے ظہر کی نماز کے بعد مولوی کو کہنے جلانا تھا روک دیں۔“

یہ سنتے ہی زہرہ جلدی سے اٹھی۔ ان کے ساتھ ارم خود بھی اٹھی تھی۔ وہ دونوں رضوی کے روم میں آئیں تو وہاں پوی بھی موجود تھا۔ دونوں باپ بیٹا بہت خوش تھے۔ اور اپنا پروگرام طے کر رہے تھے۔ ارم تو چیخ پر بیٹھ گئی کہ روپی کے گھر چھوڑنے کی وجہ سے چلنے پھرنے میں دقت محسوس کر رہی تھی۔ جسم سے جیسے جان نکل رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی پوی باپ کے قریب سے اٹھتا ہوا ہوا۔

”ہم نے سارا پروگرام طے کر لیا ہے۔ اب صرف مسجد میں مولوی صاحب کو خود کہنے جائیں گے۔ کہا ہوں کیلئے میرے دوست ہی کافی ہیں۔ میں نے اپنے چند دوستوں کفون کر دیا ہے وہ رات کو پہنچ جائیں گے۔“ پوی بہت زیادہ خوش اور پر جوش تھا۔

”اب کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔“ زہرہ نے شوہر کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”سارے پروگرام اب کینسل کر دیں۔ آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ نا کسی کو بلانے کی۔ سب کچھ فنا ہو گیا ہے۔“

”کیوں مگر؟“ پوی نے فوراً پوچھا۔

زہرہ خانم نے ساری بات بتادی۔ یہ سن کر دونوں باپ بیٹوں کا رنگ اڑ گیا۔ پھر پوی نے کہا۔

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ ارم آپ نے کہا بھی تھا کہ پوی کے ساتھ نکاح کے بعد ہی اب روپی کو گھر سے باہر جانے کی اجازت دیں مگر۔۔۔ مگر آپ نے۔“ پوی نے مارے غصے کے بات نامکمل چھوڑ دی۔

”جو بھی ہوتا تھا ہو گیا۔ اب آپس میں جھگڑ کر مزید اس طرح کی بکواس کرنا فضول ہے۔ تاہم کرن کی صورت میں امید کی ایک کرن چمک رہی ہے۔ تم یہاں فضول بکواس کر کے نام ویسٹ کرنے کے بجائے جلدی سے جا کر بہن کو ہاسٹل سے گھر لے آؤ۔ اب بس کرن ہی روپی کو منا کر گھر لاسکتی ہے۔ ہو سکتا ہے روپی کرن کی بات مان جائے اور گھر واپس آجائے۔“ زہرہ نے کہا تو پوی فوراً ہی جابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

رات کے اس نے کتنے ہی خواب دیکھ لئے تھے۔ ماں نے روپی کے گھر چھوڑنے کی بات کر کے ہر خواب چکنا چور کر ڈالا تھا۔ وہ طوفانی رفتار سے کرن کے ہاسٹل آیا تو گیٹ سے باہر آتی کرن کی دوست کو دیکھ کر ہوا۔



”پلیز ہما! کرن کو بلا دو میں اس کو لینے آیا ہوں۔“

”خیریت!“ ہمارے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں اور سب خیریت ہے۔ وہ بس ماما اس ہو رہی ہیں اور کرن سے ملنا چاہتی ہیں۔“ پومی نے موڑبا نیک سے اترے بغیر بتایا۔

”لیکن وہ آج ہی تو گھر سے واپس آئی ہے۔ کیا اس کے آتے ہی آنٹی اداس ہو گئی ہیں۔“ ہمارے کہا تو پومی چونک پڑا۔

”کرن گھر کب گئی تھی۔ میں تو تین دن کے بعد قصور سے لاہور آیا ہوں۔ یہاں سے گزرتے ہوئے سوچا جب میں جا رہا تھا تو ماما کرن کیلئے اداس ہو رہی تھیں۔ اب جاتے جاتے

بہن کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔“ پومی نے چالاکی سے بات بناتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کل گھر گئی تھی۔ آج صبح ہی تو واپس آئی ہے۔ خیر میں بلا کر لاتی ہوں۔“ مگر وہ دیکھیں میرا ڈائریو گاڑی لئے کھڑا ہے مجھے جانا ہے۔ آپ چوکیدار سے کہیں وہ بلا لائے گا۔ ہمایہ

کہتے ہوئے چلی گئی اور پومی اندر جانے کے بجائے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اب وہ دل میں کھولتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

مما کہتی ہے روپی نے ارم آپ کی رات ساری باتیں سن لی تھیں۔ اس لئے جاتے ہوئے بھی کچھ ساتھ لے گئی۔ اب ہمارے گھر واپس آنے سے انکار کر دیا ہے۔ اونہہ اس میں

اب ذرا سی بھی شک کی گنجائش نہیں کہ یہ سب باتیں روپی نے نہیں کرن نے سنی تھیں۔ خود کرن نے سنی تھیں اور پھر حق دوستی ادا کرتے ہوئے اس کو گھر سے بھگادیا۔ بھی وہ جاتے وقت

برجیز گھر سے لے گئی تھی۔

رجسٹری، گاڑی کے کاغذات، چیک بک اور کیش کے ساتھ ساتھ سارا کلڈ بھی لے گئی۔ یہ سب کرنے کا مشورہ اسی نے دیا ہوگا۔ وہ بدھو خود اتنی ذہین نہیں تھی۔ ہر گز نہیں وہ تو بہت

بے وقوف اور ڈرپوک لڑکی تھی۔ وہ سب گھر والے اس کو جو بھی جھوٹ کہتے تھے وہ سب سچ سمجھ کر یقین کر لیتی۔ اگر روپی خود گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرتی تو یہ سب کچھ بھی نہ ساتھ لے کر نہ

جاتی۔ وہ صرف خود کو بچا کر لے جاتی۔ اگر کرن تعاون نہ کرتی تو روپی کو اس کے ساتھ شادی کرنے سے بھی انکار کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ ارم آپ سے بہت ڈرتی تھی۔ یہ کرن ہی ہے

جس نے حق دوستی نبھاتے ہوئے روپی کو گھر سے بھگایا ہے۔

اس کو حق دوستی نبھاتے ہوئے روپی کو گھر سے بھگانے کی عبرت ناک سزا دیں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا اس کمینی کو۔ مگر کچھ بھی کرنے سے پہلے چوکیدار سے پوچھنا ضروری ہے۔

ہو سکتا ہے وہ اپنے کسی یار کے ساتھ رات بسر کر کے واپس ہاٹل گئی ہو اور ہما کو گھر جانے کا کہہ دیا ہو۔ مگر نہیں وہ گھر ہی آئی تھی۔ میرا مستقبل تباہ کرنے۔ وہ جس طوفانی رفتار سے گھر

سے نکل کر ہاٹل روانہ ہوا تھا اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ گھر واپس آیا۔ دل میں یہ بھی سوچتا آیا تھا کہیں وہ چوکیدار کو بتانے سے منع نہ کر گئی ہو۔ خیر مجھے پوچھنے کا طریقہ آتا ہے

پھر گیٹ کے باہر ہی موڑبا نیک دوکتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔

”کرن بی بی کل کتنے بجے گھر واپس آئی تھیں اور صبح واپس کتنے بجے گئیں۔“ پومی کی بات سن کر چوکیدار نے چونک کر پومی کو دیکھا تو پومی کو پورا یقین ہو گیا کرن کل گھر ہی آئی تھی اور

جاتے ہوئے یقیناً چوکیدار کو منع کر کے گئی ہے۔ اس لئے چوکیدار کو غور سے دیکھا پھر گھورتے ہوئے کہا۔

”دیکھو جھوٹ نہیں بولنا۔ ورنہ میں ابھی ارم آپ کو بلا تا ہوں۔“ اور پومی کے پروگرام سے بے خبر ارم کا نام سن کر چوکیدار ڈر گیا۔ اور بتا دیا کل سپر کے بعد آئی تھیں اور صبح روپی بی بی

کے جاتے ہی وہ بھی چلی گئیں۔ یہ سب سنتے ہی پومی نے ہونٹ بھیج لئے تھے۔ پھر گھر کے اندر جانے کے بجائے وہ اپنے ایک بد معاش دوست کی جانب چلا گیا تھا۔ وہ اب کرن کو

اس کی جرأت کی سزا دینا چاہتا تھا۔ جس نے اس کا شاندار مستقبل ایک منٹ میں تباہ کر کے دکھ دیا تھا۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا وہ دونوں بہنیں پومی سے شدید نفرت کرتی تھیں۔ مگر

ماں کی وجہ سے اس کو برداشت کرتی تھیں۔ کرن تو اس کو کچھ نہیں کہتی تھی مگر ارم جب چاہتی تھی پاؤں سے جوتی اتار کر اس کو ایک منٹ میں بے عزت کر کے رکھ دیتی تھی۔ اب روپی کے

ساتھ شادی تو محض اپنے مطلب کیلئے کر رہی تھی خود نہیں کر سکتی تھی۔

مگر پومی نے بھی سوچ لیا تھا ذرا شادی ہو جائے پھر وہ ارم آپ کے سارے کس بل نکال دے گا۔ پھر وہ پومی کو جوتیاں مانتا تو دو روڈ انٹ کر بھی دکھائے۔ یہ گھر اس کی بیوی روپی کے

نام تھا۔ وہ ایک منٹ سے پہلے ارم اور کرن کو چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کرتا۔ مگر روپی بیوی بننے سے پہلے ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ یہ سب کرن کی وجہ سے ہوا تھا۔ پومی کی آنکھوں میں

خون اتر آیا اور وہ خونی لہجے میں بربرہایا تھا۔



”روبی کو گھر سے بھگانے والی! حق دوستی نبھانے والی بد معاش لڑکی! اس حق دوستی ادا کرنے کی سزا بھگتتے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ روبی گھر چھوڑ کر گئی ہے۔ تم کو کرن یہ دنیا چھوڑ کر جانا ہوگا۔ وہ دوست کے پاس آیا اور پھر ساری بات کھل کر دوست کو بتادی۔ پوی کا یہ دوست پہلے ہی اشتہاری تھا۔ فوراً ہی پوی کا ساتھ دینے پر تیار ہو گیا۔ پھر وہ دونوں دوست سارا پروگرام طے کرنے کے بعد کرن کے ہاسٹل آئے اور چوکیدار سے پوی نے کہا۔

”کرن بی بی کو بلاؤ۔ پولوان کی والدہ کی طبیعت خراب ہے۔ جلدی سے آئیں۔ بولیں پوی لینے آیا ہے تمہارا بھائی۔“ جب چوکیدار گیا تو طبل میں نفرت سے سوچا میرا مستقبل تباہ کرنے والی! آج میں تم کو برگزیدہ نہیں چھوڑوں گا اور پھر دوست سے کہا۔

”جیسے ہی وہ میرے قریب آ کر ماں کا حال پوچھے گی میں اس کو شوٹ کر کے موٹر بائیک پر بیٹھ جاؤں گا۔ تم اس کو ابھی سے سٹارٹ کر کے رکھو۔“ دوست نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ مارے غصے کے وہ پاگل ہو رہا تھا۔

☆☆☆☆

کرن نے اپنے روم کی کھڑکی میں سے روبی کو اپنی ماں کے ساتھ جاتے دیکھا۔ پھر گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو کرن نے اطمینان کی کبری سانس لی۔ اس کو یہ خوف تھا کہیں ان لوگوں نے اپنے پروگرام میں ترمیم نہ کر لی ہو۔ یعنی صبح روبی کو سٹوڈیو جانے کی ضرورت نہیں اب وہ نکاح کے بعد ہی گھر سے باہر آ جاسکے گی۔ ایسی صورتحال میں کرن نے روبی کی جانب سے خود ماں اور بہن کے مقابلے پر آنا تھا۔ مگر خیریت رہی اور روبی ان لوگوں کے چنگل سے نکل گئی تھی۔ عزت کی زندگی گزارنے کیلئے۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی کرن بھی اپنے روم سے باہر چلی آئی۔ سارا گھر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پوی، رضوی ہی نہیں ارم بھی ابھی سو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی بڑی بے فکری اور اطمینان سے گیٹ کی جانب چل دی۔ گیٹ کی کھڑکی کھول کر وہ گھر سے ہمیشہ کیلئے باہر نکل آئی تھی۔ دو تین منٹ چوکیدار کے پاس رک کر سمجھایا کہ اس کے بارے میں گھر میں کسی کو بتائیں کہ وہ آئی تھی۔ اب تم کو بھی کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی پوچھے تب بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ کہنا نہیں آئی تھی اور پھر وہ ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہاسٹل کی جانب روانہ ہو گئی۔

وہ خوش تھی بے حد خوش کہ اس نے روبی کی زندگی مزید تباہ ہونے سے بچالی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ روبی کو اس نے بچالیا ہے۔ مگر خود اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ بہر حال اس وقت اس نے حق دوستی ادا کر دیا تھا۔ اور پھر وہ خیریت سے ہاسٹل پہنچ کر اپنے روم میں جاتے ہی سو گئی تھی۔ ساری رات اس نے روبی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزاری تھی۔ اس وقت سوتے سے اٹھا کر ہی کرن کو بتایا گیا تھا کہ اس کی والدہ سخت غلیل ہیں اور اس کا بھائی پوی اس کو لینے آیا ہے۔ کرن سمجھ گئی روبی گھر چھوڑ چکی ہے اور ماں کی طبیعت تو خراب ہو نا ہی تھی۔ سونے کا منڈے دینے والی مرغی گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اب ماں چاہتی ہوگی میں روبی کو مینا کر گھر واپس لے آؤں۔ وہ میری دوست ہے۔ میری بات سے انکار نہیں کرے گی۔ مگر ماں یہ نہیں جانتی کہ روبی کو گھر سے بھگانے والی بھی میں ہوں۔ وہ گھر واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی اس گھر کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ آئی تھی۔ مگر اس وقت پوی کے ساتھ بات کرنا ضروری تھا۔ ورنہ چوکیدار کیا سوچتا؟ وہ چوکیدار کے ساتھ گیٹ کی جانب آتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی۔ پوی کے ساتھ جانے سے انکار کیسے کیا جائے۔

☆☆☆☆

پوی کو کرن کا زیادہ طویل ویٹ نہیں کرنا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ چوکیدار کے ساتھ پوی کی جانب آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ دھڑاسی بھی پریشان نہیں تھی۔ اس کو دیکھ کر پوی نے سوچا۔

”اس کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ چوکیدار کو منح کرائی تھی اور سمجھ رہی ہوگی گھر میں کسی کو اس کی چلا کی کا پتہ ہی نہیں چلے گا۔ وہ کبھی پکڑی نہیں جائے گی۔ وہ تو سوچ رہی ہوگی روبی کے گھر چھوڑنے سے ماں پریشان ہوگی۔ اس لئے پوی اس کو لینے آیا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ میں اس کو موت دینے آیا ہوں۔ تب تک اپنی موت سے بے خبر کرن پوی کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔

”کیا ہوا آپا کو؟“ کرن نے اس کے قریب رکتے ہوئے پوچھا۔ اور پوی ضبط نا کر سکا۔ پوری قوت سے کس کر ایک تھپڑ کرن کے منہ پر رسید کرتے ہوئے غرایا۔

”روبی کو گھر سے بھگانے کے بعد بھی مجھ سے یہ پوچھتی ہو کہ ان کو کیا ہوا؟“



کرن پوی کو مارنے چھٹی گریپوی اپنی بات ختم کرتے ہی جیکٹ کی پا کٹ سے موزر نکال چکا تھا۔ یہی وجہ تھی پوی کو مارنا دور کی بات کرن اپنی بات بھی پوری کر سکی اور پوی نے یہ کہتے ہوئے کہ۔

”روبی گھر چھوڑ کر گئی ہے تو تم اب دنیا ہی چھوڑ جاؤ۔“ سارا موزر کرن پر خالی کر دیا۔

فائرنگ کی آواز سن کر چوکیدار نے مڑ کر دیکھا۔ پھر بھاگ کر بڑی تیزی سے کرن کی جانب آیا۔ مگر تب تک وہ زخمی ہو کر زمین پر گر چکی تھی۔ کرن پر موزر خالی کرتے ہی پوی بھی اچھل کر موٹر بائیک پر دوست کے پیچھے جا بیٹھا تھا۔ اس کے بیٹھے ہی دوست نے بائیک آگے بڑھا دی تھی۔ اب وہ دونوں ہوا سے باتیں کرتے اڑتے جا رہے تھے۔ یعنی وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆

گھر آتے ہی نسیم روبی کو ساتھ لئے سیدھی اپنے روم میں آئی تھی۔ روم میں داخل ہوتے ہوئے روبی نے دیکھا تھا اچھا خاصا بیڈ روم تھا۔ مگر اس میں ایک خوبصورت اور قیمتی قالین بچھا کر اس پر ایک ڈبل بیڈ رکھ دیا گیا تھا۔ اس ڈبل بیڈ کے علاوہ اس کشادہ روم میں اور کوئی چیز نا تھی۔ مثلاً نا تو صوفہ تھا اور نا ہی بیڈ روم چیئر ز اور نا ہی فلور کشن روم میں رکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ روبی حیران ہوتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ نسیم نے کہا۔

”بیٹھو روبی یوں کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہی ہو۔“

”مگر بیٹھوں کہا؟ نا صوفہ ہے؟ نا چیئر اور نا ہی فلور کشن۔“ روبی نے سارے روم میں اپنی نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”یار! یہاں میرے بستر پر بیٹھو اور کہاں بیٹھنا ہے۔“ نسیم نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ اور روبی بستر پر بیٹھ گئی تو مزید کہا۔

”دراصل میں اپنے بیڈ روم میں کسی کو ملنا پسند نہیں کرتی۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے میں اس روم میں اپنے گھر والوں کا بھی آنا پسند نہیں کرتی۔ اس لئے صوفہ، چیئر، فلور کشن وغیرہ نہیں رکھتی۔“

”پھر مجھے کیوں یہاں لائی ہو۔“ روبی نے اس کی بات سن کر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تم کو اپنے وجود کا حصہ سمجھ کر یہاں لائی ہوں۔“ نسیم نے فوراً کہا تو روبی نے جھپکتے ہوئے پوچھا۔

”اور وہ جب لوگ آتے ہیں تمہارے پاس تب۔“

”وہ یہاں نہیں دوسرے روم میں آتے ہیں۔“ کہتے ہوئے نسیم اس کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر روبی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم کو آزر سے محبت ہے۔ مجھے کچ بچاؤ۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“ روبی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تم نے وہاں سٹوڈیو میں بتایا تھا نا کہ آزر کو تم سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں یہ پوچھ رہی ہوں کیا تم کو بھی آزر سے محبت ہو چکی ہے جو تم نے اس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“ نسیم نے کھل کر بات کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے محبت صرف بلال سے کی۔ پھر مجھے محبت سے بھی نفرت ہو گئی اور اب آزر نے خود محبت کا اظہار کیا اور خود ہی شادی کی آفر بھی دی اور میں نے عزت کی زندگی گزارنے کیلئے یہ سب قبول کر لیا۔ کیونکہ میں نے سوچ لیا ہے شادی کے بعد میں اپنی ساری فلمیں مکمل کر کے کام چھوڑ دوں گی اور کوئی مزید نئی فلم سائن نہیں کروں گی۔“ روبی نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا تو نسیم نے پوچھا۔

”تمہیں یقین ہے آزر بخیدگی سے یہ شادی کر رہا ہے۔ یعنی وہ تم سے محبت کرنے میں سنجیدہ ہے۔“

”ظاہر ہے سنجیدہ ہی ہوگا۔ شادی غیر سنجیدہ کام تو نہیں۔ کچھ سوچ کر ہی اس نے اظہار محبت کیا ہوگا۔“ روبی نے کہا تو نسیم چند لمحے اس کو دیکھتی رہی پھر کہا۔

”فلم لائن میں کوئی سنجیدہ محبت نہیں کرنا۔ آج فلم میں اپنی جوڑی قائم رکھنے کی خاطر لوگ شادی کرتے ہیں اور کل کوئی نئی لڑکی آئی اور جب اس کے ساتھ جوڑی بن گئی تو نا صرف



پہلی جوڑی ٹوٹ گئی بلکہ طلاق بھی ہو جاتی ہے۔ کوکہ سب لوگ ایسا نہیں کرتے مگر یقین کرو اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ دیکھو میری بات کا غلط مطلب نہیں لینا۔ ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ ایسا نہ ہو مگر تم سے زیادہ میں آزر کو جانتی ہوں اور تمہارے لئے میرا ایک مشورہ ہے اگر تم مانو تو ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ ایسا نہ ہو پھر بھی میرا مشورہ ہے۔

”کیا مطلب.....؟ اور کیا مشورہ؟“ روبی نے پوچھا تو نسیم نے کہا۔

”تم آزر کو صاف صاف بتا دو کہنا تو تمہارے پاس کوئی بینک بیلنس ہے اور نا ہی یہ گھر تمہارے نام پر ہے اور نا ہی تم شادی کے بعد فلموں میں کام کرو گی۔ اس کے بعد بھی وہاں گھر تم سے شادی کرے تو کر لینا۔ شادی کر کے طلاق لینے سے بہتر ہے بندہ دوسرا جھم کرنے کے بجائے پہلا ہی نا کرے۔ شادی کے بعد بھی اگر شوہر کے ساتھ اور لوگوں کو بھی خوش کرنا ہے تو پھر شادی کے بغیر ہی بندہ دوسروں کو خوش کر سکتا ہے۔ اور ایک حد تک خود بھی خوش رہ سکتا ہے۔

دراصل فلم لائن میں شادی کے بعد بیوی کے جسم کے ساتھ ساتھ ہر اس چیز پر بھی شوہر صاحب کا قبضہ ہو جاتا ہے جو بیوی کی ملکیت ہو۔ مطلب خود بھی خوش ہوگا اور دوسروں کو بھی خوش کرنے کا موقع دے گا اور اس خوشی کی جو رقم تم کو ملے گی۔ اس پر بھی اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو یا مزید کھل کر سمجھاؤں۔“ نسیم نے پوچھا۔ وہ اس وقت بے حد سنجیدہ تھی۔ روبی کے جواب دینے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی تو نسیم نے کہا۔

”آ جاؤ۔“ اور فوراً ہی ایک ملازمہ بڑے میں جوں کے دوگلاس رکھے روم میں داخل ہوئی تو روبی نے یہ دیکھتے ہی نسیم سے پوچھا۔ تم تو کہتی ہو اس روم میں تمہارے علاوہ کوئی نہیں آتا۔“

”یہ میری ذاتی ملازمہ ہے اور میرے ساتھ والے روم میں ہی رہتی ہے۔ اب میں اپنی ضرورت کیلئے خود تو روم سے یا بار نہیں جاسکتی۔“ نسیم نے جوں کا ایک گلاس اٹھا کر اس کو تھماتے ہوئے کہا۔ پھر دوسرا خود اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ ان کے جوں پینے تک ملازمہ چپ چاپ بڑے لئے کھڑی رہی تھی اور پھر خالی گلاس لے کر ہی واپس گئی تھی۔



”اب بتاؤ میری باتوں کی سمجھا آئی یا نہیں۔“ ملازمہ کہ جاتے ہی نسیم نے پوچھا۔

”آئی ہے۔ میں آج ہی آزر سے بات کر لوں گی۔“ روبی نے کہا۔

”اچھا اب یہ بتاؤ تمہارے گھر والے کہاں رہتے ہیں؟“ نسیم نے پوچھا۔

”یہ بھی نہیں بتاؤں گی کسی کو بھی۔“ روبی نے جلدی سے جواب دیا تو نسیم مسکرا دی پھر ہنستے ہوئے بولی۔

”اچھا چلو اتنا ہی بتا دو کیا تم لاہور ہی کی رہنے والی ہو یا لاہور سے باہر کی۔ اب بتو کی نہ کہہ دینا۔“

”شہر کا بھی کبھی نہیں بتاؤں گی کیونکہ میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔“ روبی نے فوراً کہا تو نسیم اس کے گھر اور خاندان کو چھوڑ کر امر اور زہرہ کی باتیں کرنے لگی۔ روبی نے بتایا۔

”اگر وہ لوگ جلد بازی سے کام نہ لیتے تو میں نے سوچ لیا تھا آزر کے ساتھ شادی سے پہلے ہی گھر آیا آئی کے نام کروں گی۔ گاڑی بھی ان لوگوں کو دے دوں گی۔ مگر انہوں نے زبردستی پوی کے ساتھ میری شادی کا پروگرام بنا کر سب کچھ ہی کھو دیا۔ خیر میں تو پھر بھی گھر ان کو ہی دینا چاہتی تھی مگر ان نے اپنی قسم دیکر مجھ سے کہا تھا۔ گھر گاڑی تو کیا کیش کلڈ سب ساتھ لے کر جانا بلکہ اس نے خود ہی احتیاط سے ہر چیز میرے بیگ میں ڈال دی۔ باقی سارا سامان نکل دیا۔“

”کرن اچھی لڑکی ہے۔ اس نے دوست ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ورنہ آج کل تو اپنے سگے پیدا کرنے والے بھی یہ حق ادا نہیں کرتے۔“ وہ دونوں باتوں میں محو تھیں کہ اچانک پردہ ہٹا کر ایک ہنس برس کا بچہ روم میں داخل ہوا۔ اس کے شلڈر پر سکول بیگ تھا۔ روبی نے حیران ہو کر اس بچے کو دیکھا۔

بچے نے روبی سے بھی زیادہ حیران ہو کر روبی کو دیکھا تھا۔ اتنے میں نسیم اپنی جگہ سے اٹھ چکی تھی۔ اس نے بچے سے ہاتھ ملایا پھر کاندھوں سے بیگ اتارنا تو بچے نے حیران ہو کر پھر روبی کو دیکھا۔ اور نسیم سے پوچھا۔

”یہ کون ہیں؟ اور ہمارے روم میں کیوں ہیں۔“

”یہ آپ کی خالہ ہیں۔ چلو ہاتھ ملاؤ ان سے۔“ کہتے ہوئے نسیم بچے کو روبی کے قریب لائی۔ اور بچے نے روبی کو سلام کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھایا۔ روبی نے سلام کا



جواب دیتے ہوئے ہاتھ ملایا پھر نسیم سے پوچھا۔

”یہ بچہ کون ہے؟“

”یہ میرا بیٹا نوئی ہے۔“ نسیم نے محبت سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر یونیفارم چھینج کر دانگ روم میں لے گئی۔ روبی مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑے نسیم کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی کہ اس کا چھٹی طرح معلوم تھا کہ نسیم غیر شادی شدہ ہے۔

نسیم بھی جاتے جاتے اس کی حیرت دیکھ کر مسکرائی تھی۔ جلد ہی وہ بچے کو ڈریس چھینج کر دالے آئی اور پھر وہ دونوں ہی روبی کے پاس بیٹھ گئے۔ اتنے میں ملازمہ بھی آ گئی۔ اس نے زمین پر دسترخوان چنا پھر کھانا لا کر رکھا۔ جب وہ جلی گئی تو نسیم بچے کو ساتھ لے کر اٹھتے ہوئے بولی۔

”آؤ روبی کھانا کھاتے ہیں۔“ روبی ابھی تک بیٹے والی حیرت میں گم تھی۔ وہ کھل کر پوچھنا چاہتی تھی مگر بچے کی موجودگی میں یہ بات پوچھنا مناسب نہیں تھا کہ شادی تو کی نہیں مگر یہ بچہ کیسے آ گیا؟ وہ خاموشی سے دسترخوان پر آ بیٹھی۔ خاموشی سے کھانا شروع ہوا اور خاموشی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ کھانا کھانے کے بعد روبی تو روم میں ٹھہرنے لگی اور نسیم بچے کو سلائے کیلئے خود بھی اس کے ساتھ بستر پر لیٹ گئی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد نسیم بستر سے اٹھی۔ بچہ سو گیا تھا پھر روبی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج پہلی بار اس روم میں صوفے چھیریا فلور کشن کی کمی محسوس ہوئی ہے۔ اب تمہیں کہاں بٹھاؤں۔“

”کہاں سے کیا مطلب؟“ قالین پر بیٹھ جاتے ہیں۔“ روبی نے فوراً اس کی مشکل حل کرتے ہوئے کہا۔ روم چونکہ کافی کشادہ تھا اس لئے وہ دونوں بیڈ سے دور ایک کونے میں جا بیٹھیں۔ کونے میں بیٹھتے ہی روبی کو جو بات پریشان کر رہی تھی اس کبارے میں پوچھنا ضروری سمجھا۔ نسیم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ آپ کا سگایا ہے؟“ نسیم اس کا مطلب سمجھ کر مسکرائی اور آہستہ سے ہنس کر کہا۔

”ہاں یا بالکل سگا ہے۔ پورے نو مہینے میں نے اس کو اپنے پیٹ میں رکھا تھا۔ آخر تم کو اس کا میرا بیٹا ہونے پر شک کیوں ہے؟“ نسیم کی یہ بات سن کر روبی نے بے حد حیران ہو کر نسیم کو دیکھا۔ پھر اسی حیرانی سے نسیم کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”مگر آپ کی تو ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ یہ بات آپ نے خود مجھے بتائی تھی۔ پھر یہ بچہ۔“ روبی نے بات ادھوری چھوڑ دی تو نسیم نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”تم فلم انڈسٹری میں چند برس بتانے کے باوجود بہت معصوم ہو رہی! ہاں میری شادی نہیں ہوئی۔ مگر تم یہ کیوں بھول گئی ہو کہ میں ایک طوائف بھی تو ہوں اور میرا یہ بچہ میری ننھ اترائی کا گفٹ سمجھ لو۔ ارے سمجھ کیا لویہ بس ہے ہی میری ننھ اترائی کا تحفہ۔ طوائف کی قسمت میں شوہر نہیں ہوتا مگر بچے لازمی ہوتے ہیں۔ یہ بچے چھوٹے لوگوں کے نہیں وزیر جاگیر دار اور ان جیسے بڑے بڑے مفردوں اور بیوروکریٹ کی اولاد ہوتے ہیں۔ یہاں کبھی کبھی بیٹا اپنی ہی ماں کے کوٹھے پر آتا ہے۔ اپنی ہی بہن کے ساتھ لیٹ کر چلا جاتا ہے۔ یا پھر اس کا مجراں کر چلا جاتا ہے۔“

”اس بچے کا مستقبل کیا ہوگا یہ بھی سوچا ہے آپ نے۔“

”کم از کم اس کے اپنے ماموں جیسا نہیں ہوگا۔ باہر بھیج دوں گی پڑھنے کیلئے اور کہہ دوں گی پھر یہاں لوٹ کر نہ آئے۔“ نسیم نے جذباتی ہو کر کہا۔ روبی مارے صدمے کے بول ہی نہ سکی۔ نسیم نے کہا۔ ”اگر میں فلم انڈسٹری میں نہ آتی تو اب تک مزید چار بچے نکال دیتا۔ مگر اب میں نے طے کر رکھا ہے بچہ پیدا نہیں کروں گی کیونکہ اگر میرے یہاں بیٹی پیدا ہوئی تو میں اس سے وہ سبنا کر اس کوں گی جو میرے والدین اور بھائی ماموں مجھ سے کروا رہے ہیں۔ ماں کہتی ہے ارے کیوں اپنا بڑھاپا خراب کرنے پر تکی بیٹھی ہو اور میں کہتی ہوں طوائف بن کر پیدا ہونا میرا تقدیر تھا۔ مگر میرے پیٹ سے کوئی طوائف پیدا نہیں ہوگی۔ بس مجھ میں اور تم میں یہی فرق ہے کہ تم برس تم کا اپنے پاس رکھنے کے باوجود چودھری نواز تم کو کوئی بچہ دے کر نہیں گیا۔ مگر طوائف کے پاس کچھ مرد بچہ دینے والے بھی آتے ہیں۔“

”آپ شادی کریں گی؟“ روبی نے نہ جانے کیوں پوچھا۔

”کبھی نہیں جب شادی کر کے بھی یہی کام کرنا ہے تو پھر شادی کئے بغیر ہی کرنا چاہئے۔ ایک فلم ڈائریکٹر کافی عرصہ مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے شادی کے لئے پیچھے پڑا رہا مگر میں نہیں مانی۔“



”کیوں؟ وہ سنجیدہ تھا تو شادی کا پیغام دیا۔“ روہی نے کہا۔

”تم ابھی بھی بہت بھولی ہو روہی۔ یہ شادی نہیں کمپروماز ہوتا ہے۔ طوائف شادی کے بعد بھی طوائف ہی رہتی ہے۔ وہ شادی کر کے میری کمائی پر قبضہ کر لیتا اور اس کے بدلے مجھے اپنا نام اور ایک دو بچے دے دیتا۔ ابھی تم چھوٹی ہو۔ مجھے یقین ہے ابھی تم پورے پچیس کی بھی نہیں ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں پتا چل جائے گا۔ تم ایک ہمدل میں تری ہو اور یہ بڑی گندی جگہ اور زندگی ہے۔ تم بہت بد نصیب ہو جو ایک شریف خاندان کی بیٹی ہونے کے باوجود گھر چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ میں کہتی ہوں اب بھی وقت ہے تم گھر واپس جاسکتی ہو۔ تم چاہو تو میں خود تم کو تمہارے گھر چھوڑنے جاسکتی ہوں۔ میں تمہاری می کے پاؤں پکڑ کر ان کو منالوں گی۔“ نسیم نے روہی کو سمجھاتے ہوئے پورے خلوص سے کہا۔

”تم میرے خاندان کو نہیں جانتی۔ اول تو وہ مجھے قبول ہی نہیں کریں گے اور فرض کرو وہ لا کرنے پر مجھے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر تمہارے آنے کے بعد وہ جو پہلے ہی مجھے آوارہ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اب ساتھ یہ بھی کہیں گے۔ نو سو چوہے کھا کر ملی گھر واپس آگئی ہے۔ وہ لوگ کبھی بھی نہیں بدل سکتے۔ میری واپسی کا تو خیال ہی ذہن سے نکال دو۔ اب میرا جو بھی انجام ہو مگر میں گھر واپس کبھی بھی نہیں جاؤں گی۔“ روہی کی بات سن کر نسیم نے پھر مزید کچھ پوچھنا نہیں چاہا تھا۔

نسیم کا پروگرام تو صبح شوٹنگ پر جانے کا تھا۔ اس نے سوچا تھا جب تک روہی کا گھر خالی نہیں ہو جاتا تب تک وہ روہی کو اپنے گھر رکھے گی۔ دونوں یہاں سے اکٹھی شوٹنگ پر جایا کریں گی۔ مگر پھر ایک ایسا سانحہ ہو گیا کہ اس نے خود بھی ایک ہفتہ کیلئے سٹوڈیو نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ سانحہ تھا کرن کی موت کا۔ نسیم کو رات ہی کو کرن کے قتل کی خبر مل گئی تھی۔ مگر اس نے یہ خبر روہی کو بتانے کے بجائے چھپالی تھی۔ جانتی تھی روہی کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ مرنے والی دوستی کا حق ادا کرنے کے جرم میں بھائی کے ہاتھوں قتل ہو گئی تھی۔ اب اگر روہی وہاں جائے گی تو ارم زہرہ اس کو پھر ایک بار اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کریں گی۔ اس نے سوچ لیا تھا جب تک وہ لوگ کوٹھی خالی نہیں کرتے تب تک وہ روہی کو کرن کی موت کی خبر نہیں دے گی۔ بعد میں بتانے پر بے شک روہی اس کے ساتھ ناراض ہو جائے۔ مگر وہ ہنسی سے وہ اسے جذباتی فیصلہ کرنے سے بچائے گی۔ اس کو دوبارہ ارم زہرہ کے جال میں پھنسنے کی اجازت نہیں دے گی۔

☆☆☆☆

ارم ہاں کے ساتھ کرن کا انتظار میں بیٹھی تھی۔ جب ہاسٹل سے فون آیا کہ کرن کا بھائی کرن پر فائرنگ کر کے فرار ہو گیا ہے۔ کرن کو شدید زخمی حالت میں جنرل ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ آپ فوراً آ جائیں۔

ارم کی سمجھ میں بالکل بھی نہیں آیا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ پوی تو بڑی محبت سے کرن کو ہاسٹل سے لینے گیا تھا۔ پھر یہ فائرنگ وغیرہ مگر مزید کچھ سوچنے کا نام نہیں تھا۔ وہ فوراً ماں اور رضوی صاحب کو ساتھ لے کر جنرل ہسپتال کی جانب روانہ ہوئی۔ مگر ان کے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی کرن رضوی کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ چکی تھی۔ کرن کی موت ارم کو پاگل کر گئی۔ ان کے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی پولیس بھی پہنچ چکی تھی۔ پہلے تو ارم کی سمجھ میں یہی نہیں آ رہا تھا پوی نے کرن کو کیوں قتل کیا؟ وہ تو بہت بڑ دل اور ڈرپوک لڑکا تھا مگر چونکہ یہ سب چوکیدار کی موجودگی میں ہوا تھا۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پوی کرن کا بھائی ہے۔ وہ پہلے بھی کئی بار اس کو لینے جا چکا تھا۔ یہ پتا چلتے ہی کہ یہ قتل پوی ہی نے کیا ہے ارم نے کچھ دیر سوچا۔ پوی قتل کر کے بھاگ چکا ہے۔ مگر اس کا نقشہ بے غیرت باپ یہاں موجود ہے۔ پکڑا تو وہ بھی جائے گا کہ میں اپنی بہن کے قاتل کو آزاد پر گزرنے چھوڑوں گی۔ آج اگر موقع آ گیا ہے اس بے غیرت بڑھے کو زادینے کا تو یہ میری اور میری ماں کی زندگی تباہ کرنے والا اب باقی کی تمام عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارے گا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی وہ پولیس کی جانب بڑھی اور کہا۔

”میری بہن کے قتل میں پوی اور اس کے والد رضوی کو گرفتار کر لیں۔ یہ قتل ان دونوں نے باقاعدہ پلان بنا کر کیا ہے۔“

ارم کی بات سن کر رضوی تو مارے حیرانی کے کچھ بول ہی نہ سکا۔ اچھی طرح جانتا تھا وہ ان دونوں باپ بیٹے سے شدید نفرت کرتی ہے۔ مگر اس نفرت میں وہ اس حد تک جائے گی۔ اتنا برا الزام ان پر رکھتے ہوئے بہن کے قتل میں ملوث کرے گی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اس کی موجودگی میں ہی تو پوی کرن کو لینے گیا تھا۔ بلکہ اس خود پوی کو ہاسٹل بھیجا تھا کہ وہ جا کر کرن کو لے آئے۔ ہو سکتا ہے روہی سے صلح کی کوئی صورت بن جائے۔ اور ان کو تو پوی پر بھی حیرت تھی۔ آخر ایسی کیلیات ہوئی جو پوی نے کرن کو قتل کر دیا۔ کیا پوی کے ساتھ کرن نے



آنے سے انکار کر دیا تھا؟ روٹی کو منانے سے انکار کر دیا تھا یا مطلب تو صاف تھا کہ ان دونوں میں ضرور کسی بات پر جھگڑا ہوا۔ جس کا نتیجہ کرن کے قتل کی صورت میں نکلا۔ اور اب ارم پوی کے ساتھ ساتھ اس کو بھی پولیس کے حوالے کر رہی تھی۔ رضوی تو چپ رہا تھا مگر کرن کا چہرہ چومتی روٹی زہرہ خانم نے ارم کی بات سن کر چونک کر ارم کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ارم یہ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ کیا کرنے جا رہی ہو۔“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ پلیز آپ چپ رہیں۔ یہ قتل ان دونوں باپ بیٹے نے پلان بنا کر کیا ہے۔ ان کے بغیر پوی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا۔“ ارم نے یہ سوچ کر کہا کہ بیٹا تو گیا اب اس نشتی بے غیرت ذلیل بڈھے سے بھی نجات حاصل کر لوں گی۔ بلکہ سخت سزا بھی دوں گی۔ یہی سوچنے کے بعد وہ پولیس کے پاس گئی اور پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”یہ دونوں باپ بیٹا میری بہن کو دھندے پر لگانا چاہتے تھے۔ مگر وہ نہیں مانی اور اس کا انکار کی وجہ سے یہ غصے میں بھرے رہتے تھے۔ اس لئے باقاعدہ پلان بنا کر میری معصوم بہن کو قتل کر دیا ہے۔ یاد رہے یہ رضوی صاحب میرے سگے والد نہیں ہیں اور پوی ان کا بیٹا ہے۔ میرا سگا بھائی نہیں ہے۔“

ارم کی بات سنتے ہی پولیس رضوی کو لے گئی۔ تب ارم پھر کرن کی میت کے قریب آئی۔ چہرہ بچ گیا تھا۔ ساری کلیاں دل کاٹنا نہ لے کر ماری گئی تھیں۔ بس یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سو رہی تھی۔ ارم چند لمحوں کو دیکھتی رہی پھر جھک کر بہن کی پیشانی چومی تو آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے روتے روتے ماں سے سر دلچے میں کہا۔

”یاد رکھئے گا اگر آپ نے رضوی یا پوی کی حمایت میں ایک لفظ بھی کسی سے یا پولیس سے کہا تو آپ کو بھی پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ آپ نے ہر بات کے جواب میں خاموش رہنا ہے۔“ اور زہرہ خانم گم صدمہ میں اس کو دیکھتی رہ گئی۔ جانتی تھی وہ بہت زہر پٹی لڑکی ہے۔ جو کہہ رہی ہے ویسا کر بھی گزرے گی۔ وہ کرن کو سری دیکھ کر پاگل ہو رہی تھی۔ وہ اس کی چھوٹی بہن تھی۔ تو کیا کرن ان کی بیٹی نہ تھی؟ کیا ان کا بیٹی بیٹی کی موت کا صدمہ دکھ نہیں تھا کہ وہاں بھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ پوی کیلئے بھی پریشان تھی۔ وہ بیٹا تھا۔ ارم کرن کا سوتیلہ بھائی تھا۔ مگر ان کا تو سگ بیٹا تھا۔ وہ اس کیلئے بھی دکھی ہو رہی تھی۔ ابھی تک ان کو بھی اس بات کی سمجھ نہ آئی تھی کہ پوی نے کرن کو قتل کیوں کیا تھا؟ وہ تو روٹی کے ساتھ شادی کرنے کیلئے اس کو لینے گیا تھا۔ کیا ساری بات سن کر کرن نے آنے سے انکار کر دیا تھا؟ کیا دونوں میں وہاں جھگڑا ہو گیا تھا؟ جو اتنا بڑھا کہ بات کرن کے قتل تک جا پہنچی۔ مگر موزر پوی کے پاس آیا کہاں سے۔ وہ تو بڑا دل ڈر پوک لڑکا تھا۔ اس کی جیب میں چرس سگریٹ تو ہو سکتی ہے۔ مگر اسلحہ نہیں۔ پھر یہ سب کیسے ہوا؟ ان کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ روٹی جا رہی تھیں۔ مگر صرف کرن کیلئے بلکہ پوی کیلئے بھی کہ نجانے اس وقت وہ کہاں ہوگا؟ ارم اس کو بھی نہ چھوڑے گی۔“

جب وہ میت لے کر گھر گئے تو ساری بات کھل گئی۔ چونکہ ارم نے ارم اور زہرہ خانم کو کرن کے قتل گھرانے اور پھر واپس جانے اور آج ابھی تھوڑی دیر پہلے پوی کا کرن کے گھر آنے کے بارے میں پوچھنا۔ سب بتا دیا تھا۔ اب ساری بات کھل کر ان دونوں ماں بیٹی کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھیں کہ مات بیاتیں روٹی نے نہیں کرن نے سنی ہوں گی اور اس کے بعد روٹی کو گھر سے بھاگنے کا مشورہ دے دیا ہوگا۔ بلکہ خود بھاگ کر گئی ہوگی کہ روٹی کے گھر سے سٹوڈیو جانے تک وہ گھر کا اندر موجود تھی۔ روٹی اس کی دوست تھی اور وہ کئی بار روٹی کی وجہ سے ان کے ساتھ جھگڑا کر چکی تھی۔ اب پوی کے ساتھ روٹی کی شادی کا پروگرام سنتے ہی اس کو گھر سے بھاگ دیا۔ روٹی سے اگر کرن کو محبت تھی تو پوی سے شدید نفرت اور یہ سب جاننے کے بعد کہ روٹی کو کرن نے گھر سے بھاگایا ہے۔ پوی اس کو کیسے زندہ چھوڑ سکتا تھا۔ روٹی کے گھر سے جانے کی وجہ سے اس کا شاندار مستقبل تار پک ہو گیا تھا۔

کرن کا جنازہ دھنسنے سے پہلے ہی پولیس نے پوی کو اس کے دوست کے ساتھ گرفتار کر لیا تھا۔ ارم کیلئے یہ خیر خوشی کا باعث تھی جبکہ زہرہ پریشان ہو گئی تھی یہ سب سن کر۔

☆☆☆

رات روٹی نے نسیم کے روم میں سو کر گزاری تھی۔ اس کے ساتھ بیڈ پر نسیم اور اس کا بیٹا بھی سوئے تھے۔ کل دوپہر جب نسیم کا بیٹا سو کر اٹھا تو ٹیوشن پڑھانے والا آ گیا تھا۔ نوئی بیگ لے کر ملازمہ کے ساتھ روم سے باہر چلا گیا تو نسیم نے روٹی کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”آؤ اب ہم بھی لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ روٹی انکار کئے بغیر نسیم کے ساتھ لان میں آ گئی تھی۔ صبح کی وہ روم میں بند تھی۔ لان نہ صرف خاصا وسیع تھا بلکہ بہت خوبصورت سرسبز و شاداب بھی۔ ہر رنگ کے پودے لان میں موجود تھے۔ جن پر پھول کھلے ہوئے تھے۔ روٹی کا اتنا پیلا لان دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ وہ چند منٹ کھڑی چاروں طرف دیکھتی رہی پھر لان میں رکھی بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئی۔ نسیم اس کے بیٹھنے کے بعد بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بیٹھنے کے بعد روٹی نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”بہت خوبصورت لان ہے آپ کا۔“



روبی جو بابت کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک لان میں ایک ہستی داخل ہوئی۔ روبی سب کچھ بھول کر چونک کر اس کو دیکھنے لگی۔ یہ ایک بزرگ عورت تھیں۔ جن کا چہرہ بہت پر نور اور نورانی تھا۔ انہوں نے فل سفید ڈریس پہن رکھا تھا۔ روبی کو انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سیدھی جائے نماز سے اٹھ کر آ رہی ہوں یا پھر حج کر کے آ رہی ہوں۔ وہ بہت باوقار انداز میں چل رہی تھی۔ روبی بے حد عزت اور عقیدت سے ان کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ کون ہو سکتی ہیں یہ؟ وہ سیدھی روبی اور نسیم کی سمت آئیں اور پھر جب ان کے قریب کرسی پر بیٹھ گئیں تو نسیم نے روبی کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

”روبی! میری والدہ ہیں۔“

”کیا...؟“ روبی نے چونکتے ہوئے اس پر نور چہرے والی خاتون کو دیکھا۔ وہ کسی طور پر بھی ایک طوائف کی ماں نہ لگ رہی تھی۔ وہ تو بہت نیک شریف اور معصوم شرمیلی بہت سیدھی سادی گھریلو قسم کی خاتون لگ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سیدھی حج کر کے آ رہی ہوں یا جائے نماز سے اٹھ کر آ رہی ہوں۔ روبی نے یہی سوچتے ہوئے ان کو سلام کیا اور وہ روبی کے سلام کا جواب دیتے ہوئے روبی کا حال پوچھنے لگیں۔ ان کی آواز میں بہت نرمی تھی اور یہ سب باتیں روبی کو حیران کر رہی تھیں۔ تبھی وہ نسیم کی آواز سن کر چونکی جو کہہ رہی تھی بلکہ روبی کو بتا رہی تھی۔

”روبی! میری والدہ تمہاری فلمیں بہت شوق سے دیکھتی ہیں۔ مگر ان کو تمہارا ڈانس ذرا بھی پسند نہیں۔ ان کا خیال ہے تم کو کسی اچھی ناپتنے والی سے ڈانس سیکھنا چاہئے۔ کیا خیال ہے اب یہاں آئی ہو تو کچھ سیکھ لو۔“ روبی نسیم کی بات سن کر چپ رہی۔ دل میں نہ چاہتے ہوئے بھی سوچا۔ ”میں کیا خاندانی طوائف ہوں جو شاہی محلے جا کر ڈانس سیکھوں گی؟“ نسیم کی والدہ جو محض روبی سے ملنے آئی تھیں۔ چند باتیں کرنے کے بعد اٹھ کر چلی گئیں۔ کیونکہ ان کے بھائی اور بیٹوں نے بتایا تھا کہ آج روبی کی وجہ سے نسیم کا اہم اور اس کی والدہ زہرہ خانم سے جھگڑا ہوا گیا ہے۔ اب وہ روبی کو اپنے ساتھ ہی لے آئی ہے۔ اس کے بعد چشمہ بانی نے سوچا وہ روبی سے مل لے کہ وہ مہمان ہے۔ یہاں ہو کہ بعد میں نسیم خفا ہو کہ آپ روبی سے ملنے کیوں نہیں آئیں؟ نسیم کے بیڈروم میں تو وہ جا ہی نہ سکتی تھیں۔ اس لئے اس کو لان میں بیٹھ دیکھا تو فوراً یہاں ملنے چلی آئی تھیں۔ نسیم کی والدہ اٹھ کر گئیں تو روبی تب تک ان کی جانب دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئیں۔

”یوں کیا دیکھ رہی ہو؟“ نسیم نے روبی کی نگاہوں کو مسلسل اپنی ماں کی تعاقب میں دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔“ روبی نے اپنی حیرت کو ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ مگر نسیم شاید سب کچھ سمجھ رہی تھی کیونکہ وہ روبی کو دیکھتے ہوئے مسلسل مسکراتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

روجی میکے آئی تو بہت خوش تھی۔ وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اور ایک بے حد عملی زندگی گزار رہی تھی۔ عامر بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ پھر اللہ نے پہلے بیٹے سے نوازا تو بعد میں بیٹی عطا کر دی۔ یہ دونوں بچے عامر کی جان تھے۔ وہ ان کی ایک دن کی دوری بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ جب روجی نے میکے جانا ہوتا تھا تو عامر صبح آفس جاتے ہوئے ان کو چھوڑ جاتا پھر شام آفس سے واپس سیدھے سرراٹ آتے رات کا کھانا وہاں سب گھر والوں کے ساتھ مل کر کھاتے کھانے کے بعد گڈو کے ہاتھ کی مزیدار کافی پیتے اور پھر روجی اور دونوں بچوں کو ساتھ لیکر اپنے گھر واپس آ جاتے۔ آج جب عامر روجی اور بچوں کو چھوڑ کر گیا تو روجی بہت خوش تھی۔ مسکراتی ہوئی گھر کا انداز آئی تو شمشاد پوتا کوڈ میں لے کر بیٹھی تھی۔ گڈو یکن میں ناشتے کے بعد برتن صاف کرنے میں مصروف تھی۔ جبکہ نصیر صاحب اور سلمان اپنے اپنے آفس جا چکے تھے۔ روبی بھی کالج جا چکی تھی۔ شمشاد روجی اور بچوں کو دیکھتے ہی خوش ہو گئی اور کہا۔

”اے! ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا اور تم چلی آئیں۔“ پھر یکن کی جانب منہ کر کے بولیں۔

”ارے گڈو دیکھو تو روجی آئی ہے۔“ گڈو جلدی سے ہاتھ صاف کرتی یکن سے باہر نکلی۔ روجی کا بیٹا تین برس کا تھا۔ اور وہاں کے آگے آگے ہاتھوں میں چھوٹے پکڑے چلا آ رہا تھا۔ بیٹی کو کوڈو برس کی تھی وہ بھی چلتی تھی مگر روجی نے اس کو کوڈ میں اٹھا رکھا تھا۔ گڈو نے آگے بڑھ کر بیٹے کو اٹھایا تو اس نے جلدی سے سلام کیا۔ گڈو نے جواب دیتے ہوئے اس کو یہاں کرتے ہوئے روجی کو پوچھا۔

”عامر اندر نہیں آئے؟“ کبھی کبھار وہ اندر ایک دو منٹ کیلئے بھی آ جاتا تھا۔

”نہیں باہر ہی سے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ رات کو آئیں گے اور کھانا یہیں کھائیں گے۔“ روجی نے جواب دیا۔ پھر ماں کو سلام کرتے ہوئے بولی۔



”امی جان آپ کیلئے ایک خوشخبری لے کر آئی ہوں۔ سنیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔“

”کیا روپی مر گئی۔۔۔؟“ انہوں نے پوتے کو جھولے میں ڈالنے کے بعد کہا۔ ”میرے لئے تو خوشی کی خبر یہی ہو سکتی ہے کہ سارے شہر میں ہماری رسوائی کا ہتھام کرنے والی مر جائے۔ اس کی وجہ سے تو ہم نے اخبار لیا ہی بند کر دیا ہے۔ ایک صفحہ تو اس کی فلموں کا شہدات سے بھر ہوتا ہے۔ اس پر ہر ہفتے فلمی صفحے پر اس کے بارے میں کوئی نئی چٹ پٹی خبر۔ سلمان کا تو خون کھولنے لگ جاتا تھا یہ سب پڑھ کر تنگ آ کر اخبار ہی بند کر دیا۔“ شمشاد نے نوای کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

”امی خبر تو موت ہی کی ہے مگر روپی کی نہیں کرن کی موت کی۔“ یہ دیکھیں روجی نے اخبار کھل کر ان کے سامنے کی اور مزید بتایا کرن کو اس کے بھائی پومی نے قتل کر دیا ہے۔

”اچھا ہوا۔ بہت اچھا ہوا۔ تھی تو چندال۔ کیسے میرے ہی گھر میں میرے سامنے زبان چلا کر گئی تھی۔ پر ہوا کیا۔“ حمیدہ نے نوای کو گھسی گود میں بٹھا کر یار کرتے ہوئے پوچھا۔

”امی! ارم اور اس کی امی روپی کی شادی پومی سے کرنا چاہتی تھیں۔ مگر کرن نے روپی کو گھر سے بھگا کر ان کی امید پر پانی پھیر دیا۔ وہ بہر حال روپی کی دوست تھی۔ پہلے تو پومی کو پتہ ہی نہ چلا اور جب بتا چلا تو اس نے یونیورسٹی ہاسٹل جا کر اس کو شوٹ کر دیا۔“ روجی نے مزید تفصیلات بتائیں۔

”اچھا اور اب خود کہاں ہے؟ اگر کرن کو بھگانے کے جرم میں قتل کیا ہے تو بھاگنے والی کو گھسی پکڑ کر ختم کر دیتا۔“ حمیدہ نے کہا۔

”امی! ارم نے پومی کے ساتھ ساتھ اس کے باپ کو گھسی قتل میں ملوث کر کے پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ خود اپنی ماں کو ساتھ لے کر لاہور چھوڑ کر راجی چلی گئی ہے۔“ روجی نے صبح کی پڑھی ہوئی خبر ان کو زبانی سنادی۔ ”اور روپی؟“ شمشاد نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھا۔

”وہ ارم وغیرہ کو چھوڑنے کے بعد آج کل اداکارہ نسیم کے گھر رہ رہی ہے۔ اور امی آپ کو بتا ہے نسیم طوائف ہے۔“ روجی نے ہمیشہ کی طرح یہ بات کر کے ان کو مزید روپی سے متنفر کرنا چاہا۔

”ارے میں کہتی ہوں نسیم طوائف ہے تو روپی کون سی شریف رہ گئی ہوگی نسیم تو پھر طوائف ہے اور یہ شریف خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی گندی کرتوتوں سے طوائف بن کے مردوں کے ساتھ ننگیازوں کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے۔ ہمیشہ اخبار میں جو تصویر آتی تھی بغیر بازو والی میض پہنی ہوتی تھی۔ اور پھر ناچتی ہوئی کی تصویریں آتی ہیں۔ میں تو کہتی ہوں اللہ کرے کوئی اس کو گھسی قتل کر دے۔“ شمشاد نے نفرت سے کہا تو روجی نے کہا۔

”اس کو کون قتل کرے گا؟ دغا بازی گارڈ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ آزر سے شادی کرنے والی ہے۔ یہ سارا فساد آزر کے ساتھ شادی کا فیصلہ کرنے پر ہی تو ہوا ہے۔“

”اور یہ آزر کون ہے؟“ حمیدہ نے پوچھا۔

”امی بڑا مشہور فلمی اداکار ہے۔ آپ کو یہ بھی نہیں بتا۔“ روجی نے جلدی سے کہا۔ آزر اس کا پسندیدہ اداکار تھا۔

”دفع کرو۔“ حمیدہ نے اخبار گڈو کو کھماتے ہوئے کہا۔ گڈو نے کرن کی تصویر دیکھنے کے بعد روجی کوئی ارم اور زہرہ خانم کی تصویر دیکھی پھر روجی سے پوچھا۔

”دوپہر کے کھانے میں کی پسند کرو گی روجی!“

”جو جی میں آتا ہے پکالو۔ مگر رات کو مٹن کڑائی بنانا۔ عامر نے رات کا کھانا ادھر ہی کھانا ہے۔“ روجی نے کہا۔ پھر چونک کر بولی۔

”بچے پلاؤ کھائیں گے۔ پلاؤ ضرور بنانا۔“ گڈو اس کی بات سن کر واپس کچن میں چلی گئی تھی اور روجی ماں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔

ارم نے کرن کے ساتویں کا ختم روپی کی گھسی میں کیا تھا۔ پھر اگلے روز وہ صرف روپی کی گھسی ہی نہیں۔ لاہور کو بھی چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے ماں کو ساتھ لے کر راجی چلی گئی تھی۔ کوکہ وہ ایک ڈرامہ سیریل میں ان دنوں کام کر رہی تھی۔ جس میں اس کا تھوڑا کام باقی تھا۔ ارم نے کہہ دیا تھا وہ یہ کام پھر آ کر مکمل کر دیا جائے گی۔ کرن کو پومی نے قتل کیا تھا اور اب اس کے قتل میں ارم نے ان دونوں باپ بیٹے کو پولیس کے ہاتھوں پکڑوا کر ہمیشہ کیلئے ان دونوں سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اب صرف ماں بھی جس کو ساتھ لے کر وہ راجی چلی آئی تھی۔

ان حالات میں ماں اس کا سہارا بھی تو وہاں کا۔ دونوں ایک دوسرے کی وجہ سے زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ زہرہ خانم کے پاس چوائس یا کوئی اور آپشن تھا ہی نہیں ارم کے سوا۔ اس لئے وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ تاہم آنے سے پہلے انہوں نے روتے ہوئے ارم کی منت کی تھی کہ وہ صرف ایک بار جانے سے پہلے پومی سے ملاقات کر دے۔ زندگی کا کیا بھروسہ؟ کیا خبر بھی دوبارہ پھر اس شہر میں آنا نصیب ہوگا بھی یا نہیں۔ مگر ارم نے سخت نفرت سے ان کی پومی کے ساتھ جیل میں آخری ملاقات کی خواہش کو



مستر دکر دیا تھا۔ اور شدید نفرت سے کہا تھا۔

”میں ان بے غیرت باپ بیٹے کی اب شکل دیکھنا تو دور کی بات ان کے بارے سوچنا بھی کوارہ نہیں کرتی۔ اور آپ ملاقات کا کہہ رہی ہیں۔ یاد رکھیں میں ان کی بات سننا بھی پسند نہیں کرتی۔ ذلیل بے غیرت احسان فراموش۔ آپ نے اگر ان سے تعلق رکھنا ہے تو پھر اچھی طرح سوچ لیں میں اکیلی کراچی چلی جاتی ہوں۔ آپ یہاں رہ کر صرف ملاقاتیں کرتی رہیں بلکہ پیسے بھی کافی آپ کے پاس ہیں۔ جن کو دے ملا کر ان کی رہائی کیلئے بھی کوشش کر لیں۔“ یہ سب سننے کے بعد زہرہ خانم نے خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی۔ مگر ان کا دل ٹپ رہا تھا پوی کو دیکھنے کیلئے۔ رضوی کی اب ان کو پروانا بھی۔ مگر پوی بیٹا تھا۔ مگر صبر کا گھونٹ پی کر چپ چاپ پارم کے ساتھ کراچی چلی آئیں تھیں۔

☆☆☆☆

ایک ہفتے سے روبی نسیم کے گھر مقیم تھی۔ نسیم خود سٹوڈیو جا رہی تھی اور یہی روبی کو جانے دیا تھا۔ روبی نے کہا بھی تھا۔

”اب تم کو کس بات کا خوف ہے۔ وہ دونوں ماں بیٹی تم سے ڈر کر چلی گئی تھیں۔ ورنہ مارا پی تو کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔ مجھے تو حیرت ہے وہ تم سے ڈر کیسے گئیں۔“

”بس دیکھ لو پھر میری طاقت کو۔“ نسیم مسکرائی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں ابھی ساری بات نہیں بتا سکتی لیکن جب تک وہ دونوں کوٹھی خالی نہیں کرتیں تب تک ہم سٹوڈیو نہیں جائیں گے۔“ تب روبی خاموش ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر نسیم نے پوچھا۔

”یہاں سارا وقت روم میں بند رہنے سے اکثر پریت محسوس کرنے لگی ہو تو میں نے تم کو کہا بھی تھا گھر والوں کے پاس نہیں مگر باہر لان میں جب چاہو واک کیلئے جاسکتی ہو۔ میں نے سب گھر والوں کو کہہ دیا ہے کہ جب تک تم یہاں ہو تب تک ان میں سے لان میں کوئی بھی نہیں جائے گا۔“

”اپنی امی کو بھی منع کر دیا۔“ روبی نے بے ساختہ پوچھا۔

”نہیں ان کو منع نہیں کیا۔ مگر وہ خود ہی لان میں کم کم آتی ہیں۔ رہائشی حصے میں ہی کافی کام ہوتے ہیں ان کے کرنے کیلئے۔“ نسیم نے ذومعنی انداز میں مسکرا کر کہا۔

”امی کیا کام کرتی ہیں۔ وہ تو بوڑھی ہیں۔“

”اپنی دو بوتلیوں نازبہ اور نادیہ کو آسمان کی ایک ٹاکی اتارنے دوسری لگانے کے آسمان سے تارے توڑ کے لانے کے طریقے سکھاتی ہیں اور کیا کرتی ہیں۔“ نسیم نے ہنستے ہوئے کہا

تو روبی نے کچھ تھاہو کر نسیم سے کہا۔

”کیسی خراب بات کر رہی ہو۔ تمہاری امی کو دیکھ کر تو یہ بتائی نہیں چلتا کہ وہ تمہاری امی ہیں۔“

”مطلب۔۔۔۔۔؟“

مطلب روبی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی بات نسیم کو کیسے سمجھائے مگر نسیم اس کی بات سمجھ چکی تھی۔ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولی۔

”میری والدہ تم کو بہت سیدھی ساوی محسوس ہوتی ہوں گی۔“ روبی نے اثبات میں سر ہلایا تو نسیم نے روبی کو بغور دیکھتے ہوئے پھر سنجیدگی سے کہا۔

”طوائف کی ماں طوائف سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتی ہے۔ جسے تو بیٹی کی کمائی کھاتی ہے۔ میری ماں کتنی تیز عورت ہے تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ نتھارتوانی کی رسم سب کی ایک بار

ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے طوائف جوان ہو گئی ہے۔ اور میری نتھارتوانی کی رسم میری ماں کی چالاکی اور ہوشیاری کی وجہ سے دوبار ہوتی ہے۔ پھر میری ماں سارے خاندان کو فخر سے اپنی

عقل مندی اور اس بڑھئی کی بے وقوفی کے قصے سناتی رہی ہے۔ کیسے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ اب تک سناتی ہیں اور پھر خوب ہنستی ہیں۔ جانتی ہو ہماری ہیرامنڈی میں جب کسی کے

ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اسے گھٹی چشمہ بانی سے ملائی جائے تاکہ بڑی ہو کر وہ بھی چالاکی ہوشیاری عیاری مکاری میں چشمہ بن سکے۔ ایک ایسی رسم جو ایک بار ہی ہوتی

ہے دوبار کردانی اور میری دونوں بھتیجیاں ابھی سے اپنی دادی کی کاپی ہیں۔“ روبی یہ سب سن کر خاموش ہی رہی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ کیا بولے۔ اور اس کو خاموش دیکھ کر نسیم نے

ہی پھر کہا۔

”تب میں بھی یہ سارے قصے سن کر نا صرف ہنستی تھی۔ بلکہ خوش ہوتی تھی۔ لیکن پھر یہ سب میرے اندر سے ختم ہو گیا۔“ نسیم خاموش ہو گئی پھر طویل سانس لے کر بولی۔

”تمہاری عقل میں اضافے کیلئے یہ باتیں میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ میری ماں کا نام چشمہ ہے اور کہتے ہیں چشمہ نام کی عورتیں بڑی خطرناک تیز ہوشیار اور بتا نہیں کیا کیا ہوتی



ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بات سچ نا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے چشمہ نام کی ساری عورتیں ایسی خوبیوں کی مالک نہ ہوں۔ مگر میرا مشاہدہ بھی ہے اور ماں کی شکل میں تجربہ بھی۔ میں اپنی زندگی میں جتنی بھی چشمہ نامی عورتوں سے ملی ہوں ان کو ہمدردی کی بد معاش و خطرناک پایا ہے۔ جس بازار کی میں رہنے والی ہوں اس کے علاوہ بھی میں نے اگر کسی چشمہ کو دیکھا ہے تو کانوں کو ہاتھ لگایا ہے کہ میں نے بازار والوں سے بڑھ کر اسے خطرناک اور بد معاش و آوارہ پایا ہے۔

ہاں ایسی عورتوں کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ چہرے سے بظاہر بڑی شریف نظر آتی ہیں اور اندر سے اتنی ہی بد معاش ہوتی ہیں۔ میں نے ایک چشمہ دیکھی ہے۔ موقع ملے تو طوائف کو بھی سچ کرکھا جائے۔ بد معاشی اور کم کاری میں میں نے اس کو طوائف سے بھی جا رہا تھا۔ گے نہیں سو ہاتھ آگے پایا ہے۔ بظاہر سب کے سامنے شریف۔ آپ کسی کے سامنے اس کے خلاف بات کریں تو لوگ آپ سے باقاعدہ جھگڑنے لگیں گے کہ وہ شریف ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ہر بات جھوٹی کرتی ہے۔ مگر خوبی اس سے کرتی ہے کہ لوگ اس کو سچی اور سچے کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ چشمہ نام کی عورتوں کے سائے سے بھی سچ کر چلو۔“

”تمہیں اپنی امی سے نفرت ہے؟“ نسیم کی ساری باتیں سننے کے بعد روبی نے پوچھا۔  
”میں کسی سے نفرت نہیں کرتی۔ مگر محبت بھی نہیں کرتی۔ یہ بات کہتے ہوئے منجانے نسیم کے لہجے میں کیا تھا۔ چہرہ البتہ سہاٹ تھا۔  
”اپنے بیٹے سے بھی محبت نہیں کرتی ہو۔“ روبی نے پوچھا۔  
یہ سننے ہی نسیم ہول پڑی۔

”میرا بیٹا میری جان ہے۔ بس میں اپنے بیٹے ہی سے اس دنیا میں محبت کرتی ہوں۔ صرف اپنے بیٹے سے سنا پنے نوا ہے۔“  
”اور میں مجھے مجھارم وغیرہ سے بچا کر یہاں لائی ہو تو مجھ سے بھی محبت ہو گئی ہوگی۔“ روبی نے ہنستے ہوئے شرارت سے کہا۔  
”روبی یہ کیا کہہ دیا تم نے؟“ نسیم نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چند لمحوں اس کو دیکھتی رہی۔ پھر کہا۔

”میں سب سے زیادہ محبت اپنے بیٹے سے کرتی ہوں۔ وہ میرے زندہ رہنے کا جواز ہے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں یا نہیں اس بات کو چھوڑ کر صرف یہ سوچو مجھے تمہارا خیال تھا تو میں ان لوگوں سے لڑ جھگڑ کر تمہیں یہاں لائی ہوں۔ میرا خیال ہے خیال رکھنا محبت سے زیادہ اہم ہے اور میرا تم سے یہ وعدہ ہے۔ بے شک میں چشمہ بانی کی بیٹی ہوں۔ طوائف بھی ہوں مگر اب ہمیشہ تمہارا خیال رکھوں گی۔ تمہیں جب کوئی بھی جھوٹی مولی بات پریشان کرے مجھ سے کہہ سکتی ہو۔“

”ارے ارے میں تو مذاق کر رہی تھی اور آپ سنجیدہ ہو گئیں۔ مگر ایک بات بتائیں آپ اپنی امی سے خفا لگتی ہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نا۔“ روبی نے سنجیدگی سے پوچھا۔  
”ہاں ہوں۔ حالانکہ ہونا تو نہیں چاہئے کہ میں شریف خاندان میں نہیں کوٹھے پر پیدا ہوئی اور ماں نے میرے ساتھ وہی کیا جو ہر کوٹھے پر رہنے والی ماں اپنی بیٹی کے ساتھ کرتی ہے۔ مگر سچ میں ایک آدھ ماں نہیں بھی کرتی وہ سب جو کوٹھے پر رہنے والی مائیں کرتی ہیں۔ دراصل میرا بیٹا نومی سندھ کا ایک بہت بڑے ڈیرے کا تحفہ ہے۔ وہ نہ تھا اتروائی کے بعد باقاعدہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ عمر میں مجھ سے بیس برس ہی بڑا تھا مگر ماں نے اپنی باقی خاندان کے ماننے کا تو سول ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

نانی کو اپنی فکر تھی۔ ماموں کو اپنی بھائیوں اور باپ کو اپنی۔ لیکن ماں سب کو چاہتی تو راضی کر ہی سکتی تھی کہ وہ ایک بڑی مولی رقم ہاں کو دینے کیلئے تیار تھا۔ میرے ساتھ شادی کرنے کیلئے۔ مگر ماں نہ مانی اور وہ اتنی لالچی ہیں کہ جو رسم ایک بار ہی ہوتی ہے۔ اس کو بھی اپنی ہوشیاری سے دہار کیا۔ تب مجھے بھی شادی کی پروا نہ تھی۔ اب یہ میرا بیٹا اپنے باپ کے پاس ہوتا تو اس کی جو حیثیت ہوتی وہ یہاں ساری زندگی نہیں بن سکتی۔ میں نومی کا خاندان کے بچوں کے ساتھ بات کرنا کھیلتا بھی پسند نہیں کرتی۔ وہاں بیٹھ کر اس نے چشمہ بانی اپنی نانی کی باتیں لازمی سننی ہیں۔ بہن کی کمائی تمام عمر کیسے کھائی جاسکتی ہے۔ بیٹی بہن کو لمبے عرصے تک کنٹرول میں کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ بہت ساری مزید ایسی باتوں سے بچانے کیلئے میں نے اپنے بیٹے کو خاندان کے ہاں ہی جھسے میں جانے سے روک رکھا ہے۔ یہ جو میری ملازمہ ہے یہ ایک شریف خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ میری غیر موجودگی میں میرے بیٹے کے پاس صرف اسی کو میرے روم میں رہنا ہوتا ہے۔

نانی سے بھی میں اپنے بیٹے کو ملنے نہیں دیتی۔ اس لئے تو کہتی ہوں میں جلد ہی اس کو پڑھنے کیلئے باہر بھیج دوں گی اور کہہ دوں گی۔ اگر عزت کی زندگی چاہتے ہو تو پھر ہمیشہ کیلئے ادھر ہی رہ جاؤ۔ آخر تو اس کو بچا چلنا ہی ہے کہ وہ طوائف کا بیٹا ہے اور اداکارہ کا بھی۔“ نسیم چپ ہوئی تو پھر روبی بھی کچھ نہیں بولی تھی۔ کمرے میں ہر جانب گہری داسی پھیل رہی تھی۔ یہ بھی



ایک طوائف کی کہانی جو دنیا کے سامنے طوائف تھی اور اندر سے ہزاروں شریف ذالیوں سے زیادہ اچھی نیک۔ مگر اس کے باوجود وہ طوائف ہی کہلائے گی۔

روبی کا یہ ایک ہفتہ نسیم کے ہاں اچھا ہی گزرا تھا۔ خاص کر نسیم کے بیٹے کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ بہت فیری ہو گیا تھا۔ بہت گھل مل کر رہتا تھا۔ روبی کو بچے اچھے لگتے تھے مگر وہ حرامی بچہ پیدا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی آزر سے فون پر بات ہوئی تھی۔ روبی نے آزر سے نسیم کے کہنے کے مطابق کہہ دیا تھا کہ نہ تو اس کے پاس کوئی کیش ہے اور نہ ہی یہ گھر جس میں وہ رہتی ہے۔ یہ کوئی زہرہ خانم کے نام ہے اور یہ بھی کہ وہ شادی کے بعد فلموں میں کام نہیں کرے گی۔ ایک بار پھر بتا دو کیا واقعی تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ آزر اس کی بات سن کر چند لمحے خاموش رہا پھر کہا۔

”یار! میں شادی تم سے گھر آباد کرنے کیلئے کر رہا ہوں کوئی اپنے نام کروانے یا فلموں میں کام کروانے کیلئے نہیں۔ تمہیں ابھی تک میری محبت پر شک کیوں ہے؟ آئی لو یو۔ آئی لو یو۔“ پھر وہ کتنی دیر باتیں کرتا رہا۔ روبی روتے ہوئے سنتی رہی۔ یعنی اس دنیا میں کوئی مرد تو ایسا تھا جو اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بغیر کسی لالچ کے نہ صرف اس سے محبت کرتا تھا بلکہ شادی کر کے عزت بھی دینا چاہتا تھا۔ عورت کیلئے مرد کی محبت بہت ضروری ہے۔ اگر سچی ہو۔ بہر حال آزر سے بات کرنے کے بعد اس نے نسیم کو ساری بات بتا دی تھی۔ نسیم اس کی بات سن کر بہت خوش ہوئی اور کہا تھا تم کو بار بار سے دوہن دینا کہ اپنے ہاتھوں آزر کے ساتھ رخصت کروں گی۔ اللہ کرے تم ہمیشہ خوش رہو۔ میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔ بے شک نسیم کی دعائیں روبی کے ساتھ تھیں۔ مگر ماں کی بددعائیں بھی تو روبی کے تعاقب میں تھیں۔ آدی جو دیتا ہے آدی جو لیتا ہے۔ زندگی بھر وہ دعائیں اور بددعائیں انسان کا پیچھا کرتی ہیں فوراً بددعائیں نا بھی اڑ کریں مگر زندگی کے کسی ناکی موڑ پر آپ اس بددعا کی زد میں ضرور آتے ہیں۔ بھی نہ بھی وہ بددعا آپ کو ضرور پکڑتی ہیں اور شمشاد کو سارا وقت ہی روبی کیلئے بددعائیں کرتی تھیں پھر وہ خوش کیسے رہ سکتی تھی۔

ارم نے کوئی خالی کرنے کی اطلاع خود نسیم کو نہیں دی تھی۔ مگر جاتے ہوئے چوکیدار کو ہدایت کا رنیا ز کا نمبر دینے کے بعد کہہ گئی تھی کہ اس نمبر پر فون کر کے پیغام دے دو کہ کوئی خالی کر دی گئی ہے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اب ارم کو نہ تو روبی پر غصہ باقی رہا تھا نہ ہی کوئی شکوہ۔ صرف یہ سوچ کر کہ وہ کرن کی فرینڈ بھی اور جب کرن نے حق دوستی نہا ہے ہوئے اپنی جان دے دی ہے تو پھر اب خود اس کو بھی روبی پر غصہ ہونے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں اس کو یہ حیرت ضرور تھی کہ اخبار میں یہ خبر پڑھنے کے باوجود کہ کرن کی جان محض اس کی وجہ سے گئی تھی۔ وہ اپنی ہی کوئی میں نہ تو کرن کا چہرہ آخری بار دیکھنے آئی تھی اور نہ ہی ارم زہرہ سے افسوس کرنے۔ پھر اس نے سوچا یقیناً نسیم نے اس کو نہیں آنے دیا ہوگا۔ نسیم کو نہ صرف سٹوڈیو سے کوئی خالی ہونے کی اطلاع مل گئی تھی۔ بلکہ ساتھ ہی یہ بھی بتا چل گیا تھا کہ ارم اپنی والدہ کو ساتھ لے کر مستقل کراچی چلی گئی ہے۔ یہ سب سنتے ہی اس نے شوٹنگ پر جانے کا فیصلہ کر لیا کہ ڈائریکٹر بھی فون پر فون کرنا جا رہا تھا۔ اب مسئلہ کرن کی موت کا تھا۔ روبی کو کیسے بتایا جائے؟ یہاں گھر پر ہی بتا دیا جائے یا سٹوڈیو جا کر؟ پھر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ سٹوڈیو جا کر ہی بتایا جائے۔ زیادہ لوگ ہونے کی وجہ سے ضبط کر لے گی۔ ورنہ یہاں تو روم میں رو کر اپنا حشر کر لے گی۔ بہر حال کرن حق دوستی ادا کرتے ہوئے ہی قتل ہوئی تھی تاہم کوئی خالی ہونے کے بارے میں اس نے بتا دیا تھا۔ مگر ساتھ ہی نہیں بتایا تھا کہ ارم لاہور ہمیشہ کیلئے چھوڑ گئی ہیں۔

صبح نوی کے سکول جانے سے پہلے ہی روبی نے اس کو بتا دیا تھا کہ وہ آج چلی جائے گی۔ نوی نے اس کی بات سن کر بڑوں والی متانت کے ساتھ کہا تھا۔

”اُس اوکے! چلی جائیں مگر کبھی گھار ملنے آ جایا کیجئے گا۔“ اور روبی کو اللہ حافظ کہہ کر سکول چلا گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں بھی تیاں ہو کر سٹوڈیو آ گئی تھیں۔ راستے میں روبی کرن کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ اگر وہ ساری باتیں سن کر اس کو گھر سے جانے کا مشورہ نہ دیتی تو اب تک وہ پوی کی بیوی بن چکی ہوتی۔ ارم آپ کی سامنے انکار کرنے کی جرأت کر ہی نا سکتی تھی۔ وہ سٹوڈیو آئی تو معلوم ہوا آزر بھی آچکا ہے۔ سٹوڈیو میں ہے۔ ڈائریکٹر کے روم میں بیٹھا ہے۔ روبی کا دل دھڑکا اٹھا۔ اس نے نسیم سے پوچھا۔

”میں ذرا آزر کو مل آؤں وہ بھی آیا ہوا ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ نسیم نے کہا اور روبی دھک دھک کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے ڈائریکٹر کے روم کی جانب چل دی۔ دروازے پر پہنچ کر جیسے اس کے قدم جم ہی گئے تھے اندر شاید ڈائریکٹر آزر سے پوچھ رہا تھا۔

”سنا ہے تم روبی سے شادی کر رہے ہو۔“

”پر وگرام تو یہی تھا مگر اب بدل دیا ہے۔“ وہاں پر دانی سے کہہ رہا تھا۔



”کیوں اب کیوں بدل لیا؟“ ڈائریکٹر نے پوچھا تو آزر بولا۔ ”میں سمجھا تھا تین کروڑ کی جس کو بھی میں رہتی ہے وہ اس کے نام ہے اور تین برس چودھری نواز نے اس کو رکھا ہے تو بینک بزنس بھی اچھا خاصا ہوگا۔ پھر میری اس کی جوڑی بھی خوب مقبول ہے۔ عیش ہی عیش ہیں مگر ایک ہفتہ پہلے اس نے مجھے بتا دیا۔ یہ کو بھی جس میں وہ رہتی ہے وہ اس کی والدہ کے نام ہے۔ کیش بھی کوئی نہیں اور شادی کے بعد وہ فلموں میں کام بھی بالکل نہیں کرے گی۔ اس کے بعد روپی سے شادی کر کے میں نے اس کا اچاڑا لیا ہے۔ میں اس کو کھانا چاہتا تھا اور وہ گھر بیٹھ کر مجھے کھانا چاہتی ہے۔ اگر خود ہی کھا کر کھانا ہے تو پھر ایک آوارہ دار سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ گھر والے پہلے ہی میری بات فیصل آباد کے ایک ریکس خاندان میں طے کر رہے تھے۔ اگر خود کھا کر کھانا ہے تو پھر بیوی تو شریف ہو خاندانی ہو اور پھر جہیز بھی وہ ٹھیک ٹھاک لارہی ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے۔ باپ کی تمام جائیدادوں کی اکلوتی وارث۔ میں نے شادی کیلئے گھر والوں کا اپنی رضامندی دے دی ہے۔“ اس کے بعد وہ مزید روپی کے بارے میں بکواس کرنے لگا تو روپی واپس جانے کوڑی تو سامنے جس فلم کی اس وقت وہ شوٹنگ کرنے آئی تھی اس کا لون کھڑا تھا۔ روپی کو دیکھتے ہی بولا۔

”بہت زیادہ فسوس ہوا مجھے آپ کی دوست کرن کی موت کا سن کر۔ وہ اکثر آپ کے ساتھ سٹوڈیو آتی رہتی تھی۔“ روپی نے بہت حیران ہو کر اس کی بات سنی پھر پوچھا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ کرن مر گئی۔“ روپی تو ابھی آزر والے شک سے ہی سنبھلنا پائی تھی اور وہ دوسرا لگا رہا تھا۔

”کمال ہے آپ کی وجہ سے وہ قتل ہوئی ہے اور آپ اس کی موت سے بے خبر ہیں۔ ساری کہانی تو اخبار میں چھپ چکی ہے۔ آپ نے نہیں پڑھی۔ کہاں تھیں آپ ایک ہفتے سے۔“

روپی اس کو کوئی بھی جواب دیے بغیر دوڑتی ہوئی نسیم کی جانب آئی۔ اب سمجھ آ رہی تھی نسیم نے بغیر کوئی وجہ بتائے اس کو اپنے گھر کیوں رکھا؟ کیوں وہ ایک ہفتہ شوٹنگ پر نہ خود آئی تھی تاہی اس کو آنے دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کرن میری وجہ سے قتل ہوئی۔ کرن میری وجہ سے کیوں قتل کی گئی؟ وہ یہی سوچتی نسیم کے پاس پہنچی۔ جب کرن کے قتل کے بارے میں پوچھا تو نسیم نے اب کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ یہ بھی کہ ارم ماں کے ساتھ لاہور چھوڑ کر اب کراچی چلی گئی ہے۔ یہ سارے انکشافات ایسے تھے جن کو سننے کے بعد روپی کا مزید اپنے قدموں پر کھڑا رہنا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ چکرائی اور قتل اس کے کہ کوئی اس کو سنبھالنا وہ زمین پر گر کر دنیا جہان سے بے خبر ہو چکی تھی۔

نسیم پاس حیران و ششدر گھڑی تھی۔ وہ کرن کی موت کا اتنا زیادہ اثر لے گی۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ کرن کی موت سے پہلے اس نے محبت کے نام پر ایک اور صدمے کا ذائقہ پھر سے چکھا تھا۔ کئی برسوں بعد آج پھر کسی نے اس کو آوارہ کہہ کر بلال کی یاد دلادی تھی۔

☆☆☆☆

روپی اپنے بیڈ پر خاموش لیٹی تھی۔ طبیعت کو کہ پہلے سے کافی بہتر تھی۔ مگر ابھی پوری طرح بہتر نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہی دن میں ایک ہی پل میں اس کو وہ بہت بڑے صدمات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس نے آزر سے محبت نہیں کی تھی کہ بلال کے بعد وہ کسی اور سے محبت کر ہی نہ سکتی تھی۔ ہاں مگر اس گندگی سے ہمیشہ کیلئے نکلنے کیلئے اور باقی کی زندگی عزت سے گزارنے کیلئے اس نے آزر کی اس محبت پر یقین کر لیا تھا۔ اس کی طرف سے شادی کی پیشکش قبول کر لی تھی۔

نسیم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ فلم لائن میں کوئی کسی سے سنجیدہ محبت نہیں کرتا۔ لوگ اپنے مطلب اور مفاد کا خیال کرتے ہیں۔ کتنے لمبے عرصے بعد لفظ آوارہ کسی نے پھر اس کے لئے استعمال کیا تھا۔ اب روپی کا خون کھول رہا تھا۔ بلال اس کا محبوب تھا۔ اس لئے وہ کچھنا کر سکتی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ چھوٹی تھی اور بلال سے محبت بھی کرتی تھی۔ مگر یہ آزر اس کی حیثیت ہی کیا تھی کہ وہ روپی کو آوارہ کہتا۔ اس لئے روپی نے اس کو اس جرم کی سخت تر سزا دینے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔

آندرہ آزر کے ساتھ کسی فلم میں کام نہیں کرے گی۔ صرف پہلے والی فلموں کا کام مکمل کروائے گی کہ یہ مجبوری تھی۔ دو ہفتے پہلے اس نے آزر کے ساتھ جو نئی فلمیں سائن کی تھیں ان کے معاملہ بے بھی کینسل کر دیے گئے یا پھر ڈائریکٹر سے کہے گئے کہ یہ فلم کا ہیرو بدل لے گا مگر مجھ سے کام کروانا ہے۔ میں اب آزر کے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتی۔ کچھتی ہوں میرے ساتھ جوڑی ٹوٹنے سے کتنے مہینے فلم انڈسٹری میں رہتا ہے۔ میرے بغیر کتنی فلمیں اس کو ملتی ہیں۔ بہت میرے بیوی تو گھر بیٹھ کر اس کی کمائی کھائے۔ فلم انڈسٹری اب میں اس کی نہ لگنے دوں گی۔

اس کے ساتھ ساتھ روپی نے اب کی بار فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی سے محبت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں آندرہ میرے پاؤں پر سر رکھ کر بھی کوئی اپنی محبت کا یقین دلانے کا تو بھی ہرگز یقین نہ کروں گی۔ شادی کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ بھی شادی نہیں کرے گی۔ ہمیشہ تنہا ہی رہے گی۔ وہ پیدا ہی شاید تنہا رہنے کیلئے ہوئی



تھی۔ مگر وہ کوا نہیں کھائے گی۔

پھر وہ کرن کے بارے میں سوچنے لگی۔ جو شخص اس کی دوستی کی بھیجٹ چڑھا دی گئی تھی اس آخری رات اس نے کہا تھا۔ ”میں تمہارے سٹوڈیو جانے تک گھر میں موجود رہوں گی تا کہ ایسی ویسی بات ہونے کی صورت میں تمہاری مدد کر سکوں۔ یعنی اگر وہ تمہیں گھر کے اندر روکنے کی کوشش کریں تو تم کو بچا سکوں۔ مجھے دوستی ہر رشتے سے زیادہ عزیز ہے۔ اگر تم بخیریت گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تو تمہارے جانے کے بعد میں بھی باقی سب کے اٹھنے سے پہلے ہاسٹل چلی جاؤں گی۔ اور جاتے ہوئے چوکیدار کو منع کرتی جاؤں گی کہ وہ میرے گھر آنے جانے کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔ اگر ان کو بتا چل گیا کہ تم کو گھر سے میں نے بھگایا ہے تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔“ آخر وہی ہوا تھا۔ جو کرن نے کہا تھا۔ ان کو بتا چل گیا تھا کہ روپی کو گھر سے بھگانے والی کرن تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہی روپی نے اس کو شوٹ کر دیا تھا۔ وہ دوست جس کے ساتھ وہ قارروستی نبھاتے ہوئے کرن نے اپنی جان دی تھی وہ آخری بار اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکی تھی۔ کرن کا بے جان چہرہ دیکھنے کا فسوس بھی روپی کو نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت کرن کے ساتھ اس آخری ملاقات والا ہنستا مسکراتا پر عزم چہرہ رہتا تھا۔ مگر اس کو کرن کی موت کا بے حد افسوس ہوا تھا۔ اس وقت تو وہ کرن کی موت کا سن کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ مگر ہوش آنے پر اس کو یاد کر کے جی بھر کر روئی تھی بلکہ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے بھی گئی تھی۔ محض نسیم کی وجہ سے وہ آخری بار کرن کا چہرہ نہ دیکھ سکی تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے روپی کو ایک ہفتہ تک ہر بات سے بے خبر رکھا تھا۔ لیکن روپی کو نسیم پر کوئی شکوہ نہ تھا۔ اس نے بڑی بہن کا حق ادا کرتے ہوئے اس کو دوبارہ آرام اور زبرد کے جل میں بھسنے سے بچانے کیلئے یہ سب کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں تم سے محبت کا دعویٰ نہیں کرتی۔ مگر یہ وعدہ ہے جب تک تم یا میں زندہ ہوں ہمیشہ تمہارا خیال رکھوں گی۔ یہی وجہ ہے جب وہ بے ہوش ہو کر سٹوڈیو میں گری تو اس کے ہاسٹل لے کر جانے والی نسیم تھی۔ وہ ایک بار پھر روپی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانا چاہتی تھی۔ مگر روپی ضد اور انکار کر کے اپنے گھر آ گئی تھی اور نسیم نے ان حالات میں روپی کو تنہا چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اور خود بھی ہاسٹل سے اس کے ساتھ اس کی کوٹھی چلی آئی تھی۔ پھر بعد میں اپنے بیٹے اور ملازمہ کو بھی وہیں بلا لیا تھا۔ نوئی کے آنے سے کافی حد تک روپی کا دل بہل گیا تھا۔ وہ سارا وقت نوئی کے ساتھ کھلتی رہتی تھی اور نسیم یہ سب دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔

نسیم نے زبرد خانم کے کد کھے ہوئے سارے ملازمین نکال دیئے تھے۔ حتیٰ کہ خانساں بھی چوکیدار بھی بدل دیا تھا۔ روپی کا کھانا پکانے کیلئے اس نے ایک ماں کو بلا لیا تھا۔ چوکیدار اپنی کوٹھی والا یہاں رکھوا دیا تھا اور صفائی کیلئے ہفتہ وار ایک لڑکی رکھی تھی۔ سارے روز بند کر دیئے تھے۔ ایک روپی کے پاس تھا تو اس کے ساتھ والا ماں کو دے دیا گیا تھا۔ یا پھر ڈرائنگ روم کھلا رہنے دیا تھا باقی سب لاک لگا دیئے گئے تھے اور پھر روپی کی طبیعت بہتر ہونے پر نسیم خود بھی واپس چلی گئی تھی اور جاتے ہوئے بظاہر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یار! میں طوائف ہوں۔ میں ہر کام اپنے فائدے کیلئے کرتی ہوں۔ مگر تمہاری دوستی کی وجہ سے میرا نقصان ہو رہا ہے۔ جس رات میں تمہارے ساتھ ہاسٹل رہی اس رات ملتان کی ایک شادی میں میرا مچرا طے تھا۔ میں اس میں نہ جا سکی۔ تمہارا خیال رکھنے کو اور میری جگہ دوسری خاندان کی لڑکیوں کو وہاں جا کر پر فارم کرنا پڑا تھا۔ کہتے ہیں بہت مال لے کر وہ سب واپس آئی ہیں۔ میرا تو نقصان ہو گیا۔ بس بہت ہو گئی۔ اب میں جاتی ہوں۔ اور سنو پریشان نہیں ہونا فون پر میں اور نوئی تم سے بات کرتے رہیں گے۔ مگر ملاقات اب صرف سٹوڈیو میں ہی ہوا کرے گی۔“ پھر وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی تھی۔ روپی نے یہ سوچ کر کہ جب ساری زندگی تنہا ہی اس دنیا میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر اس گھر میں تنہا کیوں نہیں رہ سکتی۔ یہی سوچ کر وہ نسیم کے ساتھ اس کے گھر جانے کی بجائے ہاسٹل سے سیدھی اپنے گھر آئی تھی۔

چند روز آرام کرنے کے بعد روپی نے باقاعدہ سٹوڈیو جانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے روز سٹوڈیو جاتے ہی روپی نے سب سے پہلے آزر کے ساتھ فلموں میں کام نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان سن کر کبھی حیران ہوئے تھے۔ روپی سے بہت سے لوگوں نے پوچھا تھا کہ وہ کیوں آزر کے ساتھ فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتی؟ کیا آزر سے جھگڑا ہو گیا ہے؟ مگر یہ جھگڑا ہوا کس بات پر ہے؟ جو آپ نے یک دم ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا ہے۔ مگر روپی نے وضاحت کرنے کی زحمت کو ادا نہ کی تھی۔ دوئی فلموں کے معاہدے بھی کینسل کر دیئے تھے۔ گو کہ روپی نے بذات خود کسی قسم کی وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ کیوں آزر کے ساتھ مزید فلموں میں کام نہیں کرے گی۔ اس کے باوجود اگلے روز فلمی صحافیوں نے خوب نمک مرچ لگا کر روپی کے اس اعلان کو چھاپ دیا تھا۔ نسیم نے ایک بار جب وہ آزر کے ساتھ بننے والے اپنے سکیڈل پر ایک فلمی صحافی کو پکڑ کر برس رہی تھی نسیم کے ساتھ ساتھ بلکہ آرام اور زبرد خانم نے بھی روپی کو سمجھلایا تھا۔ یا فلمی صحافی سے تعلقات ہمیشہ اچھے ہونے چاہئیں اورے شوبز کی دنیا میں سکیڈل بنتے ہی رہتے ہیں اور ان کا شمار کو نقصان نہیں فائدہ ہی ہوتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ درحقیقت سکیڈل شمار کو پھر شمار بنانے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔



مجھے نیز میں ان رہنے کا کوئی شوق نہیں۔ اگر میرے خلاف کسی نے لکھا تو میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔ روپی کی اس وارنگ پر اس کے بعد کم کم ہی لکھا گیا تھا۔ مگر اب آزر کے ساتھ فلمیں نہ کرنے کا اعلان سن کر صحافیوں نے سب کچھ کھل کر لکھا تھا۔

کئی برس کی محبت اور دوستی کا انجام علیحدگی پر۔ آزر نے روپی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیا تو روپی نے اس کے ساتھ مزید فلمیں کرنے سے انکار کر دیا۔ نئی فلموں کے معاملے بھی کینسل کر دیئے۔ چونکہ یہ سب کچھ سچ تھا۔ اس لئے روپی احتجاج کرنے کے بجائے خاموش ہی رہی تھی۔ وہ سچ لکھنے سے کسی کو منع نہ کر سکتی تھی۔ یہ خیر سنتے ہی کہ روپی نے میرے ساتھ مزید فلموں میں کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ آزر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ روپی اس وقت فلم انڈسٹری کی ناصرف بے حد مقبول ہیروئن تھی۔ بلکہ اب اس کو ہر فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔

آزر نے تو دل میں سوچ رکھا تھا فلموں میں اپنی جوڑی قائم رکھنے کیلئے وہ روپی سے معذرت کرتے ہوئے سو کواری شکل بنا کر کہہ دے گا کہ بہت کوشش اور منت سماجت کے باوجود گھر والے تمہارے ساتھ شادی کیلئے مانگی نہیں ہوئے۔ لہذا مجھے پوچھنے بغیر ہی میرا رشتہ اپنی پسند پر فیصلہ آباد طے کر دیا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ وہ لوگ بے شک میری شادی اپنی پسند پر طے کر دیں۔ مگر میں نے محبت تم سے کی ہے۔ تم سے ہمیشہ کنارہ ہوں گا۔ وہ یہ سب روپی کو کہنے کیلئے فون کرنے ہی والا تھا مگر اس سے قبل ہی روپی نے فوراً اس کے ساتھ فلموں میں کام نہ کرنے کا اعلان کر کے اس کو پریشان کر ڈالا تھا۔ مگر یہ سب کیوں؟ کیسے روپی نے کیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ پا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا عورت بے وقوف ہوتی ہے۔ وہ یہ سب کہہ کر روپی کو بہلا لے گا۔ مگر سب الٹا ہو گیا تھا۔ سب گڑبڑ ہو گیا۔ آخر اس نے روپی کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ رات کو خود روپی کو فون کر کے پوچھنے گا کہ یہ سب کیا ہے؟ جو اخبارات میں لکھا ہے۔ میری جان! آخر کیا سوچ کر میرے ساتھ فلمیں نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟ مجھ سے خفا ہو کچھ مجھے بھی تو بتا چلے؟ پھر رات کو آزر نے روپی کو فون کیا اور بڑی محبت سے پوچھا۔

”روپی میری جان! یہ سب کیا ہے؟ جو اخبارات میں لکھا گیا ہے۔ کیا یہ سب سچ ہے؟ تو ڈسٹر! مجھے بھی تو بتا چلے کیا سوچ کر تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیا ہے؟ بولو بتاؤ مجھے۔“

روپی کو یقین تھا آزر فون کر کے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کرے گا۔ یہی وجہ تھی وہ آزر کی بات سن کر روپی۔

”سوچ سمجھ کر نہیں تمہاری وہ بکواس سن کر کیا ہے جو تم ڈائریکٹر عماد کے کمرے میں کر رہے تھے۔ اب تم آوارہ خاندان کے غلیظ انسان! مجھے ایک برس انڈسٹری میں رہ کر دکھانا نئی فلمیں سائن کر کے دکھاؤ تمہارا دیکھو میں حشر کیا کرتی ہوں؟ دوبارہ مجھے بھی فون نہ کرنا میں تھوکتی ہوں تمہاری شکل پر۔ فلموں میں کام کرنا تو دور کی بات۔ آؤ فون بند کر دیا۔“

روپی کے آزر کے ساتھ کام نہ کرنے کے اعلان کے بعد فلم سازوں نے آزر کے ساتھ اپنی روایتی بے حسی کا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر آزر نے صلح کرنے کیلئے بہت سارے لوگوں کو منج میں ڈالا۔ مگر روپی کی نا ہاں میں نہ بدلی اور پھر روپی نے بار بار دیکھا کہ اس کو آوارہ کنام سے مخاطب کرنے والا بھکاریوں کی طرح فلم ساز اور ڈائریکٹر سے کام مانگتا پھرتا۔ مگر روپی کی وجہ سے کوئی اس کو کام دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ روپی ہر فلم کی ڈیمانڈ تھی اور وہ اب اپنی جوڑی نئے آنے والے ہیرو ذیشان سے بنا چکی تھی۔ اسی وجہ سے آزر فلم منظر سے غائب ہونا شروع ہوا اور پھر آہستہ آہستہ ہمیشہ کیلئے فلم سٹوڈیو سے آؤٹ ہو گیا۔ آزر کا انجام دیکھ کر روپی از حد خوش ہوئی تھی۔ اس کیلئے روپی نے محنت بھی بہت کی تھی کیونکہ۔

آزر کی اصل شکل دیکھنے کے بعد کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے وہ پوری سنجیدگی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ آزر کو بتانے کیلئے اپنی جوڑی منج اورٹی وی سے فلموں میں آنے والے نئے اداکار ذیشان سے بنائی تھی۔ یہ جوڑی آزر سے زیادہ مقبول ہوئی تھی۔ اس میں روپی کی پوری کوشش اور تعاون ذیشان کو حاصل تھا۔ بس یہی وجہ تھی آزر مکمل طور پر فلم لائن چھوڑ گیا تھا۔ انہی دنوں جب ذیشان اور روپی کی جوڑی بے حد مقبول اور مشہور ہو چکی تھی جب وہ دونوں ہی شہرت کے ساتویں آسمان کو چھو رہے تھے۔ ذیشان روپی پر بری طرح فریفتہ ہو گیا تھا۔ اور اندر کی بات یہ تھی کہ روپی کے ساتھ اپنی پہلی فلم کے دوران ہی روپی پر مرنا تھا کہ فلم میں آنے سے پہلے ہی روپی ذیشان کی فیورٹ اداکارہ تھی۔



پہلی فلم کے بعد جس طرح روپی ذیشان کے ساتھ جوڑی بنانے کیلئے ذیشان کو فلمیں دلانے کیلئے ڈائریکٹر کی منت کرتی تھی۔ ذیشان کیلئے سفارشات کرتی تھی۔ وہ بھی بھولنے والی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی ذیشان کے دل میں روپی کے لئے بہت عزت اور محبت تھی۔ بہت سوچنے کے بعد ایک دن موقع پا کر بجائے اظہار محبت کرنے کے سیدھے سادھے طریقے سے روپی کو شادی کی پیشکش کر ڈالی۔



روپی کو ذیشان کی پیشکش سن کر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ فلم انڈسٹری میں رہتے ہوئے وہ اب اس ماحول کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ کبھی پرانا نئے آنے والے کا استعمال کرتا تھا۔ تو کبھی نیا آنے والا پرانے کا استعمال کر کے یکدم ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونا چاہتا تھا۔ کبھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہتا ہے۔ اور کبھی بھی ناکام بھی ہو جاتا ہے۔ آزر کی طرح۔

مگر ذیشان کی روپی کے ساتھ عقیدت مصنوعی بات نہیں تھی۔ سب ہی جانتے تھے کہ وہ دل سے روپی کی عزت کرتا ہے۔ مگر اہم بات یہ تھی کہ روپی نے اب کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عمر بھر تنہا رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اب شادی کے موضوع پر بات کرنا مسننا پسند نہیں کرتی تھی۔ مگر ذیشان کی یہ پیشکش سن کر روپی نے نئی سے جواب دینے کے بجائے نرمی اور بڑے نکل سے ذیشان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو ذیشان رنگ و روشنیوں کی اس دنیا میں آئے ہوئے ابھی تمہیں بہت تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ اس لئے تم کچھ نہیں سمجھتے۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ بلکہ سمجھانا چاہتی ہوں اگر فلمی ہیر و ہر و فن اپنی اس فنی زندگی کے آغاز میں ہی شادی کر لیں تو ان دونوں کی مارکیٹ ویلیو متاثر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ شادی شدہ ہیر و کی فلم لڑکیاں ذرا کم کم ہی دیکھتی ہیں۔ مجھے تو شاید زیادہ فرق نا پڑے کہ میں اپنا مقام بنا چکی ہوں۔ مگر تم شاید پھر کبھی ان بلندیوں کو نا چھو سکو جن کو چھونے کی خواہش رکھتے ہو کہ وہ شادی شدہ ہیر و فن کی بھی مارکیٹ ویلیو کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شادی سے پہلے ہر تماشائی مرد ہیر و فن کو اپنی ہیر و فن سمجھتا ہے۔ اور شادی کے بعد وہ اپنی اہمیت کھودیتی ہے۔ تمہارے لئے میرا پر خلوص مشورہ یہی ہے کہ ابھی تم شادی کے چکر میں نا ہی پڑو تو بہتر ہے۔ فلم انڈسٹری میں اپنا ایک مقام بنا لو۔ اس کے بعد شادی کا سوچنا۔ ابھی تو ان فضول باتوں کیلئے ایک عمر پڑی ہے تمہارے پاس۔“ روپی کے نزدیک اب شادی فضول چیز ہی تھی۔ ذیشان نے بہت غور سے روپی کی یہ باتیں سنی تھیں اور برا بھی نہیں منایا تھا۔

”آئی وضاحت کے ساتھ سمجھانے کا بہت بہت شکریہ۔“ ذیشان شرمندہ سا ہو کر ہنس پڑا۔ مگر پھر فوراً ہی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”یقین کرو روپی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس لئے شادی کی پیشکش کی تھی۔“

”مگر میں محبت پر یقین نہیں رکھتی۔ اب کہ روپی نے ہلکی نا کواری سے کہا۔

”آپ سب کو آزر جیسا نا سمجھیں میں۔۔۔۔۔“ ذیشان نجائے کیا کہنا چاہتا تھا۔ مگر روپی نے اس کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

”پلیز میں آزر کا نام مسننا پسند نہیں کرتی۔ خاموش ہو جاؤ۔“ روپی نے غصے سے چلا کر کہا تو ذیشان خاموش ہو گیا۔

تاہم اس نے روپی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ وہ جانا چاہتا تھا روپی کون ہے؟ یہ تو وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ روپی فلم انڈسٹری میں اداکارہ ماڈل ارم اور اس کی والدہ زہیرہ خانم کی معرفت آئی تھی۔ اور یہ کہ روپی کا تعلق ہیرامندی سے نہیں۔ ایک شریف خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ مگر اس کے خاندان والے کون تھے؟ اور کہاں رہتے تھے؟ اس کے پیارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ تھک ہار کر ذیشان نے براہ راست جب پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے ذیشان کو دیکھتے ہوئے فقط ایک شعر سنا کر اس بار بھی بات ہمیشہ کیلئے ختم کر دی تھی۔

مت پوچھو مجھ سے میری بربادیوں کی داستان  
شاہینہ کچھ اپنا ذکر آئے گا اس فلسفے میں

شعر سن کر ذیشان نے گہری نظروں سے روپی کو دیکھا۔ پھر دکھ سے کہا۔

”روپی! تم نے خود کو لوگوں سے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ مگر خدا کیلئے مجھ سے نہ کچھ مت چھپاؤ۔ میں تو تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم کو سہارا دینا چاہتا ہوں۔ میرا یقین کرو جب بھی قادرغ ہوتا ہوں صرف تمہارے بارے میں ہی سوچتا ہوں۔ پلیز پلیز مجھے بتاؤ تم کس خاندان کی بیٹی ہو۔ یقیناً تمہارا تعلق شریف خاندان سے ہے۔“

روپی نے سکون سے ذیشان کی یہ تمام باتیں سنیں پھر مسکرا کر کہا۔

”پہلی بات تو یہ کہ دوبارہ کبھی میرے سامنے محبت کا نام نہ لینا۔ تم صرف میرے دوست ہو اور تمہارے لئے یہی بات کافی ہونی چاہئے کہ میں تم کو اپنا دوست سمجھتی ہوں۔ باقی میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی ہوں؟ اور میرا کس خاندان سے تعلق ہے؟ یہ سب بھول جاؤ میرے خاندان کے بارے میں تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ ہماری یہ دوستی بھی ختم ہو جائے گی۔ محبت پر تو خیر میں یقین نہیں رکھتی۔ تاہم مجھے تمہاری دوستی ٹوٹنے کا بہت دکھ ہوگا۔ اب تم خود ہی سوچ لو دوستی رکھنی ہے یا توڑنی ہے۔“



یہ حقیقت تھی نسیم کے بعد ذیشان کی صورت میں بھی ایک پر خلوص دوست مل گیا تھا۔ وہ روپی کی ذرا ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جاتا تھا۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران اس کا از حد خیل رکھتا تھا۔ روپی کو ذیشان کی دوستی پر فخر تھا۔ نسیم کے بعد بس وہی تھا جس کو وہ بلا جھجک ہر بات کہہ دیتی تھی۔ بتا دیتی تھی۔ مگر اپنے خاندان کے بارے میں وہ ذیشان کو بھی بتانا پسند نہیں کرتی تھی۔ ذیشان ہر حال میں اس کے خاندان کے بارے میں جانتا چاہتا تھا۔

روپی کی تنبیہ کے باوجود ذیشان نے ہمت نہ ہاری تھی۔ کو کو وہ اب روپی سے اس کے خاندان کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔ مگر کام کے ساتھ ساتھ اپنے طور پر اب بھی روپی کے خاندان کے بارے میں جاننے کی پوری کوشش جاری رکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس سلسلے میں کامیابی حاصل نہ کر سکا تھا۔

اس دن روپی میک روم میں بیٹھی حسب معمول اپنا میک اپ کر رہی تھی۔ کدیا چانک دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ روپی کیلئے حیرانی کی بات تھی۔ روپی اب اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں فلم ساز یا ڈائریکٹر اس کی ضرورت مند رہتے تھے۔ بلکہ وہ خود ان کی ضرورت بن چکی تھی۔ اب وہ حکم دینے والے مقام پر پہنچ چکی تھی۔ سنسنے والے پر نہیں اور اب وہ سب کا جینی جوتی کی نوک پر رکھتی تھی۔ اس مقام پر آتے آتے پہنچتے ہوئے روپی نے بے شمار باتیں اٹھائی تھیں۔ لیکن اب چھوٹوں کی چھوڑ بڑوں میں بھی یہ جرأت نہ تھی کہ اس کو کہتے ہیں خوش کرو۔ اب تو روپی کو میڈ میڈم کہتے سب کے منہ نہ تھکتے اور پہلے تو یہ بھی ہوتا تھا کہ جس کے جی میں آتا روپی سے بات کرنے میک اپ روم میں چلا آتا۔ مگر اب روپی نے حتیٰ کے ساتھ سب کو منع کر دیا تھا کہ کوئی اس کو میک اپ روم میں ڈسٹرب کرنے نہ آئے۔ روپی کے اس حکم کے بعد اب کوئی بھی میک اپ روم کا رخ نہ کرتا تھا۔ پھر آج یہ دستک کیسی؟ روپی نے میک اپ کرواتے ہوئے پلٹ کر اپنے پیچھے کھڑے لڑکے سے کہا۔

”جاؤ دیکھو۔ پوچھو کون ہے؟ مگر سنو دروازہ نہیں کھولنا۔“

لڑکے نے دروازے کے قریب جا کر آواز دی۔ ”کون ہے؟“ تو باہر سے بڑے تکبر کے ساتھ کہا گیا۔ ”میں روپی کی نئی پانچ فلموں کا ہدایت کار عطاء محمد ہوں۔ جلدی سے دروازہ کھولو مجھے روپی میڈم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ روپی نے خود ہی عطاء محمد کی بات سن لی تھی۔ اس لئے وہیں بیٹھے بیٹھے بولی۔

”عطا صاحب آپ ذرا سا ویٹ کریں میں بس ابھی فارغ ہو کر آتی ہوں۔ بس میں فارغ ہوا ہی چاہتی ہوں۔“

”روپی میرے ساتھ سر حیات خان صاحب بھی آئے ہیں۔ وہ بھی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہی حیات صاحب جنہوں نے تمہاری نئی آنے والی فلموں کے حقوق حاصل کئے ہیں۔“ عطاء محمد نے اپنی بات کو وزن دار بنانے کیلئے روپی کو بتایا۔ یہ سن کر روپی کو غصہ آ گیا۔ مگر اس نے ضبط کرتے ہوئے فقط اتنا کہا۔

”عطا صاحب! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے میں میک اپ روم میں کسی کو ملنا پسند نہیں کرتی۔ آپ حیات صاحب سے کہہ دیں کہ وہ ہیٹ پر تشریف رکھیں۔ میں فارغ ہو کر ابھی آتی ہوں۔“

”روپی دروازہ کھولو تم آخر خود کو سمجھتی کیا ہو؟ تم دروازہ کھول کر حیات صاحب کی تو بین کر رہی ہو۔ وہ ہیٹ پر نہیں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتے ہیں۔“ کہہ کر عطاء محمد زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا تو روپی نے تنگی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میں تنہائی میں کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”روپی جلدی سے بس اب دروازہ کھول دو ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ عطاء محمد دھمکی دیتے ہوئے غرایا۔ روپی کا میک اپ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ وہ اطمینان سے اٹھی اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ جہاں ہدایت کار عطاء غصے میں پھرا کھڑا تھا قریب ہی ایک اور مرد بھی کھڑا تھا جس کی عمر پچاس برس کے قریب ہوگی۔ عام سی شکل و صورت تھی۔ وہ عوامی شلواریوں میں ملبوس تھا۔ ایک کاندے پر سیاہ شال ڈال رکھی تھی۔ پاس اس کے دو باؤ ڈی گارڈ بھی کھڑے تھے۔ روپی سمجھ گئی یہی پروڈیوسر حیات ہے مگر اس وقت حیات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہدایت کار عطاء محمد کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ پھر بے حد غصے سے کہا۔

”عطا صاحب! میں سب لوگوں کی عزت کرتی ہوں اور جو اب خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ لوگ میری بھی عزت کریں۔ آپ آئندہ ذرا منہ سنبھل کر بات کیا کریں۔ میں یہاں کسی کے باپ کی نوکر نہیں اور نہ مجھے بے تکلفی پسند ہے خواجہ خواہ کی۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ پاؤں بچ کر آگے بڑھی تو پروڈیوسر حیات نے جو ابھی تک اس کی باتیں سن کر خاموشی سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ آگے بڑھ کر روپی کا راستہ روک لیا۔



روپی نے حیات کی اس حرکت پر نفرت سے اس کو دیکھا۔ پھر دانت چبیتے ہوئے بولی۔  
 ”مسٹر حیات آپ کو یہاں آئے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے میں خودخواہ کی بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔“  
 کہہ کر روپی آگے بڑھی تو حیات نے روپی کی کلائی پکڑ لی۔ روپی نے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے ضبط کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
 ”مسٹر حیات آپ بدتمیزی کر رہے ہیں۔ پلیز چھوڑ دیں میری کلائی ورنہ۔“  
 ”کب سے دیکھ رہا ہوں میں تم کوڑ کر رہے ہوئے۔ اب تو ہمیں تمیز سکھائے گی۔“ حیات نے ایک زناٹے دار تھپڑ روپی کے منہ پر رسید کیا۔ پھر غرایا۔  
 ”اپنی اوقات میں رہو طوائف ورنہ ہمیشہ کیلئے یہ بولتی بند کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔“

”ذیل انسان تمہاری یہ جرأت کہ تم مجھ پر یعنی روپی پر ہاتھ اٹھاؤ۔ میں تم کو تمہاری اس جرأت اور بدتمیزی کی بہت عبرت ناک سزا دوں گی۔ روپی نے پلٹ کر ایک الٹا ہاتھ حیات کے منہ پر رسید کیا۔ پھر ناگن کی طرح پھنکار کر بولی۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں تم دونوں پر اور تمہاری فلموں پر بھی۔ یاد رکھنا عطا اور حیات جب تک تم دونوں باقاعدہ معافی نہیں مانگو گے میں تمہاری کسی بھی فلم کی عکسبندی میں حصہ نہیں لوں گی۔ وہاں تم بیت چکا جب مجھے تو جیسے کتوں کو خوش کرنا پڑتا تھا۔ اوئے تم لوگوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ یہ وقت میرا ہے اور میں اب تم جیسے کتوں کو جوتے کی ٹوک پر رکھتی ہوں۔“  
 بات ختم کرتے ہی وہ مارے غصے کے آگے بڑھی تو حیات نے نفرت سے روپی کو گھورتے ہوئے کہا۔  
 ”معافی اور تم سے۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے زمین پر تھوک دیا۔

”بہت اکڑ رہے ہو۔ اگر مر رہے تو اپنی بات اور اکڑ پر قائم رہنا۔ اپنے نقصان کی پروا کئے بغیر اور میں اپنی بات بھر پور پیٹ کرتی ہوں۔ جب تک تم دونوں ہی معافی نہیں مانگو گے میں تمہاری کسی بھی شوٹنگ میں حصہ نہیں لوں گی۔“ پھر وہ سیٹ پر جانے کی بجائے اپنی گاڑی لے کر سیدھی اپنے گھر چلی آئی تھی۔ ہدایت کار عطا محمد اور پروڈیوسر حیات وہیں کھڑے مارے غصے کے کھولتے رہ گئے تھے۔ اگلے روز روپی اپنے کہنے کے مطابق عکسبندی میں حصہ لینے سٹوڈیو نہیں آئی تھی۔ کوکہ عطا محمد اور حیات اپنے سیٹ پر بیٹھے روپی کا ویٹ کرتے رہے۔ مگر روپی کے نہ آنے کو انہوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ سوچ کر کہ غصے سے بھری گئی تھی تو جب یہ غصہ اتر جائے گا تو خود ہی سٹوڈیو چلی آئے گی۔ روپی ان کی ایک دوئیں پوری پانچ فلموں میں کام کر رہی تھی۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ روپی نئی آرٹسٹ نہیں تھی۔ وہ اس وقت شہرت کے ساتویں آسمان پر تھی۔ وہ خود روپی کی نہیں اب روپی ان کی ضرورت تھی۔ خاص کر اس وقت جب وہ کثیر سرمایہ ان فلموں پر خرچ کر چکے ہوں۔

ایک ہفتہ یونہی بیت گیا تھا مگر روپی نے کسی بھی سٹوڈیو کا رخ نہ کیا تھا۔ عطا اور حیات کے علاوہ باقی جن ڈائریکٹر ز کی فلموں میں کام کر رہی تھی۔ ان سب کفون کر کے عطا محمد اور حیات کے درویش کا بتانے کے بعد اپنا باقی کا سامرا پروگرام بتاتے ہوئے ویٹ کرنے کا کہہ دیا تھا۔

جب ایک ہفتہ گزرنے کے بعد بھی روپی سٹوڈیو نہ آئی تو ڈائریکٹر عطا محمد اور پروڈیوسر حیات کو پہلی بار فکر لاحق ہوئی۔ بلکہ ان کے ہوش ٹھکانے پر آ گئے کہ روپی ان کی ایک دوئیں بیک وقت پانچ فلموں میں پر قائم کر رہی تھی اور ان پانچ فلموں میں سے تین فلمیں تو تقریباً مکمل ہونے کے قریب تھیں۔ بلکہ مکمل ہو چکی تھیں۔ بس برائے نام روپی کا کام ان میں باقی تھا۔ یا پھر ڈنگ ہونا باقی تھی۔ باقی کی دو فلمیں بھی نصف کے قریب مکمل ہو چکی تھیں۔ اچھا خاصا سرمایہ ان فلموں کو مکمل ہونے پر اٹھ چکا تھا۔ بلکہ کافی زیادہ خرچا ہو چکا تھا۔ اب روپی کا یوں ضد میں آ کر سٹوڈیو نہ آنا ان کو ارب پتی سے لکھ پتی بنا سکتا تھا۔ بلکہ سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

کوکہ روپی اپنے دوسرے ہدایت کاروں سے بات کر چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ سب بھی پریشان تھے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جن کی فلمیں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں۔ بس ایک ایک دو دوئیں باقی تھیں۔

یہی وجہ تھی وہ بہت پریشان تھے۔ بار بار روپی کے سیکرٹری کفون کر رہے تھے۔ خود بھی جا جا کر سیکرٹری سے مل رہے تھے۔ اس کا سب کیلئے ایک ہی جواب تھا جو روپی اس کا اچھی طرح سمجھا چکی تھی۔

”جناب عالی عطا محمد اور حیات صاحب کے ساتھ جھگڑا ہو جانے کے بعد انہوں نے گھر جاتے ہی مجھے فون کر دیا تھا۔ جب تک عطا محمد اور حیات صاحب ان سے باقاعدہ معافی



نہیں مانگتے تب تک وہ سٹوڈیو میں قدم نہ رکھیں گی۔ اب اگر آپ لوگ چاہتے ہیں روپی میڈم سٹوڈیو آنا شروع کر دیں تو پھر جو شرط میڈم نے رکھی ہے اس کو پورا کر دیں۔ انہوں نے سختی کے ساتھ مجھے منع کیا تھا کہ جب تک وہ لوگ معافی مانگنے کیلئے ایگری نہیں ہوتے تب تک میں ان کفون کر کے پریشان کرنے کی کوشش نہ کروں۔ اس کے باوجود میں نے آپ کی پریشانی کا خیال کرتے ہوئے کئی بار ان کفون کیا ہے۔ مگر انہوں نے ریسپونڈ نہیں کیا جس کا مطلب یہی ہے کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔

”تم گھر جا کر خود بھی تو دیکھ سکتے ہو۔“ حیات نے جلدی سے کہا۔

”آپ شاید میری بات کا یقین نہ کریں۔ مگر میں میڈم کے گھر کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے نسیم کے علاوہ فلم انڈسٹری کا اور کوئی فرد بھی میڈم کی قیام گاہ کے بارے میں نہیں جانتا۔ میڈم ہا تو خود کہیں جاتی ہیں اور وہاں کسی کا اپنے گھر آنا پسند کرتی ہیں۔“ سیکرٹری کی باتیں سننے کے بعد وہ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے تھے۔

ادھر روپی عطا اور حیات کے ساتھ جھگڑے کے بعد بڑے آرام سے گھر میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس بات کا اکثر شکرا کرتی تھی کہ اس کی رہائش گاہ کے بارے میں انڈسٹری کا کوئی فرد بھی نہیں جانتا تھا۔ سوائے نسیم کے۔ ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی۔ جھگڑا تو اس کا صرف عطا محمد اور حیات کے ساتھ ہوا تھا۔ مگر روپی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان ڈائریکٹرز کو بھی سبق سکھانا چاہتی تھی۔ جو کبھی کبھار خواہ مخواہ دروس بن جاتے تھے۔ فری ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ سٹوڈیو سے گھر آتے ہی روپی نے سب سے پہلے اپنے سیکرٹری کو ساری بات بتانے کے بعد تاکید کی تھی کہ جب بھی ان میں سے کوئی آئے تو ان کو صاف صاف بتا دینا۔ میڈم کہتی ہیں جب تک عطا اور حیات صاحب ان سے معافی نہیں مانگیں گے تب تک میڈم عکسبندی میں حصہ لیا تو دور کی بات سٹوڈیو میں بھی قدم نہ رکھیں گی۔

روپی کے سیکرٹری نے کہا تھا۔ نسیم کے علاوہ کوئی بھی روپی میڈم کی قیام گاہ کے بارے میں نہیں جانتا۔ عطا محمد اور حیات سیکرٹری کے ہاں سے اٹھ کر سٹوڈیو آنے کے بجائے سیدھے نسیم کے ہاں گئے۔ روپی کھل کر نسیم کو ساری بات بتا چکی تھی۔ یہ بات چند برس پہلے نسیم نے ہی روپی سے کہی تھی۔

”آج سب چھوٹے بڑوں کو خوش کرنا تمہاری مجبوری ہے۔ اگر فلم انڈسٹری میں بلند مقام پانا چاہتی ہو اور جب یہ مقام حاصل کر لو تو پھر چھوٹوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی اپنے جوتے کی ٹوک پر رکھ لیتا۔“ اور آج روپی اسی مقام پر تھی۔ اس لئے اس نے معافی کی شرط رکھی تھی۔ وہ نسیم کے ہاں آئے۔ وہ خوش اخلاقی سے ملی کیونکہ یہ طوائف ہونے کے سوا اس کی تربیت کا بھی حصہ تھا۔ اس کی ماں نائیکہ چشمہ کہتی تھی کہ نسیم اپنے دشمن کی دشمنی میں دور تک نہ جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ بھی اس دشمن ہی کی تم کو ضرورت پڑ جائے۔ عطا حیات کی دھمکوں میں تو وہ خود بھی کام کر رہی تھی۔ حیات نے ساری بات نسیم کو بتانے کے بعد کہا تھا۔ پلینز کچھ کرو کسی طرح روپی کو گھر سے نکل کر سٹوڈیو لاؤ۔ ورنہ ہم تو فقیر ہو کر سڑک پر بیٹھ جائیں گے۔ تباہ ہو جائیں گے۔

”اگر فقیر ہونے کی اتنی ہی فکر تھی تو پھر وہ سب نہیں کرنا تھا جو تم لوگوں نے کیا۔ روپی مجھے سب کچھ بتا چکی ہے۔ وہ نئی لڑکی نہیں تھی کہ آپ اس کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتے اور وہ برداشت کرتی۔ آپ روپی کے مقام کا اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ کیونکہ ایک دو نہیں وہ تو آپ کی ہی پانچ غفلتوں میں کام کر رہی ہے۔ اب اگر یہ سب کیا ہے اور آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کا ہر یہ نقصان نہ ہو جبکہ سیٹ لگے کتنے دن ہو چکے ہیں تو پھر میرا نیک مشورہ یہی ہے کہ جو روپی کہہ رہی ہے وہ کر لیں۔ اس کے بغیر وہ سٹوڈیو نہیں آئے گی۔ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے۔“ نسیم آخر میں معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی تو چشمہ جو خود بھی نسیم کے ساتھ وہاں آئی تھی وہ عطا اور حیات کا اچھی طرح جانتی تھی کیونکہ بہت پہلے وہاں کے گوشے پر بڑی باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھار تو اب بھی آ جلیا کرتے تھے۔ نسیم کے جانے کے بعد بولی۔

”اوپر حیات اور عطا تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ ارے بندہ مطلب کے وقت گدھے کو بھی اپنا باپ بنا لیتا ہے۔ ارے یہ اپنا عزت اکڑ میں تو کہتی ہوں پیسے کے سامنے ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ میرا نام نائیکہ چشمہ ہے اور میں نے کبھی کسی کو کوئی غلط مشورہ نہیں دیا۔ جب کسی کو مشکل پیش آتی ہے تو وہ سیدھا میرے پاس آتے ہیں۔ اور جب میرے کہنے کے مطابق عمل کرتے ہیں تو مشکل کا نام و نشان تک نہیں رہتا۔ میں کہتی ہوں تمہارے اس مسئلے کا حل صرف معافی ہی ہے۔ میں روپی کو بھی جانتی ہوں اور اس کے مقام کو بھی پہچانتی ہوں۔ زیادہ دن گزرنے پر بھی جب تم لوگوں نے معافی ہی مانگی ہے تو پھر ابھی کیوں نہیں۔ میں کہتی ہوں ہر جنگ پوری قوت سے لڑو۔ لیکن جب اپنی ہار آتی دکھائی دے تو پھر بازی جیتنے کیلئے جب ضرورت پڑے تو اپنا تھکا ہوا خود بھی جاٹ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ جس کو کل جوتا مارا ہے اپنا دشمن سمجھ کر آج اگر اس کے ساتھ کوئی مطلب پڑا ہے تو اس کے پاؤں میں بیٹھ جانے سے بلکہ پیر پکڑ کر منا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ نوکیر و مالز نو سرینڈر نو سوری یہ خودی انا عزت غیرت یہ سب باتیں اصول پرست شریف لوگوں کیلئے مخصوص ہوتی ہیں۔



بد معاش اور مکار لوگوں کیلئے نہیں۔ تم دونوں تو بچے بد معاش ہو میں اپنی جوانی کد مانے سے تم کو جانتی ہوں۔ چھوڑو یہ ساری فضول باتیں۔ بازی جتنی ہے تو صرف اپنا مطلب دیکھو۔ فوراً معافی مانگ لو۔ چشمہ کسی کو بھی غلط مشورہ نہیں دیتی۔ بازی جتنی ہے تو پھر باقی سب کچھ بھول جاؤ۔ یہ غلط کہی باتیں نہیں۔ یہ چشمہ کماصول ہیں اور انہی باتوں اور اصولوں پر عمل کر کے میں آج مشہور اور مقبول عورت بنی ہوں۔ آج اس مقام پر ہوں کہ سب کو مشورہ دیتی ہوں۔ تم بھی مجھ جیسی طرح جانتے ہو۔“

”بالکل بالکل چشمہ بائی۔ لوٹری کی مکاری ہو شکاری آپ کی چالاکی اور ہوشیاری کے سامنے کیا ہمت رکھتی ہے۔ چشمہ بائی کی ہوشیاری کا اعتراف تو سارا بازار کرتا ہے۔ ارے آپ تو وہاں نیکہ ہیں۔ جنہوں نے اپنی چالاکی اور ہوشیاری کی وجہ سے نسیم کی تنہا تر فانی کی رسم ایک کے بجائے دوبارہ کی۔“ حیات نے خاصے لفظ انعام دماز میں کہا تو چشمہ نے ایک اونچا قبہ لگایا۔ کافی دیر تک خود ہی اکیلی خوب ہنستی رہی۔ یہی تو وہ واقعہ تھا جس کے بعد اس کی چالاکی اور ہوشیاری کے چرچے اور قصے لاہور کے بازار سے نکل کر ملتان اور کراچی کے بازاروں تک بھی جا پہنچے تھے۔ روپی اس وقت نہیں دیکھتی تو بتا چلتا وہ کتنا پر نور چہرہ رکھتی ہیں۔ بہر حال عطا اور حیات جب نائیکہ چشمہ کے پاس سے اٹھے تو ان کے مشورے کی روشنی میں سیکسیوز کرنے کا پکا پکا پروگرام بنا چکے تھے کہ فقیر ہونے سے بچنے کیلئے معافی مانگنا ہی ان کے حق میں بہتر تھا۔ پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا تھا۔ سیٹ لگے کتنے روز ہو چکے تھے۔ روپی نے اپنے سیکریٹری کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی۔ جب تک وہ صلح کیلئے ایگری نہ ہوں خواہ مجھے فون کر کے پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ فلاں یہ کہتا ہے۔ ڈھمکان یہ کہتا ہے۔ ایک ہی بار مجھے فون کرنا اور وہ بھی اس وقت جب وہ لوگ معافی مانگنے پر ایگری ہو جائیں۔ ابھی ابھی اس کے سیکریٹری کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ لوگ معافی مانگنے کیلئے ایگری ہو گئے ہیں۔ وہ بتا رہا تھا ابھی ابھی حیات صاحب کا فون آیا تھا۔ حیات صاحب کہہ رہے تھے۔ میڈم سے کہہ دیں کل سٹوڈیو شریف لے آئیں۔ ہم ان کی خواہش پوری کرنے کو تیار ہیں۔ ہم ان سے سیکسیوز کر لیں گے۔ ہاں ان کے بعد ڈیشان صاحب کا بھی فون آیا تھا۔ وہ بھی بتا رہے تھے ساری بات طے ہو گئی ہے۔ آپ کل سٹوڈیو آ جائیں سارا معاملہ خوش اسلوبی سے آپ کی خواہش کے مطابق حل ہو جائے گا۔ اب آپ بتائیں آپ کیا کہتی ہیں تاکہ میں ان سب کو بتا سکوں۔ کیا آپ کل آرہی ہیں۔“

”بالکل آرہی ہوں۔ کہہ دو سب سے۔“ روپی نے کہا۔ پھر ریسورسز رکھا اور روم میں ٹہلنے لگی۔ یہ ایک بڑی فتح تھی جو اس نے ان مردوں پر حاصل کی تھی۔ جو کبھی اس کی توہین کرتے رہے تھے۔ اب اس واقعہ کے بعد تو ڈائریکٹر اس سے بات کرتے ہوئے محتاط بھی رہیں گے۔ اگلے روز روپی نے ناشتہ کرنے کے بعد ایک خوبصورت سوٹ زیب تن کیا۔ پھر اچھا سا میک اپ کر کے گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے باہر چلی آئی۔ ایک گھنٹہ بعد وہ سٹوڈیو میں موجود تھی۔ سٹوڈیو میں بنے اس روم میں اس وقت کافی سارے لوگ موجود تھے۔ جن میں عطا محمد اور حیات نمایاں تھے اور اس وقت سبھی کو صرف اسی کا انتظار تھا اس کو دیکھتے ہی ڈیشان جلدی سے اٹھا پھر آگے بڑھ کر روپی کا استقبال کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”تم آدھ گھنٹہ لیٹ آئی ہو اور ہم پریشان تھے کہ کہیں تم نے آنے کا پروگرام نہ بدل لیا ہو۔“

”وہ سڑک پر ٹریفک بلاک ہونے کی وجہ سے لیٹ ہو گئی۔ ورنہ گھر سے تو ٹھیک ٹائم پر ہی نکلی تھی۔“ روپی نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔ ”اچھا خیر اب آؤ۔“ ڈیشان نے کہا۔ اور روپی آگے بڑھی۔ پھر سب کو سلام کرتے ہوئے ڈیشان کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے باڈی گارڈ صوفے کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔ روپی روم میں موجود سب لوگوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے ڈیشان کو دیکھنے لگی۔ کو کہہ رہی ہو دیر کس بات کی ہے۔ اب بات شروع کی جائے۔ جی فلم ایکٹرز ایسوسی ایشن کے صدر نے بات شروع کی۔

”میں زیادہ لمبی بات کر کے آپ کا قیمتی ٹائم ضائع نہیں کروں گا۔ روپی نے اس جھگڑے کے بعد مجھ سے بات کی تھی اور میں نے عطا محمد اور حیات صاحب سے اس حوالے سے بات کی۔ مگر تب وہ میری بات نہیں مانے تھے۔ بہر حال میں نے ان کو سوچنے کیلئے دو ہفتے دیئے تھے اور انہوں نے خوب سوچنے کے بعد مجھ سے رابطہ کر لیا اور وہ روپی کی جانب سے رنجی گئی شرط پوری کرنے پر تیار ہو گئے۔“ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ کوسانس لینے کو تھوڑی دیر بعد پھر بات شروع کی اور کہا۔

”دیکھیں آپ لوگ خود ہی سمجھ دار ہیں۔ آپ سب ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ ایک دوسرے سے تعاون کئے بغیر آپ لوگوں کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ اس جگہ کبارے میں پہلے ہی لوگ اچھی رائے نہیں رکھتے۔ ایسے حادثات اس جگہ کو مزید بدنام کرنے کا باعث بنیں گے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب آپ سب کچھ بھول کر ایک دوسرے کو معاف کر کے ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔ ایکٹرز ایسوسی ایشن کے صدر نے بات ختم کی اور ان کے خاموش ہوتے ہی ہدایتکار عطا محمد نے روپی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے فسوس ہے کہ بات میری وجہ سے بڑھی تھی۔ میں اپنے اس رویے پر شرمندہ ہوں۔ مجھے امید ہے میڈم روپی مجھے معاف کر دیں گی۔“



”تقریباً یہی خیالات میرے بھی ہیں۔“ پروڈیوسر حیات نے اتنا ہی جلدی سے کہا اور چپ ہو گئے۔ تب روبی نے اسی دن کی کہی ہوئی اپنی بات نکودہ رایا اور عطا حیات کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کوشش کرتی ہوں سب کو عزت و احترام دوں اور جواباً خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ لوگ مجھے بھی عزت اور احترام کے ساتھ مخاطب کریں۔“ روبی اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو روبی! مجھے یقین ہے دوبارہ پھر کبھی ایسا نہیں ہوگا۔“ ایکٹر ایسوسی ایشن کے صدر نے کہا۔ پھر روبی نے صدر کے کہنے پر عطا اور حیات سے ہاتھ ملایا اور شوٹنگ کیلئے تیار ہونے میں ایک اپ روم میں چلی گئی۔ جب وہ تیار ہو کر میک اپ روم سے باہر آئی تو میک روم کے سامنے جو قدیم درخت تھا۔ ذیشان اس کے تنے سے ٹپک لگائے کھڑا تھا۔ روبی کو باہر آتے دیکھ کر مسکرایا۔ تو روبی نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تم یہاں کس خوشی میں کھڑے ہو۔“

”تم کو جی بھر کر دیکھنے کیلئے کافی دنوں بعد دیدار ہوا ہے نا۔“ ذیشان نے ہنس کر کہا تو روبی بجائے برا ماننے کے اس کی شرارت کو سمجھ کر خود بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ مگر پھر فراموشی اختیار کرتے ہوئے بولی۔

”یہ بڑے کڑتے تھے اور کہتے تھے معافی اور تم سب معافی کیلئے تیار کیسے ہو گئے۔“

”ہونا ہی پڑا کہ ایک تو وہ غلط تھے اور پھر سارے فنکار بھی تمہارے ساتھ تھے۔ ویسے بھی کروڑوں کا معاملہ تھا۔ بے چارے مرتے کیا کرتے۔ معافی مانگتی ہی پڑی کہ تمہارا رویہ بے لچک تھا۔ اسی وجہ سے تمہارا کافی رعب پڑ گیا ہے۔ ان دونوں پر ہی نہیں سب پر۔“

”واقعی؟“ روبی مسکرائی تو ذیشان جی ہاں کہتے ہوئے مسکرا پڑا۔ اور پھر یونہی دونوں باتیں کرتے ہوئے سیٹ پر آ گئے۔ وہاں عطا محمد صلح کی خوشی میں سب کا منہ مٹھا کر رہے تھے۔ روبی کو دیکھا تو ایک پیس لے کر فوراً آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر خود ہی روبی کے منہ کے سامنے کر دیا۔ اس نے بادل خواستہ منہ کھول کر تھوڑا سا چھکا۔ اس کے بعد فوراً شوٹنگ کا آغاز ہو گیا۔ روبی تو یہی سمجھی تھی کہ اپنے نقصان سے بچتے کیلئے اور ایکٹر ایسوسی ایشن کے صدر کے دباؤ پر عطا حیات نے معافی مانگی ہے۔ مگر وہ تو نسیم نے ملتان سے واپسی پر جب شوٹنگ میں حصہ لینے سٹوڈیو آئی تو روبی نے عطا حیات کے جھگڑنے کا بتایا۔

یہ سن کر نسیم نے ہنس کر کہا۔

”بعض مرد اپنا کروڑوں کا کیا رول کا نقصان برداشت کر لیتے ہیں۔ مگر عورت کے سامنے جھکنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ حیات کا شمار بھی انہی مردوں میں ہوتا ہے۔ میرے پاس آیا تھا کہ میں معافی نہیں مانگ سکتا تھا۔ تم روبی کو سمجھاؤ مگر میں نے معذرت کی۔ اس کے بعد میری امی نے ان کو سمجھا بجھا کر تم سے معافی مانگنے کیلئے رضامند کر ہی لیا کہ تم ان کو اچھی لگتی ہو۔ ویسے بھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری امی کسی سے کوئی بات کہہ اور وہ نہ مانے۔ آخر میری امی کا نام چشمہ ہے۔“ بات ختم کر کے وہ پھر مسکرائے لگی اور روبی بھی مسکرا دی تھی۔

چند روز سیٹ پر عکس بندی ہوتی رہی۔ پھر فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس فلم کا ایک سین کیلئے عطا محمد کو حقیقی بارش کا انتظار تھا۔ مگر سائون کا مہینہ ہونے کے باوجود اس قسم کا موسم نہ بن رہا تھا لگتا تھا اس بار سائون ترسا کر سوکھا ہی بیت جائے گا۔ بارش بالکل بھی نہیں ہوگی۔ ذیشان نے تو عطا محمد سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

وہ سٹوڈیو کے اندر ہی مصنوعی بارش سے کام چالے۔ اس ایک آخری سین کیلئے حقیقی بارش کے چکر میں فلم کو مزید لیٹ نا کریں۔ مگر عطا محمد رضامند نہ ہوا تھا۔ وہ اس سین کو کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق حقیقی بارش میں ہی فلمنا چاہتا تھا۔

ایک دن یکدم آسمان کا لے کا لے بالوں سے بھر گیا۔ یہ دیکھتے ہی عطا محمد اپنی تیاری مکمل کر کے پورے یونٹ کو ساتھ لے کر سٹوڈیو سے نکلے۔ یہ سین شہر لاہور کی خوبصورتی میں مزید اضافے کا باعث بنے والی لاہور کے درمیان پہنچنے والی نہر کے کنارے فلمایا جاتا تھا۔ جب یہ لوگ سٹوڈیو سے باہر آئے تو سارا شہر بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دن پر بھی اترتی ہوئی شام کا گمان ہونے لگا تھا۔ لیکن نہر کے کنارے جا کر ان لوگوں نے اپنا سلمان وغیرہ درست کیا۔ کیمروہیٹ کیا تو اداھر تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی۔ اس تیز ہونے چند منٹ میں بادل بھگا کر سارا آسمان خالی کر کے دکھ دیا۔

قدرت کی اس قسم ظریفی پر اور عطا محمد کی حالت دیکھ کر ہنس ہنس کر سب کا برا حل ہو گیا تھا۔ سب ہی عطا محمد کو چھیڑ رہے تھے۔ ذیشان پھر پوری سنجیدگی سے یہی مشورہ دے رہا تھا۔



”عطا صاحب آپ خود آواز نہ چل سکتے ہیں۔ پوری فلم تیار ہو چکی ہے اور صرف ان چند شائیں کیلئے آپ فلم لیٹ کر رہے ہیں۔ یہ تو زیادتی ہے حیات صاحب کے ساتھ۔ ویسے بھی تماشائیوں کو اس بات سے کوئی اثر سٹ نہیں ہوتی کہ سین نیچرل بارش میں عکس بند ہو یا منصوبی بارش میں۔ اب بھی نامم ہے آپ اپنی یہ ضد چھوڑ دیں۔“

”جس کام سے میں خود مطمئن نہیں ہوتا وہ نہیں کرتا۔ فلم بے شک ایک برس لیٹ ہو جائے مگر میں یہ سین نیچرل بارش میں ہی کروں گا۔“ عطا محمد نے تھوڑے غصے سے ذیشان کا مشورہ رد کرتے ہوئے کہا تو روٹی ذیشان کو دیکھتے ہوئے مسکراتے لگی۔

روٹی چند روز بعد ایک دوسری فلم کے سیٹ پر کام کر رہی تھی۔ جب بتا چلا کہ باہر موسم بہت سہلنا ہو رہا ہے۔ بارش بس ہوائی چاہتی ہے اور بارش کا سن کر روٹی کو عطا محمد یاد آ گیا جس نے اس اصل بارش میں چند شائیں کے لئے فلم روک رکھی تھی۔ روٹی ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ عطا محمد کا پیغام ملا۔ پیلیز فوراً چلی آؤ آج بارش نہ ہونے کا سول ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عطا کے اصرار اور سین کی ڈیمانڈ کے پیش نظر اس نے ہدایتکار نیاز سے معذرت کی اور ایک بار پھر پورے یونٹ کے ساتھ نہر کی جانب روانہ ہو گئی۔

نہر پر پہنچتے ہی سلمان سیٹ کرنے کے بعد کمرہ درست کر کے بارش کا انتظار کرنے لگے۔ ہوا میں بھیگاہن تھا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ بارش اس وقت لاہور کے کہیں آس پاس ہو رہی تھی۔ موسم لہجہ بہ لہجہ خراب سے خراب تر ہو رہا تھا۔ دن شام میں بدلنے کے بعد کمرے کمرے کی سیاہی میں دخل رہا تھا۔ روٹی اس خراب ہوتے موسم کے اثرات سے بچنے کیلئے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ذیشان سے بے تحاشہ باتیں کئے جارہی تھی۔ بے مقصد اور بے معنی باتیں۔ دراصل وہ اپنا دھیان اس خراب موسم کی جانب سے ہٹانا چاہتی تھی۔ کیونکہ ایسا ہی موسم اس کو ماضی میں لے جاتا تھا۔ اور بلال کی یاد دلا کر اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ کر ڈالتا تھا۔ ایسے موسم میں وہ اکثر گھر کا اندر رہتی تھی۔ اگر گھر سے باہر ہوتی تو جلد از جلد گھر پہنچنے کی تیاری کرتی۔ مگر آج اس فلم کے چند شائیں کیلئے جو اس بارش میں ہی اس پر قلم اُٹے جانے تھے اس کا یہاں رکنا لازمی تھا۔ اس وقت روٹی کے ارد گرد قلمی یونٹ کے علاوہ بھی کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ محض شوٹنگ دیکھنے کے چکر میں۔ ان لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ زیادہ گھبراہٹ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ مگر دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی۔

اچانک فضا میں بجلی چمکی اور اس کے ساتھ ہی بالوں نے بھی ایک خوفناک آواز میں اپنی موجودگی کا احساس دلانا ضروری سمجھا۔ بادل تھے بھی ساون کے۔ وہ کچھ ایسی خوفناک آواز کے ساتھ گرجے کہ باتیں کرتے ہوئے روٹی یکدم ہی گھبرا کر مضطرب انداز میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ذیشان جو اس کی باتیں سنتے ہوئے کافی دیر سے اس کی بدلتی ہوئی رنگت اور کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا ٹھٹھے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔“ روٹی کی آواز بے حد مدہم تھی۔ وہ ذیشان کو وہیں چھوڑ کر نہر کے کنارے کنارے چلتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ہوا جھکڑ کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔ بالوں نے نان سٹاپ اپنی پوری قوت سے گرجنا شروع کر دیا۔ پھر بارش بھی خاص تیز شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی روٹی کی سماعتوں میں سرکوشیوں کی صورت میں بلال کی باتوں کی بازگشت ابھرنے لگی۔

”بلال!۔۔۔۔۔“ روٹی نے بے بسی سے زیر لب کہتے ہوئے سہڑ کر دیکھا۔ وہ سب لوگ بارش شروع ہونے پر اس کو پکار رہے تھے جبکہ سماعتوں میں بلال کی سرکوشیاں زبر گھولنے میں محو تھیں۔

”دیکھو میں مرد ہو کر تمہارے پاس نہیں آیا۔ ورنہ اس بھگے موسم کے تقاضے میں بھی سمجھتا تھا۔ اور تم عورت ہو کر مجھ سے رفاقت کی بھیک مانگ رہی ہو۔“

”او بلال!۔۔۔۔۔ او بلال!۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے روٹی نے مارے کرب کے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور بے ساختگی میں بے تحاشہ بھاگنے لگی۔ ہمیشہ کی طرح اپنے آپ سے بیگانہ ہوئی تو اچانک پاؤں پھلانے پر بغیر کسی رکاوٹ کے نہر میں جاگری۔ ذیشان جو اس کا ٹھہ کر جانے کے بعد ابھی تک وہیں بیٹھا مسلسل اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کو یوں پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے دیکھ کر خود بھی تڑپ کر اٹھا۔ پریشان ہو کر پوری تیزی سے روٹی کے پیچھے بھاگا۔ مگر اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ پھسل کر نہر میں گر چکی تھی۔ ذیشان نے بھی اس کے پیچھے نہر میں فوراً چھلانگ لگا دی تھی اور پھر نہر کے کنارے ہی روٹی کو لٹاتے ہوئے ذیشان نے بغور اس کی حالت دیکھتے ہوئے بڑے کرب سے پوچھا تھا۔

”ڈیر! مجھے بھی تو بتاؤ آخر وہ کونسا دکھ ہے جس کو تم نے صرف اپنی ذات تک محدود کر رکھا ہے۔ کیوں نفرت ہے تمہیں محبت سے اور کیوں نہیں یقین کرتی ہو میری محبت پر؟ سبھی



انسانوں کو ایک جیسا مت سمجھو۔ ایک بار آنا کر تو دیکھو روپی!۔ یقین کرو میں تمہارے دکھ شیر کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز اپنے سارے دکھ ساری محرمیاں مجھے دے دو۔ صرف ایک بار مجھے اپنا سمجھ کر تو دیکھو۔ مجھے بتاؤ تو کسی تمہاری یہ حالت کس کی وجہ سے ہوئی۔“ روپی نے ایک نظر ذیشان کو دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں میں بلال کا سر پاتا تھا۔ روپی نے بلال کے اس سر پرے کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچا۔

کو مدد ملے ہوئی ہیں کسی سے جدا ہوئے  
دل کی مگر یہ آگ ابھی تک بجھی نہیں

پھر آنکھیں کھولتے ہوئے وہ بڑی پھرتی سے اٹھی۔ ذیشان کو یوں نظر انداز کرتے ہوئے جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ بڑی تیزی سے عطا محمد کے قریب آ کر رکی اور صرف اتنا کہہ کر کہ مجھے افسوس ہے میں عکسبندی میں حصہ نہ لے سکوں گی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میں گھر جا رہی ہوں۔ مزید رکھو اپنے باڈی گارڈ کو لے کر چلی گئی۔ ذیشان روپی کے اس سر روپی کے بارے میں وہیں بارش میں بھگتے ہوئے بہت کچھ سوچتا رہ گیا تھا۔

اگلے روز جب فلم کا یہ سین مصنوعی بارش میں عکسبند ہوا تو ذیشان نے عطا محمد کو دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”عطا صاحب میں نے پہلے بھی کئی بار آپ سے کہا تھا اعلیٰ بارش سے کام چلا لیجئے گا۔ مگر افسوس آپ کی سمجھ میں میری بات نہ آئی۔ چلیں خیر دیر آئے درست آئے۔“ ذیشان کی بات سن کر عطا محمد کے علاوہ سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ عطا اپنی خفت مٹانے کیلئے خواہ مخواہ ہی کمرہ میں کوڑا نٹنے لگا تھا۔ روپی یہ سب دیکھ کر مسکراتی ہوئی ذیشان کے ساتھ باہر چلی آئی تھی۔ ذیشان نے روپی سے کل والے رویے کی شکایت نہیں کی تھی۔ بلکہ یوں ظاہر کیا تھا جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ جو کچھ ہوا سنجیدگی سے سوچتا تو بہت تو ہین آمیز ہوا تھا۔ مگر وہ چونکہ روپی سے محبت کرتا تھا اس لئے اس کی اس وقت کی کیفیت کو دل سے سمجھتے ہوئے روپی کے رویے کو نظر انداز کر چکا تھا۔

روپی روپی تو وہ ذیشان کے ساتھ اگرچہ بہت فیری بھی اور دونوں میں گہری دوستی بھی تھی۔ ہر فلمی فنکشن میں اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔ دیکھنے والوں کی اکثریت یہی سمجھتی تھی کہ دونوں عنقریب شادی کرنے والے ہیں۔ ذیشان کی پکی پکی خواہش تھی۔ وہ تو بس روپی ہی رضامند نہ تھی۔ کہ روپی کی ذیشان سے بہت گہری دوستی تھی۔ اس کے باوجود روپی نے ابھی تک اپنی قیام گاہ کا نمبر تک بھی ذیشان کو نہیں دیا تھا۔ کیونکہ وہ ذیشان کا اپنے گھر آنا پسند نہیں کرتی تھی۔ شاید دل کے کسی حصے میں بلال کی محبت آج بھی زندہ تھی۔ اور محبت نہیں تو نا سہی نفرت تو پکی پکی موجود تھی۔

آج کل روپی کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کا کافی سلسلہ چل رہا تھا۔ صبح وہ شہر کے ایک حصے میں ہوتی تھی تو دوپہر کو دوسرے حصے میں۔ اور شام کو تیسرے حصے میں۔ ویسے بھی روپی آؤٹ ڈور کے علاوہ بھی آج کل اپنی ان تمام فلموں کا کام جلد از جلد مکمل کر رہی تھی۔ جن میں اس کے دو دو چار چار سین باقی رہ گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ اس نے جب سے فلم انڈسٹری کو جوائن کیا تھا تب سے وہ مسلسل کام کر رہی تھی۔ مسلسل کام اور صرف کام کی وجہ سے وہ بری طرح تھک چکی تھی۔ اب اس کا پروگرام ملک سے باہر جا کر دو تین ماہ آرام کرنے کا تھا۔ یہی وجہ تھی روپی نے اپنے ان تمام ڈائریکٹرز سے جن کی فلموں کا تھوڑا بہت کام باقی تھا کہ وہ دیا تھا کہ اس کے لندن جانے سے پہلے مکمل کروالیں تاکہ بعد میں کوئی یہ شکوہ شکایت نہ کر سکے کہ میں نے جانے سے پہلے بتایا کیوں نہیں۔

اپنی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں اس دن روپی اپنے فلمی یونٹ کے ہمراہ ایک مقامی میڈیکل کالج میں بیٹھی تھی۔ کمرہ میں سیاہ کپڑے کا اندر منہ لگائے لوکیشن کا جائزہ لے رہا تھا۔ یونٹ کے دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ فلم کا ڈائریکٹر ذیشان اورا بھرتے ہوئے فن ظفر کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ ساتھ میں چند لڑکے اور بھی کھڑے تھے۔ جنہوں نے اس سین میں فن کے دوستوں کا رول پلے کرنا تھا۔ پہلے شاٹ کیلئے تمام تیاری مکمل ہو چکی تھی اور روپی کا کام بھی پہلے شاٹ کا ہی تھا۔ ہدایتکاران کو ہدایات دے کر ایک جانب ہٹ گیا اور روپی جلدی سے آئینہ اٹھا کر اپنے میک اپ کا جائزہ لینے لگی۔

کالج کیلئے یہ سین کچھ اس طرح کا تھا کہ اس کالج میں روپی بھی پڑھتی ہے اور فن ظفر اکثر آتے جاتے اس کو بہت تنگ کرتا ہے۔ جملے کستا ہے اور پھر اپنی محبت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ مگر روپی اس سے نفرت ہے اور وہ اس کے ساتھ بات کرنا تو دور کی بات نظر اٹھا کر اس کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔

اس دن وہ اپنی کلاسز سے فارغ ہو کر چھٹی کے بعد گھر جانے کیلئے کالج کی سیرمیاں اتر رہی ہوتی ہے کہ ظفر اس کا راستہ روک کر لیتا ہے۔ اور اظہار محبت کرتے ہوئے زبردستی اپنے



ساتھ چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ جب روپی اس کے ساتھ جانے سے انکار کرتی ہے تو وہ بڑی ہنسی سے روپی کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

ایسے میں ہیر و ذیشان جو ای کالج میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ ظفر کو اس کے اس رویے پر سرزنش کرتے ہوئے دوبارہ ایسی حرکت کرنے سے منع کرتا ہے۔ جس پر ظفر کو غصہ آ جاتا ہے اور وہ ذیشان کو ملکہ مانتا ہے۔ جس کے بعد ان دونوں میں لڑائی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی دوران ظفر کے چند دوست بھی وہاں آ جاتے ہیں اور پھر وہ بھی اس لڑائی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ظفر کے ساتھ مل کر ذیشان کو خوب مارتے ہیں۔ جس کے بعد یہ بات اساتذہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور وہ آ کر ہیر و ذیشان کو سبھا بھجا کر ان میں صلح کرا دیتے ہیں۔ جس کے بعد یہ معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے روپی کا سین تھا۔ روپی نے اپنا یہ ثارٹ پوری کا کارنامہ بھارت سے فلم بند کرایا تھا۔ سب نے اسی وقت تالیاں بجا کر روپی کو زبردست داد دی تھی۔

ثارت دینے کے بعد روپی جلدی جلدی سیزمیں اترنے لگی۔ لیکن ابھی روپی نے چند سیزمیں ہی طے کی تھیں کہ چانک نظر نیچے سامنے ہی کھڑے لڑکیوں کے ایک گروپ کی جانب اٹھ گئی۔ وہ چونک پڑی کہ اس گروپ میں اس کو ایک چہرہ شناسا لگا تھا۔ روپی نے اس چہرے کو زبرد غور سے دیکھا تو گویا دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی تھی۔ ایک قیامت تھی جو دل بھر میں اس کے دل پر آ کر گزرتی تھی۔ یا پھر تھم گئی تھی۔ روپی نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے ایک بار پھر اسی چہرے کی سمت دیکھا۔ اب شک کی بالکل بھی گنجائش نہ رہی کہ رشتہ دور کا نہیں بہت نزدیک کا تھا۔

ہاں وہ زوپی ہی تھی۔ وارنٹ پونی فارم میں لباس فائل سینے سے لگائے وہ بڑی محویت سے شوٹنگ دیکھ رہی تھی۔ روپی بغور اس کو دیکھنے لگی۔ زوپی جو اس شریف خاندان کی بیٹی تھی۔ جہاں روپی آوارہ کی گنجائش نہیں تھی۔ جہاں سے وہ آوارہ روپی بھاگ نکلی۔ اب وہ اس شریف خاندان میں واپس جانے کے قائل نہ رہی تھی۔ مگر معارف روپی کا اپنی جانب دیکھتا تھا کہ زوپی نے جلدی سے اپنی نگاہیں جھکا لی تھیں۔ یعنی وہ بھی اس کو پہچان گئی تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ آوارہ روپی اس کی بہن ہے۔ روپی کا جی چاہا وہ بھاگ کر جائے اور اس کو سینے سے لگا کر جی بھر کے روئے۔ وہ کتنی بڑی ہو گئی تھی۔ مگر یہ نامناسب بات تھی۔ اس نے تو کبھی کسی کو اپنے خاندان کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اب سب کے سامنے زوپی کے گلے میں کراس بات کا اعتراف کیسے کرتی کہ وہ اس کی بہن ہے۔ شاید زوپی بھی اس بات کو پسندنا کرتی کہ روپی سے نگاہیں ملنے ہی اس نے جھکا لی تھیں۔ یعنی وہ آج بھی اس سے خفا تھے۔ اس کو آج بھی ناپسند کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے روپی خود کو سنبھالتے ہوئے نیچا آئی اور ایک جانب پیچھی کر سیوں پر جا کر بیٹھ گئی۔ پھر وہ لڑکیوں کا گروپ روپی کے قریب آ گیا۔ وہ سب روپی سے آٹو گراف مانگ رہی تھیں۔ مگر زوپی ان کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ وہ وہیں ابھی تک درخت سے ٹپک لگائے کھڑی تھیں۔ روپی کے بجائے زمین کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ اب بتا نہیں دھاقہ کچھ سوچ رہی تھی یا روپی نے ہی ایسا محسوس کیا تھا۔ جب لڑکیوں نے روپی سے آٹو گراف مانگے تو روپی نے زوپی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ارے آپ کی ایک ساتھی ابھی تک وہاں درخت سے ٹپک لگائے کھڑی ہے۔ اپنی اس ساتھی کو بھی بلا کر یہاں لائیں۔ اس کے بعد ہی میں آپ کو آٹو گراف دوں گی۔“ زوپی کی ایک پہلی روپی کی بات سنتے ہی بھاگ کر زوپی کے پاس گئی۔ گلے ہی لمحے مایوس سی واپس لوٹ آئی کہ زوپی نے اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے واپس آ کر روپی سے کہا۔

”وہ کہتی ہے میں نے نہیں آنا۔“

روپی نے زوپی کو تنگ کرنے کیلئے اس کی سب سہیلیوں کو دیکھا۔ اور مسکرا کر کہا۔ ”ارے وہ بھی تو آپ کی فرینڈ ہے۔ اگر وہ کسی ایک کے کہنے پر یہاں نہیں آتی تو آپ سب جائیں اور اس کو زبردستی پکڑ کر لے آئیں۔ یا درکھیں جب تک وہ نہیں آئے گی تب تک میں آپ کو آٹو گراف نہیں دوں گی۔“

روپی کی بات سن کر سب لڑکیاں حیران ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ فلم سٹار روپی ایسا کیوں چاہتی ہے۔ ایک لڑکی جب اس کو ملنا نہیں چاہتی تو پھر وہ خود کیوں اس کو ملنا چاہتی ہے؟ کیوں کہتی ہے کہ جا کر زبردستی اس کو میرے پاس لے کر آؤ۔ بہر حال اب مجبوری تھی زوپی کو لانا۔ سو تین لڑکیاں بھاگ کر زوپی کی جانب گئیں اور پھر زبردستی اس کو پکڑ کر روپی کے پاس لے آئیں تو روپی نے مسکرا کر زوپی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم خود سے کیوں نہیں آئی ہو؟ کیا تم کو ادا کاروں سے ملنا اچھا نہیں لگتا۔ شوق نہیں ہم جیسے شوبز کے مشہور لوگوں سے ملنے کا۔“ روپی نے زوپی کی اندرونی کیفیت سمجھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

زوپی اس کی بات سمجھ کر خاموش ہی رہی تھی۔ جواب دینے کی زحمت کا وہ نہیں کی تھی۔ روپی حیران تھی زوپی کو دیکھ کر بجائے نفرت کے دل میں محبت کیوں اٹھ اٹھ کر آ رہی تھی۔ زوپی چپ چاپ اس کے سامنے کسی مجرم کی طرح نظریں جھکائے کھڑی تھی اور دل میں سوچ رہی تھی۔



اگر روپی میری سگی بہن نہ ہوتی تو سب سے پہلے میں اپنی کاپی پر آٹوگراف لیتی۔ اور پھر گھر جاتے ہی امی بھابی کو دکھاتی اور بتاتی آج کتنی بڑی فلمسٹار ان کے کالج آئی تھی شوٹنگ کیلئے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اب تو اس وقت زوپی اس بات سے خفیہ وہی کہیں روپی زوپی کی فرینڈز کو یہاں تارے کدوپی اس کی بہن ہے۔ یہ تو زوپی کی سوچ تھی۔ اور روپی کو اسے دیکھ کر یہ یاد آ رہا تھا۔ جب زوپی اس کے ساتھ کھیلنے سے انکار کرتی تھی تو روپی کتنے زور زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مارتی تھی۔ زوپی نے روپی کے ان تھپڑوں کی امی سے شکایت کرنا تو دور کی بات بھی روپی سے بھی شکوہ نہ کیا تھا کہ وہ کیوں اس کو بغیر وجہ کے مارتی ہے۔ آج اس وقت وہ سب باتیں یاد کر کے روپی کو زوپی پر ڈھیروں پیارا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا صرف ہل بھر کیلئے یہ سب لوگ ادھر ادھر ہو جائیں تو وہ زوپی کو سینے سے لگا کر اس کو پیار کر کے اپنے ان تھپڑوں کا کفارہ ادا کر دے۔ مگر یہ ناممکن بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سب کچھ بھول کر سامنے کھڑی زوپی کو دیکھا کر کہا۔

”میں نے کتنی باتیں پوچھی ہیں مگر تم خاموش ہو لگتا ہے کسی بھلے گھر کی ہو جیسی ہم جیسے شوبز کے آوارہ لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے لڑکیوں کے اس گروپ کو آٹوگراف دیئے۔ پھر زوپی کو دیکھا وہ بھی تک و بسی ہی گم صم کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر روپی نے پوچھا۔

”تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اب کیا آٹوگراف بھی نہیں لوگی۔“ روپی کی بات کا جواب دینے کے بجائے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ تو روپی نے کہا۔

”تم چاہو یا نا چاہو مگر میں تو تمہیں بھی آٹوگراف دینا چاہتی ہوں۔“ روپی کی بات کا زوپی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ سنی ان سنی کر کے اب روپی کے بجائے خواہ مخواہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔ یہ دیکھ کر روپی کو غصہ آ گیا اور اس نے تھوڑے سخت لہجے میں کہا۔

”تم نے سنا نہیں میں نے کہا ہے۔ میں تم کو بھی آٹوگراف دینا چاہتی ہوں۔ نکالو اپنی کاپی جلدی کرو۔“

زوپی نے گھبرا کر روپی کو دیکھا اور پھر یہ سوچ کر جلدی سے فائل ہی روپی کے سامنے کر دی کہ کہیں بچپن کی طرح اس وقت بھی سب کے سامنے تھپڑ نہ مارنے لگ جائے۔ زوپی کے اس طرح ڈر جانے پر لڑکیاں حیران ہو کر پہلے زوپی پھر روپی کو دیکھنے لگیں۔ زوپی کے اس طرح ڈر کر کاپی کے بجائے فائل روپی کے سامنے کرنے کی وجہ سمجھ سکی تھیں۔ زوپی خود بھی اس حیرت کو سمجھ رہی تھی۔ مگر چپ رہنے پر مجبور تھی۔ وہ ان کو کھل کر نہیں بتا سکتی تھی کہ وہاں کا وہ روپی سے ہرگز نہ ڈری تھی۔ وہ تو اپنی بڑی بہن روپی سے ڈری تھی۔ روپی نے زوپی کی فائل پر غلیل جبران کا صرف ایک فقر دکھا تھا جس کا مطلب کچھ یوں تھا۔

”کتنی عجیب بات ہے۔ میری پارسائی نے مجھے سوائے نقصان کے کچھ نہیں دیا اور میری گناہ گاری کبھی میرے مفاد کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنی۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اپنی پارسائی سے مجنونانہ عقیدت ہے۔ آوارہ روپی“

اور پھر فائل بند کر کے زوپی کو تھماتے ہوئے آنکھوں میں آنے والے آنسو ضبط کرتی ہوئی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر فوراً ہی واپس چلی گئی تھی۔ زوپی اس دن کالج سے واپس گھر آئی تو خوش بھی تھی افسردہ بھی۔ روجی بھی آئی ہوئی تھی۔ زوپی نے اپنے روم جانے سے پہلے رک کر فائل ان کو کھول کر دکھائی۔ پھر بتایا یہ روپی آپ نے لکھا ہے۔ وہ آج ہمارے کالج آئی تھیں اپنی شوٹنگ کے لئے۔“ یہ سنتے ہی شمشاد کا موڈ آف ہو گیا۔ انہوں نے زوپی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے بلایا تو نہیں اس آوارہ کو کوئی بات تو نہیں کی نا اس نے۔“

”بس کریں امی آپ کے اسی رویے کی وجہ سے وہ گھر سے بھاگی تھی۔ سارا وقت آپ اور آپنی اس کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ میری حیثیت ہی کیا ہے کہ میں ان کو بلاتی۔ وہ اس ملک کی ایک بڑی سٹار ہیں۔“ زوپی نے اتنا کہا اور فائل لے کر اپنے روم میں چلی گئی۔

زوپی کو آٹوگراف دینے کے بعد روپی تم آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر سیدھی گھر چلی آئی تھی۔ اس کے بعد وہ بہت دن تک کسی شوٹنگ میں حصہ نہ لے سکی۔ بل بہت اداں ہو رہا تھا۔ طبیعت خراب رہی۔ نجانے کیوں سب گھر والے شدت سے یاد آتے رہے۔ ورنہ وہ تو جب سے روٹینوں کی دنیا میں آئی تھی۔ تب سے سب کچھ بھول گئی تھی۔ تارکیوں سے اب اس نے کوئی کبھی واسطہ نہ رکھا تھا، کیونکہ اس کا ماضی تاریک تھا۔ یہی وجہ تھی وہ اس کو بھول چکی تھی۔ اپنے خاندان کو بھی بھول چکی تھی۔ پھر آج کیا ہوا تھا۔

ہاں اگر کوئی یاد رہ گیا تھا یا کسی کو یاد رکھا تھا تو وہ صرف بلال تھا۔ نجانے کیوں وہ ایک بار پھر سے بلال کو دیکھنا چاہتی تھی۔ شاید پہلی اور آخری جاہلیت کے روپ میں۔ وہ ابھی تک اس کے دل کے ایک حصے میں موجود تھا۔ بلال کو دیکھنے کے لئے یا پھر اپنا آپ دکھانے کیلئے وہ اس کی تلاش میں ایسٹ آباد کے سبزہ زاروں میں بھی گئی تھی۔ مگر وہ نمل سکا۔ شہر میں ہونے



والی تقریبات میں وہ محض اس لئے شامل ہوتی تھی کہ شاید کبھی اتفاق سے بلال سے سامنا ہو جائے۔ وہ بلال کا موجودہ ری ایکشن دیکھنا چاہتی تھی۔ یا پھر اس کو اپنا آپ دکھا کر بتانا چاہتی تھی کہ تم مسٹر نمازی! لوگوں کو تبلیغ کر کے بھلائی کی جانب بلاتے ہو۔ اور تمہاری وجہ سے ایک شریف لڑکی گھر سے بھاگ کر آج رسوائی اور تباہی کے جس مقام پر پہنچا سب انہوں سے دور کھڑی ہے۔ اس کے ذمہ دار صرف تم ہو صرف تم۔ اور تمہارا یہ ایک گناہ تمہاری عمر بھر کی تمام نیکیوں پر بھاری ہے۔ مگر بلال کو نجانے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ باوجود کوشش کو وہ اس کو کبھی نپا کی تھی۔

اس دن صبح سے لے کر رات بارہ بجے تک تیز روشنیوں میں شوٹنگ کرتی رہی تھی۔ حالانکہ رات نو بجے کے بعد کبھی فلم بندی میں حصہ نہیں لیتی تھی۔ مگر یہ فلم کے آخری شارٹس تھے اور ڈائریکٹر کی منت کرنے پر وہ عکسبندی مکمل کروانے پر آمادگی ہو گئی تھی۔ اب جب فارغ ہوئی تو بری طرح تھک چکی تھی۔ جب وہ گھر جانے لگی تو ڈیشان نے روک لیا اور کہا سنو آج تم میرے ساتھ کلب چلو گی۔

روبی ڈیشان کی بات سن کر خاموش ہی رہی۔ حالانکہ وہ اس وقت گھر جا کر فوراً آرام کرنا چاہتی تھی۔ ڈیشان نے اس کو خاموش دیکھ کر اس کے موڈ کا اندازہ لگایا اور پوچھا۔  
”کیا خیال ہے آج کلب نا چلیں۔ بہت دن ہو گئے کلب گئے ہوئے۔“

”چلو۔“ وہ ڈیشان کا دل نہ توڑ سکی۔ اس لئے حامی بھری۔ پھر ڈریس چھینج کئے بغیر ہی وہ اپنا میک اپ درست کرتی ہوئی ڈیشان کے ساتھ باہر چلی آئی۔ جہاں ڈیشان کا ڈرائیور اس کی گاڑی لئے کھڑا تھا قریب ہی روبی کی گاڑی بھی تھی۔ ڈیشان نے ڈرائیور کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے روبی کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ خود منجھال لی۔ روبی فرنٹ سیٹ پر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ جبکہ روبی کے دونوں باؤں گاڑی پیچھے بیٹھ گئے تھے۔ پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کلب کی جانب روانہ ہو گئیں۔

یہ کلب اس شہر کا سب سے مشہور پرائیویٹ کلب تھا۔ جس میں معزز لوگ آتے تھے۔ جن میں سرمایہ دار تھے، سول آفیسر، بڑے بڑے سائیکٹرز۔ خاص طور سے غیر ملکیوں کا یہ اس شہر میں پسندیدہ ترین کلب تھا اور روبی کو بھی یہ کلب بے حد پسند تھا۔ وہ ڈیشان کے ساتھ اکثر یہاں آتی رہتی تھی۔ ان دونوں کی ٹیمبل یہاں مستقل ریز روڑتی تھی۔ وہ دونوں اندر آ کر اپنی مخصوص ٹیمبل پر بیٹھ گئے۔ روبی تو بیٹھ کر ہال کا جائزہ لینے لگی اور ڈیشان میو دیکھتے ہوئے ویٹر کو کھانے کا آرڈر نوٹ کروانے لگا۔ روبی کو کہ گھر سے باہر کھانا کم کم ہی کھاتی تھی۔ لیکن ڈیشان کے کہنے پر اکثر یہاں آتی رہتی تھی کھانا کھانے کیلئے۔ یہی وجہ ہے اس وقت کھانے کا آرڈر نوٹ کرواتے دیکھ کر وہ خاموش ہی رہی تھی۔ کہ خود اس کو بھی سخت بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا آنے تک انہوں نے ہلکی پھلکی بات چیت کی۔ پھر کھانا کھانے کے بعد انہوں نے کافی منگوائی اور پھر کافی پیتے ہوئے ڈیشان نے کہا۔

”کب تک تمہارا سہنہ کا ارادہ ہے۔“

”ہمیشہ عمر بھر کیلئے۔ آخر تمہاری سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آتی۔ جو ہر چند ہفتوں کے بعد یہی ٹاپک لے کر بیٹھ جاتے ہو۔“ روبی نے جواب دیتے ہوئے مسکرا کر ڈیشان کو دیکھا۔

”بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر دل کو نجانے کیوں صبر نہیں آتا۔ اس لئے چند ہفتے گزرنے پر بات کرنی ہی پڑتی ہے۔“ ڈیشان نے بھی مسکرا کر کہا۔ پھر فوراً ہی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”جی بات ہے تمہاری محبت میرے دل سے ختم نہیں ہوتی۔ بہت سمجھایا ہے دل کو میں نے۔ مگر وہ سمجھتا ہی نہیں۔ دل کی اپنی ضد ہے۔“

”تم دل کی ضد بھول کر اپنے خاندان میں کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لو۔ یقین کرو اس کے بعد دل بھی میل جائے گا اور تم بھی۔ مگر میری ناں یقین کرو کبھی ہاں میں نہیں بدلے گی۔“ روبی نے کافی کا خالی گلاس واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ڈیشان نے اس کی بات سنی مگر اب مزید کچھ بولنے کے بجائے سگریٹ کیس نکال کر روبی کے سامنے کی۔ کافی وہ روبی سے پہلے ہی ختم کر چکا تھا۔ روبی نے انکار کئے بغیر ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی تو ڈیشان نے ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دباتے ہوئے سگریٹ کیس واپس رکھتے ہوئے لائسنز نکال کر پہلے روبی کی سگریٹ سلگائی پھر اپنی سلگا کر بولا۔

”یار دل کو بہت سمجھانا ہوں۔ مگر وہ مانتا ہی نہیں۔ خیر ایک بار پھر آج سمجھا کر دیکھوں گا۔“ ڈیشان اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ روبی ہلکے ہلکے کش لینے لگی۔ ایسے میں چانک اس کی نظر ایک ہستی کی جانب اٹھی۔ پھر جیسے جم کر رہ گئی۔ کیلیدہی ہے۔ اس نے سوچا تھا۔



بلال آج ہی امریکہ سے وطن واپس آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دو امریکن دوست بھی آئے تھے۔ پاکستان کی سیاحت کیلئے۔ بلال نے ان کے سامنے اپنی وطن کی تعریف کچھ اس انداز میں کی تھی کہ جب بلال وطن واپس آئے تو وہ بھی بلال کے ساتھ ہی چلے آئے۔ بلال نے آنے سے پہلے گھر والوں کو ان کی اپنے ساتھ آمد کے بارے میں تحریر کر دیا تھا۔ اور گھر والوں نے بلال کی وطن واپسی کی خوشی میں اپنی روایت کے مطابق ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اس دعوت کا اہتمام لاہور میں مکمل بھائی کے گھر پر کیا گیا تھا۔ بلال جب آئے تو انہوں نے دیکھا تھا دعوت میں روپی کے سب گھر والے بھی موجود تھے۔ حتیٰ کہ روچی بھی اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ موجود تھی۔ زوہی بھی سلمان کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی تھے۔ شمشاد نصیر صاحبہ وہ سب لوگ ہی بلال سے بہت محبت کے ساتھ ملے تھے۔ روچی ایسی بے تکلفی کے ساتھ بلال سے ملی تھی اور ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”اگر تم شادی کر کے امریکہ جاتے تو ایسے دو بچے تمہارے اپنے بھی ہوتے۔“ بلال اس کی بات سن کر مسکرائے تو شمشاد نے نیگم اخلاق سے کہا۔

”اب بلال کی شادی میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔“

”بالکل بھی نہیں ہوگی۔ بس ہم یہاں سے ایئرٹ آباد پہنچتے تو آپ کو شادی کا کارڈ ملا ہی ملا۔“ نیگم اخلاق نے محبت سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا تو بلال بھی مسکرا دیا۔ اب انہیں اپنی شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

مگر ان کو اس بات پر حیرت تھی کہ روپی دعوت میں کیوں نہیں آئی تھی۔ پھر انہوں نے سوچا روپی کے گھر والے تو پہلے ہی روپی کا کہیں آنا جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اب تو وہ گھر سے بھاگنے کا جرم بھی کر چکی تھی۔ اس لئے اب تو گھر میں اس پر پہلے سے بھی زیادہ سختی ہوتی ہوگی۔ پھر انہوں نے سوچا یہ بھی تو ہو سکتا ہے ان لوگوں نے روپی کی شادی کر دی ہو۔ یہی وجہ تھی انہوں نے روپی کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مگر ان کو یہ سمجھن پھر بھی رہی کہ اگر روچی اپنے شوہر بچوں کے ساتھ آ سکتی ہے تو پھر روپی کیوں نہیں۔ نجانے کیوں وہ اس کو دیکھنا چاہتے تھے۔ شاید یہ جاننے کیلئے کہ وہ اب کیسی ہے۔ ویسی ہی گم صدم جیسی آخری ملاقات میں انہوں نے دیکھا تھا یا۔۔۔ دعوت کے بعد جب سب مہمان رخصت ہو گئے تو ان کے دونوں فرینڈز نے کلب جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ چونکہ وہ لوگ یہاں کے راستوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اس لئے ان کو خود کلب چھوڑنے آئے تھے۔ ان کو ایک ٹیکس پر بٹھا کر وہ خود واپس جانے کوڑے۔ چند قدم ہی ابھی اٹھا پائے ہوں گے کہ معانظر ایک ٹیکس پر بیٹھی ایک ہستی پر پڑی تو بلال کو یاد آ سکتی کی کیفیت سے دوچار ہو گئے۔ ناقابل یقین بات تھی۔ مگر سچ تھی۔ وہ روپی ہی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان چکے تھے وہ یقیناً روپی ہی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر اس کو حیرت سے دیکھنے لگے۔



روپی اس وقت ریڈ کلر کی میکسی میں ملبوس تھی۔ جس پر بے حد شوخ کام کیا گیا تھا۔ یہ میکسی نا تو سیلیولیس تھی اور نا ہی آستین والی۔ بس برائے نام ہی آستین تھی میکسی کی۔ اور اس کے ساتھ روپی نے میکا پ بھی بے حد شوخ اور گہرا کر رکھا تھا۔ اس کے کھلے شولڈر کٹ سیاہ جال تیز جگمگ کرتی روشنی میں کچھ زیادہ ہی چمک رہے تھے۔ کو کہ وہ پہلے ہی بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ مگر اب مزید اس خوبصورتی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ پہلے جب بلال نے اس کو دیکھا تھا تو وہ بہت زیادہ دلی پتلی ہوتی تھی۔ مگر اب جسم ذرا بھر گیا تھا۔ جسم کس کس بھرنے کو مٹا پائے نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ہم وہاں وقت بہت زیادہ بیلری لگ رہی تھی۔ کافی بے باک بھی کہ میز پر موجود ساتھی اس کے ہونٹوں میں دیبائی سگریٹ سلگا رہا تھا۔ جس کے ساتھ کافی پیٹے ہوئے وہ ہنستے مسکراتے ہوئے کافی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ بلال اپنی جگہ کو یا بت بن کر اس کو دیکھ رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ یہ جو مرہاں کے ساتھ ہے کیا وہاں کا شوہر ہے۔ مگر نہیں وہ جس حلقے میں تھی یوں کوئی شوہر اپنی بیوی کی سگریٹ نہیں سلگاتا تو پھر؟ وہاں کے آگے سوچ نہ سکے۔

بلال کو یوں اچانک اپنے سامنے پا کر روپی کی حالت بلال سے مختلف ناہوئی تھی۔ نظر اس پر پڑتے ہی روپی یوں چوکی تھی جیسے بجلی کے ٹنگے تاروں کو انجانے میں چھو لیا ہو۔ ناقابل یقین بات لگتی تھی کہ وہ جس کی تلاش میں اپنے شوہر کو کیا ایئرٹ آباد کے چپے چپے کی بھی خاک چھان آئی تھی۔ وہ یکدم خود ہی نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔

وہی ڈاڑھی والا نورانی چہرہ۔ آج یہ چہرہ دیکھ کر روپی کو سیم کی ماں نا عینک چشمہ بائی یاد آ گئی تھی۔ یعنی ٹھیک ہی کہا تھا سیم نے۔ بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں اندر سے کچھ باہر سے کچھ۔ چہرے پر لکھی شرافت کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اندر سے بھی شریف ہیں۔ اب ثبوت کی صورت میں روپی کے سامنے بھی اس وقت دو چہرے تھے۔ ایک نا عینک چشمہ کا اور دوسرا بلال کا۔ بلال جس کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں شاید بہت کم گو ہے۔ اس نے جو زبان اپنے سے آٹھ دس برس چھوٹی لڑکی کیلئے استعمال کی تھی۔ وہ تو لوگ طوائف کیلئے بھی استعمال نہ کرتے ہوں



گئے۔ اچانک روپی کے دل میں بلال کیلئے بے حد نفرت اٹھ کر آئی۔ اس نفرت کے زیر اثر وہ فوراً اپنی میز سے اٹھی پھر ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ سے ذیشان کا ہاتھ تھام کر خراماں خراماں چلتی ہوئی بلال کے مقابل آن کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈل دیں۔

چند لمحے تسخراڑانے والے انداز میں مسکرا کر بلال کو دیکھتی رہی۔ پھر بڑی داسے چہرے پر آنے والے بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا۔ پھر پورا منہ کھول کر دھواں بلال کے چہرے پر چھوڑتے ہوئے زہر خند سے کہا۔

”تم نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دو چار  
خود کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے

آوارہ ہاں تو پھر آوارہ ہی رہی

آئی ایم فلم سٹار روپی۔“ پھر حیران پریشان کھڑے بلال کو وہیں چھوڑ کر ذیشان کا ہاتھ تھامے یونہی کلب کے ہل سے باہر نکل گئی۔ وہ تو بال جھٹک کر دھواں ان کے چہرے پر چھوڑ کر شاعرنا کر باقاعدہ اپنا تعارف کروا کر چلی گئی تھی اور بلال کا دل تو کیا دماغ تک جھنجھلا اٹھے تھے۔ اس کا حلیہ دیکھ کر اس کا تعارف سن کر۔

امریکے جانے کے بعد وہ اپنے ہر خط میں روپی کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔ اور گھر والے ہر بار ان کی اس بات کو نظر انداز یا کول کر دیتے تھے۔ تنگ آ کر بلال نے باقاعدہ فون کر کے پہلے سب گھر والوں سے باتیں کیں اور پھر آخر میں ماں سے بات کرتے ہوئے روپی کے بارے میں پوچھا۔ تو کچھ دیر کے بعد انہوں نے بلال سے کہا۔

”بلال تو آخر کیوں فکر کرتا ہے روپی کی۔ وہ اپنے گھر کب کی واپس آ چکی ہے اور گھر والے بھی اس کی غلطی کو بھول کر معاف کرکے اس کو قبول کر چکے ہیں۔ ہاں وہ خود ہی واپس آئی تھی۔“ انہوں نے بلال کو پکارا۔ ”نہیں دلانے کو کہا۔“

”بس مجھے ہی خط میں لکھنا بھول جاتا تھا۔“

بلال پوچھنا چاہتے تھے کیسے ملی روپی؟ مگرفون کی لائن کٹ گئی اور ابھی ابھی روپی ان کو بتا کر گئی تھی کہ وہ کون ہے اور اس وقت کس محل میں ہے؟ شاعرنا نے کام طلب تو یہی تھا کہ تم نے آوارہ کہا تھا تو میں اس سے بھی بڑھ کر اس مقام پر ہوں کہ فلمسٹار کی جواز منگی ہوتی ہے وہ سب ہی جانتے ہیں۔ سارے غصے کے وہ ہل سے باہر آئے اور پھر فل سپیڈ پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

راستے میں وہ دکھ سے سوچ رہے تھے۔ امی جان آپ کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس بات کا خوف تھا کہ روپی کے نہ ملنے کا سن کر میں وطن واپس آ جاؤں گا؟ گاڑی روک کر وہ سیدھے ہال روم میں آئے جہاں وہ سب گھر والوں کو بیٹھا چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ سب ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔ سوائے بابا جان کے کہ وہ اپنے روم میں آرام کرنے جا چکے تھے۔ بلال ماں کے پاس رے پھر کہا۔

”امی جان! میں آتے ہی آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر گھر میں مہمانوں کی موجودگی کی وجہ سے پوچھ نہ سکا۔“ بلال اتنا کہہ کر رے تو بیگم خلاق نے فوراً پوچھا۔

”کوئی بات۔۔۔؟“ بیگم خلاق کتو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ان سے اس وقت روپی کے بارے میں بھی پوچھ سکتا ہے یا روپی ان کو وطن واپس کے پہلے ہی روم میں بھی سکتی ہے۔

”امی جان! آج کی دعوت میں روپی کے سارے گھر والے آئے ہوئے تھے۔ روجی بھی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آئی۔ مگر روپی ان کے ساتھ نہیں گئی۔ کیا آپ نے روپی کو اس دعوت میں انوائٹ نہیں کیا تھا؟“ بلال کی بات سننے ہی بیگم خلاق کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ انہوں نے بوکھلا کر پہلے مکمل پھر گل کو دیکھا۔ مگر وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ جبکہ بلال ان کے سر پر کھڑے تھے۔ پہلی بار انہوں نے بے بسی سے سوچا۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ ورنہ ایک جھوٹ کو نبھانے کیلئے بہت سارے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ ایسی ہی صورتحال کا اس وقت ان کو سامنا تھا۔ آج وہ جھوٹ نہ بول سکتیں تھیں کہ یہ جھوٹ صرف ایک رات کیلئے ہی چل سکتا تھا۔ صبح گھر آنے والے اخبارات میں بلال اس کی تصویریں دیکھ لیتا فرض کریں اگر اخبارات بھی میز سے اٹھا لیتے تو پھر گھر سے باہر جب جاتا تو سارے شہر میں اس کے فلم سینرز جو لگتے ہی رہتے تھے۔ ان کو دیکھ لیتا تو تب بھی اس کو بتا چل جاتا۔ وہ اس وقت سخت مشکل میں تھیں۔ سچ بولنا نہیں چاہتی تھیں اور جھوٹ صرف ایک رات کیلئے ہی چل سکتا تھا۔

”آپ سب حیرت کی تصویریں کیوں بن گئے ہیں۔ میرے سول کا جواب دیجئے۔ امی جان روپی کیوں نہیں آئی؟ اور وہ اس وقت کہاں ہے؟“ بلال نے اپنا غصہ ضبط کرتے



ہوئے پوچھا۔ نیگم خلاق نے ٹھنڈی آہ بھر کر بیٹے کو دیکھا اور شکست خوردہ لہجے میں کہا۔  
 ”بیٹا تمہارے جانے کے بعد میں نے روپی کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ مجھے نہیں ملی۔ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئیں۔

”وہ نہیں ملی۔“ بلال نے ان سب کو نظریہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بیٹا میری کوشش کے باوجود وہ نہیں ملی۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”امی جان! اس ملک کا کچھ بچہ روپی کو جانتا ہے۔ اتنی مشہور ہستی بن چکی ہے وہ۔ اور آپ کہتی ہیں وہ نہیں ملی۔ صاف یہ کیوں نہیں کہتیں کہ آپ نے روپی کو تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ امی جان! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ مجھ سے جھوٹ بول سکتی ہیں۔ آپ نے زبردستی مجھے ملک سے باہر بھیجنے کیلئے مجھ سے جھوٹ بولا کہ آپ خود روپی کو تلاش کریں گی۔ آپ نے یہ سب اچھا نہیں کیا امی جان! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ بلال کی باتوں کے جواب میں وہ سب خاموش تھے۔ یہ دیکھ کر بلال نے کہا۔  
 ”آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ میں ابھی ابھی روپی سے مل کر آ رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ہال سے نکل کر اپنے روم میں آئے۔ مگر بستر پر لیٹنے کے بجائے وہ ہارے پریشانی کے روم میں ٹھہرتے ہوئے روپی کے بارے میں سوچتے جا رہے تھے۔ اب ان کو کیا کرنا چاہئے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے۔ مل میں پرانی محبت عود کر آئی تھی۔

☆☆☆☆

بلال کو دیکھنے کے بعد روپی بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے گھر تک آئی تھی۔ گاڑی پورج میں روک کر وہ اس کو لاک لگائے بغیر ہی بھاگتی ہوئی اپنے روم میں آئی تھی۔ اور بیڈ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ یہ اس کی اپنی ہی تو خواہش تھی کہ ایک بار صرف ایک بار بلال سے اس کا سامنا ہو اور وہ حقارت بھری نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جائے۔ بلال حیرت زدہ سا اس کو دیکھتا رہ جائے۔ اس سلسلے میں روپی نے ایک لمحے کے عنوان سے اپنی ڈائری میں ایک نظم بھی نوٹ کی تھی اور یہ نظم آج بھی اس کو لفظ بلفظ یاد تھی اس نے لکھا تھا۔

اک حسرت ہے کہ میں تم سے ملوں  
 تمہاری آنکھوں میں لہرائے آشنائی چمک  
 یہ چمک لہرائے صرف ایک لمحے کو  
 اور بس یہی ایک لمحہ  
 میری زندگی کا حاصل ہو

اور اپنے منہ سے مانگا ہوا یہ لمحہ جب اس کی زندگی میں آ گیا تھا تو نجانے وہ کیوں نکھری گئی تھی۔ نوٹ سی گئی تھی۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ اماں روم میں داخل ہوئی اور کھانا لگنے کی اطلاع دی تو روپی نے آنسو صاف کرتے ہوئے بتایا۔

”اماں کھانا آج میں نے باہر فیشن کے ساتھ کھالیا تھا۔“ یہ سن کر اماں کچھ بھی کہے بغیر روم سے باہر چلی گئی تو روپی پھر بلال کے بارے میں سوچنے لگی۔ بلال کو دیکھ کر کیا کیا نہیں آ رہا تھا۔ ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ صبح مسجد جاتے بلال کا خاموش نظروں سے روپی کو دیکھنا۔ وہ کتنا بے تاب رہتا تھا۔ صرف اس کی آواز سننے کیلئے یہ سب دیکھ کر ہی تو روپی اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی۔ اور پھر یہ محبت اس کو گھر سے نکال کر تباہی کے اس مقام پر لے آئی تھی۔ جہاں اس میں اور بازار میں بیٹھی طوائف میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ وہ جو اس کو کہتا تھا عورت کے پاس فقط ایک عزت ہی ہوتی ہے۔ یہ بھی نار ہے تو اس میں اور بازار میں بیٹھی عورت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ یہ عزت اب اس کے پاس نہ رہی تھی۔ فلم لائن جو ان کرنے کے بعد اس کی یہ عزت بہت سارے کتے لوٹ کر لے گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ زندہ تھی۔ جس کی وجہ سے یہ ہوا تھا۔ وہ آج بھی ویسا ہی خوبصورت نسو بر اور باوقار تھا اور روپی اس کی محبت میں کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی۔ روپی نے سوچا۔

شکر ہے کہ وہ صبح کی فلائٹ سے لندن جا رہی ہے۔ ورنہ اگر یہاں رہتی تو بلال کا سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتی۔

بلال نے رات ہی سوچ لیا تھا کہ انہوں نے اپنے اس گناہ کا کیا کفارہ ادا کرنا ہے۔ اس کے باوجود وہ رات پر سکون نیند نہیں لے سکے تھے۔ صبح ناشتے کی ٹیبل پر سوائے بابا جان



کے انہوں نے کسی سے بھی بات نہ کی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ روپی کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے تھے۔ وہاں کو کہاں مل سکتی تھی۔ وہ ایک فلم سٹار تھی۔ کسی سٹوڈیو میں ہی اب اس کے ساتھ ان کی ملاقات ہو سکتی تھی۔ کتنی نفرت تھی اس کی آنکھوں میں۔ جب اس نے ان کو دیکھا تھا۔ کتنی حقارت تھی اس کے لہجے میں۔ مگر روپی سے ملنا اور اپنے گناہوں کا کفارہ دہا کرنا شاید ابھی بلال کے مقدر میں نہ تھا۔ روپی تو ان کو ناپتی تھی۔ مگر یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ وہ چونکہ کئی برسوں سے مسلسل کام کر رہی تھی اس لئے آج صبح کی فلائٹ سے آرام کرنے کی غرض سے تین ماہ کیلئے لندن چلی گئی ہے۔

بلال کو اس کے لندن جانے کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا تھا۔ اب افسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جانے والی تو جا چکی تھی۔ اور اب بلال بھی گھر واپس جانے کے بجائے اپنے دوستوں کے پاس ہٹل چلے گئے تھے۔ سارا دن انہوں نے اپنے دوستوں کو لاہور گھماتے ہوئے اور لاہور کی تاریخی عمارات دکھاتے ہوئے گزار دیا۔ رات کا کھانا ان کو ایک اچھے ریسٹورنٹ میں کھلانے کے بعد وہاں دونوں کو کلب چھوڑ کر رات گئے گھر واپس آئے تو سب گھر والے ابھی تک جاگ رہے تھے۔ بلال سمجھو وہ سب شاید انہی کیلئے جاگ رہے ہیں۔ کیونکہ رات ان کو بتا دیا تھا کہ وہ روپی سے مل چکا ہے۔ اس لئے یہ لوگ سوچتے ہوں گے میں آج بھی روپی سے ملنے گیا ہوں۔ شاید اس کو لے کر ہی اب گھر آؤں گا۔ یہ سچ بھی تھا۔ اگر روپی ان کو مل جاتی تو وہ کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھا بچھا کر منا کر اپنے ساتھ گھر لے آتے۔ مگر وہ تو ان کے آتے ہی لندن روانہ ہو چکی تھی اور اب اس وقت گھر والوں سے رکمی طور پر ان کے جاگنے کا سبب دریافت کرنا ضروری تھا۔

”خیریت تو ہے آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔“

”تم صبح کے گئے اب تک کہاں تھے؟“ گل نے اس کو گھورتے ہوئے غصے سے پوچھا۔

”کیا ہوا امی جان؟! بلال نے گل کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ماں سے پوچھا۔ رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اب بلال پریشان ہوا تھا۔

”تمہاری بلا سے کوئی مرے یا جئے۔ تم اپنی آوارگی کرو۔ اس وقت آدھی رات کو بھی واپس آنے کی کیا ضرورت تھی؟“ بیگم اخلاق نے ناراضی سے کہا۔

”امی جان! آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میرے ساتھ امریکہ سے میرے دو دوست بھی آئے ہیں۔ سارا دن ان کو لاہور گھماتے اور لاہور کی تاریخی عمارات دکھاتے بیت گیا۔ اب کھانا کھانے کے بعد ان کو کلب چھوڑ کر سیدھا گھر واپس آ رہا ہوں۔“ بلال نے ان کی خفگی دور کرنے کو وضاحت کی۔ پھر ماں کے بجائے گل سے پوچھا۔

”بات کیا ہوئی ہے۔ بھابی جان! کیوں پریشان ہیں آپ سب۔“

”بابا جان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور مکمل ان کو لے کر ہسپتال گئے ہیں۔ تمہارا تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ نہ ہی تم بتا کر گئے کہ دوستوں کے پاس جا رہے ہو۔“ گل نے سوکاری سے بتایا۔

”اچھا۔“ اب بلال کو اپنی غلطی کا احساس ہوا پھر کہا۔

”لیکن صبح جب میں گھر سے ناشتے کے بعد گیا تو وہ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔“

”بندے کا کیا بھروسہ مٹی کا کھلونا پل میں تولہ پل میں ماشہ۔“ گل نے افسردگی سے کہا۔ بلال نے ان سے ہسپتال کا پوچھا پھر کہا۔

”اچھا تو میں بھی اس ہسپتال جاتا ہوں۔“ وہ جلدی سے باہر جانے کو لپکے تو اسی وقت فون کی گھنٹی بج گئی۔ بلال نے رک کر گل کو دیکھا پھر خود آگے بڑھ کر ریسورٹ اٹھالیا۔ دوسرے ہی لمحے ماؤتھ پیس سے مکمل کی سوکرا آواز نا بھری۔

”تم کہاں تھے اب تک میرے بھائی۔“

”بابا جان کیسے ہیں پہلے یہ بتائیں؟“ بلال نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔ دوسری جانب کچھ دیر سکوت رہا پھر مکمل بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

”بلال بابا جان ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“ بلال نے بڑے حوصلے سے یہ خبر سنی پھر بڑے ضبط سے پوچھا۔

”کب ہوا یہ سب۔“

”کیا ہوا؟“ گل نے جلدی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔ مارے صدمے کے بلال سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ گل نے کسی انہونی کا سوچ کر جلدی سے ریسورٹ کے ہاتھ سے چھین کر



خود چچ کر پوچھا۔

”کیا ہوا؟ بابا جان کیسے ہیں؟“

”ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بلال سے کہو بس فوراً یہاں ہاسپٹل میرے پاس چلا آئے۔“ یہ کہہ کر کمال نے فوراً فون بند کر دیا۔ تاکہ گل مزید کوئی اور سوال نہ کر دے بابا جان کے بارے میں۔

”امی جان بابا جان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔“ گل نے فون بند کر کے ان کو بتایا تو بیگم اخلاق اٹھتے ہوئے بولیں۔

”چلو ہم دونوں بھی بلال کے ساتھ ہاسپٹل چلتے ہیں۔“ ان کی یہ بات سن کر بلال جو صدمے کی حالت میں گم سم کھڑے تھے ہوش میں آ گئے۔ اور جلدی سے آگے بڑھ کر ماں سے کہا۔

”امی جان! اس وقت اتنی رات گئے آپ لوگوں کا جانا مناسب نہیں۔ آپ صبح چلی جائیں۔ اس وقت میں جو جا رہا ہوں وہاں۔ جاتے ہی آپ کفون کروں گا۔ اور بابا جان کی طبیعت کا بتا دوں گا۔“

”مگر صبح تک نہیں رک سکتے۔ تمہارے بھائی بتا رہے تھے کہ ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔“ گل نے روتے ہوئے کہا۔ وہ اخلاق خان کی سگی بیٹی تھی اور پھر بہو بھی۔

”بھابی! آپ سمجھتی کیوں نہیں؟ اس وقت آپ دونوں کا جانا مناسب نہیں۔ اس وقت آپ گھر پر ہی رکیں۔ ہاں اگر ان کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہوئی تو میں آپ کو آکر لے جاؤں گا۔“ پھر جلدی سے باہر چلا گیا۔ ہاسپٹل میں وہ کمال بھائی کے گلے کر پچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اور کہتا رہا اب میں آیا ہوں تو بابا جان ہمیشہ کیلئے چلے گئے ہیں۔ وہ چند روز تو مجھ اپنی خدمت کرنے کا اپنے پاس بیٹھنے کا اپنے دکھ کچھ کہنے سننے کا موقع دیتے۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔“ کمال کو کہہ خود بھی دکھی ہو رہے تھے۔ مگر بڑے تھے اس لئے بلال کی یہ حالت دیکھ کر خود کو سنبھالتے ہوئے بھائی کو تسلی دی۔

”صبر کرو بلال! تم مرہو۔ زندگی خدا کی دی ہوئی امانت ہے۔ وہ جب بھی چاہے ہم سے اپنی امانت واپس لے جائے۔ ہم کون ہوتے ہیں اس کے سامنے شکوہ کرنے والے۔“

”بھائی جان! امی بھابی بہت پریشان ہیں۔ میں ان کو بابا جان کے خدمت ہونے کی خبر کیسے دوں گا؟ مجھ میں تو یہ حوصلہ نہیں۔“ بلال کو کسی طور صبر نہیں آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کمال نے کہا۔

”ان کو یہ خبر میں دے دوں گا۔ مگر تم مرد بخیر رہے بھائی! اور مردوں کی طرح ہی اس صدمے کو برداشت کرو۔ ہمیں بابا جان کو لے کر واپس ایسٹ آباد بھی جانا ہے۔“ یہ سن کر بلال سنبھل گئے۔

اس کے بعد دونوں بھائی ٹرک کا انتظام کرنے کے بعد خان اخلاق خان کی میت لے کر گھر آئے تو پورا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ سبھی روتے ہوئے یونہی میت لے کر ایسٹ آباد کی جانب روانہ ہو گئے۔ ساتھ شمشاد اور نصیر صاحب بھی تھے۔ بلکہ سلمان بھی۔ ایسٹ آباد میں ان کا اپنا آبائی قبرستان تھا۔ اور خان اخلاق خان کی وصیت کے مطابق ان کو انہی کے قبرستان میں دفن کرنا تھا۔ وہ وصیت نہ بھی کرتے تب بھی یہ تدفین ان کے اپنے علاقے میں ہی جا کر ہوتی تھی۔ لاہور میں تو وہ سب مسافر تھے۔ ایسٹ آباد تک خواتین تو گریہ زاری کرتے ہی گئی تھیں۔

خان اخلاق خان کی تدفین کے چند روز بعد ہی بلال ماں کو ڈیہروں تسلیاں دیتے ہوئے سعودیہ روانہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ امریکہ سے پاکستان واپسی آنے سے پہلے ہی انہوں نے سعودیہ جانے کیلئے کمپنی کا ایگری منٹ سائن کر لیا تھا۔ اب سائن کر دیا ایگری منٹ کے مطابق ان کا ڈیوٹی پر حاضر ہونا بہت ضروری تھا۔ سو وہاں کو تسلیاں دے کر چلے آئے تھے کہ ان کے کدے یا چند روز مزید لیٹ ہونے سے بابا جان واپس آ سکتے تھے۔ سو وہ چلے آئے تھے۔

خان اخلاق خان کے چہلم کے بعد باقی سب گھر والے بھی لاہور آ گئے۔ ان میں بیگم اخلاق بھی شامل تھیں۔ اب مستقل طور پر کمال گل کے پاس رہنے لگا ہوا آگئی تھیں کہ اب ایسٹ آباد کی بڑی حویلی میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ نہ بلال تھا اور نہ ہی زندگی کا ساتھی پاس رہا تھا۔ وہ تو ایک منٹ میں منوں مٹی تلے جاسوئے تھے اور اب وہاں رہتے ہوئے دل گھبراتا تھا۔

☆☆☆☆

سعودیہ آنے کے بعد اگرچہ بلال بہت بڑی ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود بابا جان کے ساتھ ساتھ اب ان کو روپی بھی شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ کچھ بھی تھا روپی ان کی پہلی



محبت تھی۔ اگر ان کے اور روپی کے درمیان برسات کی وہ طوفانی رات نہ آ جاتی تو وہ روپی کے ساتھ شادی کرنے کا پروگرام قائل کر چکے تھے۔ اب سب کچھ جاننے کے بعد تو روپی کو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ روپی جو دوسروں کیلئے آوارہ تھی۔ مگر ان کو پورا یقین تھا وہ آوارہ نہیں تھی۔ اس کو ماحول ہی ایسا ملا تھا کہ چھوٹی عمر ہونے کی وجہ سے وہ گمراہ ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن بھٹک گیا تھا۔ ایک ایسا گھر جہاں ماں اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے کے بجائے زیادہ وقت گھر سے باہر رہتی ہو اور ایسی صورت میں بچہ اگر بھٹک جائے تو قصور وار بچہ نہیں ماں ہوتی ہے۔ جبکہ گھر میں بڑی بہن بھی لوڑ کر میسر ہو۔ ان کی نظر میں تو مجرم روتی ہی تھی۔ جس کی وجہ سے روپی کا ذہن متاثر ہوا تھا۔ یا پھر وہ خود کو روپی کا مجرم سمجھتے تھے۔ روپی کو وہ نرمی سے سمجھا سکتے تھے یا پھر راہ راست پر لانے کیلئے اس کے ساتھ شادی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے کیا تو وہ جرم جس کا کفارہ ادا نہ کر پا رہے تھے۔ اگرچہ وہ روپی سے ملے بغیر سعودیہ آئے مگر ان کے ارادے اب بھی وہی تھا۔

وہ اب ہر حال میں روپی کو اپنانا چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے گھر والے انہیں کبھی روپی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ ہر حالت میں اس کی مخالفت کریں گے۔ مگر انہیں اب کسی کی پروا نہ رہی تھی کہ جو بوجھ ان کے دل و دماغ اور ضمیر پر تھا اس کو گھر والے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اور پھر وہ ان کی محبت بھی تو تھی۔ اپنی محبت کو حاصل کرنے کیلئے وہ تین ملاحد ہی چھٹی لے کر پاکستان واپس آ گئے تھے۔ کیونکہ ان کو بتا چل چکا تھا کہ روپی پاکستان پہنچ چکی ہے۔ وہ سمجھتے تھے مزید دیر کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ چونکہ وہ گھر والوں کو اطلاع کئے بغیر پاکستان آئے تھے اس لئے سب گھر والے ان کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ ان کی والدہ نے پوچھا۔

”تم اچانک کیسے آ گئے خیریت؟“

”بالکل خیریت۔ آپ سب اپنی سناٹیں کیا حل ہے آپ کا؟“ بلال نے سکون سے پوچھا۔

”ہم سب ٹھیک ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا تو بلال نے کہا۔

”امی جان میں چھینچ کر کے آتا ہوں۔ آپ جلدی سے کھانا لگوا دیں۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ باقی سب باتیں کھانے کے بعد ہوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے روم میں چلے گئے تھے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب وقت وہ پل رہا تھا۔ نیگم خلاق نے ان سے پوچھا۔

”ہاں بھی اب کہو یہ تم تین ملاحد ہی کیسے چلے آئے؟“

بلال ایک تو جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ دوسرا انہوں نے کبھی ماں سے کوئی بات چھپائی نہ تھی اور پھر وہ روپی سے شادی کر رہے تھے۔ یہ بات چھپانے والی تھی ہی نہیں۔ یہی وجہ تھی انہوں نے ان سے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور اپنا سارا پروگرام صاف صاف بتا دیا کہ وہ روپی کے ساتھ شادی کرنے کیلئے تین ملاحد آئے ہیں۔ نیگم خلاق کو پہلے ہی شک تھا کہ وہ روپی کی وجہ سے آئے ہیں۔

”بلال تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میرے جیتے جی یہ نہیں ہو سکتا۔“ نیگم خلاق نے غصے اور نفرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

”امی جان! آپ کا غصہ بلا وجہ ہے۔ اگر آپ محسوس کریں تو قصور آپ ہی کا ہے۔ اگر آپ بروقت روپی کو تلاش کر کے اس کے والدین کے سپرد کر دیتیں تو یقین کریں میں کبھی بھی روپی سے شادی کی خواہش نہ کرتا۔ مگر اب تو یہ شادی ایک مجبوری ہے۔ آپ منع نہ کریں کیونکہ اس طرح مجھے دکھ ہوگا کہ میں نے آپ کی بات نہیں مانی۔ میں شادی کا پکا پکا فیصلہ کر کے ہی پاکستان آیا تھا۔ جس کو میں کسی قیمت پر بدل نہیں سکتا۔“ بلال نے متانت سے کہا۔

”کیوں منع نہ کروں۔ میں تمہاری ماں ہوں اور مجھے وہ آوارہ لڑکی پسند نہیں۔“ نیگم خلاق نجانے اور بھی کیا کہتی کہ مکمل نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بلال سے پوری سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

”کیا واقعی تم روپی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

”آپ کو شک کیوں ہے؟ میں روپی سے شادی کرنا چاہتا نہیں ہوں بلکہ روپی کے ساتھ شادی کرنے ہی پاکستان آیا ہوں۔“ بلال نے تھوڑے خشک لہجے میں کہا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے اگر انہوں نے ذرا سی بھی نرمی دکھائی تو گھر والے سخت ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے انہوں نے اپنا لہجہ پہلے ہی سخت اور خشک رکھا تھا۔ شادی ان کا ذاتی مسئلہ تھا اور روپی جو بھی تھی جیسی بھی تھی۔ وہ روپی سے خود شادی کر رہے تھے۔ کسی اور کو تو شادی کرنے کا نہیں کہہ رہے تھے۔



”بلال! پیلیز! میرے بھائی! میری بات پر ذرا غور کرو۔ کہاں ہمارا صاف ستھرا گھر تھا اور کہاں گھر سے بھاگی ہوئی وہ بدنام لڑکی؟“ کمال نے ایک بار پھر سمجھانا چاہا۔

”پیلیز بھائی جان! خاموش ہو جائیں۔ مزید ایک لفظ بھی نہ کہئے گا۔ آپ کچھ نہیں جانتے۔ وہ آج جو بھی ہے؟ جیسی بھی ہے؟ میری وجہ سے ہے۔ وہ گھر سے صرف میری وجہ سے بھاگی تھی۔ کتنے افسوس کی بات ہے وہ لوگ جو ایک معصوم لڑکی کی بربادی کا ذمہ دار ہیں۔ وہی اپنے آپ کو اس معاشرے کا صاف ستھرا اور شریف شہری سمجھتے ہیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ کمال نے سب کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ وہ سمجھ چکے تھے کہ بلال اب بارانے والا نہیں ہے۔ تاہم وہ آخری بار اس کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھانا چاہتے تھے۔ اس لئے بہت سوچ کر بولے۔

”دیکھو بلال! کوئی شادی تمہارا ذاتی مسئلہ ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ کل جب تمہارے بچے ہوں گے تو پھر شاید تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ کیونکہ لوگ روپی کو گھر سے بھاگی ہوئی بدنام لڑکی کے حوالے سے جانتے ہیں۔ اور اس بات کا اثر تمہارے بچوں پر بھی پڑ سکتا ہے۔ دیکھو دنیا میں رہتے ہوئے دنیا داری کا خیال تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”یہ میرا اور میرے بچوں کا مسئلہ ہوگا۔ میں ان کو بتا دوں گا کہ ان کی ماں ان کے باپ کی غلطی یا غلط رویے کی وجہ سے گھر سے بھاگی تھی۔ پیلیز آپ مجھے روپی سے شادی کرنے دیں۔ کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ میں اگر سعودیہ سے اس وقت آیا ہوں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ مجھے ہر حال میں روپی سے ہی شادی کرنی ہے۔“ بلال نے ٹھوس لہجے میں کہا اور پھر اٹھ کر اپنے روم میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی بیگم خلاق کمال پر برس پڑیں۔

”یہ تم نے کیا کیا کمال؟ میں ہرگز روپی کو اپنی بہو تسلیم نہیں کروں گی۔ بلکہ میری زندگی میں یہ شادی کبھی نہیں ہوگی۔“

”صبر کریں امی جان! صبر۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آپ نے دیکھا نہیں کس قدر سخت اور خشک لہجہ تھا اس کا۔ کتنا گستاخ ہو رہا تھا وہ۔ اگر آپ اس وقت مزید ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتیں تو بات بگڑ سکتی تھی۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں بلال! ایسٹ آباد سے نہیں سعودیہ سے آیا ہے۔ وہ بھی تین ماہ بعد روپی سے صرف شادی کرنے کیلئے بھر وہ ہماری کوئی بات کیسے مان سکتا ہے۔“

”اگر وہ میری بات نہیں مانے گا تو میں جان دے دوں گی۔ مگر اس آوارہ لڑکی کو اپنے گھر میں کبھی گھسنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ خان صاحب نہیں رہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بلال کو اپنی من مانی کرنے دوں گی۔ ایسا میری زندگی میں بھی نہ ہوگا۔ بے شک بلال ساری زندگی شادی بنا کرے۔“ بیگم خلاق نے غصے سے کہا۔

”پیلیز امی جان! آپ سے کہا تو ہے آپ صبر کریں۔ روپی سے شادی کرنا خود بلال کی خواہش ہے۔ روپی کی نہیں۔ اسی لڑکی جو والدین خاندان کی عزت تارنا کر کے گھر سے بھاگ گئی ہو اپنی آزاد زندگی گزارنے کیلئے وہ پابندی کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ جب آوارگی کا چکر پڑ جائے تو یہ بڑی مشکل سے چھوٹتا ہے۔ اس وقت بلال جذبات کی رو میں بہہ کر روپی کے ساتھ شادی کی ضد لگائے ہوئے ہے۔ آپ ذرا دیکھئے تو صحیح ہوتا کیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے روپی خود ہی بلال کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دے گی۔ وہ اس وقت جو زندگی گزار رہی ہے شادی کے بعد یہ ممکن نہیں ہوگی۔“ کمال نے ایک بار پھر ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”اور اگر روپی نے بلال کے ساتھ شادی کرنے سے انکار نہ کیا تو؟“ گل نے یوں خوف زدہ لہجے میں کہا جیسے روپی کا نہیں کسی چڑیل کا ذکر کر رہی ہو۔

”تو پھر میں خود ہی یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔ کسی بھی قیمت پر۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے میں ہر حال میں یہ شادی روکوں گا۔“ کمال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”مگر تم یہ شادی روکو گے کیسے؟“ بیگم خلاق نے فوراً پوچھا۔

”امی جان! میں بھی پٹھان کا خون ہوں۔ صرف بلال کو پتہ نہیں چلنا چاہئے۔ آپ یقین کریں میں ہر جائز ناجائز طریقے سے یہ شادی روکنے کی کوشش کروں گا۔ کہنا میں کسی طور پر شادی نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میرا آپ کے ساتھ وعدہ ہے۔“ کمال نے کہا تو بیگم خلاق مطمئن ہو گئیں۔ ان کے ساتھ ساتھ گل بھی کہ اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی جہاں وہ اور اس کی بیٹی رہتی ہے وہاں گھر سے بھاگ جانے والی اور طوائف بن کر فلموں میں ناچنے والی لڑکی بھی آ کر رہے۔

ادھر یہ تو تھے ان کے پروگرام۔ ادھر بلال تیار ہو کر ان لوگوں کو بتائے بغیر اس کلب میں چلے آئے تھے جہاں تین ماہ پہلے روپی ملی تھی۔ جہاں برسوں بعد روپی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ آخری ملاقات میں جو نفرت بلال کی آنکھوں میں اس کیلئے بھری تھی۔ اب وہی نفرت روپی کی آنکھوں میں انہیں اپنے لئے نظر آئی تھی۔ وہ کلب آئے تو روپی کی میز ابھی خالی تھی۔ وہ رات گئے تک کلب میں بیٹھے رہے مگر روپی نہ آئی۔ بلال تو یہی سوچ کر آئے تھے کہ وہ روزانہ اس کلب میں آتی ہوگی۔ مگر وہ آج نہیں آئی تھی۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ وہ شاید



کبھی کبھار ہی یہاں آتی ہو اور پھر اس بات کی تصدیق بھی ایک ویٹر نے کر دی تو وہ رات گئے ماپوی سے اٹھ کر گھر آ گئے تھے۔

انکی صبح ناشتے سے فارغ ہو کر گاڑی لے کر اس کی تلاش میں سٹوڈیو چلے گئے۔ مگر وہ نہیں ملی تھی۔ کتنے ہی سٹوڈیوز گھومنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ اپنی آؤٹ ڈور شوٹنگ کیلئے مری گئی ہوئی ہے۔ اور چند روزا دھری رک گئی۔

یہ سنتے ہی بلال نے گھر والوں کو بتائے بغیر گاڑی کا رخ مری کی جانب موڑ لیا۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ وہ چند روزا دھری رک گئی اور بلال تو اب ایک دن بھی ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے گھر والوں کو بتائے بغیر مری کیلئے روانہ ہو گئے تھے اور پھر بہت تلاش اور جستجو کے بعد بلال آخر روپی کو ڈھونڈنے اور اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

یہ لوکیشن ایک پہاڑی کی تھی۔ ایک شاٹ دینے کے بعد روپی سب سے الگ تھلگ بیٹھی آرام کر رہی تھی۔ اس وقت اس نے لباس بھی وہاں کی مقامی عورتوں کا سا پین رکھا تھا۔ کمرے قلمی میک اپ کے باوجود وہ اچھی لگ رہی تھی۔ بلال آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچ ہی تھے کہ اچانک وہ بٹے کئے نو جوانوں نے ان کا راستہ روک لیا۔

”کہاں چلے صاحب!“ ان میں سے ایک نے بلال کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

”سنو! مجھان سے یعنی روپی سے ملنا ہے۔“ بلال نے ہاتھ سے روپی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس کے باڈی گارڈز سے کہا۔

”مگر میڈم روپی کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔“ انہوں نے بتایا۔

”دیکھو میں ان کا عزیز ہوں۔ وہ مجھے جانتی ہیں۔“ بلال نے اب کے ذرا اونچی آواز میں مگر سنجیدگی سے کہا تا کہ ان کی آواز روپی تک پہنچ جائے۔ آواز واقعی روپی تک پہنچ گئی تھی۔

بلال کی آواز سن کر وہ چونک پڑی پھر پلٹ کر دیکھا تو تھکا تھکا سا بلال آج پھر اس کے سامنے تھا۔ اسٹارٹ گرین کلر کے سوٹ میں وہ بڑا بڑا سا لگ رہا تھا۔ روپی اس وقت اسے یہاں دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحوں کی یونہی ان کی جانب دیکھتی رہی۔ بلال بھی اس کو دیکھ رہے تھے۔ اس کی ہاں کا نظارہ میں وہیں کھڑے تھے۔ پھر نجانے کیا سوچ کر روپی نے ان کا پنے پاس آنے کی اجازت دیدی۔ بلال بے حد بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اس کے دروہ بیٹھ کر اس کو بغور دیکھنے لگے۔ پہلی ملاقات میں روپی نے بڑا تلخ شعر پڑھا تھا۔ مگر اس وقت وہ خاموش تھی۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ پھر جواس نے بولنے کیلئے منہ کھولا تو بند کرنا بھول گئی تھی۔

وہ کونسا نشتر تھا جو روپی نے ان کے دل پر نہیں آزمایا تھا۔ بظاہر اس نے وہ سب باتیں ہستے ہوئے کی تھیں۔ مگر وہ باتیں نہیں زہر تھا۔ جو باتوں کی صورت میں اس نے بلال کو پلایا تھا۔ بلال چونکہ سمجھتے تھے کہ وہ روپی کے مجرم ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ آج اس مقام پر بھی اس لئے وہ ضبط سے یہ سب سنتے رہے اور سوچتے رہے۔

”کیا عجیب تعلق ہے وہ جب روپی سے محبت کرتے تھے تو اس کا اپنی محبت کے بارے میں ناپتا سکھاتا آج اس کی بی بیڑا لودیا میں سننے کے باوجود یہ نہ کہہ سکتے حالانکہ کہنا چاہتے تھے۔ تمہیں خبر نا ہو گی عقل و دانش کے باوجود

برسوں تیری تلاش میں پاگل پھرے ہیں ہم

کہتے بھی تو اس کو کونسا یقین کرنا تھا اس لئے وہ کچھ کہنے کے بجائے اس کی باتیں سنتے ہوئے محویت سے اس کو دیکھتے رہے۔ یہ تو وہ سعودیہ ہی سے طے کر کے آئے تھے کہ وہاں روپی کی تلاش میں جا رہے ہیں تو پھر خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ وہ روپی کو شادی کیلئے منا کر ہی رہیں گے۔ وہ تب تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک وہ شادی کیلئے راضی نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے انہوں نے روپی کی ساری باتیں محل سے سنی تھیں۔ روپی نے ان کے بیٹھتے ہی ان سے پوچھا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس نے بلال کو مسلسل اپنی جانب دیکھتے پا کر پوچھا تھا۔ بلال اس کی بات سن کر چپ رہے۔ جانتے تھے اس کے دل میں ان کیلئے نفرت کا غبار بھرا ہوا تھا۔ بات کرنے کے بعد اس نے اپنے سگریٹ کیس کو کھول کر ایک سگریٹ نکل کر اپنے ہاتھوں میں دبائی پھر سگریٹ کیس بلال کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ پسند کریں۔“ بلال نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے نفی میں سر ہلایا تو روپی نے سگریٹ کیس بند کرتے ہوئے کہا۔

”میں یہ تو بھول ہی گئی تھی کہ آپ بہت نیک شریف پانچ وقت کے نمازی مرد ہیں۔ یہ کام یہ مشاغل تو ہم جیسے آوارہ لوگوں کے ہیں۔“ اس نے سگریٹ کیس رکھ کر لائٹرز سے اپنی سگریٹ سلگائی۔ پھر لائٹرز بند کر کے ایک طویل کش لے کر سارا دھواں بلال کے چہرے پر ڈال کر ہنسنے لگی۔ وہ اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں تھی۔ اس لئے اس سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے خود ہی اپنی کہی ہوئی بات کا جواب دیتے ہوئے بولی۔



”مجھ کو دیکھ کر یہی سوچ رہے ہونا کہ میں بہت بدل گئی ہوں ہے۔“ اور بلال ایک بار پھر سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش ہو کر صرف سگریٹ کے کش لیتی رہی پھر پوچھا۔  
 ”ارے تم مہمان ہو کچھ ہو گے۔“ بلال نے پھر نفی میں سر ہلا دیا مکمل ہے۔ وہ ایک اونچا قہقہہ لگا کر بولی۔  
 ”تم تو خوب بولنا جانتے تھے۔ وہ بھی نان سٹاپ پھر یہ چپ کیسی؟ کیا گلا خراب ہے؟“ اور بلال جو مارے بے بسی کس کی باتیں سن رہے تھے بول پڑے۔  
 ”روبی! میری سمجھ میں نہیں آتا کن الفاظ کا سہارا لے کر تم سے بات کروں۔“

مگر اس نے جلدی سے بلال کی بات کاٹ دی اور کہا۔

”روبی نہیں ارے کیا بھول گئے اس آخری ملاقات کو جس میں تم نے مجھے ایک نام عطا کیا تھا۔ وہی برسات کی طوفانی رات وہ رات بھولنے والی نہیں کہ۔“  
 ”پلیز روبی! پلیز!“ بلال نے یکدم تڑپ کر کہا۔

مگر روبی تو گویا پتھر کی ہو چکی تھی۔ شاید ہر احساس سے عاری بھی۔ اس لئے ایک بار پھر کہا۔

”روبی نہیں آوارہ۔“ اس نے مسکرا کر ٹھنڈے لہجے میں ایک بار پھر صحیح کی۔ پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”تمہارا رکھا ہوا یہ نام تو میرے لئے بہت لگی ثابت ہوا۔ میں گمنامی سے نکل کر شہرت کس مقام پر آ پہنچی۔ یہی وجہ ہے مجھے تمہارا یہ رکھا نام بہت عزیز ہے۔“ بلال کچھ کہنے کی بجائے اذیت سے اس کو دیکھتا رہا اور وہ بولتی رہی۔

”دیکھو بلال! تمہارا ساندازے کتنے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ تم تو کہتے تھے دنیا کا کوئی مرد مجھ کو نہ کما جائے۔ میں اپنی شناخت نہیں بنا سکتا۔ جبکہ آج ساری دنیا کے مرد میری ایک جھلک دیکھنے کو ترستے ہیں۔ تڑپتے ہیں۔ میرا یقین جانو وہ مجھے صرف دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ اپنی شناخت بھی بنانا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے اس بازار سے اٹھا کر اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ بازار ہی تو ہے جہاں میں گھر سے نکل کر آ بیٹھی تھی۔ صرف تمہاری مہربانی سے اور اب میں تمہیں بتاؤں۔ وہ بے شک مجھے اپنی شناخت بنانا چاہتے ہیں۔ مگر میرے پاس وقت کب ہے ان فضول باتوں کیلئے۔ شاید فضول بات ہی تو ہے میرے جیسی آوارہ کیلئے۔“

وہ لفظ آوارہ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”یوں بھی آوارگی گھر کے باہر اچھی لگتی ہے۔ گھر کے اندر نہیں۔ ورنہ کم بخت ایک دفعہ آوارگی کی عادت پڑ جائے تو پھر چھوٹی کب ہے۔ دیکھو بلال! عادت تو پھر عادت ہی ہوتی ہے۔ تمہیں میری باتوں کی سمجھ آ رہی ہے نا۔“ وہ بے ٹکان بولتی رہی۔ بلال اس میں اس جگی کٹاں لڑکی کو تلاش کرتے رہے جو باطل دیکھ کر ہی ڈرجاتی تھی۔ جو اندھیری رات اور طوفان سے غمزہ ہو کر ان کے پاس آئی تھی پتاہ کیلئے۔ اس روبی میں اور اس روبی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ روبی ہر وقت ڈری ڈری سبھی رہتی تھی۔ مگر یہ روبی تو بہت مند اور بے باک تھی۔ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ وہ روبی کو دیکھتے ہوئے افسوس سے سوچ رہے تھے۔ اور پھر چونک پڑے۔ روبی ہنستے ہوئے ان سے پوچھ رہی تھی۔

”کیا اتنی دور سے تم مجھے صرف دیکھنے ہی آئے ہو۔ اگر یہی بات تھی تو پھر اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ لاہور کے ہر ایک سٹال پر میری تصویروں سے بھرے فلمی پرچے موجود ہوتے ہیں۔ ایک فلمی رسالہ خرید کر میری تصویر دیکھ لی ہوتی۔“ پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

”ویسا ایک بات تو مجھے بتاؤ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں۔ یقیناً تم نے وہاں لاہور کے سٹوڈیوز کے چکر لگائے ہوں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔“ وہ خود ہی سوال کرتی تھی خود ہی جواب دے دیتی تھی۔ اب پہلی بار بلال نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

”روبی پلیز! یہاں سے میرے ساتھ کسی اور جگہ چلو۔ میں تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں جو یہاں سب کے سامنے نہیں ہو سکتیں۔“

”یہ کیا روبی روبی لگا رکھی ہے تم نے۔ سننا نہیں میرا نام آوارہ ہے۔ اور یہ تم نے رکھا تھا۔ اتنی جلدی اپنا رکھا نام بھول گئے۔“ روبی نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

”خدا کیلئے روبی! میرے ساتھ چلو۔ مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ پلیز پلیز!“ بلال نے یہ کہتے ہوئے منت بھری نظروں سے روبی کو دیکھا تو وہ بکڑ گئی۔

”سنو میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔ میرے پاس نام ہی نہیں تم جیسے فضول لوگوں کی فضول باتیں سننے کا۔“ روبی نے بے رخی سے کہا۔

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو روبی! میری بات مان لو۔“ بلال نے التجا کرنے والے انداز میں کہا۔

”اوہو بھئی کیا سمجھنا چاہتے ہو۔“ روبی نے بے دردی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اور بلال کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی ہدایت کار نے اگلے سٹاٹ کیلئے روبی کو آواز دی تو روبی اٹھتے



ہوئے بولی۔

”چاہو تو تم بیٹھ سکتے ہو اور اگر جانا چاہو تو۔۔۔۔۔“ وہاں سے طور پر جملہ اٹھوڑا چھوڑ کر چلی گئی۔ بلال وہیں بیٹھ کر اس کو دیکھنے لگے۔ سین فلم بند کروانے کے بعد روٹی واپس آئی تو بلال وہیں بیٹھے تھے۔

”ارے بھی تم گئے نہیں۔“ روٹی نے دوبارہ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے پوچھا۔ بلال چند ساعتیں روٹی کو دیکھتے رہے۔ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ وہاں کیلے میں ان کے ساتھ کبھی نہیں جائے گی۔ یوں وہ جس کام کیلئے اتنی دور سے آئے ہیں اس کا دھوڑا رہ جانے کا خدشہ تھا۔ اس لئے ایک کبری سانس لے کر بولے۔

”سنو روٹی اپنی زیادتیوں کی معافی مانگنے کا تواب شاید وقت نہیں رہا مگر۔۔۔۔۔“ بلال نے رک کر روٹی کو دیکھا اور ٹھوس لہجے میں کہا۔

”مگر میں بہر حال تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی فی الفور۔“

روٹی نے حیران ہو کر ان کی بات سنی۔ چند لمحے حیرت میں گم رہی پھر اس نے اپنی اس حیرت پر قابو پایا۔

”شادی اور مجھ سے۔“ روٹی اپنے چہرے پر جھک آنے والے بالوں کا ایک اکاڑ سے پیچھے جھٹکتے ہوئے ہنس دی۔

”شادی۔“ اس نے پھر ریپٹ کیا۔ پھر مسکرا کر بلال کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یعنی کہ میں یہ سمجھوں تم دن کے روشن اجالے میں مجھے اپنی شناخت بتانا چاہتے ہو۔ کالی رات کی کالک کو خود سے وابستہ کرنا چاہتے ہو۔ یہی مطلب ہے تمہاری اس بات کا۔“

اس نے بڑی بے ہمدی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں یہی مطلب ہے؟“ بلال نے بڑے ضبط سے اس کو دیکھا۔

”بلال تم جانتے ہو میں جس پیشے سے وابستہ ہوں اس کے بارے عام لوگوں کا خیال ہے۔ بلکہ یہ تاثر عام ہے یہاں پر عورت اپنی عزت جیسی نایاب چیز سے محروم ہو جاتی ہے۔ ہو کیا جاتی ہے زبردستی کر دی جاتی ہے۔ صرف ایک بار نہیں کئی بار۔ دیکھو نا یہاں یہ سب کچھ یعنی یہ شہرت یہ دولت یونہی تو نہیں مل جاتی۔ اس کیلئے کچھ تو قربانی دینی ہی پڑتی ہے اور پھر خاص کر میرے جیسے آوارہ لوگوں کو تو بغیر ذلت اٹھائے کوئی مقام ملتا ہی نہیں۔ اب میں تمہیں حل کر کیا بتاؤں۔“ وہ رک کر پھر کہا۔

”پر کیا کروں بتانا ہی پڑے گا۔ تو سنو مسٹر بلال! مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں اب تک کتنے مردوں کو خوش کر چکی ہوں۔ مگر یہ کام میں نے اپنی خوشی سے نہیں کیا مجبوری تھی کہ فلم سپر سٹار بننے کیلئے یہ سب کرنا بہت ضروری تھا۔ یعنی مردوں کو خوش کرنا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا۔“ وہ ایک ایک بات ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”میں سب جانتا ہوں۔ سب سمجھ رہا ہوں۔“ بلال نے بڑے کرب سے کہا۔ وہ جانتے تھے روٹی ان سے ایسی ہی جلی کٹی باتیں کرے گی۔ اور وہ ان باتوں کیلئے خود کو تیار کر کے آئے تھے۔ یوں بھی گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ وہ چونکہ اس کو اس مقام پر لانے کا ذمہ دار تھے۔ اس لئے اب کفارے کے طور پر شادی کر رہے تھے۔ اور پھر وہاں کی پہلی محبت بھی تو تھی۔ جس کو بھولنا اب کم از کم اس حالت میں جب وہ تنہا رہ گئی تھی۔ بلال کے بس کی بات نہیں تھی۔

”اس کے باوجود تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“ اب کہ روٹی نے شدید حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں اس کے باوجود میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ بلال نے اذیت سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ اس کی بات سن کر روٹی نے سر ہلا کر کچھ دیر سوچا۔ پھر پوچھا۔

”کیا تم اس لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو کہ میں ایک مشہور فلمسٹار ہوں۔ بہت دولت مند اور مجھے ملک گیر شہرت بھی حاصل ہے۔“

بلال نے روٹی کی بات سن کر بڑے کربناک انداز میں اس کو دیکھا پھر کہا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ مجھے جھوٹ بولنا سخت ناپسند ہے۔ نفرت کرتا ہوں میں جھوٹ بولنے سے۔“

”ہاں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ روٹی نے نخنی سے کہا۔ ”بھلا مجھ سے زیادہ یہ بات کوئی دوسرا کیسے جان سکتا ہے۔ یہ تمہارا سچ ہی تو تھا جو مجھے تمہاری اور بربادی کے اس رسوا کن مقام پر لے آیا۔ میرے ساتھ یہ جو بھی ہوا سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اور تم آئے ہو مجھ سے شادی کرنے۔ گیٹ آؤٹ۔“ وہ مارے غصے کے یک دم چلائی۔ مگر بلال نے اٹھنے کی بجائے محل



سے کہا۔

”سنو روپی! نہ تو تمہاری شہرت کی وجہ سے تمہیں اپنا رہا ہوں اور نہ ہی تمہاری دولت کی وجہ سے تم جانتی ہو اللہ کا دیا ہمارے خاندان کے پاس بہت کچھ ہے۔ میں خود بھی امریکہ سے لاکھوں مکا کر لایا ہوں۔“

”اچھا یہ وجہ نہیں اگر تو پھر اور کیلیاں ہے۔ جو تم مجھ پر مہربان ہو رہے ہو۔“ روپی نے طنزیہ نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اور بلال نے محبت پاش نظروں سے روپی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی بات تو یہ ہے روپی کہ میں تم سے محبت۔۔۔۔۔“

”شٹ اپ بلال! جو تم نے محبت کا نام بھی لیا فوراً خاموش ہو جاؤ اور اب یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ غصے سے اس کو تکلتے ہوئے بولی۔

”تم جو سلوک بھی مجھ سے روا رکھو مجھے قبول ہے۔ اگر مجھے ذلیل کرنے میں تمہاری خوشی ہے تو مجھے یہ ذلت بھی کوارہ ہے۔ مگر جی بات مکمل کئے بغیر میں نہیں جاؤں گا۔ میں تم کو بتا رہا تھا کہ میں تم سے محبت۔۔۔۔۔“

”میں کہتی ہو چپ ہو جاؤ اور فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ روپی ہذیانی انداز میں چلائی تو دور بیٹھے سارے لوگ ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”روپی فوراً روڈز سیک! میری بات سن لو۔“ بلال نے آخری کوشش کی۔ ”یکلاس مت کرو میرے ساتھ۔“ وہ ہدایتی سے بولی۔ اتنے میں ذیشان اپنی شوٹنگ چھوڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔ اور پھر بلال کو ہاں دیکھ کر چونک پڑا اس رات جب وہ کلب میں ملا تھا روپی کو تو تب بھی وہ اس کو دیکھ کر نفرت سے بھر گئی تھی۔ ذیشان نے کلب سے باہر نکلتے ہی پوچھا تھا کہ وہ کون ہے؟ مگر روپی کچھ بھی بتائے بغیر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر فوراً چل گئی تھی۔

”کیلیاں ہے ڈیئر! ذیشان نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”موصوف شادی کا امیدوار ہیں۔“ روپی بلال کی جانب مسخرانہ انداز سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ پھر پلٹ کر اپنے باڈی گارڈ سے کہا۔

”ان کو ذرا نیچے کا راستہ دکھا دو خواہ کب سے میرا دل چاہ رہا ہے۔“

بلال کسی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی خاموشی سے اٹھنے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے نیچے کی جانب چل دیے۔ روپی نے ایک نظر جاتے ہوئے بلال پر ڈالی پھر پلٹ کر وہ پہاڑوں کے اس پار غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگی۔ غروب آفتاب کی سرخی میں ڈھلتی ہوئی ساری کرنیں شق بن کر اب تمام پہاڑوں پر پھیل گئی تھی۔ بہت خوبصورت اور پیدا منظر تھا۔ سب لوگوں کے نصیب میں سمندر کا انداز تار تار سورج اور پہاڑوں کے پیچھے چھپتا سورج دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

روپی پہاڑوں کے پیچھے چھپتے ہوئے سورج کو دیکھتے ہوئے بلال کے بارے میں سوچنے لگی۔ بے شک اس کو یہاں تک لانے والا بلال ہی تھا۔ کتنی تو بہن کی تھی اس نے روپی کی اس طوفانی رات میں۔ کیا کیا لازم اس پر نہیں لگائے تھے؟ اس کی باتوں نے دل کے اندر وہ آگ لگائی تھی جو کبھی بجھ نہ سکتی تھی۔ وہ دن رات میں کئی بار سوچتی کاش! کبھی بلال مل جائے تو وہ کل کر اس کے سامنے اپنی نفرت کا اظہار کر سکے۔ اور وہ صلا تو اس وقت جب وہ اگلے ہی روز لندن جا رہی تھی۔ بہر حال مسئلہ اظہار نفرت کا تھا اور وہ اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے بعد ہی کلب سے باہر گئی تھی۔

چند روز پہلے لندن سے واپس آئی تو دل نے دعا کی تھی اے کاش! ایک بار پھر بلال اس کو ملے اور اس کا پتہ لانے کی درخواست کرے۔ اور پھر وہ اس کو اسی طرح ٹھکرا دے جس طرح کبھی بلال نے اس کو ٹھکرایا تھا۔ یہ سب کچھ عین اس کی دعا کے مطابق ہوا تھا۔ پھر نجانے اس نے بلال کی پوری بات کیوں نہ سنی تھی۔ لفظ محبت اس کے اندر آگ لگا گیا تھا۔ اب جب بلال جا چکا تھا تو وہ ایک بار پھر اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”لندن وہاں کی نہیں سیم اور اس کے بیٹے کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے سیم کو بتا دیا تھا کہ مات افتاق سے بلال اس کل لگ گیا۔

”پھر کیا کیا بلال نے تمہیں دیکھ کر۔“ سیم نے پوچھا۔

اس نے تو کچھ نہیں کہا۔ بس میں نے ہی ایک شعر پڑھا اور پھر کلب سے باہر آ گئی تھی۔ روپی نے بتایا تو سیم چپ ہو گئی۔ پھر سیم اپنے بیٹے کو ہاں کا ایک اچھے سکول میں ایڈمیشن



کروانے کے بعد ہی واپس آئی تھی۔ یعنی بیٹا وہاں ہاسٹل میں رہ گیا تھا۔ اور وہ دونوں وطن واپس آ گئی تھیں۔ لندن میں دونوں کا بیٹا کم کافی اچھا بلکہ بہت اچھا گزرا تھا۔ بلال کو اپنی اس توہین کا احساس بالکل بھی نہیں تھا جو روپی نے اس کی، کی تھی۔ نہ ہی وہ دوسرے لوگوں کے آ جانے سے توہین کے ڈر سے اٹھ کر آئے تھے۔ وہ تو صرف اس لئے اٹھ آئے تھے کہ ان لوگوں کی موجودگی میں وہ روپی سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ان کا ارادہ بھی لاہور جانے کا بالکل بھی نہیں تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا وہ کل پھر کوشش کریں گے۔ وہ روپی کو ہر حال میں بتا کر رہیں گے کہ وہ ان کی پہلی محبت ہے۔ اور پھر انہوں نے اسی ہوٹل میں اپنے لئے روم حاصل کر لیا جس میں روپی اور اس کا قلمی یونٹ مقیم تھا۔ یہ بھی محض اتفاق تھا کہ ان کا روم بالکل روپی کے روم کے سامنے تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب اوپر اپنے روم میں روپی آئی تو انہوں نے دروازہ ٹوک کیا۔ روپی نے کھانا اپنے ساگی ذیشان کے ساتھ کھایا تھا۔ انہوں نے دیکھا تھا تین ماہ پہلے جب انہوں نے کلب میں اس کو دیکھا تھا تب بھی یہی قلمی ہیر روپی کے ساتھ تھا۔

”کون.....؟“ روپی نے اندر سے پوچھا۔ بلال نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے پھر ڈور ٹوک کر دیا۔ ان کو معلوم تھا ان کی آواز سن کر وہ ہرگز دروازہ نہ کھولے گی۔ روپی نے دوبارہ دستک ہونے پر دروازہ کھولا۔ پھر بلال کو دیکھ کر جلدی سے بند کرنا چلا مگر بلال پھرتی سے اس کو پیچھے دھکیل کر نہ صرف روم میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے بلکہ دروازہ بھی بند کر کے لاک بھی لگایا۔ جب لاک لگا کر روپی کی جانب مڑے تو روپی نے ان کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا مطلب۔“ بلال یہ سن کر بولے۔

”اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں پہاڑوں پر میری بات اور لوگوں کے آ جانے سے ادھیڑ رہ گئی تھی۔ اب میں اس کو پورا کرنے آیا ہوں۔ تم پسند کرو یا نا کرو میں اپنی بات پوری کر کے ہی جاؤں گا۔“

”ابھی میں فون کر کے کسی کو بلا کر تمہیں بے عزت کر کے روم سے نکلوا دوں تو کیسا لگے گا آپ کو؟“ روپی نے ناکاری سے اس کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”فون کرنے دوں گا تو کر سکو گی نا۔ چلو بیٹھو۔“ انہوں نے رعب سے کہا اور یہ دیکھ کر روپی کو غصہ آ گیا۔

”مجھے نہیں بیٹھنا۔ آپ میرے روم سے فوراً نکل جائیں۔ مجھے پہلے والی روپی نہ سمجھیں۔“ روپی غرائی تو بلال بولے۔

”جب تک تم میری بات نہیں سنو گی میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والا ہرگز نہیں۔“

روپی ان کو گھورتی ہوئی بستر پر جا بیٹھی۔ بلال چیئر گھسیٹ کر بیڈ کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔

”اب سنو مجھ سے میری کہانی۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار مینسن کے قریب کھڑا دیکھا تھا تو تم پہلی بار ہی مجھے اچھی لگیں۔ میں تو شروع میں یہ بھی سوچتا تھا کہ تم شاید آسمان سے اترتی ہو کوئی آسمانی مخلوق ہو جو خاص اس وقت آسمان سے اترتی ہو کہ سارا دن تو تم گھر میں کہیں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ نہ ہی تمہارا مجھ سے تعارف کروایا گیا تھا۔ بہر حال پھر تم جب دن میں پکڑی گئیں اور تمہیں میرے سامنے آنے کی اجازت مل گئی تو پھر مجھے تم سے محبت ہو گئی۔ میں نے تم سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور سوچا ابھی تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ جانے سے پہلے ہی تم سے تمہاری رائے پوچھوں گا۔ مگر پھر تمہاری حرکتیں دیکھ کر میرا دل تم سے خراب ہونے لگا۔ وہ رات والی رات جو تم نے غلط کیا اس کے بعد۔“

”تو تم آج بھی یہی سمجھتے ہو کہ رات والی رات میں غلط تھی۔“ روپی نے فوراً غصے سے کہا تو بلال جلدی سے بول پڑے۔

”تم نہیں روپی! شاید میں ہی غلط تھا میں اپنے آپ سے ڈر گیا تھا۔ مجھے خود پر کنٹرول رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ اور پھر بعد میں روجی نے تمہارے حوالے سے مجھے گمراہ کیا۔ مگر روجی کی شادی والے دن ساری بات کھل گئی۔ جب جمشید روجی کے محبت نامے اس کے سسرال والوں کو دینے آیا۔ اس کے آنے سے تمہاری بے گناہی ثابت ہو گئی۔ اس نے کہا تھا روپی چھوٹی تھی۔ میرا تعلق روجی سے تھا۔ وہی دن میرے سکون کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد جو میں نے تمہاری تلاش شروع کی تو امریکہ جانے تک کرتا رہا۔ پھر یہ تلاش اپنی امی کے سپرد کر کے میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے میں نے ان کا فون کر کے پوچھا تو انہوں نے بتایا تم گھر واپس آ چکی ہو۔“

وہ تو جس دن میں امریکہ سے واپس آیا۔ اس رات تمہیں کلب میں دیکھ کر مجھے بتا چلا ماں نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں صبح ہی تمہاری تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ مگر معلوم ہوا تم تین ماہ آرام کرنے امریکہ چلی گئی ہو اور اب تم آئی ہو تو میں پھر تمہاری تلاش میں نکل پڑا۔ میں سمجھتا ہوں بے شک روجی نے مجھے تمہارے حوالے سے گمراہ کیا تھا۔ مگر میں مرد تھا مجھے اپنی عقل استعمال کرنی چاہیے تھی۔ اب تم جو بھی ہو، جیسی بھی ہو مجھے قبول ہو۔ اس مقام پر تم صرف میری وجہ سے ہو۔“



”اوہ تو کفارہ دا کرنا چاہتے ہو۔“ روہی نے طنز کیا اور بلال نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں کفارہ بھی کرنا چاہتا ہوں میں۔ مگر حقیقت میں برسوں پہلے کھوجانے والی اپنی محبت کو پانا چاہتا ہوں۔ یقین کرو میں نے اپنی زندگی میں صرف تم سے محبت کی۔ مجھے زندگی میں کوئی لڑکی اچھی لگی تو وہ صرف تم ہو۔ آج بھی میں صرف تم سے ہی محبت کرتا ہوں اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک کرتا رہوں گا۔ پلیز انکارنا کرو۔ شادی کیلئے ہاں کرو روہی! ایک غلطی میں نے کی اور تم کو کھودیا مگر اب تم یہ غلطی بنا کرو۔ میرا یقین کرو میں اپنے ہر گناہ کا کفارہ دا کروں گا۔ ایک بار ہاں کرو۔“

روہی کو بلال کی یہ باتیں سن کر گویا سکتہ ہو گیا تھا۔ یعنی اگر اس نے بلال سے محبت کی تھی تو اس کا محبوب بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ اس کو بتا چکا تھا کہ وہ بھی اس کو پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ بلکہ شدت سے اس کو چاہنے لگا تھا۔ مگر ایک غلط فہمی کی وجہ سے سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔

”کیا میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔“ بلال نے اس کو دہرائی کے عالم میں مسلسل اپنی جانب دیکھتے یا کر پوچھا۔

روہی نے نظریں جھکالیں پھر نجانے یکدم ہی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ دل کے کسی بھی حصے میں بلال کیلئے کوئی شکوہ شکایت نہ رہی تھی لیکن اب وہ خود بھی تو بلال کے لائق نہ رہی تھی۔ نجانے کتنے مرد اس کو چھو چکے تھے۔ خواہ وہ مجبور ہی بھی۔ مگر مردوں نے اس کو چھوا تو تھا۔ اب بلال کی محبت سے انکار فضول تھا مگر قرار کرنے کا بھی نام نہ رہا تھا۔ روہی نے کچھ دیر سوچا پھر فیصلہ کرتے ہی وہ اٹھی۔ دل میں بے پناہ محبت بھی مگر بظاہر اس نے شدید نفرت سے کہا۔

”مسٹر تبلیغ کار! مسٹر نمازی! پرہیز گار اور شریف زادے! تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ عشق کرتے ہو۔ تم جانتے ہو عشق محبت کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“ روہی نے نگاہوں میں حقارت بھر کر پوچھا۔

”میرے قریب آؤ تو بتا سکتا ہوں۔“ بلال خفیف سا مسکرائے شرارت سے اور روہی نے چیخ کر کہا۔

”تم وہ گھٹیا انسان ہو جس کی وجہ سے میں اپنے گھر سے بھاگی اور آج اس مقام پر ہوں۔ تمہیں اب مجھ سے محبت ہے مگر مجھے تم سے شدید نفرت ہے۔ اتنی شدید کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔“

”اب نہیں روہی! میں نے تمہیں بتایا ہے کہ تم مجھے پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھیں۔“ بلال نے جلدی سے وضاحت کی تو روہی نے کہا۔

”مجھ سے شادی کرنے کیلئے تو بڑے بڑے لگ بڑپے رہتے ہیں۔ تمہاری اوقات اور حقیقت ہی کیا ہے ان کے سامنے۔ میری طرف سے پکا پکا انکار سمجھو اور سنو پھر کبھی میرے پیچھے مت آنا اور نا ہی مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کرنا۔ میری طرف سے جواب ہمیشہ انکار کی صورت میں ہی ملے گا۔“

”میں تمہارے اس انکار کو کبھی نہیں مانوں گا۔ ہمیشہ تمہارے تعاقب میں رہوں گا۔ تمہارے ہاں کرنے تک۔“ بلال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر روہی کے قریب آئے کچھ دیر اس کو دیکھتے رہے پھر یکدم کلائی تھام کر اپنے قریب کرتے ہوئے بانہوں میں بھر کر اپنے لبوں سے اس کے ہونٹوں کو چھو کر روہی کو چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”جب تک میں زندہ ہوں تب تک اب میرے سوا تمہیں کوئی نہ چھو سکے گا۔ اگر کسی نے کوشش کی تو شوٹ کروں گا۔ آخر پتھان کا پچھو ہوں۔ اس وقت تو میں جا رہا ہوں جب تک تم شادی کیلئے ہاں نہیں کرتی تب تک میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ ہر کام چھوڑ دوں گا میں تمہیں حاصل کرنے تک مگر تمہیں نہیں چھوڑوں گا سمجھیں۔“ پھر وہ روہی کو وہیں چھوڑ کر دروازہ کھول کر روم سے باہر چلے گئے اور جاتے ہوئے دروازہ بھی بند کر گئے۔



بلال کے باہر جاتے ہی اچانک روہی کا دل بلال کو پانے کیلئے پھل اٹھا۔ اس نے جاتے ہوئے بلال کو دیکھا تو دل چاہا بھاگ کر اس کے پیچھے جائے اور سینے سے لگ کر روتے ہوئے کہے۔ ”مجھے معاف کرو بلال! میں نے تو یہ سب یونہی کہا ہے۔ جھوٹ بولا ہے۔ بھلا روہی تمہیں ٹھکانے کی جرأت کر سکتی ہے۔ وہ روہی جس نے تم سے محبت کی۔ تمہیں پانے کی کوشش کی۔ تم تو سب کچھ کہنے کرنے کے باوجود ہمیشہ میرے دل میں موجود رہے ہو۔ اور اب ایک بار پھر تم بری طرح میرے دل و دماغ پر چھا چکے ہو۔ یقین کرو آج کے بعد میں خود بھی تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ یہ ہونٹ جن کو تم نے چھوا۔ اب کوئی اور ان کو کبھی نہ چھو سکے گا۔ اس تن من کے مالک اب صرف تم ہی رہ گے۔ صرف تم۔ مگر یہ تمہارے لائق نہیں رہا۔“ مگر افسوس بلال چلا گیا اور وہ یہ سب اس کو نہ کہہ سکی۔



یہ شک اس کی پہلی اور آخری محبت بلال ہی تھا۔ جاوید، آصف، توصیف اس کی محبت نہ تھے اور نہ ہی روبی کو ان سے محبت ہوئی تھی۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر قبل از وقت جوان ہوئی تھی۔ یہ فطرت تھی۔ اس کو جاوید، آصف، توصیف نہیں ان کی صورت میں مرہا چھالگا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ جب غزالہ اور آپ کو جمشید اور پرویز کے حوالے سے باتیں کرتے سنتے تھی۔ تب اس کا دل چاہتا تھا۔ اس کا بھی کوئی محبوب ہو۔ جس کے خوشبودار سینے میں وہ بھی منہ چپا کر بات کر سکے۔ اگر اس کو ان تینوں سے محبت ہوتی تو پھر اس کو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مگر محبت ٹھیل نہیں کہ آپ سب سے کرتے رہیں۔ یہ صرف ایک بار ہوتی ہے اور پھر ہمیشہ رہتی ہے۔

جاوید کو محبت نامہ روبی نے کرن کے تعاون سے لکھا تھا۔ مگر وہ روبی کا محبت نامہ وصول کرنے سے پہلے بک کارز چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پھر آصف اس کا کرن تھا تو جب روبی کی خلع کی مٹی نے اسے پھانسا تب روبی نے سوچا۔ پہلا حق میرا ہے کہ وہ میرے بچا کا بیٹا ہے۔ یہ سوچتے ہی اس کو بھی محبت نامہ لکھا مارا۔ مگر نتیجہ جو نکلا وہ سب نے دیکھ لیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے چھت کے اوپر سے سلمان بھائی کے دوست توصیف کو دیکھ لیا۔ مگر خط لکھنے کا نتیجہ چونکہ اچھا نہ نکلا تھا اس لئے اس نے توصیف کو خط لکھنے کے بجائے صرف ایک فلمی سونگ گا کر اکتھا کر محبت کیا۔ نتیجہ اس کا بھی برا ہی نکلا تھا۔ نتیجہ تو بلال کے سینے میں منہ چپانے کا بھی اچھا نہیں نکلا تھا۔ مگر بلال سے ہر حل روبی نے محبت کی تھی۔

یہی وجہ تھی بلال اس کے دل سے کبھی نہ نکل سکا۔ کبھی محبت تو کبھی نفرت کی صورت وہ روبی کے دل کے کسی حصے میں ہمیشہ موجود رہا۔ بلال کی آمد کے بعد اس کے دل کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا تھا۔ اب ذیشان کے ہزار بار دستک دینے کے باوجود بھی نہیں کھلا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس میں پہلے ہی سے بلال موجود تھا۔ اس بات کا احساس تو روبی کو اب اس وقت پوری شدت سے ہو رہا تھا۔ محبت ہمیشہ زندہ رہتی ہے مرنی نہیں۔ جس طرح بلال کی محبت ہمیشہ موجود رہی۔

اس محبت کے باوجود بلال سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ نجانے کیوں بلال کا اکتھا کر محبت کے باوجود وہ بھی سوچ رہی تھی کہ وہ یہ شادی محض کفارے کے طور پر کر رہا ہے۔ اس بدل سے روبی کو نکالنے کا کوئی اور ذریعہ جو اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ ایک نیک فطرت انسان تھا۔ اس کو اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ وہ بلال کے جذبات احساسات اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ ایک بار پھر اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔

اس کے باوجود بلال کے ساتھ شادی کر کے ان کو اور ان کے بے حد معزز خاندان کو رسوا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لوگوں کو کیا معلوم اصل معاملہ کیا ہے؟ وہ تو یہی کہتے۔ دیکھو کتنے پرہیز گار گھرانے کاڑ کا کتنے گندے ماحول سے لڑکی لایا ہے۔ اور پھر اس بات کا کیا ثبوت تھا کہ بلال کے گھر والے اس کو قبول کرتے ہیں یا مارے غصے کے بلال کو بھی گھر سے باہر نکالتے ہیں۔ یہی وجہ تھی روبی نے بلال کو ٹھکرا دیا تھا۔

دو تین روز وہ عکسبندی میں حصہ لیتی رہی۔ بلال بھی روز وہاں آتا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ روبی کو مخاطب نہیں کرتا تھا۔ پھر جیسے ہی روبی کا کام ختم ہوا وہ بے قرار دل کو لئے لاہور چلی آئی۔ چند روز وہ خود کو سنبھالتی ہوئی گھر پر ہی آرام کرتی رہی۔ بلال سے پیچھا چھڑانے کا حل سوچنے کیلئے بے تحاشا سگریٹ نوشی بھی کرتی رہی۔ جب اس نے پہلی بار رام اور زبرہ خانم کو سگریٹ نوشی کرتے دیکھا تھا تو اس کو حیرانی کے ساتھ ساتھ برا بھی بہت لگا تھا۔ زبرہ خانم نے اس کی ناپسندیدگی کو محسوس کر لیا اور کھل کر بتایا کہ وہ کیوں سگریٹ نوشی کرتی ہیں۔ یہ تک کہا کہ ہماری خلع ناتی وغیرہ بھی حقہ پیا کرتی تھیں۔ اب اس زمانے میں حقہ کون تازہ کرے اس لئے سگریٹ ہی ٹھیک رہتا ہے۔

روبی نے دیکھا جب وسیم نے ارم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو وہ اپنے روم میں بند ہو کر سارا وقت المیہ سونگ سنتی اور بے تحاشا سگریٹ نوشی کرتی۔ روبی ان کو تسلیاں دینے دو تین بار روم میں گئی تھی اور پوچھا تھا۔

”کیوں اپنی صحت خراب کر رہی ہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ وہ ذلیل انسان شادی کر کے کینیڈا جا چکا ہے۔ بنی مون منانے۔ اور آپ یہاں اس کے سوگ میں بیٹھی ہیں۔“ تب ارم نے کہا تھا۔

”یہی بات تو مجھے بے سکون رکھتی ہے۔ وہ کہتا تھا مجھے تیار کر اقبال دیکھنے کا از حد شوق ہے۔ مگر نہا نہیں شادی کے بعد ہم دونوں بنی مون کیلئے سیدھا کینیڈا جائیں گے۔ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بائیں ڈال کر اس خوبصورت جھیل کو دیکھیں گے۔ اور اب۔۔۔۔۔ اب وہ۔۔۔۔۔ اتنا کہہ کر ارم آپ کو روئے لگیں۔ پھر سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے بولیں تھیں۔

”بہت سکون ملا ہے اس کو پی کر۔“

روبی نے پہلی بار سگریٹ نوشی کرن کی موت کے بعد اس وقت شروع کی جب ہاسپٹل سے گھر آنے پر نسیم چند روز اس کے پاس رہ کر واپس چلی گئی تھی۔ اس کے بعد اس سگریٹ



نوٹی میں اضافہ ہی ہوا تھا کی نہیں۔ اب بلال کی وجہ سے پریشان تھی۔ اس لئے سب کچھ بھول کر سگریٹ نوشی میں مصروف تھی۔ مگر سکون پھر بھی نہ رہا تھا کہ بلال نے کہا تھا۔ روپی ایک غلطی مجھ سے ہو گئی تھی اور میں نے تم کو کھو دیا۔ اب تم یہ غلطی ناکرنا پلیز شادی کیلئے ہاں کر دو اور روپی کیلئے اب بلال کے ساتھ شادی کرنا ممکن نہیں تھا۔

چند یوم بعد جب وہ سٹوڈیو شوٹنگ کیلئے آئی تو بلال وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ روپی کو اس کو سٹوڈیو میں دیکھ کر بے حد دکھ ہوا تھا۔ وہ کار سے نکل کر سیدھی بلال کی جانب گئی اور پھر اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم اور یہاں خیریت تو ہے۔“

”ہاں میں اور یہاں باقی خیریت ہے یا نہیں اس کا مجھے پتا نہیں۔“ بلال نے جواب دے کر اپنی گاڑی سے ٹیک لگالی اور روپی کو دیکھنے لگا۔

”دیکھو بلال! تم ایک معزز شریف اور پریزگار گھرانے کے فرد ہو۔ تمہارے یہاں آنے سے تمہاری ہی نہیں تمہارے خاندان کی بھی بدنامی ہوگی۔ لوگ کیا کیا باتیں نہ بنا دیں گے۔ ذرا سوچو تو سہی۔“ روپی نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”اتنا ہی خیال ہے میرا اور میرے خاندان کا تو مجھ سے شادی کر لو۔ میرا یہاں آنے کا سلسلہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔ باقی میں اگر معزز اور شریف خاندان کا ہوں تو تم خود بھی تو شریف خاندان کی ہو۔“ بلال نے اس کی باتوں کا اثر لئے بغیر اس کو دیکھتے ہوئے سکون سے بتایا۔

”مگر اب شریف نہیں رہی اور ان لوگوں نے کوئی میری کمی محسوس کر کے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کی یا پھر وہ اب بھی کوئی میری کمی محسوس کرتے ہوں گے۔“ روپی تنہی سے بولی۔

”وہ نہیں کرتے تو نا سہی۔ میں تو تمہاری کمی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم میری محبت ہو اور میں نے اب تک تمہاری وجہ سے شادی نہیں کی۔ پھر کیا خیال ہے میرے ساتھ شادی کرنے کے بارے میں۔“ بلال نے مسکرا کر پوچھا۔

”میں نے تم کو کھل کر بتایا تھا کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔“ روپی نے مصنوعی غصے سے بلال کو گھورتے ہوئے بتایا۔

”تم ایک بار شادی کر کے مجھ کو آزماؤ۔ میں تمہاری اس نفرت کو محبت میں بدل دوں گا۔“ بلال نے پھر مسکرا کر کہا۔

”میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ تم اس بات کو جتنی جلدی بھول جاؤ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“ روپی نے اب کفری سے کہا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا تم میری بھول معاف کر دو۔“ آخر بلال نے منجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”معاف کر دو؟ کیا تمہارا جرم اتنا معمولی ہے کہ میں تمہیں معاف کر دوں۔ مگر سے نکل کر جوڑتیں میں نے اٹھائی ہیں ان کو میں ہی جانتی ہوں۔ تم سمجھ بھی نہیں سکتے۔ یا درکھنا مجھے تم سے نفرت ہے۔ شدید نفرت۔ میں تم کو معاف نہیں کروں گی اور سنو آئندہ یہاں مت آنا۔ ورنہ بہت برا ہوگا۔“ روپی نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ اور اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ سیٹ پر چلی گئی۔

وہاں سے وہ میک اپ کروانے اور ڈریس چننے جانے لگی۔ جب تیار ہو کر سیٹ پر آئی تو بلال وہاں شوٹنگ دیکھنے کیلئے موجود تھے۔ اس کو دیکھ کر روپی ڈائریکٹر سے سنا ساز طبیعت کا بہانا کر کے اور بلال کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر شوٹنگ کینسل کر کے گھر واپس چلی آئی تھی۔ بلال کی موجودگی روپی کو ذہنی طور پر ڈسٹرب کر گئی تھی۔ گھر آتے ہی روپی نے اپنے سیکرٹری کفون کر کے کہہ دیا میرے تمام ڈائریکٹر کو کہہ دو میڈم کہتی ہیں میں سٹوڈیو فلور پر دوسرے لوگوں کی موجودگی میں عکسبندی میں بالکل حصہ نہیں لوں گی۔ اس کی بات تو حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ فوراً ہی اس پر عمل ہوا۔ مگر بلال سٹوڈیو آنے سے پھر بھی باز نہ آئے۔ اندر سٹوڈیو فلور پر نہیں فلور سے باہر سٹوڈیو کے اندر ہی کئی ملاقات ہوتی تو ہے۔ وہ روپی کو دیکھ کر لپک کر روپی کی جانب آتے پھر بڑی امید سے پوچھتے۔

”پھر کیا سوچا ہے تم نے میرے ساتھ شادی کرنے کے بارے میں۔“

روپی اب جواب دینے کے بجائے زیادہ تر خاموش ہی رہتی۔ ورنہ شروع میں وہ بلال کو دیکھتے ہی مصنوعی غصہ طاری کر کے اس پر طنز کی بارش شروع کر دیتی تھی۔ چند روز یہ تماشا ہوتا رہا۔ اس کے باوجود جب بلال سٹوڈیو آنے سے باز نہ آئے تو روپی نے ایک نیا حکم جاری کیا۔ وہ یہ تھا کہ یہ بات کسی کو بھی نہ بتائی جائے کہ وہ کس وقت کونسے سٹوڈیو میں کام کر رہی ہے۔ یا کس فلم کے سیٹ پر عکسبندی میں حصہ لے رہی ہے۔ مگر یہ سب بھی پہلے حکم کی طرح بیکار ہی ثابت ہوا تھا۔ بلال دو تین روز سارے سٹوڈیو کی خاک چھاننے کے بعد اس کو



ملنے یا پکڑنے میں کامیاب ہو ہی جاتے تھے۔ اور پھر بڑی معصومیت سے ایک ہی بات پوچھتے۔

”روپی پھر کیا سوچا ہے تم نے میرے ساتھ شادی کرنے کے حوالے سے۔“

یہ بات اب روپی کوڑیا نے لگی تھی۔ وہ بچہ نہیں تھا جو ایک ہی ضد پکڑ لی تھی۔ مجھ سے شادی کر لویا پھر میرے ساتھ شادی کرنے کے حوالے سے تم نے کیا سوچا ہے۔ جب ایک بار نہیں گئی بار کہہ دیا ہے کہ نہیں کرنی تم سے شادی پھر کیوں اس کا تعاقب کرتا ہے؟ کیوں خود بھی پریشان ہوتا ہے اور اس کو بھی پریشان کرتا ہے؟ اس پریشانی میں روپی کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا وہ اب کرے تو کیا کرے۔ اس ضدی کو سمجھائے تو کیسے یہ تو تھے روپی کے مسئلہ اور بلال مسئلے کے بغیر نہیں تھے۔

بلال کیلئے آج کل بڑا مسئلہ بلکہ مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ ایک تو جب سے گھر والوں کو بتائے بغیر وہ روپی کی تلاش میں مری گئے تھے۔ تب سے گھر والے ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ایک تو وہ روپی کے پیچھے گئے اور پھر وہ بھی ان سب کو بتائے بغیر کیا روپی ان سب سے زیادہ اہم ہو گئی تھی کہ ماں کی پریشانی کا اتنا بھی خیال نہ تھا کہ تم بتا کر جاتے کہ تم شہر سے باہر جا رہے ہو۔ بلال ماں کی ان سب باتوں کے جواب میں چپ رہے تھے۔ جانتے تھے وہی غلط ہیں اور پھر مری سے واپس آنے کے بعد ان کے قدم کو نئے گھر کا اندر لگے تھے۔ سارا دن لاہور کے سٹوڈیوز کی خاک چھاننے کے بعد رات کو وہ جس حلقے میں واپس آتے تھے وہ بھی دیکھنے والا ہوتا تھا۔ گردا لود پاس اور گردا لود چہرہ اور بال۔ ماں ان کو دیکھتے ہی بولنے لگتی۔ اور وہ جواباً خاموش رہتے۔ کمال بھائی نے ان کو مری جانے پر ضرور ڈانٹا تھا کہ کم از کم جانے سے پہلے بتا جاتے تو کیا حرج ہوتا۔ مگر اب وہ خود تو کیا ماں کو بھی سمجھاتے تھے۔ امی جان! آپ چپ ہو جائیں وہ جس کام کیلئے آیا ہے اسے وہ کرنے دیں یہ تو تھے گھر والوں کے رویے اور بلال کی خاموشی۔

دوسرا مسئلہ خود روپی بھی۔ اول تو وہ ملتی ہی نا تھی اور اگر اتفاق سے مل جاتی تو پھر ان کی بات کا جواب دینا تو دور کی بات وہ نظر اٹھا کر ان کی جانب دیکھنا بھی کوارا نہیں کرتی تھی۔ یوں خاموشی کے ساتھ ان کے سامنے سے ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جاتی۔ جیسے وہ روپی کیلئے اجنبی ہو اور بلال کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ روپی کو اپنے ساتھ شادی کرنے کیلئے انگریز کیسے کریں کہ روپی کسی طور بھی ان کو معاف نہیں کر پار ہی تھی۔ روپی بلال سے جان چھڑانے کے طریقے سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی۔ مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ایسے میں ایک روز نسیم کراچی اور مکران میں اپنی آؤٹ ڈور شوٹنگ مکمل کرانے کے بعد لاہور واپس آئی تو چند یوم بعد نام نکال کر روپی کو بطور خاص ملنے آئی۔ پھر بیٹھتے ہی روپی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”روپی یہ میں کیا سن رہی ہوں؟“ روپی کا موڈ بلال کا سوچ سوچ کر خراب ہو رہا تھا بیزاری سے پوچھا؟

”کیا سنا ہے؟“

”میں نے سنا ہے میری غیر موجودگی میں تمہارا ایک مجنوں نما سچا عاشق پیدا ہو گیا ہے۔ جو تمہاری ایک جھلک دیکھنے کیلئے تم سے ملنے کیلئے سارا دن لاہور کے تمام سٹوڈیوز کی خاک چھاننا رہتا ہے۔ اور تم اس کو ملنا یا منہ لگانا پسند نہیں کرتی ہو۔ کیلئے سب کچھ ہے؟“ نسیم نے کچھ اس انداز میں بات کی تھی کہ بے ساختہ روپی کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے نسیم کو بتایا۔

”نیلا بالکل پیدا نہیں ہوا وہ تو بہت پرانا عاشق ہے میرا۔“

”پرانا کون۔۔۔؟“ نسیم نے روپی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں سمجھی۔“ روپی نے پھر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ جلدی سے بتاؤ کون ہے پرانا؟“ نسیم نے بتانی سے پوچھا۔

”ارے بابا وہی جس کی وجہ سے آج میں اس مقام پر ہوں۔“ اب روپی نے سنجیدگی اختیار کر لی تو نسیم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”بلال کی بات کر رہی تم۔“

”بالکل اسی کی بات کر رہی ہوں۔“ کہہ کر روپی نے ساری سٹوری نسیم کو سنائی۔ ساری بات سننے کے بعد نسیم نے خفا ہو کر کہا۔

”کیا تکلیف ہے تم کو جو تم انکار کر رہی ہو۔ جب وہ خود تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تمہیں تو شکرا کرنا چاہئے کہ وہ تم سے آج بھی محبت کرتا ہے۔“

”تم جھگڑتی کیوں نہیں ہو؟ کیا میں اس کے لائق رہ گئی ہوں؟“ روپی نے خود پر اک نکاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے۔ لیکن اس مقام پر تم آئی بھی تو اسی کی وجہ سے ہو۔“







اپنے باڈی گارڈ زاور نسیم کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ تب نسیم نے کہا۔

”بہت زیادتی کر رہی ہو تم اتنی شدید محبت کرنے والے بندے کے ساتھ۔“

”یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔“ روبی نے کہا۔ نسیم تو اپنے بھائی ماموں کے ساتھ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اور روبی اپنے باڈی گارڈز کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب چلی آئی۔ مگر بلال ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔ جہاں روبی ان کے ساتھ بات کر کے چھوڑ آئی تھی۔

روبی مل ہی مل میں ان کی اس حالت پر افسوس کرتے ہوئے اب واقعی ان کے ہر سٹوڈیوز میں داخلے پر پابندی لگانے کا سوچ رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل ہی ایکٹرز ایسوسی ایشن کے صدر سے بلال کی شکایت کرتے ہوئے کہہ دے گی بلال فلم لائن کا بندہ نہیں۔ وہ مجھے صرف تنگ کرنے پر سٹوڈیوز میں پہنچ جاتا ہے۔ برائے سہربانی بلال کے ہر سٹوڈیوز میں داخلے پر پابندی لگادی جائے کہ اس کے بغیر بلال باز آنے والا نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی گھر آئی نسیم کا فون آ گیا۔ نسیم نے روبی سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”روبی اتنی سچی محبت کرنے والے بندے کی قدرنا کرنا بہت بڑی ناشکری ہے۔ حلیہ اور حالت دیکھی تھی تم نے بلال کی۔ میں کہتی ہوں اب بھی نام ہے۔ بلال کی بات سامان لوٹیوں اپنی زندگی کو خریدنے ہی ہاتھوں سے تباہ کرنا اور شادی کر لو۔“

”یہ ممکن ہوتا تو میں اس کو کبھی انکار نہ کرتی۔“ روبی نے کہا تو نسیم نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔ آج اس کی مگرے کی رات تھی فون بند ہونے کے بعد روبی نے پہلی بار سوچا کوٹھے اور گھروں میں رہنے والے خاندانی لوگوں کے رویے میں جھڑپ ہوتا ہے۔ اس کو کم نہیں میں سمجھ سکتی ہوں۔ پھر وہ بلال کا سوچنے لگی۔ کوئی ایسا طریقہ سمجھ میں نہیں آتا تھا جو روبی کی بات سن کر وہ روبی کا پیچھا چھوڑ کر اپنی پرسکون دنیا میں واپس لوٹ جائے۔ اب خود بھی بے سکون ہو رہے تھے اور روبی کو بھی بے چین و بے قرار کر رہے تھے۔ وہ انہی سوچوں میں گم بیٹھی تھی کہ اماں روم میں داخل ہوئی اور کھانا لگنے کی اطلاع دی تو روبی جلدی سے اٹھ کر باہر کھانے والی ٹیبل پر آ بیٹھی۔

ادھر روبی اگر فلمی دنیا اور ملک چھوڑنے کا سوچ رہی تھی تو دوسری جانب بلال بھی روبی کی دھمکی کے بعد اس کو حاصل کرنے کیلئے اس کے قریب رہنے کا طریقہ سوچ رہے تھے۔ روبی تو ابھی اپنا پروگرام فائل نہ کر پائی تھی۔ مگر بلال نے بہت زیادہ سوچنے کے بعد فیصلہ کر لیا تھا کہ روبی کے قریب رہنے کیلئے نہیں کیا کرنا ہے۔ یا کس طریقے سے وہ روبی کے قریب رہ سکتے تھے۔ پھر ایک حیرانی کی بات ہوئی اپنی دھمکی کے بعد ایک ہفتہ تک بلال اس کو اپنے تعاقب میں کسی بھی سٹوڈیوز میں دکھائی نہ دیئے۔ یہ اچھی بات تھی۔ روبی یہ سوچ کر خوش اور مطمئن ہو گئی۔ بلال نے اس کی بات سامان لی ہے۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔ اس کو اب تمام عمر ہی تنہا رہنا تھا۔ اس بھری دنیا میں بلال تو کم از کم اپنی پرسکون دنیا میں رہتے۔

روبی کے پاس تو کوئی چوائس ہی نہ تھی۔ مگر ان کے پاس اپنا خاندان تھا اور مزید کسی اچھے خاندان میں شادی کر کے وہ اس میں اضافہ کر سکتے تھے۔ وہ یہی ساری باتیں سوچتے ہوئے ہدایت کار نیاز کے روم میں آئی تھی کہ رات روبی کے سیکرٹری نے روبی کو فون کر کے بتایا تھا کہ ہدایت کار نیاز کا فون آیا تھا۔ وہ ایک نئی فلم بنانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ جس میں وہ آپ کو ہیروئن لینا چاہتے ہیں۔ آپ کل صبح شاہ نور سٹوڈیوز میں ان سے ضرور ملیں۔ اب جب روبی روم میں داخل ہوئی تو نیاز صاحب کیلئے صوفے پر بیٹھے تھے۔ سامنے ٹیبل پر شاید کھانی کا مسودہ تھا جس پر وہ نظر ڈال رہے تھے۔ روبی اس کو سلام کرتے ہوئے خود بھی وہیں ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی تو نیاز نے کھانی پر سناٹا اٹھا کر اس کو دیکھا پھر کہنے لگے۔

روبی اس وقت جبکہ ہماری فلم انڈسٹری شدید بحران کی زد میں ہے۔ یہ ہماری بہت خوش نصیبی ہے کہ ایسے وقت میں انڈسٹری کو ہمارا دینے ایک پڑھ لکھنے والا اس ادارے میں آئے ہیں۔ ابھی فی الحال تو انہوں نے ایک ہی فلم بنانے کا اعلان کیا ہے اور ابھی اس فلم میں وہ تمہیں تنہا ہیروئن کے طور پر لینا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں بات کرنے کیلئے آج میں نے تمہیں بلایا ہے۔ نیاز کی بات سن کر روبی نے بھی رسمی طور پر کہا۔

”میرے لئے یہ بہت خوش کن بات ہے کہ کوئی پڑھا لکھا بندہ اس ادارے کو فلم ساز کے روپ میں ملا ہے۔“ یہ بات کہتے ہوئے روبی کی نگاہ چانک جو سامنے درجے کی جانب اٹھی تو وہ چونک پڑی۔ وہاں یقیناً وہی پڑھا لکھا نوجوان فلم ساز کھڑا تھا۔ اپنا چہرہ دوسری جانب کئے درجے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بھی نیاز نے ان کو آواز دی۔

”آئیے بلال صاحب! میڈم روبی آچکی ہیں۔“ بلال مڑے۔ ایک نظر نیاز صاحب کے پاس صوفے پر بیٹھی روبی پر ڈالی پھر نیاز اور روبی کے سامنے دوسرے صوفے پر آ بیٹھے۔ اس کے بعد نیاز نے بڑی عزت اور احترام سے ان کا تعارف روبی سے کروایا۔

”روبی یہ ہیں ہمارے نئے پڑھ لکھنے والا نوجوان فلم ساز بلال خان۔“ اور روبی کو کیا کسی نے بلندیوں سے اٹھا کر کبریٰ کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ بلکہ پوری قوت سے بچ دیا تھا۔ وہ تو



سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کو اس غلاظت سے نکالنے کیلئے وہ خود بھی اس گندگی میں تر آئیں گے۔ روبی نے نگاہ اٹھا کر سامنے بیٹھے بلال کو دیکھا۔ وہ اس وقت بے حد سنجیدہ تھے اور روبی کوئی دیکھ رہے تھے۔ روبی کو اپنی جانب دیکھتے پایا تو سنجیدگی سے کہا۔

”ہیلو مس روبی!“

جواباً روبی خاموش ہی رہی۔ حالانکہ فلم ساز ہونے کے بنا بلال کو پہلے سلام کرنا اس کا حق بنتا تھا۔ اچانک وہ نیاز کی بات سن کر چونکی۔

”روبی یہ فلم کے پیر سائن کر دو اور ہاں معاوضہ بھی تمہیں آج ہی مل جائے گا۔ آدھا نہیں پورا۔ بلال صاحب بہت اچھے ہیں۔ یہ لو بین پکڑا دو پیر سائن کر دو۔“ یہ کہتے ہوئے نیاز نے بین روبی کی سمت بڑھایا اور روبی نے فوراً ہی انکار کرنے کا سوچ لیا تھا۔ اس لئے بولی۔

”مجھے افسوس ہے نیاز صاحب! میں ان کی فلم میں کام نہ کر سکوں گی۔ میرے پاس پہلے ہی کافی زیادہ فلمیں ہیں۔ ابھی کل ہی میں نے تین نئی فلمیں سائن کی ہیں۔ اب میرا فلمی شیڈول کچھ ایسا بن گیا ہے کہ مزید ایک منٹ بھی قائلو نہیں بچتا۔ جواہر اھر دے سکوں۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کی اس فلم میں کام نہ کر سکوں گی۔ اب مجھے اجازت دیں۔“

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے روبی نے کہا اور پھر بلال کو دیکھتے ہوئے اٹھ کر باہر آ گئی۔ مگر باہر آ کر وہ کہیں گئی نہیں تھی بلکہ نیاز کے روم سے ذرا ہٹ کر بلال کے انتظار میں کھڑی ہو گئی تھی۔ چند منٹ بعد ہی بلال نیاز کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے باہر آئے۔ پھر نیاز صاحب تو اپنے سیٹ پر چلے گئے اور بلال سیدھے اپنی گاڑی کی جانب آئے تھے۔ ابھی لاک ہی کھول رہے تھے کہ روبی نے جلدی سے پیچھے آتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”میں پوچھتی ہوں یہ سب کیا کرتے پھر رہے ہیں آپ۔“

آواز سن کر بلال نے لاک میں کی گھماتے ہوئے سر کر اس کو دیکھا۔ پھر سیدھا ہوتے ہوئے شان بے نیازی سے کہا۔

”میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔ ویسے بائی داوے تمہیں مجھ سے پوچھ گچھ کا یہ حق کہاں سے مل گیا۔“

”اتنے سیدھے نہیں ہیں آپ اور نا ہی میں نے مشکل سوال کیا ہے۔ جو آپ کو سمجھنا آئی ہو۔“ روبی نے ان کی بات کا آخری حصہ نظر انداز کرتے ہوئے تھوڑے غصے سے کہا۔

بلال نے بہت دلچسپی کے ساتھ اس کے غصے سے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔ صاف پتا چل رہا تھا اس کو بلال کا یوں فلم ساز بننا اچھا نہیں لگا۔ روبی کا اپنے لئے اس انداز میں سوچنا ان کو اچھا لگا بلکہ گہرا سکون دے گیا۔ مگر بظاہر سنجیدگی سے بولے۔

”جو بھی کہنا چاہتی ہو صاف صاف اور برا کھل کر کہو۔ میں واقعی نہیں سمجھا کہ تم نے کیا کہا ہے یا کیا چاہتی ہو۔“

”یہ فلم کیوں بنا رہے ہیں آپ؟“ روبی نے اب کے بات کرتے ہوئے اپنی آواز دھیمی کر لی تھی۔

”صاف اور سیدھی بات تمہارے قریب رہنے کیلئے۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا تم میرا تمام سٹوڈیوز میں داخلہ بند کر دو گی۔ تمہاری اس دھمکی کے بعد میں نے فلم ساز بننے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا خیال ہے اب جب میں خود بھی فلم بنا رہا ہوں تو کوئی مجھے سٹوڈیوز آنے سے نہیں روک سکتا۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔“ بلال نے بات ختم کر کے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بلال کیوں خود کو تباہ کر رہے ہو۔ وہ بھی ایک آوارہ۔۔۔“ باقی کی بات روبی کے منہ میں ہی رہ گئی تھی کہ اچانک ہی بلال کا ہاتھ اٹھا تھا۔ روبی کے گل پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے انہوں نے سخت اور سرد لہجے میں کہا تھا۔

”خبردار جو پھر بھی میرے سامنے اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کیا۔ میں اول آخرا انسان تھا فرشتہ نہیں کہ غلطی نہیں کر سکتا۔ مجھ سے بھول نہیں ہو سکتی تھی۔ معافی مانگ چکا ہوں میں اپنی اس غلطی اور بھول کی تم سے۔ تم معاف نہ کر دو الگ بات ہے۔ مگر کان کھل کر سن لو میرے سامنے پھر بھی اس نام کو خود سے منسوب کیا تو نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ مار ڈالوں گا میں تمہیں اس وقت بہت زبان کھل گئی ہے گھر سے نکل کر تمہاری۔“ روبی نے اپنے گل پر ہاتھ رکھ کر بلال کو دیکھا۔ آنکھوں میں یکدم ہی نمی اتر آئی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا تھا۔

”بلال یہ جگہ آپ کے لائق نہیں۔ کیوں خود کو تباہ کرنے یہاں آ گئے ہیں۔ اب بھی کچھ نہیں بکڑا۔ آپ لوٹ جائیں اپنی پر سکون دنیا میں۔“

”اتنا ہی خیل ہے میری تباہی کا تو مجھ سے شادی کر لو۔ میں خود ہی تباہ ہونے سے بچ جاؤں گا۔ بس یہی صورت ہے مجھے تباہی سے بچانے کی۔ ورنہ میں اب اس جگہ کو چھوڑنے والا نہیں۔“



”میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ یہ بات میں آپ کو بتا چکی ہوں۔“ روبی نے پھر دہشتی آواز میں کہا۔

”ٹھیک ہے پھر اس بات کو بھی بھول جاؤ کہ یہ جگہ میرے لائق ہے یا نہیں۔ یا میں یہاں آ کر تباہ ہو رہا ہوں۔ اگر تم میری وجہ سے تباہ ہوئی ہو تو بد لے میں اب میں بھی خود کو تباہ کروں گا۔ ویسے بھی تمہارے قریب رہنے کا اور کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں مجبوری ہے۔“

”تو یہ آپ کا کیا فیصلہ ہے۔“ روبی نے گویا آخری بار پوچھا۔

”میرا نہیں روبی یہ تمہارا فیصلہ ہے۔ تم ابھی شادی کیلئے ہاں کر دو تو تمہارے ساتھ میں بھی اس جگہ کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ دوں گا۔ یوں تمہاری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی اور میرا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ پھر کیا خیال ہے۔“ انہوں نے بات ختم کر کے پھر پوچھا۔

”مجھے آپ سے نفرت ہے اس لئے میں آپ سے بھی شادی نہیں کروں گی۔“ اب کہ روبی نے پوری قوت سے چلاتے ہوئے نفرت سے کہا۔

”تو ٹھیک ہے پھر میرے لئے پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ اوکے اب جانا ہوں۔ اب انشاء اللہ تم سے کل میری لازمی ملاقات ہوگی۔“ بلال نے بات ختم کر کے پریشان کھڑی روبی کو دیکھا۔ پھر اللہ حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھا اور یہ جاوہ جا۔ جلد ہی ان کی گاڑی روبی کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مگر روبی بہت دیر تک وہیں کھڑی سوچتی رہی اور پھر وہیں کھڑے کھڑے روبی نے پکا فیصلہ کر لیا۔

اب وہ مزید فلموں میں کام کرے گی اور ابی پاکستان میں رہے گی۔ بلال مرد ہیں وہ اپنی ضد چھوڑنے والے نہیں اور ان کو تباہی سے بچانے کیلئے اب روبی کا اپنا فلم انڈسٹری اور وطن چھوڑنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس کی اپنی زندگی تو تباہ ہو چکی تھی۔ مگر اپنے محبوب کی زندگی کو تباہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جب روبی نے یہ فیصلہ کر لیا تو پھر سب سے پہلے وہ اپنے ان ڈائریکٹرز کے پاس گئی۔ جن کی فلمیں اس نے سائن کی تھیں۔ ان سب سے بے حد معذرت کرتے ہوئے روبی نے یہ تینوں معاہدے کنسل کر دیئے تھے۔ اس کے بعد اسی دن روبی نے اپنے ان ڈائریکٹرز سے جن کی فلموں میں وہ کام کر رہی تھی۔ ضرور دے کر کہہ دیا تھا وہ سب جلد از جلد اپنی فلموں کا کام مکمل کروالیں۔ بے شک مجھے تین تین کی شفٹ میں کیوں نا کام کرنا پڑے میں انکار نہیں کروں گی۔ یہ تو تھے روبی کے پروگرام۔ اس نے کسی کو بھی بتائے بغیر ملک چھوڑنے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ حتیٰ کہ ابھی نسیم کو بھی کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔

دوسرے روز بلال سٹوڈیو آتے ہی سیدھے نیاز کے روم میں آئے پھر بیٹھتے ہوئے سب سے پہلے یہی پوچھا۔

”روبی صاحبہ کا بگری کرنے میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی آپ کو۔“

”بلال صاحب! انہوں نے پھر انکار کر دیا ہے۔ رات میں نے ان کے سیکرٹری سے پھر بات کی تھی اور سیکرٹری نے روبی سے بات کرنے کے بعد بتایا۔ روبی میڈم کی طور پر بھی اس فلم میں کام کرنا نہیں چاہتی۔ ویسے مجھے تو حیرت ہے۔ وہ انکار کر کیوں رہی ہیں۔ میری فلم میں کام کرنا تو سب ہی فنکار باعث فخر سمجھتے ہیں۔ آپ تو روبی کو معاوضہ بھی منہ مانگا دے رہے تھے۔ پھر روبی کا انکار سمجھ میں نہیں آتا۔ یوں بھی آئی تو وہ یہاں میرے پاس فلم سائن کرنے ہی تھی انکار کرنا ہوتا تو سیکرٹری سے کہہ کر کر سکتی تھی کہ انکار کر دو۔ اب اللہ جانے یکدم ایسا کیا ہوا کہ اس نے انکار کر دیا۔“

”اس فلم انڈسٹری میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو روبی کو میری فلم میں کام کرنے کیلئے ابگری کر سکے۔“ بلال نے ذیشان کا سوچتے ہوئے پوچھا کہ وہ اس کے ساتھ زیادہ انہوں نے دیکھی تھی۔ نیاز روبی کا انکار سے حیران تھا۔ اور بلال اب ان کو تو اندر کی بات بتانے سے رہے کہ یہ انکار روبی نے محض ان کی وجہ سے کیا تھا۔

”بلال صاحب! روبی بے حد تنہائی پسند لڑکی ہے۔ زیادہ تر اکیلے رہنا پسند کرتی ہے۔ اب تک فلم انڈسٹری میں کسی کو یہ بتا نہیں چل سکا کہ وہ کس خاندان کی بیٹی ہے۔ ہاں پوری فلم انڈسٹری میں اگر کسی سے اس کی کہری دوستی ہے تو وہ نسیم ہے۔ جو ہیرا منڈی کی لہڑی سے بھی زیادہ مکار اور خطرناک عورت مانیکہ چشمہ کی بیٹی ہے۔ یا پھر ذیشان سے ہلکی چھلکی دوستی ہے۔ اس کے علاوہ باقی کسی کو وہ منہ لگانا پسند نہیں کرتی۔ ہاں نسیم کی بات روبی ٹال ہی نہیں سکتی۔“ نیاز نے بتایا۔

بلال کو یہ سن کر بے حد غصہ آیا تھا کہ روبی کی دوستی ایک طوائف سے ہے۔ مگر فو رائی یہ سوچ کر ان کا غصہ جاتا رہا کہ فلم انڈسٹری میں اکثریت ان اداکاروں کی تھی جو اس بازار سے اٹھ کر آئی تھیں۔ اسی لئے تو اس جگہ کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ روبی کو اب اپنی فلم میں کام کرنے کیلئے راضی کرنے کو انہوں نے خود بھی نسیم سے ملنے اور روبی کے حوالے سے دماغ لگنے کا



فیصلہ کرتے ہوئے نیاز سے نسیم کے گھر کا ایڈریس پوچھا۔ نیاز نے ایڈریس ان کو بتانے کے بعد کہا گھر جانے سے بہتر ہے آپ یہاں پر ہی نسیم سے ملاقات کر لیں۔ وہ آج عطاء محمد کی فلم کے ایک گانے پر پر فارم کر رہی ہے۔ آپ پسند کریں تو وہاں سیٹ پر چلتے ہیں۔ آپ ذرا نسیم کا ڈانس بھی دیکھ لیجئے گا۔ بہت زبردست ڈانس کرتی ہے۔ ساری ہیرا منڈی میں نسیم کے پلے کی ایک بھی ڈانس نہیں۔ بہت اونچا ریٹ ہے نسیم کے مگر بے کما۔

بلال کو تو نسیم سے دلچسپی تھی اور نا ہی اس کے ڈانس سے۔ ان کا اس فلم سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی جو وہ خود بنا رہے تھے۔ وہ تو محض روپی کے قریب رہنے کیلئے اس بظاہر روشنیوں کی دنیا مگر اندر سے غلامت کے ڈھیر میں داخل ہوئے تھے۔ روپی کے قریب رہنے کا اور کوئی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا۔ انہوں نے نیاز کی بات سن کر کہا۔

”میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔ ہاں اگر نسیم کو یہاں بلا دیں تو از حد مہربانی ہوگی۔ وہ جب فارغ ہوں مجھ سے مل لیں۔ میں نسیم کلائیٹ کر لوں گا۔“

”بلال صاحب! مہربانی کیسی۔ ہمارا تو کام ہی یہی ہے۔ ابھی لڑکا بھیجتا ہوں کہ وہ نسیم سے کہہ دے کہ وہ جب فارغ ہو مجھ سے مل لیں۔“ نیاز نے اسی وقت اپنا ملازم لڑکا پیغام دے کر بھیجا۔ چند منٹ بعد ہی لڑکے کے ساتھ نسیم خود بھی چلی آئی اور آتے ہی کہا۔

”نیاز صاحب! میں تو گھر واپس جا رہی تھی جب آپ کا پیغام ملا۔ اور میں فوراً ہی چلی آئی۔ خیریت؟ ابھی تو دو دن بعد آپ کی فلم کی عکس بندی شروع ہونا تھی۔ باقی عطا کا پروگرام تو اب کل گانا فلمانے کا ہے۔“ بات کرتے ہوئے اچانک اس کی نگاہ بلال پر پڑی۔ وہ مل میں چونکی مگر ظاہری طور پر خود کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ صاحب کون ہیں؟“ نیاز نے فوراً تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔

”یہ ہمارے بہت زیادہ پڑھے لکھے فلم ساز بلال خان ہیں۔ یہ اپنی پہلی ذاتی فلم بنا رہے ہیں۔ اس فلم میں روپی کو بطور ہیروئن لینا چاہتے تھے مگر روپی نے ان کی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم روپی کی واحد دوست ہو جس کی بات سے روپی انکار نہیں کر سکتی۔ اگر تم روپی کو بلال صاحب کی فلم میں کام کرنے کیلئے ایگری کر دو تو یہ تمہاری مہربانی ہوگی۔ بلال صاحب اس سلسلے میں خود تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ذرا کام ہے میں ایک چکر سیٹ کا بھی لگا آؤں۔ تب تک بلال صاحب تم سے بات کرتے ہیں۔“ اتنا کہنے کے بعد نیاز اجازت لینے کے بعد چلا گیا تو بلال نے پہلی بار نسیم کو بغور دیکھا۔ ان کو فلموں سے ذرا سا بھی انٹرسٹ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے وہ کسی بھی فلمسٹار کے بارے میں نا ہی جانتے تھے۔ اور نا ہی پہچانتے تھے۔ اب نسیم کو دیکھا تو فوراً یاد آیا اس شام جب روپی نے ان کو دھمکی دی تھی کہ وہ تمام سٹوڈیوز میں ان کے داخلے پر پابندی لگا دے گی۔ تب نسیم بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس وقت وہ کمرے میں تھی۔ مگر اس وقت وہ بے حد عام سے سادہ لباس میں بالکل شریف لڑکی لگ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ وہ ایک طوائف ہے۔ انہوں نے سر جھٹک کر ایک کبری سانس لی پھر نسیم سے کہا۔

”نیاز صاحب بتا رہے تھے کہ آپ روپی کی بہت کبری دوست ہیں۔ روپی آپ کی بات کو کبھی نہیں مٹا سکتی اور میں چاہتا ہوں آپ اس کو میری فلم میں کام کرنے کے لئے ایگری کر سکیں۔“

”مگر آپ فلم کیوں بتانا چاہتے ہیں بلال! یہ جگہ یہ پیشہ آپ کے نمایان شان نہیں۔“ نسیم نے بلال کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اوہ تو روپی آپ کو یقیناً میرے بارے میں بتا چکی ہے۔ فوہ میں یہ بھول گیا تھا کہ آپ روپی کی کبری دوست ہیں۔ پھر وہ یہ بات آپ سے کیسے چھپا سکتی تھی؟ اگر میری بات درست ہے تو پھر آپ ہی روپی کو سمجھائیں نا۔ وہ اپنی یہ فضول ضد چھوڑنے اور مجھے معاف کر کے شادی کیلئے ہاں کر دے۔ بہت پریشان ہوں میں اس کی وجہ سے۔“ بلال نے کہا تو نسیم ہولی۔

”آپ کے کہنے سے پہلے ہی میں نے اپنے طور پر روپی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ نہیں مانی۔ باقی رہی آپ کو معاف کرنے کی بات تو معاف تو وہ آپ کو کر چکی ہے۔ مگر شادی سے انکار اس وجہ سے کرتی ہے کہ خود کو آپ کے لائق نہیں سمجھتی۔“ نسیم نے پوری بات بتا کر بلال کو گویا اندر تک ٹھنڈا اور پرسکون کر دیا تھا۔ چند منٹ تک وہ اس ٹھنڈک اور کبرے سکون کو محسوس کرتے رہے پھر نسیم سے پوچھا۔

”اگر یہ بات ہے تو مجھے بتائیں میں اس کو منانے کیلئے کیا کروں۔“

”نا آپ کے کچھ کرنے سے کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے اور نہ ہی میرے کوشش کرنے سے۔ وہ آپ کی فلم میں کبھی بھی کام نہ کرے گی اور اس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ یہی ہے کہ وہ



آپ کا یہاں اس ماحول میں آنا پسند نہیں کرتی۔ اس شام آپ کی جو حالت اور حلیہ تھا۔ وہ اس کو ڈسٹرب کر گیا تھا۔ خیر وہ تو میری بات نہیں مانتی مگر آپ مان لیں تو مہربانی ہوگی۔“ نسیم نے کہا تو بلال نے پوچھا۔

”کون سی بات منوانا چاہتی ہیں آپ مجھ سے۔“

”اپنی فلم بنانے کا پروگرام کینسل کر دیں کہ یہ مجھے بھی اچھا نہیں لگا۔“

”یہ فلم تو صرف میں روپی کے قریب رہنے کیلئے بنا رہا ہوں۔“ بلال نے جلدی سے بتایا۔

”اس کے بغیر بھی آپ اس کے قریب رہ سکتے ہیں۔ آپ نیاز صاحب سے کہہ دیں جب تک روپی میری فلم میں کام کرنے کی حامی نہیں بھرتی تب تک میں فلم نہیں بناؤں گا۔ اور میں بھی نیاز صاحب سے کہہ دوں گی کہ میں روپی کو راضی کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ جلد ہی میری بات مان جائے گی۔ اس طرح چار پانچ ماہ تو آپ کے نکل ہی سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس عرصہ میں روپی روزانہ آپ کو آتا دیکھ کر اپنے رویے پر نظر ثانی کرے۔ اپنی شادی نہ کرنے کا پروگرام بدل کر شادی کیلئے ہاں کر دے۔ تب تک میں مصنوعی طور پر روپی کو آپ کی فلم میں کام کرنے کیلئے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تنگ کرتی رہوں گی۔“ نسیم نے مسکرا کر بلال کو دیکھا تو بلال نے کہا۔

”چلیں میں آپ کی یہ بات مان لیتا ہوں۔ ورنہ آپ کہیں گی دونوں ایک سے ضدی ہیں۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔“

”شکریہ مجھے یقین ہے اللہ یقیناً بہتر ہی کریں گے۔“ نسیم نے کہا۔ پھر مزید اپنا پروگرام بلال کو سمجھا کر وہ اجازت لے کر چلی گئی تھی۔

یہ تو تھے ان دونوں کے پروگرام۔

اور روپی کا اپنا پروگرام تھا۔ جو وہ پکا پکا قائل کر چکی تھی۔ وہ دن رات ایک کر کے اپنی زیر تحمیل فلموں کو مکمل کر رہی تھی۔ وہ دن رات تین تین شفتوں میں کام کر رہی تھی۔ دن رات کس کام میں اب اس کو اپنے آپ کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔ اسے میں ایک دن اپنے پروگرام کے مطابق نسیم نے روپی سے بات کرتے ہوئے کہا۔

”روپی بلال اور نیاز نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا کہ تمہیں میں بلال کی فلم میں کام کرنے کیلئے ایگری کر دوں۔ تم کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ بلال اپنی ذاتی فلم بنا رہا ہے۔ جس میں صرف وہ تمہیں ہیروئن لینا چاہتا ہے۔ نیاز نے بلال کو بتایا تھا۔ میں تمہاری دوست ہوں اور تم میری بات سے بھی انکار نہیں کر سکتیں۔ اس لئے بلال نے مجھے بلایا تھا۔ اب بتاؤ تم کیا کہتی ہو؟ کیا جواب دوں میں بلال کو۔“

”نسیم تم اچھی طرح بلال کے بارے میں میرے خیالات جانتی ہو۔ پھر بھی یہ بات مجھ سے کہہ رہی ہو۔ میں پہلے ہی بلال کے اس فیصلے سے بہت پریشان ہوں۔ تم نے وہیں انکار کر دینا تھا۔“ روپی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ اس نے ابھی تک بات نکل جانے یعنی پھیل جانے کے ڈر سے نسیم کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وہ ملک چھوڑ کر جا رہی ہے کہ اس نے فلمی دنیا کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تاہم جانے سے پہلے وہ اس کو بتانے کا ارادہ لازمی رکھتی تھی۔

”میں فوراً انکار کیسے کر سکتی تھی۔ ہاں اب کل ضرور کر دوں گی۔“ نسیم نے کہا تو جو بلال روپی خاموش ہی رہی تھی نسیم کتنی دیر اس کے ستائے ہوئے روئے چہرے کو دیکھتی رہی پھر کہا۔

”اگر اتنی ہی پریشان ہو اس کیلئے تو پھر سیدھی طرح شادی کیلئے ہاں کر دو۔ اس طرح تمہاری اپنی پریشانی بھی ختم ہو جائے گی اور بلال کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ بلکہ تم دونوں کے سارے مسائل ہی حل ہو جائیں گے۔ وہ بھی بہت زیادہ پریشان نظر آتا ہے۔“

”کاش! یہ ممکن ہوتا۔“ روپی نے کہا۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے مارے بے بسی کے۔

یہ دیکھ کر نسیم نے ایک بار پھر اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر روپی کی ناں ہاں میں تبدیل نہ کی۔ یہ دیکھ کر نسیم مایوس ہو کر واپس چلی گئی تھی۔

☆☆☆☆

بلال آج ذرا جلدی گھر آئے تھے۔ آج روپی بھی جلدی سٹوڈیو سے گھر واپس چلی گئی تھی۔ روپی کے بعد ان کا سٹوڈیو میں رکنا بے کاری تھا۔ اپنے روم میں جانے سے پہلے وہاں کے روم میں آئے اور روم کے اندر داخل ہو اسی چاہتے تھے کہ اندر سے آتی شمشاد خالہ کی آواز سن کر دروازے کے باہر ہی رک گئے۔ پھر اندر جانے کا ارادہ ملوئی کرتے ہوئے واپس



مڑنا ہی چاہتے تھے کہ اندر سے آتی ماں کی تیز آواز نے ان کے قدم روک دیئے۔ وہ شمشاد سے کہہ رہی تھیں۔ بلکہ شکوہ کر رہی تھیں۔

”شمشاد تمہاری بیٹی روبی نے تمہاری عزت خراب کی ہی تھی۔ اب میرا گھر بھی تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ بلال روبی کو حاصل کرنے کیلئے پاگل ہو رہا ہے۔ سنا اپنا ہوش رہا ہے میرے بیٹے کو اور سنا ہی اپنے معزز زور شریف خاندان کی عزت کا وہ خیال کر رہا ہے۔ سارا دن روبی کے پیچھے مار مارا پھرتا ہے۔ سعودیہ میں لگی نئی نئی نوکری چھوڑ کر صرف روبی کی وجہ سے چھٹی لے کر واپس آ گیا ہے۔ اب میری ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود واپس نوکری پر نہیں جاتا۔ ایک ہی بات کہتا ہے۔ روبی کے ساتھ شادی کرنے کے بعد ہی اب واپس جاسکوں گا۔ اچھی بات یہ ہے کہ روبی نے خود ہی بلال کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے انہیں اس لئے بلایا ہے روبی تمہاری بیٹی ہے۔ ذرا تم ہی بلال کو اس کے حوالے سے سمجھا کر دیکھو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہاری بات مان کر روبی کا پیچھا چھوڑ کر واپس اپنی نوکری پر چلا جائے۔ میری تو وہ بالکل نہیں سنا۔

”میری بہن میری بات کا برا نہیں منانا۔ جب وہ تمہارا بیٹا ہو کر تمہاری بات نہیں مان رہا تو پھر میری بات کیسے مان سکتا ہے؟“ حمیدہ نے صاف جواب دے دیا تھا۔ اس کو بلال سے بات کرتے ہوئے ویسے بھی ڈر لگتا تھا۔

”اچھا تو پھر مجھے ہی کچھ مشورہ دو۔ میں ایسا کیا کروں کہ بلال روبی کا پیچھا چھوڑ کر میری پسند پر شادی کرے نوکری پر واپس چلا جائے۔“ بیگم اخلاق نے پریشان سے کہا۔

”مشورے سے کچھ بھی ہونے کا نہیں ہم بھی دعا کرتے ہیں۔ تم بھی کرو اللہ روبی کو موت دے دے تاکہ ہم سب کی نجات ہو سکے۔ پتا نہیں وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب یہ آوارہ میرے گھر پیدا ہوئی۔“ حمیدہ نے کہا پھر منہ بھر بھر کر دونوں عورتیں روبی کو بددعا میں دیتے ہوئے کوئی بھی رہیں۔ بلال یہ باتیں سننے کے بعد واپس اپنے روم میں چلے آئے تھے۔ انہیں افسوس ہوا تھا۔ ان دونوں کی باتیں سن کر انہیں آج بھی اپنی غلطی کا احساس نہیں تھا۔ وہ آج بھی خود کو بے گناہ اور روبی کو مجرم سمجھتے تھے اور یہ بہت غلط بات تھی۔

☆☆☆☆

نسیم روبی سے ملنے کے بعد اگلے ہی روز بلال کے پاس آئی تھی۔ روبی کے ساتھ ہونے والی نہ صرف ساری بات چیت اس کو بتادی تھی۔ بلکہ روبی کی حالت بھی کھل کر سمجھادی تھی۔

روبی کی حالت کا سن کر بلال نہ صرف پریشان ہوئے تھے۔ بلکہ بہت بے چین بھی۔ یہ دیکھ کر نسیم نے بلال سے کہا۔

”اب اگر آپ ایک کام کرنے کو ایگری ہو جائیں تو روبی کی پریشانی بھی ختم ہو سکتی ہے اور آپ کا اپنا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیا؟“ بلال نے پوچھا تو نسیم نے بہت زیادہ سنجیدگی سے کہا۔

”بلال میری بات کو مذاق نہیں سمجھنا۔ روبی کیلئے فلم ساز بننے سے بہتر ہے کہ تم اداکار بن جاؤ۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ بلال نے نسیم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہی سمجھانے لگی ہوں۔“ نسیم نے کہا۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر کہا۔ ”میری بات بہت غور سے سنیں۔ روبی کس وقت کون سے سٹوڈیو میں ہے اور کس فلم کے سیٹ پر کام کر رہی ہے یہ بات میں خود آپ کو بتادیا کروں گی۔ اپنے سیٹ پر آنے کی تو روبی آپ کو بھی بھی اجازت نہ دے گی اور جب وہ سٹوڈیو آئے تب بھی نہیں۔ ہاں جب وہ شوٹنگ کرنے کے بعد واپس گھر جا رہی ہو تب آپ نے اسی حلقے میں آنا ہے جس حلقے میں اس شام آئے تھے۔ جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا مجھے مکمل یقین ہے۔ روبی زیادہ دن آپ کو اس حلقے میں برداشت نہ کر سکے گی۔ اور سرینڈر کرتے ہوئے شادی کیلئے ہاں کر دے گی۔ اب آپ بتائیں آپ ایسا کرنے کو تیار ہیں۔“ نسیم کی بات سن کر بلال سنجیدگی سے بولے۔

”حواس گم کر کے دکھائیے ہیں روبی نے میرے۔ میں روبی کو پرسکون عزت کی زندگی دینے کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ یقین کریں اگر میرے جیسا کرنے سے روبی مان سکتی ہے۔ شادی کیلئے راضی ہو سکتی ہے تو میں کل ہی سے آپ کے کہنے پر عمل شروع کر دیتا ہوں۔“ اس کے بعد مزید تفصیلات سے باتیں طے کرنے کے بعد نسیم چلی گئی تھی۔

اگلے ہی روز بلال نے اپنا جنونی محبتوں والا رول پلے کرنا شروع کر دیا تھا۔ روزیہ تماشا ہونے لگا جب روبی عکسبندی مکمل ہونے کے بعد سیٹ سے باہر آتی۔ کبھی اس وقت اور کبھی اس وقت جب وہ اپنے باڈی گارڈز کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب بڑھ رہی ہوتی۔ تب اور کبھی کبھار اس وقت جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہی ہوتی۔ بلال بھی گاڑی میں کبھی پیدل بھاگتے ہوئے روبی کو پکارتے ہوئے روبی کی جانب آتے۔ حلیا ایسا ہوتا جیسا سارا دن تمام سٹوڈیوز گھومنے کے بعد اب روبی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چہرہ گرد آلود ہی نہیں ٹھکن زدہ بھی۔ بے ترتیب کھمرے بال اور گرد آلود لباس کے ساتھ تھکا تھکا لہجہ۔ ”روبی پیلیز میری بات سن اوپلیز روبی۔“



وہ لمحے روپی کیلئے بے حد اذیت ناک ہوتے تھے۔ ان کو اس حلقے میں دیکھ کر ان کی یہ حالت دیکھ کر روپی کے دل پر کیا گزرتی تھی۔ یہ صرف وہی جانتی تھی۔ وہ کہ بغیر ان کی بات سنے بغیر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر گھر چلی آتی۔ اور سوچتی مارے دکھ کے جلدی جلدی فلموں کی عکسبندی کا سلسلہ مکمل ہوا اور اس کی اس عذاب اس اذیت سے جان چھوٹ جائے۔ وہ ملک سے باہر چلی جائے تو بلال بھی سب کچھ بھول کر ایک بار پھر اپنی پرسکون دنیا میں لوٹ جائے گا۔ پاگل ہو رہا ہے اس کو اپنانے کیلئے۔ اپنی عزت اور حیثیت کا بھی خیال نہیں رہا۔ اس اذیت ناک صورتحال کو برداشت کرتے ہوئے روپی نے اپنی تمام فلموں کا کام مکمل کروا ہی لیا تھا۔ اب صرف ٹی وی کے لئے روپی کی آخری ریکارڈنگ باقی تھی۔ تبھی اخبار میں بلال کی خبر روپی کے سچے عاشق کی کہانی کے عنوان سے لگ گئی۔ خبر میں بلال کا نام بھی لکھا گیا تھا اور پوری وضاحت کے ساتھ بتایا گیا تھا۔ کیسے وہ روپی کو دیوانوں کی طرح پکارتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور پکارتا ہے۔ مگر روپی اس کو گھاس ڈالنا پسند نہیں کرتی۔ ساتھ یہ بھی لکھا تھا۔ وہ کتنے بڑے اور معزز خاندان کا بیٹا ہو کر سب کچھ چھوڑ کر روپی کی محبت میں پاگل ہو کر پھرتا ہے۔ روپی کیلئے یہ پہلے سے بھی زیادہ اذیت اور صدمے کی بات تھی۔ خبر پڑھ کر وہ کتنی ہی دیر روٹی رہی تھی کہ اس کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔ اخبار نے سب کچھ سچ ہی تو لکھا تھا۔ بلال اپنے ہوش و حواس سے بے خبر ہو کر کب سے یہی حرکتیں تو کر رہے تھے۔ خود بھی دکھ اٹھاتا ہے۔ تھے اور روپی کو بھی ناقابل برداشت اذیت سے دوچار کر رہے تھے۔ لیکن اب تو سب ختم ہونے والا تھا۔ یہ سوچ کر روپی پرسکون تھی۔ اللہ اللہ کر کے وہ ٹی وی کیلئے اپنی آخری ریکارڈنگ مکمل کروانے کے بعد ذیشان سے مل کر گھر واپس آئی تو بہت پرسکون تھی۔ اس کے سارے ہی کام مکمل ہو گئے تھے۔ اور اب وہ کسی بھی وقت ملک چھوڑ کر جاسکتی تھی۔ مگر اب ماں نے اپنا تیا مسئلہ پیدا کر لیا تھا۔ ساتھ جانے کی ضد لگا کر۔

روپی نے سوچا وہ صبح ماں کو سمجھانے کی پوری کوشش کرے گی۔ اگر ماں اس کی بات مان لے گی تب بھی ٹھیک نامانی تب بھی ٹھیک۔ اس بات کا بھی اس کو مکمل یقین تھا کہ اس کے مستقل ملک چھوڑ جانے کی خبر سن کر بلال ناچا ہے ہوئے بھی اپنی دنیا میں لوٹ جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ بھی نالوث کر آنے کیلئے ملک چھوڑ کر جا رہی تھی اس کے جانے کے بعد ذیشان نے یہ بات سب کو بتا دی تھی۔ یعنی اخبار والوں کو۔ اس خبر کو پڑھ کر بلال کو خود بخود صبر آ جاتا۔ اس کو اب سب کو بتائے بغیر ہی جانا تھا۔ اب گھر سے باہر روپی کے سب کام مکمل ہو گئے تھے۔

بلال رات گئے گھر واپس آئے تو موڈ آف تھا۔ وجہ دو تین دن سے روپی سٹوڈیوز نہیں آ رہی تھی۔ نجانے کیوں جبکہ نسیم اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں بحرے کیلئے لاہور سے باہر گئی ہوئی تھی۔ وہ روپی کیلئے پریشان تھے۔ وہ جو مسلسل کتنے ہفتوں سے ایک ہی دن میں رات گئے تک تین تین چار چار شفٹوں میں کام کر رہی تھی۔ اب چاچا نک سٹوڈیو آنا چھوڑ دیا تھا۔ کہیں مسلسل کام کرنے کی وجہ سے بیمارنا پڑ گئی ہو۔ وہ فکر مندی سے سوچ رہے تھے۔ اب گھر آئے تو نا صرف ماں بلکہ مکمل بھائی بھی ان کا انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ دونوں سخت غصے میں تھے۔ بلال کو دیکھتے ہی مکمل بھائی اپنی جگہ سے اٹھ اٹھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار بلال کے سامنے کرتے ہوئے شدید غصے سے پوچھا۔

”بلال یہ سب کیا ہے؟ جو اخبار میں تمہارا بارے میں لکھا ہے۔“

بلال نے مکمل بھائی کی بات سن کر خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی تھی۔ اخبار میں اپنے بارے میں چھپنے والی یہ خبر تو وہ خود بھی صبح پڑھ چکے تھے۔ ان کو خاموش دیکھ کر مکمل بھائی کو مزید غصہ آ گیا۔ انہوں نے بلال کو گھورتے ہوئے کہا۔

”تم ذاتی طور پر جو بھی اس کو حاصل کرنے کیلئے کرو وہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔ لیکن ہمارے خاندان کی عزت سے کھیلنے کا تمہیں کوئی حق نہیں بلال وہ بھی ایک ایسی بدنام اور آوارہ۔“

اب کے بلال خاموش نہیں رہے تھے۔ انہوں نے بھائی کی بات کاٹے ہوئے کہا۔ ”پلیز مکمل بھائی! یہاں پر ہی سٹاپ پکڑ لیں۔ جو کچھ بھی کہنا ہے مجھے کہیں۔ میں سن بھی لوں گا اور برداشت بھی کر لوں گا۔ بے شک پاؤں سے جوتا اتار کر مجھے مار لیں۔ میں فٹ تک نہیں کروں گا۔ مگر روپی کے بارے میں ایک غلط لفظ تو کیا ایک حرف بھی نہ سن سکوں گا۔ وہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ صرف ایک لڑکی نہیں۔“ اس کے بعد مکمل بھائی تو غصے میں بھرے اپنے روم میں چلے گئے تھے۔ اور ان کے جانے کے بعد نسیم اخلاق نے ان کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”واپس نوکری پر جانے کا کب تک پروگرام ہے۔ یایاتی کی ساری عمر یونہی آوارہ کے پیچھے آوارگی کرنے کا پروگرام ہے۔“ انہوں نے مکمل بھائی کو تو آوارہ کہنے سے روک دیا تھا مگر ماں کو نندوک سکے۔ مگر غصہ ان کو حد سے زیادہ آیا تھا۔

”جب روپی شادی کیلئے ہاں کر دے گی تب اس کے ساتھ شادی کرتے ہی فوراً ہی اس کو ساتھ لے کر یہاں سے واپس سعودیہ چلا جاؤں گا۔“ بلال نے غصے سے کہا۔ پھر ماں کو وہیں



بیٹھی چھوڑ کر اپنے روم میں چلے گئے۔ نہاں سے زیادہ باتیں سن کر اپنا موڈ خراب کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی ماں کی شان میں کوئی گستاخی کرنا چاہتے تھے۔

یہیگم اخلاق کو گو کہ اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ روبی نے بلال کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر بلال کا اس کے باوجود روبی کے پیچھے مجنوں بن کر پھرنا ان کو ایک آنکھنا بھار ہا تھا۔ مگر وہ یہ سب دیکھنے پر مجبور تھیں کہ بلال ناان کی بات مانتا تھا اور نہ ہی بھائی کی۔

روبی تو ذیشان کے ساتھ بات کرنے کے بعد یہ سمجھی تھی کہ وہ اس کی امریکہ روانگی کی بات اس کے جانے کے بعد پرپس کو بتائے گا۔ مگر صبح کے اخبارات میں یہ خبر نمایاں تھی کہ مشہور اداکارہ روبی بہت جلد مستقل سکونت کیلئے امریکہ جا رہی ہیں۔ لکھا تھا کہ ذیشان نے ایک پارٹی میں اخباری نمائندوں کو بات چیت کرتے ہوئے بتایا۔

روبی نے اپنی امریکہ روانگی کا کام بڑے خفیہ طریقے سے انجام دیا۔ انہوں نے بتایا وہ روبی سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے روبی کو کئی بار شادی کی پیشکش بھی کی۔ مگر روبی نے ہر بار ٹھکرا دی۔ یاد رہے تین ماہ پہلے روبی نے تمام نئی فلمیں سائن کرنی چھوڑ دی تھیں اور تین تین چار چار شغلوں میں دن رات شوٹنگ میں حصہ لے کر اس نے اپنی زیر تکمیل سب فلموں کا کام مکمل کر دیا۔ چار روز پہلے روبی نے اپنی آخری فلم مکمل کروائی۔ اس کے بعد وہ سٹوڈیوز نہیں آئی اور آج رات ٹی وی کے لئے اس کی آخری ریکارڈنگ تھی۔

بلال کا موڈ رات مکمل بھائی کی باتوں کی وجہ سے خراب تھا۔ وہ ناشتے کی ٹیبل پر آئے اور بغیر کسی سے بات کئے اخبار دیکھنے لگے اور پھر روبی کے حوالے سے لگی خبر پڑھ کر چونکے۔ سوچا اچھا تو یہ وجہ بھی اس کے سٹوڈیوز نہ آنے کی۔ پھر یہ خبر انہوں نے ایک بار نہیں کئی بار پڑھی اور پھر اخبار ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”کہاں جا رہے ہو بغیر ناشتے کئے؟“ یہیگم اخلاق جو کافی دیر سے ان پر نگاہ رکھتے ہوئے تھیں۔ بلال کو اٹھتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”وہیں جہاں روز جاتا ہوں۔“ بلال نے یہ کہتے ہوئے پاؤں کی ٹھوک سے کرسی پیچھے کھسکائی اور سیدھے دروازے کی جانب بڑھے۔ ”روز جاتے ہو تو آج بھی چلے جانا۔ مگر پہلے ناشتہ تو کر لو۔ تمہیں معلوم ہے میں کسی کا ناشتے کی ٹیبل سے یوں اٹھ کر جانا پسند نہیں کرتی۔ چلو پہلے ناشتہ کر لو پھر چلے جانا۔ وہ جانتی تھیں رات کا اس کا موڈ آف ہے اس لئے اب کا اپنے لہجے کو کافی حد تک نرم رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”سوری امی آج بھی ارجنٹ جانا بہت ضروری ہے۔“ بلال نے کہا۔ پھر ان کا جواب سنے بغیر ہی باہر چلے گئے تھے تب یہیگم اخلاق نے گل سے کہا۔

”گل ذرا دیکھو تو سہمی آج اخبار میں کیا لکھا ہے۔ جس کو پڑھتے ہی بغیر ناشتے کئے ہی چلا گیا۔ یقیناً روبی کے بارے میں ہی کوئی خبر ہوگی۔“ ان کی بات سنتے ہی گل نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اخبار لیا۔ اس پر تیزی سے نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”امی جان واقعی روبی کے بارے میں ایک خبر سے جس کی وجہ موصوف ارجنٹ کہہ کر چلے گئے ہیں۔“ گل نے بتایا۔

”آج کیا لکھا ہے اس آوارہ کے بارے میں؟“ انہوں نے نفرت سے پوچھا۔ گل نے سرخی پر نظر ڈالی اور بولی۔

”اخبار میں لکھا ہے روبی مستقل سکونت کیلئے امریکہ جا رہی ہے۔“ گل نے خبر پڑھ کر ان کو سنا دی۔

●☆☆☆●

”شادی کر کے جا رہی ہے یا؟“ یہیگم اخلاق نے پوچھا۔

”نہیں امی جان! شادی نہیں کی۔ تنہا ہی جا رہی ہے۔“ گل نے کہا اور اخبار رکھ دیا۔

”اچھی بات ہے۔ وہ اس شہر اس ملک سے ہمیشہ کیلئے جتنی جلدی دفع ہو سکتی ہے ہو جائے۔ بد بخت نے اپنے گھر کا تو سکون برباد کیا ہی تھا۔ ہمارے گھر کا چین بھی لوٹ لیا۔ نجانے بے غیرت گئی کس پر ہے۔ بڑی بہن اتنی نیک شریف اور اب چھوٹی روبی کو دیکھ لو کتنی بیلری اور سادہ پنکی ہے۔ اور یہ آوارہ نجانے کس پر گئی ہے۔ خدا غارت کرے اس کم بخت کو۔ موت بھی تو نہیں آتی۔ پاگل کر رکھا ہے میرے بیٹے کو۔“ وہ پھر روبی کو کو سے تلگئیں۔

”چھوڑو بیٹھی جان! اب تو روبی کا قصہ ہمیشہ کیلئے پاک ہو رہا ہے۔ اب آپ کیوں پریشان و ہلکان ہوتی ہیں۔ چائے پیچھے اور روبی کو دعا بھی دیجئے کہ بلال کی ہزار منت سماجت کے باوجود وہ شادی کیلئے ایگری نہیں ہوئی۔ ورنہ بلال کب کسی سے ڈرنے والے نہیں تھے۔ بیاہ کر سیدھے گھر لے آتے۔ کسی کا بھی لحاظ کئے بغیر۔“ گل نے کہا تو وہ خاموش ہو کر چائے پیئے لگیں کہ بات تو گل کی ٹھیک ہی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ آج کل بلال کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان رہتی تھیں۔ رات جو روپاں نے روبی کیلئے بڑے بھائی کے



ساتھ اختیار کیا تھا۔ وہ بھی سوچنے کی بات تھی۔ ان کو قصہ تو بے حد آیا تھا۔ مگر بات بڑھ جانے کے ڈر سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کی تھی۔ وہ تو روپی کی محبت میں پاگل ہو رہا تھا۔ مگر وہ سب تو ہوش میں تھے۔

نسیم لاہور میں نہیں تھی اور اس کے بعد اور کوئی ایسا نہیں تھا۔ جس سے بلال روپی کے حوالے سے مدد لیتے۔ بس اپنے طور پر ہی اس کو رات گئے تک تلاش کرتے رہے۔ سارے سٹوڈیو گھوم لئے تھے۔ وہ نیاز صاحب کے پاس گئے یونہی تو انہوں نے بلال کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”آپ روپی کے بغیر فلم نہیں بنا رہے تھے اور وہ دیکھو کتنی چالاک نکلی۔ کسی کو بھی بتائے بغیر ہمیشہ کیلئے اس ملک کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔ جس نے اس کو عزت دی نام دیا۔“ بلال اتنا سنتے ہی باہر نکل آئے۔ بھوک پیاس سے بے نیاز وہ سارا دن اس کی تلاش میں پھرتے رہے۔ وہ وہاں بھی گئے جہاں نہیں جانا چاہئے تھا۔ مگر روپی ناپاکی تھی۔ اس کی رہائش کے بارے میں کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ اب وہ صرف نسیم کے جلد گھر واپس آنے کی دعا ہی کر سکتے تھے۔ سارا دن اس دشمن جان کی تلاش میں پھرنے کے بعد جب وہ رات کو گھر واپس آ رہے تو موسم ایک بار پھر ماضی میں لوٹ رہا تھا۔

سب سے پہلے تیز ہوائیں جھکڑ کی صورت میں چلنا شروع ہوئی تھیں۔ جو کسی طوفان کا پیشہ خیمہ تھیں۔ پھر بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج نے بلال کو وہ موسم یاد دلایا تھا جو بیت چکا تھا۔ ان کو شاید بھی نا بھرنے والا ایک رخم دے کر۔ بھی نا مٹنے والا داغ لگا کر۔ انہیں وہ وقت وہ رات یاد آ رہی تھی۔ جب روپی ان کے دربرو تھی۔ خوف سے سبھی کانٹتی پتاہ کی تلاش میں۔ مگر تب تب ان سے وہ غلطی ہوئی جس کا کفارہ ابھی تک ادا نہ کر پا رہے تھے۔ اور پتا نہیں کبھی کر بھی پائیں یا نہیں۔ وہ انہی سوچوں میں گم کار پورج میں روک کر جب اپنے روم کی جانب بڑھ رہے تھے تو خاصی تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ روم میں داخل ہوتے ہی بلال سیدھے درجے کی جانب آئے تو پردے کھینچ کر پورا درجہ کھل دیا۔ کچھ دیر کھڑے ہو وہ موسم کی شدت محسوس کرتے رہے اور اپنے ذہن سے اس رات کو بھی نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر اپنی اس کوشش میں ناکام رہے تھے۔ ہر سمت روپی کی بازگشت تھی۔ وہ ان کو پکار رہی تھی۔ ”بلال! بلال! بلال! دروازہ کھولو۔“

اف بلال سر تھام کر شکست خوردہ بیڈ پر جا بیٹھے۔ کتنی کوشش کی تھی مگر ان کو معاف کرنے کے باوجود ان کی حالت پر تڑپنے کے باوجود وہ ہمیشہ کیلئے ان کو چھوڑ کر ملک سے باہر جا رہی تھی۔ اب اس بات کا بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ روائگی کب ہے۔ ان کی وجہ سے وہ نسیم سے بھی خفا رہنے لگی تھی۔ اس لئے شاید نسیم کو بھی اپنے ملک چھوڑ کر جانے کی اطلاع نہ دی تھی۔ کیونکہ اگر نسیم کو اس کی روائگی کا علم ہوتا تو وہ لازمی ان کو بتا دیتی۔ باہر بارش مسلسل برس رہی تھی اور اندر وہ روپی کے بارے میں ہی سوچتے جا رہے تھے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا وہ صبح نسیم کے گھر جائیں گے۔ ان کے گھر والوں کو تو معلوم ہو گا ہی نسیم کہاں پر ہے۔ وہ نسیم سے رابطے کا نمبر ان سے لے کر نسیم کفون کریں گے۔ وہ جتنی جلدی ہو سکے لاہور آ جائے۔ فوراً رورنہ روپی ملک چھوڑ کر چلی جائے گی۔ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ انہوں نے سوچا اور مطمئن ہو گئے۔ مگر اس کے باوجود نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ روپی کے اس رویے نے ان کو سیلینڈر پیلر کا عادی بنا دیا تھا۔ نیند کی کوئی کھائے بغیر ان کو اب نیند نہیں آتی تھی۔ انہوں نے سائید نیمل پر رکھی سیلینڈر پیلر کی شیشی اٹھائی پھر اس میں سے دو نیمل نکال کر اس کو واپس رکھتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھالیا۔ نیملٹ پانی کے ساتھ ننگے کے بعد انہوں نے گلاس واپس رکھا اور تھکے تھکے سے بستر پر لیٹ گئے۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ بعد ہی ان کو کسی چیز کا ہوش نہ رہا ناموسم کی شدت کا۔ نہ ہی روپی کا اور نہ کسی اور چیز کا۔ وہ دنیا کے ہر احساس سے عاری ہو کر بے خبر سو رہے تھے۔ لیکن یہ الگ بات ہے سوتے میں بھی ان کے چہرے پر وحشت ہی برس رہی تھی۔ ان کو سوتے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ان کی بھابی گل ان کے روم میں داخل ہوئی۔ سیدھی درجے کی جانب گئیں سب سے پہلے درجہ بند کیا۔ پھر پردے برابر کرنے کے بعد آہستہ آہستہ بلال کے بیڈ کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ وہ نیند کی کوئی کھا کر دنیا جہان سے بے خبر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے باوجود دل کی حالت چہرے پر لکھی تھی۔ وہ روپی کی تلاش میں ناکام لوٹا تھا۔ گل کتنی دیر دکھ سے کھڑی اس کو دیکھتی رہی کہ وہ صرف اس کا دیور نہیں کزن بھی تھا۔ پھر بلال کے پاؤں میں پڑا کمبل اٹھا کر اچھی طرح ان کے اوپر ڈال کر لائٹ آف کی۔ سائٹ بلب روشن کرنے کے بعد باہر آ کر آہستگی سے دروازہ بند کر کے بیگم اخلاق کے روم میں چلی آئی۔ ”یقیناً وہ نیند کی کوئی کھا کر سو رہا ہوگا؟“

گل کو اپنے روم میں داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔ ان کے چہرے پر گہری فکرمندی کے آثار تھے۔ وہ اس وقت بہت زیادہ پریشان تھیں۔ اپنے بیٹے کیلئے وہ صبح اخبار میں روپی کے امریکہ جانے کی خبر پڑھتے ہی بغیر ناشتہ کئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب گھر واپسی پر رات کا کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ان کو تو یقین تھا سارا دن وہ گھر سے باہر بھی بھوکا



رہا ہوگا یہی وجہ تھی کہ انہوں نے گل کو چپک کرنے بھی بجاتھا کہ جاؤ دیکھو سو گیا ہے یا جاگ رہا تھا۔ اگر جاگ رہا ہے تو پھر کوشش کر کہ اس کو کھانا کھلا دو۔ بلال کی یہ حالت دیکھ کر ہی ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ روپی کی تلاش میں نا کام رہا ہے۔ یہ بات ان کی خوشی اور سکون کا باعث تھی۔ مگر بلال کی یہ حالت بھی اب ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ پچھلے کتنے مغتوں سے مسلسل سیلونگسے پلے رہا تھا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

”امی جان! وہ پھر سیلونگسے پلے رکھا کر بے سدھ پڑا ہے۔ اللہ جانے کب تک اس کی یہ حالت رہے گی۔“ گل نے پریشانی سے کہا۔

”بیگم خلاق ان کی یہ بات سن کر خاموش رہیں تو گل نے پھر کہا۔

”اگر یہی حالت رہی تو مجھے ڈر ہے کسی دن وہ پوری شیشی خالی نہ کر دے اور ہم لوگ تنہا بیٹھے سوچتے ہی رہ جائیں۔“ گل نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ایسی باتیں مت کر گل! اللہنا کرے جو بھی ایسا ہو۔“ بیگم خلاق نے تڑپ کر کہا کہ آخر ماں تھی۔

”ایسی باتیں کیوں نہ کروں امی جان جب کہ حالات بھی ایسے ہی ہیں۔ آپ بلال کیلئے کچھ کریں نا۔ وہ خفا ہوتا ہے تو ہو آپ کھل کر اس کو سمجھائیں۔ اللہنا کرے لیکن اگر ان مسلسل پریشانیوں سے تنگ آ کر کچھ لٹا سیدھا کر لیا تو ہمارا کیا ہوگا۔“ گل ان سے کم پریشان نہ تھی۔

”وہ ایسا ویسا کچھنا کرے گا۔“ اب کہ بیگم خلاق نے مکمل سکون سے کہا۔ بلال کو معلوم ہے خود کشی حرام ہوتی ہے اور اللہ حرام موت مرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ تمہیں معلوم تو ہے وہ بچپن سے ہی اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتا آیا ہے۔ میں نے اس کی تربیت بڑے خاص انداز سے کی تھی۔ بلال کی دینی تعلیم و تربیت پر میں نے سب سے زیادہ دھیان دیا۔ کہیں کوئی کمی نہ رہے۔ مجھے معلوم تھا جب بلال جوان ہوگا تو پکا اور سچا مومن مسلمان ثابت ہوگا۔“ وہ چپ ہو گئیں پھر بولیں۔

”آج اس بات پر پچھتاتی ہوں۔ انسان کو اس قدر بھی نیک اور مذہبی نہیں ہونا چاہئے کہ ساری زندگی گناہ اور ثواب کے چکر میں ضائع کر دے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ اسی راہ پر تو چل رہا ہے جس پر میں اس کو دیکھنا چاہتی تھی۔“

”مگر بالکل تنہا۔“ گل بول پڑی۔ وہ ایسے حالات میں کب تک چل سکے گا۔ آخر ایک نہ ایک دن تھک کر گر جائے گا۔ آج کے دور میں ایسے بے لچک اصول پرست لوگوں کی گنجائش ہی کہاں ہے۔ امی جان آج میں جو اس کی حالت دیکھ کر آئی ہوں۔ وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔ آپ بلال کے لئے جلد ہی کچھ کیجئے۔ آپ اپنی ممتا اپنی زندگی کا واسطہ دے کر اس کو شادی کیلئے نگری کریں۔ مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔“

”میں یہ بات کتنی بار کر چکی ہوں۔ مگر وہ میری نہیں سنتا اور اب جو حالات ہیں ان میں تو یہ بات کرنے کا سول ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس دعا کرو اللہ روپی کم بخت کو غارت کرے۔ اس ذلیل اور آوارہ لڑکی کو رات کے بعد دن دیکھنا نصیب نہ ہو۔ جب وہ فارسی تو بلال خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“ بیگم خلاق بات ختم کر کے سوچے ملیں۔ گل اجازت لے کر اپنے روم میں آ گئی تھی۔

اگلی صبح جب وہ نازل تھا۔ وارنٹ بے داغ سوٹ پہنہ وہ جب ناشتے والے روم میں آیا تو بیگم خلاق کو روز سے کچھ زیادہ ہی اچھا لگا تھا۔ وہ بہت محبت سے بیٹے کو دیکھنے لگی تھیں۔

”آؤ بھئی بہت دیر کر دی آج۔ طبیعت تو ٹھیک تھی۔“ کمال نے بھائی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”طبیعت کو کیا ہو سکتا ہے۔ وہ اصل میں نماز پڑھنے کے بعد واک پر جانے کی بجائے لیٹ گیا آج۔ شاید اس لئے آپ کو ایسا فائل ہو رہا ہے بھائی جان!“ بلال نے کہا اور ہنسنے لگا۔

ادھر دیکھنے کے بعد آلیٹ والی پلیٹ اپنے سامنے کھڑکاتے ہوئے پوچھا۔

”آج بھی تک اخبار نہیں آیا یا آپ لوگوں نے ٹیکل سے اٹھالیا۔“

”ہم لوگ کیوں اٹھا دیتے۔ گھر کا اندر نہیں تو تم گھر سے باہر جا کر پڑھ لیتے۔“ بیگم خلاق نے قدرے نا کواری سے کہا۔ بلال کی بات سن کر ان کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ صرف روپی کا سوچ کر۔

”امی جان اس میں بکڑنے والی کیلیات ہے؟ میں نے تو یونہی ایک عام سی بات کی تھی۔“ بلال نے حیرت سے ان کے چہرے پر پھیلی نا کواری کو دیکھتے ہوئے کہا۔ تب بیگم خلاق نے رات گل والی باتوں کی روشنی میں کہا۔



”بلال اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا بھی کچھ خیال ہے۔ کب تک مجھے پریشان کرتے رہو گے بیٹا! اب تو شادی کر لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری شادی کی حسرت دل میں لئے میں قبر میں اتر جاؤں۔“ بیگم خلاق نے بات ختم کر کے چہرے پر اداسی طاری کر لی۔ بلال کو متاثر کرنے کیلئے۔

”امی جان! اللہ جیسا لکھتا ہے۔ ویسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کا اپنے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ سے پہلے میں خود ہی فوت ہو جاؤں۔ موت کا کس کو پتا کہ کب کہاں آ جائے۔“ وہ بے رحمی سے بولا۔ ماں کے چہرے پر پھیلی اداسی بلال کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکی تھی۔ اگر وہ ان سے روٹی کی تلاش کا جھوٹا وعدہ نہ کرتیں تو آج نہ وہ بی اس مقام پر ہوتی اور نہ وہ اس کے لئے یوں پریشان پھر رہے ہوتے۔

”اللہ نہ کرے۔ کیسی بدقل منہ سے نکل رہے ہو۔“ بیگم خلاق اس کو ڈانٹنے لگیں۔ ”میں نے شادی کی بات کی ہے اور تم۔“ وہ بات ختم کر کے بلال کو گھورنے لگیں۔

”شادی شادی۔“ وہ سب کے چہرے پر اک نگاہ ڈال کر ناکاری سے بولے۔ ”کردیجئے میری شادی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر۔۔۔۔۔“ وہ رک کر ان سب کے چہروں کے تاثرات دیکھنے لگے۔

”مگر کیا۔۔۔۔۔؟“ بیگم خلاق نے جلدی سے پوچھا۔

”مگر امی جان! بہن سے میرا کوئی تعلق ناہوگا۔ وہ اس گھر میں صرف آپ کی بہن ہوں گی۔ اگر آپ کو یہ سب منظور ہے تو بے شک کل ہی میری شادی کر دیجئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر یاد رکھئے گا میری بیوی صرف روٹی ہی بن سکے گی اور کوئی نہیں۔“ انہوں نے بات ختم ہی کی تھی کہ بلازم لڑکا اخبار لے کر آ گیا۔ یہ دیکھ کر گل نے کہا۔

”لو۔ بھی تمہارا اخبار آ گیا۔ اب پڑھ لو۔“ بلال نے لڑکے کے ہاتھ سے اخبار لے کر فوراً ہی کھول لیا۔ ہو سکتا ہے آج پھر روٹی کی امریکہ روانگی کے حوالے سے کوئی خبر ہو۔ کم از کم اتنا ہی پتا چل جائے کہ وہ کب روانہ ہو رہی ہے۔ وہ جلدی جلدی اخبار پر نظر دوڑانے لگا اور پھر یکدم چلا اٹھے۔

”اوہ میرے اللہ! یہ کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ روٹی! یہ تم نے کیا کر دیا؟“ ان کی آواز دبہم ہو گئی۔ انہوں نے اخبار چھوڑ کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا تھا۔

”کیا ہوا بلال؟“ مکمل اپنی چیئر سے اٹھ کر جلدی سے بھائی کے قریب آئے تھے۔ بلال تو چپ رہے مگر بلال کے سامنے رکھے اخبار کے پہلے ہی صفحے پر روٹی کی موت کی خبر موجود تھی۔ مکمل نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے اخبار اٹھا لیا اور پڑھنے لگے تھے۔

”ادا کارہ روٹی بھی اللہ کو پیدا ہو گئیں۔ امریکہ جانے والا پلین کر لیا ہو گیا ہے۔ حادثے کی وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ حادثے کی خبر ملتے ہی امدادی پارٹیاں روانہ کر دی گئی ہیں۔ معلوم ہوا ہے معروف ادا کارہ روٹی بھی اس پلین میں سفر کر رہی تھیں۔ وہ مستقل سکونت کیلئے امریکہ جا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے عروج کے زمانے میں ہی فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“ مزید لکھا تھا۔

”یاد رہے روٹی نے بطور ادا کارہ ہی فلمی صنعت کی خدمت نہیں کی فلمی صنعت اور تجارت کی فلاح و بہبود کیلئے بھی بے حد جدوجہد کی۔ فلم انڈسٹری کی نمائندہ کی حیثیت سے روٹی نے اپنے فلمی دور میں حکام سے فلمی صنعت کی ترقی و ترقی کے سلسلے میں اکثر گفتگو کر کے بہت سارے فلمی مسائل حل کروائے۔ یہی نہیں ادا کارہ روٹی اپنی رقم دلی اور انسانی دوستی کیلئے بھی بہت مشہور تھیں۔ خاص کر چھوٹے آرٹسٹوں اور غریب ہنرمندوں کی وہ بڑی خاموشی کے ساتھ مدد کیا کرتی تھیں۔ ادا کارہ روٹی کی ایسی متعدد خوبیوں کی وجہ سے ان کو فلم انڈسٹری میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ روٹی جیسی ادا کارہ روز بروز پیدا نہیں ہوتی۔ روٹی ایسی فلموں کے حوالے سے اپنی طبعی موت کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ہماری دعا ہے اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔“

ادوان کے عزیزوں اور چاہنے والوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔“ (آمین)

مکمل نے خبر پڑھنے کے بعد اخبار واپس ٹیبل پر رکھا۔ پھر بھائی کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر گویا تسلیاں دینے کیلئے مناسب الفاظ سوچتے ہوئے ماں کو دیکھنے لگے۔ جو بڑی تیزی سے اخبار پڑھ رہی تھیں۔ روٹی کی موت والی خبر پڑھنے کے بعد انہوں نے اخبار واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے پر سکون لہجے میں کہا۔

”چلو خس کم جہاں پاک۔ جان چھوٹ گئی آج ہماری اس آوار لڑکی سے۔“

”امی جان پلیز!“ مکمل نے چالاکی سے ان کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھانے کی کوشش کی۔ خوشی تو روٹی کی موت کا پڑھ کر ان کو بھی بے حد ہوتی تھی کہ ان کے گھر جو مسائل اس



کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے وہ اب ختم ہونے والے تھے۔ مگر اس خوشی کا اظہار بلال کے سامنے کرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد وہ بلال سے مخاطب ہوئے۔  
 ”دیکھو بلال! موت برحق ہے۔ یہ بات تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ موت جب آتی ہے تو اس کو کوئی بھی نہیں پال سکتا۔ میرے بھائی، ہم نے تو محض تمہاری خوشی کیلئے دل پر پتھر رکھ کر تمہیں روپی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ مگر افسوس روپی کے ساتھ شادی تمہارے مقدر میں نہ تھی۔ شاید اس لئے کہ روپی تمہاری محبت پر یقین کرنے کے بجائے بے اعتباری کا اظہار کرتے ہوئے مسلسل شادی سے انکار کرتی رہی۔ اب صبر کرو میرے بھائی کہ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اب تو سب کچھ ہی ختم ہو گیا ہے۔“ ان کی بات سن کر بلال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”بھائی جان! میں نے تو ابھی اپنے گناہ کا کفارہ بھی ادا نہ کیا تھا کہ روپی چل بسی۔“ اتنا کہتے ہی وہ اٹھے اور گھر سے باہر جانے کے بجائے اپنے روم میں گئے۔ دروازہ بند کر لیا۔ ان کے جاتے ہی بیگم خلاق نے سکون کی ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہماری بددعا میں سن لی اور روپی کا ٹھالیا۔“ یہ سن کر کمال نے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بلیز ای جان! بلال کے سامنے اپنی اس قسم کی باتوں سے پرہیز کیجئے گا۔ کہیں غصے میں آ کر وہ کچھ غلط نہ کر بیٹھے۔ ابھی اس کو مارا ہونے میں تھوڑا ناٹم لگے گا۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ کہہ کر وہ ہاسپٹل چلے گئے۔ بغیر ناشتہ کئے کہ ان کو دیر ہو رہی تھی۔ گل ساس کے ساتھ بیٹھ کر روپی کی موت پر اظہار خوشی کرنے لگی۔ ایک بلا بھی جوان کے سروں پر بیٹھے بیٹھے ٹپک گئی تھی۔

☆☆☆

شمشاد ابھی صبح ناشتہ کرنے بیٹھی ہی تھی کہ ان کی بھانج گڈو کی ماں کا فون آ گیا۔ اس نے شمشاد کی ہیلو سنتے ہی کہا۔  
 ”شمشاد! پا بہت افسوس ہوا؟“

”کس بات کا؟“ شمشاد نے چائے میں بھگی باقر خانی والا پیلا اپنے سامنے کرتے ہوئے پوچھا تو ان کی بھانج نے کہا۔  
 ”کمال ہے شمشاد! سارے ملک میں شور مچا ہے اور آپ کو واقعی کچھ پتہ نہیں۔“

”کس بات کا شور مچا ہے؟“ شمشاد نے پوچھتے ہوئے اپنے سامنے رکھے پیالے میں سے چائے میں بھگی باقر خانی کا چمچ بھر کر منہ میں ڈال لیا۔

”ارے شمشاد! تمہاری روپی مر گئی اور تمہیں کوئی خبر ہی نہیں۔“ گڈو کی ماں نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا اور شمشاد کے ہاتھ سے چمچ گر پڑا۔ مارے دکھ یا صدمے کے نہیں بلکہ بے پناہ خوشی کی کیفیت کی وجہ سے۔ شمشاد نے چائے باقر خانی والا پیلا ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے بہت بے تابلی سے پوچھا؟  
 ”کیا واقعی روپی مر گئی؟ اگر یہ خبر سچی ہے تو پھر مجھے جلدی سے بتاؤ۔ تمہیں اس بات کا کیسے پتا چلا کہ روپی مر گئی ہے؟“

”شمشاد! پاروپی فلموں میں کام چھوڑنے کے بعد پاکستان چھوڑ کر مستقل رہائش کیلئے امریکہ جا رہی تھی۔ وہ جس جہاز میں امریکہ جا رہی تھی وہ پرواز کے تھوڑی دیر بعد ہی کریش ہو گیا۔ جہاز میں سارے ہی مسافر مر گئے۔ جن میں روپی بھی شامل تھی۔ آپ نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ آج کا تو سارا اخبار ہی جہاز کے کریش اور روپی کی خبروں سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے تو سوچا آپ نے یہ خبر پڑھ لی ہوگی۔“

”ارے اس کمبخت کی وجہ سے ہی تو ہم نے اخبار بند کر دیا تھا۔ آئے روز اس کے بارے میں نئی نئی خبریں اور پھر ناچتی ہوئی کی تصویریں چھپی تھیں۔ سلمان کا تو اس کی خبر پڑھتے ہی اور تصویریں دیکھتے ہی خون کھولنے لگتا تھا۔ اور سنو لوگوں کیلئے وہ آج مری ہے۔ ہمارے لئے تو اس دن ہی مر گئی تھی جس دن ہماری عزت پر پاؤں رکھ کر گھر کی دلیز پار کر کے بھاگی تھی۔ آج تو اس کے مرنے کی خبر سن کر مجھے سکون مل گیا ہے۔ آج میرے شوہر کو بھی سکون مل جائے گا اور میرے بیٹے کا کھولنا خون بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ روز اخبار میں روپی کے بارے میں نئی نئی باتیں اور نئی نئی تصویریں اور تم تو اپنی ہو۔ شریکا تو پھر شریکا ہی ہوتا ہے۔ جب بھی اس بے غیرت کے بارے میں کوئی نئی خبر لگتی تھی تو میری دیورانی حرام زادی بطور خاص فون کرے بتاتی تھی۔

ارے بڑی بھالی کچھ بتا چلا آج کے اخبار میں تمہاری روپی کے بارے میں یہ خبر لگی ہے۔ تب سینہ کیسے پھٹتا تھا؟ دل کیسے تپتا تھا؟ یہ میں ہی جانتی ہوں یا پھر میرے گھر والے۔



اب کوئی مجھے فون کر کے یہ نہ کہہ سکے گا کہ آج تمہاری روپی کے بارے میں یہ خبر اخبار میں لگی ہے۔ ارے کہتے ہیں چودھری نواز نے اس کو تین برس اپنے پاس رکھا۔ اس بڈھے نے بیٹی بنا کر تو نہ رکھا ہوگا۔ وہ تو ایک نمبر کا حرامی مشہور ہے۔ اخبار میں اکثر اس کی عیاشی کی خبریں لگتی رہتی ہیں۔ کہتے ہیں یہ کوٹھی جس میں روپی رہتی تھی۔ یہ بھی چودھری نواز نے ہی اس کو دی تھی۔ پیسے کیلئے کیسے کیسے کام کرتی رہی۔ ارے یہیہ تو تجروں کے پاس بھی ہوتا ہے۔“ کہتے ہوئے حمیدہ نے فون بند کر دیا۔ پھر رونے لگیں۔ گڈو جو سب کچھ سن چکی تھی قریب بیٹھ کر ان کو تسلیاں دینے لگی۔ تاہم خود اس کو روپی کی اس موت کا بے حد صدمہ پہنچا تھا۔

نصیر صاحب اور سلمان بھی رات کی بجائے دن میں ہی جاتے جاتے واپس گھر آ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آج کے اخبار تھے۔ نصیر صاحب نے شمشاد کے قریب بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”کچھ بتا چلا تمہیں یا بے خبری بیٹھی ہوا بھی تک۔“

”سب بتا چل گیا ہے۔ ابھی گڈو کی ماں کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی روپی مر گئی اور میں کہتی ہوں آخر خدا کو ہم پر ترس آ ہی گیا۔ اللہ نے ہماری فریاد سن لی۔ سلمان کے لبا ہماری عزت خراب کر کے خوشی برباد کر کے گئی تھی تو خود کو نسا عزت اور امن کی موت مری۔ پتا نہیں جسم کے کتنے ٹکڑے ہوئے ہوں گے اور قبر تو کیا کفن بھی نصیب نہیں ہوا۔“ انہوں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”سچ کہتی ہو۔“ نصیر صاحب نے صرف اتنا کہا اور سلمان مارے خوشی کہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ مگر شمشاد نصیر کے پیچھے مگر سلمان کے سامنے کھڑی گڈو نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

تین ماہ پہلے گڈو کے باپ بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ جبکہ بیٹی سے پہلے دو بیٹے ہوئے تھے۔ بیٹی کی پیدائش پر حلاکتہ ویسے تو وہ بیٹی کی پیدائش سے پہلے بھی کافی حد تک روپی کے حوالے سے سلمان کا دل نرم کر چکی تھی۔ مگر اب بیٹی ہونے پر اس نے سلمان سے پوچھا تھا۔ ”میرے تین بچے ہیں اگر میں ان میں سے دو کے ساتھ اچھا اور آپ کی بیٹی کے ساتھ سخت سلوک کروں تو۔“ سلمان نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا تھا۔

”میں تمہارے بیٹوں کی ایسی کی تلمی کر دوں گا۔“ تب گڈو نے پہلی بار کہا تھا۔ اس گھر میں کون تھا جو روپی سے محبت کرتا تھا؟ روپی گھر کا کام بھی زیادہ روپی سے لیتی تھی اور اس کو مارتی بھی بے تحاشہ تھی۔ بھوپھو کی مار کا تو کبھی جانتے ہیں۔ آپ بھی تو ان دونوں کے ساتھ شامل تھے۔ اور تو اور روپی کو اس کے ساتھ کھیلنے کی اجازت تک نہ تھی۔ اب روپی کو برا کہنا چھوڑ دیں۔ پتا نہیں وہ بد نصیب انہوں سے دور ہو کر کیسی زندگی بسر کر رہی ہے۔ یہ نہ ہو آپ کے اس رویے کا اثر میری بیٹی پر پڑے۔ اللہ کے قبر سے ڈنا چاہئے۔“ تب سے سلمان نے روپی کو برا بھلا کہنا مکمل طور پر چھوڑ دیا تھا۔ اور اب شمشاد ان دونوں باپ بیٹوں کو بتا رہی تھی۔

”روپی کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میری ساس روپی کے فیسوں کیلئے آنا چاہتی ہیں۔ میں نے اس کو منع کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا۔ ان کو روک دو کہ ہمارے لئے تو وہ تب ہی مر گئی تھی۔ جب اس نے ہمارے گھر کی دلیز پار کی تھی۔ جب ہمارے گھر کی پہلی خوشی برباد کی تھی۔ جاتے جاتے شادی کیلئے رکھی گئی رقم میں سے دس ہزار بھی ساتھ لے گئی۔ بیٹا سوچا گن من کر شادی کی ضرورت کے مطابق رقم ہوگی۔“ حمیدہ ہنستی رہیں اور وہ دونوں باپ بیٹا خاموشی سے سنتے رہے۔ بولتے نصیر صاحب بھی کم کم ہی تھے۔ مگر سب خوش تھے کہ شکر ہے روپی مر گئی۔

گھر میں کسی کو بھی روپی کی اس ناگہانی موت کا دکھ نہیں تھا۔ سوائے زوپی کے وہ بھی کالج سے جلدی گھر واپس آ گئی تھی۔ گڈو کے گلے کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ مگر کہا تھا اتنا ہی تھا۔

ہماری بہن فوت ہو گئی۔ ہماری نفرت کو اپنے دل سے لگائے۔“ گڈو اس کو تسلی دیتے ہوئے پیار کرتے ہوئے اپنے روم میں لے گئی تھی۔ باقی سب لگ بھگ خاموش ہی رہے تھے کہ مرنے والی مر چکی تھی۔ اب زوپی کو کیوں ڈانٹ کر اس کا سو ڈنڈہ برباد کیا جائے کہ مرنے والی بہر حال اس کی بہن تھی۔ وہ اگر رونا چاہتی ہے تو رونے دیں۔

اور پھر اسی رات شمشاد نے روپی کے حوالے سے اپنی زندگی کی آخری ذلت اٹھائی تھی۔ رات سارا ہی سسرالی خاندان روپی کی موت پر تعزیت کرنے ان کے گھر آیا تھا۔ بلکہ تعزیت اور افسوس کم اور طنز زیادہ۔ ابھی حمیدہ کی دیورانی نے بات شروع کی ہی تھی کہ شمشاد نے ایک ہی بات کہہ کر باقی سب کے منہ بھی بند کر دیئے۔ کسی کو مزید کچھ کہنے کے لائق نا



رہنے دیا۔

”میں کہتی ہوں آپ لوگوں نے خواہواہ آنے کی زحمت کی۔ ہمارے لئے تو وہ تب ہی مر گئی تھی جب ہمارے گھر سے بھاگی تھی۔“ شمشاد کی اس بات کے بعد سب ہی چپ ہو گئے تھے پھر کسی نے روپی کا نام تک نہ لیا تھا۔ ادھر ادھر کی کچھ باتیں کرنے اور چائے پینے کے بعد وہ لوگ چلے گئے تھے۔

☆☆☆☆

دوپہر کے کھانے پر جب مکمل کھانے کیلئے گھر آئے تو بیٹے سے کہا۔ ”جاؤ چاکو کو کھانے کیلئے بلا کر لاؤ۔“ بیٹا گیا تو انہوں نے ماں سے پوچھا۔ ”آپ میں سے کوئی تسلی دینے اس کے پاس نہیں گیا؟“

”گل کو تمہارے جانے کے بعد بھیجا تھا۔ مگر اس نے دروازے کو اندر سے لاک لگا رکھا تھا۔ گل کے کئی بار دستک دینے پر بھی اس نے دروازہ نہیں کھولا تو گل واپس آ گئی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد میں خود بھی گئی۔ دروازہ بھی ناک کیا اور آواز بھی دی کہ ناشتہ کر لو۔ مگر اس نے پھر بھی دروازہ نہیں کھولا۔ میرا خیال ہے اب بھی نہیں کھولے گا۔ چند روز بھوکا رہ کر روپی کی محبت کا سوگ منانے کا پروگرام ہوگا۔“ وہ خاموش ہوئیں تھیں کہ بوتے نے آ کر بتایا۔

”بابا جان چلو اپنے روم میں نہیں ہیں۔“ یہ سنتے ہی بیگم خلاق کو غصہ آ گیا۔

”ارے اب کیا روپی کے جنازے میں شرکت کرنے گیا ہے۔ مگر اس کی لاش کہاں پئی ہوگی۔ ہمارا خون جلاتی تھی تو خود بھی تو جل کر ہی مری ہے۔ دیکھو میں صبح کی یہاں بیٹھی ہوں اور وہ نجانے کیسے چھپ کر چلا گیا ہے۔ پر گیا کہاں ہے یہ تو پتہ کرو۔“ انہوں نے مکمل سے کہا۔

”امی جان آپ کا اب پریشان ہونا فضول ہے۔ اور بکڑنا بھی بیکار ہے۔ اللہ نے جب خود ہی آپ کا مسئلہ حل کر دیا ہے تو پھر آپ پر سکون ہو جائیں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے اس کا دل بہلانے کی کوشش کیجئے۔“ مکمل نے کہا تو بیگم خلاق چپ ہو گئیں کہ گل نے بھی شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ وہ لوگ رات کا کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ جب سارا دن گھر سے باہر گزار کر بلال گھر میں داخل ہوئے۔ بیگم خلاق نے مکمل کی باتوں کی روشنی میں چہرے پر سوکاری طاری کرتے ہوئے کہا۔

”ارے میرے بیٹے تو کہاں چلا گیا تھا مجھے بتائے بغیر؟ میں تمہارے لئے سارا دن پریشان رہی۔ اب آئے ہو تو آؤ کھانا پہلے کھا لو پھر کچھ اور کرنا۔ تمہارے انتظار میں ہم نے دوپہر کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔“

”آپ کھانا شروع کر س میں ابھی آتا ہوں۔“ بلال نے ان کو دیکھے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔ اور اپنے روم میں چلے گئے۔ مگر جلد ہی ان کی واپسی ہوئی۔ اب ان کے ہاتھ میں سفری بیگ تھا۔ جسے یقیناً وہ صبح گھر سے باہر جانے سے پہلے تیار کر کے رکھ گئے تھے۔ جبھی تو اب جلدی سے اٹھائے باہر چلے آئے تھے۔ وہ سیدھے ماں کے قریب آ کر رک گئے پھر کہا۔

”امی جان آپ سب گھر والوں کو روپی سے نفرت تھی۔ اور اب جب روپی زندہ نہیں رہی تو مجھے شادی سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں صبح کا سعودیہ جانے کیلئے ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو مجھے مل گیا ہے۔ روپی نے آپ سب لوگوں کی بے رحمی اور بے حسی کی وجہ سے دنیا چھوڑ دی ہے تو میں اس ملک اور آپ لوگوں کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آج کے بعد اگر میں روپی کو نہ دیکھ سکوں گا تو اللہ کی قسم آپ بھی زندگی بھر مجھے نہ دیکھ پائیں گے۔“

”بلال یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ بیگم خلاق جلدی سے اٹھیں۔ ساتھ مکمل بھی مروہان لوگوں کوڑ کر دیکھے بغیر سیدھے باہر آئے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ایئر پورٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔ جو ان پر گزر رہی تھی اس کو صرف وہی محسوس کر رہے تھے۔ اب چونکہ نسیم سے ملنا بھی بیکار تھا۔ اس لئے وہ نسیم سے ملے بغیر ہی واپس جا رہے تھے۔ یکدم ہی ان کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

بلال کو سعودیہ آئے تین برس ہو چکے تھے اور ان کی محبت ان کی روپی کو بھی آغوش فنا میں سمائے تین برس ہو چکے تھے۔ ان کی مستقل رہائش سعودیہ کے شہر انور میں تھی۔ جس کو چھوٹا پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ وہ روپی کی ہر برسی پر خانہ کعبہ آتے۔ روپی کے نام پر عمرہ کرتے۔ حسبِ توفیق خیرات کرتے اور پھر دوسرے روز واپس روانہ ہو جاتے۔ اس بار بھی وہ روپی کی



تیسری برسی پر خانہ کعبہ آ رہے تھے کہ کمال بھائی کا خط ملا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ ماں سخت بیمار ہیں اور تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ جتنی جلدی آسکتے ہو آ جاؤ۔ بلال کا پاکستان جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ تاہم انہوں نے سوچا اب کی برسی پر خانہ کعبہ تو جانی رہا ہوں۔ وہاں امی جان کی صحت یابی کیلئے بھی دعا کروں گا۔ اور پھر وہ خانہ کعبہ چلے آئے تھے۔ روپی کے نام کا عمرہ کرنے کے بعد وہ دعائے مانگنے کے بعد ہاتھ چڑے پر پھیرنے کے بعد واپس مڑے اور ابھی چند ہی قدم اٹھائے تھے کہ نظر برآمدے میں بیٹھے ایک چہرے پر جا پڑی۔ وہ جہاں تھے وہیں تھم کر رہ گئے تھے۔ ناقابل یقین بات لگتی تھی۔ مگر حقیقت وہ آہستہ آہستہ اس چہرے کی جانب بڑھنے لگا اور پھر قریب پہنچ کر رک گئے۔

”اوہ میرے اللہ کیا یہ سچ ہے۔“ انہوں نے سوچا پھر بڑی محبت اور نرمی سے پکارا تھا۔

”روپی!“

ان کی آواز سنتے ہی اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ جس پر تھکاوٹ نمایاں تھی۔ چند سیکنڈ بلال کو اجنبی نظروں سے دیکھتی رہی پھر چہرہ جھکایا تو بلال نے تڑپ کر جھکتے ہوئے پھر پوچھا۔

”روپی! یہ تم ہونا۔“

”آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔“ اس نے اب کہ چہرہ اٹھا کر بلال کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو بلال نے جلدی سے کہا۔

”روپی! یہ تم ہونا۔“

”معاف کیجئے گا میرا نام شب نور ہے۔“ اس نے وضاحت کرتے ہوئے اپنا چہرہ پھر جھکایا تھا۔ بلال نے حیرت سے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہی آواز وہی چہرہ اور وہی جسم۔“ کہتے کہتے دھڑک گئے مگر شب نور نے جواب دینا تو دور کی بات چہرہ اٹھا کر ان کو دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔ بلال نے پھر کہا۔

”روپی! یہ تم ہی ہو۔ نام بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ دیکھو میں بلال ہوں تمہارا بلال۔“

”آپ کی سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آتی۔ میرا نام شب نور ہے اور میں اپنی والدہ کے ساتھ یہاں آئی ہوں۔ پتا نہیں آپ کس روپی کی بات کر رہے ہیں؟“ اب کی بار اس نے سختی سے کہا تو بلال اس کو دیکھتے رہ گئے۔ اتنے میں کسی عورت نے پیچھے سے آواز دی۔ آؤ شب نور بیٹی! اب چلتے ہیں۔“

”جی امی جان!“ وہ آہستگی سے اٹھی۔ تب عورت بھی پیچھے سے نکل کر سامنے آ گئی تھی۔ بلال کو یقین آ گیا کہ وہ روپی نہیں کہ اس کی والدہ نے بھی اس کو شب نور کہہ کر پکارا تھا۔ مگر دل بفران ہونے لگا تھا۔ وہ جانے لگی تو بلال نے بہت دکھی ہو کر اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو تم میری روپی نہیں ہو۔ میرا مطلب ہے آپ واقعی روپی نہیں ہیں۔“

”کون روپی؟! آپ کس روپی کی بات کر رہے ہیں؟“ لڑکی کی والدہ نے پوچھا تو لڑکی نے جلدی سے کہا۔

”امی جان! یہ کب سے مجھے روپی روپی کہہ کر تنگ کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھی ہے کہ میرا نام شب نور ہے۔ مگر ان کو شاید یقین نہیں آیا۔“ شب نور نے اپنی والدہ سے کہا تو بلال بھی جلدی سے بول پڑے۔

”میرا یقین کیجئے میں غلط نہیں کہہ رہا۔ روپی میری محبت تھی۔ خوشی تھی اور میرے لئے زندگی بھی وہی تھی۔ پھر وہ ایک حادثہ میں ہلاک ہو گئی ہے۔ اس حالت میں کہ مجھ سے خفا تھی۔ اس کے بعد میں نے بھی ہر خوشی سے منہ موڑ لیا۔ اس نے دنیا چھوڑی تو میں سب اپنوں کو چھوڑا اور اپنے ملک کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر اسی دن یہاں آ گیا اور پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں گیا۔ تاہم جانے کا کبھی ارادہ ہے۔ اپنی زندگی میں تو کیا موت کے بعد بھی ادھر ہی رہنے کا ارادہ ہے۔ تین برس ہو گئے میری روپی میری محبت کو مجھ سے جدا ہوئے مگر میں نے شادی نہیں کی اور نا ہی ساری زندگی کرنے کا ارادہ رکھا ہوں۔ میں ہر برس اپنی روپی کی برسی پر یہاں اللہ کے گھر آتا ہوں۔ آج بھی میری روپی کی برسی ہے۔ اس لئے میں یہاں آیا ہوں۔ اس کے نام کے عمرے کرنے اور اس کے نام کی خیرات کرنے۔ میرا یقین کریں میں اللہ کے گھر کھڑا ہوں۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں ان کی شکل و صورت تو کیا آواز بھی میری روپی سے ملتی ہے۔ حتیٰ کہ قد اور عمر بھی۔ میری روپی کی عمر بھی یہی تھی جب وفات ہوئی۔“ بلال خاموش ہوئے تو شب نور کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بلال کو ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا تمہاری کہانی بہت دردناک ہے۔ مگر میں پھر بھی یہ کہوں گی مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ بیٹا تمہاری محبت اپنی جگہ مریوں تمہا زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ شادی



کرلو۔ اس طرح دل میل جائے گا۔“

”شادی کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ کہہ کر بلال باہر کی جانب چل دیئے۔ شب نور اور ان کی والدہ بھی ان کے ساتھ ہی چل رہی تھیں۔ باہر آ کر ان کے راستے الگ ہو گئے تھے۔ بلال اپنی گاڑی کی جانب آئے اور وہ دونوں ماں بیٹی پیدل ہی اپنی منزل کی جانب چل دیں۔ ان کی رہائش یہاں قریب ہی تھی۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد شب نور کی والدہ کو نجانے کیا یاد آیا کہ انہوں نے بیٹی سے کہا۔

”نور بیٹی! تم ذرا یہاں رکو میں ابھی آئی۔ پھر وہ بڑی تیزی سے بلال کی جانب آئیں جو اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ رہے تھے۔ جب ماں نے بڑی بے تابی سے پیچھے سران کو پکارا۔

”بیٹا میری بات سن لو۔“ آواز سن کر بلال نے چہرہ گھما کر اپنے پیچھے دیکھا تو شب نور کی والدہ ان کو پکارتی ان کی جانب آ رہی تھی۔ بلال وہیں رک گئے۔ تب تک وہ بلال کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ پھر انہوں نے بے حد محبت سے بلال کو دیکھتے ہوئے ہانپتے ہوئے پکارا۔

”بیٹا میری بات سنو۔“

”جی فرمائیے۔“ بلال نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

”بیٹا واپس نہیں جانا۔“ ماں نے جلدی سے صرف اتنا کہا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟ واپس نہ جاؤں مگر کیوں؟“ بلال واقعی کچھ نہ سمجھتے تھے۔

”بیٹا مطلب سمجھانے کیلئے میرے پاس زیادہ نام نہیں۔ میرا فون نمبر جلدی سے لکھ لو۔“

بلال نے کچھ بھی کہے پوچھے بغیر پاکٹ سے چھوٹی نوٹ بک نکالی تو ماں نے جلدی جلدی نمبر لکھوایا۔ پھر کہا آج بعد دوپہر مجھے لازمی یاد سے فون کر لینا۔ ابھی واپس انہو بر نہیں جانا۔“ پھر جلدی سے واپس مڑ گئیں۔ مگر جاتے جاتے پھر بلال سے کہا۔

”ٹھیک دو بجے فون کرنا۔“ اور واپس چلی گئیں۔ بلال گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے وہیں کھڑے سوچتے رہے۔ مگر کچھ سمجھنا آئی تھی کہ ماں نے ایسا کیوں کہا ہے۔ پھر وہ ہر جھٹک کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ماں واپس آئی پھر کہا۔

”آؤ نور بیٹی اب چلتے ہیں۔“

”آپ کہاں گئی تھیں؟“ نور نے مشکوک انداز میں ان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ مگر ماں نے سنی ان سنی کر دی اور جواب دیئے بغیر چلنے لگی۔ نور جیسے نیسے ان کے ساتھ گھر آئی اور گھر آتے ہی اس کا رخ تار کر رونے لگی۔ ماں چند لمحوں کو دیکھتی رہی پھر کہا۔

”میری بات کا برا نہیں ماننا بیٹی! تمہارا رونا اس کیلئے بے کار ہے۔ اب بھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم ایک اچھا فیصلہ کر کے اپنی اور اس کی زندگی مزید تباہ ہونے سے بچا سکتی ہو۔ خوشگوار بنا سکتی ہو۔ دیکھو وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے۔ اس لئے تمہارے بعد سب اپنوں حتیٰ کہ اپنے وطن کو بھی چھوڑ کر صرف تمہارے نام پر زندگی بسر کر رہا ہے۔“ نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماں نے پھر کہا۔

”تم نے اس کو صرف اس لئے چھوڑا تھا کہ وہ اپنوں میں لوٹ جائے اور ایک پرسکون زندگی بسر کرے۔ مگر تمہارے بعد اس نے سب کو چھوڑ دیا۔ مگر تمہیں پھر بھی نہیں چھوڑا۔ وہ تمہارے نام پر زندگی بسر کر رہا ہے۔“ نور نے ماں کی بات کا جواب دینے کے بجائے صرف اتنا کہا۔

”میرا ڈیوٹی پر جانے کا نام ہو گیا۔ وہ جلی گئی تو ماں بستر پر لیٹ گئی۔ اب ان کو بلال کفون کا انتظار تھا اور ٹھیک دو بجے بلال کا فون آ گیا تھا۔ ماں نے ہیلو سنتے ہی کہا۔

”بیٹا اگر یہاں میرے پاس آ سکتے ہو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ میرے پاس تمہارے لئے خوشخبری ہے۔“ بلال کے ہاں کہنے پر ماں نے اس گھر کا ایڈریس سمجھا دیا۔ آدھ گھنٹہ بعد ہی بلال ماں کے سامنے بیٹھے تھے۔ ماں آہستہ آہستہ بڑی رازداری سے ان کو بتا رہی تھی۔



”وہی روہی ہے۔ یعنی شب نور ہی روہی ہے۔“

”میری روہی! بلال نے بے ساختگی سے پوچھا۔

”ہاں بیٹا وہ تمہاری روہی تھی اور ہمیشہ اب تمہاری ہی رہے گی۔ وہ امریکہ نہیں گئی تھی بلکہ سعودیہ آئی تھی۔ وہ بھی نسیم کے تعاون سے نسیم کے کوٹھے پر سعودیہ کا ایک شیخ بھی آتا تھا۔“

”تو نسیم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا۔ مجھے کچھ کرنے کو کہا اور اندر سے روہی کے ساتھ مل گئی۔“ بلال نے اماں کی بات کا متھے ہوئے افسوس کرنے والا انداز میں کہا تو اماں بولی۔

”بیٹا پہلے صبر سے میری پوری بات تو سن لو۔ اس کے بعد افسوس کرنا۔“ پھر بلال نہیں بولے اور اماں نے کہا۔

”نسیم نے تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہیرا منڈی کی مکار عورت چشمہ کی بیٹی ہونے کے باوجود بہت سی شریف عورتوں سے زیادہ اچھی تھی۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ روہی تم سے شادی کر کے عزت کی زندگی گزارے۔ شریف لوگوں میں واپس چلی جائے۔ اس لئے نسیم نے تمہیں اداکاری کرنے کو کہا مگر پھر ہوا یہ کہ ایک دن جب بارش ہو رہی تھی تم پر قارم کرتے ہوئے دیوانہ وار روہی کے پیچھے بھاگے اور پھر پھسل گئے کوکہ تم گرنے نہیں سنبھل گئے۔ مگر گرتے گرتے بمشکل سنبھلے تھے۔ یہ سن دیکھنے کے بعد روہی سیدھی نسیم کے پاس گئی اور بتایا۔

پہلے تو اس کا پروگرام امریکہ جانے کا تھا۔ مگر اب بلال کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ اب میں خودکشی کر رہی ہوں اور جب اس نے تمہاری قسم کھا کر کہا تو نسیم نے کہا امریکہ جا کر کیا کرو گی۔ اس پر روہی نے کہا جانا تو میں سعودیہ چاہتی تھی کہ باقی کی عمر اللہ کی عبادت میں گزار کر اپنی بخشش کا سامان کرتی۔ مگر وہ پاک جگہ شاید میرے جیسی ناپاک عورت کے لائق اور مقدر میں نہیں۔ اس لئے امریکہ جا رہی تھی۔ مگر اب میں یہ دنیا ہی بلال کے سکون کیلئے چھوڑ دوں گی۔ تب نسیم نے کہا سعودیہ کا ایک شیخ میرے پاس کافی آتا ہے۔ میں اس کو کہتی ہوں وہ تمہارے لئے وہاں کسی گھر کے اندر کھانا وغیرہ پکانے کی ملازمت کا بندوبست کر دے۔ کھانا پکانا تو آتا ہے تمہیں۔

ہاں کافی حد تک روہی نے بتایا۔

”تو نسیم بولی اگر نہیں بھی آتا تو آج کل ہر کام کی بکس جاتی ہے۔ بک کی مدد سے بنالیا کرنا اور روز بے شک خانہ خدا کا دیدار کرنا کلاس کی رہائش کے میں ہی ہے۔ مگر نام بدل لینا۔“ اور پھر روہی نے نسیم کے کہنے پر اپنا نام بدل کر شب نور رکھ لیا۔ سعودیہ سے نسیم کے کہنے پر اس کا ویزہ آ گیا تھا۔ مگر روہی نے سعودیہ کے ساتھ ساتھ امریکہ جانے کیلئے بھی ٹکٹ اوکے کروائی تھی۔ شب نور کے نام سے کاغذات بدلانے کے بعد سعودیہ کیلئے اور روہی کے نام پر امریکہ جانے کیلئے۔ مجھ ایک رات قبل روہی نے بتایا کہ وہ جا رہی ہے تو میں نے کہا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مگر میرا فوراً روہی کیساتھ جانا ناممکن تھا۔ تاہم مجھے روتے دیکھ کر روہی نے نسیم سے صحت بات کی تو اس نے کہا۔ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں اماں کی وجہ سے تمہیں بھی کھانا وغیرہ پکانے میں اچھی خاصی سہولت ہو جائے گی۔ ابھی تم جاؤ تمہارے بعد تمہاری والدہ کی حیثیت سے اماں بھی تمہارے پیچھے پہنچ جائے گی۔ یوں پہلے روہی یہاں آئی اور بعد میں میں اور میں ابھی وہی تھی جب ربی کی اللہنا کرے موت کی خبر امریکہ جانے والا طیارہ تباہ ہونے کی وجہ سے پھنسی تھی۔

روہی تم سے دور یہاں اس لئے آئی کہ تم اپنے خاندان میں واپس جا کر عزت اور سکون کے ساتھ زندگی گزار سکو۔ مگر تم واپس خاندان میں جانے کے بجائے ملک ہی چھوڑ آئے اور اس کی یاد کے سہارے زندگی گزارتے رہے۔ روہی کی وجہ سے نسیم نے تم سے کہا تھا کہ وہ لاہور سے باہر جا رہی ہے۔ وہ تم سے شرمندہ تھی۔ ورنہ وہ لاہور ہی میں تھی۔ اماں نے بات ختم کی تو بلال نے پوچھا۔

”روہی اس وقت کہاں ہے؟“

”وہ کھانا پکانے گئی ہے۔ میں تمہاری وجہ سے یہاں رک گئی ورنہ مجھے بھی ساتھ ہی جانا تھا۔ زیادہ کام میں خودی کرتی ہوں کھانا پکانے کا۔ روہی میری مدد کرتی ہے۔“

”اب میں کیا کروں اماں جی!“ بلال نے ان کی ساری باتیں سننے کے بعد بڑے ادب سے پوچھا۔

”وہی جو مرد کرتے ہیں۔ اب روہی کی کوئی بات سننے کی ضرورت نہیں۔ اپنی مرضی کرنا۔ حکم دینا التجا نہیں کرنا۔“ اماں نے کہا تو بلال مسکرا دیئے۔ اللہ نے اپنے ہی گھر میں ان کی پکھڑی ہوئی محبت کو ان سے ملادیا تھا۔ وہ بھی یقیناً اب ہمیشہ کیلئے پھر اماں بلال سے اجازت لے کر خود بھی روہی کے پیچھے چلی گئیں تو بلال کرسی سے اٹھ کر کھڑکی میں نجانے کتنی ہی دیر باہر دیکھتے رہے۔ اور سوچتے رہے وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ دل کی گہرائیوں سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ مگر ایک دوسرے سے جدا الگ الگ تھے۔



زندگی گزار رہے تھے۔ کیوں؟ صرف دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کیلئے۔ ان کی اپنی خوشی کوئی اہمیت نہیں نہ رکھتی تھی۔ وہ نجانے مزید کتنی دیر تک اور کھڑے سوچتے رہے۔ مگر جب شام رات سے گئے رسی بھی تب روپی روم میں داخل ہوئی۔ اماں نے اس کو بلال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے پہلے سوچ آج کر کے ٹیوب لائٹ جلائی پھر آگے بڑھی۔ مگر پھر فوراً ہی کھڑکی میں کھڑے بلال کو دیکھ کر جہاں بھی وہیں رک گئی۔

بلال کو اپنی خوش کن سوچوں میں رات ہونے کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ اب کمرہ روشن ہوا تو مزہ کر دیکھنے آئے پھر روپی پر نظر پڑی تو جیسے وہیں جم کر رہ گئی تھی۔ ان کو اپنی جانب دیکھتے پا کر روپی کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ روپی نے سوچا یہ شخص جس کی وجہ سے وہ کبھی بھی وہ تباہ ہوئی ہے۔ بے گھر ہوئی، انہوں سے دور ہوئی، بے عزت ہوئی ہے۔ وہ ہر بار ذلت اٹھانے کے بعد جس کو چھوٹی بھر بھر کر بددعاؤں سے نوازتی رہی۔ جب یہ بھید کھلا کہ جو کچھ ہوا وہ غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ انجانے میں ہونے والی بھول کیلئے وہ اس سے ایک سکویز کرنے کیلئے اس کو تلاش کرتا رہا ہے تو اس نے سچے دل سے اس کو معاف کر دیا۔ مگر وہ اس کی بددعاؤں کے زیر اثر آچکا تھا۔ اور وہ نارسی تو اس کی یا کو سینے سے لگائے تھا زندگی گزار رہا تھا۔ وہ زندہ بھی مگر وہ ہر برس اس کو وہ کچھ کراس کی برسی کا اہتمام کرتا تھا۔ اس کی برسی کا اہتمام تو کسی اپنے نے بھی اس کیلئے نہ کیا ہوگا۔ کیا آج کے دور میں ایسا محبت کرنے والا اور کوئی ہو سکتا ہے۔ وہ غم آنکھوں سے ان کو دیکھتی سوچتی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر بلال اس کے قریب آن کھڑے ہوئے تو روپی نے نگاہیں جھکا لیں اور بلال نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی تم خفا ہو۔ اللہ کے گھر میں طیس مگر پھر بھی غلط بات کر کے خود کو چھپا کر جلی آئیں۔ اگر اماں نہ مجھے روکتی تو ہم ایک بار پھر جدا ہو جاتے۔“ روپی یہ سن کر خاموش رہی تو بلال نے پھر کہا بلکہ پوچھا۔

”تم نے مجھ سے معاف کرنے کے باوجود اس لئے چھوڑ دیا کہ میں انہوں میں چلا جاؤں۔ مگر تم نے دیکھا یا جب تم نہ رہیں تب بھی میں انہوں میں جانے کے بجائے تمہاری یاد کو سینے سے لگائے یہاں چلا آیا۔ چھوڑ دیا سب انہوں کو کہ جب تم نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔ اب کیا خیال ہے مجھ سے شادی کرنے کے بارے میں۔ یاد رکھنا روپی آج میں تمہارا انکار نہیں سنوں گا۔“

روپی نے جھکی ہوئی نگاہیں اٹھا کر بلال کو دیکھا۔ پھر آگے ہو کر چپکے سے اس کے سینے سے لگ گئی تو بلال نے دونوں بازو اس کے گرد لپیٹتے ہوئے پرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

وقت کو کیا تھم سا گیا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ یوں جیسے سارے الفاظ ختم ہو گئے ہوں۔ البتہ روپی ان کے سینے میں منہ چھپائے روٹی جا رہی تھی۔ مگر بلال اس کو چپ کروانے کے بجائے یونہی سینے سے لگائے صرف اس لئے خاموش کھڑے تھے کہ یہ آخری آنسو ہیں اچھا ہے دل کا غبار نکل جائے۔ پھر باقی عمر میں کبھی روتے نہیں دوں گا۔ مگر جب یہ روتے کا سلسلہ کچھ زیادہ طویل ہو گیا تو بلال نے جھکتے ہوئے ایک ہاتھ اس کی تھوڑی کے نیچے رکھ کر روپی کا چہرہ دلو پر کرتے ہوئے پوچھا۔

”اب تو خوشی ملی ہے پھر یہ آنسو کیوں؟“

”بلال! میں نے آپ کو بہت دکھائیے۔ بہت پریشان کیا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ روپی نے روتے ہوئے کہا۔

”ایک شرط پر۔“ بلال نے مسکرا کر کہا۔

”کون سی۔۔۔؟“ روپی نے جلدی سے پوچھا۔

”صبح تم اور اماں میرے ساتھ میرے گھر آؤ۔ برچلوگی۔ اگر منظور تو پھر میری طرف سے معافی ہی معافی ہے۔ ورنہ اب میں خفا ہو جاؤں گا۔“ بلال نے رعب سے کہا۔

”مجھے اعتراض نہیں بلال مگر میں یہاں ملازمہ ہوں۔“ روپی نے اپنی مجبوری بتائی۔

”صاحب حیثیت ہونے کے باوجود یہ ملازمہ کی زندگی کس لئے۔ صرف میرے لئے۔ مجھے پرسکون زندگی دینے کیلئے۔ بلال تو تمہارے علاوہ کسی اور لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بلال کو زندگی میں اول آخر جولوڑ کی اچھی لگی وہ تم ہو۔ صرف تم اور تمہاری زندگی میں تو کیا تمہارے بعد بھی بلال خان کی زندگی میں نا کوئی لڑکی آئی اور نہ ہی کبھی آ سکتی گی۔ بلال صرف تمہارا ہے سمجھیں۔“

روپی نے جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر اپنا چہرہ ان کے سینے میں چھپا لیا تھا۔ بلال کی باتیں سن کر ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ وہ زندگی بھر جس سے نفرت کرتی رہی۔ وہ دنیا میں اس کے علاوہ کسی اور لڑکی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ ایسی دلیلا نہ دار محبت کرتا تھا اس سے۔ مگر آنکھوں میں نمی کے ساتھ ساتھ آنے والے خوشگوار دنوں اور



پر سکون لمحوں کا سوچ کر اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک پیدلی سی مسکان بھی تھی۔

اماں رات کا کھانا لے کر آئیں تو وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے باتوں میں محو تھے۔ اماں کو دیکھتے ہی روٹی اٹھی اور کھانا ان کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ تب اماں نے کہا چند چیزیں باہر بھی رکھ کر آئی ہوں وہ بھی لے آؤ اور اب جلدی سے کھانا لگا دو۔ پھر بات ختم کر کے وہ خود بلال کے قریب آ بیٹھی تھی اور ان کے بیٹھتے ہی بلال نے پوچھا۔

”آپ فارغ ہو گئیں یا ابھی پھر جانا ہے۔“

”ہاں بیٹا بالکل فارغ ہو گئی۔ اب نہیں جانا۔ تم یہ بتاؤ تمہارا کیا بنا کچھ کامیابی حاصل ہوئی یا؟“ اماں نے دانستہ بات دھوری چھوڑ دی جبکہ روٹی باہر چلی گئی تھی۔

”کچھ کامیابی نہیں اماں جان مکمل کامیابی حاصل کر چکا ہوں۔“ بلال نے روٹی کو اندر آنا دیکھ کر مسکرا کر بتایا۔ مگر روٹی اب ان کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ وہ کھانے کیلئے دسترخوان لگا رہی تھی۔

”یعنی شادی کیلئے رضامند ہو گئی۔“ اماں نے خوشی سے کانپتے لہجے میں پوچھا تو بلال نے کہا۔

”بالکل رضامند ہو چکی ہے۔ مگر اب ایک اور مسئلہ ہے۔ وہ کہتی ہے میں یہاں ملازمہ ہوں مالک کی اجازت کے بغیر کہیں بھی نہیں جاسکتی۔“

”یہ بات تو اس کی درست ہے۔“ اماں نے کہا۔

”نسیم کا فون نمبر تو آپ لوگوں کے پاس لازمی ہوگا۔“ بلال نے پوچھا تو اماں یکدم ہی بہت زیادہ داس ہو گئیں۔ جبکہ بلال اب بھی کہہ رہے تھے۔ ”میں نسیم سے خود بات کر کے کہتا ہوں وہ ذرا روٹی کے مالک سے بات کر کے ہمارا یہ مسئلہ حل کروادے۔ اب روٹی ملی ہے تو یہاں چھوڑ کر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”نسیم ہوتی تو تب نا۔“ اماں نے آہ بھر کر کہا۔

”کیوں وہ بھی کہیں چلی گئی ہے؟“ بلال نے پوچھا تو اماں کہنے لگی جب روٹی سعودیہ آ گئی تو دونوں ایک دوسری کفون کرتی ہی رہتی تھیں۔ ایک دن یونہی باتیں کرتے کرتے روٹی نے نسیم سے کہا۔

”جس طرح میں نے گندگی کو چھوڑ دیا ہے۔ ویسے تم بھی یہ سب چھوڑ دو اور یہاں میرے پاس سعودیہ چلی آؤ۔“ روٹی کی بات سن کر نسیم نے کہا۔ اول تو میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں اور فرض کرو تمہارے پاس آ بھی جاتی ہوں تو وہ عرب مجھے ہرگز نہ چھوڑے گا۔ جو میرے لئے سال میں پاکستان کے تین چار چکر لگاتا ہے۔ تم تو اس کے سامنے نہیں آتی اور میں نے تمہارے بارے میں کہا بھی یہی تھا کہ بہت شریف لڑکی ہے۔ ولد فوت ہو چکے ہیں۔ ماں بیٹی کا کوئی خرچہ اٹھانے والا نہیں۔ مگر اپنا کیا کہوں گی مجھے تو وہ پہلے ہی کہتا ہے سعودیہ آ جاؤ تو تم کو الگ گھر میں رکھوں گا۔“ یہ سن کر روٹی نے کہا۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر نومی کے پاس لندن ہی چلی جاؤ۔ وہاں تمہارا ماموں بھائی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“ یہ سن کر نسیم نے کہا۔

”مشورہ تو تمہارا برا نہیں۔ وہاں وہ مجھے مانا تو دور کی بات چھو بھی نہیں سکتے۔ لیکن اگر میرے جانے سے پہلے ہی بات کھل گئی تو پھر وہ مجھے قتل کر کے ہی چھوڑیں گے۔ یہ کہہ کر نسیم نے فون بند کر دیا۔ مگر پھر اس نے روٹی کے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے لندن بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے فون کر کے روٹی کو اپنا سارا پروگرام سمجھانے کے بعد کہا۔

”اگر میں بھاگتی ہوئی پکڑی گئی تو پھر یاد رکھنا نومی تمہاری ذمہ داری ہوگا۔ کیونکہ پکڑی جانے کی صورت میں وہ لوگ مجھے ہرگز زندہ نہ چھوڑیں گے۔ پھر اس نے بتا دیا کہ وہ کس دن لندن کیلئے روانہ ہو رہی ہے۔ فون بند کرنے سے پہلے اس نے روٹی کو اپنی ایک کزن کا جو اس کی سہیلی بھی تھی نمبر لکھ دیا اور کہا ویسے تو خیریت سے لندن پہنچتے ہی میں تمہیں خوف فون کر لوں گی اور اگر میں نے فون نہ کیا تو سمجھ لینا میں زندہ نہیں ہوں۔ تب میری کزن کفون کر کے میری خیریت پوچھ لینا۔ پھر یہ ہوا کہ نسیم کا فون نہ آنے پر روٹی نے اس کی کزن کفون کیا تو اس نے بتایا سارا کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ وہ گھر سے بخیریت ایئر پورٹ پہنچ گئی مگر جہاز میں اچانک پیدا ہو جانے والی خرابی کی وجہ سے لندن جانے والی یہ فلائٹ کئی گھنٹے لیٹ ہو گئی تھی۔ جس کزن کو نسیم نے بتایا تھا۔ اس نے جب دیکھا جہاز لندن کی طرف روانہ ہو چکا ہوگا تو خود ہی کسی بہانے سے نائیکہ چشمہ کو بتا دیا کہ چڑیا اڑ گئی۔ یہ سنتے ہی چشمہ بائی غصے سے پاگل ہو گئی۔ اس نے بیٹوں اور بھائی کو ساتھ لیا اور یہ کہتی ہوئی ایئر پورٹ کی جانب روانہ ہو گئی کہ ساری ہیر امنڈی چشمہ بائی سے مشورہ لے کر چلے اور یہ میری بیٹی مجھے ہی دھوکہ دے کر جاری ہے۔ یاد رکھنا طوائف کی کمائی پر پہلا حق اس کے ماں باپ اور دوسرا بھائیوں اور تیسرا ماموں نانی نانا اور باقی خاندان کا ہوتا ہے۔ بیٹے کا نہیں۔ اتنا خیال تھا بیٹے کا تو پھر پیدا



کر لیتی دو بیٹیاں بھی۔ اب ہمارا مستقبل تباہ کر کے بیٹے کا مستقبل بنانے جارہی ہے۔ یاد رکھنا اگر وہ لگتی تو زندہ نہیں چھوڑنا۔ بچ گئی تو پھر بھاگنے کی کوشش کرے گی۔ پکڑے جانے کی فکر مت کرنا چھڑالوں کی میں تمہیں۔ بہت زیادہ دن جیل میں نہیں رہنے دوں گی آخر ہیرا منڈی کی بے حد مقبول عورت نائیکہ چشمہ ہوں میں۔ ورنہ اگر یہ بھاگ گئی تو پھر تمہاری دوسری بہنوں کو بھی حوصلہ ملے گا ورنہ بھی اس کی راہ پر چلنے کی کوشش کریں گی۔

نسیم ویننگ روم میں بیٹھی تھی جب اس پر اچانک قیامت ٹوٹی۔ وہاں بھائی اور ساموں کو دیکھ کر چونکی۔ اٹھ کر بھاگی مگر دیر ہو چکی تھی۔ ماں نے نسیم کو دیکھتے ہی صرف اتنا کہا۔ ”ارے تو چشمہ جولوڑی سے زیادہ مکار بھی اس کو دھوکہ دے کر اس کی ساری عزت خاک میں ملا کر جا رہی تھی۔ ساری زندگی لوگ مجھے طعنے دیتے۔ دوسروں کو مشورہ دیتی تھی خود اپنی ہی بیٹی کے بھاگنے کا پتہ نا چل سکا۔ لے اب ذرا بھاگ کر دکھا کہتے ہوئے اس نے بیٹے کو اشارہ کیا اور اس نے پستول نکال کر وہیں سے قاتل مار کر نسیم کو ہلاک کر دیا۔ اماں پر اپنی عورت بھی اس لئے ساری کہانی حرف بہ حرف ویسے ہی بلال کو سنا دی جیسے نسیم کی کزن نے روبی کو سنا ہی تھی۔

”بہت افسوس ہوا مجھے نسیم کی موت کا سن کر۔ میں نے بہر حال اسے ایک اچھی عورت کے روپ میں ہی دیکھا۔ دوسروں کے دکھ درد کا احساس کرنے والی۔“ بلال نے احترام سے کہا۔ تب روبی نے کھانے کیلئے بلایا تو وہ دونوں اٹھ گئے۔ تینوں نے مل کر کھانا کھایا پھر کھانے سے فارغ ہوتے ہی بلال نے کہا۔

”اماں! آپ اگر ابھی مجھے اپنے مالک کے پاس لے جائیں تو ان سے بات کر کے صبح آپ کو ساتھ لے کر انہو پر روانہ ہو جاؤں گا۔ اماں اسی وقت بلال کو لے کر مالک کے پاس چلی آئی۔ بلال نے اماں کو بتا دیا تھا کہ وہ ان سے کہہ دے گا آپ میری خلع ہیں اور روبی میری کزن اور میں اب آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ خود ہی آپ کا خرچہ بھی اٹھالوں گا کہ میں اپنی کزن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

بہر حال جو بھی اور جیسے بھی ہو مالک اجازت دینے پر رضامند ہو گیا۔ اماں بلال کے ساتھ اپنے روم میں آئی تو بلال نے روبی سے کہا۔ ”روبی! صبح تک اپنی تیاری مکمل رکھنا۔ اللہ کے گھر بطور شکرانہ عمر داد کرنے کے بعد ہم لوگ انہو پر روانہ ہو جائیں گے۔“ بلال خاموش ہوا تو روبی نے کہا۔ ”میرا نام روبی نہیں شب نور ہے۔ پھر کبھی مجھے روبی کے نام سے مخاطب نہ کیجئے گا۔ میں نے جب فلمی دنیا کو چھوڑا تو پھر یہ نام بھی چھوڑ دیا کہ اس نام نے مجھے سوائے رسوائیوں کے دیا ہی کیا تھا۔ یاد رکھئے گا اب میں صرف شب نور ہوں۔“ روبی کی بات سنتے ہی بلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”او کے نور اب کل تم سے میری ملاقات ہوگی اور پرسوں شام ہماری رسم نکاح کا ہوگی۔“ پھر وہ اماں اور روبی دونوں کو اللہ حافظ کہہ کر اپنے ہوٹل چلے آئے۔ اماں نے تو بہت کہا تھا ایک مدت کی بات ہے بلکہ چند گھنٹوں کی تم یہاں پر ہی ہمارے ساتھ گزار لو۔ مگر بلال نے رکنائے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ایک ہی روم تھا۔ لیکن وہ اس وقت بے حد خوش تھے۔ آئے تھے روبی کی تیسری برسی منانے اور یہاں اللہ نے زندہ سلامت روبی سے ملا دیا تھا۔ اس بار آتے ہی انہوں نے سب سے پہلے ماں کی صحت یا بی کیلئے دعا کی تھی۔ پھر روبی کے نام کا عمرہ اور اب وہ سوچ رہے تھے گھر والوں کو اپنی شادی کے بارے میں اطلاع دیں یا نہیں۔ شادی کیسی صرف سادگی سے رسم نکاح کرنے کا پروگرام تھا ان کا پھر۔ انہوں نے گھر والوں کو بتانے کا ہی فیصلہ کیا تھا کہ خواہ مخواہ کوئی نئی بات کر کے ان کا موڈ خراب کر دیں۔ ویسے بھی روبی یقیناً پاکستان جانا پسند نہیں کرے گی۔

اگلی صبح وہ اماں اور روبی کو لینے آئے تو وہ اپنا سلمان پیک کئے بالکل تیار تھیں۔ بلال نے سامان ڈنگی گھول کر کچھ اس میں رکھا کچھ پچھلی سیٹ پر۔ پھر اماں کو آگے اور روبی کو پیچھے بیٹھنے کا کہا۔ مگر اماں نے فرنٹ سیٹ پر روبی کو بٹھا دیا اور خود پیچھے سامان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ وہ تینوں اللہ کے گھر آ کر اپنی اپنی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ عبادت سے فارغ ہو کر باہر آئے تو پہلے بلال نے ان کو ناشتہ کرایا اور خود بھی کیا۔ پھر بے حد پرسکون ہو کر اپنے گھر انہو پر کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں روبی نے تو ان کے برابر بیٹھنے کے باوجود بہت کم باتیں کی تھیں۔ مگر اماں خوب باتیں کر کے اپنے سعودیہ میں قیام کے دوران کے قصے سن کر ان کا دل بہلاتی رہی تھی۔ یوں ہنسی خوشی وہ باتیں کرتے سنتے اپنا سفر مکمل کر کے اپنے انہو پر پہنچ گئے تھے۔ سب سے پہلے تو وہ دوسری منزل پر ملے ہوئے اپنے دو بیٹروں کے اس فلیٹ میں اماں اور روبی کو ساتھ لے کر اوپر آئے۔ پھر لاک کھولنے کے بعد لاک کی چابی روبی کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

”لیجئے بیگم صاحبہ! اب آپ اپنا گھر خود ہی سنبھال لیں۔ اور خود سلمان لینے نیچے چلے گئے تھے۔ روبی ان کی بات سن کر مسکرائی۔ پھر چابی ہاتھ میں پکڑے مسکراتے ہوئے ہی فلیٹ میں داخل ہو گئی۔ دو بیٹروں کا بے حد خوبصورت فلیٹ تھا۔ ساتھ ہی باہر اور لاؤنج جب تک بلال سامان کی پہلی قسط لے کر اوپر آئے تو روبی جلدی جلدی سارا فلیٹ اچھی طرح گھوم پھر

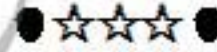


دیکھ چکی تھی۔ بلال سلمان رکھنے کے بعد نیچے مزید سامان لینے گئے تو ان کے بیڈروم میں رکھے فون کی بیل ہونے لگی۔ وہ چونکہ بلال کے بیڈروم میں ہی بیٹھی تھی کہ دوسرا روم تو بالکل خالی تھا۔ لیٹنے کیلئے تو کیا وہاں تو بیٹھنے کیلئے بھی کوئی چیز فلو رکشن تک نہیں تھا۔ اب فون کی بیل ہوئی تو ماں نے روپی سے کہا۔  
”اٹھا کر دیکھو کس کا ہے؟“

”کیا کہتی ہیں امی جان! ہو سکتا ہے پاکستان سے کسی کا ہو اور بلال مشکل میں پڑ جائیں۔“ روپی اب ماں کو امی جان ہی کہتی تھی کہ وہاں نہیں دل سے ماں مان چکی تھی۔ جب تک بلال سامان کی دوسری قسط لے کر اوپر آئے فون کی بیل بند ہو چکی تھی۔ روپی نے ان کو بتانا مناسب بھی نہیں سمجھا تھا۔ بہر حال سارا سامان اوپر آ ہی گیا۔ تب بلال بھی ان کے قریب آ بیٹھے تھے پھر انہوں نے روپی سے کہا۔

”آج رات کا کھانا تو بازار سے آئے گا ورنہ کل سے تمہارے ہاتھوں کا بتنا شتہ کھانا کھایا کروں گا۔“ یہ سن کر ماں نے کہا۔  
”اے لکڑی میری بیٹی کی شادی ہے اور تم اس کے ہاتھ کٹنا شتہ اور کھانا کھانے کی بات کرتے ہو۔ ساری عمر پڑی ہے نور کے بنے ناشتے اور کھانے کیلئے جب تک میں زندہ تب تک میں خود ہی کچن کا کام دیکھوں گی۔ ویسے بھی نئی نوپلی ڈھن کام کاج کرتی اچھی نہیں لگتی۔“ ماں نے کہا تو روپی شرمانی۔ بلال بھی مسکرا کر اس کو دیکھنے آئے تھے۔ بھی فون کی بیل پھر ہوئی۔ بلال اٹھ کر گئے پھر ریسورٹھا کر ماؤتھ پیس میں بیٹھ گیا تو دوسری جانب مکمل تھے۔ بلال کی آواز سنتے ہی بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میں نے کہا بھی تھا ماں سخت بیمار ہے اور وہ مجھیں آخری بار کا نظر دیکھنا چاہتی ہیں۔“  
”کیا ہوا ماں کو؟“ بلال نے تڑپ کر پوچھا اور کمال کے جواب دینے سے پہلے ہی فون کٹ گیا تھا۔



فون کٹتے ہی بلال نے خود نمبر ملائے تھے۔ یہ سوچ کر کہ کہیں خدا نخواستہ امی جان کو کچھ ہونہ گیا ہو۔ یہاں تو جوان لوگوں کا پتہ نہیں چلتا منٹوں میں مٹی کے نیچے جاسوتے ہیں۔ جو ابھی چند منٹ پہلے ہی اکڑا کڑ کر چلتے ہوئے زمین کو اپنی موجودگی کا احساس ظاہر کرتے ہیں۔ ماں تو پھر بزرگ عورت تھی۔ وہاں پریشانی کے مسلسل نمبر ملا رہے تھے۔ مگر فون مل نہیں رہا تھا۔ تب انہوں نے سوچا دوسری جانب سے یقیناً مکمل بھائی پھر ثرائی کر رہے ہیں۔ اس لیے میرا نمبر نہیں مل رہا۔ یہ سوچتے ہی انہوں نے ریسورٹھا پس رکھا تو اس وقت پھر سے بیل ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر بلال نے جلدی سے ریسورٹھا کر اپنے کان سے لگایا تو مکمل بھائی نے بلال سے کہا۔

”میں پچھلے دو دن سے مسلسل ثرائی کر رہا ہوں۔ تمہارا فون خراب تھا یا تم کہیں گئے ہوئے تھے جفون اٹینڈ نہ کر سکے۔“  
”بھائی جان میں دو دن کے لیے خانہ کعبہ گیا ہوا تھا۔ امی جان کی صحت یابی کے لیے دعا کرنے کیلئے۔ بس ابھی ابھی گھر واپس پہنچا کہ آپ کا فون آ گیا۔ یہ بتائیں امی جان اب کیسی ہیں؟“ بلال نے پوچھا تو مکمل بھائی بولے۔

”ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ بچنے کی کوئی امید نہیں۔ بلال اس حالت میں امی جان کی صرف یہی آخری خواہش ہے وہ تمہیں اور تمہاری خوشی کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ بلال ہم نے تو تمہاری خوشی کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی پورے خلوص دل سے روپی کے ساتھ شادی کی اجازت دے دی تھی۔ مگر وہ خود تمہارے ساتھ شادی کے لیے راضی نہیں ہوئی اور پھر اسی حالت میں فوت ہو گئی۔ اس میں ہمارا اور ماں کا کیا دوش۔ جو تم نے تین برس سے پلٹ کر ہماری تو کیا ماں کی بھی خبر نہیں لی۔ بچے تم کو یاد کرتے ہیں اور ماں تمہارے غم میں رو رو کر سوکھ کر کاٹنا ہو رہی ہیں۔ میرے بھائی! اب بھی وقت ہے تم ماں کی آخری خواہش اور خوشی پوری کر سکتے ہو۔ ایسا نہ ہو ماں چل بسے اور تم مارے کچھتوے کے ہاتھ ملتے رہ جاؤ۔ میرا خیال ہے تم ایسے مذہبی انسان کو تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔ تم بیمار ماں کی خواہش اور خوشی پوری کر کے یہ جنت حاصل کر سکتے ہو۔ میری ماں تو فوفا سے بھی پہلے پاکستان چلے آؤ۔ دیکھو تم جہاں کہو گے ہم وہیں تمہاری شادی کر دیں گے۔ اب بولو تم کیا کہتے ہو۔ دیکھو انکار نہیں کرتا۔ وہاں ہاسپٹل میں بیڈ پر ماں کی آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔“ مکمل بھائی کی ساری بات سننے کے بعد بلال نے کہا۔

”میں ابھی خود تھوڑی دیر بعد آپ کا فون کر کے بتا پر وگرا م بتاتا ہوں۔“ اؤ فون بند کر دیا فون بند کر کے ماں اور روپی کو دیکھا تو ماں نے جلدی سے پوچھا۔  
”بیٹا کیا ہوا تمہاری والدہ کو؟“ جبکہ روپی خاموشی ہی رہی تھی۔ ماں کے پوچھنے پر بلال نے من و عن ساری بات ان کو بتادی پھر پوچھا۔



”اب آپ بتائیں میں کیا کروں؟“

”اگر ان کو روپی کے ساتھ تمہاری شادی پر اعتراض نہیں تو پھر میرا خیال ہے یہاں سادگی سے نکاح کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ تم پاکستان جا کر اپنی امی جان کی خواہش پوری کرو۔ ماں بہر حال ماں ہوتی ہے۔ باقی جیسا تم مناسب سمجھو۔“ اماں اتنا کہہ کر چپ ہو گئیں تو بلال نے روپی کو پوچھا۔

”روپی تم کیا کہتی ہو؟“

روپی کو پاکستان جانے سے سب نفرت تھی۔ مگر بلال کی والدہ بیمار تھی یہی وجہ ہے اس نے کہا۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“

”تمہیں پاکستان جانا پسند نہیں؟“ بلال نے اس کا کمزور لہجہ دیکھ کر پوچھا۔ روپی ان کی بات سن کر چپ رہی تو بلال نے کہا۔

”نور! ہم کونسا ہمیشہ کے لیے جارہے ہیں۔ میری جاب یہاں پر ہے۔ شادی کرنے کے بعد امی جان کو خوش کر کے ہم لوگ واپس آ جائیں گے۔ ٹھیک ہے۔“

”میں نے انکار تو نہیں کیا۔“ روپی نے آہستہ سے کہا۔

”انکار زبانی ضروری نہیں ہوتا۔ جب آنکھیں اور لہجہ انکار کر رہے ہوں۔“ بلال نے سنجیدگی سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ روپی پھر بھی چپ ہی رہی تھی اور بلال نے اسی وقت کمال بھائی کفون کر کے ساری بات صاف صاف بتا دی تھی۔ بلال کو اچھی طرح معلوم تھا۔ شادی کی اجازت کمال بھائی نے دی تھی امی جان نے نہیں۔ لیکن اب وہ بیمار تھیں۔ اگر بلال ان کی وجہ سے پاکستان جا رہا تھا تو وہ بھی بلال کی خوشی کا خیال کریں گی۔ ویسے بھی انہوں نے یہ کسی کو بتانا ہی نہ تھا کہ نور۔ روپی ہے۔ یہی وجہ ہے انہوں نے کمال بھائی کو بتا دیا کہ کل ان کی یہاں رسم نکاح ہے۔ وہ اپنی پسند پر شادی یہاں کر رہے تھے لڑکی بالکل اکیلی ہے یا پھر اس کی والدہ ہے۔ یہ سنتے ہی کمال بھائی نے کہا۔

”تم لڑکی اور اس کی والدہ کو لے کر یہاں پاکستان آ جاؤ۔ تمہاری شادی کی رسم یہاں لاہور ہی میں ادا ہوگی۔ اور وہ بھی بہت دھوم دھام سے کہ آخر تم خان اخلاق خان کے چھوٹے بیٹے ہو۔“

”بھائی جان! دھوم دھام مجھے پسند نہیں، صرف سادگی سے رسم نکاح ہوگی۔ وہ بھی اسی شام جب ہم پاکستان آئیں گے اور جمعہ کی شام کو ہم انشا اللہ پاکستان ہوں گے۔“ بلال نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تو دوسری جانب کمال نے بھی رسیور واپس رکھ کر اماں اور گل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”امی جان کی چال کا مایا ب رہی۔ وہ بیماری کا سن کر نرم ہو گیا اور اب جمعہ کو پاکستان آ رہا ہے۔ کل وہاں اس کی رسم نکاح تھی۔ جواب جس دن وہ آئے گا اسی شام یہاں لاہور میں ادا ہوگی۔“ کمال کی بات سن کر گل ہی نہیں بیگم اخلاق بھی مسکرائی تھیں۔ پھر پرسکون لہجے میں کہا تھا۔

”رسم نکاح اس کی خواہش کے مطابق سادگی سے ادا ہوگی۔ مگر اگلے ہی روز رسم ولیمہ خوب دھوم دھام سے ادا ہوگی فوراً سارے انتظام کرو۔“ وہ سب بے حد خوش تھے۔ ایک تو روٹھا ہوا بلال مان گیا تھا۔ دوسرا وہ شادی بھی کر رہا تھا۔ اپنی پسند سے سبھی کو تو رہا تھا۔ وہ اس کی تنہائی کا سوچ کر پریشان رہتی تھیں۔ اب اس کا گھرا باندھ رہا تھا۔ ماں کے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ بیٹے کا گھرا باندھ رہا ہو اور پھر آباہی رہے۔

”گل لڑکی کے ساتھ اس کی والدہ بھی پاکستان آ رہی ہیں۔ اوپر جو دو بیڈروم ہیں ان دونوں کی صفائی کروا کر سیٹ کروا دو۔ ایک لڑکی کی والدہ کے لیے اور دوسرا بلال اور اس کی دلہن کے لیے۔“ کمال نے بیوی سے کہا۔

”آپ سمجھیں یہ دونوں کام ہو گئے۔“ گل نے مسکرا کر کہا۔ پھر وہ شادی کے فنکشن کا باقی پروگرام طے کرنے لگے۔ وہ سب بے حد خاموش تھے۔ کمال کی شادی کے بعد یہ ان کے گھر کی دوسری بڑی خوشی تھی کہ بیٹے ہی دو تھے۔

نسیم نے روپی کو بتایا تھا۔ روپی! تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ بلال نے مجھے بتا دیا ہے اس کی والدہ ہائیکری نہیں۔ مگر بڑے بھائی نے تمہارے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے اور اب بلال اپنے گھر والوں کو اس کے بارے میں کھل کر بتائے بغیر اس کا اپنے ساتھ شادی کے لیے پاکستان لے جا رہے تھے۔ روپی کا دل ڈر رہا تھا۔ اگر اس کی والدہ کو بتا چل گیا کہ وہی روپی ہے تو وہ پھر شادی سے کہیں انکار نہ کر دیں۔ جب اس نے اپنے ان خدشات سے اماں کو آگاہ کیا تو اخلاق سے بلال نے بھی سن لیا۔ اماں نے روپی کو سلی دے دی کہ ایسا کچھ



نہیں ہوگا۔ تمہیں ایک پیار ماں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ مگر ماں کا بہت سارا نام ہیرا منڈی کی عورت چشمہ بانی کے گھر گزرا تھا۔ اس لیے انہوں نے تنہائی میں نہ صرف بات کی بلکہ یہ مشورہ بھی دے دیا۔ بیٹا قتل اس کے پاکستان جا کر مسئلہ پیدا ہو تم نکاح کی رسم سعودیہ میں ہی ادا کر لو۔ میری بیٹی تمہاری نور بہت ڈر رہی ہے۔ بلال نے ماں کی بات سے انکار کرنے کی بجائے سوچ لیا کہ رسم نکاح پاکستان جانے سے پہلے مسجد نبوی میں ادا ہوگی۔ ویسے تو پاکستان میں بھی اب کوئی مسئلہ نہ تھا کمال بھائی نے اب بھی اپنی بات رپیٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ہم نے تمہاری خوشی کے لیے تمہیں روپی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔“ پھر بھی بہتر یہی ہوگا کہ نکاح پاکستان جانے سے پہلے ہی پڑھ لیا جائے۔ وہ مطمئن ہو گئے تھے۔ یہ سوچتے ہی اور یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ تب تک یہ بات ان کو نہیں بتائیں گے کہ روپی ہی نور ہے۔ جب تک وہ خود نہ روپی کو پہچان لیں۔ ایسا بھی ان کو کونسا وہاں زیادہ رکنا تھا مگر پھر بھی تین ماہ کی رخصت لی تھی۔ انہوں نے ماں کی پیاری کی وجہ سے اور یہ بھی سوچ لیا تھا کہ آتے ہوئے ماں کو بھی اپنے ساتھ سعودیہ لے آؤں گا۔ جانے سے پہلے انہوں نے نور ماں اور سب گھر والوں کے لیے بے تحاشا شاپنگ بھی کی تھی۔ کافی برسوں بعد وہ بے حد خوش اور مطمئن تھے۔

بلال کو ایئر پورٹ ریسو کرنے مکمل اور ان کے دونوں بیٹے یا پھر بیگم اخلاق خود آتی تھیں۔ مگر بلال کی فلائٹ لیٹ تھی۔ انہوں نے شام پانچ بجے آنا تھا۔ مگر رات نو بجے ان کی فلائٹ آئی تھی۔ فارغ ہوتے ہوتے اور پھر باہر آتے آتے ان کو دس بج گئے تھے۔ پھر وہ سلمان والی ٹرائی گھسیٹتے ہوئے ماں اور نور کے ساتھ باہر آئے تو مکمل بھائی کے ساتھ ماں کو بھی دیکھ کر قدرے حیران ہوئے کہ مکمل بھائی نے کہا تھا وہ سخت پیار ہیں۔ تاہم وہ ان کو صحت مند دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ باہر آتے ہی ماں کو سب سے پہلے سلام کرتے ہوئے گلے ملے تھے اور ان کو گلے لگاتے ہی بیگم اخلاق کوئی شکوہ کیے بغیر رو پڑی تھیں۔

”مجھے معاف کر دیں امی جان!“ بلال نے ان کو روتے دیکھ کر کہا۔

”معافی والی اب کوئی بات نہیں۔“ بیگم اخلاق نے ساتھ آنے والی بہو کا سوچتے ہوئے کہا۔ پھر الگ ہو گئیں۔ ماں کے بعد وہ مکمل بھائی اور بھتیجیوں سے گلے ملے۔ پھر روپی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”امی جان! یہ نور ہے آپ کی بہو۔ آپ کو بہت خواہش تھی نہ میری خوشی دیکھنے کی۔“ اور بیگم اخلاق تو کب سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ وارنٹ شلوار سوٹ کے ساتھ وارنٹ دوپٹہ اور وارنٹ ہی اسکارف اس نے باندھ رکھا تھا۔ جس نے پیشانی پوری چھپا رکھی تھی۔ وہ بہت پیاری اور بہت خوبصورت تھی۔ انہوں نے اس کو گلے لگاتے ہوئے اس کی گال چوم کر سوچا نام نور ہے تو خود بھی میری بہو نور ہی نور ہے۔ ان کو نور بے حد پسند آئی تھی۔ نور سٹل کرا اور دیکھ کر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ نور ان کو بے حد پسند آئی تھی۔

”امی جان! یہ نور کی والدہ ہیں۔“ بلال نے بتایا تو انہوں نے نور کو الگ کرتے ہوئے اس کی والدہ سے گلے ملیں۔ پھر وہ سب گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ گھر آتے ہی بیگم اخلاق نے گل سے کہا۔

”لو بھئی سنبھالو اپنی دیورانی کو اور اپنے ساتھ لے جاؤ اور عروسی جوڑا جو بنایا ہے وہ پہنا کر خوب اچھا سا میک اپ کر کے لے آؤ۔“ گل روپی سے گلے ملنے کے بعد اس کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کافی مہمان آچکے تھے۔ جن میں روپی کے گھر والے بھی شامل تھے۔ گل جب روپی کو عروسی جوڑا پہنانے لگے دم میں لے کر آئی تو روپی نے پہچان لئے جانے کے ڈر سے کہا۔

”بھابی! آپ تھوڑی دیر بعد آجائیں میں خود ہی تیار ہوتی ہوں۔“ گل نے اس کی بات پر اس کو حیران ہو کر دیکھا۔ پھر سوٹ، جیلوری اور میک اپ کا سلمان اس کے حوالے کرنے کے بعد حیران ہوتی ہوئی باہر چلی گئی۔ روپی نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور صوفے پر آ بیٹھی۔ بتائیں کیوں اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ بہر حال وہ اٹھی، عروسی جوڑا پہنا جو جدید فیشن کے مطابق ہی تھا۔ پھر میک اپ کرنے کے بعد جیلوری پہنی اور دوپٹہ کچھ اس سٹائل سے لیا کہ زیادہ چہرہ چھپ جائے یا چھپا رہے۔ پوری طرح تیار ہو کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ گل باہر ہی کھڑی تھی یا ابھی آئی تھی۔ یہ روپی کا مسئلہ نہ تھا۔ گل نے اس کو دیکھتے ہی ہاتھ تھام لیا اور پھر یونہی اپنے ساتھ لیے ہل کر رے میں لے گئی۔ جہاں سبھی مہمان خواتین بیٹھی تھیں اور لا کر صوفے پر بٹھا دیا۔ سب ہی ذہن کو دیکھتے ہوئے تعریف کر رہے تھے۔ روپی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے اپنے گھر سے بھاگنے کے بعد پہلی بار اپنی ماں کی آواز سنی۔ وہ روپی کے قریب کھڑی کبہ رہی تھی۔



”بہن میاں کو آپ کو اپنے بیٹے کی یہ خوشی۔ شکر کریں اس منحوس کی موت کے بعد بلال اور آپ کی جان اس سے چھٹ گئی۔“ اٹھا روٹی کی جانب تھا۔ ان کے لہجے میں اس وقت جو نفرت تھی اس کو محسوس کرتے ہوئے روٹی کا جی چلا چہرہ اٹھا کر ان کی شکل بھی دیکھ لے۔ اس وقت کیسی ہے؟ گروہ لہن بھی اس لیے ایسا نہ کر سکی۔ تب روٹی کی آواز آئی۔ وہاں سے کہہ رہی تھی۔

”امی جان! آپ نے ایک بات محسوس کی لہن کی شکل روٹی سے ملتی جلتی ہے۔“ یہ سن کر روٹی نے اپنا چہرہ مزید چھپا لیا۔ مگر روٹی بہت ہوشیار تھی۔ روٹی اس کی بہن تھی۔ وہ کیسے نہ پہچانتی۔ وہاں سے بات کرنے کے بعد سیدھی روٹی کے پاس آئی اور جھک کر ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ داپر کیا اور اب آنکھیں بند کرنا فصول ہی تھا۔ روٹی نے روٹی کو دیکھا اور روٹی نے روٹی کو اور اب نہ پہچاننے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ روٹی کو پہچانتے ہی روٹی اس کا چہرہ چھوڑ کر یوں جلدی سے پیچھے ہٹی جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ پھر وہ نہ صرف ماں بلکہ گل اور بیگم اخلاق کو بھی ایک جانب لے گئی اور آہستہ سے پوچھا۔

”آپ نے کچھ محسوس کیا لہن کی شکل دیکھ کر۔“ بیگم اخلاق تو خاموش رہیں، البتہ گل نے کہا۔

”لہن کی شکل تھوڑی تھوڑی روٹی سے ملتی ہے۔ شاید اس لیے بلال نے اس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔“

”لہن کی شکل روٹی سے ملتی نہیں وہ ہے ہی روٹی۔“ روٹی نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تو بیگم اخلاق نے جلدی سے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ روٹی تو پلین کے حادثے میں مر گئی تھی۔

”یہ ہو نہیں سکتا۔ یہ ہو چکا ہے۔“

”خالہ جان! میں اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے بعد آپ سے کہہ رہی ہوں وہ میری بہن ہے۔ میں نہیں پہچانوں گی تو اور کون پہچانے گا۔ وہ زندہ کیسے بچ گئی۔ یہ بات وہ جانے یا پھر بلال مگر میرا یقین کریں وہ روٹی ہی ہے۔“ روٹی نے پورے یقین سے کہا تو گل نے بیگم اخلاق کو دیکھتے ہوئے رازداری سے بتایا۔

”روٹی کی بات غلط نہیں امی جان!“ جب میں لہن کو تیار کرنے اپنے ساتھ لے کر گئی تو اس نے مجھ سے کہا آپ جا میں خود ہی تیار ہو جاؤں گی۔ یہ بات یقیناً اپنے پہچانے جانے کے ڈر سے کہی ہوگی۔ وہ خود ہی تیار ہو کر باہر آئی تھی۔ اپنا میک اپ بھی اس نے خود ہی کیا تھا۔“

گل کی بات سنتے ہی بیگم اخلاق تیزی سے روٹی کے قریب آئیں اور ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ داپر کرتے ہوئے مہمانوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر خاصے سخت لہجے میں پوچھا۔

”کیا تم روٹی ہو؟“

روٹی نے جواب دینے کی بجائے چہرہ جھکا لیا تو بیگم اخلاق نے کہا۔

”اُو! اتنا بڑا دھوکہ۔ وہ بھی ماں کے ساتھ۔ جاؤ گل! مکمل اور بلال دونوں کفو رہا کر لاؤ۔ یہ شادی اب نہیں ہوگی۔ مولوی کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔ میری زندگی میں یہ نکاح نہیں ہوگا اور نہ ہی روٹی ہمارے خاندان کی بہو بنے گی۔“ گل نے خود جانے کی بجائے ملازمہ کو بھیج دیا اور جلدی ہی وہ دونوں بھائی اٹھ کر چلے آئے۔ بیگم اخلاق نے بلال کو دیکھتے مکمل سے کہا۔

”اپنے بھائی کی چالاکی کا کچھ بتا چلا تمہیں؟“

”کیسی چالاکی؟“ مکمل نے پوچھا تو بیگم اخلاق نے طنز یہ کہا۔

”لہن کا پتا چلا کون ہے۔ پوچھو اس سے لہن کون ہے؟“

”لہن ہمارے کون ہے؟“ مکمل نے بھائی سے کچھ پوچھنے کی بجائے ماں کو جواب دیا۔

”مکمل لہن کوئی اور نہیں روٹی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے بیگم اخلاق کے لہجے میں نفرت عموماً آئی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں امی جان آپ۔ روٹی تو پلین کریش میں ہلاک ہو گئی تھی۔ پھر وہ زندہ کیسے ہو سکتی ہے۔“ مکمل نے جلدی سے کہا۔

”یہ بات اپنے بھائی سے پوچھو وہ زندہ کیسے ہے اور اس نے اس کو ہمارے گھر میں لانے کی جرأت کیسی کی۔ کیا وہ اس گھر میں لانے کے قابل تھی۔“ نفرت و آہستگی سے کہا۔



”بلال! امی جان جو کچھ کہہ رہی ہیں کیا وہ سچ ہے۔“ بھائی کی بات سن کر بلال نے ایک نظر سامنے بیٹھی روبی کو دیکھا۔ وہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ یتیم خانقہ نے گل سے کہا۔

”اب یہ نکاح اور شادی ہرگز نہ ہوگی۔ اٹھاؤ اس آوارہ کو یہاں سے اور ملازمہ کے ساتھ اوپر بھیج دو۔ مہمانوں سے کہہ دیں گے کہ ان کی طبیعت نامناسب ہے۔ جلدی کرو اس سے قبل کہ سب اس کو پہچان کر ہم پر تھوکتے ہیں اور پر بھیج دو۔“ یتیم خانقہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ روبی کے پاس گل فروشی گئی اور آہستہ آہستہ طنزیہ انداز میں کہنے لگی۔

”آدھا چہرہ چھپانے سے کردار نہیں چھپ جاتا اور نام بدلنے سے گھر سے بھاگنے والی بدنام لڑکی شریف نہیں بن جاتی۔ قبل اس کے کہ سب مہمان تم کو پہچان لیں اور ہماری رسوائی ہو اٹھو یہاں سے اور اوپر جاؤ۔ تب تک ہم تمہارے بارے میں کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر لیتے۔“

روبی نے چہرہ اٹھا کر سامنے کھڑے بلال کو دیکھا۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہے تھے۔ پھر وہاں اور ملازمہ کے ساتھ ہل سے باہر چلی آئی۔ آنکھوں میں نمی اتر رہی تھی۔ مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ ملازمہ اس کو اوپر چھوڑ گئی اور جاتے جاتے یہ بھی بتا گئی کہ ساتھ والا روم آپ کی والدہ کا ہے اور چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد روبی نے اماں کو دیکھا اور کہا۔

”وہی ہونا جو میں نے کہا تھا۔ ایک بار پھر بلال نے میرا سکون تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔“

”نور! اس میں اس بیمار بے کا کیا تصور؟ وہ تو بیمار ماں کی خوشی کی خاطر تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔ اماں جلدی سے بلال کی فیور میں بولیں پھر کہا۔

”میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی یہ لوگ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ ارے بھری محفل سے کہن کو اٹھا دیا۔“ روبی نے اب کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ کپری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

روبی کے اوپر جاتے ہی یتیم خانقہ کمال بلال اور گل کو ساتھ لیے اپنے روم میں آئیں۔ ان کے ساتھ روجی بھی آئی تھی کہ وہ خود بلال کی فریڈنگ بھی لے لے۔ اپنے روم میں آتے ہی یتیم خانقہ نے بلال کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اتنا بڑا دھوکا۔ پہلے تو یہ بتاؤ یہ بدنام لڑکی زندہ کیسے سچ گئی اور تم نے آنے سے پہلے بتایا کیوں نہیں کہ تم روبی کے ساتھ شادی کر رہے ہو۔ اتنا لمبا چوڑا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یاد رکھو یہ شادی اب ہرگز نہ ہوگی۔ اتنا بڑا دھوکا اور وہ بھی ماں کے ساتھ۔“

”دھوکا میں نے کیا ہے یا آپ نے کیا۔ ڈرامہ میں کر رہا ہوں یا آپ نے کیا۔ مجھے فون کر کے بتایا گیا کہ آپ سخت بیمار ہیں اور آپ یہاں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ بھری محفل سے میری کہن کو اٹھا تے ہوئے آپ کو ذرا سا بھی خیال نہیں آیا کہ اس کے گل پر کیا گزرے گی۔ اس خوش فہمی میں نہ رہنے گا کہ آپ اس شادی کو روک سکتی ہیں۔ میں نکاح کرنے کے بعد ہی پاکستان آیا ہوں۔ آپ اس کو بطور بہو قبول کریں یا نہ کریں وہ میری بیوی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔“ بلال نے بھی شدید غصے سے ذرا سا بھی لحاظ کیے بغیر کہہ دیا۔ روبی کی جوتوہن ہوئی تھی وہاں کو مارے غصے کے پاگل کر رہی تھی۔

یہ سنتے ہی کہ بلال اس کو نکاح کرنے کے بعد یہاں لایا ہے۔ یتیم خانقہ بھی مارے غصے کے پاگل ہو گئیں۔ انہوں نے بال کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”تمہاری جرات کیسے ہوئی اس کو یہاں ہمارے گھر نکاح کے بعد لانے کی۔ جس کی بدنامی اور آوارگی کے قصص شہر کی ہر دو دیوار پر لکھے گئے، جس کے پوسٹر چھاپے گئے۔ وہ آوارہ تمہاری بیوی ہو سکتی ہے۔ میری بہو ہرگز نہیں، سنا تم نے۔“

”امی! بلال نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔“ وہاں ہال میں جب آپ نے یہ لفظ کہا تو مہمانوں کی موجودگی کا خیال کر کے میں چپ رہا۔ مگر اب پھر آپ نے کہہ دیا۔ بس یہ آخری بار ہونا چاہیے۔ یاد رکھیے گا اب وہ میری بیوی ہے۔ اگر آپ نے پھر یہ لفظ نور کے لیے استعمال کیا تو ہو سکتا ہے مجھ سے بھی آپ کی شان میں کوئی بے ادبی ہو جائے۔“ بلال اتنا کہہ کر دروازے کی جانب پڑھے تو روجی نے ان کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

”بلال! میں نے تمہیں روبی کے بارے میں سب کچھ کھل کر بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود تم نے روبی سے نکاح کر لیا۔ بڑے فاسوس کی بات ہے۔“ روجی کی یہ بات بلال خان کو تپا گئی اور انہوں نے روجی کی طبیعت صاف کرنے کا سوچتے ہوئے کہا۔

”روجی! روبی اب تمہاری بہن نہیں میری بیوی ہے۔ اس کے بارے میں مزید کچھ بھی کہنے سے پہلے سوچ لیتا۔ اپنی بیوی کے بارے میں ایک لفظ بھی سننا مجھے کوارا نہیں ہوگا۔ یاد رکھنا میرا خاموش رہنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے ورنہ یہ بات غزالہ کی موت سے بھی بہت پہلے میں جان چکا تھا کہ مجرم روبی نہیں کوئی اور تھا۔ مجھے تو حیرت ہے تمہارے اس رویے



پر ایک تو چوری اس پر سینہ زوری۔“

پھر وہ اوپر چلے آئے۔ انہیں حیرت تھی اس خاندان پر جہاں مجرم لوگ اب بھی معتبر تھے اور جو بے گناہ بھی تب معصوم بھی تھی اور چھوٹی بھی۔ وہ آج بھی سب کی نگاہوں میں مجرم تھی۔ وہ اوپر آئے تو بیگم خلاق بھی ان کے پیچھے آئیں اور قبل اس کے کہ وہ اپنے روم میں داخل ہوتے انہوں نے بلال کا ہاتھ پکڑ کر ان کو روکتے ہوئے کہا۔

”تم روپی کے پاس نہیں جاؤ گے۔ تم نکاح کر چکی ہو تو وہ صرف نام کی حد تک تمہاری بیوی رہے گی۔ میں روپی کے وطن سے نہ اپنے لیے پوتا چاہتی ہوں نہ بی پوتی۔ تمہیں تو کچھ خیل نہیں اپنی محبت میں اندھے ہو رہے ہو مگر مجھے خیال ہے۔ میں نہیں چاہتی کل کو لوگ میرے پوتے پوتی سے یہ کہیں کہ ان کی ماں اپنے گھر سے بھاگ گئی تھی۔“ مگر آگے بڑھنے نے ان کو بولنے سے روک دیا تھا۔ یہ کہہ کر امی ”پلیز! آپ جائیں یہاں سے۔ آپ سے اب مہمانوں کے جانے کے بعد بات ہوگی اور یہ فضول باتیں اب چھوڑ دیں تو آپ کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔ آپ کے بہو تسلیم نہ کرنے سے مجھے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ وہ میری بیوی اب ہمیشہ رہے گی۔“

”ٹھیک ہے چھوڑ دیتی ہوں۔ مگر تم بھی نیچے چلو کھانا تم مہمانوں کے ساتھ کھاؤ گے۔“ نیگم اخلاق بلال کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے ساتھ نیچے لے گئی تھیں۔ لیکن کی تو طبیعت خرابی کا کہنا تھا۔ اب کیا دوا بھی ساتھ پیمان ہو گیا تھا۔

روحی بلال کی بات سننے کے بعد ان کے اوپر جاتے ہی خود جلدی سے خواتین والے حصے میں آگئی تھی۔ کھانا کھاتے ہی وہ عامر کے ساتھ بچے لے کر شمشادلو کو وہیں چھوڑ کر اپنے گھر چلی آئی تھی۔ مل میں پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ولیمہ پر بالکل بھی نہیں جائے گی۔ پھر اس نے گھبرا کر سوچا۔

”کیلا دل کو سب باتوں کہ بتا چل گیا مگر کیسے؟“ بہت سوچنے کے بعد اس کو خزانہ کی اجنبی بات والے دن کبھی ہوئی بات یاد آئی۔

”روحی! میں نے ابھی ابھی تمہارے جمشید کو باہر بلال کے پاس کھڑا دیکھا ہے۔“ تب تو نہیں مراب اس نے سوچا یقیناً جمشید بلال کا دوست ہوگا اور اسی نے میرے بارے میں بلال کو سب کچھ بتایا ہوگا۔ خیر جو بھی ہے اب زندگی میں کبھی بلال کے گھر نہیں جانا۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ ماں سے بھی کہہ دیا تھا۔ اب ابوسلمان، نزولہ وغیرہ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ روہی زندہ ہے۔ اور نہ گڈ کو کسی کا بیٹنا ساز طبیعت کی وجہ سے وہ بھی شادی میں نہیں آئی تھی۔

★ ★ ★

روبی نے نیگم اخلاق کی وہ سب باتیں سن لی تھیں۔ جو انہوں نے روم کے دروازے کے باہر کھڑی ہو کر بلال سے کہی تھیں۔ اور پھر بلال کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں دعائیں کی تھیں۔ روبی کو سنانے کے لیے۔ ان کے جانے کے بعد روبی کتنی ہی دیر بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر فیصلہ کرتے ہی وہ اٹھی اور نہ صرف جیلری اتار کر عروسی جوڑا بدل لیا بلکہ سارا میک اپ بھی صاف کر دیا۔ منہ دھو کر وہ بستر میں آئی اور لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ابھی زیادہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ کیا سوچ کر آئی تھی اور کیا ہوا تھا؟ جو بھی ہوا تھا بہت زیادہ تو بین آئینہ ہوا تھا۔ بل بھر میں ایک بار پھر زندگی اس کو ایک نئے دور ہے پر لے آئی تھی۔ ساری خوشی خاک میں مل گئی تھی۔ اب کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

تقریباً دو گھنٹہ کی طرح گزر گئے مگر وہ کوشش کیا وجود نہیں سکی تھی۔ تاہم اس نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی اور پھر بالآخر سونے میں کامیاب ہوئی گئی تھی۔ نجانے ابھی کتنی دیر سوتی تھی مگر چونکہ کبھی نیند بھی اس لیے اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو روپی کی آنکھ کھل گئی۔ پھر بہت آہستگی سے دروازہ بند کیا گیا۔

یوں تو دم پہلے ہی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ مگر ایک لگسی خوشبو روپی نے محسوس کی۔ کارپٹ بچھا ہونے کی وجہ سے قدموں کی آہٹ تو سنائی نہ دی مگر روپی نے محسوس کیا تھا کہ کوئی اس کے سر ہانے آ کھڑا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک عجیب سی خوشبو اور مہلک اسے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ روپی جو پہلے ہی سونے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد شاید چند منٹ ہی سو پائی تھی کہ بلال کی آمد سے آنکھ کھل گئی تھی۔ اب بلال کی موجودگی کا خیل کر کے سوتا ہوا ذہن ایک دم پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ روپی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اس لمحہ وہ کیا کرے۔ اسے کب معلوم تھا کہ اگر اس کی لائف میں سہاگ رات آئے گی تو وہ۔۔۔۔۔ اف مجھے کیا کرنا چاہیے؟ وہ سوچ رہی تھی جبکہ بلال سر ہانے کھڑے خود بھی کسی سوچ میں گم تھے۔ کچھ وقت یونہی گزر گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم رہا اور پھر بلال نے جھکتے ہوئے اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ ہاتھ کا یہ لمس محسوس کرتے ہی روپی نے تڑپ کر آنکھیں کھل دیں۔ بلال اس کے سر ہانے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ روپی نے بغور ان کو دیکھا تو دل ڈانواں ڈول ہو گیا۔ کیا میں وہ سب کچھ ان سے کہہ سکوں گی؟ روپی نے ایک نکل اس کے چہرے کو دیکھتے



ہوئے سوچا۔

”نور کی بات ہے؟“ بلال نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنا نیت سے پوچھا۔

روبی نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے اور ہونٹ سختی سے بھیج کر سسکیوں کو روکا۔ ورنہ اس کا توججہ چیخ کر رونے کو مل چاہ رہا تھا۔ وہ بھی بلال کے سینے سے لگ کر۔ مگر جو کچھ وہ کرنے جا رہی تھی اس کے لیے ضبط کرنا بے حد ضروری تھا۔

بلال یونہی کھڑے لغو اس کو دیکھ رہے تھے یا شاید حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے منہ سے تو کچھ نہ کہا تھا۔ مگر ان کی نگاہوں میں شکایت تھی۔ شکوہ تھا۔ روبی کے اس رویے اور حلیے پر۔ مگر وہ چپ تھے۔ ایک لمبا امتحان سے گزر کر وہ یہاں تک آئے تھے اور دوسرا امتحان یہاں ان کا منتظر تھا۔

روبی کا بدلہ ہوا یہ روپ یہ بتانے کو کافی تھا کہ وہ شاید بلکہ یقیناً ہی کی سب باتیں سن چکی ہے۔ گھر والوں کا رویہ اگر نا مناسب تھا تو اس میں ان کا کیا قصور۔ وہ تو خود بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ گھر والے ان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ روبی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ روبی ان کو زبردستی دیکھنے کی اور نظریں جھرا لیں۔ ایسا نہ کرتی تو دل بے اختیار ہو جاتا۔ وہ دل جو شروع ہی سے ان کو دیکھ کر بے ایمان ہو جاتا تھا۔ اس نے بے دردی سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچا۔

بلال! ایک وقت وہ تھا جب آپ نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ پھر وقت میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے آپ کو ٹھکرا کر اپنے ٹھکرائے جانے کا آپ سے بدلہ لے لیا۔ اب عجیب موڑ ہے زندگی کا۔ آپ مجھے چاہتے ہیں۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے میں آپ کو چاہتی ہوں۔ اپنے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ۔ اس کے باوجود نہ چاہتے ہوئے بھی آج مجھیں دوسرے لوگوں کی خوشی کے لیے آپ کو ایک بار پھر ٹھکرا دیا ہو گا۔ مجھے۔ یہ لوجہ مجھے بہت اذیت دے گا۔ مگر پھر بھی یہ سب کرنا ہی ہو گا۔ مجھے۔ اگر آپ کی والدہ میرے بطن سے بچے نہیں چاہتی تو پھر میں بھی آپ کی اس قربت نہیں چاہتی۔ اے کاش! میں آپ کے ساتھ یہاں نہ آتی۔ میں نے تو اللہ کے گھر کے اندر آپ سے سامنا ہونے کے باوجود بچنے کی کوشش کی تھی۔ خود کو چھپا کر اپنے گھر چلی آئی تھی۔ آپ سے دور رہنے کے لیے۔ مگر ای جان سے آپ کا دکھا اور میری تنہائی دیکھی نہ گئی اور انہوں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا۔ یہی تو بتانا انسان کے اپنے اختیار میں کب کچھ ہوتا ہے۔ ہر انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہوتا ہوتا ہے۔ سو میں بھی ہو گئی۔ شاید اس لیے کہ یہاں میری ایک نئی آزمائش منتظر تھی۔ آپ کے ساتھ یہاں نہ آتی تو یہ اذیت نہ مجھے سنی پڑتی جو میں بہہ رہی ہوں۔ نہ آپ کو یہ دکھا ٹھکانا پڑتا جو ابھی آپ اٹھانے والے ہیں۔

بلال روبی کو عام سا دلہا لباس میں دیکھ کر ہی سمجھ گئے تھے کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اس وقت روبی کو مسلسل سوچتے دیکھ کر مارے دکھ کے سوچا۔ کتنی عجیب بات ہے نور! یہاں بعض اوقات بلکہ اکثر جرم دوسرے لوگ کرتے ہیں اور سزا کسی تیسری کے کھٹکتی پڑتی ہے۔ جیسے اس وقت تم نے دوسروں کے جرم کی سزا مجھے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انہوں نے ایک بار پھر روبی کو دیکھا۔ وہ ابھی تک یونہی لٹی لٹی ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر بھی اس نے اٹھنے کی زحمت کو امانہ کی تھی۔ نیند کی آمد سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے روبی کا رادے سمجھتے ہوئے سوچا۔ پھر فیصلہ کرتے ہی رونمائی والی ڈیبا سائینڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔

”نور! تمہیں یقیناً سخت نیند آ رہی ہے۔ تم سو جاؤ۔“ پھر وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

اگرچہ روبی کا دل کمزور ہو رہا تھا۔ مگر یہی وہ لمحے تھے جن میں اس نے بلال کو فیصلہ سنا دیا تھا۔ اپنی پوری قوت یکجا کرتے ہوئے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور آہستہ سے کہا۔ ”میں سو تو نہیں رہی تھی۔“

”پھر؟“ بلال گھوم کر اس کے سامنے آ گئے۔ دل کو تھوڑا سا حوصلہ ملا تھا۔

ادھر روبی نے اٹھل پھٹل ہوتے دل کو سنبھالا اور کہا۔ ”اصل میں میں اس روایتی پن کو ختم کرنا چاہتی تھی۔“

”کیا روایتی پن؟“ بلال نے بے ساختہ پوچھا۔

”یہی۔“ وہ آنکھوں میں آئے آنسو ضبط کرتے ہوئے تنہی سے ہنسی۔ لہن کو دہن نہ کہنا سرخ کپڑوں کی گھٹری کہنا، کتنی عجیب بات ہے۔ ہمارے یہاں صدیوں سے یہ حماقت کی

جا رہی ہے۔ لہن کو جابنا کر ایک مرد کے حوالے کیا جاتا ہے۔ لو بھی جو چاہے سلوک کر دے اس کے ساتھ، ہمیں سب اختیار حاصل ہے۔“

”نور! بلال نے حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا مگر وہ اپنی ترنگ میں بولتی گئی۔



”میں اس رسم کو منانا چاہتی تھی۔ کیلیہ ضروری ہے کہ لہن سرخ لباس پہنا اور اس پر غضب یہ کہ گھونگھٹ بھی نکالے۔ اونہ لہن۔“ وہ نفرت سے بولی۔ اس کی خود اپنی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ بے معنی باتیں کیوں کر رہی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسوہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔

”نور! بلال نے اس کی کیفیت سمجھ کر اس کا ہاتھ تھا مناجا تو وہ تڑپ کر دور ہو گئی۔

”نور! بلال کے لہجے میں احتجاج تھا۔ روپی نے پلٹ کر انہیں دیکھا اور پھر بیچ سے نیچا تر گئی۔ اندر لگی آگ کو بجھانے کے لیے روپی سائیدیمیل پر رکھے ہوئے پانی کے جگ میں سے اس بھر کر ایک ہی سانس میں پی گئی۔ پھر بلال کے مقابل کھڑی ہوتی ہوئی اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

”آپ کو یاد ہے میں نے آپ سے کہا تھا؟“

”کیا سر ہار کیا خان کیا وڈیرے اور کیا چوہدری سب مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سب مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔“

”نور! بلال نے احتجاج کیا۔ ”ان باتوں کا اس وقت کیا ذکر۔“ مگر روپی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ سنی ان سنی کر کے بولی۔

”آپ کو وہ رات تو اچھی طرح یاد ہو گئی جب میں آپ کے پاس آئی تھی اور آپ نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ آپ کو کیا پتا اس رات جو آگ میرے دل میں لگی تھی اسے کبھی کوئی نہ بجھا سکا۔ آپ کا وہ ٹھکرنا آپ کی وجہاتیں میرے دل میں کھب گئیں۔ آپ نے کہا تھا عورت کے پاس فقط ایک عزت ہوتی ہے۔ وہ بھی چلی جائے تو۔۔۔۔۔“ وہ کی اور بلال سمجھ گئے۔ آج انہیں ایک بار پھر وہی سب کچھ سننا ہوگا۔

”وہ بھی چلی جائے تو اس میں اور بازار میں بیٹھی عورت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ آپ کی مہربانی سے میں بھی اس کوہر نایاب سے زبردستی محرم کر دی گئی۔ میں زیادہ نہیں کہنا چاہتی۔ قصہ مختصر کرتی ہوں سنیں۔ اس رات آپ نے مجھے ٹھکرا دیا تھا اور آج کی رات میں آپ کو ٹھکرانی ہوں۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر کے لیے روم میں سکوت چھا گیا جسے بلال کی کبھیر آواز نے ہی توڑا۔

”نور! بلال نے سکون سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ بار بار اس رات کا ذکر مت کرو۔ اس رات میں اور آج کی اس رات میں بہت فرق ہے۔ اس رات میں تمہارے لیے نامحرم تھا۔ وہ رات گناہ کی رات بن جاتی مگر آج تو ہم ایک مقدس بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ آج تو ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ آج ہم دونوں ایک ہیں۔ نور آج کی رات تو ملن کی رات ہے۔“ انہوں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ کوپا آ پے سے باہر ہو گئی۔

”کیا آپ آج بھی یہ سمجھتے ہیں اس رات میں آپ سے آپ کی رفاقت کی بھیک مانگنے لگی تھی۔“ روپی کی آنکھوں میں نفرت چھا گئی۔ وہ بلال کو خود سے متنفر کرنے کے لیے زبردست اداکاری کر رہی تھی۔

بلال نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ جانتے تھا انہوں نے ایک بار پھر نیکی کے روپ میں اس کے ساتھ برائی کی ہے۔ یقیناً وہ امی کی سب باتیں سن چکی تھی۔ اس میں اب شک کی گنجائش نہ رہی تھی اور پھر جو توہین اس کی ہوئی تھی۔ جو سلوک اختیار کیا گیا تھا وہ بھولنے یا نظر انداز کرنے والا کب تھا اس کو بھری محفل سے اٹھا دیا گیا تھا۔ وہ محفل جو منعقد ہی اس کے لیے ہوئی تھی۔ وہ جس نام کو بھول گئی تھی اس کو پھر اسی نام سے پکارا گیا تھا۔ اس کی کیفیت کو بلال اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ یہی وجہ بھی انہوں نے محض اس کو خوش کرنے کے لیے نرم لہجے میں کہا۔

”نور! تم ٹھیک کہتی ہو۔ اصل میں اس رات شاید میں اپنے آپ سے ڈر گیا تھا۔ شاید میں خود سے خنجر وہ ہو گیا تھا اور لازم تم کو دیا۔ مگر نور! آج۔“ انہوں نے اسے کامدھوں سے تھا مناجا چلا مگر وہ تڑپ کر الگ ہو گئی اور چیخ کر بدتمیزی سے کہا۔

”پلیز! مجھے بلال چھوٹا نہیں۔ اگر تم نے مجھے چھوٹا تو۔۔۔۔۔“

”نور! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ بلال نے اس کا کانپا ہوا سر دبا تھا نے ہاتھ میں لیا چلا تو وہ پھر چیخ پڑی۔

”مجھے تمہاری قسم بلال! اگر تم نے مجھے چھوٹا تو میں جان دے دوں گی۔“ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

بلال نے کبری سانس لے کر اسے دیکھا۔ وہ جان گئے تھے وہ جو کہہ رہی ہے کبھی گزرے گی۔ جو ٹھل قدموں سے چلتے ہوئے وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔ پھر پوچھا۔



”تم کیا چاہتی ہو نور! صاف صاف کہو۔“

”آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میں آپ سے لگتا آپ سے دور رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ اندر کے انتشار کو دبا کر بظاہر سکون سے بولی۔

”دیکھو نور! گھر والوں نے اگر یہاں کارسلوک تم سے کیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے تو خلوص دل سے تم کو اپنایا ہے۔ تم میری بیوی ہو۔“

”میں فضول باتیں نہیں سن سکتی اور ناپسندیدہ باتیں کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی ماں کو میرے بطن سے پوتا پوتی نہیں چاہیے تو مجھے بھی آپ یا فضول شوہر نہیں چاہیے۔ بہتر ہے آپ فوراً میرے روم سے چلے جائیں ورنہ۔“ روبی نے سخت لہجے میں کہا۔ اور دل میں سوچا اب تک جو کچھ کہا ہے کہیں ایسا نہ ہو دل کے بے قابو ہونے پر وہ سب رائیگاں چلا جائے۔ یہی وجہ تھی اس نے انہیں فوراً روم سے نکل جانے کا کہہ دیا تھا۔

”نور یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ بلال نے قدرے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”کسی پیچیدہ زبان میں تو بات نہیں کی جسے آپ سمجھ نہ سکیں۔“ روبی نے زیر خند سے کہا۔

بلال کو ایک دم ڈھیروں غصہ آ گیا۔ مگر وہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔ ”تم اگر مجھ سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی تو نہ یہی تمہاری یہ باتیں اس روم تک محدود رہنی چاہئیں۔ باہر لوگوں کو تمہارا دکھانے کی۔۔۔۔۔“ مگر روبی نے ان کی بات کاٹ دی۔

”میں منافقت پسند نہیں کرتی۔“ اور وہ بلال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”کیا بھول گئے جھوٹ تو آپ بھی نہیں بولتے اور پھر یہ کسی ناول یا افسانے کا سینہ نہیں کہ میں اداکاری کرتی رہوں۔ اندر کچھ اور باہر کچھ۔۔۔۔۔ نہیں جو کچھ اندر ہے وہی باہر بھی ہوگا۔ آپ اس روم میں نہیں سو سکتے۔ اور اگر آپ یہاں سونا چاہتے ہیں تو میرے لیے الگ روم کینڈوبست کر دیجئے۔ پھر جب آپ کی امی مجھ سے اپنی اور اس خاندان کی چھوٹی بہو تسلیم کر لیں گی تو میں بھی آپ کو بطور شوہر قبول کرنے پر غور کروں گی۔ اچھی بھلی پرسکون زندگی گزار رہی تھی میں جو آپ نے ایک بار پھر تباہ کر دی یہاں لا کر۔“

بلال کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ”او کے نور! تم جو چاہتی ہو وہی ہوگا۔ مگر آج کی رات مجھے اس روم میں بسر کرنے دو۔ نیچے سب مہمان اور گھر والے سو چکے ہیں۔ کل سے میں اپنے لیے الگ روم کا انتظام کر لوں گا۔“ جواباً روبی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر گھوم کر مسہری کے دوسری جانب بیٹھ گئی۔ ”کیا اب بات کرنے کا موڈ نہ تھا۔ بلال اٹھے اور سلپنگ سوٹ لے کر فاش روم میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئے تو روبی لیٹ چکی تھی۔ تاہم لائٹ آن ہی تھی۔ بلال نے ایک اچھٹی نظر اس پر ڈالی اور لائٹ آف کر کے خود بھی بیڈ کی دوسری سائیڈ پر لیٹ گئے اور تارکی ہوتے ہی کو یادہ خود بھی دکھی ہو گئے۔ آنکھیں بھیگی سی لگیں۔

یہ بجا سجا یا روم، یہ عروسی بیج، یہ پھولوں کی نرم اور بھینسی سی مہک اور نور کے وجود کی خوشبو ان کے درمیان اگرچہ اس وقت بہت کم فاصلہ تھا مگر یہ فاصلہ صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔ روم میں بچھے ہوئے پھول انہیں اپنی حسرتوں کے مزار پر پڑے لگدے تھے۔ سعودیہ سے چلتے ہوئے انہوں نے یہ کب سوچا تھا کہ ان کی سہاگ رات ایسی ابھورنگ ہوگی۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ گھر والے نور کو دیکھ کر خفا ضرور ہوں گے۔ مگر خود نور بھی بدل جائے گی یہ کب معلوم تھا انہیں۔ کوشش کے باوجود وہ سونہ سکے۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ جاگ نور بھی رہی ہوگی۔ بھلا ایسی حالت اور حالات میں کون سو سکتا تھا اور ان کا یہ رویہ اور اندازہ درست بھی تھا۔ یہی وجہ ہے انہوں نے خاموشی سے نور کی بات مان لی تھی۔

روبی چپ چاپ بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ بلال جب بیڈ پر آ کر لیٹنے لگے تھے تو اس کا بے ساختہ جی چلایا کہہ دے یہاں نہیں وہاں صوفے پر جا کر سوئے۔ مگر کوشش کے باوجود وہ کہہ نہ سکی۔ وہی بہت تھا جو پہلے کہا تھا اور دل پر کتنا جبر کر کے کہا تھا۔ یہ تو وہی جانتی تھی۔ تاہم اس کے باوجود اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ابھی تو ابتدا ہے۔ انتہا میں پتہ نہیں کیا کچھ کرنا ہوگا۔ چونکہ بلال ہی اس کو یہاں لانے کے ذمہ دار تھے اس لیے بدلا بھی وہ بلال سے ہی لینا چاہتی تھی۔ آئندہ اس نے کیا کرنا تھا۔ وہ ابھی سے سوچ رہی تھی اور رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔

رات کا نچانے کو سنا پہر تھا جب بلال کی آنکھ کچھ دیر کے لیے لگی تھی۔ مگر اچانک وہ کوئی مانوس سی آواز سن کر جاگ اٹھے۔ یوں بھی اتنی کبریٰ نیند وہ کب سوئے تھے۔ انہوں نے پلٹ کر نور کو دیکھا مگر بیڈ خالی دیکھ کر دل ایک دم اچھل کر حلق میں آ گیا۔ نور انہوں نے سوچا کہاں جاسکتی ہے۔ اسی وقت جلدی سے اٹھے اور اچانک نظر کھڑکی سے ٹپک لگائے کھڑکی نور پر پڑ گئی۔ باہر شاید پھر بارش ہو رہی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اسے دیکھنے لگے۔ روم کی لائٹ اگرچہ آف تھی مگر کبھی کبھار جب بجلی چمکتی تو نور کا چہرہ نظر آ جاتا۔ وہ آنکھیں بند کیے



کھڑی تھی۔ شاید یہ ڈر رہی ہے۔ پہلا خیل بلال کے دل میں یہی آیا اور سارا غصہ جاتا رہا۔ وہ جلدی سے اٹھے۔ سلیپر پہن کر اس کے قریب آئے۔ مگر وہ یونہی آنکھیں بند کیے بے خبر کھڑی رہی اور ان بند آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر بلال تڑپ گئے۔ آج جب وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ تب بھی وہ تنہا تنہا اپنے اپنے دکھ جھیل رہے تھے اور یہ کتنے دکھ کی بات تھی۔ مگر وہ بھی کیا کرتے مجبور تھے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا مگر والے ان کے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں تو وہ کبھی نور کو لے کر یہاں نہ آتے۔ نہ خود بے سکون ہوتے نا خود کو بے سکون کرتے۔ لیکن اب تو وہ آنے کی بھول کر چکے تھے۔

”نور! بلال نے محبت سے پکارا تو وہ چونک پڑی۔ پوری آنکھیں کھول کر بلال کو دیکھا۔ کچھ دیر کھوٹی کھوٹی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر آنکھیں موند لیں۔ گویا بات کرنے کا سوڈ نہ تھا۔ نہ ہی ان کو دیکھنے کا۔ حالانکہ دل اندر سے ان کی اس حالت پر تڑپ رہا تھا۔ جن کی سہاگ رات اس نے محض اپنی انا اور ضد میں تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ وہ پھر بھی محبت سے اس کو مخاطب کر رہے تھے۔

”کیلیات ہے نور! تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ اگر تمہیں ڈر لگے۔۔۔۔۔“ مگر ان کی بات ادھوری رہی۔

”ڈر۔“ وہ سیدھی ہوتی ہوئی مصنوعی نفرت سے بولی۔ ”اچھا تو آپ یہ سوچ کر آئے ہیں کہ شاید میں ڈر رہی ہوں۔ اس لیے یہاں کھڑی ہوں نہیں۔“ وہ تنگی سے بولی۔ ”وہ رات جب ختم ہوئی تھی تو ڈر بھی ہمیشہ کے لیے میرے اندر سے ختم ہو گیا تھا۔ مگر ہاں اس رات جو ایک آگ میرے اندر لگی تھی۔ وہ کبھی نہیں بجھی۔ نجانے یہ آگ کب بجھے گی۔“ وہ بلال کو وہیں چھوڑ کر آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔

☆☆☆

دور فضا میں اسی وقت مؤذن کی آواز ابھری۔ بلال غسل کر کے مسجد چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی نور نے بھی وضو کر کے نماز پڑھی۔ درود کو اللہ سے اپنے بہتر مستقبل کی دعا لگی تو دل کو کچھ سکون سلا۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ بلال جب نماز پڑھ کر آئے تو وہ سچ سچ سو رہی تھی۔ وہ خود بھی لیٹ گئے۔ ذہن بری طرح تھک گیا تھا۔ وہ اس وقت صرف سونا اور سونا چاہتے تھے۔ مگر ان حالات میں نیند کیسے آتی۔ روٹی نجانے کیسے سو گئی تھی۔ شاید اس نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر مطمئن تھی مگر بلال کو نیند نہ آئی۔ اگرچہ آنکھیں بند کر کے وہ لیٹ گئے تھے مگر نیند نہ آ رہی تھی۔ آخر نیند کو ان پر ترس آ ہی گیا۔ مگر ابھی وہ پوری طرح سو بھی نہ پائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ بچی نیند میں ہی تھے اس لیے آنکھ فوراً کھل گئی۔ نظر سیدھی کلاک پر گئی۔ دو بج رہے تھے۔ گویا کچھ دیر ہی سوئے تھے۔ انہوں نے سوچا اور پھر نور کو دیکھا لیکن وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ دستک ایک بار پھر زور سے ہوئی۔ بلال جلدی سے اٹھے اور دروازہ کھولا تو باہر گل بہت ساری رشتے دار لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ انہوں نے ایک نظر بلال کو دیکھا اور پھر روم میں داخل ہوئی۔ ایک نظر سوئی ہوئی روٹی پر ڈالی اور تنگی سے بولی۔

”رات کیا سونے کے لیے نا کافی تھی جو ابھی تک پڑی سو رہی ہو۔ چلو اٹھو اور ناشتہ۔۔۔۔۔ ناشتہ تو خیر کھل ہوا۔ اب دو بج رہے ہیں۔ کھانا کھاؤ۔“ انہوں نے یوں کہا جیسے کہہ رہی ہوں زہر کھاؤ۔ روٹی تو دروازہ کھلنے کی آواز سن کر ہی جاگ گئی تھی۔ مگر وہ ان سب لوگوں کے سامنے اٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اٹھنا تو تھا وہ سر پر دوپٹہ لیتے اٹھ بیٹھی۔ گل نے غور سے اس کو دیکھا اور روٹی نے نظریں جھکا لیں۔ پھر گل جس طرح آئی اسی طرح یہ کہتے ہوئے چلی گئی میں کھانا بھیج رہی ہوں۔ جلدی سے تیاں ہو جاؤ۔

ان کے جاتے ہی روٹی چپل پہن کر واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد منہ دھو کر آئی تو بلال پھر بیڈ پر لیٹ چکے تھے۔ پتا نہیں کیلیات تھی۔ ایک عجیب سی ٹھکن، ایک عجیب سا درد وہ جسم میں محسوس کر رہے تھے۔ وہ گل کے جاتے ہی پھر لیٹ گئے تھے۔

روٹی کی سمجھ میں نہ آیا اب وہ کیا کرے۔ بیڈ پر بیٹھ جائے یا صوفے پر مگر صوفہ تو اسی سائیڈ پر تھا جس سائیڈ پر بلال لیٹے تھے۔ وہ اسی شش و پنج میں کھڑی تھی کہ بلال نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔ رات والے سرمئی سا دھوٹ میں سر پر اچھی طرح دوپٹہ لپیٹا۔ وہ چپ اور ادا کی کھڑی تھی۔ وہ ان کے نکاح میں تھی۔ مگر وہ اس کو چھونے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ گھر والوں نے محض اپنی ذاتی انا اور خوشی کے لیے ان دونوں کی خوشیاں تباہ کر دی تھیں۔ وہ ان سے تھا بھی تو ٹھیک ہی تھی۔

”نور! ادھر آ کر صوفے پر بیٹھ جاؤ۔“ بلال نے آہستہ سے کہا۔ مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔

”کیا میں اٹھ جاؤں؟“ انہوں نے دوبارہ پوچھا۔ مگر جواب دینے کی بجائے وہ کھڑکی کے قریب آئی اور پوری کھڑکی کھول دی۔ باہر گھر اگھر اسادن تھا۔ بادل یا کھل والے خراب موسم کا کہیں پتا نہیں تھا۔ یوں جیسے صدیوں سے موسم ایسا خشک اور خوشگوار چلا آ رہا ہو۔ کتنی دیر وہ کھڑی باہر دیکھتی رہی اور بلال اس کو نہ صرف دیکھتے رہے بلکہ سوچتے بھی رہے۔



ایچانک روم شور سے کونج اٹھا۔ روبی نے پلٹ کر دیکھا تو لڑکیاں کھانا لے کر آئی تھیں۔ مگر اب ان میں گل نہیں تھی۔ یعنی دوبارہ آنے کی زحمت اس نے گوارا نہ کی تھی۔ وہ وہیں کھڑکی میں کھڑی لڑکیوں کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی لڑکیوں نے کھانا صوفے کے سامنے رکھی بیکل پر رکھا اور اس کے قریب چلی آئیں۔

”آئیے لہن صاحبہ! کھانا حاضر ہے۔“ ان سب نے مسکرا کر کہا۔ اور وہ کوشش کے باوجود انکار نہ کر سکی۔ حالانکہ کھانے کا موڈ اس وقت بھی نہ تھا۔ مگر اب کھانا تو تھا ہی لڑکیوں نے روبی کو لا کر صوفے پر بٹھا کر بلال کو دیکھا، پھر شوخی سے پوچھا۔

”کیوں جناب! اب آپ کیا چاہتے ہیں؟ جو ابھی تک بستر نہیں چھوڑا۔“

”کیا مطلب۔“ بلال نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”لیجئے، یہ تو مطلب بھی ہم سے پوچھ رہے ہیں۔“ انہوں نے پلٹ کر روبی سے کہا۔ مگر روبی چپ رہی تو وہ پلٹ کر بولیں۔ ”اٹھئے جناب! کھانا تناول فرمائیے۔ ارے جلدی کیجئے ورنہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”ان کے ساتھ؟“ بلال نے احمقوں کی طرح پوچھا؟ کیونکہ وہ جانتے تھے اگر وہ ساتھ کھانے بیٹھے تو نور اٹھ جائے گی۔ وہ پہلی ہی کہہ چکی تھی جو اندر ہو گا وہی باہر بھی۔ اور بلال ان سب کے سامنے اپنی سکی نہیں چاہتے تھے۔

”ارے! لڑکیوں نے حیران ہو کر ان کو دیکھا۔“ ان کے ساتھ نہیں کھائیں۔ گتو پھر کن کے ساتھ کھانے کا پروگرام ہے۔“ سب نے ہستے ہوئے پوچھا۔

بلال نور کو دیکھتے ہوئے چپ چاپ اٹھ گئے۔ حالانکہ دل تو یوں بھی رات روبی کی باتیں سن کر بھر چکا تھا۔ مگر مجبوری تھی وہ کسی اور کو تو اپنی حالت نہیں بتا سکتے تھے۔

کھانا سب کی موجودگی میں انہوں نے نور کے ساتھ کھایا اور قدرے حیران ہو کر کھایا۔ کیونکہ نور چپ رہی تھی اور کھانا بھی اس نے برائے نام کھایا تھا۔ کھانے کے بعد بلال نے کافی کا کہا تھا کیونکہ انہوں نے سعودیہ میں کھانے کے بعد ہمیشہ نور کو کافی پیتے دیکھا تھا۔

دوڑکیاں برتن لے کر چلی گئیں۔ دو روبی کے قریب بیٹھ گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر بلال اٹھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اماں روم میں داخل ہوئیں۔ بلال نے ان کو سلام کیا اور اماں نے ییار دیتے ہوئے ڈیمروں دعائیں ان کو دے ڈالیں اور پھر بلال روبی کو دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔

اماں روبی کے قریب آئیں۔ روبی نے ان کو دیکھا اور بے ساختہ ان سے لپٹ گئی۔ اماں نے منہ چوم کر ییار کیا اور اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”امی جان! آپ نے کھانا کھالیا؟“ روبی نے فوراً پوچھا۔

”ہاں بیٹی! کھالیا ہے۔“ اماں نے جواب دیا۔ اس دوران لڑکیاں اٹھ کر باہر چلی گئیں اور اماں نے سرکوشی میں پوچھا۔ ”کیوں نور بلال تو ٹھیک ٹھا کدہا۔“

”نہ بھی رہتے تو مجھے کیفرق پڑتا۔“ اس نے سنگدلی سے کہا۔

”ننہ بیٹی! ایسی بات نہیں کرتے۔“ انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ چپ ہی رہی۔ کیونکہ لڑکیاں کافی لے کر آ گئی تھیں لڑکیوں نے آتے ہی ادھر ادھر دیکھا اور پھر کہا۔

”ارے! آپ کے صاحب بہادر تو چلے گئے۔“ روبی چپ ہی رہی۔ انہوں نے کافی بنا کر اماں اور روبی کو دی اور خود خاموشی سے قریب بیٹھ گئیں۔ جب ان دونوں نے کافی پی لی تھی تو وہ خالی برتن لے کر واپس چلی گئیں۔ نور وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ اماں سے باتیں کرتی رہی۔ کچھ خاص نہیں یونہی فضول سی باتیں۔ پھر اماں نما عصر کے لیے اٹھ کر گئیں تو وہ بستر پر لیٹ کر نئے سرے سے حالات کا جائزہ لینے لگی۔

بلال کے ساتھ وہ اپنے اس سلوک کو جائز سمجھتی تھی۔ اتنے طویل عرصہ بعد وہ ایک بار پھر اس خطاب کو پا کر تڑپ اٹھی تھی۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں وہ بلال کے علاوہ کس پر اپنا یہ غصہ اتارتی۔ جبکہ اس کو یہاں پر واپس لانے کا ذمہ دار بھی بلال ہی تھا۔ ویسے بھی کیا معلوم! ابھی اس کے گھر والوں نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرنا تھا۔ جن لوگوں نے پہلی رات کی لہن کا خیل نہیں کیا وہ بعد میں اس کے ساتھ کوئی سا بھی سلوک بلکہ برا سے برا سلوک کر سکتے تھے۔ بلال نے اب کیا گاڑ لیا ہے ان کا جو آنے والے حالات سے بلال سے کوئی امید رکھی جاتی۔ اس کو بلال پر ترس آتا تھا۔ مگر وہ اپنا یہ رویہ پھر بھی بلال کے ساتھ مناسب ہی سمجھتی تھی۔ وہ ان کا خاندان تھا۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ لوگ ان کے ساتھ کہیں دھوکا نہ کر رہے ہوں۔



شام ہو رہی تھی۔ جب بلال دبا رہا تو اپنے روم میں آئے۔ ایک نظر بستر پر لیٹی روٹی پر ڈالی۔ ان کی سہاگ رات برباد کر کے ان کے سکون کو بھی اپنی باتوں اور سخت رویے سے تباہ کر کے وہ خود اس وقت پر سکون لیٹی ہوئی تھی۔ ان کو معلوم تھا وہ غما ہے۔ ان سے بات نہیں کرے گی۔ مگر وہ خود غما نہیں تھا اس لیے سیدھا اس کی جانب آئے پھر محبت سے پوچھا۔ ”تو کیسی ہو؟“

نور نے جواب دینے کی بجائے آنکھیں بند کر لیں۔ تو وہ ڈانٹا۔ روم میں آئے۔ پہلے اپنے لیے وارڈ روب سے اپنا سوٹ نکالا پھر غسل کے لیے واش روم چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ریڈی ہو کر ڈریسنگ روم سے باہر آئے تو نور بدستور ابھی تک اسی انداز میں لیٹی تھی۔ جبکہ ایک گھنٹہ بعد ہی دعوت ولیمہ میں شرکت کے لیے مہمانوں کی آمد شروع ہو جانا تھی۔ وہ خود بھی قوامی کے کہنے پر تیاہ ہونے آئے تھے۔

اب وہ کھڑے سوچ رہے تھے۔ روٹی کو خود ہی تیاہ ہونے کا کہہ دیں۔ نیچے سے تو شاید کوئی بھی اس کو لہن سمجھ کر تیار کرنے نہ آئے کہ رات جو کچھ گھر والوں نے نور کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد ان سب سے کسی اچھے رویے کی توقع رکھنا عبث تھا۔ لیکن کیا روٹی ان کی بات مان لے گئی یا انکار کر دے گی۔ اس بات کا بھی خوف تھا۔ بہر حال وہ ابھی اسی سوچ میں گم کھڑے نور کو دیکھ رہے تھے کہ اپنی روم میں داخل ہوئیں۔ ایک نظر تیار کھڑے بیٹے کو دیکھا۔ اور دوسری نظر سے روٹی کو جو سب سے بے پروا آرام سے لیٹی تھی۔ ان کو دیکھ کر بھی اٹھنے کی یا سلام کرنے کی زحمت کا رانہ کی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کو غصہ آ گیا مگر اس کو کچھ بھی کہنے سے پہلے بلال کو روم سے نکالنا ضروری تھا۔

”بلال! چلو تم فوراً نیچے جاؤ۔“ انہوں نے حکمانہ انداز سے کہا تو بلال سمجھ گئے وہ ضرور نور سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے وہ بولے۔ ”امی! نور ذرا تیار ہو جائے تو ہم دونوں اکٹھے ہیں۔“

”نور! انہوں نے نفرت سے بات کاٹتے ہوئے بیٹے کو دیکھا۔ ”وہ بھی تیار ہو جائے گی۔ آ رہی ہیں لڑکیاں اس کو تیار کرنے۔ تم تو نیچے جاؤ۔“ ان کی بات ختم ہوتے ہی پروگرام کے مطابق گل چند دوسری رشتے دار لڑکیوں کے ساتھ روم میں داخل ہوئی۔ بیگم خلاق نے خلاف توقع گل کے اتنی جلدی آنے پر گھور کر اس کو دیکھا۔ اصل میں بلال سے تو انہیں کسی طرح کا کوئی ڈر خوف نہ تھا تاہم دنیا میں رہ کر دنیا داری کا خیل تو کتنا ہی پرانا ہے۔ سو رشتے داروں کو دعوت ولیمہ میں لہن کی عدم شرکت کا جواز پیش کرنے کے لیے۔ ”انہوں نے گل سے کہا تھا۔ ”میں بلال کے روم میں اوپر جا رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد تم بھی رشتے دار لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے کر اوپر آ جانا اور میں رشتے داروں کو بتانے کے لیے ان سب لڑکیوں کے سامنے تم سے کہہ دوں گی لہن کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر نے اس کو مکمل ریسٹ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ یوں بات بن جائے گی۔ ہماری عزت بھی رہ جائے گی اور لوگ روٹی کو بھی نہ دیکھ سکیں گے۔“

اپنے پروگرام کے مطابق وہ اس وقت بلال کے روم میں موجود تھیں۔ ان کو یہ امید نہیں تھی کہ گل اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کرے گی اور قبل از وقت ہی اوپر آ جائے گی جبکہ ابھی بلال بھی روم میں موجود تھا۔ دل ہی دل میں انہوں نے گل پر دانت پیستے ہوئے گل کے ساتھ آنے والی لڑکیوں سے کہا۔

”سنو لڑکیو! لہن کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کو مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس لیے اب وہ دعوت ولیمہ میں شرکت نہ کر سکی گی۔ اب تم سب واپس جاؤ۔“ ان کی بات سنتے ہی سب لڑکیاں واپس چل گئیں تو بلال نے بے ساختہ نظریں اٹھا کر سامنے لیٹی نور کو دیکھا کہ امی کی باتوں پر اس کا ریاکشن کیا ہے۔ وہ خاموش تھی۔ مگر دیکھ اٹھی کوری تھی۔ گویا بے لفظی زبان میں وہ ان سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔ ایسی ہی عزت افزائی کے لیے مجھ اتنی دور سے لے کر یہاں آئے تھے۔ دیکھ رہے ہیں نہ آپ جو کچھ آپ کی وجہ سے رات کا ہو رہا ہے۔ اب میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بلال خان میں اپنی ہر توہین ہر تکلیف کا بدلہ آپ سے لوں گی۔ آپ نے مجھ سے میری پرسکون زندگی چھینی ہے تو سکون سے اب میں آپ کو کبھی نہ رہنے دوں گی۔ یہ دیکھتے ہی بلال تڑپ کر ماں کی جانب مڑے۔

”امی! نور کی طبیعت خراب نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔“ بلال نے ضبط کی کوشش کرتے ہوئے لہجہ کو نرم رکھنے کی کوشش کی۔

”میں جانتی ہوں۔“ بیگم خلاق نے یہ کہتے ہوئے گھور کر بلال کو دیکھا۔

”یہ تو زیادتی ہے امی۔ آپ بہت غلط کر رہی ہیں۔ کبھی دعوت ولیمہ بھی لہن کے بغیر ہوئی ہے۔“ بلال نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں ہوئی بھی تو اب ہو گئی اور اس کے ذمہ دار بھی تم خود ہو، جس نے اس کو یہاں لانے سے پہلے اس کی اصلیت بتانے کی بجائے چھپانے کی کوشش کی۔ سنو کیا غلط ہے؟ کیا



صحیح؟ مجھے یہ بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کو اس وقت قبول کرنا میری مجبوری ہے۔ مگر کل تو ذرا آنے دو پھر دیکھنا اس کا انجام۔“ بیگم خلاق نے زیر خند سے کہا۔

”کل تو لازمی آئے گا می ہمارا فسوس آپ کچھ نہ کر سکیں گی کیونکہ آنے والے کل میں نور کا تعلق آپ سے نہیں صرف مجھ سے ہوگا۔ صرف آج آپ کا ہے امی! اور اس آج کو یوں ریمونہ کیجئے پلینز نور کو دعوت میں شامل ہونے کی اجازت دے دیں ورنہ ناچھا نہیں ہوگا۔“

”اگر آج ہمارا ہے تو کل بھی ہمارا ہی ہوگا۔ مجھے اچھا برا کہہ کر ڈرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر روٹی دعوت ولیمہ میں شامل نہیں ہوگی۔“ انہوں نے نفرت سے روٹی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اگر میں یہاں رکا بھی کل آپ کا ہوگا۔“ بلال نے بھی ماں کو سخت لہجے میں کہا۔

”تمہیں اب یہاں سے جانے ہی کون دے گا۔ بلال خان! جواب بلال کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ وہ غضب ناک ہو کر بولیں۔

”یہاں کھڑے کھڑے کب تک بکواس کیے جاؤ گے اس کے لیے۔ چلو نیچے تمہیں اکیلے ہی چلنا ہوگا۔ کہا ہے نایہ دعوت میں شامل نہیں ہوگی۔ میں اس کو اپنی بہو کے روپ میں خاندان میں متعارف کرانا نہیں چاہتی۔ تمہیں اگر خاندان کی عزت کا خیال نہیں رہا۔ اس کی محبت میں امدھم ہو رہے ہو مگر مجھے تو کرنا ہے۔ خان خلاق خان کی بہو وہ بھی گھر سے بھاگی ہوئی۔ ایک بدنام آوارہ لڑکی! یہ کبھی نہیں ہوگا۔“ وہ نفرت بھری نگاہ روٹی پر ڈالتے ہوئے یونہی بڑبڑاتی روم سے باہر چلی گئیں تو بلال نے پلٹ کر نور کو دیکھا۔ مگر وہ ان کو دیکھنے سے پہلے ہی اپنی آنکھیں بند کر چکی تھی۔ گویا اب ان کا سامنا کرنے کا ارادہ نہ رہتی ہو۔ مگر بند آنکھوں کے کناروں سے پانی بہہ کر باہر آ رہا تھا۔ جو بلال کو یہ بتانے کو کافی تھا کہ وہ کس اذیت سے گزر رہی ہے۔ دل کا درد آنسوؤں کی شکل میں بہہ کر باہر آ رہا تھا۔ بلال عجیب سے شش و پنج میں گرفتار کھڑے کچھ مڑتے رہے۔ پھر باہر نکلے تو ماں اپنے روم کے دروازے پر کھڑی تھی۔ بلال نے ان کو سلام کرنے کے بعد آہستہ سے کہا۔

”امی جان! نور کی طبیعت ٹھیک نہیں پلینز۔ آپ فوراً اس کے پاس چلی جائیں۔“

”اللہ خیر کرے کیا ہوا نور کو۔“ انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔

”کوئی ایک بات ہو تو آپ کو بتا بھی دوں۔ بتا نہیں کیا کیا ہوا ہے۔ آپ خود ہی جا کر دیکھ لیجئے اور پوچھ بھی لیجئے گا۔“ کہتے ہوئے بلال سیڑھی کی جانب آئے اور پھر اپنی ہی سوچوں میں غرق جب وہ نیچارے تو سب مہمانوں کے ساتھ روٹی کے گھر والے بھی آ چکے ہیں۔ وہ سب ایک ہی جگہ کٹھے بیٹھے تھے مگر روتی آج ان میں شامل نہیں تھی۔ عقل مند بھی جوان کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ بیگم خلاق باقی سب مہمانوں کو بھول کر اس وقت بھی شمشاد سے یقیناً روٹی کے حوالے سے ہی بات کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ پیشانی پر ٹل ڈالے یہ دیکھ کر بلال کے اندر ایک آگ سی جل اٹھی۔ وہ سلام دعا کیے بغیر ہی قریب سے گزر کر باہر لان میں آ گئے تھے۔

”تم نے دیکھا شمشاد وہ تمہیں سلام کیے بغیر ہی باہر لان میں چلا گیا ہے۔“ بیگم خلاق بلال کے اس خشک رویے پر دانت پیستے ہوئے بولی۔

”ہاں اللہ کی شان دیکھ رہی ہوں۔“ شمشاد اتنا کہہ کر چپ ہو گئیں۔ وہ آج اکیلی ہی آئی تھی یا پھر ساتھ ہی دونوں پوتے تھے۔ وہ روٹی کو بھی گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ کل تو گڈو کی خراب طبیعت کی وجہ سے وہ گھر رہی تھی۔ اور آج وہ خود نہیں ساتھ لائی تھیں۔ اچھی طرح جانتی تھی وہ روٹی کے لیے دل میں زہم کو شہرہ رکھتی تھی۔ یا پھر نصیر صاحب اور سلمان آئے تھے۔ روتی نے بھی ان کفون پر ساتھ آنے سے معذرت کر لی تھی۔ دعوت ولیمہ میں شامل ہر فرد نے لہن کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ بلال جواب میں خاموش ہی رہے تھے۔ بتاتے بھی تو کیا چپ چاپ ماں کی جانب دیکھتے۔

”یا تمہارے چہرے پر بارہ کا عکس کیوں ہے؟“ بلال کے بہت سارے کزنز اور بے تکلف دوستوں نے پوچھا تو بلال صرف مسکرا کر رہ گئے۔ سعودیہ سے چلتے وقت ان کو یہ کب معلوم تھا کہ وہ ان سے ڈھوکا کر رہے ہیں یا وہ نور کی اس قدر توہین کریں گے۔ وہاں کی محبت میں چلے آئے تھے اور ماں ان کی خوشی کی خاطر نور کو بطور بہو بھی تسلیم نہ کر سکی۔ ان کو بیٹے کی خوشی سے زیادہ اپنی انا اور خاندان کی عزت کا خیال آج بھی سب سے اہم تھا۔ وہ کتنے بے بس ہو گئے تھے۔ یہاں قریب میں اکیلے آنے کے لیے یہ اور بات ہے کہ اس وقت بہت سارے مہمانوں میں گھرے ہونے کے باوجود کو کمان کا جسم یہاں موجود تھا۔ مگر ذہنی طور پر وہاں پر نور کے پاس تھے۔ وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچے جا رہے تھے۔ امی کی باتوں کے بعد وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ کیا محسوس کر رہی ہوگی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ان کا ایک پل بھی اس محفل میں بیٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا جس میں ان کی محبت، ان کی زندگی کی ساری نورمان کے ساتھ نہ تھی۔



مگر مجبوری تھی۔ یہ محفل بھائی ہی ان کے لیے گئی تھی۔ لہٰذا ان کی طبیعت نا ساز تھی۔ ان کے بارے میں کیا کہتے۔ وہ تو اب یہاں کے حالات دیکھ کر دل ہی دل میں اماں کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ جن کے مشورہ دینے پر پاکستان آنے سے پہلے ہی نکاح پڑھ لیا۔ ورنہ یہاں جو حالات تھے ان میں یہ بات ناممکن تھی۔ مگر اب یہ بات تو ان کو ہر حال سکون دے رہی تھی کہ نور ان کی ہو چکی ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ بس آج کی یہ رات ذرا مشکل تھی۔ یہ گزر جاتی تو وہ پرسکون ہو جاتے۔ حالات کو اچھے طریقے سے خود کنٹرول کر لیتے مگر مسئلہ تو اس وقت تھا۔ وہ خاندان اور دوست احباب کی رنگ برنگ باتیں سن رہے تھے اور ڈسٹرب ہو رہے تھے۔ ان کو تنہا دیکھ کر سب یہی کہہ رہے تھے۔

”ساری زندگی میں یہ پہلی دعوت ولیمہ دیکھی ہے۔ جہاں دو بھائی بھین کے تنہا بیٹھا ہے۔ بھی کوئی اگر ایسی ویسی بات تھی تو آپ لوگ تھوڑا لیٹ ولیمہ کر لیتے۔“ اب بھلا بلال اس بات کی کیا وضاحت کرتے کہ لہٰذا خود نہیں آئی یا اس کو لایا ہی نہیں گیا۔ وہ خود جواب دینے کی بجائے ماں کی جانب دیکھتے۔ بلال کو تو کمال بھائی کے رویے پر بھی حیرت تھی۔ وہ جو سعودیہ میں فون پر بلال کو ماں کی نا ساز طبیعت کی اطلاع دیتے ہوئے بڑی محبت سے کہہ رہے تھے۔ بلال محض تمہاری خوشی کے لیے ہم نے نہ چاہتے بھی تمہیں روپی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اگر روپی شادی کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئی اور پھر اسی حالت میں مر گئی تو اس میں ہمارا یا ماں کا کیا دخل ہے اور اب یہ بتا چلنے کے بعد کہ وہ روپی کے ساتھ نکاح کرنے کے بعد ہی پاکستان آئے ہیں۔ انہوں نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے بلال سے بات کرنی ہی چھوڑ دی تھی۔ اس کے بعد جو رخ حالات نے اختیار کیا تھا۔ بلال نے خود بھی ان کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جیسے ہی کھانا شروع ہوا وہ جلدی سے اوپر نور کے پاس جانے کے خیال سے اٹھا اور بیگم خلاق جو شروع سے آخر تک ان کے قریب ہی رہی تھیں ان کو گھورتے ہوئے کہا۔

”کہاں چلے۔ ادھر آؤ اور کھانا کھاؤ اب کھانا بھی نہیں کھاؤ گے۔“

”کیوں نہیں کھاؤں گا۔ مگر یہاں نہیں اوپر نور کے ساتھ کھاؤں گا۔ آپ ہمارا کھانا اوپر بھیج دیجئے۔“ انہوں نے کہا۔ پھر ماں کے گھورنے کی پروا کیے بغیر اوپر چلے آئے۔ ڈور کھول کر روم میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے نور کو دیکھا۔ وہ ابھی تک بستر میں لیٹی ہوئی تھی اور ماں اس کے قریب بیٹھی اس کے کھلے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مارے صدمے کے ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ ایک ہی دن میں نور کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ وہ یکدم ہی برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر بلال کا اندر رنجانہ کیا کیا ہونے لگا۔ ان کا دل چاہا وہ نور کے قریب بیٹھ کر اس کو اپنی بانہوں میں لے کر سینے سے لگا کر بہا لیں مگر وہ ایسا نہ کر سکے کہ وہ رات کا کہہ چکی تھیں۔ ”میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔“ تاہم وہ بیڈ کے قریب آئے اور تشویش بھری نظروں سے روپی کو دیکھتے ہوئے اماں سے پوچھا۔

”امی جان نور کو کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے نہ نور کی۔“

”جانتی نہیں بیٹا!“ یہ کہتے ہوئے اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بلال کو دیکھتے ہوئے مزید کہا۔

”یہ ایسی باتیں تھیں بلال! جب تم کو اللہ کے گھر ملی تھی۔ تب بھی ایسی نہ تھی جب تمہارے ساتھ پاکستان آئی تھی۔ یہ ایک ہی دن رات میں کیا کر دیا ہے تم لوگوں نے میری نور کو؟ میں کہتی ہوں ولیمہ تو ہوتا ہی لہٰذا کے لیے ہے۔ پھر تمہاری والدہ نے یہ۔“

”امی جان! یہ سب باتیں آپ ان سے کیوں کہہ رہی ہیں۔ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے تو ہوا ہے۔ بس آپ ان سے کہئے یہ فوراً میرے دم سے چلے جائیں۔“ روپی نے ہزانی میں چیخ کر کہا۔

”نور! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ اماں نے قدرے حیران ہو کر روپی کو دیکھا۔

”میں درست کہہ رہی ہوں امی جان! ان سے کہئے یہ یہاں سے چلے جائیں میں ایک منٹ کے لیے بھی ان کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔“

”بری بات نور بیٹی! اب یہ تمہارے عجاظی خدا ہیں۔“ اماں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”اچھا مجھے نہیں معلوم تھا۔“ روپی نے مسخرانہ انداز میں کہا۔ پھر یکدم چینی۔ ”امی! یہ کچھ بھی بن جائیں مگر میرے دم میں نہیں رہ سکتے۔ ان سے کہئے یہ فوراً میری نظروں سے دور



ہو جائیں ورنہ پتا نہیں میں کیا غلط سلط کر بیٹھوں۔“ یہ سن کر ماں کو غصہ آ گیا۔ وہ روٹی کو ڈانٹتا چاہتی تھیں مگر بلال کا اشارے نے انہیں روک دیا۔ پھر روٹی سے مخاطب ہوئے۔  
 ”نور! مجھے فسوس ہے یہ سب ہوا مگر میرا تھین کر وہ اب کوئی تم نہیں۔“

”میں کوئی وضاحت نہیں چاہتی۔ میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔“ وہ بلال کی بات کاٹ کر چلائی اور بلال سمجھدار تھے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کو مزید پریشانی سے بچانے کے لیے جلدی سے روم سے باہر چلے آئے۔ ان کے جانے کے بعد نور نے ماں کو دیکھا، پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔  
 ”امی جان! آج سے آپ یہاں میرے ساتھ سویا کریں گی۔“

”کیسی غلط بات کر رہی ہے۔“ ماں نے تنہا ہو کر اس کو دیکھا پھر عشاء کی نماز کا کہا نہ بنا کر فوراً ہی اٹھ کر اپنے روم میں چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد کچھ دیر روٹی سوچتی رہی پھر دروازہ بند کرنے اٹھی۔ مگر بلال کو روم میں داخل ہوتے دیکھ کر پھر بستر پر بیٹھ گئی۔ بلال کے بغیر سیدھے ڈریسنگ روم میں گئے۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد باہر آئے۔ پھر روٹی کے قریب صرف چند سیکنڈ رک کر شب بخیر کہا اور روم سے باہر چلے آئے۔ ان کے باہر جاتے ہی روٹی نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ پھر واپس بستر میں آئی اور نکلنے پر سر رکھ کر رونے لگی کہ عورت رونے کے سوا کر ہی کیا سکتی ہے۔

کل رات سے وہ اپنی قوت برداشت سے زیادہ ضبط کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ بلال کے سامنے رو کر نہ تو اس کو پریشان کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی خود کو کمزور ثابت کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس وقت کوئی بھی اس کے پاس نہ تھا۔ یعنی کوئی موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس کربناک تنہائی میں خوب جی بھر کر رونا چاہتی تھی۔ آج اس کو اپنے خدا سے بھی شکوہ تھا اور اپنی تقدیر سے بھی اور اپنے پیدا کرنے والے والدین سے بھی اور پھائی بہنوں سے بھی۔ کیا وہ اتنی ہی بری تھی۔ بجائے اس کے وہ اس کی محسوس کرتے۔ اپنی غلطی محسوس کرتے وہ آج بھی سب اس سے شدید نفرت کرتے تھے۔ حالانکہ وہ بے گناہ تھی اور جو گناہ گار تھی وہ آج بھی عزت دار بنی پھرتی تھی۔

اب وہ اپنی اس توہین پر روتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اسے کاش! وہ سعادہ جانے کی بجائے امریکہ جانے کی تیاری کرتی اور پھر طیارے کے حادثے میں مر کر اس کی جان ہر عذاب سے چھوٹ جاتی۔ مگر نہیں اس کی قسمت میں اگر عزت کی زندگی نہیں تو عزت کی موت کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا میں یونہی ذلیل اور رسوا ہونے کے لیے آئی تھی۔ اور بلال وہ غصے سے اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ جب بھی اس کے ساتھ نیکی کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ مزید ذلیل اور رسوا ہوتی ہے۔ قصور بتانا نہیں بلال کا تھا یا اس کی اپنی قسمت کا مگر کچھ سمجھ نہ آتی۔ سوائے اس کے کہ وہ پہلی بار ملتا تو گھر چھوٹ گیا۔

دوسری بار ملتا تو ملک چھوڑنا پڑا اور اب اس کو لگتا تھا۔ دنیا چھوڑنے کا نام آ گیا تھا۔ وہ یہی سب سوچتی رہی اور روتی رہی۔ رات دھیرے دھیرے گزرتی رہی۔ بلال کہاں تھے یا کہاں سوئے تھے؟ اس بات کی اب اس کو پورا نہ تھی۔ حالانکہ اچھی طرح جانتی تھی بلال نہ صرف بے قصور ہے بلکہ اس کو چاہتا بھی اپنے آپ سے بڑھ کر ہے۔ مگر وہ کیا کرتی سب لوگوں کا خراب رویہ دیکھ دیکھ کر ایک بار پھر اس کے اندر وہی آگ روشن ہو گئی تھی جس کے روشن ہونے پر وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ ایک بار پھر وہ ان سے انتقام بھی لینا چاہتی تھی۔ خود کو بھی اذیت دینا چاہتی تھی۔ چار دن عزت کی زندگی جو وہ اللہ کے گھر گزارا آئی تھی۔ وہ ایک خواب سی لگ رہی تھی۔ اور روٹی اس خواب کو بھول جانا چاہتی تھی۔

اوپر کی منزل پر بس وہی بیڈ روم تھے یا پھر ان کے ساتھ ایک خاصا بڑا سٹور بھی تھا۔ بلال کفون پر یہ کہنے کے بعد کہ لڑکی کی والدہ بھی اس کے ساتھ آ رہی ہے ایک بیڈ روم ماں، دوسرے بلال اور اس کی لہن کے لیے صاف کرنے کے بعد سیٹ کیا گیا تھا۔ مگر یہاں تو ساری بات ہی بکڑ کر رہ گئی تھی۔ ماں تو یہ سوچ کر کمرے میں چلی آئی تھی کہ ہو سکتا ہے ان کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد روٹی بلال کو اپنے ساتھ روم میں سونے کی اجازت دے دے۔ جب وہی انسان ایک روم، ایک ہی بستر پر ہوں گے تو ناراضگی خود بخود ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مرد عورت کو منانے، بہلانے کا ہنر جانتا ہے اور بلال تو ویسے بھی روٹی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح روٹی کو بہلا پھسلا کر منالیتا۔ مگر اس کو روم میں رہنے یا بستر میں روٹی کے قریب بیٹھنا لینے کی اجازت ملتی تو تبا۔

مگر یہ ماں نہیں جانتی تھی کہ روٹی نے ایک پھر خود کو تھرکا بنالیا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے گھر سے بھاگتے وقت خود کو بنالیا تھا۔ ایک بار پھر وہہرا حیاں، ہر رشتے، ہر جذبے سے عاری ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے بلال کو یہ رات اپنے روم سے باہر کہیں بھی گزارنی تھی کہ نیچے آج بھی ایسٹ آباد سے آئے ہوئے کافی زیادہ مہمان موجود تھے۔ بہت سوچنے کے بعد بلال نے یہی بہتر جانا کہ نیچے جا کر رسوا ہونے سے اچھا ہے۔ وہ اوپر سٹور میں ہی سو جائیں۔ حالانکہ نیند تو ان کو اپنے روم میں بھی نہیں آتی تھی مگر بہر حال رات تو کہیں نہ کہیں بسر کرنی ہی تھی۔ سو



وہ شور میں چلے آئے۔ شور میں لیٹنے کو جگہ تو کافی تھی مگر بستر تھانہ ہی کمبل۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا تو بیٹی پر ایک گدا بچہ بنا پرانا پڑا تھا۔ انہوں نے اس کو پکڑ کر زمین پر بچھایا پھر لیٹ گئے۔ تکیہ بھی نہیں تھا مگر مجبوری تھی۔ سو وہ یونہی لیٹ گئے کہ بہر حال آج کی رات تو جیسے تیسے گزارنی ہی تھی۔

عجیب سی ٹھکن محسوس ہو رہی تھی۔ دو دن سے وہ ایک منٹ بھی نیند نہ لے سکے تھے۔ ایک تو گھر والوں کی باتیں اور روپی کے ساتھ اختیار کیا گیا تو بین آمیز رویہ اور اس پر نور کا یکدم بدل جانا۔ وہ گھر والوں کے غلط رویے کا بدلہ ان سے لے رہی تھی۔ وہاں سے کھل کر اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھی اور وہ محض نور کے سکون کے لیے خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے اور اب وہ روپی اور گھر والوں کے مسئلے کا حل سوچتے ہوئے بچانے کب سو ہی گئے تھے۔ اماں صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہو کر کمرے سے باہر آئیں تو نور کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ انہوں نے سوچا کیا آج بلال نماز کے لیے نہیں اٹھا۔ پہلے سوچا دروازے پر دستک دے کر خود اٹھا دے۔ پھر سوچا یہ مناسب نہیں۔ ہو سکتا ہے لیٹ سویا ہو اور اب آنکھ نہ کھلی ہو۔ یہی سوچ کر اپنے روم میں واپس چلی گئی تھیں۔

ادھر بیگم خلاق بھی نماز پڑھنے کے بعد یہی سوچ کر اوپر آئی تھیں کہ خدا خیر کرے آج بلال نماز پڑھنے کیوں نہیں گئے۔ جبکہ وہ تو کل شادی والے روز بھی نماز پڑھنے مسجد گئے تھے۔ پرسوں سے جب سے آئے ہیں پریشان بھی تو بہت ہیں۔ انہوں نے بلال کے دروازے پر دستک دی۔ ایک بار، دوبار، تین بار کہیں پھر پانچویں دستک پر روپی نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ حالانکہ وہ نماز پڑھنے کے بعد جاگ رہی تھی۔ اب دروازہ کھول کر ایک جانب ہٹنے کی بجائے دروازے کے دونوں پٹ پکڑ کر صلیب کا نشان بن کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی کو یا بے لفظی زبان میں پوچھ رہی ہو۔

”کیا کام ہے کیوں آئی ہو یہاں۔“ یہ دیکھ کر بیگم خلاق نے اس کو گھور کر دیکھا اور سخت لہجے میں کہا۔  
”بدتمیز لڑکی! تم نے سنا نہیں؟ پیچھے ہٹو۔ مجھے بلال سے بات کرنی ہے۔“ یہ دیکھ کر روپی کچھ دیر ان کو بھی گھور کر دیکھتی رہی۔ پھر دروازہ چھوڑ کر الگ ہٹ گئی تو بیگم خلاق جلدی سے اندر آئیں مگر بلال وہاں موجود نہیں تھے۔

”بلال کہاں ہے؟“ انہوں نے رعب سے پوچھا۔  
روپی نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے شانوں کو جنبش دی تھی۔ کو یا کہہ رہی ہو مجھ نہیں معلوم اور یہ بھی حقیقت۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ بلال رات کہاں سوئے ہیں۔ روپی کا یہ انداز دیکھ کر بیگم خلاق آگ بگولا ہو کر بولیں۔

”یہ گھر ہے سٹوڈیو نہیں۔ پر فارم کرنے کی بجائے مجھے سیدھی طرح یہ بتاؤ وہ کہاں ہے۔ رات سونے کے لیے تو وہ اوپر ہی آیا تھا۔ اب کہاں چلا گیا ہے۔ بولو، جواب دو۔“  
روپی نے ٹھنڈی آہ بھر کر ان کو دیکھا، پھر مسکرا کر کہا۔

”سٹوڈیو میں بہت پر فارم کیا اب گھر کا اندر کرنے کو مل چاہتا ہے۔ کیونکہ بلال کہتے ہیں وہ اب مجھے فلموں میں کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے محترمہ ساں صاحبہ! اوپر فقط وہی روم تو بنائے ہیں آپ نے۔ ایک میری والدہ محترمہ کے پاس ہے اور دوسرا میرے پاس۔ اگر کوئی تیسرا روم موجود ہے تو اس میں ان کو دیکھ لیجئے۔“  
یہ دیکھ سن کر بیگم خلاق کا خون کھول کر رہ گیا۔

”تمہاری یہ جرات۔“ وہ دانت پیس کر بولیں۔ ”تمہاری ماں شمشاد ہے۔ یہ بنی بنائی ماں کہاں سے مل گئی تمہیں۔“  
”وہاں سے جہاں سے شوہر ملا تھا۔ بس دیکھ لیجئے۔“ یہ کہتے ہوئے روپی کے ہونٹوں پر طنز یہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دل میں سوچا یہ ہمت آپ نے دی ہے اور یہ تو کچھ بھی نہیں اب آگے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ بیگم خلاق اس کو بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پہلی فکر بیٹے کی تھی۔ وہ روم سے نکل کر سیدھی سٹوڈیو کی جانب آئیں، دروازہ بند تھا۔ مگر داسا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ بیگم خلاق جلدی سے اندر داخل ہوئیں تو ایک جانب دیوار کے ساتھ فرش پر پرانا گدا بچہ بلال سو رہے تھے۔ نا کمبل نہ تکیہ۔ اس کے باوجود وہ سو رہے تھے۔ اس بات پر بیگم خلاق کو حیرت تھی۔ انہوں نے آہستہ سے پکارا، زور سے پکارا مگر بلال یونہی بے خبر، بے سدھ پڑے رہے۔ آخر ماں تھی ہڑپ کر آگے بڑھی۔ جھک کر چھو کر دیکھا تو وہ شدید بخار میں تپ رہے تھے۔

ان کے دل کو کچھ ہو گیا۔ اتنی سخت سردی اور نا کافی کپڑے۔ وہ جلدی سے باہر آئیں۔ پھر کمال اور گل کو آواز دے کر اوپر آنے کا کہتے ہوئے خود واپس بلال کے پاس آئیں اور قریب



ہیٹھ کر ان کو جھوڑنے لگیں۔ ان کے اس طرح جھنجھوڑنے پر بلال نے بمشکل آنکھیں کھولتے ہوئے ان کو دیکھا۔ پھر فوراً ہی اذیت محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اتنے میں کمال اور گل بھی آگئے۔ پہلے حیران ہو کر بلال کو دیکھا پھر ماں کو اور یتیم خانہ کے آٹکھوں میں آئے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اب کھڑے دیکھتے کیا ہو۔ اٹھا کر اس کے روم میں لے چلو میرے بیٹے کو۔“

”لیکن امی جان! یہ یہاں کیوں سویا ہے؟“ کمال کو اسے شور میں دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی۔

”مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ مجھے کیا معلوم؟ جلدی سے اٹھاؤ اور گل! تم جلدی سے نیچے جا کر اپنے ڈاکٹر فون کر کے بلاؤ۔ کمال جلدی سے اٹھاؤ تم بھی؟“ پھر وہ دونوں ماں بیٹا بلال کو اٹھا کر اس کے روم میں لائے اور نجی سبائی عروسی بیچ پر لٹا دیا۔

ادھر ڈریسنگ روم سے باہر آتی روبی نے حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ دل دھک سے رہ گیا اور اس نے سوچا یہ ان کو کیا ہوا ہے۔

کمال نے ماں کی مدد سے بلال کو بستر پر لٹانے کے بعد روبی کو دیکھا۔ دل چاہا پوچھیں یہ شور میں کیوں سویا اپنا بیڈ روم ہونے کے باوجود۔ مگر روبی ان کو اپنی جانب دیکھتے پا کر فوراً ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر جان بوجھ کر برش پکڑ کر بال سنوارنے لگی۔ یتیم خانہ کے باوجود چپ تھیں۔ بلال کی ناساز طبیعت کی وجہ سے مگر گل جب ڈاکٹر کو فون کر کے اوپر آئی اور یوں روبی کو بال بناتے دیکھا تو نفرت سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”شوہر بیمار پڑا ہے اور تمہیں ہار سنگھار کی پڑی ہے۔ کس کو دیکھانا ہے بن سنور کر۔“

”خود اپنے آپ کو۔“ روبی نے اس کو چڑانے کو کہا۔

”بلال رات شور میں کیوں سوئے؟“ گل نے غصے سے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیونکہ مجھے ان کا اپنے روم میں سونا پسند نہیں تھا۔“ روبی نے نا کواری سے کہا۔

”تم..... تم کون ہوتی ہو پسند نہ پسند کرنے والی۔ یہ گھر تم اپنے جہیز میں لے کر نہیں آئی ہو۔ یہ بلال کا گھر ہے۔ اپنی اوقات میں رہو ورنہ.....“ مارے غصے کے گل دانت پیسنے لگی۔

بس نہیں چل رہا تھا ورنہ روبی کو مار دیتی۔ روبی اب کہاں ڈرنے والی تھی اس نے فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر گل کو ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

”تم بھی اپنی اوقات میں رہو۔ تم اگر اس خاندان کی بڑی بہنوئی ہو تو میں چھوٹی بہنوئی ہوں۔ آئندہ مجھ سے بات کرو تو ذرا سوچ سمجھ کر کرنا۔ یہ گھر میں جہیز میں نہیں لائی تو کیا تم لائی ہو۔“

روبی نے غرا کر کہا۔ بات بردھتی دیکھ کر یتیم خانہ کے انٹر فیز کرتے ہوئے کہا۔

”دفع کرو گل! اس کو تم۔ کیوں خواہو اس آوارہ کے منہ لگ رہی ہو۔ بلال کی طبیعت ذرا سنبھل لینے دو پھر دیکھنا کیا حل کر کے میں اس کو اپنے گھر سے نکالتی ہوں۔“ اتنے میں

ملازمہ کے ساتھ ڈاکٹر روم میں داخل ہوا اور سب لوگ ہی چپ ہو گئے۔ مگر اندر رہی اندر سب ہی کھل رہے تھے۔ خاص کر روبی نے جس طرح گل کے ساتھ زبان چلائی تھی کمال کا

خون کھل کر رہ گیا تھا۔ مگر بلال کی وجہ سے ضبط کر گئے تھے۔

ڈاکٹر نے خوب اچھی طرح بلال کا معائنہ کرنے کے بعد اس کا انجکشن دیا پھر بتایا۔

”وہی تو یہ سخت ڈپریشن کا شکار تھے۔ اس پر غضب یہ کہ سردی بھی اپنا کام دکھا گئی ہے۔“ بات ختم کر کے انہوں نے اچھی طرح سجا سجایا یہ دو لہا لہن کا روم دیکھا۔ پھر یتیم خانہ کے

سے سر کوئی نما آواز میں پوچھا؟

”کیا یہ شادی بلال کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے؟“

”بالکل بھی نہیں لڑکی بلال اپنے ساتھ ہی سعودیہ سے لے کر آیا تھا۔ مطلب یہ کہ یہ بلال کی اومیرج ہے۔“ انہوں نے نفرت بھری نگاہوں سے لا پر وا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے

کھڑی روبی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جو ابھی تک بالوں میں برش کر رہی تھی، محض ان کو نارچہ کرنے کو۔

”اگر یہ اومیرج ہے تو پھر یہ ڈپریشن اور ایسی حالت کیوں؟ اس کی وائف کو بلائیں۔“ ڈاکٹر کی بات سن کر یتیم خانہ کے توجہ سے روبی نے اس کو اشارے سے ڈاکٹر کے پاس

آنے کا کہا۔ روبی بالوں میں برش تو یونہی کر رہی تھی۔ کان ان کی باتوں کی جانب لگا رکھے تھے۔ اس لیے کمال کے کہنے پر چپ چاپ ڈاکٹر کے قریب آئی تو انہوں نے روبی کو بلال



کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”مسز بلال! رات آپ کے میسینڈ کب سوئے تھے؟“

”جی۔“ روبی ڈاکٹر کی بات سن کر گھبرا گئی کہ ڈاکٹر سے کہے تو کیا پلٹ کر جلدی سے بلال کو دیکھا مگر وہ تو اب بھی بے ہوش پڑے تھے۔ ان کو اپنے آس پاس کی کچھ خبر نہ تھی اور روبی سوچ رہی تھی۔ ڈاکٹر کی بات کا کیا جواب دے۔

”آپ نے جواب نہیں دیا مسز بلال!“ ڈاکٹر نے پھر پوچھا تو روبی نے سوچا رات 12 بجے تو وہ اس کے روم میں ڈریس چھینج کرنے آئے تھے اور ظاہر ہے سوتے سوتے ایک دو بج گئے ہوں۔ گے اور یہی بات اس نے ڈاکٹر سے بھی کہہ دی۔

”اچھا اب آپ یہ بتائیں وہ پریشان کیوں تھے؟“ ڈاکٹر نے دوسرا سوال کر دیا۔

روبی نے نیگم خلاق کی جانب دیکھ کر سوچا ڈاکٹر کو ساری بات صاف صاف بتادے مگر نجانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکی مگر پھر بھی اتنا ضرور کہا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ پریشان بھی تھے۔ بہتر ہو گا یہ بات آپ ان کی والدہ سے پوچھیں یقیناً وہ مجھ سے زیادہ ان کی پریشانی کی وجہ جانتی ہوں گی۔“

”ہوں۔“ کہہ کر ڈاکٹر نے نیگم خلاق کو دیکھا پھر ان سے کچھ پوچھا ہی چاہتے تھے کہ بلال پر نظر پڑ گئی۔ وہ ہوش میں آ گئے تھے اور قدرے حیران ہو کر کبھی خود کو اور کبھی روم میں موجود لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ نور جوان کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی تھی اس کا یوں اپنے قریب بیٹھنا ان کو کبرا سکون دے رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے وہ سنور سے یہاں کیسے آ گئے۔ پھر ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ ساری بات سمجھ گئے۔ تین دن سے وہ جس ذہنی دباؤ کا شکار تھے اس نے اپنا اثر تو دکھانا ہی تھا۔ گھر والوں کی وہ اتنی پروا نہ کرتے۔ مگر یہاں تو وہ ہستی بھی ان سے منہ موڑ گئی تھی جس کے لیے انہوں نے بھی پوری دنیا سے ٹکری تھی۔ اگر نور ان کا ساتھ دیتی تو وہ خوشی خوشی سب کچھ برداشت کر لیتے۔ مگر یہاں تو گھر والوں سے بڑھ کر نور نے ان سے اتنا نفرت کیا تھا۔ وہ تو پھر بھی چپ چاپ یہ سب زیادتیاں سہتا چاہتے تھے۔ مگر آخر انسان تھے۔ حالات نے بیمار کر ڈالا۔

”اف! آہ! ان کے منہ سے کراہ نکل گئی۔“ ڈاکٹر جو بغور ان کو دیکھ رہے تھے۔ پوچھنے لگے۔ ”کیوں بھی صاحبزادے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔“

”کیوں کیا ہو میری حالت کو؟“ انہوں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر نے اس کے پریشان چہرے کو دیکھا اور سوچا کیا نئے شادی شدہ مرد کی حالت ایسی ہوتی ہے۔ چہرہ ایسا بچھا بچھا سا ہوتا ہے۔ انہوں نے سب کو روم سے باہر جانے کا اشارہ کیا اور جب نور بھی ان کے ساتھ اٹھ کر باہر جانے لگی تو ڈاکٹر نے اس کو روک لیا۔ وہ سب چلے گئے تو ڈاکٹر نے مدھم لہجے میں بلال سے دریافت کیا۔

”تم شدید ڈپریشن کا شکار ہو کیوں جبکہ یہ تمہاری امیر ج ہے۔ وجہ بتانا پسند کرو گے صاحبزادے مجھے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے کوئی ڈپریشن نہیں۔ میری یہ حالت صرف ٹھکن کا نتیجہ ہے اور بس۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں جیسا ببات کرنی، سنی نہ چاہتے ہوں۔ یہ محسوس کر کے ڈاکٹر نور کو ضروری ہدایات دے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد روبی بلال کو دیکھنے لگی۔ وہ جب سعودیہ سے چلے تھے تو کس قدر خوش تھے۔ ان کے چہرے پر تب قوس قزح کے ساتوں رنگ تھے۔ مگر اس وقت اس کے سامنے لیٹے یہ بلال کتنے پر شمرہ لگ رہے تھے۔ وہ ان کو دیکھ رہی تھی کہ بھی لوگ ایک بار پھر روم میں داخل ہوئے تو روبی ان کو وہیں چھوڑ کر خود ماں کے روم میں چلی آئی۔ اس کو دیکھتے ہی ماں نے بلال کا پوچھا کہ ڈاکٹر اور ان کے خاندان والوں کو آتے انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ خراب حالات کی وجہ سے اور ان سب کی وجہ سے بلال کو دیکھنے نہیں گئی تھیں۔ پتا نہیں وہ ان کا آنا پسند کریں یا نہ کریں کہ اب یہ بات بھی تو کھل چکی تھی کہ وہ روبی کی والدہ نہیں تھیں۔ جو لوگ اپنی ہی بہو کو قبول نہ کر پا رہے تھے ان سے نجانے کیسے بات کرتے۔

”وہ ابھی زندہ ہیں۔“ روبی نے سفاکی سے کہا اور ان کے ستر پر لیٹ گئی تھی۔

”نور تم اچھی طرح جانتی ہو بلال ایسا ویسا نہیں۔ پھر تم کیوں اس کے ساتھ ایسا بر سلوک کر رہی ہو۔ جاؤ بیٹا اس حالت میں اس کو تنہا مت چھوڑو۔ اپنے روم میں جاؤ۔“ انہوں نے پیلہ بھری حقلمی سے کہا۔

”امی جان! اس وقت وہاں ان کے بھی گھر والے موجود ہیں۔ اس لیے میں نہیں جاؤں گی۔“ روبی نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔



”پھر کیا ہوا جو اس کے گھر والے موجود ہیں۔ بلال کو سب سے زیادہ اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔“ یہ سن کر روبی منہ بناتی ہوئی اپنے روم میں واپس آئی تو بلال ابھی بھی آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ شاید ان کو نیند کی دوا دی گئی تھی۔ روبی کو دیکھتے ہی بیگم اخلاق نے کمال اور گل سے کہا۔

”تم دونوں اب نیچے جاؤ اور یاد رکھنا نیچے جو مہمان موجود ہیں ان کو بلال کی ناساز طبیعت کا پتا نہ چلے۔ ورنہ وہ کہیں گے پہلے لہن بیمار تھی اب دوبارہ بھی ہو گیا۔ وجہ کیا ہے۔“

”جی بہتر امی جان! ان دونوں نے سعادت مندی سے کہا اور نیچے چلے گئے۔ ان دونوں کے جاتے ہی انہوں نے روبی کو دیکھا اور کہا۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اب بہتر یہ ہوگا کہ بلال کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“

”بلال کی اس حالت کی میں نہیں آپ خود ذمہ دار ہیں اور بہتر اب یہ ہوگا کہ آپ خود بھی اس روم سے تشریف لے جائیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں اب آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

روبی نے ذرا سا بھی لحاظ کیے بغیر کہہ دیا۔

”بدتمیز لڑکی! مجھے کیا گل سمجھ کر یہ بکواس کرتی ہو۔“ بیگم اخلاق نے ایک ذوردار چائنا اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

روبی نے گھور کر ان کو دیکھا جو اب کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ بلال یکدم اٹھ بیٹھے، نجانے کیسے۔

”امی! اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے۔ اگر آپ مجھے زندہ رکھنا چاہتی ہیں تو پیلیز پھر نور کو زید کچھ نہ کہیے گا۔“ وہ ناقہ بہت بھرے لہجے میں بولے۔

”کیوں نہ کہوں، یہ چڑیل اپنے خاندان کی عزت برباد کرنے کے بعد ہمارے گھر کی خوشیوں کو بھی کھا گئی اور تم کہتے ہو اس کو کچھنا۔“

ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بلال ٹکیے پر گر گئے تھے۔ نجانے اٹھنے بھی کیسے تھے۔ روبی تو اپنی جگہ ہی کھڑی رہی تھی مگر بیگم اخلاق ماں تھی۔ تڑپ کر آگے بڑھی، چھو کر دیکھا، پکارا بھی مگر وہ پھر بے ہوش ہو چکے تھے۔ لیکن اب کہ یہ بے ہوشی عملیہ کی وجہ سے تھی۔ بیگم اخلاق غصے سے کچھ دیر روبی کو کھڑی کھڑی رہیں، پھر مہمانوں کا خیال کر کے نیچے چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی روبی بلال کے قریب آئی۔ کتنی دیر کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔ پھر وہیں ان کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔ چند منٹ بعد ماں بھی چلی آئیں۔ پہلے بلال کو دیکھا پھر روبی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نور بیٹی! حالت دیکھی ہے تم نے اس دو تین دن کو دوبارہ کی یہ سب تمہاری بے رخی کا نتیجہ ہے۔ تمہیں سب کچھ بھول کر صرف یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔“

”جی نہیں، میں بالکل بھی ذمہ دار نہیں۔ یہ اپنی حالت کے خود ذمہ دار ہیں۔ ان کا خاندان تھا۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ بات کھلنے پر وہ لوگ کیا کیا کر سکتے ہیں یا پھر ان کو بتا دیتے کہ میں روبی سے ہی شادی کر رہا ہوں۔ اب جو کچھ یہاں آ کر میرے ساتھ ہوا ہے وہ بھولنے والا تو نہیں۔“

”جگتیں اب خود بھی۔“ روبی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا تو ماں ایک بار پھر اس کو سمجھانے لگیں۔ شوہر کے حقوق بتانے لگیں۔ اب روبی کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے سختی رہی تھی۔ جواب میں ماں ہوں کیا تھا نا ہاں اور پھر ماں اپنے روم میں چلی گئی تھی کہ کمال اوپر بلال کو دیکھنے آئے تھے۔

بلال کا بخار کم ہونے کی بجائے پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ نرس کے فرائض اب کمال نے خود سنبھال لیے تھے۔ وہاں بار بار بلال کا ٹمپر پچر چیک کرتے۔ میڈیسن کھلاتے، برف کے پانی میں پیٹیاں بھگو بھگو کر ان کی پیشانی پر رکھتے۔ باقی لوگ بھی کبھی آتے۔ کبھی جاتے کہ نیچے بھی مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ دن یونہی گزر گیا اور بلال کی حالت بھی کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ وہ ہوش میں آئے تو کمال نے ان کو جوں پلانے کے بعد پھر نیند کی دوا دے دی تھی۔ سارا دن بلال کی حالت کے پیش نظر کسی کو بھی کھانے پینے کا ہوش نہ رہا تھا۔ وہ سب بلال کے پاس ہی آتے جاتے رہے تھے اور روبی تو انہو کو گھور گھور کر ان سب کو دیکھتی رہی تھی۔

تاہم رات کے کھانے کے لیے وہ لوگ جیسے ہی نیچے گئے روبی نے جلدی سے اٹھ کر ناصرف دوا زہند کر دیا بلکہ لاک بھی لگا دیا۔ سارا دن ان سب کی وجہ سے وہ بے آرام رہی تھی۔ ایک منٹ بھی آرام نہ کر سکی تھی۔ اگر ماں کے روم میں آرام کی نیت سے جاتی تو وہ بھی کمرے سے نکل دیتی کہ شوہر بستر پر بیمار پڑا ہے اور تمہیں آرام کرنے کی سوجھ رہی ہے۔ جاؤ اور اس کے پاس جا کر بیٹھو۔ اس وقت وہ ٹھکن سے چور تھی۔ اب وہ صرف سونا چاہتی تھی۔ اس لیے بلال کے قریب آئی۔ وہ نیند کی دوا زیر اثر سو رہے تھے۔ مگر چہرے سے اندر کی حالت عیاں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا۔

”اگر آپ اپنے دوبارہ کی زندگی چاہتی ہیں تو ان کی پریشانی شیفز کرنے کی کوشش کریں ورنہ ہارٹ ایٹک کا خدشہ ہے۔“ روبی بے ساختہ جھک کر ان کے دل کی دھڑکن سننے لگی۔ پھر



یکدم نجانے کیا ہوا وہ بلال کے ساتھ لیٹ کر رونے لگی۔ وہ اس شخص کو تکلیف دے رہی تھی جو اس کے مرنے کے بعد ہر برس اس کی ہری کا اہتمام کرتا تھا۔ اور وہ اس کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ وہ روتے روتے کہنے لگی۔

”بلال مجھے تنہا چھوڑ کر نہیں جانا۔ میرا آپ کے سوا کوئی بھی نہیں اور میں اب آپ کے بغیر رہ نہیں سکتی۔“ باہر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ پہلے ملازمہ اس کے لیے کھانا لے کر آئی تھی مگر وہ ناٹھی۔ پھر گھر والے بلال کو دیکھنے آئے۔ نیگم اخلاق نے آواز بھی دی مگر اس نے دروازہ نہ کھولا۔ یونہی بلال کے ساتھ لیٹ کر روتے روتے وہ بالآخر سو گئی تھی۔

رات کا نجانے کونسا پہر تھا جب بلال ہوش میں آئے۔ کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا اور کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس کے ساتھ ایک حیرت ناک بات بھی تھی۔ روپی ایک بازو ان پر رکھے ان سے لیٹ کر بے خبر سو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر بلال کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ ناقابل یقین بات ہی تو تھی۔ وہ بغیر اس کو دیکھنے لگے۔ روتے روتے سوئی تھی۔ آنسو کے نشان اب بھی چہرے پر موجود تھے کہ وہ ان سے لیٹ کر سو رہی تھی۔ فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اتنا قریب دیکھ کر ان کے اندر گہرا سکون اتر رہا تھا۔ یقیناً وہ ان کے لیے پریشان تھی۔ اس لیے ان سے لیٹ کر روتے روتے سو گئی تھی۔ یہ سوچتے ہی وہ مسکرائے، پھر ایک ہاتھ سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے کہ چلو ان کی بیماری نے یہ ایک بڑا کام تو کیا۔

معاروپی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چہرہ اٹھا کر بلال کو دیکھا۔ پھر ان کا ہاتھ پیچھے کرتی ہوئی ذرا پارے ہوتے ہوئے کروٹ بدل کر اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیا۔ یہ دیکھ کر بلال کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور سکون بھی جاتا رہا۔ وہ کروٹ بدل کر پھر سو گئی تھی۔ مگر وہ باقی کی رات پھر نا سو سکے تھے۔ باقی کی رات وہ اپنی موجودہ زندگی کے بارے میں سوچتے رہے تھے اور روپی بڑے آرام سے سوئی رہی تھی۔

ایک ہفتہ بعد ان کی طبیعت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ صرف جسمانی طور پر ورنہ ذہنی طور پر تو وہ اب بھی بیمار ہی تھے۔ دماغ تفکرات سے بھرا پڑا تھا۔ تاہم جسمانی طور پر صحت مند ہوتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ ملازمہ سے کہہ کر سٹور کا ایک حصہ اپنے رہنے کے لیے صاف کر دیا تھا کہ روپی نے اس ایک ہفتے میں جو انہوں نے بیماری کی حالت میں اس کے روم میں بسر کیا تھا ایک بار بھی ان کو مخاطب کرنے کی زحمت نہ کی تھی۔ طبیعت کا پوچھنا تو دور کی بات تھی کہ وہ ان کے ساتھ ہی بستر میں سوئی تھی مگر بالکل بیڈکی بیٹی سے لگ کر۔ ادھر ماں نے جب یہ دیکھا۔ یعنی بلال کی بیچا رنگی اور نور کی ضد تو انہوں نے اپنا کمر بلال کو دے دیا۔ بلال مان تو نہیں رہے تھے مگر ماں نے دھمکی دی۔ اگر ان کی بات نہ مانی گئی تو وہ یہ گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ یوں مجبوراً بلال کو ماں کی بات ماننی پڑی تھی۔ اس کے بعد وہ ماں کے روم میں شفٹ ہو گئے تھے اور ماں خوشی خوشی سٹور میں رہنے لگی تھی۔

اس نئی زندگی کے پہلے روز وہ بھی صبح کو تیار ہو رہے تھے کہ ملازمہ ان کو ناشتے کے لیے بلانے آیا کہ بڑی نیگم صاحبہ آپ کو یاد کر رہی ہیں۔

”تم چلو ہم بھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“ بلال نے کہا۔ لڑکا چلا گیا تو انہوں نے بال بنائے پھر بال بنانے کے بعد وہ باہر آئے تو ماں نور کے کمرے میں جا رہی تھی۔ بلال نے پہلے ان کو سلام کیا پھر کہا۔

”اماں جی! آپ نور کو لے کر اپنے ساتھ نیچنا شتے کے لیے آئیں۔ امی جان نے بلایا ہے۔“

”تم چلو بیٹا ہم بھی آتے ہیں۔“ اماں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا تو بلال چلے گئے۔ ماں نور کے روم میں آئی۔ وہ روم میں ٹبل رہی تھی۔ اماں کو دیکھتے ہی سلام کیا اور اماں نے محبت سے جواب دیتے ہوئے اس کو پر سکون زندگی کے لیے ڈھیروں دعائیں دینے کے بعد بتایا۔

”نور! جلدی سے تیار ہو جاؤ تمہاری ساس نے ناشتے پر بلایا ہے۔“ یہ سن کر نور نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ نیگم صاحبہ نے ہمیں ناشتے پر بلایا ہوگا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”جیسے ہر بات پر شک کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ دیکھو بیٹی ساس ماں کی بات کا برا نہیں مناتے۔ ساس کا حق ہوتا ہے بات کرنے کا۔“ اماں نے پید سے سمجھایا تو روپی نہ چاہتے ہوئے بھی اچھا سا سوٹ پہن کر نا صرف تیار ہو گئی۔ بلکہ ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر لیا تھا کہ آخروہ نئی نئی لہجہ تھی۔ پھر سر پر اچھی طرح دو پٹا اوڑھ کر وہ ماں کی سنگت میں نیچے چلی آئی تو ملازمہ کال گیا۔ نجانے ان دونوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت کیوں ابھرا آئی تھی۔ اماں نے اس سے ڈرائنگ روم کا پوچھا تو وہ اشارے سے بتا کر چلا گیا تھا۔ اور روپی دھڑکتے



دل کے ساتھ ماں کو ساتھ لئے ڈرائنگ روم کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ خود سے اندر جانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کوئی اس کو دیکھ کر اندر آنے کا کہے مگر وہ تو سبناشتے کی میز پر یوں چپ چاپ سوکار بیٹھے تھے گویا تازہ تازہ کسی کو فون کر کے آئے ہوں۔

بلال اخبار پڑھ رہے تھے اور مکمل بھائی اخبار کے ساتھ آیا میگزین دیکھ رہے تھے۔ گل اپنے دائیں یا دائیں دونوں بیٹوں کو بٹھائے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ نیگم اخلاق کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ پاس ہی پوتی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ ملازمہ میز پر ناشتہ جین رہی تھی۔ بلال چونکہ اوپر ناشتے پر آنے کا کہہ کر آئے تھے اس لیے اخبار پڑھتے پڑھتے ایک نظر دروازے پر بھی ڈال لیتے تھے۔ نور کے آنے کا یقین تو نہیں تھا مگر پھر بھی ہلکی سی امید تھی۔ ہو سکتا ہے ماں منا کر نیچے لے ہی آئے اور اب جو دروازے کی جانب دیکھا تو وہاں کے ساتھ کھڑی تھی۔ نور کو دیکھ کر انہوں نے اطمینان کی گہری سانس لی، پھر اخبار ٹیبل پر رکھ کر باقاعدہ ٹھٹھے ہوئے ہوئے۔

”آؤ نور! وہاں کیوں رک گئی ہو اور ماں جان! آپ بھی آئیں۔“ بلال کی بات سن کر سب نے یکے وقت چہرے اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا تو نور ماں کا ہاتھ پکڑے ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کو یوں بغیر اجازت آنا دیکھ کر پہلے تو نیگم اخلاق حیران ہوئی پھر ایک دم غصے سے کھل اٹھی۔ تب تک نور اور ماں ٹیبل کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

”آؤ نور! یہاں بیٹھو۔“ بلال نے ابھی گھر کے کسی فرد کی جانب نہ دیکھا تھا۔ جانتے تھے سب کے منہ بن گئے ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے نور اور ماں کو اپنے ساتھ والی کرسیوں پر بیٹھنا کہا تھا۔ ابھی وہ بیٹھی ہی تھیں کہ نیگم اخلاق نے بلال کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”ان دونوں کو ناشتے پر آنے کا کس نے کہا تھا؟ کس کی اجازت سے انہوں نے آنے کی جرأت کی؟“ بلال کو ماں سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

”امی جان! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“ بلال نے یہ کہتے ہوئے گھبرا کر نور کو دیکھا تو پہلے ہی بکڑی بکڑی رہتی تھی۔ اس بات کے بعد نجانے کیا ایکشن لیتی اور مزید کیا کیا ستم ان پر ڈھاتی۔

ماں تو بلال کی بات کے جواب میں چپ ہی رہی تھی کہ وہ ابھی نیا نیا بیماری سے اٹھ کر آیا تھا۔ اور وہ اس حالت میں بیٹے کو زیادہ ٹینشن نہیں دینا چاہتی تھی۔ مگر مکمل نے حد سے زیادہ رکھائی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”امی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں بلال! کسی نے کہا نہیں تو روپی کو خود ہی سوچنا چاہیے تھا اس کو یہاں ڈرائنگ روم میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ بات ختم کر کے مکمل نے ناکاری سے روپی کو دیکھا۔

ابھی انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ روپی کی امی جان نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ہیرامندی میں بسر کیا تھا۔ بے شک کھانا پکاتی تھیں مگر رہتی تو طوائفوں کے ساتھ کوٹھے پر ہی تھی نا۔ مگر ان کا نشانہ تو روپی تھی۔ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی۔

”پلیز بھائی! آگے اور کچھ مت کہئے گا ورنہ ناچنا نہیں ہوگا۔“ بلال نے سخت لہجے میں کہا۔

تو گل تک کر بولی۔

”کیوں نہ کہیں یہ عورت کیا اس قابل ہے کہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرے۔“

”بھابی جان پلیز! آپ تو اپنی زبان بند ہی رکھیں۔ ورنہ میرے منہ سے بھی کچھ غلط سلاط نکل جائے گا کہ نور میری بیوی ہے۔“ بلال نے پہلے سے بھی زیادہ سخت لہجے میں کہا۔ قبل اس کے کہ وہ آپس میں الجھ جاتے نیگم اخلاق نے بلال سے کچھ کہنے کی بجائے براہ راست روپی کو مخاطب کرتے ہوئے حکمانہ انداز میں کہا۔

”تم اوپر جاؤ۔ تم دونوں کا ناشتہ ملازمہ اوپر لے کر آتی ہے۔“

آف! اس قدر تو بین ندولی نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو بمشکل روکا اور سنی ان سنی کر کے بیٹھی رہی۔

”تم نے سنا نہیں روپی!“ نیگم اخلاق نے دوبارہ کہا تو بلال جو ضبط کی آخری حد سے گزر رہے تھے ان کو خفصا آ گیا۔

”امی! آپ سب سن لیں نور میری بیوی ہے، اب وہ بھی اس گھر کا ایک فرد ہے۔ وہ اوپر نہیں جائے گی۔ یہاں میرے ساتھ ناشتہ کرے گی۔“

”بلال تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جو میرے سامنے بکواس کرنے کی جرأت کر رہے ہو۔ وہ تمہاری بیوی ہو سکتی ہے۔ اس خاندان کی بہنیں اور تمہاری بیوی ہوتی تو تمہارا روم



الگ نہ ہوتا۔ اس کو تہاری پروا نہیں تو تم اس کے لیے کیوں باگل ہو رہے۔“

”یہ ہم میاں بیوی کا پرستل معاملہ ہے۔ کسی اور کو اس پر ڈنکس کرنے کی ضرورت نہیں۔“ بلال نے بھی لحاظ کیے بغیر کہہ دیا۔

ینگم خلاق اس کو سخت سرزنش کرنا چاہتی تھی مگر پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ وہ بھی ابھی بیماری سے اٹھا ہے۔ ابھی ذہنی طور پر پوری طرح تندرست نہ ہوا تھا۔ جبکہ روپی ان کی بات سنی ان سنی کر کے ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ پھر بلال کے کہنے پر چلو نواشتہ شروع کرو۔ روپی نے ابھی سلاؤس کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ گل پچوں کو لے کر کھڑی ہو گئی اور روپی کو گھورتے ہوئے تحقیرانہ لہجے میں کہا۔

”اچھی بات ہے۔ اگر اس عورت نے یہیں ناشتہ کرنا ہے تو پھر میں اپنے پچوں کو لے کر یہاں سے جاتی ہوں۔ اب میں ناشتہ اپنے روم میں کیا کروں گی۔“ وہ پچوں کو لے کر جانے لگی تو کمال جو خاموشی سے بلال کو گھور رہے تھے بولے۔

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا بلال۔“

”کیوں کیا برا کیا ہے میں نے آخر۔ آپ سب خود کو اتنا بلند اور بارسا کیوں سمجھتے ہیں۔ میرے ساتھ مزید اس طرح کی فضول باتیں کر کے میرا دماغ نہ لٹائیں۔“ بلال مارے غصے کے کھڑے ہو گئے کہ وہ سب حد سے بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کو کھڑے ہوتے دیکھ کر کمال بھی کھڑے ہو گئے تو روپی نے محسوس کیا اگر وہ مزید کچھ دیر یہاں بیٹھی تو شاید دونوں بھائی آپس میں الجھ پڑیں۔ وہ اٹھنے لگی تو بلال اس کی طرف پلٹ پڑے۔

”نور تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ بیٹھو اور ناشتہ کرو۔ باقی جس کا جی چاہتا ہے وہ بیٹھ جائے یا کہیں اور جا کر ناشتہ کرے مجھے پروا نہیں۔“ انہوں نے غصے سے کہا تاہم یہ سب کہنے کے باوجود وہ خود بھی محسوس کر رہے تھے کہ ان کا لہجہ کمزور سا ہے اور روپی ان کے دو کٹے سے رکنے والی کب تھی۔ جلدی سا تھی۔ پھر بدتمیزی سے کرسی کو ٹھوکر مار کر پرے کیا اور پھر سب پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈال کر بلال کی جانب دیکھے بغیر اماں کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

روپی اماں کے باہر جاتے ہی گل اپنی فتح پر مسکراتی ہوئی پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر بلال کچھ دیر کھڑے غصے سے کھولتے رہے۔ پھر خود بھی ناشتہ کیے بغیر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔ کسی نے بھی ان کو جاتے دیکھ کر روکنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ مگر بلال اوپر واپس جانے کی بجائے گھر سے باہر ہی چلے گئے تھے۔ جانتے تھے اب وہ اوپر رو رہی ہوگی یا پھر ان کو دیکھ کر اپنا غصہ ان پر نکالے گی۔ ظاہر ہے اس کی اس توہین اور بے سکونی کے ذمہ دار وہی تو تھے جو سعودیہ کی اچھی بھلی پرسکون زندگی چھوڑ کر محض ماں کی خوشی کے لیے یہاں آئے تھے۔ یہاں ماں ہی ان کی خوشیوں کی سب سے بڑی دشمن بن بیٹھی تھی۔ ان کو بیٹے کی خوشی اور سکون سے زیادہ خاندانی عزت و وقار کا خیال تھا۔

”دیکھ لیا مجھے ناشتے کے لیے ڈرائنگ روم میں لے جانے کا انجام۔ میں نے بھی کہا جو ینگم صاحبہ مجھ کو کھانا پسند نہیں کرتی وہ مجھے ناشتے کے لیے کیسے بلا سکتی ہے۔ یہ سب آپ کی وجہ سے میرے ساتھ ہوا۔ آپ کے کہنے پر میں گئی تھی۔ کسی اور کی تو اب میرے نزدیک اہمیت ہی نہیں (اشارہ بلال کی جانب تھا)۔“ روپی نے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہی اماں سے کہا؟ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتی اماں سے پہلو پر جلی آئی۔

اماں اپنے روم میں جانے کی بجائے اس کے روم میں آئی اور صوفے پر بیٹھ کر بنوراس کو دیکھنے لگیں۔ جس کا چہرہ اپنی توہین پر مارے غصے کے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ پورے روم میں تیز تیز ٹپل رہی تھی اور ٹپلتے ہوئے وہ بھی اپنی مٹھیاں کھول رہی تھی، کبھی بند کر رہی تھی۔ اماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اس کا دل کیسے بہلائے۔ اس کا غصہ ٹھنڈا کیسے کرے۔ اماں نے اپنی زندگی میں اچھے برے سبھی طرح کے لوگ دیکھے تھے مگر ایسے بدلے لگانے والے پہلی بار دیکھے تھے جن کو بیٹے کی خوشی کا بھی خیال نہیں۔ بہت سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔

”نور دفعہ کرو ان لوگوں کو۔ آؤ یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ روپی نے ان کی بات سن کر ان کو دیکھا مگر اپنی رفتار میں کمی نہ آنے دی۔ یہ دیکھ کر اماں نے پھر کہا۔

”یہاں میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ نور بیٹی! یہ بے وقوف اور کم عقل لوگ ہیں۔ صرف ظاہر کو دیکھنے والے کسی کے باطن کو یہ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے عقل کے کورے لوگوں کے سامنے آخر ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ سوائے اس دعا کے کہ اللہ ان کو بھی عقل سے سمجھ سے نواز دے۔“

”میں پوچھتی ہوں، ہم کیا نہیں کر سکتے۔“ روپی غرائی۔ یہ لوگ آخر خود کو سمجھتے ہی کیا ہیں۔ اب ان کو میں بتاؤں گی میں کیا چیز ہوں اور بلال اس کو تو معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں



ہوتا اس کا تو میں وہ حشر کروں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔

”نور! بلال تو بہت اچھا بچہ ہے۔ اس کو برا مت کہو۔ کتنی محبت کرتا ہے تم سے۔ ذرا خود ہی سوچو کیا نہیں کیا اس نے ہمارے لیے۔“ اماں نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے سمجھلایا۔

”کیا کیا ہے اس نے ہمارے لیے۔ ذرا کھل کر مجھے بھی تو بتا دیں اور محبت کرتا ہے تو میں کیا کروں۔ یہ اس کی محبت ہی تو ہے جو میں یہ دلتیں چپ چاپ اٹھا رہی ہوں۔ ورنہ بیگم اخلاق نے جب مجھے تھپڑ مارا تھا تب میں ان کا ہاتھ توڑ دیتی اور دھکے مار کر اپنے روم سے نکل دیتی۔ اس بد دماغ عورت کو تو ہوش بھکانے پر آ جاتے۔ ماں ہونے کا فائدہ اٹھا رہی ہے۔“ ملازمہ کو روم میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی تو اماں نے سکون کی گہری سانس لی۔ ملازمہ صوفے کے سامنے رکھی ٹیبل پر ناشتے کی ٹرے رکھ کر واپس چلی گئی۔ نیچے سب لوگوں کا خیال تھا کہ روٹی ناشتہ واپس کر دے گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ ملازمہ نے واپس آ کر ان کو بتایا دیا تھا کہ انہوں نے ناشتہ رکھ لیا ہے۔

ڈر تو اماں کو بھی تھا کہ کہیں وہ ناشتہ کرنے سے ہی انکار نہ کر دے۔ پھر اس کو آرام سے ناشتہ کرتے دیکھ کر حیران ہوئیں تو روٹی نے ان کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کہا۔

”امی جان بندہ غصہ ان چیزوں پر کرے یا چھوڑے جن کو تمام عمر کے لیے چھوڑا جاسکے۔ یہ خوراک تو انسانی جسم کے لیے بہت ضروری ہے بلکہ بے حد ضروری ہے۔“ بات ختم کر کے وہ زور سے منس پڑی نجانے کیا سوچ کر اور اماں کو محسوس ہوا جیسے منس نہیں روٹی تھی کہ آواز میں کمی تھی۔ شاید یہ بھی حقیقت ورنہ اتنی تو بہن کے بعد کون کھانا کھاتا ہے۔

یونہی دو ماہ گزر گئے۔ پتا نہیں دوپہل بن کر یا دو صدیوں کی طرح۔ بلال صبح ناشتہ کر کے جو گھر سے نکلتے تو تب گھر واپس آتے جب رات گہری ہو رہی ہوتی۔ روٹی سارا دن دروازہ بند کر کے اپنے روم میں چپ چاپ پڑی رہتی۔ ان دو ماہ میں بلال کی بیماری کے بعد ایک بار بھی تو بلال کے سامنے نہیں آئی تھی۔

حالانکہ بلال ان کے ساتھ نبولنے کے لیے آچھی بکس لاتے رہتے تھے۔ بلکہ ڈیک بھی لا کر دیا تھا اور ساتھ بہت ساری اچھی اچھی غزلوں کی کیسٹ بھی نور کے لیے لاتے تھے کہ وہ تیار روم میں پوریت محسوس نہ کرے۔ وہ سب چیزیں لا کر براہ راست نور کو دینے کی بجائے اماں کے حوالے کرتے ہوئے کہتے۔

”یہ نور کو دے دیجئے گا تا کہ وہ پور نہ ہو۔“ اور اماں اس کی محبت دیکھتے ہوئے سوچتی بہت ظلم کر رہی ہے نور بلال پر۔ انہیں بلال پر بے حد ترس آتا تھا اور اس سلسلے میں جب وہ نور کو سمجھانے کی کوشش کرتی تو وہ حالانہ ان سے بکڑ جاتی اور کہتی۔

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ آپ بلال کی ہمدرد بنیں اور نہ میں اس جہنم میں آتی۔ اتنی اچھی بھلی پرسکون زندگی تباہ کر کے رکھ دی ہے میری۔“ اماں اس کی بات سن کر چپ ہو جاتی اور وہ بلال کی بھجوائی ہوئی بکس اور کیسٹ اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکتے ہوئے نفرت سے کہتی۔

”میں ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی کام کرتی ہوں۔ برائی کے وقت برائی اور بھلائی کے وقت بھلائی۔ میں ان عورتوں میں سے نہیں جو ہزاروں ضلالتیں بھی کرتی ہیں پھر نماز بھی پڑھتی ہیں نجانے کیوں۔ کیونکہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے۔ اللہ تو جانتے ہیں یہ ذلیل عورت عبادت کرنے سے پہلے کیا کر رہی تھی۔ افسوس میرا بھلائی کا چھائی کا دور ختم ہو گیا۔ اب برائی ہی برائی ہوگی۔“ اماں اس کی یہ جلی کٹی چپ چاپ سختی مگر بلال کو کبھی کبھانہ بتاتی۔ وہ بے چارہ پہلے ہی کونسا خوش تھا یا پرسکون جو وہ روٹی کی باتیں بتا کر مزید ان کو تپاتی۔ وہ جب کبھی بڑی حسرت سے اپنی لائی ہوئی چیزوں کے بارے میں روٹی کی رائے پوچھتے۔

”اماں! نور کو بکس، کیسٹس پسند آتی تھیں۔“ تو جو اماں اس کا دل رکھنے کو بلکہ خوش کرنے کو راضی کہتی۔

”ہاں بیٹا وہ بہت زیادہ تعریف کرتی تھی اور مجھ سے کہتی تھی ان دونوں چیزوں کی وجہ سے میرا وقت اچھا گزرتا ہے۔“ یہ کہنے کے بعد وہ بلال کو سمجھانے بیٹھ جاتی۔

”دیکھو بلال وہ دل کی بری نہیں۔ تم ایک بار اس کو منانے کی کوشش تو کرو۔ یوں دور رہنے سے تو یہ مسئلہ حل ہونے سے رہا اور اماں کی بات سن کر وہ ان سے شکوہ کرتے ہوئے کہتے۔

”آپ بھی مجھے ہی لازم دیتی ہیں ماں جان!“

”آپ ذرا غور کریں، دو ماہ ہو گئے مجھے اس روم میں آئے ہوئے اور میرے ساتھ والا روم اس کا ہے مگر میں ان دو ماہ میں ایک بار بھی اس کی شکل نہیں دیکھ سکا۔“ تب اس کی بات سن کر اماں کا افسوس ہوتا کہ انہوں نے یہ بات بلال سے کبھی ہی کیوں تھی۔ کیونکہ ان کا اچھی طرح معلوم تھا بلال صبح کے گھر سے نکلتے رات کو گھر واپس آتے تھے۔ صرف جمعہ والے روز وہ گھر ہوتے تھے اور جمعہ کو روٹی اپنے روم کا ڈوری لاک رکھتی تھی۔ جب بلال نیچے چلے جاتے تب دروازہ کھولتی کو یا اس نے بھی نہ بلال کے سامنے آنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ مگر ان سب



احتیاطوں کے باوجود اس کا سامنا بلال سے ہو ہی گیا۔

وہ جمعہ کا روز تھا اور روپی حسب معمول اس ڈر سے دروازے کو لاک لگائے بیٹھی تھی کہ بلال کبھی اچانک اس کے درم میں نہ آ جائیں۔ جب بلال کا دوپہر کے کھانے کے لیے نیچے جانے کا نام ہوا تو تھوڑی دیر بعد ہی وہ دروازہ کھل کر باہر آئی کیونکہ اماں کی طبیعت کل سے کچھ ٹھیک نہ تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی سٹور کی جانب آئی اور بوکھلا کر دروازے کے بیچ ہی رک گئی۔ سامنے بلال اماں کے قریب بیٹھے اماں کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔ لائٹ گرے کمر کے شلوار سوٹ میں وہ بہت ہی جاذب نظر آ رہی تھی۔ روپی فوراً ہی واپس مڑنا چاہتی تھی کہ اچانک بلال کی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی اور وہ ششدر سے دیکھتے رہ گئے۔ بلکے کام والے فیروزی سوٹ میں بالوں کی پونی بنائے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بلال کو اچانک سامنے دیکھ کر آنکھوں میں ابھرنے والی حیرت ابھی تک آنکھوں میں موجود تھی۔ مسلسل روم میں بند رہنے سے رنگت پہلے ہی جو بہت کوری تھی مزید صاف، اجلی ہو گئی تھی۔ بلال نے آج دو ماٹھ حد اس کو دیکھا تھا اور کتنی دیر بے خودی کے عالم میں دیکھتے ہی رہے۔ وہ دونوں لائف پائزر تھے۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے کتنے فاصلوں پر رہتے تھے۔ وہ دروازے میں کھڑی اپنے ہی ہونٹ چبا رہی تھی۔ گویا فیصلہ نہ کر پا رہی ہو اندر آنے کا۔ اس کو یوں ہچکچاتا دیکھ کر بلال اٹھتے ہوئے بولے۔

”اچھا اماں جی! اب میں جاتا ہوں۔ آپ اپنی صحت کا خیال رکھیے گا۔“

ادھر اماں بھی نور کو دروازے میں کھڑا دیکھ چکی تھی اور بلال کا ان کو محض نور کی وجہ سے اٹھ کر جانا پسند نہ آیا۔ انہوں نے بلال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تم بیٹھو بیٹا! تم اس کے لیے غیر یا جینی نہیں ہو۔ نور نے اندر آنا ہے تو آ جائے مگر تم اس کی وجہ سے اٹھ کر مت جاؤ۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

مگر بلال جانتے تھے وہ ان کی موجودگی میں کبھی بھی اندر نہیں آئے گی۔ اس لیے رکے بغیر بولے۔

”اماں جی! کھانے پر وہ سب میرا ویٹ کر رہے ہوں گے۔“ پھر دروازے کے قریب آئی روپی جلدی سے ایک جانب ہٹ گئی۔ انہوں نے رک کر ایک گہری نظر روپی پر ڈالتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

”کیسی ہو نور! اور طبیعت کیسی ہے تمہاری۔“

روپی کو یہ امید بر گز نہ تھی کہ وہ جاتے جاتے اس کا حل بھی پوچھیں گے۔ جواب میں صرف نگاہیں اٹھا کر ان کو دیکھا پر نگاہیں جھکا لیں تو بلال نے کہا۔

”جواب دینا گوارا نہیں؟ اوکے تم اماں کے پاس بیٹھو میں جاتا ہوں۔“ اور وہ باہر نکل گئے تو روپی گم سم سی اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ بلال کو دیکھ کر باہر چل اٹھل پٹھل ہونے لگا تھا۔

وہ اس کا تھا مگر..... ان کی اماں نے کہا تھا میں روپی کے بطن سے اپنے لیے پوتا پوتی نہیں چاہتی۔ پھر وہ کیسا ان کا بچہ قریب آنے کی اجازت دے سکتی تھی۔

”نور! بلال بہت اچھا ہے۔“ اماں نے اس کو سوچتے دیکھ کر بلال کی تعریف کی تو وہ چونک پڑی۔ پھر سنبھل کر برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔

”امی جان! آپ بلال کی تعریف کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کر سکتیں۔ وہ اچھا ہے تو میں کیا کروں اور کیلیات کروں؟“

”مینی تم پہلے ہی بہت زیادہ نام ویسٹ کر چکی ہوں۔ اب اپنی فضول ضد میں مزید ضائع نہ کرو۔ تم جانتی ہو میری زندگی کا ایک بڑا حصہ چشمہ بانی کے کوٹھے پر بھی گز رہا ہے جہاں ہر

رنگ کا مرد آتا تھا۔ مجھے معلوم ہے کوئی مرد کیسا ہوتا ہے۔ بلال جیسا مرد تمہیں کبھی بھی نہ ملے گا۔ ایسے محبت کرنے والے مرد دنیا میں کم کم ہی ہوتے ہیں۔“ روپی کو معلوم تھا اماں بلال

کے علاوہ کوئی بات نہ کریں گی۔ اس لیے وہ بھی اور منہ بگاڑتی باہر چلی آئی۔ جانتی تھی اماں کی ایک ایک بات سچ ہے مگر پھر وہی فیصلہ تو اس کے بارے میں نیگم اخلاق نے کرنا تھا جو ابھی

تک وہ نہ سکا تھا۔ بلال اگر بے سکون تھے تو سکون سے وہ بھی کب تھی۔ دفعتاً اپنے روم کی جانب جاتے ہوئے وہ نیچے سے آتی نیگم اخلاق کی تیز آواز سن کر رک گئی۔

”بلال! دو ماہ سے زیادہ ہی عرصہ گزر گیا۔ مگر بات وہیں کی وہیں ہے۔ تم آخر کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔“ انہوں نے بلال کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیسا فیصلہ۔“ بلال نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر پوچھا۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو میں روپی کی بات کر رہی ہوں۔ تمہیں اب سنجیدگی سے اس کے بارے میں فیصلہ کر لینا چاہیے۔“

”میں سمجھا نہیں امی۔“ بلال نے خشک لہجے میں کہا۔

”بلال! تم سب سمجھتے ہو میں اب مزید اس کا جو داس گھر میں برداشت نہیں کر سکتی تمہیں اب اس کو چھوڑنا ہوگا۔ سب سے بگاڑ کر تم نے اس کا ساتھ دیا مگر اس کا صلہ کیا دیا اس نے



تمہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ تمہارا احسان مانتی وہ اور بھی بکڑی ہے۔ اب بہتر ہے کہ تم اس کو یہاں سے چلتا کرو۔“

”پلیز امی! مزید کچھ مت کہیے گا۔“ بلال نے غصے سے کہا۔

”کیوں نہ کہوں۔“ میں پوچھتی ہوں اس کی نفرت کے باوجود تمہیں اس سے محبت کیوں ہے۔ بیوی بیوی کہتے تمہارا منہ تھکتا ہے اور بیوی کہنے کے باوجود اس نے تمہارا لڑکا حق ادا کیا ہے۔ تمہارے حقوق ادا کرنا تو دور کی بات وہ تو تمہیں شوہر بھی نہیں سمجھتی اور ایک تم ہو کہ اس کی محبت میں مرے جاتے ہو۔ ختم کرو اب اس قصے کو۔“

”امی جان! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں یہ ہم میاں بیوی کا معاملہ ہے کسی اور کو اس پر فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہ میرے حقوق ادا کرتی ہے یا نہیں۔ مجھے شوہر تسلیم کرتی ہے یا نہیں۔“

”کیسا تمہارا معاملہ۔ تم میرے بیٹے اور بیوی۔ بیوی ہونے کا نام بھی ہوتی ہے اور میں تم سے پوچھتی ہوں یہ روپی جس کو فلم انڈسٹری کا بڑا مرد چھوڑا رہا ہے اس کو اس کا اپنا ہی شوہر نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے باوجود تم کہتے ہو میری بیوی ہے۔“

”امی جان! ایسی باتیں کر کے نہ تو میرا دماغ خراب کریں اور نہ ہی مجھے گستاخ بن جانے پر اور مجبور کیجئے گا۔ اگر آپ ذرا سا غور کرنے کی زحمت کر لیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ میرے ان حالات کی ذمہ دار آپ ہیں کوئی اور نہیں۔ بہتر ہوگا آپ اس موضوع پر مجھ سے نہ ہی بات کریں۔“ بلال نے بے بسی سے کہا جبکہ گھر کے دوسرے لوگ خاموشی سے ماں بیٹے کی اس بات چیت کو سن رہے تھے۔

”جو بھی ہے بلال! نہ وہ تمہاری بیوی بنی ہے اور نہ ہی میں اس کو اپنی بہو تسلیم کرتی ہوں۔ تم روپی سے کہو وہ یہاں سے چلی جائے۔“ بیگم خلاق کے لہجے میں ذرا بھی نرمی نہ تھی۔

”امی جان! میرے ساتھ ہی وہ اس گھر سے جاسکتی ہے۔ اکیلی نہیں۔ اور اس کا نام روپی نہیں اب شب نور ہے۔ کئی بار آپ کو بتا چکا ہوں۔“ بلال نے کويا احتجاج کیا تو بیگم خلاق نفرت سے بولیں۔

”بلال میرے سامنے اس کی حمایت میں بولنا چھوڑ دے۔ وہ جس کے وجود سے دن بھی تاریک ہو جاتے ہیں تم اس کو رات کا نور کہتے ہو۔ میں تو اس کو روپی ہی کہوں گی۔ تمہیں اچھا لگے یا برا۔“

”خدا کا خوف کریں امی جان! میں آپ کو نور کو روپی کہنے کا حق نہیں دے سکتا اور باقی رہی اس کو چھوڑنے کی بات تو خدا کے گھر میں وہ مجھے ملتی تھی اور مسجد نبوی میں ہمارا نکاح ہوا تھا۔ وہ میری زندگی بھر کی ساتھی ہے۔ میں اس کو چھوڑنا تو دور کی بات اس کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہی فیصلہ میرا آج ہے اور یہی ہمیشہ رہے گا۔ اتنا کہہ کہ وہ خاموش ہو کر کھانے کی جانب متوجہ ہو گئے کہ یہ تو ہر جمعہ کا معمول تھا۔ روپی نے ہی یہ آج پہلی بار سنا تھا جبکہ بلال کو وہ اب عادت ہو چکی تھی۔ ہر جمعہ ماں کی ان بے معنی باتیں سننے کی اور برداشت کرنے کی۔ اگر ان کا نور ساتھ دیتی تو پھر شاید حالات ایسے نہ ہوتے مگر یہاں تو نور ہی بدل گئی تھی۔ پھر کسی اور سے کیا شکوہ کرتے۔“

ادھر روپی ان دونوں کی بات چیت سن کر غصے میں بھری اپنے کمرے میں آ بیٹھی۔ اور سوچنے لگی میں نے بھلا ان لوگوں کو کیا تکلیف دی ہے جو میرے خلاف بول رہی تھیں۔ سارا دن چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔ اس کے باوجود یہ لوگ مجھے برا کہتے ہیں تو اچھی بات ہے۔ اب میں ان کو بری بن کر دکھاؤں گی۔ ہونہہ پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ اپنے آپ کو۔ وہ انہی سوچوں میں بیٹھی کھول رہی تھی کہ ملازمہ کھانا لے کر آ گئی مگر مارے غصے کے روپی نے وہ کھانا واپس کر دیا اور دروازہ بند کر کے لیٹ گئی اور سوچا ساس۔۔۔۔۔۔

ساس ہی ہوتی ہے جو اچھائی کے جواب میں بھی برائی ہی کرتی ہے۔ جب انہوں نے مجھے کھانے والے کمرے سے نکال دیا تو اس کے بعد بلال نے بھی ڈرائنگ روم میں ناشتہ کرنا اور کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی اوپر اپنے روم میں ناشتہ کھانا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا اور میں نے اماں سے کہا آپ بلال کو سمجھائیں وہ ناشتہ کھانا نیچے اپنے گھر والوں کے ساتھ کیا کریں اور بلال مان تو نہیں رہے تھے۔ تب اماں نے کہا تھا میری نہیں نور کی خواہش ہے اس کے بعد وہ ناشتہ کھانا کھانا کے لیے نیچے ڈرائنگ روم میں جانے لگے تھے۔ اس نے سوچا ماں کا دل دکھتا ہوگا گھر میں موجود ہونے کے باوجود جب بلال ان کے پاس بیٹھ کر کھانے پینے کی بجائے اپنے روم میں کھاتے ہوں گے مگر اب وہ سوچ رہی تھی یہ عورت نرمی کے لائق ہے ہی نہیں۔ ملازمہ سپہر کی چائے لے کر آئی تو روپی نے وہ بھی واپس سمجھا دی۔ پھر وہ رات کا کھانا لے کر آئی تو روپی نے وہ بھی واپس کر دیا کہ ابھی تک اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ ملازمہ کھانا لے کر واپس گئی تو بیگم خلاق کا اطلاع دی۔



”بی بی نے کھانا واپس کر دیا ہے۔“

”کیا مطلب۔“ کھانا کھاتے بلال کے ہاتھ رک گئے۔ ”اور انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور سہ پہر کی چائے بھی واپس کر دی تھی۔“ ملازمہ نے وضاحت سے بتایا تو بیگم خلاق کو اس پر غصہ آ گیا اور انہوں نے ملازمہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔“ پھر بیٹے کو دیکھنے لگیں تو بلال نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہو سکتا ہے ان کی طبیعت نا ساز ہو۔ جاؤ چائے کا پوچھ کر آؤ۔“ بلال نے ملازمہ کو روکتے ہوئے کہا۔ ملازمہ ان کی بات سن کر اوپر گئی۔ پھر واپس آ کر بتایا۔

”وہ کہتی ہیں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔“ بلال نے ملازمہ سے کہا۔ پھر بمشکل اپنا کھانا زبر مار کیا اور چائے پیئے بغیر ہی جلدی ساٹھ کر اوپر ماں کے پاس آئے اور بڑی بے چینی سے پوچھا۔

”اماں جان! نور کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اس نے ابھی کھانا واپس کر دیا تھا۔“

”وجہ بالکل ٹھیک ہے۔ یونہی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔“ ماں نے کہا۔

”اماں جان! نور نے دوپہر میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا وہ ابھی سہ پہر کی چائے پی تھی۔“ بلال نے مزید وضاحت کی۔

”موڈ نہیں ہوگا بیٹا! اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ وجہ بالکل ٹھیک ہے۔“ ماں نے بلال کو پریشانی سے بچانے کے لیے کہا اور دل میں سوچا اب شوہر کو مزید پریشان کرنے کے لیے کوئی نیا ڈرامہ کر رہی ہوگی۔

بلال یہ سن کر چپ ہو گئے مگر دل میں وجہ اب بھی نور کے نہ کھانے پر پریشان تھے۔ پھر کچھ دیر ماں کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے روم میں آئے تو دیکھا روبی کے روم کی لائٹ جل رہی تھی حالانکہ اکثر جمعہ کو رات کا کھانا کھا کر لائٹ آف کر کے جلدی سو جاتی تھی۔ مگر آج ابھی تک ان کے روم کی لائٹ جل رہی تھی۔ بلال بے چینی سے اپنے روم میں جانے کی بجائے باہر ہی ٹھہرنے لگے اور آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نور کے روم کا دروازہ ٹوک کر ڈالا۔ اندر روبی کبھی ماں نے دروازہ ٹوک کیا ہے۔ دستک دیا رہوئی تو روبی نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پھر باہر کھڑے بلال کو دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے اس کو دیکھنے لگی کو یا دروازہ ٹوک کرنے کا مطلب پوچھنا چاہتی ہو۔ اور بلال نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا بلکہ پوچھا۔

”کھانا کیوں دوپہر اور رات کا واپس کر دیا اور سہ پہر کی چائے بھی نہیں پی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔“ ان کی نظروں اور لہجے میں اس کے لیے تشویش کے ساتھ ساتھ بے حد محبت بھی تھی۔

”آپ سے مطلب؟ اگر طبیعت بھی خراب ہے۔“ روبی کا موڈ یکدم ہی آف ہو گیا تھا۔ فضول باتیں نہیں کرو۔ نور! طبیعت خراب ہے تو ڈاکٹر کو بلاؤں۔“ وہ زہری سے پوچھ رہے تھے۔

”مجھ سے مزید ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ وہی بہت ہے جواب تک میرے ساتھ کر چکے ہیں۔“ اتنا کہتے ہی روبی نے زور سے دروازہ بند کر کے لاک لگایا پھر لائٹ آف کر کے بستر پر لیٹ کر کل کے لیے پروگرام بنانے لگی جبکہ بلال کچھ دیر باہر کھڑے سوچتے رہے۔ پھر لائٹ آف ہوئی تو وہ بھی اپنے روم میں چلے آئے مگر نور کو دیکھ کر ایک بات انہوں نے ضرور محسوس کی تھی کہ دوپہر میں ان کی بات کا جواب نہ دینے کے باوجود اس کے چہرے پر نرمی تھی۔ مگر اس وقت اس کا موڈ تباہ کن حد تک خراب تھا۔ وجہ کیا بتانی تھی موڈ کی اس خرابی کی وہ سوچ رہے تھے مگر کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی مگر ظاہر ہے کچھ نہ کچھ ہوا تھا جو اس کا چھا بھلا موڈ آف ہو گیا تھا۔

اگلے روز سے روبی نے اپنا یہ معمول بنایا تھا وہ بھی پکا پکاسیہر ڈھلتے ہی وہ شور لے کر لباس تبدیل کرتی۔ خواب اچھا سا میک اپ کرنے کے بعد ملازمہ سے کچرے منگوا کر بالوں میں لگاتی اور اپنے کمرے سے نکل کر خواتین کا دھرا دھر گھومنے لگی۔ بھی چھت کی رینگ پر رکھڑی ہوتی تو بھی بالکونی میں کھڑی ہو کر نیچے لان میں جھانکتی اور کبھی کبھار اوپر والی چھت پر بھی چلی جاتی۔ صرف یہی نہیں ڈیک جو بلال لائے تھے اب روبی نے اس کو بھی استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا بلکہ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سارا دن خوب اس کو فل آواز پر چلاتی۔

ماں نے یہ دیکھ کر کہا ”بیٹا ذرا آواز ہی کم کر لیا کرو۔“ تو روبی نے ہنس کر کہا۔

”آواز اگر ہلکی رکھتی ہے تو پھر کیسٹ چلانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھے سوئنگ غزل اونچی آواز میں یعنی فل والیم میں سننا اچھا لگتا ہے بلکہ مزہ آتا ہے۔ آپ اپنے روم کا دروازہ



بند کر لیا کریں۔ اماں نے اس کے بعد کچھ نہ کہا تھا تاہم ان کو خوشی تھی کہ وہ جلنے لڑھکنے کی بجائے زندگی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

نیچے پورشن میں بیگم خلاق کا بس نہ چلتا تھا کہ پاؤں سے چپل اتار کر اوپر جاتیں۔ روپی کے سر پر مارتے ہوئے نیچے لائیں اور بالوں سے پکڑ کر گھر سے نکال دیں مگر بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ جاتی کہ بیٹا اس کی محبت میں پور پور ڈوبا ہوا تھا اور وہ بیٹے کی وجہ سے ضبط کرنے پر مجبور تھیں۔ تاہم اس شدید شور سے تنگ آ کر انہوں نے ملازمہ کو بلایا اور کہا۔

”اوپر جاؤ اور اس کم بخت سے کہو یہ ہمارا گھر ہے فلم سٹوڈیو نہیں۔ آواز کم رکھنا پنے سننے والی۔ ہمیں کچھ سننے کا شوق نہیں۔ ملازمہ نے جب اوپر جا کر یہ میسج روپی کو دیا تو وہ زبردستی سے منس کر بولی۔

”ان سے کہو میرے لیے گھر اور سٹوڈیو میں کوئی خاص فرق نہیں اور ہاں سنو اور ان سے یہ بھی کہنا میرے معاملات میں دخل نہ دیں کیونکہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتی۔ ملازمہ نے واپس جا کر جب یہ میسج بیگم خلاق کو دیا تو وہ مارے غصے کے دانت پیٹتے ہوئے بولیں۔ ”آ نے دو آج ذرا بلال کو۔ ارے بتائیں کیا جاؤ کر دیا ہے ڈائن نے میرے بیٹے پر جو اس کی نفرت کے باوجود اس پر مرا جانا ہے اور بلال کے ساتھ جمعہ سے پہلے بات نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ صبح جو ناشتہ کر کے گھر سے نکلتے تو رات گئے واپس آتے تھے۔ کھانا بھی گھر آ کر کھاتے۔ کبھی باہر ہی سے کھا کر آتے حالانکہ جاب وغیرہ تو وہ کوئی کرتے نہ تھے۔ بتائیں سارا دن کہاں رہتے تھے۔ بیگم خلاق کو غصے کے ساتھ ساتھ بیٹے پر ترس بھی آتا تھا کہ جب وہ اس کی پر وائیں کرتی تو وہ کیوں اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے مگر غصہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں یہ ان کی اپنی بلال کو دی گئی۔ اس نیک تربیت کا اثر ہے وہ شروع سے ہی نیک فطرت انسان تھا۔ خود دکھ بہہ کر دوسروں کو سکھ دینے والا خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانے والا۔ پھر اب وہ ان کی بات کیسے مان سکتا تھا۔ دوسرے دن انہوں نے ملازمہ کی بجائے گل کو اوپر بھیجا اور کہا ذرا رعب سے بات کرنا یہ سن کر گل اوپر آئی تو روپی خود سب سے اوپر والی چھت سے نیچے آ رہی تھی۔ گل نے بہت غور سے اس کا جائزہ لیا پھر بڑے رعب سے اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”ڈیک بند کرو یا آواز کم کرو یہ گھر ہے بازار نہیں۔“

”روپی نے بے حد سکون سے اس کی بات سنی پھر مسکرا کر کہا۔

”تمہاری زبان شریف زاد یوں جیسی نہیں ہے اور تم یہاں رہتی ہو پھر یہ گھر کیسے ہو سکتا ہے۔ چپکے سے نیچے چلی جاؤ ذیل اور نیچے عورت! اور نہ بھی چوٹی سے پکڑ کر دھکا دے کر نیچے گرا دوں گی۔“

”ہاتھ لگا کر دیکھو کیا حشر کرتی ہوں میں تمہارا۔ یہ میرے شوہر کا گھر ہے سمجھی۔“ گل نے اکڑ کر جواب دیا تو روپی نے چونک کر اس کو دیکھا کچھ سوچا پھر کہا۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر اپنی ساس کو جا کر میرا تیج دو۔ کہہ دو خان اخلاق خان کی وراثت میں میرے شوہر کا جو حصہ ہے وہ فوراً میرے حوالے کر دیں تا کہ ہم اپنا الگ گھر لے سکیں اور یہ کام جلدی ہونا چاہیے۔ آخر کل کو ہمارے بچے بھی ہوں گے جہاں بچوں کی ماں کی عزت نہیں وہاں میرے بچوں کی عزت کیسے ہو سکتی ہے اور کان کھول کر سن لو تو میں نے ڈیک ہی بند کرنا ہے اور نہ ہی آواز کم کرنی ہے۔ بیٹا ہو تمہارا رعب کوئی اور منہ اٹھا کر خوش فہمی میں چلا آئے اور بے عزت ہو کر واپس جائے۔ بہت ضبط کیا ہے میں نے مگر اب نہیں۔ آؤٹ۔“ وہ بات ختم کر کے کدور سے چائنی اور گل دانت پیٹتے ہوئے نیچے لوٹ آئی اور پھر خوب نمک مرچ لگا کر ساری بات ساس کو بتانے کے بعد بولی۔

”اب وہ خاندانی جائیداد میں اپنے شوہر کا حصہ ملتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس نے یہ شادی بلال سے کی ہی ہماری دولت حاصل کرنے کے لیے تھی۔“

ظاہر ہے ایسی عورتوں کی محبت رشتوں سے نہیں دولت سے ہوتی ہے۔ اب جمعہ کو بلال سے کھل کر بات ہوگی۔ آخر دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ بیگم خلاق نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔



اوپر پھر جمعہ کا مبارک دن بھی آپہنچا اور جیسے ہی بلال کھانے کے لیے نیچے گئے روپی جو اس انتظار میں تھی کہ کب وہ نیچے جاتے ہیں۔ بھاگ کر رینگت پر آن کھڑی ہوئی کیونکہ وہ سننا چاہتی تھی۔ بھلا آج بیگم خلاق کیا کیا بکتی ہیں کہ یہ ہفتہ تو قیامت بن کر ان پر گزرا تھا اور پھر روپی نے خاندانی پراپرٹی میں سے اپنا حصہ بھی مانگا تھا۔ مگر کھانا خاموشی سے شروع ہوا اور پھر خاموشی سے ہی ختم ہو گیا۔ پھر شاید بلال اٹھے تھے کیونکہ بیگم خلاق کی آواز آئی۔



”بلال مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اس لیے میرے روم میں چلو۔“ وہ جاتے رک گئے پھر مسکرا کر ماں کو دیکھا اور کہا۔۔۔۔۔  
 ”میں بھی حیران تھا آپ کی خاموشی پر۔ آج کوئی خاص بات ہو گئی ہے جو آپ سب کے سامنے نہیں کہنا چاہتیں۔“  
 ”بلال میں مذاق کے موڈ میں بالکل بھی نہیں ہوں۔“ انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔

”آئی ایم سوری امی! بلال نے جلدی سے معذرت کی، پھر کہا۔۔۔۔۔

”آپ نے جو بھی کہنا ہے یہیں پر کہہ دیجئے میں ذرا جلدی میں ہوں۔“

”سارا ہفتہ غائب رہے ہو۔ آج چھٹی والے دن کیا کام ہے تجھے۔“ انہوں نے گھورتے ہوئے پوچھا؟

”امی! میرے کام کو بھول کر آپ اپنی بات کیجئے۔“ بلال نے بیزارگی سے کہا کہ ان کو معلوم تھا ان کی بات نور سے شروع ہو کر نور پر ہی ختم ہو جائے گی۔

”تم نے روپی کی حرکتوں کو دیکھا ہے؟“ نیگم اخلاق نے بات سٹارٹ کی۔

”امی! روپی نہیں نور کہہ کر بات کریں۔ میں نے کتنی بار بتایا ہے وہ کام بدل چکی ہے۔ اب وہ شب نور ہے۔“ بلال نے ایک بار پھر کہنا یا پھر بتانا ضروری سمجھا۔

”بلال اگر تم اپنی اس ضد پر قائم رہے تو میں روپی کی بجائے اس کو آوارہ کہوں گی۔“ نیگم اخلاق نے نفرت سے کہا۔

”مجھے نیکی بدی کی سمجھ ہے۔ سمجھانا ہے تو اس آوارہ کو سمجھا دیا پھر یہاں سے چلتا کرو۔ سکون تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس ذلیل لڑکی نے ہمارا۔“

”چلتا نہیں کر سکتا۔ بہت بار بتا چکا ہوں وہ میری بیوی ہے۔ میری زندگی کی ساتھی۔ آپ یہ بتائیں اب کوئی نئی شکایت پیدا ہو گئی ہے؟“ بلال نے نرمی سے پوچھا۔

”نئی سے کیا مطلب تمہارا؟ اس کی ذات نے مجھے سکھ دیا ہی کب۔ وہ تو ہے ہی شکایت کی پوٹلی۔“ وہ نفرت سے بولیں۔

”امی! وہ آپ کو سکھ دینے ہی آئی تھی۔ میں اس کو آپ کی خدمت کے لیے ہی لایا تھا۔ بات تو آپ نے ہی بگاڑی ہے۔ اب بھی اگر آپ اس کو قبول کر لیں بطور بہنوئی تو یہی سمجھئے وہ

بہت اچھی ہے۔ آپ کی بے حد خدمت کرے گی۔“ بلال روپی کی فیور میں بول رہے تھے اور نیگم اخلاق کا بس نہ چل رہا تھا کہ اوپر جا کر روپی کا گلا دبا کر ہلاک کر دیں۔

”میں قبول کر لوں؟ کیوں؟“ وہ نفرت سے بولیں۔

”امی جان! مجھے ابھی تک یاد ہے آپ کیا کرتی تھیں۔ جو انسان دوسرے کے عجیب دیکھ کر بھی اس سے محبت کر۔ تو ایسے بندے سے اللہ بہت خوش ہوتا ہے۔“ بلال نے جتایا تو

وہ بھڑک اٹھیں۔

”مجھے یہ سب جتانے کی ضرورت نہیں۔ اس کی شکل دیکھ کر میں سب بھول جاتی ہوں۔ اب سنو! اس نے جو نیا کام شروع کیا ہے سرشام سوٹ بدل کر میک اپ کرنے کے بعد

کجرے بالوں میں لگا کر رینگ پر کھڑی ہو جاتی ہے، جیسے بازار کی عورتیں اپنے۔۔۔۔۔

”بس امی! اتنا ہی کافی ہے اور کچھ مدت کیسے گا۔ میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ اس کا جو جی چاہتا ہے وہ کرے۔ آپ سے تو اب اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اوپر ہوتی ہے اور آپ

لوگ نیچے وہ اپنے دل کو خوش کرنے کے لیے کچھ بھی کرے۔“ بلال نے غصے سے کہا۔

”تعلق اس کا ہم سے ہے۔ کیوں نہیں؟“ گل جو زیادہ تر خاموش رہتی تھی بول پڑی۔ بلال نے حیرت سے ان کو دیکھا پھر پوچھا۔

”کیا تعلق ہے آپ کا نور سے۔ ذرا مجھے بھی بتائیں۔ میں بھی تو سنوں۔“

”پہلی بات تو یہ کہ وہ ہمارے ہی گھر میں رہتی ہے۔ دوسرا یہ کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ اوپر ہماری نئی والی بہو رہتی ہے اور ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ویسے بھی سرشام ساج بن کر پھر نے

سے مطلب؟ جب شوہر کو ہی منہ نہیں لگاتا۔“ گل کے اندر روپی کی باتوں کی وجہ سے زہر بھرا ہوا تھا۔ ”ویسے بھی یہ ہمارا گھر ہے بازار۔۔۔۔۔“ مگر گل بات پوری نہ کر سکی۔

”سٹاپ بھابی! آپ سب جان بوجھ کر کوئی نہ کوئی مسئلہ نکال لیتے ہیں۔“ بلال ضبط نہ کر سکا۔

”بلال! نیگم اخلاق دھماڑی۔“ یہ شپ آپ تم نے اپنی بڑی بھابی کو کہا ہے۔ چلو فوراً گل سے معافی مانگو۔“

”امی! وہ نور کو کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ آپ نے ان کو منع نہیں کیا۔“ بلال نے ماں کو دیکھتے ہوئے شکوہ کیا۔



”نور نہیں روپی نام بدل لئے سے کردار نہیں بدل جاتے۔ گھر سے بھاگنے والی کو لوگ ہمیشہ آوارہ ہی کہتے ہیں۔“ انہوں نے ایک بار پھر بلال کا دل جلایا۔  
 ”امی! بہت زیادتی کرتی ہیں آپ میرے ساتھ۔ اپنی ان زیادتیوں کا آپ کو اس وقت بتا چلے گا جب میں نارہا۔“ بلال دھکی ہو کر بولے۔  
 ”اللہ نہ کرے تمہیں کچھ ہو وہ ڈائن ہی نہ رہے۔“ وہ منہ بھر کر روپی کو بددعا میں دیتے ہوئے بولیں۔

”امی! آپ کیوں بھول جاتی ہیں وہ ڈائن ہے یا جو بھی۔ میری زندگی وہی ہے۔ میرا سکون وہی ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ بلال نے اپنی مجبوری بتائی۔

”بلال تم پہلے بھابی سے معافی مانگو۔ پھر آج میں تمہیں روپی کی اصلیت بتاتی ہوں جو اب کھل چکی ہے۔“ انہوں نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔ ”اگر آپ کا یہی انصاف ہے۔ یہی حکم ہے تو میں کیسے ٹال سکتا ہوں، سوری بھابی۔“ انہوں نے کہا تو نیگم اخلاق بولیں۔

”تمہیں اگر روپی سے سچی محبت ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بھی تم سے محبت کرتی ہو۔ وہ محبت کرنے والی لڑکی ہرگز نہیں۔ روپی نے صرف تمہاری دولت حاصل کرنے کے لیے تم سے شادی کی۔ پرسوں اس نے گل سے کہا تھا۔ خاندانی وراثت میں میرے شوہر کا جو حصہ ہے وہ میرے حوالے کیا جائے۔“ انہوں نے یہ بتا کر بلال کو روپی کے خلاف کرنا چلا مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ بلال نے سکون سے ان کی بات سنی۔ پھر اسی سکون سے بولے۔

”امی! نور نے غلط تو نہیں کہا۔ شرعی طور پر میں اپنے والد کے چھوڑے ہوئے ترکے میں نصف کا وارث ہوں۔ اور نور میری بیوی ہے۔ میرا جو کچھ بھی ہے سب اس کا ہی تو ہے۔ اگر اس نے یہ کہا ہے تو پھر یہ کام اب کر ہی ڈالیں۔“ بلال نے کہا اور باہر جانے کی بجائے اوپر چلے گئے اور روپی ان کے اوپر آنے سے پہلے ہی بھاگ کر اپنے روم میں چلی گئی تھی۔ اس وقت اس کو بلال کی حالت دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔ یہی لائے تھے اس کو بے سکون کرنے یہاں اور اب خود بھی بھگتیں۔ کیسا ذلیل کر رہے ہیں سب مل کر۔ پھر وہ اس کی محبت کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ ہمیشہ اس کی فیور میں بولتے تھے۔

نیگم اخلاق نے سوچا تھا جائیداد والی بات سن کر وہ روپی سے متنفر ہو جائے گا۔ مگر وہ یہ کہہ کر ان کو حیران ہی نہیں پریشان بھی کر گیا تھا کہ وہ ٹھیک کہتی ہے۔ ایسی اندھی محبت کس کام کی کہ اپنی جان کی پروا بھی نہ کرے۔ رند و کمال نے ان تینوں کی بات چیت میں حصہ نہیں لیا تھا۔ مگر جائیداد کی تقسیم کا سن کر وہ بھی پریشان ہوا تھا۔ اور بلال کے جانے کے بعد انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ ”وہ بھی بلال کو حصہ دے کر اس کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔“

”یہ محض اتفاق تھا۔ اگلے روز بلال کو ایک بہت پرانے دوست مل گئے۔ خوب گرم جوش سے گلے ملنے کے بعد پرانے قصہ تازہ کرنے لگے۔ پھر دوست نے پوچھا۔

”شادی کر لی یا اب بھی اکیلے ہو۔“ یہ سن کر بلال نے دل میں سوچا شادی کر کے بھی میں اکیلا ہوں۔ مگر بظاہر مسکرا کر کہا۔

”بس یار! میں نے بھی یہ جرم کر ہی ڈالا۔“

”سچ۔“ دوست خوشی سے بولے۔ جانتے تھے امریکہ جانے سے پہلے اس کی شادی کے لیے بہت دباؤ ڈالا گیا تھا۔ مگر اس نے ایک ہی ضد پکڑ لی تھی کہ شادی امریکہ سے واپسی پر ہوگی۔

”ہاں یار! اس میں جھوٹ بولنے والی تو کوئی بات ہے ہی نہیں۔“ بلال نے کہا تو دوست یکدم ہی اٹھتے ہوئے بولے۔

”اگر یہ بات ہے تو چلو آٹھ جلدی کرو۔“

”کہاں چلیں۔“ بلال نے مسکرا کر پوچھا۔

”اتھق ہو، بھابی کو دیکھنے چلوں گا اور کہاں۔“ توازن نے کہا تو بلال سوچ میں پڑ گئے۔ پھر دھیمی آواز میں پوچھا۔

”ابھی اسی وقت ملنا کیا بہت ضروری ہے۔“

”ہاں ہاں! ابھی اسی وقت۔“

”تو پھر تم ابھی نہیں مل سکو گے۔ تمہاری بھابی کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہیں کل کی۔ تم پھر کبھی بھابی سے مل لینا۔ ابھی ہوں میں یہاں۔“ اور پھر تھوڑی دیر

ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ دوست چلے گئے تو بلال بھی گھر چلے آئے اور سوچا اگر میں نواز کو روپی سے ملانے گھر لے آتا تو روپی نے میرے دوست کو کب ملنا تھا اور مجھے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔



اگلے روز سر میں درد ہونے کی وجہ سے بلال دوپہر ہی میں واپس آ گئے تھے۔ ملازمہ سے چائے کا کبہہ کر اوپر آئے تو نور کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور نور اوندھے منہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اورڈیک فل آواز میں چل رہا تھا اور غلام علی اپنی دلکش آواز میں محسن نقوی کا کام گارہا تھا۔

یہ دل یہ پاگل دل میرا کیوں بچھ گیا آوارگی  
اس دشت میں ایک شہر تھا وہ کیا ہوا آوارگی

بلال سید صاپنے روم میں چلے گئے۔ مگر آئے تھے سکون اور آرام کرنے مگر یہاں تو ایک شور برپا تھا۔ مگر کیا کر سکتے تھے؟ کیا کبہہ سکتے تھے۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ کر وہ خود بھی محویت سے غزل سننے لگے۔ کیا خوبصورت الفاظ تھے۔

یہ درد کی تنہائیاں یہ دشت کا ویران سفر  
ہم لوگ تو اکتا تھے اپنی سنا۔۔۔۔۔ آوارگی  
اک اجنبی جھوٹے نے جب پوچھا میرے غم کا سبب۔۔۔۔۔  
ساحل کی بھگی ریت پہ میں نے لکھا آوارگی

بلال اپنی غزل پر غور کر رہی رہے تھے کہ وہ لاسٹ شعر کو بار بار پیٹ کر کے سننے لگی اور وہ لاسٹ شعر یہ تھا۔

کل رات تنہا چاند کو دیکھا تھا میں نے خواب۔۔۔۔۔  
محسن مجھے اس آئے گی شاید صدا آوارگی

بلال نے جب خوب اچھی طرح غور کیا تو چونک پڑے۔ ان کو یوں محسوس ہوا جیسا ایک بار پھر نور کوئی خطرناک فیصلہ کر چکی ہو۔ یا پھر کرنے والی ہو۔ وہ اٹھ کر جلدی سے نور کے کدوم میں آئے اور ڈیک بند کر دیا۔ نور نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ یہ سوچ کر کہ شاید ماں آئی ہیں۔ مگر ڈیک کے قریب بلال کو کھڑے دیکھ کر چونک پڑی۔ مگر بلال اس کو کچھ کہے بنا اپنے روم میں واپس آئے لیکن ابھی ٹھیک سے لیٹنے بھی نہ پائے تھے کہ ڈیک بھرنج اٹھا۔ پہلی بار ان کے دل میں آیا ابھی اس کدوم میں جا کر آج اچھی طرح اس کی پٹائی کریں کہ اپنی نگلی پچھلی ساری بدتمیزیاں بھول جائے مگر وہ اپنے اس فیصلے یا سوچ پر عمل نہ کر سکے اور ایک بار پھر سانگ کے بول بن کر وہ چونک پڑے۔ اب کی بار اس نے غزل کی بجائے ایک فلمی سانگ چلایا تھا۔ جس کے بول غزل سے زیادہ خطرناک تھے۔ وہ غور سے سننے لگے۔ گلکارہ گارہی تھی۔

تصویر محبت تھی جس میں ہم نے وہ شیشہ توڑ دیا توڑ دیا

ہنس ہنس کے جینا سیکھ لیا گھٹ گھٹ کے مرنا چھوڑ دیا چھوڑ دیا

پھر ہے جھٹکا وہی پھر ہے بازار وہی

پھر حسن شام وہی پھر میرا کام وہی

یا دل کے ٹکڑے کر ڈالے یا دل کو دل جوڑ دیا

یہاں کا نام و نشان آج دنیا میں کہاں

دل پہ جب چوٹ پڑی آئی ہوتیوں یہ ہنسی۔۔۔۔۔

یا خود ہی محبت چھوٹ گئی یا ہم نے یہاں کو چھوڑ دیا، چھوڑ دیا۔۔۔۔۔

گیت کے بول بلال کو خنجر زدہ کر گئے۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگے اگر واقعی نور نے کوئی جذباتی فیصلہ کیا ہے تو انہیں نور کو اس فیصلے سے باز رکھنے کے لیے کیا کرنا ہوگا اور تب انہوں نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا کہ اگر نور کوئی جذباتی فیصلہ کرتی ہے تو پھر وہ ہنسی کی بجائے پوری سختی سے اس کو روکیں گے۔ وہ خوب اچھی طرح سمجھ گئے تھے نور کا وہ فیصلہ کس حوالے سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ نئی پریشانی اس پر سر کا درد اور پھر ڈیک کا شور۔ ان کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ تنگ آ کر انہوں نے سر پر تکیہ رکھ لیا اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگے اور ایسے



میں ماں ان کے روم میں داخل ہوئی۔ بلال کو یوں لیٹے دیکھا تو پریشان ہو کر پوچھا؟

”بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔“ بلال نے تکیہ چرے سے ہٹا کر ان کو دیکھا اور دم لہجے میں بتایا۔۔۔۔

”اماں جان! سر میں بہت شدید درد ہے اور اس پر یہ شور۔“ انہوں نے نور کے روم کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”لاؤ بیٹا میں تمہارا سر دباتی ہوں۔ اس طرح درد میں ضرور آفاقہ ہوگا۔“ بلال نہیں نہیں کرتے رہ گئے مگر ماں ان کے سر ہانے بیٹھ کر نہ صرف ان کا سر دبانے لگی بلکہ ساتھ ساتھ سمجھانے لگی۔

”بلال بیٹا! وہ صرف تمہاری نرمی سے بکڑ رہی ہے۔ تمہاری نرمی سے قاعدہ اٹھا کر ہی وہ سخت ہو رہی ہے۔ پہلی رات ہی دوزور دار تھپڑ مار کر اپنا حق وصول کر لیتے تو آج معاملہ یہاں تک نہ آتا۔ تم نے بھی سنجیدگی سے سوچا ہے۔“

”میں کیا کروں اماں جان! جب میں نے سختی کی تب بھی وہ بکڑ گئی۔ اب نرمی برت رہا ہوں تو بھی وہ بکڑ رہی ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب میں کیا کروں، کیا کہوں اور کہا جاؤں؟“ انہوں نے اذیت بھرے لہجے میں کہا۔ تو اماں کو ان پر بے حد ترس آیا۔ انہوں نے سوچا اگر نور بیگم خلاق کو پتانے کے لیے بلال کے ساتھ یہ سفاک روپنا اختیار کرتی تو ہو سکتا ہے وہ بھی نور کو معاف کر دیتی کہ بلال بہر حال ان کا بیٹا تھا۔ وہ اس کی خوشی کا ہی سوچتی۔ اتنے میں ملازمہ بلال کے لیے چائے لے کر آگئی اور اس کے ساتھ ہی بیگم خلاق کی تیز اور کرخت آواز سنائی دی وہ بے حد جارحانہ انداز میں روپی سے مخاطب تھی۔

”تمہیں کسی آئے گئے کا تو خیال نہیں۔ مگر کم از کم پیار کا تو خیال کر لیا ہوتا، ذلیل لڑکی! اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ یا پھر یہاں سے دفعتاً ہو جاؤ۔“

میرے ساتھ فضول باتیں کرنے کی بجائے خامدانی وراثت میں سے بلال کا حصہ مجھے دے دیں۔ میں فوراً یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ روپی نے ان کو بدلتا طعنے سے گھورتے ہوئے کہا تو بیگم خلاق تپ اٹھیں اور غصے سے کانپتی ہوئی بولیں۔

”تم کون ہوتی ہو بلال کا حصہ مانگنے والی۔“

”میں بلال کی بیوی ہوں۔“ روپی نے ترکی بہ ترکی زبان چلاتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو تم بلال کی بیوی ہو۔ جیسی تو وہ ساتھ والے روم میں پڑا درد سے کرا رہا ہے اور تم یہاں میوزک انجائے کر رہی ہو۔“

”ہاں! انجائے کر رہی ہوں مگر آپ کون ہوتی ہیں میرے معاملات میں دخل دینے والی۔ میں نے آپ کو بہت برداشت کیا ہے۔ مگر اب نہیں کر سکتی۔ مزید کوئی بات یا سرزنش کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیجئے گا میں بہت بدتمیز ہوں۔ بہتر ہوگا آپ اب یہاں سے چلی جائیں۔“ روپی نے سختی سے کہا۔

”تم کون ہوتی ہو مجھے میرے ہی گھر سے نکالنے والی۔“ بیگم خلاق کو یا غصے سے پاگل ہو گئیں۔

”کیا مجھ کا ایک بار پھر کہنا ہوگا بلال کی بیوی اور میں یہ بھی بتا چکی ہوں۔ میں بہت بدتمیز ہوں۔“

”یہ بتانے کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ کاش! کہ بلال بھی واقف ہو سکتا جو تم ایسی بدنام اور آوارہ کے لیے مرے جاتا ہے۔ مجھے بیٹے کا خیال نہ ہو تو تمہیں ابھی چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کروں۔“ انہوں نے حسرت سے کہا۔

”مجھے نکالنے کا اتنا ہی شوق ہے یا مجھ سے اتنی ہی شدید نفرت ہے تو پھر دعا کریں بلال فوت ہو جائے۔ جب وہ مر جائے گا تو میں خود ہی تم ایسے منہوں لوگوں کا یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“

”اوبد کر دالڑکی! میرے ہی منہ پر میرے بیٹے کو بد دعا دیتی ہو۔ بیگم خلاق نے اس دن ایک تھپڑ مارا تھا تو آج یکدم دوزور دار چلانے روپی کے منہ پر رسید کیے جن کی آواز بلال کے روم تک گئی تو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔ سر درد سے بھٹا جا رہا تھا مگر یہ صدمہ بہت شدید تھا اور پوری قوت سنان پر حملہ آور ہوا تھا کہ وہ زندہ ہیں مگر اس کے باوجود جس کا جی چاہتا ہے نور کو بے عزت کرنے چلا آتا ہے۔“ انہوں نے پوری قوت سے چیخ کر کہا۔

”اب بس کبجے امی! بہت ہو چکی۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ اگر نور پر ظلم کرنا ہے تو پھر میرے مرنے کا انتظار کیجئے گا۔“



تب بیگم اخلاق غصے سے بھری ان کفریب آئیں اور غصے سے کہا۔

”میں نے ہی تمہیں روکا تھا کہ روٹی کو طلاق دیے بغیر تم کہیں نہیں جاسکتے۔ مگر اب میں ہی تم سے کہتی ہوں اگر تم نے اس آوارہ کو طلاق نہیں دینی تو پھر اس کو یہاں سے لے کر چلے جاؤ کہیں بھی چلے جاؤ۔ میں تمہیں صبر کروں گی۔ مگر اس آوارہ کا جواب مزید اس گھر میں برداشت نہیں کروں گی۔ اتنا کہہ کر وہ باہر نکلی تو روٹی باہر کھڑی تھی۔ بیگم اخلاق کو دیکھ کر زہر خند سے بولی۔

”جب تک ہمارا حصہ ہمیں نہیں ملے گا تب تک ہم نہیں چاہیں گے اپنے بڑے بیٹے سے بولو حساب کتاب کر کے ہمارا حصہ ہمارے حوالے کر دے۔ ورنہ خالی ہاتھ ہم جانے والے نہیں۔ اگر وہ خان اخلاق خان کا بیٹا ہے تو بلال بھی بیٹے ہیں دشمن نہیں۔

”ہاں خالی ہاتھ تم کیوں جاؤ گی۔ جبکہ تم نے بلال سے شادی کی ہی ہماری دولت کے لیے ہے۔ مگر میری زندگی میں حصہ تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔“ انہوں نے کورا جواب دیتے ہوئے کہا۔ بیگم اخلاق کا جی جلاب پاؤں سے چپل اتار لیں مگر اندر لیٹے بلال کا خیال کر کے غصے سے برہنہ ہوتے نیچے چلی گئیں تو اندر لیٹے بلال کبری سوچ میں ڈوب گئے۔ پہلے بل چاہا نور کے روم میں جا کر ماں کے اس نامناسب رویے پر ایکسکلیو ز کریں مگر پھر یہ سوچ کر کہ وہاں کو دیکھ کر بیٹھ جائے گی کہ یہ سب ان کی وجہ سے ہی تو اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ وہ ضبط کر کے لیٹے ہی رہے مگر ان کو نور کے چہرے پر لگنے والے پھپھڑوں کا بے حد افسوس تھا کیا وہ بھی تھی یا لاوارث تھی جو اب بار بار اس پر ہاتھ اٹھا رہی تھی۔

”ادھر روٹی اپنے روم میں بیٹھی سوچتی رہی۔ اب اس کو کیا کرنا ہے۔ بلال نہ اس کو چھوڑ سکتے ہیں نہ ہی گھر والوں کو اور ایک بار پھر بلال کو سکون دینے کے لیے اس کو ہی فیصلہ کرنا تھا اور اس نے کر لیا اور مطمئن ہو گئی۔ اس کی قسمت میں شاید زندگی کی آخری سانس تک تڑپنا اور بے عزت ہونا لکھا تھا مگر بلال کو تو رہائی ملنا چاہیے تھے۔ وہ تو اپنی باقی ماندہ زندگی سکون سے گزاریں۔“

اگلے روز دوپہر کے نام بلال کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو وہ تیار ہو کر اپنے روم سے باہر آئے اور نیچے جانے سے پہلے نور کے روم میں جھانکا تو چونک پڑے۔ نور ریڈ کلر کی میکسی میں لمبوس کبرا میک اپ کرنے کے بعد اب کھڑی بالوں کا سادہ جوڑا بنا رہی تھی۔ پہلا خوشگوار خیال ان کے ذہن میں یہی آیا کہ وہ شاید ان کے پاس آنے کے لیے تیار ہو رہی ہے مگر جیسا تک مزاج وہ رکھتی تھی اس میں یہ بات سوچنا بھی فضول تھا تو پھر یہ تیاری اور اس کے ساتھ ہی جو دھرا خیال ان کے ذہن میں آیا وہ انہیں بڈھل کر گیا۔ یعنی اگر وہ ان کے پاس نہیں آ رہی تو پھر لازمی وہ سٹوڈیو جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ واپس اپنے روم میں آئے اور درہچے میں کھڑے ہو کر باہر دیکھتے ہوئے سوچنے لگے۔ گویا کل وہ غزل اور سانگ میں ان کا اپنے بارے میں ہی نتیجہ دے رہی تھی۔ اب ان حالات میں ان کو کیا کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہاں کے ساتھ صلح کے لیے ہی یہ تیاری کر رہی ہو کہ ماں نے کل کہا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ آج روٹی کا اچھی طرح سمجھائیں گی۔ وہ اب بھی یہی سوچ پائے تھے کہ نور اپنے روم سے باہر آئی اور اس کا رخ دیکھ کر وہ چونک پڑے۔ وہ بڑی تیزی سے سیرھیوں کی جانب جا رہی تھی۔ وہ خود بھی تیزی سے اپنے روم سے باہر نکلے اور آواز دی۔

”نور! میری بات سنو۔“

اس کے آگے بڑھتے قدم رکے گئے۔ مگر وہ خود نہیں مڑی وہیں کھڑے کھڑے چہرہ گھما کر نا کوری سے بلال کو دیکھا اور تنک کر کہا۔

”جی فرمائیے!“ واپس مڑنا اس نے اس لیے کورا نہیں کیا تھا کہ کل جو فیصلہ اس نے کیا تھا اب ہر حال میں اس پر عمل کرنا چاہتی تھی کہ اسی میں اس کے خیال میں بلال کی بہتری تھی۔ ویسے بھی وہ جب کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو پوری قوت سے اس پر ڈٹ جاتی تھی۔ پھر کوئی اس کو روک نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے بلال کا اس کو آواز دے کر روکنا سخت نا کور گزار تھا اور اس کی آواز کے تھکے پن سے بلال اس کے ارادے اچھی طرح سمجھ گئے۔ مگر یہاں باہر بات کر کے دھروں کو متاثر نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے نرمی سے بولے۔

”ادھر آؤ نور اور میری بات سنو۔“

روٹی کو بتا چل گیا کہ وہ اس کے ارادے سمجھ گئے ہیں۔ اس لیے ان کے پاس جانے کی بجائے وہیں کھڑے کھڑے اپروائی سٹان کو دیکھا اور کہا۔

”میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ کی بات واپس آ کر سن لوں گی۔“ اور یہ سنتے ہی بلال کو غصہ آ گیا اور انہوں نے شادی کے بعد پہلی بار سخت لہجے کا استعمال کرتے ہوئے آہستہ سے کہا تا کہ نیچے سے نہ کوئی سن لے اور ان کا مذاق اڑایا جائے۔



”بلکہ اس زند کروں اور ادھر آ کر پہلے میری بات سنو۔“ ان کا یہ لہجہ دیکھ کر روبی ایک لمحے کے لیے خنجر دھونگنی گردن پر سے لمٹے نفرت سے ناک سیکڑ کر سر جھٹک کر پیچھے مڑنے کی بجائے آگے بڑھی تو بلال تیزی سے اس کے قریب آئے۔ پھر مضبوطی سے کلائی تھام کر گھسیٹنے والے انداز میں نور کو اس کے روم میں لائے۔ پھر اس کی کلائی چھو کر پہلے دروازہ بند کر کے لاک لگایا پھر ضبط کی آخری کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں کی تیاری ہے۔ کہاں جارہی ہو تم اکیلی۔ وہ بھی اس حلیے میں؟“ روبی کو جس انداز میں وہ اس کے روم میں لائے تھے وہ اس کو تپا گیا۔ ویسے بھی وہ کل کا پکا پکا فیصلہ کر چکی تھی فلم انڈسٹری کو دوبارہ جوائن کرنے کا۔ اس لیے بڑے تنکھے پن سے بلال کو دیکھا اور نڈری سے کہا۔

”آپ سے مطلب میں کہیں بھی جاؤں اور کسی بھی حلیے میں جاؤں۔ آخر میں اداکارہ روبی ہوں۔“

”مطلب ہے۔ جیسی تو پوچھ رہا ہوں۔ کہاں جارہی ہو تم؟ یہ بتائے بغیر تم نہ جاسکو گی۔“ بلال کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

”جہنم میں جارہی ہوں۔ آپ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے۔“ روبی نے بدگیزی سے کہا۔

”نور! تم اچھی طرح جانتی ہو میں کون ہوں۔ تمہارا شوہر ہوں۔“ بلال نے ضبط کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس پر کوئی سختی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

”اچھا!“ روبی نے مسخراڑانے والی نظروں سے انہیں دیکھا، پھر نفرت سے بولی۔

”میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ آپ میرے شوہر ہیں۔“

”تمہارے تسلیم نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جو ہوں سو ہوں۔ تمہیں بہر حال باہر جانے سے پہلے لازمی بتانا ہوگا کہاں جارہی ہو۔ ورنہ تم باہر نہ جاسکو گی۔“ بلال نے حتیٰ لہجے میں کہا۔

”بتانگی دوں تو آپ کیا کریں گے۔ میرا کیا گاڑ لیں گے۔“ روبی نے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ تو تمہارے بتانے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ میں کچھ کر سکتا ہوں یا نہیں بگاڑ سکتا ہوں یا نہیں ذرا بتا کر دیکھو۔“ بلال سے اب ضبط مشکل ہو رہا تھا کہ وہ حد سے بڑھتی جارہی تھی۔

”اگر میں یہ کہوں کہ میں اسٹوڈیو جارہی ہوں تو۔“ اب کی بار روبی نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی اس نڈری پر ایک لمحے کے لیے بلال چکرا کر رہ گئے۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔ وہ شروع سے ہی ایسی تھی۔ تاہم انہوں نے خود کو سنبھل کر پوچھا۔

”نور تم اسٹوڈیو کیا کرنے جارہی ہو؟“

”آپ خود بھی سوچ سمجھ سکتے ہیں۔ میں اسٹوڈیو کیوں جارہی ہوں۔ اور اگر میرے منہ سے سب سننا چاہتے ہیں تو پھر سنیئے میں اسٹوڈیو اس لیے جارہی ہوں کہ میں اداکارہ روبی ہوں اور میں نے ایک بار پھر فلم انڈسٹری کو جوائن کرنے اور پر قارم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے جارہی ہوں۔ اور کچھ؟“ روبی نے اپنی بات ختم کر کے کنا کھاری سے ان کو دیکھا۔

مارے غصے کے بلال یہ سب سننے کے بعد کھل اٹھے۔ مگر پھر ضبط کا دامن تھام کر روبی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”نور پہلے کی بات اور بھی گراں۔“ وہ رکے، پھر کہا۔ ”اب تم میری بیوی ہو۔ تم اس گھر کے اندر اپنی من مانی کر سکتی ہو مگر کماندہ تمہارا جو جی چاہتا ہے کرو تم۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ مگر گھر کے باہر تم نہیں جاؤ گی۔ یہ میرا حکم ہے، سمجھیں۔ نا چاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ سخت ہو گیا۔

مگر روبی نہیں ڈری۔ بے خوفی سے ان کو دیکھا اور غرا کر کہا۔

”میں کسی کے حکم کی پابند نہیں ہوں۔ میں اسٹوڈیو ضرور جاؤں گی اور آپ مجھے نہیں روک سکتے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔

”نور! بہتر ہے تم خود ہی رک جاؤ۔ مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔“ بلال نے آخری بار اس کو سمجھانے اور خود پر ضبط کرنے کی کوشش کی مگر روبی کہاں سمجھنے والی تھی۔ اس نے یہ فیصلہ کیا ہی ان سے دور جانے کیلئے تھا۔ بلال سختی کرتے تو وہ زیادہ جرأت کے ساتھ گھر چھوڑ کے جاسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے بلال کو دیکھتے ہوئے سختی سے بولی۔

”میں نے ہمیشہ وہی کیا ہے جو میرے دل نے کہا ہے۔ کسی کے کہنے سے میں رک نہیں سکتی اور کوئی مجھے روک نہیں سکتا۔ کسی کو کیا حق ہے مجھے روکنے کا اور نہ ہی میں رکنے والی ہوں۔“

”نور! آج تمہیں رکنا ہوگا ورنہ ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا تمہیں روکنے کا کسی کو حق ہے یا نہیں۔ میں نے بہت ضبط کیا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تم میرے ضبط کا غلط فائدہ اٹھاؤ۔“



سیدھی طرح رک جاؤر نہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔“ وہ غرائے اور اچانک روپی کے اندر وہی آگ جل اٹھی جو بڑی مشکل سے بجھی تھی۔ وہ آگ جس نے اس کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ساری زندگی سکون نہیں پا سکی تھی۔ وہ آگ جس کی وجہ سے بلال سے انتقام لینے کے لیے زندہ رہی۔ لیکن جب بلال ملے تو بتا چلا وہ دشمن نہیں محبوب تھے۔ اور اس کے ساتھ دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے بلال کو معاف کر کے اس کے سکون کے لیے خود گھر کی خاک چھانے نکل گئی۔

پھر اللہ کے گھر بلال سے ملاقات ہو گئی۔ وہ پہلے بھی بلال سے بہت محبت کرتی تھی مگر اب یہ جاننے کے بعد کہ وہ اس کے لیے ساری دنیا چھوڑ کر یہاں صحرا میں اکیلے زندگی بسر کر رہے ہیں وہ پہلے سے بھی زیادہ ٹوٹ کر اس کو چاہنے لگی تھی۔ پھر وہ شادی کا پروگرام لے کر پاکستان آئے۔ تو ایک بار پھر ساری خوشیاں خاک میں مل گئی تھیں۔ اب وہ خود بھی تکلیف میں تھی اور ساتھ بلال بھی۔ یہی وجہ ہے ایک بار پھر اس نے بلال کو سکون دینے کے لیے بلال سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بلال اس کو سوچتے دیکھ کر سمجھے شاید وہ ان کی بات مان گئی ہے اس لیے اب کی بار ذرا نرمی سے کہا۔

”چلو نور! بیٹھو مجھے تم کو کچھ بتانا ہے۔“

”چپ کریں، مجھے بھی جانا ہے۔“ اس نے بلال کی بات سنتے ہی چیخ کر کہا۔ ”مجھے ہر حال میں جانا ہے۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بلال کا ہاتھ گھوم گیا۔ پھر ان کو خود بھی یاد نہ رہا کہ نور کا منہ بند رکھنے کے لیے انہوں نے اس کو کتنے تھپڑ مارے تھے اور بالآخر روپی ان تھپڑوں کی بارش کو برداشت نہ کرتے ہوئے بڑھکڑا کر بیڈ پر گر گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ناتوغصہ تھا اور نہ ہی نفرت تھی صرف حیرت تھی۔ شاید اس کو بلال سے ایسے سخت رویے کی توقع نہیں تھی۔ جبکہ بلال اب شدید غصے سے کھڑے اس کو گھور رہے تھے۔ پھر بیڈ کے قریب آئے اور دونوں گالوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی نور کو دیکھتے تنہی اور سخت لہجے میں کہا۔

”برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ حد میری آج ختم ہو گئی ہے۔ برسات اور طوفان کی اس رات میں تمہارے لیے ماحرم تھا۔ مگر آج محرم ہوں۔ آج تمہارے تمام حقوق میرے نام ہیں۔ کان کھول کر سن لو تم اسٹوڈیو نہیں جاؤ گی۔ اسٹوڈیو جانا تو دور کی بات اب تم میرے سامنے اسٹوڈیو کا نام لے کر ہی ذرا دکھاؤ۔ نور! اسٹوڈیو جانا تو دور کی بات ہے تم ذرا مجھے گھر سے قدم نکال کر دکھاؤ۔ ٹانگیں توڑ دوں گا میں تمہاری۔ میں مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں گا تمہارا۔ پر قارم کرنے سے پہلے ہی میں تمہیں اپنے ہی ہاتھوں سے ختم کر دوں گا، بعد میں مجھے چاہے بھانسی ہو جائے مگر یہ روز روز کی بے سکونی اور بک بک، ہمیشہ کے لیے ختم کر کے دکھا دوں گا۔ شوہر ہوں اب میں تمہارا۔ میری نرمی کا یہ مطلب نہیں کہ تم جو چاہو غلط سلط کر سکتی ہو۔“ بات ختم کرتے ہی وہ روم سے باہر چلے گئے اور روپی دونوں گالوں پر ہاتھ رکھے روتی چلی گئی اور پھر نجانے کیا سوچ کر روتے روتے بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

ادھر بلال کو اپنے سخت اور اس پر تشدد روئے پر بے حد افسوس تھا۔ مگر انہوں نے سوچا اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ وہ ان کی نرمی کا غلط استعمال کر رہی تھی۔ اس لیے اب اس کی اصلاح کے لیے یہ سختی بے حد ضروری تھی اور اب یہی سخت رویہ اس کے ساتھ قائم رہے گا۔ ورنہ وہ مزید بکڑ سکتی ہے۔

اگلے روز وہ گھر سے باہر نہیں گئے تھے۔ محض یہ سوچ کر کہ غصے میں بھری کہیں گھر چھوڑ کر چلی نہ جائے۔ اگر چہ ماں کو بھی انہوں نے ساری بات سچ سچ بتادی تھی اور کہا تھا وہ خود بھی اس کا دھیان رکھیں اور ماں نے بلال کی بات سن کر کہا تھا۔

”بیٹا! تم نے جو بھی کیا سچ کیا۔ ان حالات میں تمہارا یہ رویہ درست تھا۔ اگر تم اس کی اصلاح کے لیے یہ رویہ اختیار نہ کرتے تو وہ پھر اسی طہل میں تر جاتی اور یہ صرف اس کے بلکہ ہم سب کے حق میں بہت برا ہوتا اور یہ حقیقت تھی ماں کو بلال کے اس سخت رویے پر بے حد خوشی ہوئی تھی اور انہیں یہ بھی یقین تھا اب نور سدھر جائے گی۔ جب عورت نرمی کا مطلب نہ سمجھے تو پھر اس کے حق میں سختی ہی بہتر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو خیر آن پاک میں فرماتے ہیں نگران عورت کو پہلے نرمی سے سمجھاؤ، پھر بھی نہ سمجھے تو اس کے ساتھ لیٹنا چھوڑ دو اور اگر پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو پھر اس کو زرد کو ب کر دو اور ان کے خیل میں نور بھی اب اس مقام پر آ چکی تھی جہاں اس کی ٹھکانی بے حد ضروری تھی۔

نور کی پٹائی کرنے کے بعد بلال دو دن گھر کے اندر ہی موجود رہے تھے۔ تیسرے دن وہ باہر بجے کے قریب تیار ہو کر اپنے روم سے باہر آئے تو روپی کے روم کا دروازہ بند تھا۔ گھر میں موجود ہونے کے باوجود ان تین دن میں ایک بار بھی ان کا سامنا نور سے نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے دروازے کے قریب آئے۔ چیک کیا تو لاکنک نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر وہ دروازہ کھول کر اس کے روم میں آئے تو وہ گاؤٹیکے سے ٹپک لگائے بیڈ پر بیٹھی کوئی بک پڑھ رہی تھی۔ کو یا ڈیک کا شوق مار کھانے کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ تین دن سے اس نے ڈیک نہیں لگایا تھا۔ بلال چپ چاپ کھڑے اس کو دیکھتے رہے اور سوچتے رہے خود میں نے تمہیں زندگی کی ہر خوشی دینے کا عہد کر کے اپنا یا تھا مگر تم نے سہاگ رات میں مجھے ٹھکرا کر خودی سب خوشیوں



سے منہ موڑ لیا۔ تم نے میرے ساتھ جو بھی رویہ رکھا میں نے اف تک نہیں کی۔ کوئی شکوہ تم سے نہیں کیا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم خود کو پھر سے نقصان پہنچانے کی کوشش کرو اور میں تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا ہوں گا۔ کبھی نہیں۔ تم میری بیوی میری ذمہ داری ہو۔ میں تمہیں کوئی غلط فیصلہ اب کبھی نہ کرنے دوں گا۔

پڑھتے پڑھتے اچانک روپی نے کسی دوسرے وجود کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے چہرہ اٹھایا اور بلال کو دیکھ کر پھر جھکا لیا۔ یہ دیکھ کر بلال مسکراتے ہوئے اس کے قریب چلے آئے۔ پھر جھک کر اننگی سے روپی کے ایک رخسار کو چھو کر شرارت سے ہلکا سا مسکرا کر پوچھا۔

”تھپڑ زیادہ زور سے تو نہیں لگے تھے۔“

”روپی نے ان کا ہاتھ پرے جھٹکتے ہوئے ننگی سے چہرہ دوسری جانب پھیر لیا اور بلال دھڑکے سے ہنس پڑے۔ اور پھر اسی خوشگوار موڈ کے ساتھ روم سے باہر نکلے ہی تھے کہ سامنے سے آتے نواز کو دیکھ کر حیران ہوئے اور نواز نے ان کی حیرت دیکھتے ہوئے بتایا۔

”یار! میں نے گھر فون کیا تو تمہاری امی نے بتایا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں حالانکہ تم تو اس وقت ضرورت سے زیادہ صحت مند اور خوش نظر آ رہے ہو۔ کیلیات ہے پیارے جو یوں اکیلے مسکرا رہے ہو۔ نواز نے آنکھ مار کر شرارت سے پوچھا۔ ”خوش ہوں اس لیے مسکرا رہا ہوں۔“ بلال نے یہ کہتے ہوئے روپی کے روم کی جانب دیکھا تو نواز نے جلدی سے پوچھا۔

”بھابی! اندر موجود ہیں؟“

”ہاں بلال! نے کہا اور یہ سنتے ہی نواز بلال کو ہیں چھوڑ کر ایک دم روپی کے دروازے پر دستک دینا ہوا اندر چلا گیا۔“

”ارے ارے! یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔ بلال کہتا رہ گیا مگر نواز یہ جاوہ جاوہ چکا تھا۔ سمجھ میں نہ آیا اب کیا کرے۔ کچھ اور نہ سوچا تو جلدی سے اماں کے پاس آئے۔ جلدی جلدی ان کو ساری صورتحال سمجھائی اور پھر چپ اماں کو ساتھ لیے نور کے روم میں داخل ہوئے تو نواز مصروفی کی بجائے نور کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھایا تھیں کر رہا تھا اور روپی کتاب کو دھس رکھے بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اصل میں نواز نے اندر آتے ہی روپی کو سلام کرتے ہوئے چپک کر بتایا تھا۔

”بھابی جان! مجھے نواز کہتے ہیں اور میں بلال کا بہت پرانا۔۔۔ یعنی قدیم ترین دوست ہوں۔ چند دن پہلے بھی میں آنا چاہتا تھا مگر نہ سکا۔ آج بلال کی طبیعت کا سنا تو چلا آیا۔“ روپی اس کی باتوں کے جواب میں خاموش ہی رہی تو نواز نے بغور اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ روپی نے پھر جواب دینے کی رحمت نہ کی تھی اور اتنے میں بلال بھی اماں کو ساتھ لیے آ پہنچے تھے اور بلال کو دیکھتے ہی نواز نے پہلی بات یہ پوچھی تھی۔

”یار! بھابی سے تمہاری لڑائی تو نہیں چل رہی۔“

”تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔ بلال نے کن آنکھوں سے نور کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔“

”یار! ایک تو بھابی نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ دوسرا بھابی کی آنکھیں ہلکی سرخ ہو رہی ہیں۔ لگتا ہے روتی رہی ہیں۔“

”کسی کوئی بات نہیں۔ بس ان کی طبیعت ذرا خراب ہے اور شاید رات کو ٹھیک سے سو بھی نہیں پائیں۔“ بلال اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

”شاید۔“ نواز نے بلال کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم رات یہاں ان کے پاس نہیں تھے؟“

”اویار! میرا یہ مطلب نہیں۔ بلال ایک دم گھبرا گئے۔ پھر سنبھل کر کہا۔ اصل میں میں بہت تھکا ہوا تھا اس لیے جلدی ہی سو گیا تھا۔“ پھر اماں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا ان سے ملو یہ نور کی والدہ ہیں۔ نواز نے اماں کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ پھر نور سے مخاطب ہوا۔

”بھابی! میں آپ دونوں کو آج انوائٹ کرنے آیا ہوں۔“ روپی نے پھر منہ سے کچھ کہنے کی بجائے سوالیہ انداز میں نواز کو دیکھا تو اس نے شرارت بھرے لہجے میں بلال سے پوچھا۔

”یار بلال! بھابی کو لگی تو نہیں۔“

بلال اس کی بات سن کر صرف خفیف سا مسکرائے اور بل میں سوچا یہی کیا کم ہے کہ وہ پرسوں کے تھپڑ کھانے کے باوجود تمہیں برداشت کر رہی ہے۔

”یار تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔“ نواز نے دوبارہ پوچھا تو بلال نے سنجیدگی سے بتایا۔

”بہتر ہوگا تم یہ بات اپنی بھابی سے ہی پوچھو۔ ویسے نور بے حد کم کو ہے۔“



”واقعی بھابی بلال سچ کہہ رہا ہے؟“ نواز نے بہت سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ تو رولی بے ساختگی سے مسکرا دی اور بلال نے اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر اماں کو دیکھا تو اماں بھی مسکرا دیں اور اس کے بعد بلال بھی کھل کر مسکرا رہے تھے کو یا بارش کے بعد اب مطلع بالکل خفاف ہو گیا تھا اور نواز اب روم میں صوفے پر بیٹھے اماں اور بلال کی موجودگی کو فراموش کر کے صرف رولی سے باتیں کیے جا رہا تھا اور رولی بہت آرام اور خاموشی سے سن رہی تھی اور بلال کلاس کلاس رویے پر شدید حیرت تھی اور دل میں وہ سوچ رہے تھے اگر اس کو رے سخت رویے سے سدھرنا تھا تو کاش میں بہت پہلے سخت رویہ اپنالیتا۔ اچانک وہ نواز کی بات سن کر چونکے وہ کہہ رہا تھا۔

”یار! کل ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ تم اور بھابی ضرور بالضرور آنا۔“

”بہتر یہی ہوگا کہ تم یہ بات اپنی بھابی سے ہی کہو۔“ کیونکہ بلال جانتے تھے وہ ہرگز نان کے ساتھ جائے گی۔

”کیوں بھابی جان! آپ آئیں گی نا۔“ نواز نے بلال کی بات سنتے ہی پوچھا۔

”کوشش کروں گی۔“ رولی نے دھیمی آواز میں کہا۔ تو نواز نے شور مچا دیا کوشش نہیں بھابی جان! وعدہ کیجئے۔“ اور رولی کو یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ ضرور آئے گی جبکہ بلال اچھی طرح جانتے تھے وہ کبھی نہیں جائے گی۔ اچھا تو پھر میں چلتا ہوں۔“ نواز اٹھتے ہوئے بولا۔

”بیٹھو بیٹا! اب تو کھانے کا نام ہونے والا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔“ اماں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ بلال نے بھی روکنا چاہا مگر وہ انکار کر کے چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی بلال بھی اٹھ گئے تھے اور اماں رولی کے تاثرات دیکھنے لگی۔ پھر خود بھی اٹھتے ہوئے بولی۔

”کوئی حرج نہیں اگر تم سالگرہ پارٹی میں جلی جاؤ۔ مل بھی ذرا میل جائے گا۔“

”مگر کیوں؟“ رولی کی آنکھوں میں وہی نفرت عود کرتی تھی اور اماں یہ سوچتی ہوئی اپنے روم میں جی آئیں کہ تم کو مکمل طور پر درست ہونے کیلئے ابھی دو تین بار مزید ٹھکانی پٹائی کی ضرورت ہے۔

دوسری طرف بلال نواز کے ساتھ نیچے آئے پھر اس کو باہر دروازے پر چھوڑ کر واپس آئے تو بیگم اخلاق نے کہا۔

”یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟“

”کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ بلال نے ان کے قریب رکتے ہوئے پوچھا۔

”تم نواز کو اوپر کیوں لے کر گئے تھے۔“ رولی سے کیوں ملوایا ہے۔

”میں لے کر گیا تھا یا آپ نے اوپر بھیجا۔ باقی نواز میرا دوست ہے اور بہت اچھا انسان ہے۔ امریکہ میں چھٹی والے روز اس کی بیوی مجھے لازمی کھانے پر بلاتی تھی۔ جب اس کی بیوی مجھ سے ملتی ہے تو پھر میں نور کو کیوں نہ نواز سے ملواتا۔ ویسے بھی نواز بہت لائق انسان ہے۔“

”وہ لائق انسان ہے تمہاری بیوی تو نہیں۔“ انہوں نے زبردستی سے کہا۔ ”اور اگر وہ پہچان لیتا یہی ادا کارہ رولی۔۔۔۔۔“

”امی! وہ صرف نور ہے اور خدا کے لیے پیچھا چھوڑ دیں اس کا اور نور کے لیے مزید رائے زنی کرنی چھوڑ دیں۔“ بلال کو غصہ آ گیا۔ شاید رولی کے نرم رویے نے ایک نئی قوت ان کے اندر بھردی تھی۔

”بلال! ابھی وہ تمہیں گھاس نہیں ڈالتی۔ منہ نہیں لگاتی تو تمہارا یہ حل ہے۔ اگر وہ تمہیں لفٹ کراتی تو بتا نہیں تم مزید کتنے بدتمیز ہو جاتے۔ تمہیں معلوم ہے نہ شمشادیری بہن بنی ہوئی ہے۔ مگر تمہاری شادی کے بعد وہ ایک بار بھی ہمارے گھر نہیں آئی۔ جانتے ہوں کیوں؟“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں فضول لوگوں کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت برباد کرنے کی۔“ بلال نے خشک لہجے میں کہا۔

”مگر میں پھر بھی بتاؤں گی وہ صرف رولی کی وجہ سے ہمارے گھر نہیں آتی۔ کیونکہ وہ رولی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی اور اماں سے بڑھ کر تو اپنی بیٹی کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔“

”آپ کی ان باتوں کا مطلب۔“ بلال نے ناکامی سے پوچھا۔

”بلال! بلال! تم بہت گستاخ ہو گئے ہو۔ میں تمہیں تمہارے بھائی سے۔۔۔۔۔ وہ بتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ پھر بولیں۔“ خیر اب تم سے کہنا سننا بے کار



ہے۔ تم کنارہ کرلو۔ میں نے تو سوچا تھا ان تین ماہ میں تمہیں عقل آ جائے گی مگر خیر میں اب تم سے کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ بس تم کنارہ کرلو، ہم لوگ تمہیں اور برداشت نہیں کر سکتے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اب یہی آخری فیصلہ ہے میرا۔“

”جی بہتر ای! میں کوشش کروں گا۔“ بلال نے لاپرواہی سے کہا کوپا ان کی بات کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو اور وہ ایک دم آگ بھگولا ہو گئیں۔ ”کب کرو گے کوشش۔ کب کرو گے اپنی یہ کوشش۔ اس کو یہاں سے لے کر دفع ہو جاؤ بلال! اور نہ میں اسے چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دوں گی باہر سڑک پر کھڑا کر دوں گی۔“ بلال کچھ دیر ان کو دیکھتے رہا اور سوچتے رہے۔ آخر لوگ دوغلی زندگی بسر کیوں کرتے ہیں۔ ان کا باطن اور ظاہر ایک سا کیوں نہیں ہے۔ ان لوگوں کا ایسے دو یا دو باتوں کی وجہ سے پہلے ہی خرابی ہو چکی ہے۔ مگر یہ لوگ پھر بھی باز نہیں آتے۔ وہ چپ چاپ اوپر آئے اور روم میں بند ہو گئے۔ ان کا خیال تھا ہو سکتا ہے امی کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے مگر ایسا نہ ہوا۔ رات کا کھانا بھی انہوں نے نہ کھایا۔ صبح وہ نیچے آئے تو کمال کو یا پہلے سے ہی ان کے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی بولے۔ ”یہ کیا سنا ہے میں نے۔ تم اس کو اپنے دوستوں سے بھی متعارف کروانے لگے ہو۔“

”اس میں برائی کیا ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔ چھپانے والی چیز نہیں اور پھر نواز میرا بہت قریبی دوست ہے اور اس کی بیوی بھی مجھ سے پردہ نہیں کرتی۔“ بلال نے لاپرواہی سے کہا۔ ”پھر وہی بات۔“ بیگم خلاق نے انہیں گھور کر دیکھا۔ میں پوچھتی ہوں ساری دنیا نیک اور پارسا ہے۔ مگر وہ آوارہ و اس قابل نہیں۔ انہوں نے منہ سے کہا۔ ”امی جان پلیز! میں آپ کو کتنی بار کہوں آپ چپ رہا کیجئے۔“ بلال نے غصے سے کہا اور نیمیرے منہ سے کچھ لٹ سٹ نکل جائے گا کہ ضبط کی آخری حد کو چھو رہا ہوں میں۔“ ”کیا کہا۔“ گل نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا اور کہا۔ ”اس آوارہ کے لیے تم امی جان سے اس لہجے میں بات۔“

”بھابی جان! آپ کو ہمارے درمیان بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔“ بلال بھی کو یا آج غصے میں بھرے بیٹھے تھے کہ رات دن کی ان باتوں سے وہ تنگ آ چکے تھے۔ ”بلال! ذیل انسان۔ ماں جیسی بھابی کو بک بک بتاتا ہے۔“ بیگم خلاق نے اٹھ کر ان کے چائنا مار دیا۔ بلال نے دکھ سے ان کو دیکھا۔ ایک بہو کے لیے ایسی محبت اور دوسری کے لیے ایسی نفرت۔ اچانک کمال اٹھ کر ان کے قریب آئے اور کان دھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

”بلال! تم کو جس چیز کی ضرورت ہو جو چاہو یہاں سے لے جاؤ۔ مگر وہ عورت جس کے لیے تم سب کا احترام بھول گئے ہو اس کو لے کر تم کہیں بھی چلے جاؤ۔ ہم اپنے گھر کے مقدس ماحول میں اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔“

”کیوں نہیں کر سکتے؟ کیوں نہیں کر سکتے؟ میرا خیال ہے اب اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔“ بلال نے غصہ ضبط کرتے ہوئے بمشکل کہا۔ ”بھائی جان! آپ کیوں بھول جاتے ہیں وہ اس خاندان کی چھوٹی بہو ہے اور پھر میری بیوی بھی ہے۔ جس کو آپ سب لوگ برا بھلا کہہ سکتے ہیں اور اگر میں نے ذرا سا کچھ کہہ دیا ہے تو کوئی قیامت آگئی۔“

”وہ آوارہ میرے برابر ہو سکتی ہے۔“ گل نے نفرت سے بات کاٹ کر کہا تو بلال آپے سے باہر ہو گئے۔ ”یکو اس مت کیجئے۔“ بلال کا اتنا کہنا تھا کہ کمال نے غصے سے لاتعداد مٹانچے بلال کے منہ پر جڑ دیئے اور بلال یونہی بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ کو یا جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ یا پھر ہاتھ پیر سلامت نہ ہوں۔ وہ چپ چاپ پٹتے رہے۔

”دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔“ کمال دھاڑے۔ بلال نے پلٹ کر ماں کو دیکھا تو انہوں نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ بلال اپنے روم میں چلے آئے۔ ان کا ان لوگوں کی ذہنیت پر دکھ ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کیسے بے حس، بے خبر لوگ ہیں۔ ان کو موت کا بھی ڈر نہیں اور اللہ کا بھی نہیں۔ وہ جس کا اللہ نے بغیر کسی آسے اور سہارے کے اپنے گھر میں جگہ دی۔ یہ لوگ اس کو برا کہتے ہیں۔ خود بتائیں کیا اور کیسے متضاد باطن کے لوگ ہیں اور نور۔۔۔۔۔ ان کو ایک بار پھر اس کے رویے کا دکھ ہو رہا تھا۔ بجائے وہ ان کے دکھ کا مداوا کرنی وہ مزید دکھ دینے کا باعث بن رہی تھی۔ اسے ذرا بھی تو ان کا ذرا خیال نہیں تھا۔ یہ تو وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ گھر والے کبھی نہ بھی ان سے ایسا سلوک ضرور کریں گے۔ اور وہ گھر والوں کے اس سلوک سے پہلے ہی یہ گھر چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ مگر اس کو کیا کہیں کہ گھر چھوڑنے سے پہلے ہی یہ وقت آگیا تھا۔ وہ سوچتے رہے اس مسئلے کا حل اور دن گزارتا رہا۔

سر شام ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے سوچا شاید امی یا بھابی میں سے کوئی منانے آیا ہو مگر جب دروازہ کھولا تو اماں کھڑی تھیں۔ بلال دروازے سے ہٹ گئے۔ اماں اندر آئیں اور پوچھا۔



”کیا طبیعت بہت زیادہ خراب ہے؟“

”نہیں اماں جان! طبیعت تو ٹھیک ہے، آپ بیٹھیں۔“ بلال نے خود کو مارلے ظاہر کیا۔

”تمہیں یا نہیں تمہارے دوست نے تمہیں دعوت دی تھی۔ آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے۔“

”اوہو! مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ مگر ماں جان! اچانک وہ فسر دھوئے۔ ”اکیلا کیسے جاؤں گا؟ آپ کو تو معلوم ہے اس نے نور کے لیے کتنا زور دیا تھا۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔ تم فکر نہ کرو میں نور سے کہتی ہوں۔ بس تم تیار ہو جاؤ۔“ اماں خلی گئی۔ بلال جانتے تھے یہ سب تسلی ہے۔ نور بھی جانے پر تیار نہیں ہوگی۔ مگر خود ان کو تو ہر حال میں جانا تھا۔ جیسے تیسے تیار ہو کر روم سے باہر آئے تو نا صرف نور کا بلکہ اسٹور کا دروازہ بھی بند تھا۔ انہوں نے سوچا نور رضامند نہ ہوئی ہوگی اور بے چاری اماں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ وہ سیرھیوں کی جانب بڑھے ہی تھے کہ اماں کی آواز سن کر چونک پڑے۔

”اکیلے ہی جا رہے ہو؟“ وہ پوچھ رہی تھیں؟ بلال نے سوچا ماں آپ سب کچھ جان کر بھی انجان کیوں بنتی ہیں مگر انہوں نے چپ رہنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے ماں بھی ان کی طرح مجبور ہیں۔

”کیلیات ہے بیٹا! میری آواز نہیں سنی۔“ بلال نے پلٹ کر ان کو دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اسی تھا کہ دروازے کے کچھ کھڑی نور پر نظر پڑ گئی۔ وہ حیرت زدہ سے کتنی ہی دیر دیکھتے رہے اور ماں مسکراتی رہی۔ وارنٹ میکسی پر سر پر سرخ اسکارف باندھے بغیر میک اپ وہی مقدس چہرہ جو عودہ میں بلال نے دیکھا تھا۔ اچانک وہ ماں کی آواز سن کر چونک پڑے۔ وہ ان سے جانے کا کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر پھر نور کو دیکھا مگر نور نے ایک بار بھی ان کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ تاہم ماں کے کہنے پر وہ آہستہ آہستہ بلال کے قریب آئی اور وہ کسی سحر زدہ انسان کی طرح چل پڑے تھے۔ گاڑی تو ان کے پاس تھی نہیں۔ گھر والوں سے اگر مانگتے تو وہ مان کر دیتے۔ انہوں نے ٹیکسی لی اور اس تبدیلی کے بارے میں سوچنے لگے۔ صبح کی ساری کوفت چلی گئی ایک دم۔ ان کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ اگرچہ نور نے ان سے بات نہ کی تھی مگر وہ جانتے تھے ان کا کچھ خیل تھا تو وہ ساتھ آئی تھی۔ راستہ خاموشی سے طے ہوا اور وہ اپنے دوست کے گھر پہنچ گئے۔ وہ سب ان لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوئے جبکہ بلال تو پہلے ہی خوش خوش آئے تھے۔ نور نے سوائے ہوں ہاں کے وہاں کوئی خاص بات نہ کی جبکہ وہ خوب باتیں کرتے رہے اور ان کو دیکھتے رہے جو ان سب سے الگ اور منفرد ہی لگتے تھے۔ رات ساڑھے بارہ بجے یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔ سب گیسٹ چلے گئے مگر بلال اور نور کو روک لیا۔ ایک بجے تک گپ شپ ہوتی رہی اور پھر بلال اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر سرد اور منہ زور ہوا چل رہی تھی۔ شاید بارش کا موڈ بن رہا تھا۔ انہوں نے نواز سے اجازت لی اور کہا یا روبر ہو گئی تو بارش میں بھیگ جائیں گے اب چلتے ہیں۔

”کیوں گاڑی میں نہیں آئے ہیں؟“ نواز نے پوچھا۔

”نہیں بھئی! ٹیکسی میں آئے ہیں۔“ بلال نے بتایا۔

”بڑے فسوس کی بات ہے اخلاق خان کے بیٹے کے پاس گاڑی بھی نہیں۔ خیر تم بھی کیا یاد کرو گے چلو میری گاڑی کی چابی پکڑو اور عیش کرو۔“ بلال نے جھینکس کہتے ہوئے چابی پکڑ لی۔ کیونکہ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ فرنٹ ڈور کھول کر پہلے نور کو بٹھنے کا کہا اور خود بھی اس کے برابر بیٹھ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور نور باہر سڑک پر دیکھنے لگی۔ بارش ہلکی تھی مگر ہوا بہت منہ زور تھی۔ سفر خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ ہلکی بارش زور پکڑ گئی تھی۔ طوفانی ہوا ہونے کی وجہ سے بلال نے نور سے کہا گاڑی کے شیشے چڑھا دو نور نے خاموشی سے ان کی بات پر عمل کیا لیکن ابھی اس نے شیشے چڑھا کر ہاتھ ہٹایا ہی تھا کہ زمین لرز کر رہ گئی۔ ایک عجیب سا خوف اس کے پورے بدن میں سرایت کر گیا۔ بے ساختگی میں وہ بلال سے لپٹ گئی۔ مگر اس وقت اس کو اس بات کا ہوش کب تھا بس یوں محسوس ہوا تھا گویا سینے سے دل نکال کر کسی نے مسل دیا ہو۔ وہ تو ہر ڈر پر خوف سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ پھر یہ اچانک کیا ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی اور بلال نے تو خود حیران و پریشان بمشکل ہوش قابو میں رکھتے ہوئے گاڑی کو بریک لگائے تھے۔ ورنہ شاید وہ موت کی وادی میں اتر جاتے۔ دھماکا اس قدر شدید تھا۔ بجلی ان کی گاڑی سے پرے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر گر گئی تھی۔ بہت ساری چیزیں ایک ساتھ ابھری تھیں ان کے لیے اور ہر طرف دھواں سا پھیل گیا تھا۔ ان کا بیچ جانا ایک معجزہ ہی تھا۔ بلال نے ایک نظر باہر سڑک پر ڈالی اور دوسری خود سے لپٹی ہوئی نور پر۔ بجلیاں آج بھی دوسری گری تھیں۔ ایک نور کی شکل میں ان پر۔ دوسری باہر سڑک پر۔ دھواں ذرا ہلکا ہوا تو لوگ ان کی خیریت دریافت کرنے گاڑی کے قریب آ گئے۔ انہوں نے شیشہ نیچے کر کے ان سب کا شکریہ ادا کیا۔ پھر نرمی سے نور کو خود سے الگ کرتے ہوئے بولے۔



”زندگی کا بچ جانا ایک معجزہ تھا۔ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔“ مگر یہ کیا نور تو بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ بارش بھی زوروں کی ہو رہی تھی۔ گاڑی بھی تیز نہ چلا سکتے تھے۔ اسی حالت میں گاڑی چلاتے ہوئے وہ بمشکل گھر پہنچے۔ گاڑی پورچ میں روک کر وہ بے ہوش نور کو بائیں میں اٹھائے اندر آئے تو سب لوگ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ شاید ان کے لیے۔ مگر وہ کسی سے بات کیے بغیر اوپر آئے تو سٹور کا دروازہ بند تھا۔ یقیناً اماں سو چکی تھی۔ بلال نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور نور کے قدم میں داخل ہو گئے۔ نور کو آرام سے بیڈ پر لٹا کر انہوں نے دروازہ پہلے بند کیا۔ پھر درجے کے پردے برابر کر کے جب وہ نور کے قریب آئے تو نور اب بھی بے ہوش تھی۔ وہ پریشانی سے اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ سمجھ میں نہ آیا اب کیا کریں۔ ویسے خطرے کی تو کوئی بات نہ تھی۔ وہ جانتے تھے اس کی یہ حالت صرف ڈر کی وجہ سے ہوئی۔ وہ گاؤں کیے سے ٹیک لگا کر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں آج وہ بارہ سال پہلے کی معصوم لڑکی لگ رہی تھی جو ہر چیز سے خوف کھاتی تھی۔ بالآخر انہی کی وجہ سے ایک دن وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس جرم کا کفارہ انہوں نے کیسے کیسے ادا نہیں کیا تھا۔ وہ سوچتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔ تین بجے کے قریب نور کو ہوش آیا۔ کچھ دیر چت لٹی اپنی حالت پر غور کرتی رہی مگر جیسے ہی بلال پر نظر پڑی وہ یکدم اٹھ بیٹھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ بلال نے اس کی جانب جھکتے ہوئے پوچھا۔ نور کی سمجھ میں نہ آیا اب کیا کرے اور کیا جواب دے۔ یا شاید ابھی تک وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھ ہی نہ پائی تھی اور چپ چاپ حیرانی سے بلال کو دیکھتی جا رہی تھی۔

”نور! تم ٹھیک تو ہو؟“ انہوں نے محبت سے پوچھا۔ روبی نے چہرہ اٹھا کر بلال کو دیکھا اور چند لمحے دیکھتی رہی اور جب کچھ نہ سوچا تو پھر دونوں ہاتھوں میں اپنا ہی چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ بلال کچھ دیر اس کو رونا دیکھتے رہے۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا کر محبت سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”ارے ارے یہ کیا رونا نہیں۔ نور مجھے تکلیف ہوگی۔“ پھر آہستگی سے کہا۔

”میں جانتا ہوں نور تم مجھ سے بہت خفا ہو۔ میں تمہاری ناراضگی کو سمجھتا ہوں۔ مگر میں کیا کروں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اپنی طرف سے تو میں نے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ خوشیاں دینے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ اور بات ہے میری ہر نیکی گناہ بنتی رہی ہے۔ خدا کے لیے نور رونا نہیں۔ تمہارا یہ رونا مجھے اذیت دے رہا ہے۔ مجھے میرے گناہوں کا احساس دلاتا ہے۔ کاش کہ گزرے ہوئے وقت کو واپس لانا انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا تو آج میں اتنا پشیمان نہ ہوتا۔ نور میں تم سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ تم خوش رہو۔ یا پھر مجھے بتاؤ میں تمہاری خوشی کے لیے کیا کروں۔ تم جو کہو گی میں مان لوں گا۔ مگر رونا نہیں، بیٹیز!“ بلال نے روبی سے استعجا کرنے والے انداز میں کہا۔

”بلال! آپ۔۔۔۔۔ آپ۔“ روبی نے روتے روتے صرف اتنا کہا اور پھر بے ساختہ بلال سے لپٹ کر اور بھی زور شور سے رونے لگی۔ نجانے کب کا غبار تھا جو پوری شدت سے اب بہہ نکلا تھا۔ بلال نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کے گرد اپنے بازو لپیٹ کر پوری شدت سے اس کو گھونچ لیا۔ اسی حالت میں اس کو اپنے بازو میں لیے روتے دیکھتے رہے۔ کیونکہ وہ خود بھی چاہتے تھے آج ایک بار بلکہ آخری بار جی بھر کر رونے کی حاجت مند ہے۔ اب وہ بلال کے سینے سے لگی نہ صرف رونے جاتی تھی بلکہ ساتھ ایک ہی بات دہرائے جاتی تھی۔

”مجھے معاف کر دیجئے بلال! میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں۔ آپ کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ مگر بلال میں خود بھی تو دکھا کھا تھی رہی ہوں کہ شاید یہی قسمت میں لکھا تھا۔ اندر ہی اندر اذیت سہتی رہی ہوں۔ مگر آج آپ کے ساتھ جو بھی ہوا مجھ پر میری وجہ سے ہوا ہے۔ آپ کی آج جو توہین ہوئی اس کی ذمہ دار صرف میں ہوں۔ اس کے لئے میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تو شروع سے ہی بد نصیب تھی۔ میرے ساتھ تو ایسا ہونا ہی تھا۔ یہ سزا عین مجھے تو ملنا ہی تھیں۔ مگر آپ کیوں میری محبت میں بدنام ہوئے۔ میری فیور میں بول کر دوسروں کے ہاتھوں ذلتیں اٹھائیں۔ حالانکہ میں برسوں دن، نئی رات ایک نیا دکھ آپ کو دیتی تھی۔ آپ پھر بھی مجھ سے محبت کرتے رہے۔ میری خاطر دوسروں کے ساتھ جھگڑا کرتے رہے۔

نور کی یہ باتیں سن کر بلال پر یہ انکشاف ہوا۔ وہ صبح والی ساری بات چیت سن چکی ہے۔ اس وقت اس کے مزاج کی یہ تبدیلی اسی بات چیت کا نتیجہ تھی۔ یہ سوچ کر وہ بے حد خوش ہوئے کہ وہ ان کا اتنا خیال کرتی ہے۔ ساتھ یہ دکھ بھی ہوا اگر پہلے ہی ان کا خیال کر لیتی تو پھر ان حالات کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس وقت خود سے لپٹی ہوئی نور پر ان کا زہد ترس بھی آیا۔ اور نوٹ کر یہ بھی۔ ان کی محبت میں اس نے کم ذلتیں تو نہیں اٹھائی تھیں۔ وہ بلال خان کی بیوی تھی۔ جی تو ان صرف نیگم اخلاق بات بات پر اس کو رسوا کرتی



تھیں بلکہ دوبارہ مارا بھی تھا۔ پہلی بار ایک تھپڑ، دوسری بار دو۔ اگر وہ بلال خان کی بیوی نہ ہوتی تو وہ اس کو چھونے کی بھی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ یہ سارے ظلم بلال خان کی بیوی ہونے کے ناظرے برداشت کیے تھے اس نے۔ جیسی تو ان کو اس وقت نور پر ترس کے ساتھ ساتھ ٹوٹ کر یہ بھی آ رہا تھا۔ انہوں نے محبت پاش نگاہوں سے نور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نور تم بھی مجھے معاف کرو۔ میری وجہ سے تمہیں گھر والوں کے سخت رویے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ خاص کر امی جان نے تمہارے ساتھ جو بھی برا سلوک کیا اس کے لیے مجھے معاف کرو۔“ تب روبی نے کہا۔

”میں اسی کے لائق تھی بلال! نہیں گھر سے بھاگتی نہ لوگ میرے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتے۔ مگر میں آپ کو بتاؤں اگر آپ مجھے آوارہ نہ کہتے تو میں گھر سے کبھی نہ بھاگتی۔ آپ کے منہ سے آوارہ ہونے والے اس ایک لفظ آوارہ نے میرے اندر ایک ایسی آگ لگائی جو بھی نہ بجھ سکی۔ لیکن جب آپ مجھ سے ملے اور بتایا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ تب وہ آگ اپنے آپ بجھ گئی۔ مگر میں آوارہ نہیں تھی۔“ وہ بات ختم کر کے سکی۔

”میں جانتا ہوں نور! جرم کسی اور نے کیے تھے۔ یہ کہہ کر انہوں نے جمشید کلانا اور پھر روجی اور غزالہ کی بات چیت جو انہوں نے سنی تھی وہ پوری وضاحت سے نور کو بتانے کے بعد کہا۔ اس کے بعد ہی تو میں نے تمہاری تلاش شروع کی۔ مگر افسوس وقت میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔“

میں تو روجی کے ویسے میں بھی تمہاری تلاش کی وجہ سے شام نہ ہوا تھا۔ اگر امی جان جھوٹا وعدہ کر کے تمہاری تلاش کا مجھے امریکہ نہ جانے کا کہتیں تو میں نے تب ہی تمہیں تلاش کر لیا تھا۔ مگر افسوس جب بات کھلی تب وقت میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ امی جان میرے ساتھ جھوٹ بھی بول سکتی ہیں۔

”کیونکہ یہی مقدار میں لکھا تھا۔“ روبی سسکی تو بلال نے کہا۔

”روبی میں نے جو تم پر ہاتھ اٹھایا اس کے لیے مجھے معاف کرو۔ مجھ اپنے ہاتھ اٹھانے پر بے حد افسوس ہے۔ بس میں نے محسوس کیا کہ آج تم نرمی سے نہیں مانو گی تو یہ سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔“

”کوئی ضرورت نہیں معافی کی۔ میں ان تھپڑوں کی حقدار تھی۔ اگر آپ وہ تھپڑ مجھے نہ مارتے تو میں نے اپنی مرضی کر لیتی تھی۔“ روبی نے کہا تو بلال مسکرا دیے اور روبی نے پھر کہا۔

”مگر تب درد بہت ہوا تھا۔“ بلال نے کہا۔

”آئی ایم سوری! آؤ میں اس درد کا کفارہ ادا کروں۔“ اور دونوں ہاتھوں میں نور کا چہرہ تمام کمراس پر جھکے تو یہ رات وصل کی رات بن گئی تھی۔

صبح وہ اٹھے تو نور ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر سیدھے واش روم میں گئے۔ پھر ضروریات سے فارغ ہو کر ملازم سے ناشتہ لانے کا کہا۔ گھر والوں نے کل سے انہیں کھانا وغیرہ دینا بند کر دیا تھا۔ بلال اب ان کی نفرت پر حیران ہوتے اور سوچتے اگر ان کو مجھ سے سچی محبت ہوتی تو میری خاطر نور کو بھی برداشت کر لیتے مگر وہ سب تو قدم قدم پر میری توہین کرتے آئے تھے۔ وہ ملازم کو ناشتے کے لیے بھیج کر واپس روم میں آئے تو نور بیڈ پر موجود نہیں تھی۔ کو یا وہ بھی جاگ گئی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر آئینہ دیکھنے پر دو گرام کے بارے میں سوچنے لگے۔ دفعتاً انہوں نے قدموں کی آہٹ پر سر اٹھایا تو نور ٹاول سے بال خشک کرتی ڈرائنگ روم سے باہر آ رہی تھی۔ بلال پر نظر پڑی تو ان کو اپنی جانب دیکھتے پا کر شرما کر چہرہ جھکا لیا تھا۔ بلال نے مسکراتی نظروں سے اس کو دیکھا اور کہا۔

”جناب! آج شرمانے کا نہیں کام کرنے کا دن ہے۔“ نور چونک کر ان کو دیکھنے لگی۔ بلال نے اس کا بے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ پھر نور کے قریب بیٹھنے پر ہاتھ پکڑ کر اپنا پروگرام بتانے لگے۔ نور یہ سب سن کر سوچتی رہ گئی۔ وہ کتنی محبت کرتے ہیں اس سے۔ وہ اندر ہی اندر اس کو خوشی دینے کی کوششوں میں تھے۔

چار بجے کے قریب بلال نیچے آئے تو موسم ابراؤں ہونے کی وجہ سے سب لوگ باہر لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ بلال کو دیکھتے ہی بیگم خلاق نے آواز دی مگر وہ سنی ان سنی کر کے باہر چلے گئے۔ بیگم خلاق مارے غصے کے کھول کر رہ گئیں۔ تاہم چند منٹوں بعد ہی بلال کی واپسی ہوئی تو بیگم خلاق دھاڑیں۔

”تم نے سنائیں میں نے آواز دی تھی۔“

”جی فرمائیے امی جان!“ بلال نے ادب سے پوچھا۔

”تمہیں اس دن کہا تھا ہمارا گھر چھوڑ دو مگر تم ابھی تک یہیں ہو۔ کیا چاہتے ہو تم؟“ ان کی بات سن کر بلال نے بھائی اور بھابی کو دیکھا وہاں گرچہ خاموش تھے۔ مگر ان کی یہ خاموشی ماں کی



بات کی تائید کر رہی تھی۔

بلال کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئے تو یگم اخلاق نے سخت لہجے میں کہا۔ ”بلال میری بات کی تمہاری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں۔ مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ چپ چاپ یہ گھر چھوڑ دو۔“

بلال ایک بار پھر سنی ان سنی کر کے اوپر آئے۔ مگر واپسی میں ان کو دیر لگی تھی تاہم اب وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ناصر ف نور تھی بلکہ ماں بھی۔ بلال نے اٹیچی اٹھا رکھا تھا۔ نور نے بیگ اور ماں خالی ہاتھ تھیں۔ اچانک ہی سب لوگوں کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ وہ کبھی سامان کو دیکھتے اور کبھی ان لوگوں کو۔ ماں کے قریب پہنچ کر بلال رکے۔ تب سیاہ بالوں کے بڑے بڑے ٹکڑے چلے آنے پر فضا میں اچانک تاریکی چھا گئی تھی۔ بلال نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ پھر نور کو جو خوف سے کانپ رہی تھی کیونکہ اس موسم نے ہمیشہ نور کو دکھ دیئے تھے۔ اچانک تاریکی چھا جانے پر وہ خوفزدہ ہو کر سوچنے لگی کہیں بلال اس وقت بدل نہ جائیں۔ اگر ان کی امی نے روک لیا تو وہ کب نہ جائیں۔ بلال نے بغور ماں کو دیکھا تو نجانے کیوں مل بھرا آیا۔ انہوں نے آنکھوں میں آنے والے آنسو ضبط کیے اور دم آواز میں کہا۔

”امی جان! میں نہیں جانتا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر آپ لوگ مجھ سے اس طرح کا سلوک بھی کر سکتے ہیں۔ آپ لوگوں نے تو نفرت کی انتہا کر دی۔ مجھے تو خود سے بھی شرم آنے لگی تھی۔ آپ نے گھر چھوڑنے کا کہا تھا۔ میں ہمیشہ کے لیے اس ملک کو چھوڑ کر جا رہا ہوں کیونکہ میں یہاں کب سکون سے تھا۔ مگر تین ماہ تو مارے مجبوری کے کسی نہ کسی طرح کاٹنے تھے کفو ر واپس جا کر مجھے دوستوں سے مذاق نہیں بخانا تھا کہ تین سال بعد چھٹی گیا اور تین ماہ بعد ہی واپس آ گیا۔ مگر اب چھٹی ختم ہونے کے قریب آ پہنچی تھی۔

اب تو آپ نہ بھی کہتیں تو ہمیں یہاں سے چلے جانا تھا۔“ پھر وہ رکے کیاضبط کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر بولے۔ ”یقین کیجئے امی جان! دکھ تو اس بات کا ہے کہ آپ کی خوشیوں کے لیے یہاں آیا مگر سوائے دکھوں کے کچھ نہ ملا۔ اگر میں وہاں رہتا تو کم از کم دکھوں کا یہ زہر میرے اندر نہ اترتا۔ آپ کو یقیناً خوشی ہوگی کہ میں ہمیشہ کے لیے سعودیہ جا رہا ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے گا کہ آپ کی بات نہ مان کر نفرت کا شکار ہوا۔ مگر اس کے باوجود امی جان! میں اپنے گھر میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ آپ کا انتظار کروں گا۔

ہاں امی جان خدا کے مقدس گھر کے سامنے میں بھی ایک چھوٹا سا گھر بناؤں گا جہاں میں اور نور اپنے بچوں کے ساتھ اس یقین کے ساتھ آپ کا انتظار کریں گے کہ ایک نایک دن آپ ہمیں دیکھنے ضرور آئیں گی۔“ پھر وہ بنا رکے بنا دیکھے باہر نکلتے چلے گئے۔ بھائی اور بھائی سے انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔

یگم اخلاق اس کی باتوں کی کبر لائی پر غور کر رہی تھی کہ باہر گاڑی چلنے کی آواز آئی اور وہ چالگوں کی طرح جیتھتی ہوئی باہر بھاگیں۔ مگر وہاں اب بلال نہیں تھا۔ وہ ہوتی ان کی ٹیکسی کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اچانک بارش زوروں سے شروع ہو گئی مگر وہ ہر احساس سے عاری گل اور مکمل سے بے پروا مہر آتی رہیں۔

”بلال! میں شاید تمہارے گھر نہ آ سکوں۔ میرے عقیم اور لاڈلے بیٹے بیشک میں آج اپنی تربیت پر فخر محسوس کرتی ہوں کہ میں نے تم ایسے فرشتے کو جنم دیا۔ میری دعا ہے نیکی کا جو دیا میں نے تیرے دل میں روشن کیا ہے وہ کبھی نہ بجھے۔ آج کے بعد کوئی پریشانی تمہارے قریب سے بھی ناگزیر ہے۔ میں تم سے ملنے بھی نہ آ سکوں گی۔ مگر اپنی ہر دعا میں ہمیشہ تمہیں شامل رکھوں گی۔“ پھر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا گل کمال ان کے تینوں بچہ ان کے بہت قریب آ کھڑے ہوئے۔ مگر آج ان کو دیکھنے کا بھی حوصلہ ان میں نہیں تھا۔ وہ نا کوئی بات کیسا اپنے روم میں چلی گئیں۔

☆☆☆

جہاز سعودیہ کی طرف محو پرواز تھا اور نور اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے بلال کو وہ کونسا دکھ ہے جو نہیں دیا تھا۔ وہاں ہی باہر اس کی خوشیوں کے لیے کوشش کرتے رہے۔ جس کے نتیجے میں آج وہ آزادگی۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے بلال کو دیکھا تو وہ مسکرا کر بولے۔

”ایک بات بہت باتم سے کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا کیونکہ تمہارا موڈ اکثر خراب رہتا تھا۔ مگر آج کہہ رہا ہوں اسے غور سے سننا۔“

”جی فرمائیے!“ نور نے شوخی سے مسکرا کر پوچھا۔

”دیکھو ڈیر!“ بلال نے سنجیدگی سے کہا۔ ”موسم آج پھر خراب ہے مگر اس کے باوجود ہم اپنی دائمی خوشیوں کے لیے اپنی منزل کی جانب جا رہے ہیں۔ کہنے کا مطلب ہے کہ کسی بات میں شرک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہم کہ یہ موسم ہمیشہ تمہارے لیے دکھ لے کر آتا ہے۔ اب ختم ہو جانا چاہیے کیونکہ اسی موسم نے اب تمہیں خوشیاں بھی دی ہیں اور مجھے یقین ہے



اب ہم صد ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں گے۔“

”آئی ایم سوری بلال! آئندہ میں ایسا کوئی خیال اپنے دل میں نہ آنے دوں گی۔“ اور بلال کے کاندھے پر سر رکھ کر آنکھیں موندھ لیں۔ ایک عجیب سا سکون اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا مگر پھر اس نے سوچا میں خوش ہوں کیونکہ بہت پہلے اپنے گھر کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر محض میری وجہ سے بلال کو اپنے گھر والوں سے دور ہونا پڑا۔ یہ سوچتے ہی اس کے آنسو بہہ نکلے۔ بلال نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”تو تم رورہی ہو مگر کیوں؟“

روبی نے روتے روتے کہا۔

”محض میری وجہ سے آپ کو اپنے گھر والوں کو چھوڑنا پڑا۔ کیا میں اتنی ہی بری ہوں کہ وہ لوگ مجھ سے محبت نہ کر سکے۔ مجھے قبول نہ کر سکے۔ جب میں سب کچھ بھول گئی ہوں تو پھر یہ لوگ کیوں نہیں بھول جاتے میری غلطی کو۔“

اس کی باتیں سن کر بلال نے محبت سے اس کو دیکھا پھر کہا۔ ”بری تم نہیں نور برا تو وہ فعل تھا جو تم سے سرزد ہوا۔ گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کو ہمارے معاشرے میں پھر کبھی عزت نہیں ملتی۔ محض ایک لڑکی کے گھر سے بھاگنے کی وجہ سے اس کے خاندان اور گھر والے معاشرے میں ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ ان کو لوگوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ سو طرح کی رسوائی ہوتی ہے والدین کی۔ خاندان کی۔“

گھر سے بھاگنے کا جرم کرنے والی لڑکیاں بعد میں توبہ کر کے کتنی بھی نیک اور پارسا بن جائیں۔ مگر صرف اس ایک فعل کی وجہ سے خاندان کو چھوڑ کر معاشرے میں موجود دوسرے لوگ بھی نہ تو ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں نہ اعتبار کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی شریف انسان ان سے ملنا پسند کرتا ہے۔ مطلب اب یہی دیکھو تو تمہاری وجہ سے میرے گھر والوں نے مجھے بھی ٹھکرا دیا۔ یعنی تمہارا جرم اتنا برا ہے کہ تم کو قبول کرنے کی بجائے مجھے ہی ٹھکرا دیا۔

لڑکیاں بہت نازک ہوتی ہیں۔ خاندان کی عزت ان کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ان کی ایک غلط حرکت سارے خاندان کو رسوا کر ڈالتی ہے۔ گھر سے بھاگنا چھوٹی بات نہیں نور! حالات کیسے بھی خراب کیوں نہ ہوں لڑکیوں کو گھر سے نہیں بھاگنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بعد ان کی اپنی زندگی بھی تو تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کی باقی زندگی پھر بھاگتے بھاگتے ہی بسر ہوتی ہے۔ کوئی پکا ٹھکانا ان کو بھی نہیں ملتا۔ تو پھر خاندان ہی اس لڑکی کو واپس قبول کرتا ہے اور نہ ہی معاشرے کے شریف لوگ۔ بلال اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے اور نور جو بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھی چونک کر بغور ان کو دیکھا۔ پھر پوری سنجیدگی سے پوچھا۔

”بلال اگر یہ بات ہے تو پھر آپ نے کیوں قبول کیا مجھے؟“

بلال اس کی بات سن کر مسکرائے پھر کہا۔

”ایک تو اس لیے کہ تم گھر سے میری وجہ سے بھاگیں۔ اس حال کو میری وجہ سے پہنچیں۔“ وہ ر کے پھر ایک طویل سانس کھینچ کر بولے۔ ”دوسرے دل کے ہاتھوں بھی مجبور تھا۔ لگتا تھا تمہارے بن میں ادھورا ہوں۔ محبت کی گھی میں نے تم سے اور ہمیشہ تمہیں ہی محبت کروں گا۔ تم میری محبت ہونا نور اور مجھے تم ہر حال میں قبول ہو۔“ تو یہ سن کر رو پڑی پھر کہا۔

”آپ پہلے کیوں نہیں آئے۔ اگر آپ بہت پہلے آ جاتے تو یہ دلتیں اور ننھے ننھے دکھ میرا مقدر جو بنے ہیں ان سے بچ جاتی کہ گھر سے بھاگ کر سکون کا ایک لمحہ میں نے بھی بسر نہیں کیا۔ ہمیشہ بے سکون رہی۔“

”یعنی باتوں پر کڑھنا اب فضول ہے۔“ یہ کہتے ہوئے بلال نے اپنی انگلیوں سے اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو صاف کیے۔ پھر روبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلاتے ہوئے محبت سے لبریز لہجے میں کہا۔

”نور! آج کے بعد میں ان پیدلی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ دیکھوں۔ جو وہ دکھ تم نے اٹھائے ہیں ان کلد ادا میں اپنی ڈھیروں محبتیں تم پر نثار کر کے کروں گا۔ مگر رونا بالکل بھی نہیں۔ اب مسکراؤ۔“ اور نور اس کی بات پر بے ساختہ مسکرائی تو بلال نے کہا۔

”شاباش! اب اچھی اچھی باتیں کرو اور سوچو بھی۔“ مگر نور نے باتیں کرنے کی بجائے ایک بار پھر بلال کے کاندھے پر اپنا سر رکھ کر سکون سے آنکھیں موندھ لی تھیں۔

(ختم شد)